هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ (آل عمران)

بیانُ القُرآن

جلد اوّل

ترجمہ ومختصر تفسیر

الفَاتِحَة ـ تا ـ المَائِدَة

مع تعارفِ قرآن

از

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

جملہ حقوق بحق مرکزی انجمن خدام القرآن اور دینِ حق ٹرسٹ محفوظ ہیں!

مذکورہ بالا دونوں ادارے ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی کتابوں، تحریروں اور اقتباسات کے ضمن میں اجازت دیتے ہیں کہ کوئی شخص یا پبلشر اگر ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے علمی مواد کو شائع کرنا چاہتا ہے تو وہ اشاعت سے قبل چند ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے، قیمتاً فروخت کرنے یا مفت تقسیم کرنے کے لیے، تحریری اجازت بلا معاوضہ مذکورہ بالا دونوں اداروں میں سے کسی ایک سے ضرور حاصل کرے۔ اگر کوئی فرد / پبلشر معین کردہ ضوابط کی خلاف ورزی کرے گا تو اُس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔

نام کتاب : بیان القرآن (جلد اوّل) طبع جدید

مبنی بر "دورۂ ترجمۂ قرآن" از ڈاکٹر اسرار احمدؒ (۱۹۹۸ء)

ترتیب و تدوین:

حافظ خالد محمود خضر، ایم ایس سی، فاضل قرآن اکیڈمی

لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین، ایجوکیشن کور

اشاعت اوّل تا چہارم (مارچ 2021ء تا نومبر 2022ء) ـــــــ 9,000

اشاعت پنجم (مئی 2023ء) ـــــــ 2200

قیمت (فی جلد) ـــــــ 2,400 روپے

(مکمل سیٹ: چار جلد) ـــــــ 9,600 روپے

ISBN: 978-969-606-070-3

ناشر الصمام:

شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی، لاہور

publications@tanzeem.org

فون: 38939321(042)

شائع کردہ:

مکتبہ خُدّامُ القُرآن لاہور

K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501(042)

maktaba@tanzeem.org

مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

ترتیب

عرضِ مرتّب (حافظ خالد محمود خضر)	4
پیش لفظ (حافظ عاکف سعید)	6
تقدیم (ڈاکٹر اسرار احمدؒ)	9
تعارفِ قرآن	13
بیانُ القرآن	93
① الفَاتِحَة	95
② البَقَرَة	107
③ آلِ عِمْرَان	317
④ النِّسَاء	413
⑤ المَائِدَة	521

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مُرتّب

(بر طبع جدید ۲۰۲۱ء)

قرآن حکیم نوعِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ کا آخری اور تکمیلی پیغامِ ہدایت ہے جسے نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت و تبلیغ میں مرکز و محور کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ ﷺ نے اس قرآن کی بنیاد پر نہ صرف دنیا کو ایک نظامِ عدلِ اجتماعی عطا فرمایا بلکہ اس عادلانہ نظام پر مبنی ایک صالح معاشرہ بھی بالفعل قائم کر کے دکھایا۔ آپ ﷺ نے اس قرآن کی راہنمائی میں انقلاب کے تمام مراحل طے کرتے ہوئے نوعِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب برپا فرما دیا۔ چنانچہ یہ قرآن محض ایک کتاب نہیں بلکہ ''کتابِ انقلاب'' ہے اور اس شعور کے بغیر قرآن مجید کی بہت سی اہم حقیقتیں اس کے قاری پر منکشف نہیں ہو سکتیں۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور اور بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو جنہوں نے اس دور میں قرآن حکیم کی اس حیثیت کو بڑے وسیع پیمانے پر عام کیا ہے کہ یہ کتاب اپنی دیگر امتیازی حیثیتوں کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب اور آپ ﷺ کے برپا کردہ انقلاب کے مختلف مراحل کے لیے بمنزلہ مینوئل (manual) بھی ہے۔ لہٰذا اس کا مطالعہ آنحضور ﷺ کی دعوت و تحریک اور انقلابی جدّ و جہد کے تناظر میں کیا جانا چاہیے اور اس کے قاری کو خود بھی ''منہجِ انقلابِ نبویؐ'' پر مبنی انقلابی جدّ و جہد میں شریک ہونا چاہیے۔ بصورتِ دیگر وہ قرآن حکیم کے معارف کے ایک بہت بڑے خزانے تک رسائی سے محروم رہے گا۔

محترم ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے دورانِ ترجمۂ قرآن (بیان القرآن) میں بھی قرآن کریم کی اس امتیازی حیثیت کو پیش نظر رکھا ہے جسے دعوت رجوع الی القرآن کے انتہائی اہم سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ راقم الحروف نے اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق طلب کرتے ہوئے چند سال قبل اس شہرۂ آفاق ''بیان القرآن'' کو کتابی صورت میں مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور پہلے ''تعارفِ قرآن'' اور پھر رفتہ رفتہ سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی ترتیب و تدوین، تخریج احادیث کے اضافے کے ساتھ مکمل کی جسے ۲۰۰۸ء میں ''بیان القرآن'' (حصہ اوّل) کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس کے بعد ترتیب و تسوید اور تبییض و تدوین کے اس کام میں مجھے لیفٹیننٹ کرنل (ر) عاشق حسین صاحب (ایجوکیشن کور) جیسی علمی و ادبی شخصیت کی رفاقت میسر آ گئی جنہوں نے خالصتاً رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر انتہائی ذوق، شوق، جہدِ مسلسل اور کمال مہارت سے (بقول ڈاکٹر اسرار احمدؒ) اس پہاڑ جیسے کام کی تکمیل تک معاونت کا حق ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس کی بھرپور جزائے خیر عطا فرمائے! یہاں اس امر کا تذکرہ بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ ''بیان القرآن'' کی ترتیب و تسوید کا بالکل ابتدائی کام یعنی اسے کیسٹ سے سن کر صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا تنظیم اسلامی حلقہ خواتین نے سرانجام دیا تھا جس پر ہماری یہ بہنیں بجا طور پر تشکر و تحسین اور دعائے خیر کی مستحق ہیں۔

''بیان القرآن'' کا سال بہ سال ایک حصہ منصۂ شہود پر آتا رہا' تا آنکہ جون ۲۰۱۵ء کے آغاز میں یہ کٹھن کام سات حصوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ ''بیان القرآن'' کو علمی اور دینی حلقوں میں بحمد اللہ خاصی پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف ایک سال (۲۰۲۰ء) کے دوران ''بیان القرآن'' (مکمل سیٹ) کے چار ایڈیشن طبع کیے گئے ہیں۔ ''بیان القرآن'' کی کتابی صورت میں تکمیل کے بعد راقم الحروف کی خواہش تھی کہ چھوٹے بڑے سات حصوں کے بجائے ایک نئی ترتیب و تقسیم کے ساتھ اسے تقریباً برابر ضخامت کی چار جلدوں میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ شعبان المعظم ۱۴۴۲ھ میں ''بیان القرآن'' طبع جدید پیش خدمت ہے۔ قارئین ہماری اس کاوش کو متعدد ظاہری و باطنی خوبیوں کی حامل پائیں گے۔ اس نئے ایڈیشن کی تیاری میں جدید کمپیوٹر سافٹ ویئر ''قرآن پبلشنگ سسٹم'' استعمال کیا گیا ہے' جس سے آیاتِ قرآنی خوبصورت قرآنی رسم الخط میں طبع ہوئی ہیں۔ اس سافٹ ویئر کے لیے ہم جناب حسن رشید رامے کے ممنون ہیں' اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ اس موقع پر ''بیان القرآن'' کی ازسرِنو خواندگی کا بھی اہتمام کیا گیا ہے اور چند اغلاط یا تسامحات کی تصحیح کی گئی ہے۔ قرآنِ حکیم کے متن کی پروف ریڈنگ محکمہ اوقاف کے رجسٹرڈ پروف ریڈر قاری محمد اسلام صاحب سے بھی کرائی گئی ہے۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی حیاتِ مستعار میں ''بیان القرآن'' کا حصہ اوّل شائع ہوا تو اس کی غیر معمولی مقبولیت اور پذیرائی نے انہیں اس کے بقیہ کام کے بارے میں ایک خوشگوار اضطراب کی کیفیت سے دوچار کر دیا تھا۔ دراصل ڈاکٹر صاحبؒ کے مشن اور اس کی ترویج میں جو مرکزیت قرآن کریم کو حاصل ہے بعینہٖ وہی مرکزی اور امتیازی حیثیت انجمن اور تنظیم کی مطبوعات میں ''بیان القرآن'' رکھتی ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحبؒ انتہائی خوش قسمت ہیں کہ اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی' حدیثِ نبویؐ میں دی گئی بشارت کے مصداق' آپ کا دفترِ عمل بند نہیں ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

((اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ : اِلَّا مِنْ صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ اَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهٗ)) (رواہ مسلم والترمذی)

''جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اُس سے اس کے اعمال کا تعلق ختم ہو جاتا ہے (یعنی نامہ اعمال بند ہو جاتا ہے) سوائے تین چیزوں کے: صدقہ جاریہ' یا ایسا علم جس سے نفع اٹھایا جاتا رہے' یا نیک اولاد جو اُس کے لیے دُعا کرتی رہے۔''

محترم ڈاکٹر صاحبؒ کی خوش بختی کا کیا کہنا کہ مذکورہ بالا تین چیزوں میں سے صرف ایک یا دو نہیں' پوری تین سعادتیں اُن کے حصے میں آئی ہیں' جو اُن کے حسنات و درجات میں روز افزوں ترقی کا باعث ہیں۔ محترم ڈاکٹر صاحب اپنے حصے کا کام کر گئے' لیکن ہمیں اپنے حصے کا کام کرتے رہنا ہے۔ ''بیان القرآن'' کے مرتبین نے اس تالیف کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کی تحریک میں مقدور بھر اپنا حصہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس خدمتِ قرآنی کو شرفِ قبول عطا فرما کر اسے محترم ڈاکٹر صاحب کے بلندیٔ درجات کا ذریعہ بنائے' اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت و طباعت میں شریک تمام خواتین و حضرات کے لیے اسے دُنیوی و اُخروی فوز و فلاح کا باعث بنائے۔ آمین!

۶ رجب المرجب ۱۴۴۲ھ / ۱۹ فروری ۲۰۲۱ء
بروز جمعۃ المبارک

حافظ خالد محمود خضر
مدیر شعبہ مطبوعات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

حافظ عاکف سعید

''بیان القرآن'' کی سات حصّوں پر مشتمل کتابی صورت میں تکمیل جون ۲۰۱۵ء میں ہوگئی تھی۔ اس کے متعدد ایڈیشنز کی اشاعت کے بعد اب اسے نئی ترتیب وتزئین کے ساتھ چار مجلدات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۹۸ء کے رمضان المبارک میں کراچی میں والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد ؒ نے نمازِ تراویح کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم کے ترجمہ ومختصر تشریح کا جو مبارک فریضہ ادا کیا تھا' جسے عرفِ عام میں ''دورۂ ترجمہ قرآن'' کہا جاتا ہے' وہ ایک سو آٹھ گھنٹوں پر محیط تھا۔ ''بیان القرآن'' دراصل اسی کی تحریری صورت ہے۔ تصنیف وتالیف کی دنیا سے وابستہ حضرات خوب جانتے ہیں کہ محض ایک ڈیڑھ گھنٹے پر محیط کسی بلند پایہ تقریر یا خطاب کو معیاری سطح پر تحریری صورت میں مرتب کرنا بھی کس قدر مشقت طلب اور کٹھن کام شمار ہوتا ہے اور اس کے لیے کس اعلیٰ درجے کی علمی وادبی صلاحیت درکار ہوتی ہے' جبکہ ''بیان القرآن'' کی ریکارڈنگ ایک ڈیڑھ گھنٹے پر نہیں' ایک سو آٹھ گھنٹوں پر مشتمل ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی تائید وتوفیق کے بغیر یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

اس کارِ خیر کی تکمیل میں جن ساتھیوں نے بھی عملی حصّہ ڈالا ہے وہ تمام لوگ ہمارے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ مَیں خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کروں گا اپنے دیرینہ تنظیمی وتحریکی ساتھی اور قرآن اکیڈمی میں میرے خصوصی معاونِ کار حافظ خالد محمود خضر صاحب کا' جن کی سال ہا سال کی پیہم جدّوجُہد اور قابلِ رشک خلوص ولگن کا نتیجہ ''بیان القرآن'' کی تکمیل کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ محترم حافظ صاحب نے ''کلمۂ تشکّر'' کے حوالے سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کتاب کے آخر میں کیا ہے۔ ''بیان القرآن'' کی ترتیب وتسوید اور طباعت واشاعت کے ضمن میں جن ساتھیوں کا خصوصیت کے ساتھ انہوں نے ذکر کیا اور شکریہ ادا کیا ہے' اُن میں ہمارے ایک تنظیمی ساتھی' جن کی قافلۂ تنظیم میں شمولیت تو زیادہ پرانی نہیں ہے' لیکن بعض اعتبارات سے وہ اُن قابلِ رشک افراد میں شامل ہیں جو دیر سے آتے ہیں لیکن آگے نکل جاتے ہیں —— کرنل (ر) عاشق حسین صاحب ہیں' جو ''بیان القرآن'' کے حصّہ اوّل کی اشاعت کے بعد ہمارے رابطے میں آئے' لیکن پھر انہوں نے خود کو ہمہ تن اس کام کے لیے وقف کر دیا۔ زبان وادب کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے انہیں خصوصی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ راقم کا احساس ہے کہ ''بیان القرآن'' کی ترتیب وتسوید (editing) کے کام میں ان کا غیر معمولی تعاون ہمارے لیے تائیدِ غیبی سے کم نہ تھا۔ اسی طرح طباعت کے حوالے سے ہمارے ایک دیرینہ ساتھی شیخ رحیم الدین صاحب کی غیر معمولی مساعی' اَن تھک محنت اور بے پناہ جذبہ ولگن مثالی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ شعبہ مطبوعات کے دیگر تمام ارکان جن کا خصوصی تعاون اس کام میں ہمیں حاصل رہا' بالخصوص حافظ محبوب احمد خان'

حافظ محمد زاہد، عقیل عباس، مرتضیٰ احمد اعوان اور یاسر محمود سب ہمارے شکریے اور دعاؤں کے مستحق ہیں۔ فجزاھم اللّٰہ احسن الجزاء!

''بیان القرآن'' عام معنوں میں تفسیر قرآن نہیں ہے۔ اگرچہ یہ امر واقعہ ہے کہ والد محترم ڈاکٹر اسرار احمد ؒ کو زمانۂ طالب علمی کے دوران ہی قرآن حکیم کے ساتھ ایک ذہنی وقلبی والہانہ تعلق قائم ہو چکا تھا، چنانچہ میڈیکل کی تعلیم کے آخری سالوں میں ہی ان کے دروسِ قرآن کو قبولیتِ عام کا مقام حاصل ہو گیا تھا، لیکن جیسا کہ انہوں نے ''بیان القرآن'' حصہ اول کی ''تقدیم'' میں خود اس حقیقت کا وضاحت کے ساتھ اظہار کیا ہے کہ انہیں ہرگز ''مفسّر'' ہونے کا دعویٰ نہیں ہے۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ان کے دروسِ قرآن سے متأثر ہو کر جب بھی احباب فرمائش کرتے تھے کہ آپ قرآن حکیم کی تفسیر بھی ضرور لکھیں تو اُن کا جواب یہ ہوتا تھا کہ مَیں خود کو اس مقام کا اہل نہیں سمجھتا۔ بہرکیف، قرآن کی عظمت کا نقش اُن کے دل پر کچھ اس انداز سے ثبت ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف متوجہ کرنا، قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی انہیں ترغیب دینا اور قرآن کے منتخب مقامات کے دروس کے ذریعے مسلمانوں کو ان کی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرنا ان کی زندگی کا مشن تھا۔ اُن کی ان تمام تر دعوتی وتبلیغی مساعی کے مرکز ومحور کی حیثیت قرآن حکیم ہی کو حاصل تھی —— قرآن مجید کی عظمت اور اُمت کے عروج و زوال کے ضمن میں اس کی اہمیت کے حوالے سے علامہ اقبال کے یہ اشعار گویا اُن کے تحت الشعور کا حصہ بن چکے تھے کہ ؎

گر تُو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اور ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

حکیم الاُمت علامہ اقبال، اُمت کے زوال وانحطاط کی تشخیص کرتے ہوئے ہمیں مسلسل یہ پیغام دیتے رہے کہ اس کا اصل سبب ترکِ قرآن ہے، یعنی قرآن سے اپنے مطلوب تعلق کو توڑ کر اسے محض ایک ایسی کتابِ مقدس یا بقول اقبال نسخۂ موت بنا دینا جس کا زندگی کے پیچیدہ معاملات ومسائل کے حل اور علم وفکر کے میدان میں رُشد وہدایت سے کوئی تعلق نہ ہو۔ اقبال ہی کے دور کی ایک اور عظیم شخصیت جن کا تعلق طبقہ علماء سے تھا، یعنی شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن ؒ، وہ بھی یہی سوچ رکھتے تھے کہ زوالِ اُمت کا اصل سبب قرآن کو ترک کر دینا ہے۔ انگریز کے خلاف جہادِ حریت کے اس عظیم مجاہد نے مالٹا کی اسیری سے رہائی پانے کے بعد اپنی پیرانہ سالی میں طبقۂ علماء کے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''مَیں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے مَیں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صَرف کروں گا کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے، بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں، بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔'' (بحوالہ: ''وحدتِ اُمت'' از مفتی محمد شفیع ؒ)

والدِ محترمؒ کی تمام مساعی پر اگر نگاہ ڈالیں تو وہ ع ''میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!'' کے مصداق اُمت کو دوبارہ قرآن کے ساتھ جوڑنے کی کوشش ہی کا مظہر ہیں اور اس ضمن میں شیخ الہندؒ نے جو راستہ تجویز کیا' یعنی قرآن حکیم کو لفظاً اور معناً عام کرنا' لوگوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں قرآن کے معانی سے روشناس کرانا اور انہیں قرآن کی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کرنا' اسی کی عملی تعبیر ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے قرآن کا پیغام آج ان کے دروسِ قرآن اور خطابات کے ذریعے دنیا بھر میں اردو بولنے سمجھنے والے کروڑوں افراد تک پہنچ رہا ہے۔ اسی خدمتِ قرآنی کا ایک بہت بڑا مظہر اور ایک اعتبار سے نقطۂ عروج' نزولِ قرآن کے مہینے' رمضان المبارک کی بابرکت راتوں میں نمازِ تراویح کے ساتھ پورے قرآن کا ترجمہ' نہایت مختصر اور ضروری تشریح کے ساتھ' یعنی دورۂ ترجمہ قرآن ہے' جو بحمد اللہ اب ''بیان القرآن'' کے عنوان سے کتابی صورت میں بھی پورے کا پورا دستیاب ہے۔ فَالحمدُ لِلّٰہ علیٰ ذٰلک!

یہ امر واقعہ ہے کہ ''بیان القرآن'' کا کتابی صورت میں مرتب ہو جانا' والد محترمؒ اور ہم سب کا ایک خواب تو ضرور تھا' لیکن اس کی عملی تعبیر بظاہر ناممکن نظر آتی تھی۔ تاہم' اس کے حصہ اوّل کی اشاعت سے ہمیں یہ حوصلہ ملا کہ یہ کام ناممکن نہیں ہے' جیسا کہ خود والد محترمؒ نے بھی حصہ اوّل کی بارِ دگر اشاعت کے موقع پر ''تقدیم'' میں اپنے ان خیالات کا اظہار فرمایا تھا:

> ''اس جلد میں ابھی صرف سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی ترجمانی ہوئی ہے' گویا کہ ابھی پہاڑ ایسا کام باقی ہے۔ تاہم' اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے توقع ہے کہ جیسے اُس نے میرے کسی ارادے یا منصوبہ بندی کے بغیر اور میری خالص لاعلمی میں پیش نظر جلد شائع کرا دی' ویسے ہی باقی بھی شائع کرا دے گا — خواہ میری اس دنیا سے دارِ آخرت کی جانب روانگی کے بعد ہی سہی!''

والد محترمؒ کی حیات میں ''بیان القرآن'' کا صرف حصہ اوّل ہی شائع ہو سکا تھا' بعد کے تمام حصے اُن کی وفات کے بعد وقفے وقفے سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئے اور اُن کی وفات کے پانچ سال بعد حصہ ہفتم کی اشاعت پر یہ کام بحمد اللہ پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ السّعی منّا و الاتمام من اللہ! مدیر شعبہ مطبوعات اور ان کی ٹیم نے اب مزید محنت و کاوش سے ''بیان القرآن'' کا یہ نیا ایڈیشن تیار کیا ہے' جو مزید ظاہری و معنوی خوبیوں کا حامل ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ خدمتِ قرآنی کے اس کام کو والد محترمؒ کے لیے توشۂ آخرت اور عوام الناس کو قرآن سے جوڑنے' اس کے پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا موجب بنا دے۔ آمین یا ربّ العالمین!

۱۳ رجب المرجب ۱۴۴۲ھ / ۲۶ فروری ۲۰۲۱ء
بروز جمعۃ المبارک

حافظ عاکف سعید
ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی' لاہور

[**نوٹ**: حافظ عاکف سعید صاحب کی یہ تحریر اصلاً ''بیان القرآن'' حصہ ہفتم کا ''پیش لفظ'' تھی' جسے طبع جدید کے موقع پر معمولی لفظی ردّوبدل کے ساتھ ''بیان القرآن'' (جلد اوّل) کا ''پیش لفظ'' بنا دیا گیا ہے۔]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقدیم

(''بیان القرآن'' حصہ اوّل ـــــ ۲۰۰۸ء)

از قلم: ڈاکٹر اسرار احمد

اِن سطور کے ناچیز راقم کو قرآن مجید کا مفسر تو بہت دُور کی بات ہے' مروّجہ مفہوم کے اعتبار سے ''عالم دین'' ہونے کا بھی ہرگز کوئی دعویٰ نہیں ہے' تاہم' خالصتاً ''تحدیثًا لِلنّعمۃ'' (بفحوائے ''وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ'') اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے اعتراف واظہار میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی کہ اُس نے اپنے خاص فضل وکرم سے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اوائل عمر ہی میں قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک دلی اُنس اور ذہنی مناسبت قائم ہوتی چلی گئی۔ چنانچہ اوّلاً بالکل ہی نوعمری میں (ہائی سکول کے ابتدائی سالوں کے دوران) علامہ اقبال کی شاعری کے ذریعے قرآن کی عظمت' ملّتِ اسلامی کی نشأۃِ ثانیہ کی امید اور اس کے ضمن میں قرآن کی اہمیت کا ایک گہرا نقش قلب پر قائم فرما دیا' پھر ایک خاندانی روایت کے مطابق ہائی سکول کی تعلیم کے دوران عربی کو ایک اضافی مضمون کی حیثیت سے اختیار کرنے کی صورت پیدا فرما دی جس سے عربی گرامر کی اساسات کا علم حاصل ہو گیا ـــــ اور پھر میٹرک کے امتحان کے بعد فراغت کے دنوں میں' جبکہ ۱۹۴۷ء کے مسلم کُش فسادات کے نتیجے میں ہم لگ بھگ ایک ماہ قصبہ حصار (جو اَب بھارت کی ریاست ہریانہ میں ہے) میں ہندوؤں کے حملوں سے دفاع کے لیے چند محلّوں پر مشتمل ایک دفاعی بلاک میں ''محصور'' تھے' قرآن حکیم سے پہلے معنوی تعارف کی یہ صورت پیدا فرما دی کہ مجھے اور میرے بڑے بھائی اظہار احمد صاحب مرحوم کو ایک مسجد میں بیٹھ کر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہونے والی تفسیر سورۂ یوسفؑ کے اجتماعی مطالعے اور اس پر باہمی مذاکرے کا موقع ملا' جس سے اندازہ ہوا کہ قرآن فصاحت و بلاغت کی معراج اور سرچشمۂ ہدایت ہی نہیں منبعِ علم وحکمت بھی ہے' اور واقعتاً اِس لائق ہے کہ بہترین ذہنی وفکری صلاحیتوں کو اس کے علم وفہم کے حصول میں اس طور سے صرف کیا جائے کہ اوّلاً اس کے عمومی پیغام کو صحیح طور پر سمجھیں جو کہ علم وحکمت کے اس بحرِ زخّار کی سطح پر بالکل اسی طرح تیر رہا ہے جیسے کسی تیل بردار جہاز میں شکست و ریخت کے باعث اس سے نکل کر بہنے والا تیل سطحِ سمندر پر تیر رہا ہوتا ہے' اور پھر اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے اس کی تہہ سے اس کے فلسفہ وحکمت کے اصل موتیوں کو تلاش کریں!

الحمدللہ' ثم الحمدللہ' کہ یہ ان ہی امورِ ثلاثہ کے نتیجے کا ظہور تھا کہ جب تقسیم ہند کے وقت ایک سو ستر میل کا سفر (حصار تا ہیڈ سلیمانکی) پیدل قافلے کے ساتھ آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان پہنچنا نصیب ہوا تو فوراً تحریکِ جماعتِ اسلامی کے ساتھ عملی وابستگی ہو گئی ـــــ (جو اوّلاً اسلامی جمعیتِ طلبہ میں شمولیت کی صورت میں تھی' اور اس کے بعد جماعتِ اسلامی کی رکنیت کی شکل میں!) اور اس پورے دس سالہ عرصے کے دوران جمعیت اور جماعت کے اجتماعات میں ''درسِ قرآن'' کی ذِمہ داری عموماً مجھ پر عائد ہوتی رہی' جسے بالعموم بہت استحسان کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا ـــــ اگرچہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ سامعین کی جانب سے یہ تحسین وتعریف اقبال کے اس شعر کے عین مطابق ہے کہ ؎

خوش آ گئی ہے جہاں کو قلندری میری وگرنہ شعر مرا کیا ہے! شاعری کیا ہے!!

مزید برآں مَیں ہرگز اس کا دعویٰ بھی نہیں کرتا کہ میرے اس تعلّم وتدبّرِ قرآن کے ذوق وشوق میں روز افزوں اضافے میں اس خارجی پسندیدگی کی بنا پر پیدا ہونے والی ''ہمت افزائی'' کو بیرے سے کوئی دخل حاصل نہیں تھا' لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں اپنے دروس کے لیے تیاری کے ضمن میں جو مطالعہ کرتا اور مختلف عربی اور اردو تفاسیر سے رجوع کرتا اور پھر اپنے ذاتی غور وفکر سے بھی کام لیتا تو اس کے نتیجے میں مجھ پر قرآن کی عظمت مزید منکشف ہوتی چلی گئی —— اور اس قول کو ہرگز کسی مبالغے پر مبنی نہ سمجھا جائے کہ قرآن نے مجھے اپنا ''اسیر'' (possess) کرلیا۔ چنانچہ یہ اسی اسیری کا مظہر ہے کہ میں نے ۱۹۵۲ء ہی میں (بیس سال کی عمر میں) میڈیکل ایجوکیشن کے عین وسط میں یہ شعوری فیصلہ کرلیا تھا کہ اب یہ طب کی تعلیم بھی اور طبابت کا پیشہ بھی' سب میری ترجیحات میں نمبر دو پر رہیں گے' اوّلین ترجیح خدمتِ قرآنِ حکیم اور خدمتِ دینِ متین کو حاصل رہے گی! اور پھر ۱۹۷۱ء میں قمری حساب سے چالیس سال کی عمر میں جب یہ محسوس ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل وکرم سے مجھ پر اپنی شانِ ''عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ'' کے ساتھ ساتھ ''عَلَّمَهُ الْبَيَانَ'' کا بھی کسی درجے میں فیضان فرما دیا ہے تو اپنے پیشہ طبابت کو بالکل خیر باد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت قرآنِ مبین اور دینِ متین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

مجھ پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل وکرم اس اعتبار سے بھی ہوا کہ اس نے مجھے کسی ایک لکیر کا فقیر ہونے سے بچا لیا —— چنانچہ قرآن کے علم وفہم کے ضمن میں میرے استفادے کا حلقہ بہت وسیع بھی ہے —— اور بعض اعتبارات سے تضادات کا حامل بھی! مَیں نے اپنی ایک تالیف ''دعوت رجوع الی القرآن کا منظر وپس منظر'' میں اس کی پوری تفصیل درج کر دی ہے کہ میرے علم وفہمِ قرآن کے ''حوض'' میں تفسیرِ قرآن کے چار سلسلوں کی نہروں سے پانی آتا رہا' جن پر پانچواں اضافہ میری تعلیم میں شامل علومِ طبیعیہ کے مبادیات کا علم تھا —— پھر اللہ نے مجھے جو منطقی ذہن عطا فرمایا تھا اس کے ذریعے ان پانچ سلسلوں سے حاصل شدہ معلومات میں ''تجمیع و توافق'' (synthesis) قائم کیا۔ جس کی بنا پر بحمد اللہ میرے ''بیان القرآن'' کو ایک جامعیت حاصل ہوگئی۔ اور غالباً یہی اس کی مقبولیت کا اصل راز ہے۔[1] واللہ اعلم!

ایک مستند ''عالمِ دین'' نہ ہونے کے باوجود جس چیز نے مجھے درس وتدریسِ قرآن کی جرأت (بلکہ ٹھیٹھ مذہبی حلقوں کے نزدیک ''جسارت'') کی ہمت عطا فرمائی' وہ نبی اکرم ﷺ کا یہ قولِ مبارک ہے کہ: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً)) یعنی ''پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت!'' (صحیح بخاری' اور اس کے علاوہ ترمذی' احمد اور دارمی رحمہم اللہ)۔ چنانچہ میرے نزدیک جن علومِ دینی کی تحصیل کو علماءِ کرام لازمی قرار دیتے ہیں وہ کسی کے ''مفتی'' بننے کے لیے تو لامحالہ لازمی ہیں' لیکن قرآن کے داعی اور مبلّغ بننے کے لیے ہرگز ضروری نہیں ہیں۔ اس لیے کہ قرآن کا پیغام اگرچہ تا قیامِ قیامت پوری نوعِ انسانی کے لیے تھا' تاہم اس کے اوّلین مخاطب تو ''اُمّی'' تھے —— چنانچہ قرآن کے اصل پیغام کو اللہ تعالیٰ نے نہایت ''یسیر'' صورت میں' جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا' ایک اتھاہ سمندر کی سطح پر

۱۔ اس ضمن میں ایک واقعے کا ذکر نامناسب نہیں ہوگا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب میرے اور مولانا اصلاحی صاحب کے مابین کچھ نظریاتی اختلاف پیدا ہوگیا تھا —— ایک صاحب جن کا نام ڈاکٹر انوار احمد بگوی تھا (جو صوبائی محکمہ صحت میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے' اور غالباً اب ریٹائر ہو چکے ہوں گے) جو مولانا اصلاحی کے غایت درجہ معتقد تھے اور مجھ سے شدید اختلاف رکھتے تھے' انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا کہ: ''یہ بات بہرحال ماننی پڑتی ہے کہ آپ کے درس سے بالکل خالی ہاتھ کوئی بھی نہیں اٹھتا' ہر شخص ضرور کچھ نہ کچھ لے کر اٹھتا ہے!''

تیرنے والے تیل کے مانند پیش کیا (یہی وجہ ہے کہ سورۃ القمر میں چار بار فرمایا گیا: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ﴾ یعنی ''ہم نے نصیحت وہدایت کے لیے قرآن کو بہت آسان بنا دیا ہے' تو ہے کوئی جو اس سے تذکر حاصل کرے!'')

قصۂ مختصر ـــــ لاہور میں ۱۹۶۵ء سے میرے باضابطہ حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن قائم ہوئے تو اس کے نتیجے میں پہلے ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قائم ہوئی' جس کی کوکھ سے ذیلی انجمنوں کا ایک سلسلہ برآمد ہوا (کراچی' ملتان' فیصل آباد' جھنگ' کوئٹہ' اسلام آباد' پشاور) پھر ۱۹۷۶ء میں لاہور میں قرآن اکیڈمی قائم ہوئی' اور اس کی ''بیٹیوں'' کے طور پر کراچی' ملتان' فیصل آباد اور جھنگ میں بھی اکیڈمیاں وجود میں آئیں۔ ساتھ ہی پاکستان کے طول وعرض میں بڑے بڑے شہروں میں میرے درسِ قرآن کی محفلیں منعقد ہونے لگیں۔ پھر قرآنی تربیت گاہوں (جو ایک ہفتہ سے لے کر ایک مہینے تک کے عرصے پر محیط ہوتی تھیں) کا سلسلہ شروع ہوا ـــــ ادھر لاہور میں سالانہ قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ جاری ہوا اور پھر جب پاکستان ٹیلی ویژن پر یہ درسِ قرآن شروع ہوا تو اوّلاً الکتٰب' پھر الٓمّٓ' پھر نبی کامل (ﷺ) اور بالآخر ''الھدیٰ'' کا ہفتہ وار پروگرام جو پورے پندرہ مہینے اِس شان سے جاری رہا کہ ہفتے کے ایک ہی دن' ایک ہی وقت پر' پاکستان کے تمام ٹی وی سٹیشنوں سے نشر ہوتا تھا ـــــ تو اُس زمانے میں جو مقبولیت حاصل ہوئی اس کی بنا پر مجھے اپنے بارے میں وہ شدید اندیشہ لاحق ہو گیا تھا جس کا ذکر ایک حدیث میں آیا ہے کہ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کسی شخص کی تباہی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اُس کی جانب انگلیاں اٹھنی شروع ہو جائیں!'' اس پر دریافت کیا گیا کہ: ''اگر یہ کسی خیر کی بنیاد پر ہو تو کیا تب بھی؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ''ہاں تب بھی' اس لیے کہ اس سے انسان کے لغزش میں مبتلا ہونے (یعنی اس میں عجب اور تکبر جیسی ہلاکت خیز بیماریوں کے پیدا ہو جانے) کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے ـــــ اِلّا یہ کہ اللہ کی رحمت شاملِ حال ہو!'' (اس حدیث کو محدث ذہبیؒ نے حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے' اگرچہ اس کی روایت میں کسی قدر ضعف موجود ہے۔) اس لیے کہ اُس زمانے میں فی الواقع کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ مَیں جدھر جاتا تھا لوگ ایک دوسرے کو اشاروں کے ذریعے میری طرف متوجہ کرتے تھے ـــــ یہ بھی اُس زمانے کی بات ہے کہ مجھ سے متعدد لوگوں نے تفسیر قرآن لکھنے کی فرمائش کی' اور ایک پبلشر نے تو بہت اصرار کیا کہ آپ ایک ترجمۂ قرآن ہی لکھ دیں ـــــ لیکن مَیں نے ہمیشہ اور سب سے یہی کہا کہ یہ میرا مقام نہیں ہے! ـــــ اس دعوتِ قرآنی میں اگرچہ میرا زیادہ زور قرآن کے چیدہ چیدہ مقامات پر مشتمل ''مطالعۂ قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب'' کے درس پر رہا' لیکن بحمداللہ دو بار پورے قرآن مجید کا درس دینے کی سعادت بھی حاصل ہوئی' اگرچہ وہ سارا ٹیپ پر ریکارڈ شدہ موجود نہیں ہے!

اس دعوتِ قرآنی کا نقطۂ عروج یہ تھا کہ ۱۹۸۴ء (۱۴۰۴ھ) میں نمازِ تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز ہوا۔ چنانچہ ہر چار رکعت تراویح سے قبل ان رکعتوں میں پڑھی جانے والی آیات کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان ہوتی تھی' ـــــ پھر نماز میں ان کی سماعت ہوتی تھی' جس کے نتیجے میں' بعض لوگوں میں کم اور بعض میں زیادہ' وہ کیفیت پیدا ہو جاتی تھی جسے اقبال نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب گرہ کُشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

اس عمل کے نتیجے میں نمازِ عشاء اور نمازِ تراویح کی تکمیل میں لگ بھگ چھ گھنٹے صرف ہوتے تھے ـــــ اور بحمداللہ سامعین کا جوش وخروش اور ذوق وشوق دیدنی ہوتا تھا ـــــ اور ثم الحمدللہ کہ اب یہ سلسلہ پاکستان کے بہت سے مقامات پر میری صُلبی اور معنوی اولاد کے ذریعے جاری ہے!

اس سلسلے میں دورۂ ترجمۂ قرآن کا جو پروگرام ۱۹۹۸ء میں کراچی کی قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد میں ہوا' اس کی آڈیو ویڈیو

ریکارڈنگ اعلیٰ معیار پر کی گئی تھی۔ چنانچہ یہ بحمداللہ آڈیو ویڈیو کیسٹوں اور C.D.s اور D.V.D.s اور ٹی وی چینلز کے ذریعے پوری دنیا میں نہایت وسیع پیمانے پر پھیل چکا ہے ـــــ اور اب اسے کتابی شکل میں بھی شائع کرنے کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے' جس کا حصہ اوّل آپ کی خدمت میں حاضر ہے! اس کی طباعت واشاعت کے سلسلے میں انجمن خدام القرآن صوبہ سرحد کے صدر جناب ڈاکٹر اقبال صافی نے تاکید کا جو دباؤ مرکزی انجمن پر برقرار رکھا اور مالی تعاون بھی پیش کیا' اس کی بنا پر اس سے استفادہ کرنے والے ہر شخص پر اُن کا یہ حق ہے کہ اُن کے لیے دعائے خیر ضرور کرے۔

آخری بات یہ کہ اس ''بیان القرآن'' کے ضمن میں اگر اصحابِ علم میری غلطیوں کی نشاندہی کریں تو میں ممنون ہوں گا ـــــ اور آئندہ طباعت میں تصحیح بھی کر دی جائے گی۔ اس بات کو دہرانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ مَیں نہ مفسّر ہونے کا مدعی ہوں نہ عالم ہونے کا' بلکہ صرف اللہ کے کلامِ پاک اور اس کے دینِ متین کا ادنیٰ خادم ہوں۔ اور میری سب حضرات سے اِستدعا ہے کہ میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری مساعی کو شرفِ قبول عطا فرمائے اور نجاتِ اُخروی کا ذریعہ بنا دے۔ آمین! یاربّ العالمین!

(نوٹ: اس پوری بحث میں مَیں نے اقامتِ دین کی عملی جدّوجُہد کے لیے تنظیم اسلامی کے قیام کا ذکر نہیں کیا ـــــ اس لیے کہ یہ ایک مستقل اور جداگانہ باب ہے' اور اس مختصر 'تقدیم' میں نہ اس کی گنجائش ہے نہ ضرورت۔ تاہم اس کے لیے میری تالیفات ''تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' اور ''سلسلۂ اشاعت تنظیم اسلامی'' از اوّل تا دہم کا مطالعہ مفید ہوگا۔)

دعا کا طالب

۲۶/ نومبر ۲۰۰۸ء — خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

تقدیم طبع ثالث

''بیان القرآن'' (حصہ اوّل) کے پہلے دو ایڈیشن چند ہی ماہ میں (یعنی دیکھتے ہی دیکھتے!) ختم ہو گئے۔ اور یہ بات میرے لیے بہت حیرت انگیز ہے۔ اس لیے کہ مَیں اوّلاً تو مفسّرِ قرآن ہی نہیں ہوں' ثانیاً میرا کسی معروف مذہبی فرقے یا مسلک سے کوئی تنظیمی تعلق بھی نہیں ہے۔ ان امور کے علی الرغم اس کی اس قدر پذیرائی یقیناً اللہ تعالیٰ کی کسی خصوصی مشیت کی مظہر ہے ـــــ واللہ اعلم!!

قرآن حکیم کی اس ترجمانی میں اگر کوئی خیر وجود میں آیا ہے تو وہ سراسر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہے ـــــ اور خالصتاً اُس کی عطا و مرحمت کا نتیجہ ہے۔ اور اگر کسی مقام پر کوئی غلطی ہو گئی ہے تو وہ سراسر میرے علم یا فہم کا قصور ہے' جس کے لیے اللہ تعالیٰ سے بھی عفو و درگزر کا طلب گار ہوں ـــــ اور اہلِ علم حضرات سے بھی توقع رکھتا ہوں کہ اس پر خالصتاً فرمانِ نبویؐ ''اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ'' کے مطابق متنبہ فرما کر ثواب حاصل کریں گے ـــــ! اور ذاتی طور پر مَیں بھی ممنون ہوں گا!!

اس جلد میں ابھی صرف سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرۃ کی ترجمانی ہوئی ہے' گویا کہ ابھی پہاڑ ایسا بھاری کام باقی ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے توقع ہے کہ جیسے اُس نے' میرے کسی ارادے یا منصوبہ بندی کے بغیر اور میری خالص لاعلمی میں پیش نظر جلد شائع کرا دی' ویسے ہی باقی بھی شائع کرا دے گا' ـــــ خواہ خود میری اس دنیا سے دارِ آخرت کی جانب روانگی کے بعد ہی سہی ـــــ آخر میں دعا ہے: اَللّٰھُمَّ تقبّل منّی فانک خیرُ المُتقبِّلین وتُب عَلَیَّ فانک انت التوّابُ الرّحیم! آمین! یاربّ العالمین!!

۸/ اگست ۲۰۰۹ء — خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ


تعارفِ قُرآن

باب اوّل:	قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ	15
	(۱) قرآن: اللہ تعالیٰ کا کلام	15
	(۲) قرآن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول	22
	(۳) قرآن حکیم کی محفوظیت	26
باب دوم:	چند متفرق مباحث	29
	قرآن مجید کی زبان	29
	قرآن کے اسماء وصفات	31
	قرآن کا اسلوبِ کلام	34
باب سوم:	قرآن مجید کی ترکیب وتقسیم	37
باب چہارم:	تدوینِ قرآن	46
باب پنجم:	قرآن مجید کا موضوع	50
باب ششم:	فہم قرآن کے اصول	58
باب ہفتم:	اعجازِ قرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ	71
باب ہشتم:	قرآن مجید سے ہمارا تعلق	85
	قرآن ''حبل اللہ'' ہے!	85
	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	89

❁❁❁

باب اوّل

قرآن کے بارے میں ہمارا عقیدہ

تعارفِ قرآن مجید کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کے بارے میں ہمارا ایمان' یا اصطلاحِ عام میں ہمارا عقیدہ کیا ہے؟

قرآن حکیم کے متعلق اپنا عقیدہ ہم تین سادہ جملوں میں بیان کر سکتے ہیں:

۱) قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

۲) یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔

۳) یہ ہر اعتبار سے محفوظ ہے' اور کُل کا کُل مِن وعَن موجود ہے' اور اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔

یہ تین جملے ہمارے عقائد کی فہرست کے اعتبار سے' قرآن حکیم کے بارے میں ہمارے عقیدے پر کفایت کریں گے۔ لیکن انہی تین جملوں کے بارے میں اگر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے اور دقتِ نظر سے ان پر غور کیا جائے تو کچھ علمی حقائق سامنے آتے ہیں۔ تمہیدی گفتگو میں ان میں سے بعض کی طرف اجمالاً اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) قرآن: اللہ تعالیٰ کا کلام

سب سے پہلی بات کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ چنانچہ سورۃ التوبہ کی آیت ۶ میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا:

﴿وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ؕ﴾

''اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے' پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دو۔''

جب سورۃ التوبہ کی پہلی چھ آیات نازل ہوئیں' جن میں مشرکینِ عرب کو آخری الٹی میٹم دے دیا گیا کہ اگر تم ایمان نہ لائے تو چار ماہ کی مدت کے خاتمے کے بعد تمہارا قتلِ عام شروع ہو جائے گا' تو اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کو ایک ہدایت یہ بھی دی گئی کہ یہ اُلٹی میٹم دیے جانے کے بعد اگر مشرکین میں سے کوئی آپؐ کی پناہ طلب کرے تو وہ آپؐ کے پاس آ کر مقیم ہو اور کلام اللہ کو سنے' جس پر ایمان لانے کی دعوت دی جا رہی ہے' پھر اسے اس کی امن کی جگہ تک پہنچا دیا جائے۔ یعنی ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہیں اس سے مطالبہ کیا جائے کہ فیصلہ کرو کہ آیا تم ایمان لاتے ہو یا نہیں۔ اس وقت میں نے اس آیت کا حوالہ صرف ''کلام اللہ'' کے الفاظ کے لیے شہادت کے طور پر دیا ہے۔

کلامِ الٰہی: جملہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر

قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے میں ہی اس کی اصل عظمت کا راز مضمر ہے۔ اس لیے کہ کلام متکلّم کی صفت ہوتا ہے اور اس میں متکلّم کی پوری شخصیت ہویدا ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ کسی بھی شخص کا کلام سن کر اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے علم اور فہم و شعور کی سطح کیا ہے۔ آیا وہ تعلیم یافتہ انسان ہے' مہذّب ہے' متمدّن ہے یا کوئی اجڈ یا گنوار ہے۔ اس اعتبار سے درحقیقت یہ کلام اللہ' اللہ تعالیٰ کی جملہ صفات کا مظہر ہے' اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے نہایت خوبصورت انداز میں بیان کیا: ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست' چیزے دیگر است
مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں!
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

(جو بات میرے دل میں چھپی ہوئی ہے وہ میں صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ یہ (قرآن حکیم) کتاب نہیں ہے' کوئی اور ہی شے ہے۔ چنانچہ یہ حق تعالیٰ کی ذات کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی ہے۔ نیز یہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا بھی ہے اور یہ کلام بھی کرتا ہے۔)

مختلف مفاہیم و معانی کے لیے اس شعر کا حوالہ دے دیا جاتا ہے' لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس میں اس کے ''چیزے دیگر'' ہونے کا کون سا پہلو اُجاگر کیا جا رہا ہے۔ اس میں درحقیقت سورۃ الحدید کے اس مقام کی طرف اشارہ ہو گیا ہے کہ: ﴿هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ﴾ (آیت ۳) یعنی اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ الاوّل بھی ہے اور الآخر بھی' وہ الظاھر بھی ہے اور الباطن بھی۔ اسی طرح علامہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کی بھی یہی شان ہے۔ نیز جس طرح اللہ تعالیٰ کی صفت الحیّ القیّوم (آیت الکرسی' سورۃ البقرۃ) ہے اسی طرح یہ کلام بھی زندہ و پائندہ ہے' ہمیشہ رہنے والا ہے۔ پھر یہ صرف کلام نہیں' خود متکلّم ہے۔

یہاں کلام اور متکلّم کے مابین فرق کے حوالے سے متکلّمین کی اس بحث کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ذاتِ حق کی صفات' ذات سے علیحدہ اور مستزاد ہیں یا عین ذات؟ علامہ اقبال نے بھی اپنی مشہور نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں اس بحث کا ذکر کیا ہے ؎

ہیں صفاتِ ذاتِ حق' حق سے جُدا یا عینِ ذات؟
اُمّتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

یہ علمِ کلام کا ایک نہایت ہی پیچیدہ' غامض اور عمیق مسئلہ ہے' جس پر بڑی بحثیں ہوئیں اور بالآخر متکلّمین کا اس پر تقریباً اجماع ہوا کہ '' لَا عَیْنٌ وَلَا غَیْرٌ '' یعنی اللہ کی صفات کو نہ اس کی ذات کا عین قرار دیا جا سکتا ہے نہ اس کا غیر۔ اگر اس حوالے سے غور کریں تو قرآن حکیم بھی' جو اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' اسی کے ذیل میں آئے گا' یعنی نہ اسے اللہ کا غیر کہا جا سکتا ہے نہ اس کا عین۔ چنانچہ اس حوالے سے سورۃ الحشر کی آیت ۲۱ قرآن مجید کی فی نفسہٖ عظمت کے ضمن میں اہم ترین ہے:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا

لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢١﴾

''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اُتار دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی خشیت اور خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا' اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔''

اس تمثیل کو سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طلبی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر حاضر ہونے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہ وہی طلبی تھی جس میں آپ علیہ السلام کو توراۃ عطا کی گئی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مخاطبہ و مکالمہ سے سرفراز فرمایا تو ان کی آتشِ شوق کچھ اور بھڑکی اور انہوں نے فرمائش کرتے ہوئے کہا: ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ﴾ ''اے پروردگار! مجھے اپنا دیدار عطا فرما''۔ مخاطبہ و مکالمہ کے شرف سے تو نے مجھے مشرف فرمایا ہے' اب ذرا مزید کرم فرما۔ اس پر جواب ملا: ﴿لَنْ تَرٰىنِيْ﴾ ''(موسیٰ) تم مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتے!'' ﴿وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ﴾ ''لیکن ذرا اس پہاڑ کی طرف دیکھو' میں اس پر اپنی ایک تجلّی ڈالوں گا۔ ﴿فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِيْ ۚ﴾ چنانچہ اگر وہ پہاڑ اپنی جگہ پر قائم رہ جائے تو پھر تم بھی گمان کر لینا کہ تم مجھے دیکھ سکو گے''۔ ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۚ﴾ ''پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس پہاڑ پر اپنی تجلّی ڈالی تو وہ ''دَکًّا دَکًّا'' ہو گیا اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔''

یہاں ''دَکًّا'' کے دونوں ترجمے کیے جا سکتے ہیں' یعنی ریزہ ریزہ ہو جانا' ٹوٹ پھوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا' یا کوٹ کوٹ کر کسی شے کو ہموار کر دینا' برابر کر دینا۔ جیسے سورۃ الفجر کی آیت ﴿كَلَّآ اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾﴾ میں ان معنوں میں وارد ہوا ہے۔ وہی لفظ یہاں پہاڑ کے بارے میں آیا ہے۔ یعنی وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا یا دب گیا' زمین کے ساتھ بیٹھ گیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی یہ تجلّی دیکھی جو بالواسطہ تھی' یعنی براہِ راست حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نہیں بلکہ پہاڑ پر تھی اور حضرت موسیٰؑ بالواسطہ اس کا نظارہ کر رہے تھے' لیکن خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کیفیت یہ ہوئی کہ ﴿خَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا﴾ ''حضرت موسیٰ (علیہ السلام) بے ہوش ہو کر گر پڑے۔''

یہاں ذات و صفاتِ باری تعالیٰ کی بحث کا ایک عُقدہ حل ہو جاتا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی تجلّی پہاڑ پر ڈالی تو وہ پہاڑ دب گیا یا پھٹ گیا' ریزہ ریزہ ہو گیا' اسی طرح قرآن مجید کے متعلق فرمایا:

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰي جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ﴾

یعنی کلام اللہ کی بھی وہی کیفیت اور تاثیر ہے جو کیفیت و تاثیر تجلّیٔ ذاتِ الٰہی کی ہے' اس لیے کہ قرآن اللہ کا کلام اور اللہ کی صفت ہے۔ تو تجلّیٔ صفات اور تجلّیٔ ذات میں کوئی فرق نہیں۔

البتہ علامہ اقبال نے ایک جگہ اس بارے میں ذرا مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے۔ علامہ نے حضور ﷺ کی مدح فرماتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے: ؎

موسیٰ ز ہوش رفت بیک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری و تبسمی!

علامہ حضرت محمد ﷺ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقابل کر رہے ہیں کہ وہ تو تجلّیٔ صفات کے بالواسطہ نظارے ہی سے بے ہوش ہو کر گر گئے' لیکن اے نبی ﷺ! آپ نے عینِ ذات کا دیدار کیا اور تبسم کی کیفیت میں کیا۔ اس میں دو اعتبارات سے مغالطہ پایا

جاتا ہے۔ اوّل تو وہ تجلّی، تجلّیٔ صفات نہیں تجلّیٔ ذات تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر ڈالی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ﴾ گویا یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے کہ وہ خود متجلی ہوا۔ دوسرے یہ کہ یہ خیال بھی مختلف فیہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں ذاتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا۔ اگرچہ ہمارے اسلاف میں یہ رائے بھی ہے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا ہے، لیکن اکثر و بیشتر کی رائے اس کے برعکس ہے، اس لیے کہ وہاں بھی ''آیات'' کا ذکر ہے۔ جیسا کہ سورۃ النجم میں آیا: ﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾﴾ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آیات، جو وہاں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھیں، اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین آیات میں سے ہیں۔

﴿اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾﴾

''اُس وقت بیری پر چھا رہا تھا جو کچھ کہ چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ چندھیائی اور نہ حد سے متجاوز ہوئی۔ اور اُس نے اپنے ربّ کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔''

اب اُس سے زیادہ بڑی آیات اور اس سے زیادہ بڑی تجلّیٔ الٰہی اور کہاں ہوگی؟ لیکن دونوں اعتبار سے اس شعر میں مبالغہ ہے۔ البتہ اس آیۂ مبارکہ کے حوالے سے علامہ کے اس شعر ؎

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں!
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں!

میں میرے نزدیک قطعاً کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اور اس آیت مبارکہ کے حوالے سے وہ بات کہی جا سکتی ہے جو علامہ اقبال نے اس شعر میں کہی ہے۔

تورات کی گواہی

اب ذرا قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے کے حوالے سے ایک اور بات ذہن نشین کر لیجیے۔ تورات میں کتابِ استثناء یا سفرِ استثناء جو صُحفِ موسیٰ میں سے ایک صحیفہ ہے، کے اٹھارہویں باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جو پیشین گوئی بیان کی گئی ہے اس میں الفاظ یہی ہیں کہ:

''میں ان کے بھائیوں میں سے ان کے لیے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اس کے مُنہ میں اپنا کلام ڈالوں گا اور وہ اُن سے وہی کچھ کہے گا جو میں اس سے کہوں گا۔''

مَیں نے یہاں خاص طور پر ان الفاظ کا حوالہ دیا ہے کہ ''میں اُس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا''۔ یہاں ایک تو لفظ کلام آیا ہے جیسے کہ قرآن حکیم کی اس آیت میں آیا: ﴿حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾۔ پھر ''کلام منہ میں ڈالنا'' کے حوالے سے قرآن مجید میں ایک لفظ دو مرتبہ آیا ہے، وہ لفظ ''قول'' ہے، یعنی قرآن کو قول قرار دیا گیا ہے۔

سورۃ الحاقہ میں ہے:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۴۰﴾ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾﴾

اور سورۃ التکویر میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿١٩﴾ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿٢٠﴾ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ﴿٢١﴾ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿٢٢﴾﴾

اور اسی سورۃ میں آگے چل کر آیا:

﴿وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿٢٥﴾﴾

قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ان دو مقامات میں سے مؤخر الذکر کے متعلق تقریباً اجماع ہے کہ یہاں حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ گویا قرآن کو اُن کا قول قرار دیا گیا اور سورۃ الحاقہ میں اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول قرار دیا جا رہا ہے۔ اب ظاہر ہے یہاں جن چیزوں کی نفی کی جا رہی ہے کہ ''یہ کسی شاعر کا قول نہیں'' اور ''یہ کسی کاہن کا قول نہیں'' ان سے یقیناً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اللہ کا کلام پہلے حضرت جبرائیل علیہ السلام پر نازل ہوا۔ اگر میں کتاب استثناء کے الفاظ استعمال کروں تو یہاں ''اللہ نے اپنا کلام ان کے منہ میں ڈالا''۔ تاہم ''اُن کے منہ'' کا ہم کوئی تصور نہیں کر سکتے' وہ نہایت جلیل القدر فرشتے ہیں۔ بہرحال قول کا لفظ قرآن مجید کے لیے استعمال ہوا ہے جس سے ظاہر ہے کہ ابتداءً کلامِ الٰہی حضرت جبرائیلؑ کے قول کی شکل میں اُترا اور پھر حضرت جبرائیلؑ کے ذریعے سے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ میں ڈالا گیا' اور وہاں سے یہ قولِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں لوگوں کے سامنے آیا' اس لیے کہ یہ آپؐ ہی کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا' لوگوں نے اُسے صرف آپؐ ہی کی زبانِ مبارک سے سنا۔ گویا یہ قول' قولِ شاعر نہیں' یہ قولِ کاہن نہیں' یہ قولِ شیطان رجیم نہیں' بلکہ یہ قولِ رسولِ کریم ہے اور رسولِ کریم اوّلاً محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں' یہ لوگوں کے سامنے ان کے قول کی حیثیت سے آیا۔ پھر ثانیاً یہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کا قول ہے' اس لیے کہ انہوں نے یہ قول حضورؐ کو پہنچایا۔ اور اس کو آخری درجے تک پہنچانے پر یہ اللہ کا کلام ہے جس کے متعلق تورات میں الفاظ آئے کہ ''میں اس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا۔''

لوحِ محفوظ اور مصحف میں مطابقت

کلام ہونے کے حوالے سے تیسری بات یہ نوٹ کیجئے کہ کلام اللہ کی صفت ہے اور اللہ کی صفات قدیم ہیں۔ اللہ کی ذات کی طرح اس کی صفات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ مادیت اور جسمانیت سے ماوراء ہے۔ یہی معاملہ اللہ کی صفات کا بھی ہے۔ چنانچہ کلام اللہ' جسے حرف وصوت کی محدودیت سے اعلیٰ وارفع خیال کیا جاتا ہے' اسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے حروف واصوات کا جامہ پہنایا اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ مبارک پر بطریقِ تنزیل نازل فرمایا۔ یہی کلام لوحِ محفوظ میں اللہ کے پاس مندرج ہے جسے اُمّ الکتاب یا کتابِ مکنون بھی کہا گیا ہے۔ ہمارے پاس موجود قرآن مجید یا مصحف کی عبارت بعینہٖ وہی ہے جو لوحِ محفوظ یا اُمّ الکتاب میں ہے' بالکل اسی طرح جیسے کسی دستاویز کی مصدقہ نقل ہو' جو بغیر کسی شوشے کے فرق کے اصل کے مطابق ہو۔ چنانچہ سورۃ البروج میں فرمایا:

﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿٢١﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿٢٢﴾﴾

''یہ قرآن نہایت بزرگ وبرتر ہے اور یہ لوحِ محفوظ میں ہے۔''

اسی کے متعلق سورۃ الواقعہ میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿٧٧﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿٧٨﴾ لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿٧٩﴾﴾

''یہ تو ایک کتاب ہے بڑی کریم' بہت باعزت' اور ایک ایسی کتاب ہے جو چھپی ہوئی ہے۔ جسے چھو ہی نہیں سکتے مگر وہی جو بہت ہی پاک کر دیے گئے ہیں۔''

یعنی ملائکہ مقربین' جن کے بارے میں ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

﴿فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ﴿١٣﴾ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ﴿١٤﴾ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ﴿١٥﴾ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ﴿١٦﴾﴾ (عبس)

''یہ ایسے صحیفوں میں درج ہے جو مکرم ہیں' بلند مرتبہ ہیں' پاکیزہ ہیں' معزز اور نیک کاتبوں کے ہاتھوں میں رہتے ہیں۔''

درحقیقت یہ کتابِ مکنون ان فرشتوں کے پاس ہے' وہ تمہاری رسائی سے بعید و ماوراء ہے۔

یہی بات سورۃ الزخرف میں کہی گئی ہے:

﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿٤﴾﴾

''یہ تو درحقیقت اصل کتاب میں ہمارے پاس محفوظ ہے' بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز۔''

اُمّ کا لفظ جڑ اور بنیاد کے لیے آتا ہے۔ اسی لیے ماں کے لیے بھی عربی میں لفظ ''اُمّ'' استعمال ہوتا ہے' کیونکہ اسی کے بطن سے اولاد کی ولادت ہوتی ہے' وہ گویا بمنزلہ اساس ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی اصل اساس لوحِ محفوظ میں ہے' کتابِ مکنون میں ہے۔ مزید وضاحت کر دی گئی کہ ''لَدَيْنَا'' یعنی وہ اُمّ الکتاب جو ہمارے پاس ہے' اس میں یہ قرآن درج ہے۔ ''لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ'' اس قرآن کی صفات یہ ہیں کہ وہ بہت بلند و بالا اور حکمت والا ہے' مستحکم ہے۔ وہ اللہ کا کلام اور نہایت محفوظ کتاب ہے۔ اسے لوحِ محفوظ کہیں' کتابِ مکنون کہیں' یا اُمّ الکتاب کہیں' اصل کلام وہاں ہے — اُسی عالمِ غیب میں' اُسی عالمِ امر میں — جسے سوائے اُن پاک باز فرشتوں کے جن کی رسائی لوحِ محفوظ تک ہو' کوئی مَس نہیں کر سکتا' یعنی اس لوحِ محفوظ کے مضامین پر مطلع نہیں ہو سکتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ پر اپنے اس کلام کی تنزیل فرمائی اور اس کی عبارت کو تا قیامِ قیامت مصاحف میں محفوظ فرما دیا اور ناپاک ہاتھوں سے چھونے سے منع فرما دیا۔

کلامِ الٰہی کی تین صورتیں

جب میں نے عرض کیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان سے کس طرح ہم کلام ہوتا ہے! قرآن مجید میں اس کی تین شکلیں بیان ہوئی ہیں:

﴿وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿٥١﴾﴾ (الشوریٰ)

''کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے رُوبرو بات کرے۔ اس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے' یا پردے کے پیچھے سے' یا پھر وہ کوئی پیغامبر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔ یقیناً وہ برتر اور صاحبِ حکمت ہے۔''

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کے لیے یہ ممکن نہیں ہے' اللہ تو ہر شے پر قادر ہے' وہ جو چاہے کر سکتا ہے' اللہ کی قدرت سے کوئی چیز بعید نہیں ہے' بلکہ کہا کہ انسان کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہِ راست کلام کرے' کسی بشر کا یہ مرتبہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے' سوائے تین صورتوں کے' یا تو وحی یعنی مخفی اشارے کے ذریعے سے' یا پردے کے پیچھے سے یا وہ کسی

رسول (رسولِ ملک) کو بھیجتا ہے جو وحی کرتا ہے اللہ کے حکم سے جو اللہ چاہتا ہے۔

اب کلامِ الٰہی کی مذکورہ تین شکلیں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان میں سے دو کے لیے لفظ وحی آیا ہے۔ درمیان میں ایک شکل ''مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' بیان ہوئی ہے۔ اس کا تذکرہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۳ کے ذیل میں ہو چکا ہے۔ اور یہ تو امرِ واقعہ ہے ہی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر اس صورت میں کلام فرمایا۔

پہلی مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے تو وہاں مخاطبہ ہوا۔ یہ مخاطبہ اور مکالمۂ الٰہی حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ''مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' ہوا تھا' اسی لیے تو وہ آتشِ شوق بھڑکی تھی کہ ؎

کیا قیامت ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں 'سامنے آتے بھی نہیں!

ظاہر ہے کہ جب ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے تو ایک قدم اور باقی ہے کہ مجھے دیدار بھی عطا ہو جائے' لیکن یہ مخاطبہ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی مخاطبہ شبِ معراج میں پردے کے پیچھے سے ہوا۔ بعض حضرات کی رائے ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ (یعنی ذاتِ الٰہی) کا دیدار حاصل ہوا' لیکن میری رائے سلف میں سے ان حضرات کے ساتھ ہے جو اس کے قائل نہیں ہیں۔ ان میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بڑی اہمیت کی حامل ہیں' انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے لازماً ان چیزوں کے بارے میں استفسار کیا ہوگا' چنانچہ ان کی بات کے متعلق تو ہم یقین کے درجے میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ ''نُوْرٌ اَنّٰی یُرٰی؟'' یعنی اللہ تو نور ہے' اسے کیسے دیکھا جا سکتا ہے؟ (مسلم' کتاب الایمان' عن ابی ذر رضی اللہ عنہ) نور تو دوسری چیزوں کو دیکھنے کا ذریعہ بنتا ہے' نور خود کیسے دیکھا جا سکتا ہے! بہرحال میری رائے ہے کہ یہ گفتگو بھی مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ تھی۔ وہ وراءِ حجاب گفتگو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر مکالمہ و مخاطبہ میں نصیب ہوئی' اسی وراءِ حجاب ملاقات اور گفتگو سے اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں ''عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى'' مشرف فرمایا۔

البتہ وحی براہِ راست بھی ہے' یعنی بغیر فرشتے کے واسطے کے۔ دوسری قسم کی وحی فرشتے کے ذریعے سے ہے اور قرآن مجید سے جس بات کی طرف زیادہ راہنمائی ملتی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن وحی ہے بواسطہ ''ملک''۔ جیسے قرآن مجید میں ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ ...﴾ (الشعراء:۱۹۴) ''اسے لے کر آپ کے دل پر روحِ امین اُترا ہے.....'' اور: ﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ (البقرۃ:۹۷) ''پس اسے جبریل نے ہی آپ کے قلب پر نازل کیا ہے''۔ البتہ فرشتے کے بغیر وحی' یعنی دل میں کسی بات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست ڈال دیا جانا' یعنی ''الہام'' کا ذکر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہے اور اس کے لیے حدیث میں ''نَفَثَ فِی الرَّوْع'' کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ یعنی کسی نے دل میں کوئی بات ڈال دی' کسی نے پھونک مار دی بغیر اس کے کہ کوئی آواز سننے میں آئی ہو۔ ایک کیفیت صلصلۃ الجرس کی بھی تھی۔ حضورؐ کو گھنٹیوں کی سی آواز آتی تھی اور اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر وحی نازل ہو جاتی تھی۔

بہرحال تیقّن کے ساتھ تو میں نہیں کہہ سکتا' لیکن میرا گمانِ غالب ہے کہ دوسری قسم کی وحی (بذریعۂ فرشتہ) پر پورے کا پورا قرآن مشتمل ہے۔ اور وحی براہِ راست یعنی ''القاء'' تو درحقیقت وحی خفی ہے' جس کی وضاحت انگریزی کے دو الفاظ کے درمیان فرق سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ ایک لفظ ہے inspiration اور دوسرا revelation' جس کے ساتھ ایک اور لفظ verbal

revelation بھی اہم ہے۔ inspiration میں ایک مفہوم' ایک خیال یا تصور انسان کے ذہن وقلب میں آ جاتا ہے' جب کہ revelation باقاعدہ کسی چیز کے کسی پر reveal کیے جانے کو کہتے ہیں اور اس میں بھی عیسائیوں کے ہاں ایک بڑی بحث چل رہی ہے۔ وہ revelation کو مانتے ہیں' لیکن verbal revelation کو نہیں مانتے' بلکہ ان کے نزدیک صرف مفہوم ہی انبیاء کے قلوب پر نازل کیا جاتا تھا' جسے وہ اپنے الفاظ میں ادا کرتے تھے۔ جبکہ ہمارے ہاں اس بارے میں مستقل اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ یہ لفظاً بھی وحی ہے اور معناً بھی' لفظاً بھی اللہ کا کلام ہے اور معناً بھی' یعنی یہ verbal revelation ہے۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ لاہور ہی میں غالباً ایف سی کالج کے پرنسپل اور علامہ اقبال کے درمیان پیش آیا تھا۔ وہ دونوں کسی دعوت میں اکٹھے تھے کہ ان صاحب نے حضرتِ علامہ سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ بھی verbal revelation کے قائل ہیں! اس پر علامہ نے اُس وقت جو جواب دیا وہ اُن کی ذہانت پر دلالت کرتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جی ہاں' میں verbal revelation کو نہ صرف مانتا ہوں' بلکہ مجھے تو اس کا ذاتی تجربہ حاصل ہے۔ چنانچہ خود مجھ پر جب شعر نازل ہوتے ہیں تو وہ الفاظ کے جامے میں ڈھلے ہوئے آتے ہیں' میں کوئی لفظ بدلنا چاہوں تو بھی نہیں بدل سکتا' معلوم ہوتا ہے کہ وہ میری اپنی تخلیق نہیں ہیں بلکہ مجھ پر نازل کیے جاتے ہیں۔ تو یہ درحقیقت کسی کو جواب دینے کا وہ انداز ہے جس کو عربی میں "الاجوبة المسكتة" یعنی چپ کرا دینے والا جواب کہا جاتا ہے۔ یہ وہ جواب ہے جس کے بعد فریق ثانی کے لیے کسی قیل وقال کا موقع ہی نہیں رہتا۔

بہرحال کلام الٰہی واقعتاً verbal revelation ہے جس نے اوّلاً قولِ جبرائیل کی شکل اختیار کی۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے قول کی شکل میں نازل ہوا اور پھر زبانِ محمدیؐ سے قولِ محمدیؐ کی شکل میں ادا ہوا۔ تو یہ درحقیقت revelation ہے' inspiration نہیں' اور محض revelation بھی نہیں بلکہ verbal revelation ہے' یعنی معانی' مفہوم اور الفاظ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں اور یہ بحیثیت مجموعی اللہ کا کلام ہے۔

(۲) قرآن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزول

قرآن مجید کے محمد رسول اللہ ﷺ پر نزول کے ضمن میں بھی چند باتیں نوٹ کر لیں۔ پہلی بحث تو ''نزول'' کی لغوی بحث سے متعلق ہے۔ یہ لفظ نَزَلَ' یَنْزِلُ ثلاثی مجرد میں بھی آتا ہے۔ تب یہ فعل لازم ہوتا ہے' یعنی ''خود اُترنا''۔ قرآن مجید کے لیے ان معنوں میں یہ لفظ قرآن میں متعدد بار آیا ہے۔ مثلاً: ﴿وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ﴾ (بنی اسرائیل:۱۰۵) ''ہم نے اس قرآن کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور یہ حق کے ساتھ نازل ہوا ہے''۔ یہاں یہ فعل لازم آ رہا ہے' یعنی نازل ہوا۔ عام طور پر فعل لازم کو متعدی بنانے کے لیے اس فعل کے ساتھ کسی صلہ (preposition) کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ یہ فعل نَزَلَ ''بِ'' کے ساتھ متعدی ہو کر بھی قرآن مجید میں آیا ہے' بمعنیٰ اُس نے اتارا' جیسے جَاءَ ''وہ آیا'' سے جَاءَ بِهٖ ''وہ لایا''۔ مثلاً: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ ...﴾ (الشعراء) یعنی رُوح الامین (جبرائیل) نے اس قرآن کو اُتارا ہے محمد ﷺ کے قلبِ مبارک پر۔

نزولِ قرآن کی دو کیفیتیں: اِنزال اور تنزیل

ثلاثی مزید فیہ کے دو ابواب یعنی بابِ افعال اور بابِ تفعیل سے یہ لفظ قرآن مجید میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ دونوں ابواب سے یہ فعل متعدی کے طور پر بمعنیٰ ''اتارنا'' استعمال ہوتا ہے' یعنی اَنْزَلَ' یُنْزِلُ' اِنْزَالًا اور نَزَّلَ' یُنَزِّلُ' تَنْزِیْلًا۔ ان دونوں کے مابین فرق یہ ہے کہ بابِ افعال میں کوئی فعل دفعۃً اور یک دم کر دینے کے معنی ہوتے ہیں جبکہ بابِ تفعیل میں وہی فعل تدریجاً' اہتمام' توجہ اور محنت کے ساتھ کرنے کے معنی ہوتے ہیں۔ ان دونوں کے مابین فرق کو ''اِعلام'' اور ''تعلیم'' کے معنی کے فرق کے حوالے سے بہت ہی نمایاں طور پر اور جامعیت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ ''اِعلام'' کے معنی ہیں بتا دینا۔ یعنی آپ نے کوئی چیز پوچھی تو جواب دے دیا گیا۔ چنانچہ ''Information Office'' کو عربی میں ''مکتب الاعلام'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ ''تعلیم'' کے معنی ذہن نشین کرانا اور تھوڑا تھوڑا کر کے بتانا ہے۔ یعنی پہلے ایک بات سمجھا دینا' پھر دوسری بات اس کے بعد بتانا اور اس طرح درجہ بدرجہ مخاطب کے فہم کی سطح بلند سے بلند تر کرنا۔

اگرچہ قرآن مجید کے لیے لفظ ''اِنْزَال'' اور اس سے مشتق مختلف الفاظ استعمال ہوئے ہیں' لیکن بکثرت لفظ ''تنزیل'' استعمال ہوا ہے۔ قرآن مجید کی اصل شان تنزیلی شان ہے' یعنی یہ کہ اس کو تدریجاً' رفتہ رفتہ' تھوڑا تھوڑا اور نجماً نجماً نازل کیا گیا۔ چنانچہ قرآن مجید کے حضور ﷺ پر نزول کے لیے صحیح تر اور زیادہ مستعمل لفظ قرآن حکیم میں تنزیل ہے' تاہم دو مقامات پر لَیْلَۃُ الْقَدْرِ اور لَیْلَۃٌ مُّبٰرَکَۃٌ کے ساتھ انزال کا لفظ آیا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃِ الْقَدْرِ ①﴾ (القدر) اور: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ﴾ (الدخان:۳) اسی طرح ﴿شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ﴾ (البقرۃ:۱۸۵) میں بھی لفظ ''انزال'' استعمال ہوا ہے۔ پھر حضور ﷺ پر نزول کے لیے بھی کہیں کہیں لفظ ''انزال'' آیا ہے' اگرچہ اکثر و بیشتر لفظ ''تنزیل'' ہی آیا ہے۔ اس کی تقریباً مجمع علیہ تاویل یہ ہے کہ پورا قرآن دفعۃً لوحِ محفوظ سے سمائے دنیا تک لیلۃ القدر میں نازل کر دیا گیا' جسے ''لیلۂ مبارکہ'' بھی کہا گیا ہے جو کہ رمضان المبارک کی ایک رات ہے۔ لہٰذا جب رمضان المبارک کی لیلۃ القدر یا لیلۂ مبارکہ میں قرآن کے نزول کا ذکر ہوا تو لفظ انزال استعمال ہوا۔ قرآن مجید سمائے دنیا پر ایک ہی بار مکمل طور پر نازل ہونے کے بعد وہاں سے تدریجاً اور تھوڑا تھوڑا کر کے محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ لہٰذا حضور ﷺ پر نزول کے لیے اکثر و بیشتر لفظ تنزیل استعمال ہوا ہے۔

لفظ تنزیل کے ضمن میں سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ نہایت اہم ہے۔ ارشاد ہوا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾

''اے ایمان والو! ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اُس کتاب پر بھی جو اُس نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمائی اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے پہلے نازل کی۔''

توراۃ تختیوں پر لکھی ہوئی' مکتوب شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ وہ چونکہ دفعۃً اور جملۃً واحدۃً دے دی گئی' اس لیے اِس کے لیے لفظ اِنزال آیا ہے' جبکہ قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے بائیس تیئیس برس میں نازل ہوا' لہٰذا اسی کے ضمن میں لفظ ''نَزَّلَ'' استعمال ہوا۔ چنانچہ متذکرہ بالا آیت میں ''تنزیل'' اور ''انزال'' ایک دوسرے کے بالکل مقابلے میں آئے ہیں۔

گویا یہاں "تُعْرَفُ الْاَشْیَاءُ بِاَضْدَادِھَا" (چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں) کا اصول درست بیٹھتا ہے۔

حکمتِ تنزیل

اب ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ تنزیل کی حکمت کیا ہے؟ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے کیوں نازل کیا گیا اور ایک ہی بار کیوں نہ نازل کر دیا گیا؟ قرآن مجید میں اس کی دو حکمتیں بیان ہوئی ہیں۔

ایک تو یہ کہ لوگ شاید اس کا تحمل نہ کر سکتے۔ چنانچہ لوگوں کے تحمل کی خاطر تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا تا کہ وہ اس کو اچھی طرح سمجھیں' اس پر غور کریں اور اسے حرزِ جان بنائیں اور اسی کے مطابق ان کے ذہن وفکر کی سطح بلند ہو۔ یہ حکمت سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۱۰۶ میں بیان کی گئی ہے:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝﴾

"اور ہم نے قرآن کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں منقسم کر دیا تا کہ آپ تھوڑا تھوڑا کر کے اور وقفہ وقفہ سے لوگوں کو سناتے رہیں اور ہم نے اسے بتدریج اتارا۔"

اس حکمت کو سمجھنے کے لیے بارش کی مثال ملاحظہ کیجئے۔ بارش اگر ایک دم بہت موسلا دھار ہو تو اس میں وہ برکات نہیں ہوتیں جو تھوڑی تھوڑی اور تدریجاً ہونے والی بارش میں ہوتی ہیں۔ بارش اگر تدریجاً ہو تو زمین کے اندر جذب ہوتی چلی جائے گی' لیکن اگر موسلا دھار بارش ہو رہی ہو تو اس کا اکثر و بیشتر حصہ بہتا چلا جائے گا۔ یہی معاملہ قرآن مجید کے انزال و تنزیل کا ہے۔ اس میں لوگوں کی مصلحت ہے کہ قرآن ان کے فہم میں' ان کے باطن میں' ان کی شخصیتوں میں تدریجاً سرایت کرتا چلا جائے۔ سرایت کے حوالے سے مجھے پھر علامہ اقبال کا شعر یاد آیا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

"(یہ قرآن) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے' اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے!"

تو جب یہ قرآن کسی کے اندر اس طرح اتر جاتا ہے جیسے بارش کا پانی زمین میں جذب ہوتا ہے تو اس کی شخصیت میں سرایت کر جاتا ہے اور اس کے سرایت کرنے کے لیے اس کا تدریجاً تھوڑا تھوڑا نازل کیا جانا ہی حکمت پر مبنی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات سورۃ الفرقان میں کہی گئی ہے' اس لیے کہ وہاں کفارِ مکہ بالخصوص سردارانِ قریش کا باقاعدہ ایک اعتراض نقل ہوا ہے۔ فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝ وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ۝﴾

"منکرین کہتے ہیں: اس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا؟ — ہاں' ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو ہم اچھی طرح آپ (ﷺ) کے ذہن نشین کرتے رہیں اور اس کو ہم نے بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے کہ) جب کبھی وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے' اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے آپ کو دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی۔"

اعتراض یہ تھا کہ یہ پورا قرآن یک دم' یک بارگی کیوں نہیں نازل کر دیا گیا؟ اس اعتراض میں جو وزن تھا' پہلے اس کو سمجھ لیجیے۔ انہوں نے جو بات کی درحقیقت اس سے مراد یہ تھی کہ جیسے ہمارا ایک شاعر دفعۃً پورا دیوان لوگوں کو فراہم نہیں کر دیتا' بلکہ وہ ایک غزل کہتا ہے' قصیدہ کہتا ہے' پھر مزید محنت کرتا ہے' پھر کچھ اور طبع آزمائی کرتا ہے' پھر کچھ اور کہتا ہے' اس طرح تدریجاً دیوان بن جاتا ہے' اسی طریقے سے محمد (ﷺ) کر رہے ہیں۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو پورے کا پورا ایک دم نازل ہو سکتا تھا۔ یہ تو درحقیقت انسان کی کیفیت ہے کہ پوری کتاب دفعۃً produce نہیں کر دیتا۔ پورا دیوان تو کسی شاعر نے ایک دن کے اندر نہیں کہا بلکہ اسے وقت لگتا ہے' وہ مسلسل محنت کرتا ہے' کچھ تکلف بھی کرتا ہے' کبھی آمد بھی ہو جاتی ہے' لیکن وہ کلام دیوان کی شکل میں تدریجاً مدوّن ہوتا ہے۔ تو یہ تو اسی طرح کی چیز ہے۔ ﴿لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ﴾ ''کیوں نہیں یہ قرآن اس پر یک دم نازل ہو گیا؟''

اب اس کا جواب دیا گیا: ﴿كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ ''یہ اس لیے کیا ہے تاکہ (اے نبی ﷺ!) ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو تثبیت (جماؤ) عطا کریں''۔ یعنی وہ بات جو عام انسانوں کی مصلحت میں ہے وہ خود محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی مصلحت پر مبنی ہے کہ آپ کے لیے بھی شاید قرآن مجید کا یک بارگی تحمل کرنا مشکل ہو جاتا۔ سورۃ الحشر کے آخری رکوع میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اگر ہم پورے کے پورے قرآن کو دفعۃً کسی پہاڑ پر نازل کر دیتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا''۔ (نوٹ کیجیے کہ یہاں لفظ ''انزال'' آیا ہے)۔ معلوم ہوا کہ قلبِ محمدیؐ کو جماؤ اور ٹھہراؤ عطا کرنے کے لیے اسے بتدریج نازل کیا گیا ہے: ﴿وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ ''اور ہم نے اس کو بغرضِ ترتیل تھوڑا تھوڑا کر کے اُتارا ہے''۔ ''رتل'' چھوٹے پیمانے کو' چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں۔

اگلی آیت میں جو ارشاد ہوا اس کے دونوں مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اے نبی ﷺ! جو اعتراض بھی یہ ہم پر کریں گے ہم اس کا بہترین جواب آپ کو عطا کر دیں گے۔ لیکن دوسرا مفہوم یہ بھی ہے کہ یہ ایک مسلسل کشاکش ہے جو آپؐ کے اور مشرکینِ عرب کے درمیان چل رہی ہے۔ آج وہ ایک بات کہتے ہیں' اگر اسی وقت اس کا جواب دیا جائے تو وہ درحقیقت آپؐ کی دعوت کے لیے موزوں ہے۔ اگر یہ سارے کا سارا کلامِ الٰہی ایک ہی مرتبہ نازل ہو جاتا تو حالات کے ساتھ اس کی مطابقت اور ان کی طرف سے پیش ہونے والے اعتراضات کا بروقت جواب نہ ہوتا اور اس کے اندر جو اثر انداز ہونے کی کیفیت ہے وہ حاصل نہ ہوتی۔ اس تدریج میں اپنی جگہ موزونیت ہے اور اس کی اپنی تاثیر ہے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید کو تدریجاً نازل کیا گیا۔

قرآن کریم کا زمانۂ نزول اور ارضِ نزول

رسول اللہ ﷺ پر قرآن کے نزول کے ضمن میں اب دو چھوٹی چھوٹی چیزیں اور نوٹ کر لیجیے۔ یہ صرف معلومات کے ضمن میں ہیں۔ اس کا زمانۂ نزول کیا ہے؟ ہم جس حساب (سن عیسوی) سے بات کرنے کے عادی ہیں' اسی حساب سے ہمارے ذہن کا صُغریٰ کُبریٰ بنا ہوا ہے۔ اس اعتبار سے نوٹ کر لیجیے کہ قرآن حکیم کا زمانۂ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء تک ۲۲ برس پر مشتمل ہے۔ قمری حساب سے یہ ۲۳ برس بنیں گے۔ ۴۰ عام الفیل سے شروع کریں تو ۱۲ سال قبل ہجرت اور ۱۱ ہجری سال مل کر ۲۳ سال قمری بنیں گے' جن کے دوران یہ قرآن بطرزِ تنزیل تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ صحیح احادیث میں یہ شہادت موجود ہے کہ پہلے سورۃ العلق کی

پانچ آیات نازل ہوئیں' پھر تین سال کا وقفہ آیا۔ سورۃ العلق کی یہ پانچ آیات بھی چونکہ قرآن مجید کا حصہ ہیں' لہٰذا صحیح قول یہی ہے کہ قرآن حکیم کا زمانہ نزول ۲۳ قمری یا ۲۲ شمسی سال ہے۔

اب یہ کہ نزول کی جگہ کون سی ہے؟ اس ضمن میں صرف ایک لفظ نوٹ کر لیجیے کہ تقریباً پورے کا پورا قرآن ''حجاز'' میں نازل ہوا۔ اس لیے کہ آغازِ وحی کے بعد حضور اکرم ﷺ کا کوئی سفر حجاز سے باہر ثابت نہیں ہے۔ آغازِ وحی سے قبل آپؐ نے متعدد سفر کیے ہیں۔ آپؐ شام کا سفر کرتے تھے' یقیناً یمن بھی آپؐ جاتے ہوں گے۔ اس لیے کہ الفاظِ قرآنی ''رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ'' کی رو سے قریش کے سالانہ دو سفر ہوتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں شمال کی طرف جاتے تھے' اس لیے کہ فلسطین کا علاقہ نسبتاً ٹھنڈا ہے' اور سردیوں کے موسم میں وہ جنوب کی طرف (یمن) جاتے تھے' اس لیے کہ وہ گرم علاقہ ہے۔ تو حضور اکرم ﷺ نے بھی تجارتی سفر کیے ہیں۔ بعض محققین نے تو یہ امکان بھی ظاہر کیا ہے کہ آپؐ نے اُس زمانے میں کوئی بحری سفر بھی کیا اور گلف کو عبور کر کے مکران کے ساحل پر کسی جگہ آپؐ تشریف لائے۔ (واللہ اعلم!) یہ بات میں نے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے ایک لیکچر میں سنی تھی جو انہوں نے حیدر آباد (سندھ) میں دیا تھا' لیکن بعد میں اس پر جرح ہوئی کہ یہ بہت ہی کمزور قول ہے اور اس کے لیے کوئی سند موجود نہیں ہے۔ البتہ ''الجُبر'' جہاں آج آباد ہے وہاں پر تو ہر سال ایک بہت بڑا تجارتی میلہ لگتا تھا اور حضور ﷺ کا وہاں تک آنا ثابت ہے۔ بہر حال آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ آغازِ وحی کے بعد دس سال تک تو مکہ مکرمہ میں رہے' اس کے بعد طائف کا سفر کیا ہے۔ پھر آس پاس ''عُکاظ'' کا میلہ لگتا تھا اور منڈیاں لگتی تھیں' ان میں آپ نے سفر کیے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی ہے۔ اس کے بعد سب جنگیں حجاز کے علاقے ہی میں ہوئیں' سوائے غزوۂ تبوک کے۔ لیکن تبوک بھی اصل میں حجاز ہی کا شمالی سرا ہے۔ اس اعتبار سے حجاز ہی کا علاقہ ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ تاہم دو آیتیں اس اعتبار سے مستثنیٰ قرار دی جا سکتی ہیں کہ وہ زمین پر نہیں' بلکہ آسمان پر نازل ہوئیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم میں روایت موجود ہے کہ شب معراج میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو تین تحفے عطا کیے' ان میں نماز کی فرضیت اور دو آیاتِ قرآنی شامل ہیں۔ یہ سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات ہیں جو عرش کے دو خزانے ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کو شبِ معراج میں عطا ہوئے۔ تو یہ دو آیتیں مستثنیٰ ہیں کہ یہ زمین پر نازل نہیں ہوئیں' بلکہ آپ ﷺ کو سدرۃ المنتہیٰ پر دی گئیں اور خود آپؐ ساتویں آسمان پر تھے' جبکہ باقی پورا قرآن آسمان سے زمین پر نازل ہوا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے حجاز کا علاقہ مہبطِ وحی ہے۔

(۳) قرآن حکیم کی محفوظیت

میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن کے بارے میں تین بنیادی اور اعتقادی چیزیں ہیں: اوّل' یہ اللہ کا کلام ہے۔ دوم' یہ محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا۔ سوم' یہ مِن وعَن کُل کا کُل محفوظ ہے۔ اس میں نہ لَوئی کی ہوئی ہے نہ کوئی بیشی ہوئی ہے۔ نہ کمی ہو سکتی ہے نہ بیشی ہو سکتی ہے۔ نہ کوئی تحریف ہوئی ہے نہ کوئی تبدیلی۔ یہ گویا ہمارے عقیدے کا جزوِ لاینفک ہے۔ اس میں کچھ اشتباہ اہلِ تشیع نے پیدا کیا ہے' لیکن ان کی بات بھی مَیں کچھ یقین کے ساتھ اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ ان کا یہ قول بھی سامنے آتا ہے کہ ''ہم اس قرآن کو محفوظ مانتے ہیں''۔ البتہ عوام میں جو چیزیں مشہور ہیں کہ قرآن سے فلاں آیات نکال دی گئیں' فلاں سورت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح اور شان میں تھی' وہ اس میں سے نکال دی گئی وغیرہ' ان کے بارے میں مَیں نہیں کہہ سکتا کہ یہ ان میں سے عوام کالانعام کی باتیں ہیں یا

ان کے اعتقادات میں شامل ہیں۔لیکن یہ کہ بہر حال اہل سنت کا اجماعی عقیدہ ہے کہ یہ قرآن حکیم محفوظ ہے اور کُل کا کُل مِن وعَن ہمارے سامنے موجود ہے۔اس کے لیے خود قرآن مجید سے جو گواہی ملتی ہے وہ سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سورۃ القیامہ میں آئی ہے۔فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾﴾ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ازراہِ شفقت فرمایا: ''آپ اس قرآن کو یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو تیزی سے حرکت نہ دیں۔اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے''۔آپؐ مشقت نہ جھیلیں' یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم اسے آپؐ کے سینۂ مبارک کے اندر جمع کر دیں گے اور اس کی ترتیب قائم کر دیں گے' اس کو پڑھوا دیں گے۔جس ترتیب سے یہ نازل ہو رہا ہے اس کی زیادہ فکر نہ کیجئے۔اصل ترتیب جس میں اس کا مرتّب کیا جانا ہمارے پیش نظر ہے' جو ترتیب لوحِ محفوظ کی ہے اسی ترتیب سے ہم پڑھوا دیں گے۔﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾﴾ پھر اگر آپؐ کو کسی چیز میں ابہام محسوس ہو اور وضاحت کی ضرورت ہو تو اس کی توضیح اور تبیین بھی ہمارے ذمہ ہے۔

یہ ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی ہے۔اگر ان آیات کو کوئی شخص قرآن مجید کی آیات مانتا ہے تو اس کو ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید پورے کا پورا جمع ہے' اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہوا۔صراحت کے ساتھ یہ بات سورۃ الحجر کی آیت ۹ میں مذکور ہے۔فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۹﴾﴾ ''ہم نے ہی اس ''الذکر'' کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں''۔یہ گویا ہمیشہ ہمیش کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گارنٹی ہے کہ ہم نے اسے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔اس حقیقت کو علامہ اقبال نے خوبصورت شعر میں بیان کیا ہے: ؎

حرفِ اُو را ریب نے ' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

''اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردوبدل کی گنجائش۔اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔''

اس شعر میں تین اعتبارات سے نفی کی گئی ہے: (۱) قرآن کے حروف میں یعنی اس کے متن میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔یہ مِن وعَن محفوظ ہے۔(۲) اس میں کہیں کوئی تحریف ہوئی ہو' کہیں تبدیلی کی گئی ہو' قطعاً ایسا نہیں۔(۳) کیا اس کی آیات کی الٹ سلٹ تاویل بھی کی جا سکتی ہے؟ نہیں! یہ آخری بات بظاہر بہت بڑا دعویٰ معلوم ہوتا ہے' اس لیے کہ تاویل کے اعتبار سے قرآن مجید کے معنی میں لوگوں نے تحریف کی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اگر کہیں معنوی تحریف کی کوشش بھی ہوئی ہے تو وہ قطعاً درجۂ استناد کو نہیں پہنچ سکی' اسے کبھی بھی استقلال اور دوام حاصل نہیں ہو سکا' قرآن نے خود اس کو رد کر دیا۔جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے' ایسی تاویلات بھی اُمت کی تاریخ کے دوران کہیں بھی جڑ نہیں پکڑ سکی ہیں اور اسی طرح نکال دی گئی ہیں۔اس بات کی سند بھی قرآن میں موجود ہے۔سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آیت ۴۲ میں ہے: ﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾﴾ ''باطل اس (قرآن) پر حملہ آور نہیں ہو سکتا' نہ سامنے سے نہ پیچھے سے' یہ ایک حکیم وحمید کی نازل کردہ چیز ہے۔''

یہ بات سرے سے خارج از امکان ہے کہ اس قرآن میں کوئی تحریف ہو جائے' اس کا کوئی حصہ نکال دیا جائے' اس میں کوئی غیر قرآن شامل کر دیا جائے — سورۃ الحاقہ کی یہ آیات ملاحظہ کیجئے جہاں گویا اس امکان کی نفی میں مبالغے کا انداز ہے:

﴿وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿۴۴﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿۴۵﴾ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴿۴۶﴾ فَمَا

مِنۡكُمۡ مِّنۡ اَحَدٍ عَنۡهُ حٰجِزِيۡنَ ﴿۴۷﴾

''(کوئی اور تو اس میں اضافہ کیا کرے گا) اگر یہ (ہمارے نبی محمد ﷺ) خود بھی (بفرضِ محال) اپنی طرف سے کچھ گھڑ کر اس میں شامل کر دیں تو ہم انہیں داہنے ہاتھ سے پکڑیں گے اور ان کی شہ رگ کاٹ دیں گے۔ پھر تم میں سے کوئی (بڑے سے بڑا محافظ ان کا حامی و مددگار) نہیں ہوگا کہ جو انہیں ہماری پکڑ سے بچا سکے۔''

یہاں تو محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے بھی اس شدت کے ساتھ نفی کر دی گئی۔ کفار و مشرکین کی طرف سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ آپؐ اس قرآن میں کچھ نرمی اور لچک دکھائیں' یہ تو بہت rigid ہے' بہت ہی uncompromising ہے' بہرحال دنیا میں معاملات ''کچھ لو کچھ دو'' (give and take) سے طے ہوتے ہیں' لہٰذا کچھ آپ نرم پڑیں کچھ ہم نرم پڑتے ہیں۔ اس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَدُّوۡا لَوۡ تُدۡهِنُ فَيُدۡهِنُوۡنَ ﴿۹﴾﴾ (القلم) ''وہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے ہو جائیں تو یہ بھی ڈھیلے ہو جائیں گے''۔ اور سورۂ یونس میں ارشاد ہوا:

﴿وَاِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَيۡرِ هٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡهُ ؕ قُلۡ مَا يَكُوۡنُ لِيۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَهٗ مِنۡ تِلۡقَآئِ نَفۡسِىۡ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوۡحٰۤى اِلَىَّ ۚ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَيۡتُ رَبِّىۡ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ﴿۱۵﴾﴾

''جب انہیں ہماری آیاتِ بیّنات سنائی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے' کہتے ہیں کہ اس قرآن کے بجائے کوئی اور قرآن لائیے یا اس میں کچھ ترمیم کیجیے۔ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے میرے لیے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ میں اپنے خیال اور ارادے سے اس کے اندر کچھ تبدیلی کر سکوں۔ میں تو خود پابند ہوں اس کا جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔ اگر میں اپنے ربّ کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب کا ڈر ہے۔''

یہ ہے قرآن مجید کی شان کہ یہ لفظاً' معناً' متناً کُلّی طور پر محفوظ ہے۔

❁❁❁

باب دوم

چند متفرّق مباحث

قرآن مجید کی زبان

اب آیئے اگلی بحث کی طرف کہ قرآن مجید کی زبان کیا ہے اور اس زبان کی شان کیا ہے۔ یہ بات بھی قرآن مجید نے بہت تکرار و اعادہ کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ قرآن عربی مبین میں ہے' یعنی شستہ' صاف' سلیس' کھلی اور واضح عربی میں ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اس نے جن حروف و اصوات کا جامہ پہنا' وہ حروف و اصوات لوحِ محفوظ میں ہیں۔ اس کے بعد وہ کلامِ الٰہی' قولِ جبرائیل علیہ السلام اور قولِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن کر نازل ہوا اور لوگوں کے سامنے آیا۔ چنانچہ سورۃ الزخرف کے آغاز میں ارشاد ہوا:

﴿حٰمٓ ۝١ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝٢ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٣﴾

''ح' م۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی! ہم نے اسے قرآنِ عربی بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔''

قرآن کی مخاطب اوّل قوم حجاز میں آباد تھی۔ اس سے کہا جا رہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں بنایا۔ اس نے اوّلاً حروف و اصوات کا جامہ پہنا ہے' پھر تمہاری زبان عربی کا جامہ پہن کر تمہارے سامنے نازل کیا گیا ہے تاکہ تم اس کو سمجھ سکو۔

یہی بات سورۂ یوسف کے شروع میں کہی گئی ہے:

﴿الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝١ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝٢﴾

''ا' ل' ر۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔ ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تاکہ تم سمجھ سکو۔''

سورۃ الشعراء میں فرمایا:

﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝١٩٥﴾

''صاف صاف عربی زبان میں (نازل کیا گیا)۔''

سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

﴿قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝٢٨﴾

''ایسا قرآن جو عربی زبان میں ہے' جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے' تاکہ وہ بچ کر چلیں۔''

اس میں کہیں کجی نہیں' کہیں کوئی ایچ پیچ نہیں' اس کی زبان بہت سلیس' شستہ اور بالکل واضح زبان ہے۔ اس میں کہیں پہیلیاں بجھوانے کا انداز نہیں ہے۔

اب نوٹ کیجیے کہ قرآن کی عربی کون سی عربی ہے؟ اس لیے کہ عربی زبان ایک ہے مگر اس کے dialects اور اس کی بولیاں بے شمار ہیں۔ خود جزیرہ نمائے عرب میں متعدد بولیاں تھیں' تلفظ اور لہجے مختلف تھے۔ بعض الفاظ کسی خاص علاقے میں مستعمل تھے اور دوسرے علاقے کے لوگ ان الفاظ کو جانتے ہی نہیں تھے۔ آج بھی کہنے کو تو مصر' لیبیا' الجزائر' موریطانیہ اور حجاز کی زبان عربی ہے' لیکن اُن کے ہاں جو فصیح عربی کہلاتی ہے وہ تو ایک ہی ہے۔ وہ درحقیقت ایک اس لیے ہے کہ قرآن مجید نے اسے دوام عطا کیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا عربی زبان پر عظیم احسان ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں دوسری کوئی زبان بھی ایسی نہیں ہے جو چودہ سو برس سے ایک ہی شان اور ایک ہی کیفیت کے ساتھ باقی ہو۔ اردو زبان ہی کو دیکھئے۔ ۱۰۰-۲۰۰ برس پرانی اردو آج ہمارے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ دکن کی اردو ہمیں سمجھ میں نہیں آ سکتی' اس میں کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح فارسی زبان کا معاملہ ہے۔ ایک وہ فارسی تھی جو عربوں کی آمد اور اسلام کے ظہور کے وقت تھی۔ عربوں کے ہاتھوں ایران فتح ہوا تو رفتہ رفتہ اس فارسی کا رنگ بدلتا گیا۔ اب اس کو پھر بدلا گیا ہے اور اس میں سے عربی الفاظ نکال کر اس کے لہجے بھی بدل دیے گئے ہیں۔ ایک فارسی وہ ہے جو افغانستان میں بولی جاتی ہے' وہ ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ اس لیے کہ جو فارسی یہاں پڑھائی جاتی تھی وہ یہی فارسی تھی۔ آج جو فارسی ایران میں پڑھائی جا رہی ہے وہ بہت مختلف ہے' اپنے لہجے میں بھی اور اپنے الفاظ کے اعتبار سے بھی۔ لیکن عربی ''فصیح زبان'' ایک ہے۔ یہ اصل میں حجاز کے بدوؤں کی زبان تھی۔ پورا قرآن حکیم حجاز میں نازل ہوا۔ حجاز میں بادیہ نشین تھے۔ عربوں کا کہنا تھا کہ خالص زبان بادیہ نشینوں کی ہے' شہر والوں کی نہیں۔ جبکہ مکہ شہر تھا اور وہاں باہر سے بھی لوگ آتے رہتے تھے۔ قافلے آ رہے ہیں' جا رہے ہیں' ٹھہر رہے ہیں۔ جہاں اس طرح کی آمد و رفت ہو وہاں زبان خالص نہیں رہتی اور اس میں غیر زبانوں کے الفاظ شامل ہو کر مستعمل ہو جاتے ہیں اور بول چال میں آ جاتے ہیں۔ خاص اسی وجہ سے مکّہ کے شرفا اپنے بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد بادیہ نشینوں کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ایک تو دودھ پلانے کا معاملہ تھا۔ دوسرا یہ کہ ان کی زبان صاف رہے' خالص عربی زبان رہے اور وہ ہر ملاوٹ سے پاک رہے۔ تو قرآن مجید حجاز کے بادیہ نشینوں کی زبان میں نازل ہوا۔

البتہ یہ ثابت ہے کہ قرآن مجید میں کچھ الفاظ دوسرے قبائل اور دوسرے علاقوں کی زبانوں کے بھی آئے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ غیر عربی الفاظ بھی قرآن مجید میں آئے ہیں جو مُعرّب ہو گئے ہیں۔ ابراہیم' اسمٰعیل' اسرائیل' اسحاق' یہ تمام نام درحقیقت عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔ لفظ ''اِیل'' عبرانی زبان میں اللہ کے لیے آتا ہے اور یہ لفظ ہمارے ہاں قرآن مجید کے ذریعے آیا ہے۔ اسی طریقے سے ''سِجِّیل'' کا لفظ فارسی سے آیا ہے۔ صحرا میں کہیں بارش کے نتیجے میں ہلکی سی پھوار پڑی ہو تو بارش کے قطروں کے ساتھ ریت کے چھوٹے چھوٹے دانے بن جاتے ہیں اور پھر تیز دھوپ پڑنے پر وہ ایسے پک جاتے ہیں جیسے بھٹے میں اینٹوں کو پکا دیا گیا ہو۔ یہ کنکر ''سِجِّیل'' کہلاتے ہیں جو ''سنگِ گِل'' کا معرّب ہے۔ باقی اکثر و بیشتر قرآن مجید کی زبان جس میں یہ نازل ہوا' وہ حجاز کے علاقے کے بادیہ نشینوں کی عربی ہے' جس میں فصاحت و بلاغت نقطۂ عروج پر ہے اور اس کا لوہا مانا گیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک صوتی آہنگ ہے۔ اس کا ایک ''ملکوتی غنا'' (Divine Music) ہے' اس کی ایک عذوبت اور مٹھاس ہے۔ یہ دونوں چیزیں عرب میں پورے طور پر تسلیم کی گئی ہیں اور لوگوں پر سب سے زیادہ مرعوبیت قرآن حکیم کی فصاحت' بلاغت اور عذوبت ہی سے طاری ہوئی۔ ان کی اپنی زبان میں ہونے کے اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ قرآن

کے بہترین ناقد بھی وہی ہو سکتے تھے۔ واضح رہے کہ ادب میں ''تنقید'' دونوں پہلوؤں کو محیط ہوتی ہے۔ کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا' اسے جانچنا' پرکھنا۔ اس میں کوئی خامی ہو تو اس کو نمایاں کرنا' اور اگر کوئی محاسن ہوں تو ان کو سمجھنا اور بیان کرنا۔ اس اعتبار سے اس کی فصاحت و بلاغت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ عربی زبان آج بھی مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں اور بولیوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایک علاقے کی عامی (colloquial) عربی دوسرے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ خود نزولِ قرآن کے زمانے میں نجد کے لوگوں کی زبان حجاز کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے کہ نجد سے کچھ لوگ آئے اور وہ حضور ﷺ سے گفتگو کر رہے تھے جو بڑی مشکل سے سمجھ میں آ رہی تھی اور لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ آج بھی نجد کے لوگ جو گفتگو کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ عربی سے واقفیت ہونے کے باوجود ان کی عربی ہماری سمجھ میں نہیں آتی' ان کا لب ولہجہ بالکل مختلف ہے۔ قرآن حکیم کی زبان حجاز کے بادیہ نشینوں کی ہے۔ لہٰذا اگر تحقیق و تدبرِ قرآن کا حق ادا کرنا ہو تو جاہلیت کی شاعری پڑھنا ضروری ہے۔ ائمہ لغت نے ایک ایک لفظ کی تحقیق کر کے اور بڑی گہرائیوں میں اتر کر جاہلی شاعری کے حوالے سے جتنے بھی استشہاد ہو سکتے تھے ان کو کھنگال کر قرآن میں مستعمل الفاظ کے مادوں کے مفہوم معین کر دیے ہیں۔ ایک عام قاری کو' جو قرآن سے تذکر کرنا چاہے' صرف ہدایت حاصل کرنا چاہے' اس کھکیڑ میں پڑنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تدبرِ قرآن کے لیے جب تحقیق کی جاتی ہے تو جب تک کسی ایک لفظ کی اصل پوری طرح معلوم نہ کی جائے اور اس کے بال کی کھال نہ اُتار لی جائے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے شعرِ جاہلی کی زبان کو سمجھنا تدبرِ قرآن کے لیے یقیناً ضروری ہے۔

قرآن کے اَسماء وصفات

اگلی بحث قرآن حکیم کے اسماء وصفات کی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں قرآن حکیم کے اسماء وصفات قرآن حکیم ہی سے لے کر پچپن (۵۵) ناموں کی فہرست مرتب کی ہے۔ میں نے جب اس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کامل نہیں ہے' مثلاً لفظ ''برہان'' ان کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ درحقیقت قرآن مجید کی صفات' اس کی شانوں اور اس کی تاثیر کے لیے مختلف الفاظ کو جمع کیا جائے تو ۵۵ ہی نہیں اس سے زیادہ الفاظ بن جائیں گے' لیکن میں نے انہیں دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو وہ الفاظ ہیں جو مفرد کی حیثیت سے اور معرفہ کی شکل میں قرآن مجید میں قرآن کے لیے وارد ہوئے ہیں' جبکہ کچھ صفات ہیں جو موصوف کے ساتھ آ رہی ہیں۔ مثلاً ''قرآن مجید'' میں ''مجید'' قرآن کا نام نہیں ہے' درحقیقت صفت ہے۔ اسی طرح ''القرآن المجید'' میں اگرچہ ''الف لام'' کے ساتھ ''المجید'' آتا ہے' لیکن یہ چونکہ موصوف کے ساتھ مل کر آیا ہے لہٰذا یہ بھی صفت ہے۔

قرآن مجید کے لیے جو الفاظ بطور اسم آئے ہیں' ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جن کے ساتھ لام تعریف لگا ہوا ہے۔ قرآن کے لیے اہم ترین نام جو اس کا امتیازی اور اختصاصی (The exclusive) نام ہے' ''القرآن'' ہے۔ (میں بعد میں اس کی وضاحت کروں گا) اس کے بعد کثرت سے استعمال ہونے والا نام ''الکتاب'' ہے۔ قرآن کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والا اہم ترین نام ''الذکر'' ہے۔ قرآن مجید کی افادیت کے لیے سب سے زیادہ جامع نام ''الہدیٰ'' ہے۔ قرآن مجید کی نوعیت اور حیثیت

کے اعتبار سے اہم ترین نام ''النور'' ہے۔قرآن مجید کی ایک انتہائی اہم شان جو ایک لفظ کے طور پر آئی ہے ''الفرقان'' ہے یعنی (حق و باطل میں) فرق کر دینے والی شے' دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دینے والی شے۔قرآن کا ایک نام ''الوحی'' بھی آیا ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ﴾ (الانبیاء:۴۵) ۔اسی طرح ''کلام اللہ'' کا لفظ بھی خود قرآن میں آیا ہے: ﴿حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۶) چونکہ یہاں کلام مضاف واقع ہوا ہے' لہٰذا یہ بھی معرفہ بن گیا۔ میرے نزدیک جنہیں ہم قرآن کے نام قرار دیں' وہ تو یہی بنتے ہیں۔اگرچہ' جیسا کہ میں نے عرض کیا' جو لفظ بھی قرآن کے لیے صفت کے طور پر یا اس کی شان کو بیان کرنے کے لیے قرآن میں آ گیا ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کو فہرست میں شامل کر کے ۵۵ نام گنوائے ہیں' لیکن یہ فہرست بھی مکمل نہیں۔

قرآن کریم کی مختلف شانوں اور صفات کے لیے یہ الفاظ آئے ہیں: (۱) كَرِيْمٌ: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ (الواقعۃ) (۲) اَلْحَكِيْمُ: ﴿يٰسٓ ۝ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ﴾ (یٰسٓ) (۳) اَلْعَظِيْم: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ (الحجر) (۴) مَجِيْدٌ اور اَلْمَجِيْدُ: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ﴾ (البروج) اور ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ (قٓ) (۵) اَلْمُبِيْنُ: ﴿حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ﴾ (الزخرف) (۶) رَحْمَةٌ: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس) (۷) عَلِيٌّ: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ (الزخرف) (۸) بَصَائِرُ: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الانعام:۱۰۴) (۹'۱۰) بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا: (حٰمٓ السجدۃ:۴) [اگرچہ یہ الفاظ انبیاء کے لیے آتے ہیں لیکن یہاں خود قرآن کے لیے بھی آئے ہیں۔قرآن اپنی ذات میں فی نفسہٖ بشیر بھی ہے' نذیر بھی ہے] (۱۱) بُشْرٰى: ﴿وَبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل:۸۹'۱۰۲) (۱۲) عَزِيْزٌ: ﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ﴾ (حٰمٓ السجدۃ) (۱۳) بَلَاغٌ: ﴿هٰذَا بَلَاغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (ابراھیم:۵۲) (۱۴) بَيَانٌ: ﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ (آل عمران:۱۳۸) (۱۵) مَوْعِظَةٌ (۱۶) شِفَآءٌ: ﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ (یونس:۵۷) (۱۷) اَحْسَنُ الْقَصَصِ: ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (یوسف:۳) (۱۸) اَحْسَنُ الْحَدِيْثِ (۱۹) مُتَشَابِه (۲۰) مَثَانِيْ: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ (الزمر:۲۳) (۲۱) مُبَارَكٌ: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ﴾ (صٓ:۲۹) (۲۲) مُصَدِّقٌ (۲۳) مُهَيْمِنٌ: ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ (المائدۃ:۴۸) (۲۴) قَيِّم: ﴿قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ﴾ (الکہف:۲) ۔یہ مختلف الفاظ ہیں جو قرآن حکیم کی مختلف شانوں کے لیے آئے ہیں۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں' جو اُس کی مختلف شانوں کو ظاہر کرتے ہیں' اسی طرح حضور ﷺ کے ناموں کی فہرست بھی آپ نے پڑھی ہوگی۔آپ ﷺ کی مختلف شانیں ہیں' اس کے اعتبار سے آپ بشیر بھی ہیں' نذیر بھی ہیں' ہادی بھی ہیں' معلّم بھی ہیں۔قرآن مجید کے بھی مختلف اسماء و صفات ہیں۔

لفظ ''قرآن'' کی لغوی بحث

قرآن مجید کے ناموں میں سب سے اہم نام ''القرآن'' ہے' جس کے لیے میں نے لفظ exclusive استعمال کیا تھا کہ یہ کسی اور کتاب کے لیے استعمال نہیں ہوا' ورنہ تورات کتاب بھی ہے' ہدایت بھی تھی' اور اس کے لیے لفظ نور بھی آیا ہے۔ارشاد ہوا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (المائدۃ:۴۴) ''ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت بھی ہے اور نور بھی''۔خود

قرآن مجید ہدایت بھی ہے' نور بھی ہے' رحمت بھی ہے۔ تو بقیہ تمام اوصاف تو مشترک ہیں' لیکن القرآن کے لفظ کا اطلاق کُتبِ سماویہ میں سے کسی اور کتاب پر نہیں ہوتا۔ یہ امتیازی' اختصاصی اور استثنائی نام صرف قرآن مجید کے لیے ہے۔ اسی لیے ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم عَلَم ہے' اور اسمِ جامد ہے' اسم مشتق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام ''اللہ'' کے بارے میں بھی ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسمِ ذات ہے' اسمِ عَلَم ہے' اسمِ جامد ہے' مشتق نہیں ہے' یہ کسی اور مادے سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ جبکہ ایک رائے یہ ہے کہ یہ بھی صفت ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفاتی نام ہیں۔ جیسے ''علیم'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور ''العلیم'' نام ہے' رحیم صفت ہے اور ''الرحیم'' نام ہے' اسی طرح اللہ پر ''ال'' داخل ہوا تو ''الاِلٰہ'' بن گیا اور دو لام مدغم ہونے سے یہ ''اللہ'' بن گیا۔ یہ دوسری رائے ہے۔ جو معاملہ لفظ اللہ کے بارے میں اختلافی ہے بعینہٖ وہی اختلاف لفظ قرآن کے بارے میں ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسمِ جامد اور اسمِ علم ہے' اس کا کوئی اور مادہ نہیں ہے' جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ اسم مشتق ہے۔ لیکن پھر اس کے مادے کی تعیین میں اختلاف ہے۔

ایک رائے کے مطابق اس کا مادہ ''قرن'' ہے' یعنی قرآن میں جو ''ن'' ہے وہ بھی حرفِ اصلی ہے۔ دوسری رائے کے مطابق اس کا مادہ ''ق ر ء'' ہے۔ یہ گویا مہموز ہے۔ میں یہ باتیں اہلِ علم کی دلچسپی کے لیے عرض کر رہا ہوں۔ جن لوگوں نے اس کا مادہ ''قرن'' مانا ہے' اُن کی بھی دو آراء ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ جیسے عرب کہتے ہیں ''قَرَنَ الشَّیْءَ بِالشَّیْءِ'' (کوئی شے کسی دوسرے کے ساتھ شامل کر دی گئی) تو اس سے قرآن بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات' اللہ تعالیٰ کا کلام جو وقتاً فوقتاً نازل ہوا' اس کو جب جمع کر دیا گیا تو وہ ''قرآن'' بن گیا۔ امام اشعری بھی اس رائے کے قائل ہیں۔ جبکہ ایک رائے امام فراء کی ہے' جو لغت کے بہت بڑے امام ہیں' کہ یہ قرینہ اور قرائن سے بنا ہے۔ قرائن کچھ چیزوں کے آثار ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات چونکہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں' جیسا کہ سورۃ الزمر میں قرآن مجید کی یہ صفت وارد ہوئی ہے ''کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ''۔ اس اعتبار سے آپس میں یہ آیات قرناء ہیں۔ چنانچہ قرینہ سے قرآن بن گیا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مادہ ق ر ء ہے وہ قرآن کو مصدر مانتے ہیں۔ قَرَأَ ، یَقْرَأُ ، قَرْأً ، وَقِرَاءَةً وَقُرْآنًا۔ یہ اگرچہ مصدر کا معروف وزن نہیں ہے' لیکن اس کی مثالیں عربی میں موجود ہیں۔ جیسے رَجَحَ سے رُجحان اور غَفَرَ سے غُفران۔ ان کے مادہ میں ''ن'' شامل نہیں ہے۔ تو جیسے غفران اور رجحان مصدر ہیں' ایسے ہی قرأ سے مصدر قرآن ہے' یعنی پڑھنا۔ اور مصدر بسا اوقات مفعول کا مفہوم دیتا ہے تو قرآن کا مفہوم ہوگا پڑھی جانے والی شے' پڑھی گئی شے۔ ''قَرَأَ'' میں جمع کرنے کا مفہوم بھی ہے۔ عرب کہتے ہیں: قرأتُ المَاءَ فِی الحَوْضِ ''میں نے حوض کے اندر پانی جمع کر لیا''۔ اسی سے قریہ بنا ہے' یعنی ایسی جگہ جہاں لوگ جمع ہو جائیں۔ گویا قرآن کا مطلب ہے اللہ کا کلام جہاں جمع کر دیا گیا۔ تمام آیات جب جمع کر لی گئیں تو یہ قرآن بن گیا۔ جیسے قریہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ آباد ہو جائیں' مل جل کر رہ رہے ہوں۔ تو جمع کرنے کا مفہوم قَرَأَ میں بھی ہے اور قرن میں بھی ہے۔ یہ دونوں مادے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ بہرحال یہ اس لفظ کی لغوی بحث ہے۔

قرآن کا اسلوبِ کلام

اب میں اگلی بحث پر آ رہا ہوں کہ اس کا اسلوب کلام کیا ہے! قرآن مجید نے شدّ و مدّ کے ساتھ جس بات کی نفی کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ شعر نہیں ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ﴾ (یٰسٓ:۶۹) ''ہم نے اپنے اس رسول کو شعر سکھایا ہی نہیں' نہ ان کے یہ شایانِ شان ہے''۔ شعراء کے بارے میں سورۃ الشعراء میں آیا ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾﴾

''اور شاعروں کی پیروی تو وہی لوگ کرتے ہیں جو گمراہ ہوں۔ کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں گھومتے رہتے ہیں (ہر میدان میں سرگرداں رہتے ہیں) اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔''

اگلی آیت میں ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...﴾ کے الفاظ کے ساتھ استثناء بھی آیا ہے' اور استثناء قاعدہ کلیہ کی توثیق کرتا ہے (Exception proves the rule)— چنانچہ قرآن مجید کے اعتبار سے شعر گوئی کوئی اچھی شے نہیں' کوئی ایسی محمود صفت نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو عطا فرماتا۔ بلکہ حضور اکرم ﷺ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپؐ کبھی کوئی شعر پڑھتے بھی تھے تو غلطی ہو جاتی تھی۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ پر سے اللہ تعالیٰ شاعری کی تہمت ہٹانا چاہتا تھا' لہٰذا آپؐ کے اندر شاعری کا وصف ہی پیدا نہیں کیا گیا۔ سیرت کا ایک دلچسپ واقعہ آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک مرتبہ ایک شعر پڑھا اور اس میں غلطی ہوئی۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسکرائے اور عرض کی: اَشْهَدُ اَنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں''۔ اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ﴾۔ تو واقعتاً آپ کو شعر سے یعنی شعر کے وزن اور اس کی بحر وغیرہ سے مناسبت نہیں تھی۔ باقی جہاں تک شعر کے مفہوم کا اور اعلیٰ مضامین کا تعلق ہے تو خود حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً)) یعنی بہت سے بیان' بہت سے خطبے اور تقریریں جادو اثر ہوتے ہیں اور بہت سے اشعار کے اندر حکمت کے خزانے ہوتے ہیں۔ بعض شعراء کے اشعار حضور ﷺ نے خود پڑھے بھی ہیں اور ان کی تحسین فرمائی ہے' لیکن قرآن بہرحال شعر نہیں ہے۔

البتہ ایک بات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ قدیم زمانے کی شاعری جس میں بحر' وزن اور ردیف و قافیہ کی پابندیاں سختی کے ساتھ ہوتی تھیں' اس کے اعتبار سے یقیناً قرآن شعر نہیں ہے' لیکن ایک شاعری جس کا رواج عصر حاضر میں ہوا ہے اور اس کے لیے غالباً قرآن ہی کے اسلوب کو چرایا گیا ہے' جسے آپ ''آزاد نظم'' (Blank Verse) کہتے ہیں' اس کے اندر جو صفات اور خصوصیات آج کل ہوتی ہیں اُن کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک ردھم (Rythm) بھی ہوتا ہے' اس میں فواصل بھی ہیں' قوافی کی طرز پر صوتی آہنگ بھی ہے' لیکن وہ جو معروف شاعری تھی اس کے اعتبار سے قرآن بڑی تاکید کے ساتھ کہتا ہے کہ قرآن شعر نہیں ہے۔

قرآن کے اسلوب کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ عام معانی میں قرآن کتاب بھی نہیں ہے۔ میں یہاں اقبال کا مصرعہ quote کر رہا ہوں' اگرچہ اس کے وہ معانی نہیں ع ''ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!''

آج ہمارا کتاب کا تصور یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہوتے ہیں۔ آپ کسی کتاب یا تصنیف میں ایک موضوع کو ایک

باب (Chapter) کی شکل دیتے ہیں۔ ایک باب میں ایک بات مکمل ہو جانی چاہئے۔ اگلے باب میں بات آگے چلے گی' کوئی پچھلی بات نہیں دہرائی جائے گی۔ تیسرے باب میں بات اور آگے چلے گی۔ پھر ایک کتاب مضمون کے اعتبار سے ایک وحدت بنے گی اور اس کے اندر موضوعات اور عنوانات کے حوالے سے ابواب (Chapters) تقسیم ہو جائیں گے۔ گویا ہمارے ہاں معروف معنی میں کتاب کا اطلاق جس چیز پر کیا جاتا ہے' اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔ البتہ یہ ''الکتاب'' ہے بمعنی لکھی ہوئی شے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کتاب قرار دیا ہے اور اس کے لیے سب سے زیادہ کثرت سے یہی لفظ ''کتاب'' ہی قرآن میں آیا ہے۔ یہ لفظ ساڑھے تین سو (۳۵۰) جگہ آیا ہے۔ قرآن اور قرآنًا تقریباً ۷۰ مقامات پر آیا ہے۔ لیکن ''قرآن'' exclusive آیا ہے' جبکہ کتاب کا لفظ توراۃ' انجیل' علم خداوندی اور تقدیر کے لیے بھی آیا ہے اور قرآن مجید کے حصوں اور احکام کے لیے بھی آیا ہے۔ بہرحال کتاب اس معنی میں تو ہے۔ معاذ اللہ' کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کتاب نہیں ہے' لیکن جس معنی میں ہم لفظ کتاب بولتے ہیں اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔

تیسری بات یہ کہ یہ مجموعۂ مقالات (collection of essays) بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر مقالہ اپنی جگہ پر خود مکتفی اور ایک مکمل شے ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ تو پھر یہ ہے کیا؟ پہلی بات تو یہ نوٹ کیجیے کہ اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔ عرب میں دو ہی چیزیں زیادہ معروف تھیں' خطابت یا شاعری۔ شعراء ان کے ہاں بڑے محبوب تھے۔ شاعری کا ان کو بڑا ذوق تھا اور وہ شعراء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے ہاں قصیدہ گوئی کے مقابلے ہوتے تھے۔ پھر ہر سال جو سب سے بڑا شاعر شمار ہوتا تھا اس کی عظمت کو تسلیم کرنے کی علامت کے طور پر سب شاعر اس کے سامنے باقاعدہ سجدہ کرتے تھے۔ پھر اس کا قصیدہ بیت اللہ پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یہی قصائد ''سبعۃ مُعلّقۃ'' کے نام سے معروف ہیں۔ چنانچہ عرب یا تو شعروں سے واقف تھے یا خطبوں سے۔ تو قرآن مجید اُس دور کی دو سب سے زیادہ معروف اصناف (شاعری اور خطبہ) میں سے خطبے کے اسلوب پر ہے۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ (A Collection of Divine Orations) ہے' جس میں ہر سورت ایک خطبے کی مانند ہے۔

خطبے کے اعتبار سے چند باتیں نوٹ کر لیں۔ خطبے میں مخاطب اور خطیب کے درمیان ایک ذہنی رشتہ ہوتا ہے۔ مخاطب کو معلوم ہوتا ہے کہ میرے سامنے کون لوگ بیٹھے ہیں' ان کی فکر کیا ہے' ان کی سوچ کیا ہے' ان کے عقائد کیا ہیں' ان کے نظریات کیا ہیں۔ وہ ان کا حوالہ دیے بغیر اپنی گفتگو کے اندر اُن پر تنقید بھی کرے گا' ان کی تصحیح بھی کرے گا' لیکن کوئی تمہیدی کلمات نہیں ہوں گے کہ اب میں تمہاری فلاں غلطی کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں' میں اب تمہارے اس خیال کی نفی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ انداز نہیں ہوگا بلکہ وہ روانی کے ساتھ آگے چلے گا۔ مخاطِب اور مخاطب کے مابین ایک ذہنی ہم آہنگی ہوتی ہے' وہ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں' اور خاص طور پر مخاطبین کے فہم' اُن کی سمجھ' اُن کے عقائد' اُن کے نظریات سے خطیب واقف ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت خطبے کی شان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تحویلِ خطاب ہوتی ہے اور بغیر وارننگ کے ہوتی ہے۔ بسا اوقات غائب کو حاضر فرض کر کے اس سے خطاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خطیب مسجد میں خطبہ دے رہا ہے اور وہ مخاطب کر رہا ہے صدر مملکت کو' حالانکہ وہ وہاں موجود نہیں ہوتے۔ اسی طرح جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں بسا اوقات ان سے صیغہ غائب میں گفتگو شروع ہو جائے گی' اور یہ بھی بلاغت کا انداز ہے۔ کبھی وہ ایک طرف بات کر رہا ہے' کبھی دوسری طرف کر رہا ہے' کبھی کسی غائب سے بات کر رہا ہے اور خطابت

کا وہی انداز ہوگا اگرچہ وہ غائب وہاں موجود نہیں ہے۔ اس کو تحویلِ خطاب کہتے ہیں۔ قرآن مجید پر غور کرنے کے ضمن میں اس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر خطاب کا رُخ معین ہو کہ یہ بات کس سے کہی جا رہی ہے' مخاطب کون ہے' تو اس بات کا اصل مفہوم اُجاگر ہو کر سامنے آتا ہے' ورنہ اگر مخاطب کا تعین نہ ہو تو بہت سے بڑے بڑے مغالطے جنم لے سکتے ہیں۔

خطبے اور مقالے میں ایک واضح فرق یہ ہوتا ہے کہ مقالے میں عام طور پر صرف عقل سے اپیل کی جاتی ہے۔ اس میں منطق اور عقلی دلائل ہوتے ہیں' جبکہ خطبے میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی اپیل ہوتی ہے۔ گویا کہ انسان کے اندر جھانک کر بات کی جاتی ہے۔ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنے اندر جھانکو۔ اور: ﴿وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ (الذّٰریٰت) ''اور خود تمہارے اندر بھی (نشانیاں ہیں) تو کیا تم کو سوجھتا نہیں ہے؟'' اور: ﴿اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (ابراھیم: ۱۰) ''(ذرا غور کرو) کیا اللہ کے بارے میں شک کرتے ہو جو زمین و آسمان کا بنانے والا ہے؟'' یہ انداز بہرحال کسی تحریر یا مقالے میں نہیں ہوگا' یہ خطبے کا انداز ہے۔

ایک اور بات جو خطبے کے اعتبار سے اس کے خصائص میں سے ہے وہ یہ کہ ایک مؤثر خطبے کے شروع میں بہت جامع گفتگو ہوتی ہے۔ کامیاب خطبہ وہی ہوگا جس کا آغاز ایسا ہو کہ مقرر اور خطیب اپنے مخاطبین اور سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لے۔ اور پھر اگرچہ خطبے کے دوران مضمون دائیں بائیں پھیلے گا' اِدھر جائے گا' اُدھر جائے گا' لیکن آخر میں آ کر وہ پھر کسی مضمون کے اوپر مرتکز ہو جائے گا۔ یہ اگر نہیں ہے تو گویا وقت ضائع ہو گیا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے ہیں۔ خاص طور پر مجلس احرار نے بڑے عوامی خطیب پیدا کیے' جن میں سے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی تقریر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گفتگو چار چار گھنٹے' پانچ پانچ گھنٹے چل رہی ہے۔ اس میں کبھی مشرق کی' کبھی مغرب کی' کبھی شمال کی اور کبھی جنوب کی بات آ جاتی۔ کبھی ہنسانے کا اور کبھی رلانے کا انداز ہوتا' کہیں لطیفہ گوئی بھی ہو جاتی' لیکن اوّل و آخر بات بالکل واضح ہوتی۔ خوب گھما پھرا کر بھی مخاطب کو کسی ایک بات پر لے آنا کہ اٹھے تو کوئی ایک بات' کوئی ایک پیغام لے کر اٹھے' کوئی ایک جذبہ اس کے اندر جاگ چکا ہو' ایک پیغام اس تک پہنچ چکا ہو' یہ خطبے کے اوصاف ہیں۔

آپ کو معلوم ہے خواہ غزل ہو یا قصیدہ' شاعری میں مطلع اور مقطع دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مطلع جاندار ہے تو آپ پوری غزل پڑھیں گے اور اگر مطلع ہی پھسپھسا ہے تو آگے آپ کیا پڑھیں گے! اسی طرح مقطع بھی جاندار ہونا چاہیے۔ اسی لیے مقطع اور مطلع کے الفاظ علیحدہ سے وضع کیے گئے ہیں۔ خطبات کے اندر بھی ابتدا اور اختتام پر نہایت جامع اور اہم مضمون ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدا اور اختتام بھی نہایت جامع مضامین پر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات کی فضیلت پر بہت سی احادیث ملتی ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات' اسی طرح سورۂ آلِ عمران کی شروع کی آیات اور پھر اختتامی آیات نہایت جامع ہیں۔ یہ انداز اکثر و بیشتر سورتوں میں ملے گا۔ یہ ہے اصل میں بالعموم قرآن مجید کا اسلوب' جو ظاہر بات ہے شاعری کا نہیں ہے۔ عام معانی میں وہ کتاب نہیں' مجموعۂ مقالات نہیں۔ اس کا اسلوب اگر ہے تو وہ خطبے سے ملتا ہے۔ یہ گویا خطباتِ الٰہیہ ہیں جن کا مجموعہ ہے قرآن!

❁❁❁

باب سوم

قرآن مجید کی ترکیب و تقسیم

آیات اور سورتوں کی تقسیم

بہت سی چیزوں سے مل کر کوئی شے مرکب بنتی ہے۔ قرآن کلام مرکب ہے۔ اس کی تقسیم سورتوں اور آیات میں ہے۔ پھر اس میں احزاب اور گروپ ہیں۔ عام تصورِ کتاب تو یہ ہے کہ اس کے ابواب ہوتے ہیں' لیکن قرآن حکیم پر ان اصطلاحات کا اطلاق نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم نے اپنی اصطلاحات خود وضع کی ہیں۔ ان اصطلاحات کی دنیا میں موجود کسی بھی کتاب کی اصطلاحات سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ جاحظ نے ایک بڑا خوبصورت عنوان قائم کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عرب اس سے تو واقف تھے کہ ان کے بڑے بڑے شعراء کے دیوان ہوتے تھے۔ سارا کلام کتابی شکل میں جمع ہو گیا تو وہ دیوان کہلایا۔ لہٰذا کسی بھی درجے میں اگر مثال اور تشبیہ سے سمجھنا چاہیں تو دیوان کے مقابلے میں لفظ قرآن ہے۔ پھر دیوان بہت سے قصائد کا مجموعہ ہوتا تھا۔ ہمارے ہاں بھی کسی شاعر کا دیوان ہوگا تو اس میں قصائد ہوں گے' غزلیں ہوں گی' نظمیں ہوں گی۔ قرآن حکیم میں اس سطح پر جو لفظ ہے وہ سورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ کلام سورتوں پر مشتمل ہے۔ اگر کوئی نثر کی کتاب ہے تو وہ جملوں پر مشتمل ہوگی اور اگر نظم کی ہے تو وہ اشعار پر مشتمل ہوگی۔ اس کی جگہ قرآن مجید کی اصطلاح آیت ہے۔ شاعری میں اشعار کے خاتمے پر ردیف کے ساتھ ساتھ ایک لفظ قافیہ کہلاتا ہے اور غزل کے تمام اشعار ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قرآن مجید پر بھی ہم عام طور پر اس لفظ کا اطلاق کر دیتے ہیں' اس لیے کہ قرآن مجید کی آیات میں بھی آخری الفاظ کے اندر صوتی آہنگ ہے۔ یہاں انہیں فواصل کہا جاتا ہے' قافیہ کا لفظ استعمال نہیں کیا جاتا کہ کسی بھی درجے میں شعر کے ساتھ کوئی مشابہت نہ پیدا ہو جائے۔

قرآن مجید کا سب سے چھوٹا یونٹ آیت ہے۔ یعنی قرآن مجید کی ابتدائی اکائی کے لیے لفظ آیت اخذ کیا گیا ہے۔ آیت کے معنی نشانی کے ہیں۔ قرآنی آیت گویا اللہ تعالیٰ کے علم و حکمت کی نشانی ہے۔ آیت کا لفظ قرآن مجید میں بہت سے معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی۔ اس کائنات میں ہر طرف اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ہیں۔ کائنات کی ہر شے اللہ تعالیٰ کی قدرت' اس کے علم اور اس کی حکمت کی گواہی دے رہی ہے۔ گویا ہر شے اللہ کی نشانی ہے۔ پھر کچھ نشانیاں ہمارے اندر ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَ فِی الۡاَرۡضِ اٰیٰتٌ لِّلۡمُوۡقِنِیۡنَ ﴿۲۰﴾ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے۔ اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟'' مزید فرمایا: ﴿سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۵۳) ''عنقریب ہم اُن کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی' یہاں تک کہ اُن پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے''۔ انگریزی میں آیت کے لیے ہم لفظ verse بول دیتے ہیں' مگر verse تو شعر کو کہتے ہیں جبکہ قرآن کی آیات نہ تو شعر ہیں' نہ مصرعے ہیں' نہ جملے ہیں۔ پس بعینہٖ لفظ آیت ہی کو عام کرنا چاہیے۔ بہرحال کچھ آیاتِ آفاقی ہیں' یعنی اللہ کی نشانیاں' کچھ

آیاتِ انفسی ہیں' وہ بھی اللہ کی نشانیاں ہیں اور آیاتِ قرآنیہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور علمِ کامل کی نشانیاں ہیں۔ یہ لفظ قرآن کی اکائی کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

جان لینا چاہیے کہ آیات کا تعین کسی گرامر' بیان یا نحو کے اصول پر نہیں ہے' اس میں کوئی اجتہاد دخل نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے ایک اصطلاح ''توقیفی'' استعمال ہوتی ہے' یعنی یہ رسول اللہ ﷺ کے بتانے پر موقوف ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آیات بہت طویل بھی ہیں۔ ایک آیت آیۃ الکرسی ہے جس میں مکمل دس جملے ہیں' لیکن بعض آیات حروفِ مقطعات پر بھی مشتمل ہیں۔ ﴿حٰمٓ ①﴾ ایک آیت ہے' حالانکہ اس کا کوئی مفہوم معلوم نہیں ہے' عام زبان کے اعتبار سے اس کے معانی معین نہیں کیے جا سکتے۔ یہ تو حروفِ تہجی ہیں۔ اس کو مرکب کلام بھی نہیں کہہ سکتے' کیونکہ اس کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جاتا ہے۔ اس لیے یہ حروفِ مقطعات کہلاتے ہیں۔ ﴿حٰمٓ ① عٓسٓقٓ ②﴾ ان کو جمع نہیں کر سکتے' یہ توڑ توڑ کر علیحدہ علیحدہ پڑھے جائیں گے۔ اسی طرح ''الٓمٓ'' کو ''اَلِفْ'' نہیں پڑھا جا سکتا۔ لیکن یہ بھی آیت ہے۔ اس ضمن میں ایک بات یاد رکھئے کہ جہاں حروفِ مقطعات میں سے ایک ایک حرف آیا ہے جیسے ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّكْرِ ①﴾' ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ①﴾' ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ①﴾ یہاں ایک حرف پر آیت نہیں بنی' لیکن دو دو حروف پر آیتیں بنی ہیں۔ ''حٰمٓ'' قرآن میں سات جگہ آیا ہے اور یہ مکمل آیت ہے۔ الٓمٓ آیت ہے۔ البتہ ''الٓرٰ'' تین حروف ہیں اور وہ آیت نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کی بنیاد کسی اصول' قاعدے یا اجتہاد پر نہیں ہے' بلکہ یہ امور کلیۃً توقیفی ہیں کہ حضور ﷺ کے بتانے سے معلوم ہوئے ہیں۔ البتہ پھر حضور ﷺ سے چونکہ مختلف روایات ہیں' اس لیے اس پہلو سے کہیں کہیں فرق واقع ہوا ہے۔ چنانچہ آیاتِ قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے۔ اس پر تو اتفاق ہے کہ آیات کی تعداد چھ ہزار سے زائد ہے' لیکن بعض کے نزدیک کم و بیش ۶۲۱۶' بعض کے نزدیک ۶۲۳۶ اور بعض کے نزدیک ۶۶۶۶ ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ بعض سورتوں کے اندر آیات کے تعین میں بھی فرق ہے۔ لیکن یہ سب کسی کا اپنا اجتہاد نہیں ہے' بلکہ سب کے سب اعداد و شمار حضور ﷺ سے نقل ہونے کی بنیاد پر ہیں۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ آیت بسم اللہ قرآن حکیم میں ۱۱۳ مرتبہ سورتوں کے شروع میں آتی ہے (کیونکہ سورتوں کی کُل تعداد ۱۱۴ ہے اور ان میں سے صرف ایک سورت سورۃ التوبہ کے شروع میں بسم اللہ نہیں آتی۔) اگر اس کو ہر مرتبہ شمار کیا جائے تو ۱۱۳ تعداد بڑھ جائے گی' ہر مرتبہ شمار نہ کیا جائے تو ۱۱۳ تعداد کم ہو جائے گی۔ اس اعتبار سے آیاتِ قرآنیہ کی تعداد متفق علیہ نہیں ہے' بلکہ اس میں اختلاف ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا کہ حروفِ مقطعات پر بھی آیت ہے' مرکباتِ ناقصہ پر بھی آیت ہے' جیسے ﴿وَالْعَصْرِ ①﴾ کہیں آیت مکمل جملہ بھی ہے' اور ایسی آیتیں بھی ہیں جن میں دس دس جملے ہیں۔

قرآن حکیم کی آیتیں جمع ہوتی ہیں تو سورتیں وجود میں آتی ہیں۔ سورت کا لفظ ''سُوْر'' سے ماخوذ ہے اور یہ لفظ سورۃ الحدید میں فصیل کے معنی میں آیا ہے۔ پچھلے زمانے میں ہر شہر کے باہر' گرداگرد ایک فصیل ہوتی تھی جو شہر کا احاطہ کر لیتی تھی' شہر کی حفاظت کا کام بھی دیتی تھی اور حد بندی بھی کرتی تھی۔ آیات کو جب جمع کیا گیا تو اس سے جو فصیلیں وجود میں آئیں وہ سورتیں ہیں۔ فصل علیحدہ کرنے والی شے کو کہتے ہیں۔ تو گویا ایک سورۃ دوسری سورۃ سے علیحدہ ہو رہی ہے۔ فصیل علیحدگی کی بنیاد ہے۔ فصیل کے لیے ''سُوْر'' کا لفظ مستعمل ہے' پھر اس سے سورت بنا ہے۔ البتہ یہ سورتیں ''ابواب'' نہیں ہیں' بلکہ جس طرح آیت کے لیے لفظ verse مناسب نہیں اسی طرح سورت کے لیے لفظ ''باب'' یا chapter درست نہیں۔

اب جان لیجیے کہ جیسے آیات کا معاملہ ہے ایسے ہی سورتوں کا بھی ہے۔ چنانچہ سورتیں بہت چھوٹی بھی ہیں۔ قرآن مجید کی تین سورتیں صرف تین تین آیات پر مشتمل ہیں: سورۃ العصر' سورۃ النصر اور سورۃ الکوثر۔ جبکہ تین سورتیں ۲۰۰ سے زائد آیات پر مشتمل ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی ۲۸۵ یا ۲۸۶ آیات ہیں۔ (سورۃ البقرۃ کی آیات کی تعداد کے اعتبار سے رائے میں فرق ہے۔) سب سے زیادہ آیات سورۃ البقرۃ میں ہیں۔ پھر سورۃ الشعراء میں ۲۲۷ اور سورۃ الاعراف میں ۲۰۶ آیات ہیں۔ محققین وعلماء کا اس پر اجماع ہے کہ آیات کی طرح سورتوں کا تعین بھی حضور ﷺ نے خود فرمایا۔ اگرچہ ایک ضعیف سا قول ملتا ہے کہ شاید یہ کام صحابہ کرام ؓ نے کسی اجتہاد سے کیا ہو' مگر یہ مختار قول نہیں ہے' ضعیف ہے۔ اجماع اسی پر ہے کہ آیتوں کی تعیین بھی توقیفی اور سورتوں کی تعیین بھی توقیفی ہے۔

قرآن حکیم کی سات منازل

دورِ صحابہؓ میں ہمیں ایک تقسیم اور ملتی ہے اور وہ ہے سات منزلوں کی شکل میں سورتوں کی گروپنگ۔ انہیں احزاب بھی کہتے ہیں۔ ''حزب'' کا لفظ احادیث میں ملتا ہے' لیکن وہ ایک ہی معنی میں نہیں ہوتا۔ یہ لفظ اس معنی میں بھی استعمال ہوتا تھا کہ ہر شخص اپنے لیے تلاوت کی ایک مقدار معین کر لیتا تھا کہ میں اتنی مقدار روزانہ پڑھوں گا۔ یہ گویا اس کا اپنا حزب ہے۔ چنانچہ حضرت عمر بن خطاب ؓ سے مروی ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ نَامَ عَنْ حِزْبِهٖ مِنَ اللَّيْلِ، اَوْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ، فَقَرَأَهُ مَا بَيْنَ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الظُّهْرِ، كُتِبَ لَهٗ كَاَنَّمَا قَرَأَهُ مِنَ اللَّيْلِ)) (اخرجه الجماعة الا البخاری)

''جو شخص نیند (یا بیماری) کی وجہ سے رات کو (تہجد میں) اپنے حزب کو پورا نہ کر سکے' پھر وہ فجر اور ظہر کے درمیان اس کی تلاوت کر لے تو اس کے لیے اتنا ہی ثواب لکھا جائے گا گویا اس نے اسے رات کے دوران پڑھا ہے''۔ (یہ حدیث بخاری کے سوا دیگر ائمہ حدیث نے روایت کی ہے۔)

یعنی جو شخص کسی وجہ سے کسی رات اپنے حزب کو پورا نہ کر سکے' جتنا بھی نصاب اس نے معین کیا ہو' کسی بیماری کی وجہ سے' یا نیند کا غلبہ ہو جائے' تو اسے چاہیے کہ اپنی اس قراءت یا تلاوت کو وہ دن کے وقت ضرور پورا کر لے۔ صحابہ کرام ؓ میں سے اکثر کا معمول تھا کہ ہر ہفتے قرآن مجید کی تلاوت ختم کر لیتے تھے۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کے سات حصے ایسے ہو جائیں کہ ایک حصہ روزانہ تلاوت کریں تو ہر ہفتے قرآن مجید کا دَور مکمل ہو جائے۔ اس لیے سورتوں کے سات مجموعے یا گروپ بنا دیے گئے۔ ان گروپوں کے لیے آج کل ہمارے ہاں جو لفظ مستعمل ہے وہ ''منزل'' ہے' لیکن احادیث و روایات میں حزب کا لفظ آتا ہے۔

احزاب یا منازل کی اس تقسیم میں بڑی خوبصورتی ہے۔ ایسا نہیں کیا گیا کہ یہ ساتوں حصے بالکل مساوی کیے جائیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ظاہر بات ہے کہ سورتیں ٹوٹ جاتیں' ان کی فصلیں ختم ہو جاتیں۔ چنانچہ ہر حزب میں پوری پوری سورتیں جمع کی گئیں۔ اس طرح احزاب یا منزلوں کی مقداریں مختلف ہو گئیں۔ چنانچہ کچھ حزب چھوٹے ہیں کچھ بڑے ہیں' لیکن ان کے اندر سورتوں کی فصلیں نہیں ٹوٹیں' یہ ان کا حسن ہے۔ غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شے بھی شاید اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ منزلوں کی تعیین بھی توقیفی ہے' لیکن منزلوں کی اس تقسیم میں گنتی کے اعتبار سے جو حسن پیدا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہی کا ایک مظہر ہے۔ سورۃ الفاتحہ کو الگ رکھ دیا جائے کہ یہ تو قرآن حکیم کا مقدمہ یا دیباچہ ہے تو اس

کے بعد پہلا حزب یا منزل تین سورتوں (البقرۃ' آل عمران' النساء) پر مشتمل ہے۔ دوسری منزل پانچ سورتوں پر' تیسری منزل سات سورتوں پر' چوتھی منزل نو سورتوں پر' پانچویں منزل گیارہ سورتوں پر اور چھٹی منزل تیرہ سورتوں پر مشتمل ہے' جبکہ ساتویں منزل (حزبِ مفصّل) جو کہ آخری منزل ہے' اس میں ۶۵ سورتیں ہیں۔ آخر میں سورتیں چھوٹی چھوٹی ہیں۔ یاد رہے کہ ۶۵ بھی ۱۳ کا multiple بنتا ہے (۶۵ = ۱۳×۵)۔ سورتوں کی تعداد جیسا کہ ذکر ہو چکا ۱۱۴ ہے۔ یہ تعداد متفق علیہ ہے' جس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

آج کل جو قرآن مجید حکومت سعودی عرب کے زیر اہتمام بہت بڑی تعداد میں بڑی خوبصورتی اور نفاست سے شائع ہوتا ہے' اس میں حزب کا لفظ بالکل ایک نئے معنی میں آیا ہے۔ انہوں نے ہر پارے کو دو حزب میں تقسیم کر لیا ہے' گویا نصف پارے کی بجائے لفظ حزب ہے۔ پھر وہ حزب بھی چار حصوں میں منقسم ہے: رُبع الحزب، نصفُ الحزب اور پھر ثلاثۃُ ارباعِ الحزب۔ اس طرح انہوں نے ہر پارے کے آٹھ حصے بنا لیے ہیں۔ یہ لفظ حزب کا بالکل نیا استعمال ہے۔ اس کی کیا سند اور دلیل ہے اور یہ کہاں سے ماخوذ ہے' یہ میرے علم میں نہیں ہے۔

انسانی کلام حروف واصوات سے مرتّب ہوتا ہے اور ہر زبان میں حروفِ ہجائیہ ہوتے ہیں۔ پھر حروف مل کر کلمات بناتے ہیں۔ کلمات سے کلام وجود میں آتا ہے' خواہ وہ کلام منظوم ہو یا نثر ہو۔ اسی طرح قرآن مجید کی ترکیب ہے۔ حروف سے مل کر کلمات بنے' کلمات نے آیات کی شکل اختیار کی' آیات جمع ہوئیں سورتوں کی شکل میں اور سورتیں جمع ہو گئیں منزلوں کی شکل میں۔

رکوعوں اور پاروں کی تقسیم

سورتوں کی پہلی تقسیم رکوعوں میں ہے۔ یہ تقسیم دورِ صحابہؓ اور دورِ نبویؐ میں موجود نہیں تھی۔ یہ تقسیمیں زمانۂ مابعد کی پیداوار ہیں۔ رکوعوں کی تقسیم بڑی سورتوں میں کی گئی۔ ۳۵ سورتیں ایسی ہیں جو ایک ہی رکوع پر مشتمل ہیں' یعنی وہ اتنی چھوٹی ہیں کہ انہیں ایک رکعت میں آسانی سے پڑھا جا سکتا ہے' لیکن بقیہ سورتیں طویل ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ۲۸۵ یا ۲۸۶ آیات ہیں اور اس کے ۴۰ رکوع ہیں۔ حضور ﷺ سے منقول ہے کہ آپؐ نے ایک رات ان تین سورتوں (البقرۃ' آل عمران' النساء) کی منزل ایک رکعت میں مکمل کی ہے' لیکن یہ تو استثناءات کی بات ہے۔ عام طور پر تلاوت کی وہ مقدار جو ایک رکعت میں بآسانی پڑھی جا سکتی ہو' ایک رکوع پر مشتمل ہوتی ہے۔ رکوع رکعت سے ہی بنا ہے۔ یہ تقسیم حجاج بن یوسف کے زمانے میں یعنی تابعین کے دور میں ہوئی ہے۔ لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ یہ تقسیم بڑی محنت سے معانی پر غور کرتے ہوئے کی گئی ہے کہ کسی مقام پر ایک مضمون مکمل ہو گیا اور دوسرا مضمون شروع ہو رہا ہے تو وہاں اگر رکوع کر لیا جائے تو بات ٹوٹے گی نہیں۔ اگرچہ ہمارے ہاں عام طور پر ائمہ مساجد پڑھے لکھے لوگ نہیں ہوتے' عربی زبان سے واقف نہیں ہوتے' لہٰذا اکثر ایسی تکلیف دہ صورتِ حال پیدا ہوتی ہے کہ وہ ایسی جگہ پر رکوع کر دیتے ہیں جہاں کلام کا ربط منقطع ہو جاتا ہے۔ پھر اگلی رکعت میں وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں سے بات معنوی اعتبار سے بہت ہی گراں گزرتی ہے۔ رکوعوں کی تقسیم بالعموم بہت عمدہ ہے' لیکن چند ایک مقامات پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ آیت یہاں سے ہٹا کر رکوع ماقبل میں شامل کی گئی ہوتی یا رکوع کا نشان اس آیت سے پہلے ہوتا تو معانی اور مفہوم کے اعتبار سے بہتر ہوتا۔ بہرحال اکثر وبیشتر رکوعوں کی تقسیم معنوی اعتبار سے صحیح ہے جو بڑی محنت سے گہرائی میں غور کر کے کی گئی ہے۔

اس کے علاوہ ایک تقسیم پاروں کی شکل میں ہے۔ یہ تقسیم تو اور بھی بعد کے زمانے کی ہے اور بڑی بھونڈی تقسیم ہے' اس لیے

کہ اس میں سورتوں کی فصلیں توڑ دی گئی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں کا جوشِ ایمان کم ہوا اور لوگوں نے معمول بنانا چاہا کہ ہر مہینے میں ایک مرتبہ قرآن ختم کرلیں تب اُن کو ضرورت پیش آئی کہ اس کو تیس حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے کسی نے غالباً یہ حرکت کی کہ اُس کے پاس جو مصحف موجود تھا اُس نے اس کے صفحے گن کر تیس پر تقسیم کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح جہاں بھی صفحہ کٹ گیا وہیں نشان لگا دیا اور اگلا پارہ شروع ہو گیا۔ اس بھونڈی تقسیم کی مثال دیکھئے کہ سورۃ الحجر کی ایک آیت تیرہویں پارے میں ہے جبکہ باقی پوری سورت چودھویں پارے میں ہے۔ ہمارے ہاں جو مصحف ہیں ان میں آپ کو یہی شکل نظر آئے گی۔ سعودی عرب سے جو قرآن مجید بڑی تعداد میں شائع ہو کر پوری دنیا میں پھیلا ہے' یہ اب پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اسی انداز سے شائع کیا جاتا ہے جس سے کہ ہم مانوس ہیں۔ البتہ اہلِ عرب کے لیے جو قرآن مجید شائع کیا جاتا ہے اس میں رموزِ اوقاف اور علاماتِ ضبط بھی مختلف ہیں اور اس میں چودھواں جزء سورۃ الحجر سے شروع کیا جاتا ہے۔ گویا وہ تقسیم جو ہمارے ہاں ہے اس میں انہوں نے اجتہاد سے کام لیا ہے' اگرچہ پاروں کی تقسیم باقی رکھی ہے۔ بعض دوسرے عرب ممالک سے جو قرآن مجید شائع ہوتے ہیں' ان میں پاروں کا ذکر ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ کوئی متفق علیہ چیز نہیں ہے اور زمانۂ تابعین میں بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے' یہ اس سے بہت بعد کی بات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ اور حضرت عمران بن حصین ؓ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ)) اس حدیث کی رو سے بہترین ادوار تین ہی ہیں ـــــ دورِ صحابہ' دورِ تابعین' پھر دورِ تبع تابعین۔ ان تین زمانوں کو ہم "قرونٌ مشهودٌ لها بالخير" کہتے ہیں۔ باقی اس کے بعد کا معاملہ حجت نہیں ہے' اس کی دین کے اندر کوئی مستقل اور دائمی اہمیت نہیں ہے۔

ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف کا اختلاف

قرآن حکیم کی ترتیب کے ضمن میں پہلی بات جو بالکل متفق علیہ اور ہر شک وشبہ سے بالا ہے وہ یہ ہے کہ ترتیبِ نزولی بالکل مختلف ہے اور ترتیبِ مصحف بالکل مختلف ہے۔ اکثر و بیشتر جو سورتیں ابتدا میں نازل ہوئیں وہ آخر میں درج ہیں اور ہجرت کے بعد جو سورتیں نازل ہوئی ہیں (البقرۃ' آلِ عمران' النساء' المائدۃ) ان کو شروع میں رکھا گیا ہے۔ تو اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف مختلف ہے۔

جہاں تک ترتیبِ نزولی کا تعلق ہے' اس سے ہر طالب علم کو دلچسپی ہوتی ہے جو قرآن مجید پر غور کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے کہ ترتیبِ نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کے معانی اور مفاہیم کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ایک خاص پس منظر کے ساتھ سورتیں جڑتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ ابتدا میں کیا حالات تھے جن میں یہ سورتیں نازل ہوئیں' پھر حالات نے کیا پلٹا کھایا تو اگلی سورتیں نازل ہوئیں۔ چنانچہ ترتیبِ نزولی کے حوالے سے قرآن حکیم کو مرتب کیا جائے تو ایک اعتبار سے وہ سیرت النبیؐ کی کتاب بن جائے گی۔ اس لیے کہ آغازِ وحی کے بعد سے لے کر آپؐ کے انتقال تک وہ زمانہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ دوسرے یہ کہ اس پورے زمانے کے ساتھ قرآن مجید کی آیات اور سورتوں کا جو مجموعی ربط ہے' ترتیبِ نزولی کی مدد سے اسے سمجھنے اور غور و فکر کرنے میں مدد ملتی ہے۔ پس قرآن مجید کے ہر طالب علم کو اس سے دلچسپی ہونا سمجھ میں آتا ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ ؓ کے بارے میں روایات ملتی ہیں کہ انہوں نے ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے قرآن حکیم کو مرتب کیا تھا۔ حضرت علی ؓ کے بارے میں یہ بات

بہت شدّ و مدّ کے ساتھ کہی جاتی ہے کہ انہوں نے بھی اس کو ترتیب نزولی کے اعتبار سے مرتب کیا تھا' اور عوام کی سطح پر یہ مشہور ہے کہ اہلِ تشیع اسی کو اصل اور مستند قرآن مانتے ہیں اور حضرت علی ؓ کا یہ مصحف ان کے بارہویں امام کے پاس ہے' جو ایک غار میں روپوش ہیں۔ قیامت کے قریب جب وہ ظاہر ہوں گے تب وہ اپنا یہ مصحف یعنی ''اصل قرآن'' لے کر آئیں گے۔ گویا اہلِ تشیع یہ قرآن اُس وقت تک کے لیے ہی قبول کرتے ہیں۔ عام طور پر ان کی طرف یہی بات منسوب ہے' لیکن دورِ حاضر کے بعض شیعہ علماء اس تصور کے قائل نہیں ہیں۔ ایک شیعہ عالم دین سید ہادی علی نقوی نے بہت شدّ و مدّ کے ساتھ اس تصوّر کی نفی کی ہے اور کہا ہے کہ ''ہم اسی قرآن کو مانتے ہیں' یہی اصل قرآن ہے اور اسے من وعن محفوظ مانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کوئی آیت اس سے خارج نہیں ہوئی اور کوئی شے باہر سے بعد میں اس میں داخل نہیں ہوئی۔ یہی جو ''دُفَّتَین'' یعنی جلد کے دو گتّوں کے مابین ہے' یہی حقیقی اور اصلی قرآن ہے۔''

بہرحال اگر حضرت علی ؓ کے پاس ایسا کوئی مصحف تھا جسے آپ نے ترتیبِ نزولی کے مطابق مرتب کیا تھا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ علمی اور تحقیقی اعتبار سے قرآن حکیم پر غور وفکر کرنے کے لیے قرآن مجید کے بعض انگریزی تراجم میں بھی ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے سورتوں کو مرتب کر کے ترجمہ کیا گیا ہے۔ (محمد عزّۃ دروزۃ نے بھی اپنی تفسیر ''التفسیر الحدیث'' میں سورتوں کو نزولی اعتبار سے ترتیب دیا ہے۔) علمی اعتبار سے اس میں کوئی حرج نہیں' لیکن اصل حجیت ترتیب مصحف کی ہے۔ یہ ترتیب توقیفی ہے۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ترتیب ہے اور یہی ترتیب لوح محفوظ میں ہے۔ اصل قرآن تو وہی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝﴾ (الواقعۃ) اور: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝﴾ (البروج)۔ ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں جلال الدین سیوطیؒ نے بہت ہی زور اور تاکید کے ساتھ کسی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر تمام انسان اور جن مل کر کوشش کر لیں تب بھی ترتیبِ نزولی پر قرآن کو مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کے بارے میں ہمارے پاس مکمل معلومات نہیں ہیں۔ بہت سی سورتوں کے اندر بعد میں نازل ہونی والی آیات پہلے آ گئی ہیں اور شروع میں نازل ہونی والی بعد میں آئی ہیں۔ اس اعتبار سے ایک ایک آیت کے بارے میں معیّن کرنا اور اس کی ترتیب کے بارے میں اجماع ناممکن ہے۔ چنانچہ اصل مصحف وہی ہے جو ہمارے پاس ہے اور اس کی ترتیب بھی توقیفی ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے بتائی ہے۔

اس ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے اِس دور میں سورتوں کی ایک نئی گروپنگ کی طرف راہنمائی ہوئی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ نے خاص طور پر اپنی توجہ کو نظمِ قرآن پر مرکوز کیا' آیات کا باہمی ربط تلاش کیا۔ نیز یہ کہ آیتوں کی وہ کون سی قدرِ مشترک ہے جس کی بنا پر ان کو سورتوں میں جمع کیا گیا — پھر یہ کہ ہر سورۃ کا ایک عمود اور مرکزی مضمون ہے' بظاہر آیات غیر مربوط نظر آتی ہیں لیکن درحقیقت اُن کے مابین ایک منطقی ربط موجود ہے اور ہر آیت اس سورۃ کے عمود کے ساتھ مربوط ہے — مزید یہ کہ سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں — ان چیزوں پر مولانا فراہیؒ نے زیادہ توجہ کی۔ مولانا اصلاحی صاحب نے اس بات کو مزید آگے بڑھایا ہے۔

اس ضمن میں ایک اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے' جسے رفع کر دینا ضروری ہے کہ قرآن مجید کا یہ پہلو اس زمانے میں کیوں سامنے آیا اور اس سے پہلے اس پر غور کیوں نہیں ہو سکا؟ کیا ہمارے اسلاف قرآن مجید پر تدبّر کا حق ادا نہیں کرتے تھے؟ اس اشتباہ کو اپنے ذہن میں نہ آنے دیں' اس لیے کہ قرآن مجید کی شان یہ ہے کہ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ حضور ﷺ کا اپنا قول ہے: ((لَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ))۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص دور کے محدّثین' محققین' مفسّرین قرآن مجید کے علم کا بتمام وکمال

احاطہ کر چکے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ قرآن مجید پر بھی طعن ہوتا اور خود حضورؐ کے اس قول کی بھی نفی ہوتی۔ یہ تو جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھے گا قرآن مجید کے عجائب' اس کی حکمتیں' اس کے علوم و معارف کے نئے نئے خزانے برآمد ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ مطالعہ قرآن کے بعد ہم یہ محسوس کریں کہ ہم نے اپنی استطاعت کے مطابق اس کو سیکھا ہے اور بعد میں آنے والے اس میں سے کچھ اور بھی حاصل کریں گے' وہ ہمیشہ اس کے لیے کوشاں رہیں گے' اس میں غور و فکر اور تدبر کرتے رہیں گے اور نئے نئے علوم اور نئے نئے نکات اس میں سے برآمد ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت میں یہی زمانہ اس انکشاف کے لیے معین تھا' اور ظاہر بات ہے کہ حکمتِ قرآنی کا جو بھی کوئی نیا پہلو دریافت ہوگا وہ کسی انسان ہی کے ذریعے سے ہوگا۔ لہٰذا اس کے لیے طبیعت کے اندر بُعد محسوس نہ کریں۔ بہرحال مولانا فراہیؒ نے نظم قرآن کو اپنا خصوصی موضوع بنایا۔ وہ تفسیرِ قرآن لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ نہیں سکے' صرف چند سورتوں کی تفاسیر انہوں نے لکھی ہیں۔ ان میں سے بھی بعض نامکمل ہیں۔ وہ ایک مفکر قسم کے انسان تھے' مصنف قسم کے انسان نہیں تھے۔ مفکر انسان مسلسل غور کرتا رہتا ہے اور اس کے سامنے نئے نئے پہلو آتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا تصنیف و تالیف کا انداز یہ تھا کہ انہوں نے مختلف موضوعات پر فائل کھول رکھے تھے۔ جب کوئی نیا خیال آتا تو کاغذ پر لکھ کر متعلقہ فائل میں شامل کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف ان کی وفات کے بعد کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں' جبکہ ان کے زمانے میں وہ صرف فائلوں کی شکل میں تھیں اور کسی شے کے چھپنے کی نوبت آئی ہی نہیں۔ سوچ بچار کا تسلسل ان کے آخری لمحے تک جاری رہا۔ ''مقدمہ نظام القرآن'' واقعتاً ان کے فکر اور سوچ کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ اس ضمن میں ان کے شاگرد رشید امین احسن اصلاحی صاحب نے بات کو آگے بڑھایا ہے۔ نظمِ قرآن کے بارے میں ان حضرات کے نتیجہ فکر کے چند نکات ملاحظہ ہوں:

(i) ہر سورت کا ایک عمود ہے' جیسے ایک ہار کی ڈوری ہے اور اس میں موتی پروئے ہوئے ہیں۔ یہ ڈوری دیکھنے والوں کو نظر نہیں آتی' موتی نظر آتے ہیں' لیکن ان کو باندھنے والی شے تو ڈوری ہے جس میں وہ پروئے گئے ہیں۔ اسی طرح ہر سورت کا ایک مرکزی مضمون یا عمود ہے جس کے ساتھ اس کی تمام آیات مربوط ہیں۔

(ii) قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ ایک ہی مضمون کا ایک رُخ ایک سورت میں آجاتا ہے اور اسی کا دوسرا رخ اس جوڑے کے دوسرے حصے میں آکر مضمون کی تکمیل کر دیتا ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے۔ البتہ جہاں تک اس اصول کے انطباق کا تعلق ہے اس میں اختلاف کی گنجائش ہے اور جو حضرات میرے دروس میں تسلسل سے شرکت کرتے رہے ہیں انہیں معلوم ہے کہ مجھے بہت سے مواقع پر اصلاحی صاحب سے اختلاف بھی ہے' لیکن اصولاً یہ بات درست ہے کہ قرآن مجید کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ تاہم بعض سورتیں منفرد حیثیت کی مالک ہیں' ان کا جوڑا اس جگہ پر موجود نہیں ہے۔ اگرچہ میں نے تحقیق کی ہے کہ اکثر و بیشتر ایسی سورتوں کے جوڑے بھی معناً قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ النور تنہا اور منفرد ہے' سورۃ الاحزاب بھی منفرد اور تنہا ہے' لیکن یہ دونوں آپس میں جوڑا ہیں اور ان میں جوڑا ہونے کی نسبت بتمام و کمال موجود ہے۔ اسی طرح سورۃ الفاتحہ منفرد ہے۔ وہ تو اس اعتبار سے بھی منفرد ہے کہ واقعتاً اس کا بتمام و کمال جوڑا بننا ممکن نہیں' وہ اپنی جگہ پر قرآن حکیم اور سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ ہے' لیکن سورۃ الناس میں غور کریں تو معناً یہ سورت سورۃ الفاتحہ کا جوڑا بنتی ہے۔ اس لیے کہ سورۃ الفاتحہ میں استعانت ہے اور

سورۃ الناس میں استعاذہ۔ پھر سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی تین شانیں رَبّ' مَلِک' الٰہ ہیں اور یہی تین شانیں سورۃ الناس میں بھی ہیں۔

(iii) تلاوت کے لیے سات منزلوں کے علاوہ قرآن حکیم میں سورتوں کی ایک معنوی گروپنگ بھی ہے۔ اس اعتبار سے بھی سورتوں کے سات گروپ ہیں اور ہر گروپ میں مکی اور مدنی دونوں طرح کی سورتیں شامل ہیں۔ ہر گروپ میں ایک یا ایک سے زیادہ مکی سورتیں اور اس کے بعد ایک یا ایک سے زائد مدنی سورتیں ہیں۔ ایک گروپ کی مکی اور مدنی سورتوں میں وہی نسبت ہے جو ایک جوڑے کی دو سورتوں میں ہوتی ہے۔ جیسے ایک مضمون کی تکمیل ایک جوڑے کی سورتوں میں ہوتی ہے' یعنی ایک رُخ ایک فرد میں اور دوسرا رُخ دوسرے فرد میں' اسی طرح ہر گروپ کا ایک مرکزی مضمون اور عمود ہے' جس کا ایک رُخ مکی سورتوں میں اور دوسرا رُخ مدنی سورتوں میں آجاتا ہے۔ اس طرح غور و فکر اور تدبّر کے نئے میدان سامنے آرہے ہیں۔ جو انسان بھی ان کا عمود متعین کرنے میں غور و فکر کرے گا وہ کسی نتیجے پر پہنچے گا' اگرچہ عمود متعین کرنے میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ سب سے بڑا گروپ پہلا ہے جس میں مکی سورت صرف ایک یعنی سورۃ الفاتحہ جبکہ مدنی سورتیں چار ہیں جو سوا چھ پاروں پر پھیلی ہوئی ہیں' یعنی سورۃ البقرۃ' آلِ عمران' النساء اور المائدۃ۔ دوسرا گروپ اس اعتبار سے متوازن ہے کہ اس میں دو سورتیں مکّی اور دو مدنی ہیں۔ سورۃ الانعام اور سورۃ الاعراف مکی ہیں' جبکہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ مدنی ہیں۔ تیسرے گروپ میں سورۂ یونس سے سورۃ المؤمنون تک چودہ مکّی سورتیں ہیں۔ یہ تقریباً سات پارے بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مدنی سورت ہے اور وہ سورۃ النور ہے۔ اس کے بعد چوتھے گروپ میں سورۃ الفرقان سے سورۃ السجدۃ تک مکیات ہیں' پھر ایک مدنی سورت سورۃ الاحزاب ہے۔ پانچویں گروپ میں سورۂ سبا سے سورۃ الاحقاف تک مکیات ہیں' پھر تین مدنی سورتیں' سورۂ محمدؐ' سورۃ الفتح اور سورۃ الحجرات ہیں۔ اس کے بعد چھٹے گروپ میں پھر سورۂ ق سے سورۃ الواقعہ تک سات مکّیات ہیں جن کے بعد پھر دس مدنیات ہیں سورۃ الحدید تا سورۃ التحریم۔ اسی طرح ساتویں گروپ میں بھی پہلے مکّی سورتیں ہیں اور آخر میں دو مدنی سورتیں۔ اس طرح یہ سات گروپ بنتے ہیں۔ یہ گروپ مولانا اصلاحی صاحب کے مرتّب کردہ ہیں۔ ان میں پہلا اور آخری گروپ اس اعتبار سے عکسی نسبت رکھتے ہیں کہ پہلے گروپ میں صرف ایک سورت سورۃ الفاتحہ مکی ہے اور سوا چھ پاروں پر مشتمل چار طویل ترین سورتیں مدنی ہیں' جبکہ آخری گروپ میں سورۃ الملک سے لے کر پورے دو پارے تقریباً مکّیات پر مشتمل ہیں' آخر میں صرف دو سورتیں ''معوذتین'' مدنی ہیں۔ یعنی یہاں نسبت بالکل عکسی ہے۔ لیکن دوسرا گروپ بھی متوازن ہے' یعنی دو سورتیں مکّی' دو مدنی — اور چھٹا گروپ بھی متوازن ہے کہ اس میں سات سورتیں مکّی ہیں (سورۃ ق سے سورۃ الواقعہ تک) جبکہ دس سورتیں مدنی ہیں (سورۃ الحدید سے سورۃ التحریم تک) لیکن حجم کے اعتبار سے تقریباً برابر ہیں۔ یہ بھی غور و فکر اور سوچ بچار کا ایک موضوع ہے اور اس سے بھی قرآن مجید کی حکمت و ہدایت اور اس کے علم کے نئے نئے گوشے سامنے آرہے ہیں۔

قرآن حکیم کی سورتوں کے جوڑے ہونے کا معاملہ قرآن مجید میں بعض جگہوں پر تو بہت ہی نمایاں ہے۔ ''المُعوّذَتَین'' آخری دو سورتیں ہیں جو تعوّذ پر مشتمل ہیں: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۝۱﴾ اور: ﴿قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝۱﴾۔ اسی طرح الزّھراوَین ''دو نہایت تابناک سورتیں'' سورۃ البقرۃ اور آلِ عمران ہیں۔ حضور ﷺ نے ان دونوں کو بھی ایک نام دیا جیسے

آخری دو سورتوں کو ایک نام دیا۔ اسی طرح سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر میں اور سورۃ الضحیٰ اور سورۃ الانشراح میں معنوی ربط ہے۔ سورۃ التحریم اور سورۃ الطلاق میں تو یہ ربط بہت ہی نمایاں ہے۔ دونوں سورتوں کا آغاز بالکل ایک جیسا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اور ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ﴾۔ مضمون کے اندر بھی بڑی گہری مناسبت ہے۔ اس کے بعد سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کا جوڑا ہے۔ سورۃ الصف سَبَّحَ لِلّٰهِ سے اور سورۃ الجمعہ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ کے الفاظ سے شروع ہو رہی ہے۔ سورۃ الصف کی مرکزی آیت جو رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو معین کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ہے' جبکہ سورۃ الجمعہ کی مرکزی آیت جو حضور ﷺ کے انقلاب کا اساسی منہاج معین کر رہی ہے ﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ہے۔ بہر حال سورتوں کا جوڑا ہونا' سورتوں کا گروپ کی شکل میں ہونا' ان گروپس کا اپنا ایک عمود اور ایک مرکزی مضمون ہونا' پھر اس کے دوزخ بن جانا جو اُس کی مکیات اور مدنیات میں آتے ہیں' قرآن مجید کے علم و حکمت کے خزانے کے وہ دروازے ہیں جو اَب کھلے ہیں۔ اس طرح کے دروازے ہر دور میں کھلتے رہے ہیں اور آئندہ بھی کھلتے رہیں گے۔ چنانچہ قرآن مجید پر تذکر اور تدبر تسلسل کے ساتھ جاری رہنا چاہیے۔

پیچھے سات منزلوں اور سات احزاب کا ذکر ہو چکا۔ اب مکی اور مدنی سورتوں کے سات گروپس کا بیان ہوا۔ یہ دونوں قسم کے گروپ دو جگہ پر آ کر مل جاتے ہیں۔ پہلی منزل تو سورۃ النساء پر ختم ہو جاتی ہے اور پہلا گروپ سورۃ المائدۃ پر ختم ہوتا ہے۔ سورۃ التوبہ پر دوسری منزل بھی ختم ہوتی ہے اور دوسرا گروپ بھی ختم ہوتا ہے۔ سورۂ یونس سے تیسری منزل شروع ہوتی ہے اور تیسرا گروپ بھی شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مقام اور ہے۔ سورۂ ق سے آخری منزل بھی شروع ہو رہی ہے اور اسی سے چھٹا گروپ بھی شروع ہو رہا ہے۔ سورۂ ق چھٹے گروپ کی پہلی مکی سورۃ ہے۔ یہ چھٹا گروپ سورۃ التحریم پر ختم ہو جاتا ہے اور آخری گروپ سورۃ الملک سے شروع ہوتا ہے' لیکن جو منزل سورۂ ق سے شروع ہوتی ہے وہ سورۃ الناس تک ایک ہی ہے۔

یہ وہ چیزیں ہیں جو معلومات کے درجے میں سامنے رہیں اور ذہن میں موجود رہیں تو انسان جب غور کرتا ہے تو ان کے حوالے سے بعض اوقات حکمت کے بڑے قیمتی موتی ہاتھ لگتے ہیں۔

باب چہارم

تدوینِ قرآن

قرآن مجید کی تدوین کے ضمن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں مکمل ہوگئی تھی۔ کسی شاعر کا دیوان اس کی غزلوں اور قصائد پر مشتمل ہوتا ہے۔ قرآن مجید اللہ کا کلام ہے اور اس کی بھی تدوین ہوئی ہے۔ یہ بھی ایک دیوان کی شکل میں ہے' اس کو بھی جمع کیا گیا ہے۔ جمع و تدوینِ قرآن اپنی جگہ پر بہت اہم موضوع ہے۔ اس کے بارے میں خاص معلومات ہمارے ذہنوں میں ہر وقت مستحضر رہنی چاہئیں' کیونکہ عام طور پر اہلِ تشیع کے حوالے سے ہمارے ہاں جو چیزیں مشہور ہیں (واللہ اعلم وہ حقیقت پر مبنی ہیں یا محض مخالفین کا پراپیگنڈا ہے) ان کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں شبہات پیدا ہوئے ہیں اور وہ کافی بڑے حلقے کے اندر پھیلے ہیں۔

ہمارے ہاں جمعے کے خطبے جو مرتب کیے گئے ہیں اور عام خطیب پڑھتے ہیں' ان میں بھی ایسے الفاظ آگئے ہیں جو بہت بڑے بڑے مغالطوں کی بنیاد بن گئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی دشمن اسلام نے' کسی باطنی نے' کسی غالی قسم کے رافضی نے یہ الفاظ شامل کر دیے ہوں۔ بظاہر تعریف ہو رہی ہے مگر حقیقت میں تنقیص ہو رہی ہے اور دین کی جڑ کاٹی جا رہی ہے۔ اس کی مثال بھی اسی تدوین کے ذیل میں آئے گی۔

قرآن حکیم کی تدوین تین مراحل میں مکمل ہوئی۔ پہلی تدوین رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ہوگئی تھی' لیکن وہ تدوین اس شکل میں تھی کہ سورتیں معین ہوگئیں' سورتوں کی ترتیب معین ہوگئی۔ کتابی شکل میں قرآن مجید حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں موجود نہیں تھا۔ لوگوں کے پاس مختلف حصوں میں لکھا ہوا قرآن تھا۔ لوگ اونٹ کے شانے کی ہڈی (جو کافی چوڑی ہوتی ہے) پر لکھتے تھے یا کولہے کی ہڈی پر لکھا جاتا تھا۔ اونٹ کی پسلیاں (ribs) بھی بڑی چوڑی ہوتی ہیں' یہ بھی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ کاغذ اس زمانے میں کہاں تھا' کپڑا زیادہ دستیاب تھا' لہٰذا کپڑے پر بھی لکھا جاتا تھا۔ اسی طرح چھوٹے چھوٹے پتھروں پر بھی آیات لکھ لیتے تھے۔ یاد رہے کہ قرآن مجید کی اصل حیثیت ''قول'' کی ہے: ﴿اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿٤٠﴾﴾ (الحاقۃ) نہ تو یہ حضور ﷺ کو لکھی ہوئی شکل میں دیا گیا نہ حضور ﷺ نے لکھی ہوئی شکل میں اُمت کو دیا۔ حضور ﷺ کو بھی یہ پڑھایا گیا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ﴿٦﴾﴾ (الاعلیٰ) ''ہم آپ کو پڑھائیں گے' پھر آپ بھولیں گے نہیں''۔ یہ اوّلاً قولِ جبرائیلؑ' پھر قولِ محمد ﷺ بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔ جبرائیل علیہ السلام سے حضور ﷺ نے سنا' حضورؐ سے صحابہؓ نے سنا۔ چنانچہ اصل میں تو قرآن پڑھی جانے والی شے ہے' لیکن جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا آپ ﷺ اسے لکھوا بھی لیتے۔ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کتابتِ وحی کی ذمہ داری پر مامور تھے اور حضور ﷺ نے اس بات کا حکم بھی دے دیا تھا کہ ((لَا تَكْتُبُوْا عَنِّيْ غَيْرَ الْقُرْاٰنِ)) ''میری طرف سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو۔''

احادیث کو لکھنے سے حضور ﷺ نے منع فرما دیا تھا تاکہ کہیں اللہ اور رسولؐ کا کلام گڈمڈ نہ ہو جائے' صرف قرآن مجید کو ہی

لکھنے کا حکم دیا۔ لیکن اصل قرآن اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کے سینے میں جمع کیا اور محمد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کے سینوں میں جمع کر دیا۔ وہ قول سے قول کی شکل میں گیا ہے' لوگوں نے حضور ﷺ کے دہن مبارک سے سیکھا ہے۔ بہر حال رسول اللہ ﷺ کے دور میں لکھا ہوا قرآن بھی تھا' لیکن کتابی شکل میں جمع شدہ نہیں تھا۔ جمع شدہ شکل میں صرف سینوں میں تھا' حُفّاظ کو یاد تھا۔ انہیں یاد تھا کہ قرآن اس ترتیب کے ساتھ ہے۔ اس کے لیے سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ صحیح روایات کے مطابق ہر رمضان المبارک میں جتنا قرآن اُس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا تھا' حضور ﷺ اور حضرت جبرائیل ؑ اس کا دَور کرتے تھے' جیسا کہ ہمارے ہاں رمضان کے آنے سے پہلے حُفّاظ دَور کرتے ہیں' ایک حافظ سناتا ہے' دوسرا سنتا ہے تاکہ تراویح میں سنانے کے لیے تازہ ہو جائے۔ تو رمضان المبارک میں حضور ﷺ اور حضرت جبرائیلؑ مذاکرہ کرتے تھے' قرآن مجید کا دَور ہوتا تھا۔ آپ ﷺ کی زندگی کے آخری رمضان میں آپؐ نے حضرت جبرائیلؑ سے قرآن مجید کا دو مرتبہ مکمل دَور کیا۔ چنانچہ جہاں تک حافظے میں اور سینے میں قرآن کا مدوّن ہو جانا ہے وہ تو نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران مکمل ہو گیا تھا۔

تدوین قرآن کا دوسرا مرحلہ حضرت ابوبکر ؓ کے عہدِ خلافت میں آیا جب مرتدین اور مانعینِ زکوٰۃ سے جنگیں ہوئیں۔ جنگ یمامہ میں تو بہت بڑی تعداد میں صحابہ ؓ شہید ہوئے۔ یہ بڑی خون ریز جنگ تھی اور اس میں کثیر تعداد میں حُفّاظِ قرآن شہید ہو گئے تو تشویش پیدا ہوئی اور یہ خیال آیا کہ اس قرآن کو اب کتابی شکل میں جمع کر لینا چاہیے۔ یہ خیال سب سے پہلے حضرت عمر ؓ کے دل میں آیا۔ حضرت عمر ؓ نے یہ بات حضرت ابوبکر ؓ سے کہی تو وہ بڑے متردّد ہوئے کہ میں وہ کام کیسے کروں جو حضور ﷺ نے نہیں کیا! لیکن حضرت عمر ؓ اصرار کرتے رہے اور رفتہ رفتہ حضرت ابوبکر ؓ کو بھی اس پر انشراحِ صدر ہو گیا۔ انہوں نے حضرت عمر ؓ سے کہا کہ اب تمہاری اس بات کے لیے اللہ نے میرے سینے کو کشادہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد یہ ذمہ داری حضرت زید بن ثابت ؓ پر ڈالی گئی جو حضور ﷺ کے زمانے میں کاتبِ وحی تھے۔ آپ ﷺ کے چند خاص صحابہ جو کتابتِ وحی پر مامور تھے' ان میں حضرت زید بن ثابتؓ بہت معروف تھے۔ ان سے حضرت ابوبکر ؓ نے فرمایا کہ تم یہ کام کرو' اور ان کے ساتھ کچھ اور صحابہ کی ایک کمیٹی تشکیل دے دی۔ وہ بھی پہلے بہت متردّد رہے۔ ان کی دلیل بھی یہ تھی کہ جو کام حضور ﷺ نے نہیں کیا وہ میں کیسے کروں! علاوہ ازیں یہ تو پہاڑ جیسی ذمہ داری ہے' یہ میں کیسے اٹھاؤں! لیکن جب حضرات ابوبکر اور عمر ؓ دونوں کا اصرار ہوا تو ان کا بھی سینہ کھل گیا۔ پھر جن صحابہؓ کے پاس قرآن حکیم کا جو حصہ بھی لکھی ہوئی شکل میں تھا' ان سے لیا گیا اور مختلف شہادتوں اور حُفّاظ کی مدد سے عہدِ صدیقی میں قرآن پاک کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کر لیا گیا۔ یاد رہے کہ ایک کتاب کی شکل میں بھی قرآن مجید کی تدوین رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے دو سال کے اندر اندر مکمل ہو گئی۔ حضرت ابوبکر ؓ کا عہدِ خلافت کل سوا دو برس ہے۔

حضرت ابوبکر ؓ کی مجلس شوریٰ میں یہ مسئلہ بھی زیر غور آیا کہ حضور ﷺ کے زمانے میں تو قرآن ایک جلد کے مابین جمع نہیں کیا گیا' لہٰذا اس کا نام کیا رکھا جائے! ایک تجویز یہ آئی کہ اسے بھی انجیل کا نام دیا جائے۔ ایک رائے یہ دی گئی کہ اس کا نام ''سِفر'' ہو' اس لیے کہ سِفر کا لفظ توراۃ کی کتابوں کے لیے معروف چلا آ رہا تھا' جیسے سِفر ایوب ایک کتاب تھی۔ تو سِفر کتاب کو کہتے ہیں جس کی جمع ''اَسفار'' ہے اور یہ لفظ قرآن میں بھی آیا ہے۔ سِفر کا لفظی مطلب ہے: روشنی دینے والی۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ نے تجویز پیش کی کہ اس کا نام ''مصحف'' ہونا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ میرا آنا جانا حبشہ ہوتا ہے' وہاں کے لوگوں کے پاس ایک کتاب ہے اور وہ اسے مصحف کہتے ہیں۔ اب ''مصحف'' کے لفظ پر اتفاق و اجماع ہو گیا۔ چنانچہ قرآن کے لیے حضرت

ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تجویز پر مصحف نام رکھا گیا اور اس پر لوگوں کا اجماع ہوا۔ تدوینِ قرآن کا یہ دوسرا مرحلہ ہے۔

قرآن حکیم کی تلاوت کے ضمن میں ایک معاملہ چلا آ رہا تھا' جیسا کہ حدیث میں آتا ہے کہ قرآن مجید سات حروف پر نازل ہوا تھا۔ عربوں کی زبان تو ایک تھی لیکن بولیاں مختلف تھیں' الفاظ کے لہجے مختلف تھے۔ تو سب لوگوں کو اجازت دی گئی تھی کہ وہ اپنے اپنے لہجے کے اندر قرآن پڑھ لیا کریں تاکہ سہولت رہے' ورنہ بڑی مشقت کی ضرورت تھی کہ سب لوگ اپنے لہجے بدلیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انقلابی جِدّوجُہد کا tempo اتنا تیز تھا کہ ان کاموں کے لیے زیادہ فرصت نہیں تھی کہ اس کے لیے باقاعدہ ادارے قائم ہوں' مختلف جگہوں سے لوگ آئیں اور اپنا لہجہ بدل کر قریش کے لہجے کے مطابق کریں' حجازی لہجہ اختیار کریں۔ چنانچہ اجازت دی گئی تھی کہ اپنے اپنے لہجوں میں پڑھ لیں۔ مختلف لہجوں میں پڑھنے کے ساتھ کچھ لفظی فرق بھی آنے لگے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے نوبت یہ آ گئی کہ مختلف لہجوں میں لفظی فرق کے ساتھ بھی قرآن پڑھا جانے لگا۔ کوئی شخص قرآن پڑھ رہا ہوتا' دوسرا کہتا کہ یہ غلط پڑھ رہا ہے' یہ یوں نہیں ہے' جیسے میں پڑھ رہا ہوں وہ صحیح ہے۔ اس پر اس جذباتی قوم کے اندر تلواریں نکل آتی تھیں۔ اندیشہ ہوا کہ اگر اس طرح سے یہ بات پھیل گئی تو قرآن کا کوئی ایک ٹیکسٹ متفق علیہ نہیں رہے گا۔ اُمّت کو جمع کرنے والی شے تو یہ قرآن ہی ہے' اس میں لفظی فرق کے نتیجے میں دائمی افتراق وانتشار پیدا ہو جائے گا۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کے مشورے سے طے کیا کہ قرآن کا ایک ٹیکسٹ تیار کیا جائے۔ اس ٹیکسٹ کے لیے لفظ ''رسم'' ہے۔ رسم الخط کا لفظ ہم استعمال کرتے ہیں۔ ''ا ب ت'' حروف ہیں' لیکن عربی میں لکھے جائیں گے تو ان کا رسم الخط کچھ اور ہے' اردو میں لکھے جائیں گے تو ان کی شکل اور ہے۔ حضرت عثمانؓ نے ایک رسم الخط اور ایک ٹیکسٹ پر قرآن جمع کیا۔ انہوں نے بھی ایک کمیٹی بنائی اور اس کمیٹی کو یہ حکم دے دیا گیا کہ تمام لہجوں کو رد کر کے قریش کے لہجہ پر قرآن کا ٹیکسٹ تیار کیا جائے جو متفق علیہ ٹیکسٹ ہوگا۔ چنانچہ اس کمیٹی نے بڑی محنتِ شاقہ سے اس کام کی تکمیل کی۔ اس طرح قرآن کا رسم الخط معین ہو گیا اور ایک متفق علیہ ٹیکسٹ وجود میں آ گیا۔ رسمِ عثمانی کے مطابق سورۃ الفاتحہ میں ''ملک یوم الدین'' لکھا جائے گا' لکھنے کی شکل یہ نہیں ہوگی: ''مالک یوم الدین''۔ ایک قراءت میں چونکہ مَلِکِ بھی ہے تو ''ملک'' کو ''مَلِکِ'' بھی پڑھا جا سکتا ہے اور ''مَلِکِ'' بھی۔ تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہے جو حضرت عثمانؓ نے صحابہؓ کے مشورے سے سرانجام دیا کہ قرآن کا ایک رسم الخط معین ہو گیا اور مصاحفِ عثمانیؓ تیار ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق اس کی چار نقول تیار کی گئیں' بعض روایات کے مطابق پانچ اور بعض میں سات کا عدد بھی ملتا ہے۔ ان میں سے ایک مصحف official version کے طور پر مدینے میں رکھا گیا اور باقی نقلیں مکہ مکرمہ' دمشق' کوفہ' یمن' بحرین اور بصرہ کو بھیج دی گئیں۔ ان میں سے کوئی کوئی نقل اب بھی موجود ہے۔ ترکی اور تاشقند میں وہ ''مصاحفِ عثمانی'' موجود ہیں جو حضرت عثمانؓ نے تیار کرائے تھے۔

یہاں ایک اہم بات توجہ طلب ہے کہ ہمارے ہاں خطباتِ جمعہ میں بعض خطیب یہ جملہ پڑھ جاتے ہیں: ''جامعُ آیاتِ القرآن عثمان بن عفانؓ''۔ یہاں ہم قافیہ الفاظ جمع کر کے صوتی آہنگ کے ساتھ ایک خاص انداز پیدا کیا گیا ہے' لیکن یہ الفاظ اس قدر غلط اور اتنے گمراہ کن ہیں کہ اس سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ آیاتِ قرآنیہ کو سب سے پہلے حضرت عثمانؓ نے جمع کیا۔ یہ بات قرآن پر سے اعتماد کو ہٹا دینے والی ہے۔ آیاتِ قرآنیہ تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جمع ہو چکی تھیں' سورتیں حضورؐ

کے زمانے میں وجود میں آچکی تھیں' سورتوں کی تدوین ہی نہیں ترتیب بھی حضور ﷺ کے زمانے میں عمل میں آچکی تھی۔ کتابی شکل میں قرآن ابوبکر ؓ کے زمانے میں جمع ہوا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں دس پندرہ سال کا فصل ہے۔ اگر "جامعُ آیاتِ القرآن" حضرت عثمان ؓ کو قرار دیا جائے تو کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ قرآن کی تدوین حضور ﷺ کے پندرہ یا بیس برس بعد ہوئی ہے۔ حضرت عثمانؓ کا عہدِ خلافت بارہ برس ہے اور حضور ﷺ کے انتقال کے ۲۴ برس بعد ان کا انتقال ہوا۔ تو اس طرح قرآن کے متن (text) کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کیے جا سکتے ہیں' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمان ؓ آیاتِ قرآنی کے جمع کرنے والے نہیں ہیں' بلکہ اُمت کو قرآن کے ایک ٹیکسٹ اور رسم الخط پر جمع کرنے والے ہیں۔ اسی لیے آج دنیا میں جو مصحف موجود ہے یہ "مصحفِ عثمان" کہلاتا ہے۔ اس کا نام "مصحف" حضرت ابوبکر ؓ نے رکھا تھا اور مصحف عثمان میں رسم الخط اور ٹیکسٹ معین ہو گیا کہ اب قرآن اسی طریقے سے لکھا جائے گا اور یہی پوری دنیا کے اندر official ٹیکسٹ ہے۔

ہمارے ہاں اکثر و بیشتر قرآن پاک کی اشاعت کے ادارے رسم عثمانی کا پورا اہتمام نہیں کرتے اور اس اعتبار سے ان میں رسم کی غلطیاں بھی آجاتی ہیں' اس لیے کہ ان کے سامنے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں یعنی کم خرچ سے زیادہ نفع حاصل کرنے کی کوشش — لیکن اب سعودی حکومت نے اس کا اہتمام کر کے بڑی نیکی کمائی ہے۔ قرآن مجید کی حفاظت کے حوالے سے ایک نیکی مصر نے کمائی تھی۔ جب اسرائیل نے قراءتِ قرآن مجید کے اندر تحریف کر کے اس کو عام کرنے کی کوشش کی تو حکومتِ مصر نے اپنے چوٹی کے قُرّاء' قاری محمود خلیل حصری اور عبدالباسط عبدالصمد سے پورا قرآن مجید مختلف قراءتوں میں تلاوت کرایا اور ان کے کیسٹس تیار کر کے دنیا میں پھیلا دیے کہ اب گویا وہ ریفرنس کا کام دیں گے۔ ان کے ہوتے ہوئے اب کسی کے لیے ممکن نہیں ہے کہ اس طرح قراءت کے حوالے سے قرآن میں کوئی تحریف کر سکے۔ اسی طرح سعودی عرب کی حکومت نے کروڑوں روپے کے خرچ سے بہت بڑی فاؤنڈیشن بنائی ہے' جس کے زیر اہتمام بڑے عمدہ آرٹ پیپر پر عالمی معیار کی بڑی عمدہ جلد کے ساتھ لاکھوں کی تعداد میں یہ قرآن مجید چھاپے جا رہے ہیں' جو حضرت عثمان ؓ کے معین کردہ رسم الخط کے مطابق ہیں۔

بہرحال حضرت عثمان ؓ "جامع آیات القرآن" کی بجائے "جامع الأمّةِ علی رسمٍ واحدٍ" یعنی اُمت کو قرآن حکیم کے ایک رسم الخط پر جمع کرنے والے ہیں۔ یہ تدوین بھی حضور ﷺ کے انتقال کے ۲۴ برس کے اندر مکمل ہو گئی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا مانتی ہے اور تمام مستشرق مانتے ہیں کہ جتنا خالص متن (pure text) قرآن کا دنیا میں موجود ہے' کسی دوسری کتاب کا موجود نہیں ہے۔ یہ بات "الفضل ما شهدت به الاعداء" کا مصداق ہے' یعنی فضیلت تو وہ ہے جس کو دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے اور یہ کسی شے کی حقانیت کے لیے آخری ثبوت ہوتا ہے۔ پس یہ بات پوری دنیا میں مسلّم ہے کہ قرآن حکیم کا ٹیکسٹ محفوظ ہے یا جتنا محفوظ ٹیکسٹ قرآن کا ہے اتنا اور کسی کتاب کا نہیں ہے۔ یعنی قراءت کے فرق بھی ریکارڈ پر ہیں' سبعہ قراءت اور عشرہ قراءت ریکارڈ پر ہیں' ان میں بھی ایک ایک حرف کا معاملہ مدوّن ہے کہ فلاں قراءت میں یہ لفظ زبر کے ساتھ پڑھا گیا ہے یا زیر کے ساتھ۔ اور یہ تمام official قراءات ہیں۔ باقی جہاں تک رسم الخط کا تعلق ہے اس کا ٹیکسٹ حضرت عثمان ؓ نے معین کر دیا۔ اُمتِ مُسلمہ پر یہ ان کا بہت بڑا احسان ہے۔ قرآن حکیم کی compilation اور اس کی تدوین کے متعلق یہ چیزیں ذہن میں رہنی چاہئیں۔ یہ حقائق سامنے نہ ہوں تو کچھ لوگ ذہنوں میں شکوک وشبہات پیدا کر سکتے ہیں۔

باب پنجم

قرآن مجید کا موضوع

اب ہم اگلی بحث پر آتے ہیں کہ قرآن کا موضوع کیا ہے۔ کیا قرآن فلسفہ کی کتاب ہے؟ کیا یہ سائنس کی کتاب ہے؟ کیا یہ جیالوجی یا فزکس کی کتاب ہے؟ کس قسم کی کتاب ہے؟ تو پہلی بات یہ سمجھئے کہ قرآن کا موضوع ہے انسان — لیکن انسان کی اناٹومی' اس کی فزیالوجی یا anthropology نہیں' بلکہ انسان کی ہدایت۔ یہ ہدایت کا لفظ قرآن مجید کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے سورۃ البقرۃ کے شروع ہی میں فرمایا: ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ پھر اس کے وسط میں ارشاد ہوا: ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ﴾ یعنی پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت۔ سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۷﴾۔ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۝۳﴾۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۹۷) اور سورۃ النمل (آیت ۲) میں ﴿هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ جبکہ سورۂ آل عمران میں ﴿هُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۱۳۸﴾ اور سورۃ المائدۃ میں ﴿هُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۶﴾ کے الفاظ آئے۔ معلوم ہوا کہ ''هُدًى'' کا لفظ قرآن حکیم کے لیے کثرت کے ساتھ آیا ہے۔ پھر یہ صرف نکرہ نہیں، ''ال'' کے ساتھ معرفہ بن کر بھی کئی جگہ آیا ہے۔ تین مرتبہ تو اس آیت مبارکہ میں آیا جو رسول اللہ ﷺ کے مقصدِ بعثت کو بیان کرتی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ (التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹) هُدًى نکرہ تھا' اَلْهُدٰی معرفہ ہو گیا۔ یعنی ہدایتِ کاملہ' ہدایتِ تامہ' ہدایتِ ابدی۔ اسی طرح سورۃ النجم میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝۲۳﴾۔ سورۃ الجن کا آغاز جنات کی ایک جماعت کے اس قول ﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱﴾ سے ہوتا ہے۔ آگے چل کر الفاظ آتے ہیں: ﴿وَاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ؕ﴾ (آیت ۱۳) گویا سورۃ الجن نے معین کیا کہ ''قُرْاٰنًا عَجَبًا'' اور ''اَلْهُدٰی'' مترادف الفاظ ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں آیا ہے: ﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى﴾ (بنی اسراءیل:۹۴' الکہف:۵۵) ''کیا شے ہے جو لوگوں کو ایمان لانے سے روکتی ہے جبکہ اُن کے پاس الہدیٰ آیا ہے؟'' تو گویا قرآن کا موضوع ہے انسان کی ہدایت۔

اب یہ بات ذہن میں رکھئے کہ انسان کے علم کے دو گوشے ہیں' علمِ انسانی دو حصوں میں منقسم ہے۔ (مشہور کہاوت ہے: اَلْعِلْمُ عِلْمَانِ: عِلْمُ الْاَبْدَانِ وَ عِلْمُ الْاَدْيَانِ) ایک حصہ ہے مادی دنیا (Physical World) کا علم' مادی حقائق کا علم' جو حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ دیکھنا' سننا' سونگھنا' چکھنا' چھونا ہمارے حواسِ خمسہ ہیں۔ یہ تمام صلاحیتیں ہیں جن سے کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں اور عقل کا کمپیوٹر اِن کو پراسیس کرتا ہے' ان سے نتائج نکالتا ہے اور انہیں سٹور کر لیتا ہے۔ پھر حواس کے ذریعہ سے مزید کوئی معلومات حاصل ہوتی ہیں تو اب ان کو بھی وہ پراسیس کر کے اپنے سابقہ ''memory store'' کے ساتھ ہم آہنگ کر کے کوئی اور نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اس طرح رفتہ رفتہ انسان کا یہ علم بڑھتا چلا جا رہا ہے اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ ابھی اور کہاں تک جائے گا۔ آج سے سو سال پہلے بھی انسان تصور نہیں کر سکتا تھا کہ انسانی علم وہاں پہنچ جائے گا جہاں آج پہنچ چکا ہے۔ یہ علم بالحواس والعقل

ہے اور اس علم کا وحی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کا تعلق اس علم اَسماء سے ہے جو بالکل شروع میں حضرت آدم علیہ السلام میں ودیعت کر دیا گیا تھا اور یہی دنیا میں سربلندی کی بنیاد ہے۔

علمِ انسانی کے دو گوشوں کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کا چوتھا رکوع بہت اہم ہے۔ علم الاسماء کا ذکر اس کے شروع میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ مَیں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں تو فرشتوں کی طرف سے یہ بات استفہاماً پیش کی گئی: ﴿اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾ (آیت ۳۰) ''کیا آپ اس کو زمین میں خلیفہ بنائیں گے جو اِس میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا؟'' فرشتوں کا یہ اشکال اس طرح دُور کیا گیا: ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (آیت ۳۱) ''اور اللہ نے آدم کو تمام نام سکھا دیے''۔ یہ علمِ اسماء جو آدم کو دیا گیا' یہی حکومتِ ارضی کی بنیاد ہے۔ جو قوم اِس علم کے اندر ترقی کرے گی وہی اقتدارِ ارضی کی حق دار ٹھہرے گی۔ البتہ اس رکوع کے آخر میں فرمایا گیا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہوگئی اور شیطان کے اغوا سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگئی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کا بایں طور اعلان کر دیا: ﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۭ﴾ (آیت ۳۷) اس کے بعد ذکر ہے کہ جب آدم اور حوا علیہما السلام کو حکم دیا گیا کہ اب زمین میں جا کر رہو اور وہاں کا چارج سنبھالو تو فرمایا: ﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ ''تو جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا''۔ وہ علمِ ہدایت ہے۔

یہ دو چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں۔ علمِ اَسماء درحقیقت یوں سمجھئے کہ جیسے آم کی گٹھلی میں آم کا پورا درخت ہوتا ہے۔ وہی گٹھلی تو ہے جو آپ زمین میں دباتے ہیں۔ پھر اگر وہاں پانی پڑتا ہے اور زمین میں روئیدگی کی صلاحیت بھی ہے تو وہ گٹھلی پھٹے گی۔ اس میں سے جو دو پتے نکلیں گے وہ پھلیں پھولیں گے' پروان چڑھیں گے تو درخت بنے گا۔ وہ پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقُوّۃ (potentially) موجود تھا' البتہ اسے بالفعل (actually) پورا درخت بننے میں تین چار سال لگیں گے۔ تو جس طرح پورا درخت آم کی گٹھلی میں بالقُوّۃ موجود تھا لیکن وہ آم کا درخت کئی سال کے اندر بالفعل وجود میں آیا' بعینہٖ یہ معاملہ کُل مادی حقائق کا ہے کہ اس ضمن میں کل علم حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں بالقُوّۃ (potentially) ودیعت کر دیا گیا! اب اس کی exfoliation ہو رہی ہے' وہ بڑھتا جا رہا ہے' برگ و بار لا رہا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس علم کا کوئی تعلق آسمانی ہدایت سے نہیں ہے۔ اب یہ خود رَو پودا ہے جو بڑھتا چلا جا رہا ہے' اور معلوم نہیں کہاں تک پہنچے گا۔ علامہ اقبال نے اس کی صحیح تعبیر کی ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے!

علامہ کی زندگی میں تو انسان نے چاند پر قدم نہیں رکھا تھا' لیکن اب انسان چاند پر قدم رکھ کر آ گیا ہے۔ مزید یہ کہ اب تو جنیٹک انجینئرنگ اپنے کمالات دکھا رہی ہے۔ کلوننگ کے طریقے سے حیوانات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ اس انسانی علم کے ساتھ اگر علمِ وحی یعنی علمِ ہدایت نہ ہو تو یہ علم بجائے خیر کے شر کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ آج یہ علم واقعتاً شیطانی قوت بن چکا ہے' ہلاکت کا سامان بن چکا ہے' تباہی کا ذریعہ بن چکا ہے۔

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى﴾ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ارتقائی مراحل طے

کیے۔ جیسے جیسے نوعِ انسانی شعور کی منزلیں طے کرتی گئی' اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت میں بھی اضافہ ہوتا گیا' تا آنکہ یہ علمِ ہدایت قرآن حکیم میں آکر "اَلْھُدٰی" (Final Guidance) کی صورت میں مکمل ہوگیا۔ اس ہدایت میں جو ارتقا ہوا ہے اسے بھی آپ سمجھ لیجئے۔ پہلی کتابیں جو نازل ہوئیں ان میں بھی ھُدًی تو تھی۔ سورۃ المائدۃ میں ارشاد ہوا: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۴) ''ہم نے تورات نازل کی تھی' اس میں ہدایت بھی تھی نور بھی تھا''۔ اسی رکوع میں (سورۃ المائدۃ کا ساتواں رکوع) انجیل کے بارے میں فرمایا: ﴿فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (آیت ۴۶) ''اس میں بھی ہدایت بھی تھی نور بھی تھا''۔ لیکن یہ ہدایت اور نور درجہ بدرجہ ترقی کرتا رہا ہے' یہاں تک کہ قرآن میں آکر یہ کامل ہوا ہے اور اَلْھُدٰی بن گیا ہے۔ اب یہ ھُدًی نہیں' اَلْھُدٰی ہے' یعنی ہدایتِ تامہ۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ دیکھئے ایک بچے کو اگر آپ تعلیم دینا چاہتے ہیں تو اس کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھے بغیر نہیں دے سکتے۔ آپ پرائمری میں زیرِ تعلیم کسی بچے کے لیے چاہے پی ایچ ڈی استاد رکھ دیں' لیکن وہ استاد بچے کی ذہنی استعداد کی مناسبت سے ہی اسے تعلیم دے سکے گا۔ بچہ رفتہ رفتہ آگے بڑھے گا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی عقل اور شعور کی پوری شدت' قوت اور بلوغت کو پہنچ جائے گا تب اسے آخری علم پڑھایا جائے گا۔ پہلے وہ تاریخ پڑھ رہا تھا' اب فلسفۂ تاریخ پڑھے گا۔ اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت تدریج کے ساتھ اتاری ہے۔ تورات میں صرف احکام ہیں' حکمت ہے ہی نہیں' جبکہ انجیل میں حکمت ہے' احکام ہیں ہی نہیں۔ دونوں چیزیں مل کر ایک بات کو مکمل کرتی ہیں۔ تورات میں صرف احکام ہیں۔ جیسے آپ بچے کو بتا دیتے ہیں کہ بھئی کھانے پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے' روزے کا مطلب یہ ہے کہ اب دن بھر کھانا پینا کچھ نہیں ہے۔ چاہے بچہ ابھی چھ سات سال کا ہے' وہ یہ بات سمجھ لیتا ہے۔ اس طرح اسے احکام تو دے دیے جائیں گے کہ یہ کرو' یہ نہ کرو' یہ Do's ہیں یہ Donts ہیں۔

چنانچہ تورات میں احکامِ عشرہ (The Ten Commandments) دے دیے گئے' لیکن ابھی ان کی حکمت نہیں بتائی گئی۔ اس لیے کہ ابھی حکمت کا تحمل انسان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ابھی نوعِ انسانی کا عہدِ طفولیت تھا۔ یوں سمجھئے کہ وہ آج سے ساڑھے تین ہزار سال قبل کا انسان تھا۔ تورات چودہ سو قبل مسیح میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔ اس کے چودہ سو سال بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو انجیل دی گئی' جس میں صرف حکمت ہے' احکام ہیں ہی نہیں۔ لیکن آج سے دو ہزار سال پہلے حضرت مسیح علیہ السلام کے یہ الفاظ انجیل میں موجود ہیں (اب بھی موجود ہیں) کہ آپؑ نے اپنے حواریین سے فرمایا تھا: ''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنی تھیں' مگر ابھی تم ان کا تحمل نہیں کر سکو گے' جب وہ فارقلیط آئے گا تو تمہیں سب کچھ بتائے گا''۔ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی تھی۔ حضرت مسیحؑ نے فرمایا کہ ابھی تم تحمل نہیں کر سکتے۔ گویا تمہاری ذہنی بلوغت کے لیے چھ سو برس مزید درکار ہیں۔ چنانچہ الہدیٰ قرآن حکیم میں آکر مکمل ہوا ہے۔

قرآن مجید جو ہدایت دیتا ہے اس کے بھی دو حصے ہیں۔ ایک فکر و نظر کی ہدایت ہے' جس کا عنوان ''ایمان'' ہے۔ اس کا موضوع وہی ہے جو فلسفے کا ہے۔ یعنی کائنات کی حقیقت کیا ہے' زندگی کی حقیقت کیا ہے' زندگی کا مآل کیا ہے' اس کا آغاز کیا ہے' انجام کیا ہے' صحیح کیا ہے' غلط کیا ہے' خیر کیا ہے' شر کیا ہے' علم کیا ہے؟ قرآن مجید کا دوسرا موضوع ہدایتِ عملی ہے' انفرادی سطح پر بھی اور اجتماعی سطح پر بھی۔ یہ اوامر و نواہی اور حلال و حرام کے احکام پر مشتمل ہے۔ پھر اس میں معاشی و معاشرتی احکام بھی ہیں۔ یہ ہدایتِ فکر و نظر اور ہدایتِ فعل و عمل (انفرادی و اجتماعی) قرآن حکیم کا موضوع ہے۔

اس ضمن میں یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی قرآن حکیم کا موضوع نہیں ہے' قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے' سائنس کی کتاب نہیں ہے' البتہ اس میں سائنسی علوم کی طرف اشارے موجود ہیں اور ان کے حوالے موجود ہیں۔ قرآن مجید کائناتی حقائق کو آیاتِ الٰہیہ قرار دیتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ ملاحظہ کیجئے' جسے میں ''آیت الآیات'' قرار دیتا ہوں:

﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴾

''یقیناً آسمانوں اور زمین کی ساخت میں' رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں' اُن کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں' بارش کے اُس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے' پھر اس کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور (اپنے اسی انتظام کی بدولت) زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے' ہواؤں کی گردش میں' اور اُن بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں' ان لوگوں کے لیے بے شمار نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔ ان میں اللہ کی قدرت' اللہ کی عظمت' اللہ کا علمِ کامل' اللہ کی حکمتِ بالغہ سب کچھ شامل ہے۔ تو یہ جو مظاہرِ طبیعی (Physical phenomena) ہیں' قرآن حکیم ان کا جا بجا حوالہ دیتا ہے۔ بعض کائناتی حقائق وہ ہیں جن کا تعلق فلکیات (Astronomy) سے ہے۔ فرمایا: ﴿وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ﴾ (یٰسٓ) یعنی یہ تمام اجرامِ سماویہ اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہر شے حرکت میں ہے۔ انسان پر ایک دَور ایسا گزرا ہے جب وہ یہ سمجھتا تھا کہ زمین ساکن ہے اور سورج اس کے گرد حرکت کر رہا ہے۔ پھر ایک دَور آیا جس میں کہا گیا کہ نہیں' سورج ساکن ہے' زمین حرکت کرتی ہے' زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے' اور آج ہمیں معلوم ہوا کہ ہر شے حرکت میں ہے۔ سورج کا بھی اپنا ایک مدار ہے' اس میں وہ اپنے پورے کنبے سمیت حرکت کر رہا ہے۔ یہ نظامِ شمسی اس کا کنبہ ہے' اس پورے کنبے کو لے کر وہ بھی ایک مدار میں حرکت کر رہا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ الفاظِ قرآنی: ﴿وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ﴾ میں ''كُلٌّ'' کا لفظ جس طرح منقح اور مبرہن ہو کر' جس شان کے ساتھ آج ہویدا ہوا ہے' آج سے پہلے انسان کو معلوم نہیں تھا۔ قرآن مجید میں کائناتی مظاہر کے بارے میں جو بات کہی گئی ہے وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ حقیقت ہے جو اِس دَور میں آ کر پوری طرح واضح ہوئی ہے۔

ڈاکٹر موریس بوکائی ایک فرانسیسی سرجن تھے۔ انہوں نے قرآن اور بائبل دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا۔ واضح رہے کہ بائبل سے مراد عہد نامہ قدیم (Old Testament) اور عہد نامہ جدید (New Testament) دونوں ہیں۔ تقابلی مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ پورے قرآن میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے ہمارے سائنسی انکشافات میں سے کسی نے غلط ثابت کیا ہو' جب کہ تورات میں بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ سائنس انہیں غلط ثابت کر چکی ہے۔ اس پر انہوں نے ۲۵۰ صفحات کی کتاب تحریر کی: ''The Bible, The Quran and Science''۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تورات بھی تو اللہ کی کتاب ہے' پھر اس میں ایسی چیزیں کیوں آ گئیں جو سائنسی حقائق کے خلاف ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اصل تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہو گئی تھی جب بخت نصر کے ہاتھوں یروشلم کی تباہی ہوئی تھی۔ اس کے ڈیڑھ سو برس بعد کچھ لوگوں نے تورات کو یادداشتوں سے مرتب کیا۔ لہٰذا اُس وقت انسانی علم کی جو سطح تھی اس کے اعتبارات سے تاویلات تورات میں شامل ہو گئیں' کیونکہ انسان تو اپنی

ذہنی سطح کے مطابق ہی سوچ سکتا ہے۔ تورات میں تحریف ہونے کی وجہ سے اس میں ایسی چیزیں درآئیں جو سائنس کی رو سے غلط ثابت ہوئیں۔ البتہ قرآن میں ایسی کوئی تاویل نہیں ہوئی اور اس کی حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے خود ذمہ لیا ہے۔ یہ بات بڑی اہم ہے۔ اس کو بڑے خوبصورت انداز میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے کہا ہے کہ یہ کائنات اللہ کا فعل ہے' اُس کی تخلیق اور اُس کی تدبیر ہے' جبکہ قرآن اللہ کا قول ہے' اور اللہ تعالیٰ کے قول و عمل میں تضاد ممکن نہیں ہے۔ کسی انسان کے قول و عمل میں بھی اگر کوئی تضاد ہو تو وہ انسانیت کی سطح سے نیچے اتر جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کے قول اور عمل میں تضاد کیسے ہو سکتا ہے؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک دَور میں انسانوں نے بات سمجھی نہ ہو' اُن کا ذہن وہاں تک پہنچا نہ ہو' اُن کی معلومات کا دائرہ ابھی اس حد تک ہو کہ ان حقائق تک نہ پہنچا جا سکے۔ لیکن جیسے جیسے وقت آئے گا مزید حقائق منکشف ہوں گے اور یہ بات زیادہ سے زیادہ واضح سے واضح تر ہوتی چلی جائے گی کہ جو کچھ قرآن نے فرمایا ہے وہی برحق ہے۔ ہاں آج سے پہلے انسانی ذہن اِس حد تک رسائی حاصل کرنے کا اہل نہیں تھا۔ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کی آخری سے پہلی آیت ذہن میں رکھیے:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾ (آیت ۵۳)

''ہم انہیں دکھاتے چلے جائیں گے اپنی نشانیاں آفاق میں بھی اور خود اُن کی جانوں میں بھی' یہاں تک کہ یہ بات پوری طرح نکھر کر اُن کے سامنے واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن ہی حق ہے۔''

ڈاکٹر کیتھ ایل مور کینیڈا کے بہت بڑے ایمبریالوجسٹ ہیں۔ ان کی کتاب علم جنین (Embriology) میں سند مانی جاتی ہے اور یونیورسٹی کی سطح پر بطور ٹیکسٹ بک پڑھائی جاتی ہے۔ انہوں نے قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی حیرت کا اظہار کیا ہے کہ آج سے چودہ سو برس قبل جبکہ نہ مائیکروسکوپ موجود تھی اور نہ ہی dissection ہوتا تھا' قرآن نے علمِ جنین کے متعلق جو معلومات دی ہیں وہ صحیح ترین حقائق پر مشتمل ہیں۔ ڈاکٹر موصوف سورۃ المؤمنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴ کا مطالعہ کرتے ہوئے انگشت بدنداں ہیں:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۤ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ۭ﴾

''ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا' پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا' پھر اُس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی' پھر لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا' پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں' پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا' پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کیا۔''

ان کا کہنا ہے کہ واقعہ یہ ہے کہ انسانی تخلیق کے مراحل کی اس سے زیادہ صحیح تعبیر ممکن نہیں ہے۔ تو یہ حقیقت ذہن میں رکھیے کہ اگرچہ قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے' لیکن جن سائنسی حقائق یا سائنسی مظاہر (phenomena) کا قرآن نے حوالہ دیا ہے وہ یقیناً حق ہیں' چاہے تا حال ہم ان کی حقانیت کو نہ سمجھ پائے ہوں۔ مثلاً آج بھی مجھے نہیں معلوم کہ قرآن جو ''سات آسمان'' کہتا ہے تو اِن سے کیا مراد ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب انسان سمجھے گا کہ ''سات آسمان'' کے یہ الفاظ ٹھیک اس حقیقت پر منطبق ہوتے ہیں جو آج ہمارے علم میں آئی ہے' پہلے نہیں آئی تھی۔ البتہ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' عملی اعتبار سے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ قرآن سائنس یا ٹیکنالوجی کی کتاب نہیں ہے اور اس حوالے سے ایک بڑا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر ہمارے

اسلاف نے اپنے دَور کی معلومات کی سطح پر قرآن کی ان آیات کا کوئی خاص مفہوم معیّن کیا تو ہمارے لیے لازم نہیں ہے کہ ہم اس کی پیروی کریں۔ ہم قرآن میں بیان کردہ سائنسی مظاہر کو اس سائنسی ترقی کے حوالے سے سمجھیں گے جو روز بروز ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ آخری بات عرض کر رہا ہوں کہ اس معاملے میں خود محمد رسول اللہ ﷺ سے بھی اگر کوئی بات منقول ہو تو وہ بھی قطعی نہیں سمجھی جائے گی' کیونکہ حضور ﷺ یہ چیزیں سکھانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ یہ بات اگرچہ بہت سے لوگوں پر ثقیل اور گراں گزرے گی' لیکن صحیح طرزِ عمل یہی ہوگا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے ضمن میں اگر حضور ﷺ کی کوئی حدیث بھی سامنے آجائے تو اس کو بھی ہم دلیلِ قطعی نہیں سمجھیں گے۔

اس سلسلے میں تأبیرِ نخل کا واقعہ بہت اہم ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی پیدائش مکہ کی ہے' ہجرت تک ساری زندگی آپ نے وہاں گزاری' وہ وادیٔ غیر ذی زرع ہے' جہاں کوئی پیداوار' کوئی زراعت' کوئی کاشت ہوتی ہی نہیں تھی' لہٰذا آپ کو اس کا کوئی تجربہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ ہاں تجارت کا بھرپور تجربہ تھا اور اس کے تمام اَسرار و رموز سے آپ واقف تھے۔ آپ مدینہ تشریف لائے تو آپ نے دیکھا کہ کھجوروں کے سلسلہ میں انصارِ مدینہ ''تأبیرِ نخل'' کا معاملہ کرتے تھے۔ کھجور ایک ایسا پودا ہے جس کے نر اور مادہ پھول علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ اگر اس کے نر اور مادہ پھولوں کو قریب لے آئیں تو اس کے بارآور ہونے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔ اہلِ مدینہ کو یہ بات تجربے سے معلوم ہوئی تھی اور وہ اس پر عمل پیرا تھے۔ مدینہ تشریف آوری پر رسول اللہ ﷺ نے جب اہلِ مدینہ کا یہ معمول دیکھا تو اُن سے فرمایا کہ اگر آپ لوگ ایسا نہ کریں تو کیا ہے؟ ایسا نہ کرنا شاید تمہارے حق میں بہتر ہو۔ یہ بات آپ ﷺ نے اپنے اجتہاد اور فہم کے مطابق اس بنیاد پر فرمائی کہ فطرت اپنی دیکھ بھال خود کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فطرت کا نظام انسانوں پر نہیں چھوڑا' بلکہ یہ تو خود کار نظام ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ آپ لوگ اس قدرتی نظام میں دخل نہ دیں تو کیا ہے؟ البتہ آپ نے روکا نہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے لیے حضور ﷺ کا اتنا کہنا بھی گویا حکم کے درجہ میں تھا۔ انہوں نے اس سال وہ کام نہیں کیا' لیکن فصل کم ہوگئی۔ اب وہ ڈرتے ڈرتے' جھجکتے جھجکتے حضور ﷺ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ حضور! ہم نے اس مرتبہ تأبیرِ نخل نہیں کی تو فصل کم ہوئی ہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ))[1] اس حدیث کا ایک ایک لفظ یاد کر لیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ جو تمہارے اپنے دُنیوی اور مادی معاملات ہیں جن کی بنیاد تجربہ پر ہے' یہ تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ تم زیادہ تجربہ کار ہو' تم ان حقائق سے زیادہ واقف ہو۔ ایک دوسری روایت میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ، اِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِنْ دِیْنِکُمْ فَخُذُوْا بِهٖ، وَاِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ مِنْ رَأْیِیْ فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ))[2] ''میں تو ایک بشر ہوں۔ جب میں تمہیں تمہارے دین کے بارے میں کوئی حکم دوں تو اس سے سرتابی نہ کرنا' لیکن جب میں تمہیں اپنی رائے سے کوئی حکم دوں تو جان لو کہ میں ایک بشر ہی ہوں''۔ گویا آپ ﷺ نے واضح فرما دیا کہ میں یہ چیزیں سکھانے نہیں آیا' میں جو کچھ سکھانے آیا ہوں وہ مجھ سے لو!

اس اعتبار سے یہ حدیث بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے آپ ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔ آپ طب و جراحت

۱۔ صحیح مسلم' کتاب الفضائل' باب وجوب امتثال ما قاله ﷺ شرعًا دون ما ذکره من معایش الدنیا علی سبیل الرأی۔

۲۔ صحیح مسلم' حوالہ سابقہ۔

سکھانے نہیں آئے تھے' آپؐ کوئی اور سائنس پڑھانے نہیں آئے تھے۔ ورنہ تو ہم شکوہ کرتے کہ آپؐ نے ہمیں ایٹم بم بنانا کیوں نہیں سکھا دیا؟ جب رسول اللہ ﷺ نے یہ فرما دیا کہ ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ)) تو ہمارے لیے یہ بات آخری درجے میں سند ہے کہ جیسے جیسے سائنسی انکشافات ہو رہے ہیں' جیسے جیسے علم انسانی کی exploration ہو رہی ہے' ویسے ویسے حقائقِ فطرت ہماری نگاہوں کے سامنے منکشف ہو رہے ہیں۔ جیسے آم کی گٹھلی سے آم کا پورا درخت وجود میں آتا ہے ایسے ہی حضرت آدم علیہ السلام کے وجود میں علم بالحواس اور علم بالعقل کا جو mechanism رکھ دیا گیا تھا' یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ علم پھیل رہا ہے۔ اس سے جو بھی چیزیں ہمارے سامنے آئیں ان میں کہیں رکاوٹ نہیں ہے کہ ہم سلف کی بات کو لے کر بیٹھ جائیں کہ سائنس خواہ کچھ بھی کہے ہم تو اسلاف کی بات مانیں گے۔ یہاں پر اس طرزِ عمل کے لیے کوئی دلیل اور بنیاد نہیں۔

قرآن کا اصل موضوع ایمان ہے۔ ماوراء الطبیعیاتی حقائق عالمِ غیب سے متعلق ہیں' جو ہمارے عالمِ محسوسات سے ماورا ہیں' جس کی خبریں ہمیں صرف وحی سے مل سکتی ہیں۔ علم حقیقت جسے ہم اجمالی طور پر ایمان کہتے ہیں یہ قرآن کا اصل موضوع ہے' یعنی ہدایتِ فکری و عملی۔ تمدنی میدان میں' معاشی و اقتصادی اور معاشرتی میدان میں یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ یہ چیزیں کھانے پینے کی ہیں' یہ چیزیں کھانے پینے کی نہیں ہیں۔ یہ حرام ہیں' یہ نجس ہیں۔ یہ علم حضور ﷺ نے دیا ہے اور قرآن کا موضوع اصل میں یہی ہے۔ البتہ قرآن میں جو سائنسی ریفرنسز آئے ہیں' وہ غلط نہیں ہیں' وہ لازماً درست ہیں۔

انسانی علم کے تین دائرے ہیں۔ ایک علم بالحواس ہے' یہ انسانی علم کا پہلا دائرہ ہے۔ حواس کے ذریعے ہمیں معلومات حاصل ہوتی ہیں' جنہیں آج کل ہم sense data کہتے ہیں۔ آنکھ نے دیکھا' کان نے سنا' ہاتھ نے اس کی پیمائش کی۔ اس کے بعد دوسرا دائرہ علم بالعقل ہے۔ عقل sense data کو پراسیس کرتی ہے۔ اس ضمن میں استدلال اور استنباط کے اصول معین کیے گئے ہیں۔ انسان اپنے حواس خمسہ کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے' پھر عقل ان معلومات کو process کرتی ہے تو انسان کسی نتیجے پر پہنچتا ہے۔ یوں عقل حواس کی محتاج ہوئی' لیکن عقل و حواس کے ماورا بھی ایک علم ہے جسے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے علم بالقلب کا نام دیا ہے۔ آج اسے extra sensory perceptions کہا جا رہا ہے۔ یہ علم کا تیسرا دائرہ ہے۔ اس سے پہلے ادب میں اس کے لیے وجدان (intuition) کا لفظ تھا۔ یہ علم بالقلب درحقیقت وہ خاص انسانی علم ہے جس سے آج کے مادہ پرست واقف نہیں ہیں۔ وحی کا تعلق اسی تیسرے دائرے سے ہے۔ اس لیے کہ وحی کا نزول قلب پر ہوتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰی قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ﴿۱۹۵﴾﴾ (الشعراء)

عقل اور حواس سے حاصل ہونے والے علوم میں تمام فزیکل سائنسز' میڈیکل سائنسز اور ٹیکنالوجی کے مضامین شامل ہیں۔ انسان نے مختلف چیزوں کے خواص معلوم کیے' کچھ طبعی اور کیمیائی تبدیلیوں کے اصول دریافت کیے۔ پھر ان اصولوں سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کو استعمال کیا۔ اس سے انسان کی ٹیکنالوجی ترقی کرتی جا رہی ہے اور ابھی نامعلوم کہاں تک پہنچے گی۔ یہ ایک علم ہے جس کا ذکر قرآن حکیم میں ﴿عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ کے الفاظ میں کر دیا گیا۔ البتہ انسان صرف اس علم پر قانع نہیں رہا' اس لیے کہ اس سے تو صرف جزوی علم حاصل ہوتا ہے' انسان ایک ایک جزو' قدم بقدم سیکھتا ہے۔ انسان کی ایک طلب (urge) ہے کہ وہ ماہیت معلوم کرنا چاہتا ہے کہ کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ میری حقیقت کیا ہے؟ علم کی حقیقت' خیر و شر کی حقیقت کیا ہے؟ ظاہر بات ہے کہ آج سے ایک ہزار سال قبل کے انسان کی معلومات (علم بالحواس اور علم بالعقل کے اعتبار سے) بڑی محدود تھیں'

لیکن اُس وقت کے انسان کو بھی اس چیز کی ضرورت تھی کہ وہ کوئی رائے قائم کرے کہ یہ کائنات جس کا میں ایک فرد ہوں' اس کی حقیقت کیا ہے' خود میری حقیقت کیا ہے؟ میری زندگی کا آغاز کیا ہے؟ میرا اس کے ساتھ ربط و تعلق کیا ہے؟ اس سفر کی منزل کیا ہے؟ میں اپنی زندگی میں کیا کروں' کیا نہ کروں؟ کیا کرنا صحیح ہے کیا کرنا غلط ہے؟ یہ انسان کی ضرورت ہے' لہٰذا اس ضرورت کے تحت جب انسان نے سوچنا شروع کیا تو فلسفہ کا آغاز ہوا جو گتھیوں کو سلجھانا چاہتا ہے۔ ان گتھیوں کو سلجھانے کے لیے پھر انسان نے عقل کے گھوڑے دوڑائے' اپنی منطق کو استعمال کیا۔ فلسفہ' مابعد الطبیعیات' الٰہیات' اخلاقیات اور نفسیات' یہ تمام علوم انسانی علوم میں سے ہیں۔ گویا کہ علم بالحواس اور علم بالعقل کے نتیجے میں یہ دو علم وجود میں آئے۔ ایک فزیکل سائنسز کا علم جس کا تعلق ٹیکنالوجی سے ہے' دوسرا سوشل سائنسز کا علم جس میں فلاسفی' سوشیالوجی' نفسیات' اخلاقیات' اقتصادیات اور سیاسیات وغیرہ شامل ہیں۔

جان لیجئے کہ ھُدًی جس کی تکمیلی شکل "اَلْھُدٰی" قرآن مجید ہے' اس کا موضوع انسانی علم کا دائرۂ اوّل نہیں ہے۔ یہ سائنس کی کتاب نہیں ہے اور نہ ہی سائنس پڑھانے یا ٹیکنالوجی سکھانے آئی ہے۔ انبیاء اس لیے نہیں بھیجے گئے۔ اگرچہ قرآن حکیم میں سائنسی مظاہر کی طرف حوالے موجود ہیں اور وہ لازماً درست ہیں' لیکن وہ قرآن کا اصل موضوع نہیں ہے۔ جیسے جیسے انسان کے سائنسی علم میں تدریجاً ترقی ہو رہی ہے اسی طرح ان ریفرنسز کو سمجھنا بھی انسان کے لیے ممکن ہو رہا ہے۔ البتہ قرآن کا اصل موضوع مابعد الطبیعیات ہے۔ پھر فکر و عمل دونوں کے لیے راہنمائی درکار ہے' جیسے کہ کسی راستے پر چلنے والے کو "روڈ سائنز" کی ضرورت ہوتی ہے کہ اِدھر نہ جانا' اِدھر خطرہ ہے' ہلاکت ہے۔ اسی طرح انسان کو سفرِ حیات میں ان cautions کی ضرورت ہے کہ ادھر خطرہ ہے' یہ تمہارے لیے ممنوع ہے' یہ حرام ہے' یہ نقصان دہ ہے' اس میں ہلاکت ہے' چاہے تمہیں ہلاکت نظر نہیں آ رہی لیکن تم ادھر جاؤ گے تو تمہارے لیے ہلاکت ہے۔ درحقیقت یہ قرآن کا اصل موضوع ہے۔

❁❁❁

باب ششم

فہمِ قرآن کے اصول

فہم قرآن کے سلسلہ میں درج ذیل عنوانات کی تفہیم ضروری ہے۔

۱) قرآنِ کریم کا اسلوبِ استدلال

قرآن کے طالب علم کو جاننا چاہیے کہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں' فطری ہے۔ انسان جس فلسفے سے واقف ہے اس کی بنیاد منطق ہے۔ چنانچہ ہمارے فلاسفہ اور متکلمین استخراجی منطق (Deductive Logic) سے اعتناء کرتے رہے ہیں' جبکہ قرآن مجید نے اسے سرے سے اختیار نہیں کیا۔ وقتی تقاضے کے تحت ہمارے متکلمین نے اسے اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس سے کوئی زیادہ فائدہ نہیں پہنچ پایا۔ ایمانی حقائق کو جب استخراجی منطق کے ذریعے سے ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تو یقین کم اور شک زیادہ پیدا ہوا۔ اس ضمن میں کانٹ کی بات حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے' لہٰذا علامہ اقبال نے بھی اپنے خطبات کا آغاز اسی حوالے سے کیا ہے۔ کانٹ نے حتمی طور پر ثابت کر دیا کہ کسی منطقی دلیل سے خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ منطق میں اللہ کی ہستی کے اثبات کے لیے ایک دلیل لائیں گے تو منطق کی دوسری دلیل اسے کاٹ دے گی۔ جیسے لوہا لوہے کو کاٹتا ہے اسی طرح منطق' منطق کو کاٹ دے گی۔ قرآن نے اگرچہ کہیں کہیں منطق کو استعمال تو کیا ہے' لیکن وہ بھی منطقی اصطلاحات میں نہیں۔ قرآن مجید کا اسلوب استدلال فطری ہے اور اس کا انداز خطابی ہے۔ جیسے ایک خطیب جب خطبہ دیتا ہے تو جہاں وہ عقلی دلائل دیتا ہے وہاں جذبات سے بھی اپیل کرتا ہے۔ اس سے اس کے خطبے میں گہرائی و گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ ایک لیکچر میں زیادہ تر دارومدار منطق پر ہوتا ہے۔ یعنی ایسی دلیل جو عقل کو قائل کر سکے۔ لیکن شعلہ بیان خطیب انسان کے جذبات کو اپیل کرتا ہے۔ اس کو خطابی دلیل کہا جاتا ہے۔ یہی خطابی انداز اور استدلال قرآن نے استعمال کیا ہے۔

انسان کی فطرت میں کچھ حقائق موجود ہیں۔ قرآن کے پیشِ نظر ان حقائق کو ابھارنا مقصود ہے۔ یعنی انسان کو آمادہ کیا جائے کہ ع

''اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!''

عقل اور منطق کا دائرہ تو بڑا محدود ہے۔ انسان اپنے اندر جھانکے تو اس کے اندر صرف عقل ہی نہیں ہے' کچھ اور بھی ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے!

یہ جو اس کے اندر ''کوئی اور'' شے بھی ہے' اسے اپیل کرنا ضروری ہے تاکہ انسان فطرت کی بنیاد پر اپنے اندر جھانکے اور محسوس کرے کہ ہاں یہ ہے! تاہم اس کے لیے کوئی منطقی دلیل بھی پیش کر دی جائے تو یہ نورٌ علیٰ نور ہوگا۔ یہ ہے درحقیقت قرآن کا فطری طرزِ استدلال۔ بعض مقامات پر ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قرآن اپنے مخاطب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ کہہ رہا ہے اور اسے

توجہ دلا رہا ہے کہ ذرا غور کرو‘ سوچو! اپنے اندر جھانکو۔ جیسے سورۂ ابراہیم کی آیت ۱۰ میں فرمایا گیا: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ’’کیا اللہ کی ہستی میں کوئی شک ہے جو آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے؟‘‘ یہاں کوئی منطقی دلیل نہیں ہے‘ لیکن مخاطب کو دروں بینی پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ اپنے اندر جھانکو‘ تمہیں اپنے اندر ثبوت ملے گا‘ تمہیں اپنے اندر اللہ کی ہستی کی شہادت ملے گی۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۹ میں ارشاد ہوا: ﴿اَئِنَّکُمْ لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِهَةً اُخْرٰی ؕ﴾ ’’کیا تم واقعی اس بات کی گواہی دے رہے ہو کہ اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ بھی ہے؟‘‘ یعنی تم یہ بات کہہ تو رہے ہو‘ لیکن ذرا سوچو تو سہی کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تمہاری فطرت اسے تسلیم کرتی ہے؟ اپنے باطن میں جھانکو‘ کیا تمہارا دل اس کی گواہی دیتا ہے؟ حالانکہ ظاہر ہے کہ وہ تو اس کے مدعی تھے اور اپنے معبودانِ باطل کے لیے کٹ مرنے کو تیار تھے۔ اس خطابی دلیل کے پس منظر میں یہ حقیقت موجود ہے کہ تم جانتے ہو کہ یہ محض ایک عقیدہ (dogma) ہے جو چلا آ رہا ہے‘ تمہارے باپ دادا کی روایت ہے‘ اس کی حیثیت تمہارے نسلی اعتقادات (racial creed) کی ہے۔ قرآن مجید درحقیقت انسان کی فطرت کے اندر جو شے مضمر ہے اسی کو ابھار کر باہر لانا چاہتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا اسلوبِ استدلال منطقی نہیں ہے‘ بلکہ فطری ہے۔ اس کو خطابی انداز کہا جائے گا۔

۲) قرآن حکیم میں محکم اور متشابہ کی تقسیم

سورۂ آل عمران کی آیت ۷ ملاحظہ کیجیے! ارشاد ہوا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ﴾ ’’وہی ہے (اللہ) جس نے (اے محمد ﷺ) آپ پر کتاب نازل کی‘ اس میں سے کچھ آیاتِ محکمات ہیں‘ وہی کتاب کی جڑ بنیاد ہیں اور دوسری متشابہ ہیں‘‘۔ اس آیت میں لفظ کتاب دو دفعہ آیا ہے‘ دونوں کے مفہوم میں باریک سا فرق ہے۔ متشابہ ان معانی میں کہ ان کے اصل مفہوم کو سمجھنے میں اشتباہ ہو جاتا ہے‘ وہ آیاتِ متشابہات ہیں۔ آگے فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ﴾ ’’تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہ آیات کے پیچھے پڑ جاتے ہیں (ان ہی پر غور و فکر اور ان ہی میں کھوج کرید میں لگے رہتے ہیں) اُن کی نیت ہی فتنہ اٹھانے کی ہے‘ اور وہ بھی ہیں جو اُس کا اصل مفہوم جاننا چاہتے ہیں‘‘۔ ﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰہُ ۘ﴾ ’’حالانکہ اس کے حقیقی معانی و مراد اللہ ہی جانتا ہے‘‘۔ ﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ﴾ ’’البتہ جو لوگ علم میں پختگی کے حامل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اس پوری کتاب پر (محکمات پر بھی اور متشابہات پر بھی) یہ سب ہمارے ربّ کی طرف سے ہے‘‘۔ ﴿وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷﴾ ’’لیکن نصیحت نہیں حاصل کرتے مگر وہی جو ہوش مند ہیں‘‘۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان عقلمندوں اور ہوش مندوں میں شامل کرے‘ رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ میں ہمارا شمار ہو!

محکم اور متشابہ سے مراد کیا ہے؟ جان لیجیے کہ ’’محکمِ قطعی‘‘ یعنی وہ محکم جن کے قطعی ہونے میں نہ پہلے کوئی شبہ ہو سکتا تھا نہ اَب ہے‘ نہ آئندہ ہوگا‘ وہ تو قرآن حکیم کے اوامر و نواہی ہیں۔ یعنی یہ کرو‘ یہ نہ کرو‘ یہ حلال ہے‘ یہ حرام ہے‘ یہ جائز ہے‘ یہ ناجائز ہے‘ یہ پسندیدہ ہے‘ یہ ناپسندیدہ ہے‘ یہ اللہ کو پسند ہے اور یہ اللہ کو ناپسند ہے!

قرآن حکیم کا عملی حصہ درحقیقت محکمات ہی پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں کتاب کا لفظ دو مرتبہ آیا ہے۔ پہلے بحیثیت مجموعی پورے قرآن کے لیے فرمایا: ﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ﴾ قرآن مجید کا جو حصہ عملی ہدایات پر مشتمل ہے اس

کے لیے بھی لفظ ''کتاب'' مخصوص ہے۔ چنانچہ دوسری مرتبہ جو لفظ کتاب آیا ہے: ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ وہ اسی مفہوم میں ہے۔ جہاں کوئی شے واجب کی جاتی ہے وہاں ''کُتِبَ'' کا لفظ آتا ہے۔ جیسے ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ... كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ... كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾۔ نماز کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا﴾ یہاں کتاب سے مراد وہ حکم ہے جو دیا گیا ہے' تو اِن معانی میں ﴿هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ سے مراد قانون' شریعت' عملی ہدایات' اوامر و نواہی ہیں اور اصل میں وہی محکمات ہیں۔

دائمی متشابہات عالمِ غیب اور اس کے ضمن میں عالمِ برزخ' عالمِ آخرت' عالمِ ارواح' ملائکہ کا عالم اور عالمِ امثال وغیرہ ہیں۔ یہ درحقیقت وہ دائرہ ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے اور اس کی حقیقتوں کو کما حقہٗ اس زندگی میں سمجھنا محال اور ناممکن ہے' لیکن ان کا ایک علم دیا جانا ضروری تھا۔ مابعد الطبیعیات ایمانیات کے لیے ضروری ہے کہ اس سب کا ایک اجمالی خاکہ سامنے ہو۔ ہر انسان نے مرنا ہے' مرنے کے فوراً بعد عالمِ برزخ میں یہ کچھ ہونا ہے' بعث بعد الموت ہے' حشر نشر ہے' حساب کتاب ہے' جنت و دوزخ ہے۔ ان حقیقتوں کا اجمالی علم موجود نہ ہو تو بنیادی ضرورت کے طور پر انسان کو جو فلسفہ درکار ہے وہ اس کو فراہم نہیں ہوگا۔ لیکن اِن کی حقیقتوں تک رسائی اس زندگی میں رہتے ہوئے ہمارے لیے ممکن نہیں' لہٰذا ان کا جو علم دیا گیا ہے وہ آیاتِ متشابہات ہیں' اور وہ دائماً متشابہات ہی رہیں گی۔ ہاں جب اُس عالم میں آنکھ کھلے گی تو اصل حقیقت معلوم ہوگی' یہاں معلوم نہیں ہو سکتی۔

البتہ متشابہات کا ایک دوسرا دائرہ ہے جو تدریجاً متشابہات سے محکمات کی طرف آ رہا ہے۔ وہ دائرہ مظاہرِ طبیعی (physical phenomena) سے متعلق ہے۔ آج سے ہزار سال پہلے اس کا دائرہ بہت وسیع تھا' آج یہ کچھ محدود ہوا ہے' لیکن اب بھی بہت سے حقائق ہم نہیں جانتے۔ سات آسمانوں کی حقیقت آج تک ہمیں معلوم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ آگے چل کر ہمارا میٹیریل سائنسز کا علم اس حد تک پہنچ جائے کہ معلوم ہو کہ یہ ہے وہ بات جو قرآن نے سات آسمانوں سے متعلق کہی تھی' لیکن اِس وقت یہ ہمارے لیے متشابہات میں سے ہے۔ اسی طرح ایک آیت ﴿وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝۴۰﴾ (یٰسٓ) (ہر شے اپنے مدار میں تیر رہی ہے) اس کو پہلے انسان نہیں سمجھ سکتا تھا' لیکن آج یہ حقیقت محکم ہو کر سامنے آ گئی ہے کہ ع

''لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں!''

اگر آپ نظامِ شمسی کو دیکھیں تو ہر چیز حرکت میں ہے۔ کہکشاں کو دیکھیں تو ہر شے حرکت میں ہے۔ کہکشائیں ایک دوسرے سے دُور بھاگ رہی ہیں' فاصلہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ایک ذرّے (atom) کا مشاہدہ کریں تو اس میں الیکٹرون اور پروٹون حرکت میں ہیں۔ گویا ہر شے حرکت میں ہے۔ آج سے کچھ عرصہ قبل یہ بات متشابہات میں تھی' آج وہ محکمات کے دائرے میں آ گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے وہ سائنسی حقائق جو ابھی تک انسان کو معلوم نہیں ہیں اور ان کے حوالے قرآن میں ہیں' وہ آج کے اعتبار سے تو متشابہات میں شمار ہوں گے' لیکن انسان کا فزیکل سائنسز کا علم آگے بڑھے گا تو وہ تدریجاً متشابہات کے دائرے سے نکل کر محکمات کے دائرے میں آ جائیں گے۔

۳) تفسیر اور تاویل کا فرق

تفسیر اور تاویل دونوں لفظ قرآن مجید میں آئے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی متذکرہ بالا آیت میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ''اس کی تاویل کوئی نہیں جانتا مگر اللہ''۔ تفسیر کا لفظ قرآن مجید میں سورۃ الفرقان میں آیا ہے: ﴿وَلَا يَاْتُوْنَكَ

بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾ ''اور نہیں لاتے وہ آپ کے سامنے کوئی نرالی بات مگر ہم پہنچا دیتے ہیں (اس کے جواب میں) آپ کو ٹھیک بات اور بہترین طریقے سے بات کھول دیتے ہیں''۔ یہ لفظ قرآن میں ایک ہی مرتبہ آیا ہے' جبکہ تاویل کا لفظ سترہ (۱۷) بار آیا ہے۔ اس کے کچھ اور مفاہیم بھی ہیں اور قرآن کے علاوہ کچھ اور چیزوں پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ تفسیر اور تاویل میں فرق کیا ہے؟ تفسیر کا مادہ ''ف' س' ر'' ہے۔ یہ گویا ''سفر'' کی منقلب شکل ہے۔ سفر بمعنی Journey بھی ہے اور اس کا مطلب روشنی بھی ہے' کتاب بھی ہے۔ حروف ذرا آگے پیچھے ہو گئے ہیں' لفظ ایک ہی ہے۔ تفسیر کا معنی ہے کسی شے کا کھولنا' واضح کر دینا' کسی شے کو روشن کر دینا' لیکن یہ زیادہ تر مفردات اور الفاظ سے متعلق ہوتی ہے' جبکہ تاویل بحیثیت مجموعی کلام کا اصل مدلول ہوتی ہے کہ اس سے مراد کیا ہے' اس سے اصل مقصود کیا ہے' اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ لہٰذا زیادہ تر یہی لفظ قرآن کے لیے مستعمل ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں اردو دان لوگ زیادہ تر لفظ تفسیر استعمال کرتے ہیں کہ فلاں آیت کی تفسیر' فلاں لفظ کی تفسیر' لیکن اس کے لیے قرآن کی اصل اصطلاح تاویل ہی ہے اور حدیث میں بھی یہی لفظ آیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے حضور ﷺ کی دعا منقول ہے: ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ)) یعنی اے اللہ! اس نوجوان کو دین کا فہم اور تفقہ عطا فرما اور تاویل کا علم عطا فرما! چنانچہ کلام کی اصل حقیقت' اصل مراد' اصل مطلوب' اصل مدلول کو پا لینا تاکہ انسان اصل مقصود تک پہنچ جائے' اسے تاویل کہتے ہیں۔ ع

''جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!''

''اَوْل'' کا مادہ عربی زبان میں کسی شے کی طرف لوٹنے کے مفہوم میں آتا ہے۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں ہم فلاں کی آل ہیں' یعنی وہ کسی بڑی شخصیت کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں۔ ''آلِ فرعون'' کا مطلب فرعون کی اولاد نہیں ہے' بلکہ ''فرعون والے' فرعونی'' ہے۔ وہ فرعون ہی کی اطاعت کرتے تھے اور اسی کو اپنا معبود یعنی حاکم اور پیشوا سمجھتے تھے۔ اسی معنی میں کسی عبارت کو اُس کے اصل مفہوم کی طرف لوٹانا تاویل ہے۔ تفسیر اور تاویل کے مابین اس فرق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

۴) تاویلِ عام اور تاویلِ خاص

قرآن حکیم کی کسی ایک آیت یا چند آیات کے مجموعے یا کسی خاص مضمون جو چند آیات میں مکمل ہو رہا ہے' پر غور کرنے میں دو مرحلے ہمیشہ پیش نظر رہنے چاہئیں: ایک تاویلِ خاص' دوسرے تاویلِ عام۔ اس سلسلہ میں یاد رہے کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں نازل ہوا ہے۔ اس کا زمانۂ نزول ۶۱۰ء سے ۶۳۲ء کے عرصے پر محیط ہے اور اس کے نزول کی جگہ سرزمین حجاز ہے۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اُس وقت اور اُس علاقے کے لوگوں کے عقائد و نظریات اور ان کی ذہنی سطح کو ملحوظ نہ رکھا جاتا تو ان تک ابلاغ ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ تو اُمّی تھے' پڑھے لکھے نہ تھے۔ اگر انہیں فلسفہ پڑھانا شروع کر دیا جاتا' سائنسی علوم کے بارے میں بتایا جاتا تو یہ باتیں اُن کے سروں کے اوپر سے گزر جاتیں۔ قرآنی آیات تو ان کے دل و دماغ میں پیوست ہو گئیں' کیونکہ براہِ راست ابلاغ تھا' کوئی barrier موجود نہیں تھا۔ تو قرآن حکیم کا یہ شانِ نزول ذہن میں رکھیے۔ ویسے تو ''شانِ نزول'' کی اصطلاح کسی خاص آیت کے لیے استعمال ہوتی ہے' لیکن ایک خاص time and space complex میں قرآن حکیم کا ایک مجموعی شانِ نزول ہے جس میں یہ نازل ہوا۔ وہاں کے حالات' اس عرصے کے واقعات' ان حالات میں تدریجاً جو تبدیلی ہوئی' پھر کون لوگ اس کے مخاطب تھے' اہلِ مکہ کے عقائد' ان کی رسمیں ریتیں' ان کے نظریات' ان

کے مسلّمات' ان کی دلچسپیاں..... جب قرآن کو اس سیاق وسباق (context) میں رکھ کر غور کریں گے تو یہ تاویلِ خاص ہوگی۔ اسی میں آپ مزید تفصیل میں جائیں گے کہ فلاں آیت کا واقعاتی پس منظر کیا ہے۔ یعنی قرآن مجید کی کسی آیت یا چند آیات پر غور کرتے ہوئے اوّلاً اس کو اس کے context میں رکھ کر غور کرنا کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت لوگوں نے ان کا مفہوم کیا سمجھا' یہ تاویلِ خاص ہوگی۔ البتہ قرآن مجید چونکہ نوعِ انسانی کی ابدی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے' صرف خاص علاقے اور خاص زمانے کے لوگوں کے لیے تو نازل نہیں ہوا' لہٰذا اس میں ابدی ہدایت ہے' اس اعتبار سے تاویلِ عام کرنا ہوگی۔

تاویلِ عام کے اعتبار سے الفاظ پر غور کریں گے کہ الفاظ کیا استعمال ہوئے ہیں۔ یہ الفاظ جب ترکیبوں کی شکل اختیار کرتے ہیں تو کیا ترکیبیں بنتی ہیں۔ پھر آیات کا باہمی ربط کیا ہے' سیاق وسباق کیا ہے؟ یہ آیات جس سورۃ میں آئیں اس کا عمود کیا ہے' اس سورۃ کا جوڑ اکون سا ہے' یہ سورۃ کس سلسلۂ سُور کا حصہ ہے۔ پھر وہ سورتیں مکّی اور مدنی کون سے گروپ میں شامل ہیں' ان کا مرکزی مضمون کیا ہے؟ اس پس منظر میں ایک سیاق وسباق متن (text) کا ہوگا' جس سے ہمیں تاویلِ عام معلوم ہوگی اور ایک سیاق و سباق واقعات کا ہوگا' جس سے ہمیں ان آیات کی تاویلِ خاص معلوم ہوگی۔

اگر ہم قرآن مجید کی موجودہ ترتیب کے اعتبار سے آیات پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جس ترتیب سے اِس وقت قرآن مجید موجود ہے اصل حُجّت یہی ہے' یہی اصل ترتیب ہے' یہی لوحِ محفوظ کی ترتیب ہے۔ تاویلِ عام کے اعتبار سے ایک اصولی بات یاد رکھیں: الاعتبار لعموم اللفظ لا لخصوص السبب۔ یعنی اصل اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوگا نہ کہ خاص شانِ نزول کا۔ دیکھا جائے گا کہ جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا مفہوم و معنیٰ نیز مدلول کیا ہے۔ کلامِ عرب سے دلائل لائے جائیں گے کہ وہ انہیں کن معانی میں استعمال کرتے تھے۔ اُس لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا نہ کہ اُس کے شانِ نزول کا۔ لیکن اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ اسے بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ سب سے مناسب بات یہی ہوگی کہ پہلے اس کی تاویلِ خاص پر غور کریں اور پھر اس کے ابدی سرچشمۂ ہدایت ہونے کے ناطے اس کے عموم پر غور کریں۔ اس اعتبار سے تاویلِ خاص اور تاویلِ عام کے فرق کو ذہن میں رکھیں۔

۵) تذکّر و تدبّر

تذکّر اور تدبر دونوں الفاظ الگ الگ تو بہت جگہ آئے ہیں' سورۂ صٓ کی آیت ۲۹ میں یکجا آ گئے ہیں: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾﴾ ''یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے جو (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ کی طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل وفکر رکھنے والے اس سے سبق لیں''۔ ان دونوں کا مطلب کیا ہے؟ ایک ہے قرآن مجید سے ہدایت اخذ کر لینا' نصیحت حاصل کر لینا' اصل راہ نمائی حاصل کر لینا' جس کو مولانا روم نے کہا ع ''ماز قرآں مغز ہا برداشتیم'' یعنی قرآن کا جو اصل مغز ہے وہ تو ہم نے لے لیا۔ اس کا اصل مغز ''ہدایت'' ہے۔ اس مرحلے پر قرآن جو لفظ استعمال کرتا ہے وہ ''تذکّر'' ہے۔ یہ لفظ ذکر سے بنا ہے۔ تذکر یاددہانی کو کہتے ہیں۔ اب اس کا تعلق اسی بات سے جڑ جائے گا جو قرآن کے اسلوبِ استدلال کے ضمن میں پہلے بیان کی جا چکی ہے۔ یعنی قرآن مجید جن اصل حقائق (مابعد الطبیعیاتی حقیقتوں) کی طرف راہنمائی کرتا ہے وہ فطرتِ انسانی میں مضمر ہیں' ان پر صرف ذہول اور نسیان کے پردے پڑ گئے ہیں۔ مثلاً آپ کو کوئی بات کچھ عرصہ قبل معلوم تھی' لیکن اب اس کی طرف دھیان نہیں رہا اور وہ آپ کی یادداشت کے ذخیرے میں گہری اتر گئی ہے اور اب یاد نہیں آتی' لیکن کسی روز اُس کی طرف کوئی ہلکا سا اشارہ ملتے ہی آپ کو وہ پوری بات یاد آ جاتی ہے۔ جیسے آپ کا کوئی

دوست تھا' کسی زمانے میں بے تکلفی تھی' صبح شام ملاقاتیں تھیں' اب طویل عرصہ ہو گیا' کبھی اس کی یاد نہیں آئی۔ ایسا نہیں کہ آپ کو یاد نہیں رہا' بلکہ ذہول ہے' نسیان ہے' توجہ اُدھر نہیں ہے' کبھی ذہن اُدھر منتقل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن اچانک کسی روز آپ نے اپنا ٹرنک کھولا اور اس میں سے کوئی قلم یا رومال جو اُس نے کبھی دیا ہو برآمد ہو گیا تو فوراً آپ کو اپنا وہ دوست یاد آ جائے گا۔ یہ phenomenon تذکر ہے۔ تذکر کا مطلب تعلّم نہیں ہے۔ تعلّم علم حاصل کرنا یعنی نئی بات جاننا ہے' جبکہ تذکر پہلے سے حاصل شدہ علم جس پر ذہول اور نسیان کے جو پردے پڑ گئے تھے' ان کو ہٹا کر اندر سے اسے برآمد کرنا ہے۔ فطرتِ انسانی کے اندر اللہ کی محبت' اللہ کی معرفت کے حقائق مضمر ہیں۔ یہ فطرت میں موجود ہیں' صرف اُن پر پردے پڑ گئے ہیں' دنیا کی محبت غالب آ گئی ہے ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے! (فیضؔ)

یہاں کی دلچسپیوں' مسائل' مشکلات' مصروفیات' مشاغل کی وجہ سے ذہول ہو گیا ہے' پردہ پڑ گیا ہے۔ تذکر یہ ہے کہ اس پردے کو ہٹا دیا جائے۔ ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں' لوحِ جبیں تازہ کریں! (حفیظؔ)

یادداشت کو recall کرنا اور اپنی فطرت میں مضمر حقائق کو اجاگر کر لینا تذکر ہے۔ قرآن کا اصل ہدف یہی ہے اور اس اعتبار سے قرآن کا دعویٰ سورۃ القمر میں چار مرتبہ آیا ہے: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ۝﴾ ''ہم نے قرآن کو تذکر کے لیے بہت آسان بنا دیا ہے' تو کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟'' اس کے لیے بہت گہرائی میں غوطہ زنی کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بہت مشقت و محنت مطلوب نہیں ہے۔ انسان کے اندر طلبِ حقیقت ہو اور قرآن سے براہِ راست رابطہ (Communication) ہو جائے تو تذکر حاصل ہو جائے گا۔ اس کی شرط صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ انسان کو اتنی عربی ضرور آتی ہو کہ وہ قرآن سے ہم کلام ہو جائے۔ اگر آپ ترجمہ دیکھیں گے تو کچھ معلومات تو حاصل ہوں گی' تذکر نہیں ہو گا۔ اقبال نے کہا تھا: ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف!

تذکر کے عمل کا اثر تو یہ ہے کہ آپ کے اندر کے مضمر حقائق ابھر کر آپ کے شعور کی سطح پر دوبارہ آ جائیں۔ یہ نہ ہو کہ پہلے آپ نے متن کو پڑھا' پھر ترجمہ دیکھا' حاشیہ دیکھا' اس کے بعد اگلی آیت کی طرف گئے تو تسلسل ٹوٹ گیا اور کلام کی تاثیر ختم ہو گئی۔ ترجمہ سے کلام کی اصل تاثیر باقی نہیں رہتی۔ شیکسپیئر کی کوئی عبارت آپ انگریزی میں پڑھیں گے تو جھوم جائیں گے' اگر اس کا ترجمہ کریں گے تو اس کا وہ اثر نہیں ہو گا۔ اسی طرح غالبؔ کا شعر ہو یا میرؔ کا' اس کا انگریزی میں ترجمہ کریں گے تو وہ اثر باقی نہیں رہے گا اور آپ وجد میں نہیں آئیں گے' جھوم جھوم نہیں جائیں گے۔ عربی زبان کا اتنا علم کہ آپ عربی متن کو براہِ راست سمجھ سکیں' تذکر کی بنیادی شرط ہے۔ چنانچہ اوّلاً حسنِ نیت ہو' طلبِ ہدایت ہو' تعصب کی پٹی نہ بندھی ہو' اور ثانیاً عربی زبان کا اتنا علم ہو کہ آپ براہِ راست اس سے ہم کلام ہو رہے ہوں' یہ دونوں شرطیں پوری ہو جائیں تو تذکر ہو جائے گا۔

دوبارہ ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ آیت کا مطلب نشانی ہے۔ نشانی اسے کہتے ہیں جس کو دیکھ کر ذہن کسی اور شے کی طرف منتقل

ہو جائے۔ آپ نے قلم یا رومال دیکھا تو ذہن دوست کی طرف منتقل ہو گیا جس سے ملے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا اور اس کا کبھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔ مولانا روم کہتے ہیں ؎

خشک تار و خشک مغز و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست؟

ہمارا ایک ازلی دوست ہے ''اللہ'' وہی ہمارا خالق ہے' ہمارا باری ہے' ہمارا ربّ ہے۔ اس کی دوستی پر کچھ پردے پڑ گئے ہیں' اس پر کچھ ذہول طاری ہو گیا ہے۔ قرآن اس دوست کی یاد دلانے کے لیے آیا ہے۔

اس کے برعکس تدبّر گہرائی میں غوطہ زن ہونے کو کہتے ہیں۔ ع ''قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں!'' تدبّر کے اعتبار سے قرآن حکیم مشکل ترین کتاب ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ اس کا منبع اور سرچشمہ علمِ الٰہی ہے اور علمِ الٰہی لامتناہی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کلام میں متکلّم کی ساری صفات موجود ہوتی ہیں' لہٰذا یہ کلام لامتناہی ہے۔ اس کو کوئی شخص نہ عبور کر سکتا ہے نہ گہرائی میں اس کی تہہ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ ناممکن ہے' چاہے پوری پوری زندگیاں کھپا لیں۔ وہ چاہے صاحبِ کشّاف ہوں' صاحبِ تفسیر کبیر ہوں' کسے باشد۔ اس کا احاطہ کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ بعض لوگ غیر محتاط انداز میں یہ الفاظ استعمال کر دیتے ہیں کہ ''انہیں قرآن پر بڑا عبور حاصل ہے''۔ یہ قرآن کے لیے بڑا توہین آمیز کلمہ ہے۔ عبور ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جانے کو کہتے ہیں۔ قرآن کا تو کنارہ ہی کوئی نہیں ہے۔ کسی انسان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ قرآن پر عبور حاصل کرے۔ یہ ناممکنات میں سے ہے۔ اسی طرح اس کی گہرائی تک پہنچ جانا بھی ناممکن ہے۔

اس سلسلہ میں ایک تمثیل سے بات کسی قدر واضح ہو جائے گی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سمندر میں کوئی ٹینکر تیل لے کر جا رہا ہے اور کسی وجہ سے اچانک تیل لیک کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن وہ تیل سطحِ سمندر کے اوپر ہی رہتا ہے' نیچے نہیں جاتا۔ سطحِ سمندر پر اوپر تیل کی تہہ اور نیچے پانی ہوتا ہے اور وہ تیل پانچ دس میل تک پھیل جاتا ہے۔ سمندر کی اتھاہ گہرائی کے باوجود تیل سطحِ آب پر ہی رہتا ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ قرآن مجید کی اصل ہدایت اور اصل تذکر اس کی سطح پر موجود ہے۔ اس تک رسائی کے لیے سائنس دان یا فلسفی ہونا' عربی ادب کا ماہر ہونا' کلامِ جاہلی کا عالم ہونا ضروری نہیں۔ صرف دو چیزیں موجود ہوں۔ پہلی خلوصِ نیت اور طلبِ ہدایت' دوسری قرآن سے براہِ راست ہم کلامی کا شرف اور اس کی صلاحیت۔ یہ دونوں ہیں تو تذکر کا تقاضا پورا ہو جائے گا' البتہ تدبّر کے لیے گہرائی میں اترنا ہوگا اور اس بحرِ زخّار میں غوطہ زنی کرنا ہوگی۔ تدبّر کا حق ادا کرنے کے لیے شعرِ جاہلی کو بھی جاننا ضروری ہے۔ ہر لفظ کی پہچان ضروری ہے کہ جس دور میں قرآن نازل ہوا اُس زمانے اور اُس علاقے کے لوگوں میں اس لفظ کا مفہوم کیا تھا' یہ کن معانی میں استعمال ہو رہا تھا۔ قرآن نے بنیادی اصطلاحات وہیں سے اخذ کی ہیں۔ وہی الفاظ جن کو عرب اپنے اشعار اور خطبات کے اندر استعمال کرتے تھے انہی کو قرآن مجید نے لیا ہے۔ چنانچہ نزولِ قرآن کے دَور کی زبان کو پہچاننا اور اس کے لیے ضروری مہارت کا ہونا تدبر کے لیے ناگزیر ہے۔ پھر یہ کہ احادیث' علم بیان' منطق' ان سب کو انسان بطریق تدبر جانے گا تو پھر وہ اس کا حق ادا کر سکے گا۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اپنی تفسیر کا نام ہی ''تدبّرِ قرآن'' رکھا ہے اور وہ تدبّرِ قرآن کے بہت بڑے داعی ہیں۔ اس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی ہے۔ ان کے بعض شاگرد حضرات نے بھی محنتیں کی ہیں اور وقت لگایا ہے۔ اس کے ان تقاضوں کو تو اُن حضرات نے بیان کیا ہے' لیکن تدبّرِ قرآن کا ایک اور تقاضا بھی ہے جو بدقسمتی سے ان کے

سامنے بھی نہیں آیا۔ اگر وہ تقاضا بھی پورا نہیں ہوگا تو عصرِ حاضر کے تدبر کا حق ادا نہیں ہوگا۔ وہ تقاضا یہ ہے کہ علمِ انسانی آج جس لیول تک پہنچ گیا ہے' میٹیریل سائنسز کے مختلف علوم کے ضمن میں جو کچھ معلومات انسان کو حاصل ہو چکی ہیں اور وہ خیالات و نظریات جن کو آج دنیا میں مانا جا رہا ہے ان سے آگاہی حاصل کی جائے۔ اگر ان کا اجمالی علم نہیں ہے تو اِس دَور کے تدبّرِ قرآن کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن حکیم وہ کتاب ہے جو ہر دَور کے اُفق پر خورشیدِ تازہ کی مانند طلوع ہوگی۔ آج سے سو برس پہلے کے قرآن اور آج کے قرآن میں اس حوالے سے فرق ہوگا۔ متن اور الفاظ وہی ہیں' لیکن آج علم انسانی کی جو سطح ہے اس پر اس قرآن کے فہم اور اس کے علم کو جس طریقے سے جلوہ گر ہونا چاہیے اگر آپ اس کا حق ادا نہیں کر رہے تو آپ سو برس پہلے کا قرآن پڑھ رہے ہیں' آج کا قرآن نہیں پڑھ رہے۔ جیسے اللہ کی شان ہے: ﴿كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ﴾ اسی طرح کا معاملہ قرآن حکیم کا بھی ہے۔

اسی طرح ہدایتِ عملی کے ضمن میں اقتصادیات' سماجیات اور نفسیاتِ انسانی کے سلسلہ میں راہنمائی اور حقائق قرآن میں موجود ہیں' انہیں کیسے سمجھیں گے؟ قرآن کی اصل تعلیمات کی قدر و قیمت اور اس کی اصل evaluation کیسے ممکن ہے اگر انسان آج کے اقتصادی مسائل کو نہ جانتا ہو؟ اس کے بغیر وہ تدبر قرآن کا حق نہیں ادا کر سکتا۔ مثلاً آج کے اقتصادی مسائل کیا ہیں؟ پیپر کرنسی کی حقیقت کیا ہے؟ اقتصادیات کے اصول و مبادی کیا ہیں؟ بینکنگ کی اصل بنیاد کیا ہے؟ کس طرح کچھ لوگوں نے اس پوری نوعِ انسانی کو معاشی اعتبار سے بے بس کیا ہوا ہے۔ اس حقیقت کو جب تک نہیں سمجھیں گے تو آج کے دَور میں قرآن حکیم کی اقتصادی تعلیمات واضح کرنے کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

واقعہ یہ ہے کہ آج تدبر قرآن کسی ایک انسان کے بس کا روگ ہی نہیں رہا' اس کے لیے تو ایک جماعت درکار ہے۔ میرے کتابچے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کے باب ''تذکر و تدبر'' میں یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ ایسی یونیورسٹیز قائم ہوں جن کا اصل مرکزی شعبہ ''تدبر قرآن'' کا ہو۔ جو شخص بھی اس یونیورسٹی کا طالب علم ہو' وہ عربی زبان سیکھے اور قرآن پڑھے۔ لیکن اس مرکزی شعبے کے گرد تمام علومِ عقلی' جیسے منطق' مابعد الطبیعیات' اخلاقیات' نفسیات اور الٰہیات' علومِ عمرانی جیسے معاشیات' سیاسیات اور قانون' اور علومِ طبعی' جیسے ریاضی' کیمیا' طبیعیات' ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے شعبوں کا ایک حصار قائم ہو' اور ہر ایک طالب علم ''تدبّرِ قرآن'' کی لازماً اور ایک یا اس سے زائد دوسرے علوم کی اپنے ذوق کے مطابق تحصیل کرے اور اس طرح ان شعبہ ہائے علوم میں قرآن کے علم و ہدایت کو تحقیقی طور پر اخذ کر کے مؤثر انداز میں پیش کر سکے۔ طالب علم وہ بھی پڑھے تب معلوم ہوگا کہ اس شعبے میں انسان آج کہاں کھڑا ہے اور قرآن کیا کہہ رہا ہے۔ فلاں شعبے میں نوعِ انسانی کے کیا مسائل ہیں اور اس ضمن میں قرآن حکیم کیا کہتا ہے۔ مختلف شعبے مل کر تدبّرِ قرآن کی ضرورت کو پورا کر سکتے ہیں جو وقت کا اہم تقاضا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' تذکر کے اعتبار سے قرآن آسان ترین کتاب ہے جو ہماری فطرت کی پکار ہے۔ ع ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں تھا!'' اگر انسان کی فطرت مسخ شدہ نہیں ہے' بلکہ سلیم ہے' صالح ہے' سلامتی پر قائم ہے تو وہ قرآن کو اپنے دل کی پکار محسوس کرے گا' اس کے اور قرآن کے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا' وہ اسے اپنے دل کی بات سمجھے گا' اس کے لیے عربی زبان کا صرف اتنا علم کافی ہے کہ براہِ راست ہم کلام ہو جائے۔ جبکہ تدبر کے تقاضے پورے کرنے کسی ایک انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس میدان میں قدم رکھنا چاہے اس کے ذہن میں ایک اجمالی خاکہ ضرور ہونا چاہیے کہ آج جدید سائنسز کے اعتبار سے انسان کہاں کھڑا ہے۔ جب انسان کو اپنے مقام کی معرفت حاصل ہو جائے تو وہ قرآن مجید سے بہتر طور پر فائدہ اٹھا

سکتا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ سمندر میں تو بے تحاشا پانی ہے' آپ اگر پانی لینا چاہتے ہیں تو جتنا بڑا کٹورا' کوئی دیگ' دیگچی یا بالٹی آپ کے پاس ہے اسی کو آپ بھر لیں گے۔ یعنی جتنا آپ کا ظرف ہوگا اتنا ہی آپ سمندر سے پانی اخذ کر سکیں گے۔ اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہ ہوگا کہ سمندر میں پانی ہی اتنا ہے! انسانی ذہن کا ظرف علوم سے بنتا ہے۔ یہ ظرف آج سے پہلے بہت تنگ تھا۔ ایک ہزار سال پہلے کا ظرفِ ذہنی بہت محدود تھا۔ انسانی علوم کے اعتبار سے آج کا ظرف بہت وسیع ہے۔ اگر آج آپ کو قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنی ہے تو آپ کو اپنا ظرف اس کے مطابق وسیع کرنا ہوگا۔ اور اگر کچھ لوگ ابھی اُسی سابق دور میں رہ رہے ہیں تو قرآن حکیم کے مخفی حقائق اُن پر منکشف نہیں ہوں گے۔

۶) عملی ہدایات اور مظاہرِ طبیعی کے بارے میں متضاد طرزِ عمل

قرآن حکیم میں سائنسی علوم کے جو حوالہ جات آتے ہیں اور اس میں جو عملی ہدایات ملتی ہیں' ان کے ضمن میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ ایک اعتبار سے ہمیں آگے سے آگے بڑھنا ہے اور دوسرے اعتبار سے ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم پر غور و فکر کرنے والے کا انداز (attitude) دو اعتبارات سے بالکل متضاد ہونا چاہیے۔ سائنسی حوالہ جات جو قرآن میں آئے ہیں ان کی تعبیر کرنے میں آگے سے آگے جایئے۔ آج انسان کو کیا معلومات حاصل ہو چکی ہیں' کون سے حقائق پایۂ ثبوت کو پہنچ چکے ہیں' ان کے حوالے پیش نظر رہیں گے۔ اس میں پیچھے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ امام رازی اور دیگر قدیم مفسرین کو دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ نے بھی کچھ فرمایا ہے تو وہ بھی ہمارے لیے لازم نہیں ہے۔ اس لیے کہ حضور ﷺ سائنس اور ٹیکنالوجی سکھانے نہیں آئے تھے۔ تأبیرِ نخل کا واقعہ پیچھے گزر چکا ہے' اس کے ضمن میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ((اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاَمْرِ دُنْیَاکُمْ)) ''اپنے دنیاوی معاملات کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو''۔ تجرباتی علوم کے مطابق جو تمہیں علم حاصل ہے اس پر عمل کرو' لیکن دین کا جو عملی پہلو ہے اس میں پیچھے سے پیچھے جایئے۔ یہاں یہ دلیل نہیں چلے گی کہ جدید دَور کے تقاضے کچھ اور ہیں' جبکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کیا کیا۔ اس حوالے سے قرآن کے طالب علم کا رُخ پیچھے کی طرف ہونا چاہیے کہ اسلاف نے کیا سمجھا۔ متأخرین کو چھوڑ کر متقدمین کی طرف جایئے۔ متقدمین سے تبع تابعین' پھر تابعین سے ہوتے ہوئے ''مَا اَنَا عَلَیْهِ وَاَصْحَابِیْ'' یعنی حضور ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل تک پہنچیے۔ اس اعتبار سے اقبال کا یہ شعر صحیح منطبق ہوتا ہے ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باُو نرسیدی تمام بولہبی ست!

دین کا عملی پہلو وہی ہے جو اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے۔ اس میں اگرچہ روایات کے اختلاف کی وجہ سے کچھ فرق ہو جائے گا مگر دلیل یہی رہے گی: ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ))[1] ''نماز اس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ اب نماز کی جزئیات کے بارے میں روایات میں کچھ فرق ملتا ہے۔ کسی کے نزدیک ایک روایت قابلِ ترجیح ہے' کسی کے نزدیک دوسری۔ اس اعتبار سے جزئیات میں تھوڑا بہت فرق ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ البتہ دلیل یہی رہے گی کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل یہ تھا۔ حضور اکرم ﷺ کا یہ فرمان بھی نوٹ کر لیجیے: ((فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ

۱۔ صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة..... راوی: مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ۔

الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ))[۲] ''تم پر میری سُنّت اختیار کرنا لازم ہے اور میرے خلفاءِ راشدین کی سُنّت جو ہدایت یافتہ ہیں''۔ چنانچہ حضور ﷺ کا عمل اور خلفاءِ راشدین کا عمل ہمارے لیے لائقِ تقلید ہے۔ پھر اسی سے متصل وہ چیزیں ہیں جن پر ہماری چودہ سو برس کی تاریخ میں اُمّت کا اجماع رہا ہے۔ اب دنیا اسلامی سزاؤں کو وحشیانہ قرار دے کر ہم پر اثر انداز ہونے کی کوشش کر رہی ہے اور ہمیں بنیاد پرست (fundamentalist) کی گالی دے کر چاہتی ہے کہ ہمارے اندر معذرت خواہانہ رویہ پیدا کر دے' مگر ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ ان باتوں سے قطعاً متأثر ہوئے بغیر دین کے عملی پہلو کے بارے میں پیچھے سے پیچھے جاتے ہوئے ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ تک پہنچ جائیں!

بدقسمتی سے ہمارے عام علماء کا حال یہ ہے کہ انہوں نے عربی علوم تو پڑھے ہیں' عربی مدارس سے فارغ التحصیل ہیں' مگر وہ آگے بڑھنے کی صلاحیت سے عاری ہیں۔ انہوں نے سائنس نہیں پڑھی' وہ جدید علوم سے واقف نہیں' وہ نہیں جانتے آئن سٹائن کس بلا کا نام ہے اور اس شخص کے ذریعے طبیعیات کے اندر کتنی بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ نیوٹونین ایرا کیا تھا اور آئن سٹائن کا دَور کیا ہے' انہیں کیا پتہ! آج کائنات کا تصوّر کیا ہے' ایٹم کی ساخت کیا ہے' انہیں کیا معلوم! ایٹم تو پرانی بات ہو گئی' اب تو انسان نیوٹرون پروٹون سے بھی کہیں آگے کی باریکیوں تک پہنچ چکا ہے۔ اب ان چیزوں کو نہیں جانیں گے تو ان حقائق کو صحیح طور پر سمجھنا ممکن نہیں ہوگا۔ مظاہرِ طبیعی کا معاملہ تو آگے سے آگے جا رہا ہے۔ اس کی تعبیر جدید سے جدید ہونی چاہیے' البتہ اس ضمن میں یہ فرق ضرور ملحوظ رہنا چاہیے کہ ایک تو سائنس کے میدان کے محض نظریات (theories) ہیں جنہیں مسلّمہ حقائق کا درجہ حاصل نہیں ہے' جبکہ ایک وہ چیزیں ہیں جن کی تجرباتی توثیق ہو چکی ہے اور انہیں اب مسلّمہ حقائق کا درجہ حاصل ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا ہوگا۔ خواہ مخواہ کوئی بھی نظریہ سامنے آ جائے یا کوئی مفروضہ (hypothesis) منظرِ عام پر آ جائے اس پر قرآن کو منطبق کرنے کی کوشش کرنا سعی لاحاصل بلکہ مضر شے ہے۔ لیکن اصولی طور پر ہمیں ان چیزوں کی تعبیر میں آگے سے آگے بڑھنا ہے۔ اور جہاں تک دین کے عملی حصے کا تعلق ہے جسے ہم شریعت کہتے ہیں' یعنی اوامر و نواہی' حلال و حرام' حدود و تعزیرات وغیرہ' ان تمام معاملات میں ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا ہوگا' یہاں تک کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں اپنے آپ کو پہنچا دیجیے۔ اس لیے کہ دین اسی کا نام ہے۔ ع

''بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!''

۷) فہمِ قرآن کے لیے جذبۂ انقلاب کی ضرورت

فہمِ قرآن کے لیے بنیادی اصول اور بنیادی ہدایات یا اشارات کے ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے یہ بات بڑی خوبصورتی سے تفہیم القرآن کے مقدمے میں کہی ہے کہ قرآن محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ کسی ڈرائنگ روم میں یا کُتب خانے میں آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ کوئی محقّق یا ریسرچ سکالر ڈکشنریوں اور تفسیروں کی مدد سے اسے سمجھنا چاہے تو نہیں سمجھ سکے گا۔ اس لیے کہ یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ مولانا مرحوم لکھتے ہیں:

''.....اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ بسرے سے نزاعِ کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے

۲۔ سنن ابن ماجہ' المقدمۃ' باب اتباع سنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین۔ وسنن ابی داؤد' کتاب السنۃ' باب فی لزوم السنۃ۔ راوی: عرباض بن ساریۃ ؓ۔

سامنے بے نقاب ہو جائیں! اسے تو پوری طرح آپ اُسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اُسی طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں.....''

قرآن مجید کی بہت سی بڑی اہم حقیقتیں اس کے بغیر منکشف نہیں ہوں گی' اس لیے کہ قرآن ایک ''کتابِ انقلاب'' (Manual of Revolution) ہے۔ اس قرآن نے انسانی جِدّوجُہد کے ذریعے عظیم انقلاب برپا کیا ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی رضی اللہ عنہم ایک حزب اللہ تھے' ایک جماعت اور ایک پارٹی تھے' انہوں نے دعوت اور انقلاب کے تمام مراحل کو طے کیا اور ہر مرحلے پر اس کی مناسبت سے ہدایات نازل ہوئیں۔ ایک مرحلہ وہ بھی تھا کہ حکم دیا جا رہا تھا کہ مار کھاؤ لیکن ہاتھ مت اٹھاؤ: ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ (النساء:۷۷)۔ پھر ایک مرحلہ وہ بھی آیا کہ حکم دے دیا گیا کہ اب آگے بڑھو اور جواب دو' انہیں قتل کرو۔ سورۃ الانفال میں ارشاد ہوا: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (آیت ۳۹) ''اور ان سے جنگ کرتے رہو یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ (آیت ۱۹۱) ''اور اُن کو قتل کر دو جہاں کہیں تم ان کو پاؤ اور انہیں نکالو جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے۔''

دونوں مراحل میں یقیناً فرق ہے' بلکہ بظاہر تضاد ہے' لیکن جاننا چاہیے کہ یہ ایک ہی جِدّوجُہد کے دو مختلف مراحل ہیں۔ پھر ایک داعی جب دعوت دیتا ہے تو جو مسائل اسے درپیش ہوتے ہیں ان کو ایک ایسا شخص قطعاً نہیں جان سکتا جس نے اُس کوچے میں قدم ہی نہیں رکھا ہے۔ اسے کیا احساس ہوگا کہ محمد رسول اللہ ﷺ سے یہ کیوں کہا جا رہا ہے: ﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝۱ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝۲ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝۳﴾ ''قسم ہے قلم کی اور جو کچھ لکھتے ہیں! آپ اپنے ربّ کے فضل سے مجنون نہیں ہیں۔ اور آپ کے لیے تو بے انتہا اجر ہے''۔ یعنی اے نبی ﷺ! آپ محزون اور غمگین نہ ہوں۔ آپ ان کے کہنے سے (معاذ اللہ) مجنون تو نہیں ہو جائیں گے۔ ایسے الفاظ جب کسی کو کہے جاتے ہیں تو اس کا ہی دل جانتا ہے کہ اس پر کیا گزرتی ہے۔ اندازہ لگائیے کہ قریشِ مکہ سے اس قسم کے الفاظ سن کر قلبِ محمدیؐ پر کیا کیفیت طاری ہوتی ہوگی۔ یہ قرآن ہم پر reveal نہیں ہو سکتا جب تک ان احساسات و کیفیات کے ساتھ ہم خود دوچار نہ ہوں۔ جب تک کہ ہماری کیفیات و احساسات اس کے ساتھ مماثلت نہ رکھیں ہم کیسے سمجھیں گے کہ کیا کہا جا رہا ہے اور کس کیفیت کے اندر کہا جا رہا ہے۔

میڈیکل کالج میں داخل ہونے والے طلبہ سب سے پہلے جس کتاب سے متعارف ہوتے ہیں وہ "Manual of Dissection" ہے۔ اس میں ہدایات ہوتی ہیں کہ لاش کے بدن پر یہاں شگاف لگاؤ اور کھال ہٹاؤ تو تمہیں یہ چیز نظر آئے گی' یہاں شگاف لگاؤ تو تمہیں فلاں شے نظر آئے گی' اسے یہاں سے ہٹاؤ گے تو تمہیں اس کے پیچھے فلاں چیز چھپی ہوئی نظر آئے گی۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم "Manual of Revolution" ہے۔ جب تک کوئی شخص انقلابی جِدّوجُہد میں شریک نہیں ہوگا قرآن حکیم کے معارف کا بہت بڑا خزانہ اُس کے لیے بند رہے گا۔ ایک شخص فقیہہ ہے' مفتی ہے تو وہ فقہی احکام کو ضرور اس کے اندر سے نکال لے گا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ بعض تفاسیر ''احکام القرآن'' کے نام سے لکھی گئی ہیں جن میں صرف اُن ہی آیات کے بارے میں گفتگو اور بحث ہے جن سے کوئی نہ کوئی فقہی حکم مستنبط ہوتا ہے۔ مثلاً حلت و حُرمت کا حکم' کسی شے کے فرض ہونے کا حکم جس سے عمل کا معاملہ متعلق ہے۔ باقی تو گویا قصص ہیں' تاریخی حقائق و واقعات ہیں۔ یہاں تک کہ قصہ آدم و ابلیس جو سات مرتبہ قرآن میں آیا ہے' یا

ایمانی حقائق کے لیے جو دلائل و براہین ہیں ان سے کوئی گفتگو نہیں کی گئی' بلکہ صرف احکام القرآن جو قرآن کا ایک حصہ ہے' اسی کو اہمیت دی گئی ہے۔

قرآن کے تدریجاً نزول کا سبب یہ ہے کہ صاحبِ قرآن ﷺ کی جدّوجُہد کے مختلف مراحل کو سمجھا جائے' ورنہ فقہی احکام تو مرتب کر کے دیے جا سکتے تھے' جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دیے گئے تھے۔ ''احکامِ عشرہ'' تختیوں پر کندہ تھے جو موسیٰؑ کے سپرد کر دیے گئے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدّوجُہد جس جس مرحلے سے گزرتی رہی قرآن میں اس مرحلے سے متعلق آیات نازل ہوتی رہیں۔ تنزیل کی ترتیب کے اندر مضمر اصل حکمت یہی تو ہے کہ آنحضور ﷺ کی جدّوجُہد' حرکت اور دعوت کے مختلف مراحل سامنے آ جاتے ہیں۔ اب بھی قرآن کی بنیاد پر اور منہجِ انقلابِ نبویؐ پر جو جدّوجُہد ہو گی اسے ان تمام مراحل سے ہو کر گزرنا ہو گا۔ چنانچہ کم سے کم یہ تو ہو کہ اس جدّوجُہد کو علمی طور پر فہم کے لیے انسان سامنے رکھے۔ اگر علمی اعتبار سے سیرت النبی ﷺ کا خاکہ ذہن میں موجود نہ ہو تو فہم کسی درجے میں بھی حاصل نہیں ہو گا۔ فہمِ حقیقی تو اُسی وقت حاصل ہو گا جب آپ خود اس جدّوجُہد میں لگے ہوئے ہیں اور وہی مسائل آپ کو پیش آ رہے ہیں تو اب معلوم ہو گا کہ یہ مقام اور مرحلہ یا مسئلہ وہ تھا جس کے لیے یہ ہدایتِ قرآنی آئی تھی۔

۸) قرآن کے منزّل مِن اللہ ہونے کا ثبوت

اس ضمن میں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ قرآن کے منزّل مِن اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے۔ یاد رکھیے کہ ثبوت دو قسم کے ہوتے ہیں' خارجی اور داخلی۔ خارجی ثبوت خود محمد رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمانا ہے کہ یہ کلام مجھ پر نازل ہوا۔ پھر آپ ﷺ کی شہادت بھی دو حیثیتوں سے ہے۔ آپ ﷺ کی شخصاً شہادت زیادہ نمایاں اُس وقت تھی جب کہ قرآن نازل ہوا اور حضور ﷺ خود موجود تھے۔ وہ لوگ بھی وہاں موجود تھے جنہوں نے آپ ﷺ کی چالیس سالہ زندگی کا مشاہدہ کیا تھا' جنہیں کاروباری شخصیت کی حیثیت سے آپؐ کے معاملات کا تجربہ تھا۔ جن کے سامنے آپ ﷺ کی صداقت' دیانت' امانت اور ایفائے عہد کا پورا نقشہ موجود تھا۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر جن کے سامنے چہرۂ محمدیؐ موجود تھا۔ سلیم الفطرت انسان آپ ﷺ کا روئے انور دیکھ کر پکار اٹھتا تھا: سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا هٰذَا بِوَجْهِ كَذَّابٍ (اللہ پاک ہے' یہ چہرہ کسی جھوٹے کا ہو ہی نہیں سکتا)۔ تو حضور ﷺ کی شخصیت' آپؐ کی ذات اور آپؐ کی شہادت کہ یہ قرآن مجھ پر نازل ہوا' سب سے بڑا ثبوت تھا۔

اس اعتبار سے یاد رکھیے کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن باہم ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن محمد ﷺ کی رسالت پر گواہی دیتا ہے: ﴿يٰسٓ ۝١ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝٢ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝٣﴾ قرآن گواہی دے رہا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور قرآن کے منزّل مِن اللہ ہونے کا ثبوت ذاتِ محمدیؐ ہے۔ اس کا ایک پہلو تو وہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت رسول اللہ ﷺ کی ذات' آپؐ کی شخصیت' آپؐ کی سیرت و کردار' آپؐ کا اخلاق' آپؐ کا وجود' آپؐ کی شبیہہ اور چہرہ سامنے تھا۔ دوسرا پہلو جو دائمی ہے اور آج بھی ہے وہ حضور ﷺ کا وہ کارنامہ ہے جو تاریخ کی اَن مٹ شہادت ہے۔ آپ ایچ جی ویلز' ایم این رائے یا ڈاکٹر مائیکل ہارٹ سے پوچھیں کہ وہ کتنا عظیم کارنامہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا۔ اور آپؐ خود کہہ رہے ہیں کہ میرا آلہ انقلاب قرآن ہے' یہی میرا اسلحہ اور اصل طاقت ہے' یہی میری قوت کا سرچشمہ اور میری تاثیر کا منبع ہے۔ اس سے بڑی گواہی اور کیا ہو گی؟ یہ تو قرآن کے منزّل من اللہ ہونے کی خارجی شہادت ہے۔ یعنی ''حضورؐ کی شخصیت''۔ شہادت کا یہ پہلو حضور ﷺ کے اپنے زمانے میں اور آپ ﷺ کی حیاتِ دنیاوی کے دوران زیادہ نمایاں تھا۔ اور جہاں تک آپؐ کے

کارنامے کا تعلق ہے اس پر تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دیکھیے مائیکل ہارٹ محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ کہنے پر مجبور ہوا ہے:

"He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels."

یعنی تاریخ انسانی میں صرف وہی واحد شخص ہیں جو سیکولر اور مذہبی دونوں میدانوں میں انتہائی کامیاب رہے ——— اور آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ تو خارجی ثبوت گویا بتمام وکمال حاصل ہو گیا۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا داخلی ثبوت یہ ہے کہ انسان کا دل گواہی دے۔ داخلی ثبوت انسان کا اپنا باطنی تجربہ ہوتا ہے۔ اگر ہزار آدمی کہیں چینی میٹھی ہے مگر آپ نے نہ چکھی ہو تو آپ کہیں گے کہ جب اتنے لوگ کہہ رہے ہیں میٹھی ہے تو ہو گی میٹھی۔ ظاہر ہے ایک ہزار آدمی مجھے کیوں دھوکہ دینا چاہیں گے' یقیناً میٹھی ہو گی۔ لیکن ''ہو گی'' سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ البتہ جب انسان چینی کو چکھ لے اور اس کی اپنی حسِ ذائقہ بتا رہی ہو کہ یہ میٹھی ہے تو اب ''ہو گی'' نہیں بلکہ ''ہے''۔ ''ہو گی'' اور ''ہے'' میں درحقیقت انسان کے ذاتی تجربے کا فرق ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج کی دنیا صرف خارجی تجربات کو جانتی ہے۔ ایک تجربہ اس سے کہیں زیادہ معتبر ہے اور وہ باطنی تجربہ ہے' یعنی کسی شے پر آپ کا دل گواہی دے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

تُو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الٰہ اِلاّ
لغتِ غریب' جب تک تیرا دل نہ دے گواہی!

لا الٰہ الاّ اللہ کے لیے اگر دل نے گواہی نہ دی تو انسان خواہ عربی النسل ہو' عربی زبان جانتا ہو' لیکن اس کے لیے یہ کلمہ لغتِ غریب ہی ہے' نامانوس سی بات ہے' اس کے اندر پیوست نہیں ہے' اس کو متأثر نہیں کرتی۔ قرآن انسان کی اپنی فطرت کو اپیل کرتا ہے اور انسان کو اپنے من میں جھانکنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے مَن میں جھانکو' دیکھو تو سہی' غور تو کرو: ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط﴾ (ابراہیم:۱۰) کیا تمہیں اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے؟ ﴿اَئِنَّکُمْ لَتَشْھَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰہِ اٰلِھَۃً اُخْرٰی ط﴾ (الانعام:۱۹) کیا تم واقعتاً یہ گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے؟

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ ہی میرے دل میں ہے!

علامہ ابن قیمؒ نے اس کی بڑی خوبصورت تعبیر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو یوں محسوس کرتے ہیں کہ وہ مصحف سے نہیں پڑھ رہے' بلکہ قرآن اُن کے لوحِ قلب پر لکھا ہوا ہے' وہاں سے پڑھ رہے ہیں۔ گویا فطرتِ انسانی کو قرآن مجید کے ساتھ اتنی ہم آہنگی ہو جاتی ہے۔

ہمارے دَور کے ایک صوفی بزرگ کہا کرتے ہیں کہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ جیسے ایک گاؤں کے رہنے والے ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور باہم اُنسیت محسوس کرتے ہیں ایسا ہی معاملہ روحِ انسانی اور قرآن حکیم کا ہے۔ قرآن کو پڑھ کر اور سن کر روحِ انسانی محسوس کرتی ہے کہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرا ہے۔ جہاں سے میں آئی ہوں یہ کلام بھی وہیں سے آیا ہے۔ یقیناً اس کلام کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میرے وجود' میری ہستی اور میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ ہم آہنگی ہے جو اصل باطنی تجربہ بن جائے تب ہی یقین ہوتا ہے کہ یہ کلام واقعتاً اللہ کا ہے۔ ❁❁❁

باب ہفتم

اعجازِ قرآن کے اہم اور بنیادی وجوہ

قرآن اور صاحبِ قرآنؐ کا باہمی تعلق

میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن مجید اور نبی اکرم ﷺ دونوں ایک دوسرے کے شاہد ہیں۔ قرآن کے مُنَزَّل مِنَ اللّٰہ ہونے کی سب سے بڑی اور سب سے معتبر خارجی گواہی نبی اکرم ﷺ کی اپنی گواہی ہے۔ آپؐ کی شخصیت' آپؐ کا کردار' آپؐ کا چہرۂ انور اپنی اپنی جگہ پر گواہ ہیں۔ ہمارے لیے اگرچہ آپ ﷺ کی سیرت آج بھی زندہ و پائندہ ہے' کتابوں میں درج ہے' لیکن ایک مجسم انسانی شخصیت کی صورت میں آپ ﷺ ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں' ہم آپ ﷺ کے روئے انور کی زیارت سے محروم ہیں۔ تاہم آپ ﷺ کا کارنامہ زندہ و تابندہ ہے اور اس کی گواہی ہر شخص دے رہا ہے۔ ہر مؤرخ نے تسلیم کیا ہے' ہر مفکر نے مانا ہے کہ تاریخِ انسانی کا عظیم ترین انقلاب وہ تھا جو حضور ﷺ نے برپا کیا۔ آپؐ کی یہ عظمت آج بھی مبرہن ہے' آشکارا ہے' اظہر من الشمس ہے۔ چنانچہ قرآن کے مُنَزَّل مِنَ اللّٰہ اور کلامِ الٰہی ہونے پر سب سے بڑی خارجی گواہی خود نبی اکرم ﷺ ہیں' اور نبی اکرم ﷺ کے نبی اور رسول ہونے کا سب سے بڑا گواہ' سب سے بڑا شاہد اور سب سے بڑا ثبوت خود قرآن مجید ہے۔

اس اعتبار سے یہ دونوں جس طرح لازم و ملزوم ہیں اس کے لیے میں قرآن حکیم کے دو مقامات سے استشہاد کر رہا ہوں۔ سورۃ البیّنہ میں فرمایا:

﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝۱﴾

''اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے کفر کیا اور مشرک باز آنے والے نہ تھے یہاں تک کہ اُن کے پاس 'بیّنہ' آجاتی۔''

''بَیِّنَہ'' کھلی اور روشن دلیل کو کہتے ہیں۔ ایسی روشن حقیقت جس کو کسی خارجی دلیل کی مزید حاجت نہ ہو وہ ''بَیِّنَہ'' ہے۔ جیسے ہم اپنی گفتگو میں کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل بیّن ہے' بالکل واضح ہے' اس پر کسی قیل و قال کی حاجت ہی نہیں ہے۔ بلکہ اگر بَیِّنَہ پر کوئی دلیل لانے کی کوشش کی جائے تو کسی درجے میں شک و شبہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے' اس پر یقین میں اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ بَیِّنَہ کیا ہے؟ فرمایا:

﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۝۲ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝۳﴾

''ایک رسول اللہ کی جانب سے جو پاک صحیفے پڑھ کر سناتا ہے' جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں۔''

یہاں قرآن حکیم کی سورتوں کو اللہ کی کتابوں سے تعبیر کیا گیا ہے' جو قائم و دائم ہیں اور ہمیشہ ہمیش رہنے والی ہیں۔ تو گویا رسولؐ کی شخصیت اور اللہ کا یہ کلام جو اُن پر نازل ہوا' دونوں مل کر ''بَیِّنَہ'' بنتے ہیں۔

میں نے قرآن فہمی کا یہ اصول بارہا عرض کیا ہے کہ قرآن مجید میں اہم مضامین کم سے کم دو جگہ ضرور آتے ہیں۔ چنانچہ اس کی نظیر سورۃ الطلاق میں موجود ہے۔ اس کی آیت ۱۰ ان الفاظ پر ختم ہوتی ہے: ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝۱۰﴾ ''اللہ نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کر دیا ہے''۔ اور یہ ذکر کیا ہے؟ فرمایا: ﴿رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ ''ایک ایسا رسول جو تمہیں پڑھ کر سنا رہا ہے اللہ کی آیات جو ہر شے کو روشن کر دینے والی (اور ہر حقیقت کو مبرہن کر دینے والی) ہیں' تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے''۔ یہاں ''اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ'' کے بجائے ''اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ'' آیا ہے۔ ''بیّن'' وہ چیز ہے جو خود روشن ہے اور ''مُبَیِّن'' وہ چیز ہے جو دوسری چیزوں کو روشن کرتی ہے' حقائق کو اُجاگر کرتی ہے۔ تو یہاں پر ذکر کی جو تاویل کی گئی کہ ﴿رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ﴾ اس سے واضح ہوا کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے اور ملے ہوئے ہیں کہ ایک حیاتیاتی وجود (Organic Whole) بن گئے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے لیے شاہد بھی ہیں اور ایک دوسرے کے لیے complimentary بھی ہیں۔ اس حوالے سے یہ دونوں حقیقتیں اس طرح جمع ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں کی جا سکتیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ: قرآن حکیم

اگلی بات یہ سمجھئے کہ نبی اکرم ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا بالفاظِ دیگر آپؐ کا اصل معجزہ' بلکہ واحد معجزہ قرآن حکیم ہے۔ یہ بات ذرا اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ ''معجزہ'' کا لفظ ہمارے ہاں بہت عام ہو گیا ہے اور ہر خرقِ عادت شے کو معجزہ شمار کیا جاتا ہے۔ معجزہ کے لفظی معنی عاجز کر دینے والی شے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ''عجز'' مادہ سے بہت سے الفاظ آتے ہیں' لیکن ہمارے ہاں اصطلاح کے طور پر اس لفظ کا جو اطلاق کیا جاتا ہے وہ قرآن حکیم میں مستعمل نہیں ہے' بلکہ اللہ کے رسولوں کو جو معجزات دیے گئے انہیں بھی آیات کہا گیا ہے۔ انبیاء و رُسل اللہ تعالیٰ کی آیات یعنی اللہ کی نشانیاں لے کر آئے۔

اس اعتبار سے معجزہ کا لفظ جس معنی میں ہم استعمال کرتے ہیں' اس معنی میں یہ قرآن مجید میں مستعمل نہیں ہے۔ البتہ وہ طبیعی قوانین (Physical Laws) جن کے مطابق یہ دنیا چل رہی ہے' اگر کسی موقع پر وہ ٹوٹ جائیں اور ان کے ٹوٹ جانے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی مشیتِ خصوصی ظاہر ہو تو اسے خرقِ عادت کہتے ہیں۔ مثلاً قانون تو یہ ہے کہ پانی اپنی سطح ہموار رکھتا ہے' لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کی ضرب لگائی اور سمندر پھٹ گیا' یہ خرقِ عادت ہے' یعنی جو عادی قانون ہے وہ ٹوٹ گیا۔ ''خرق'' پھٹ جانے کو کہتے ہیں' جیسے سورۃ الکہف میں یہ لفظ آیا ہے' ''خَرَقَهَا'' یعنی اُس اللہ کے بندے نے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے' کشتی میں شگاف ڈال دیا۔ پس جب بھی کوئی طبیعی قانون ٹوٹے گا تو وہ خرقِ عادت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ان خرقِ عادت واقعات کے ذریعے سے بہت سے قوانینِ قدرت کو توڑ کر اپنی خصوصی مشیت اور خصوصی قدرت کا اظہار فرماتا ہے۔ اور یہ بات ہمارے ہاں مسلّم ہے کہ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ صرف انبیاء کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے بھی جن کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا چاہے کرتا ہے' لیکن اصطلاحاً ہم انہیں کرامات کہتے ہیں۔ خرقِ عادت یا کرامات اپنی جگہ پر ایک مستقل مضمون ہے۔

معجزہ بھی خرقِ عادت ہوتا ہے' لیکن رسول کا معجزہ وہ ہوتا ہے جو دعوے کے ساتھ پیش کیا جائے اور جس میں تحدّی

(challenge) بھی موجود ہو۔ یعنی جسے رسول خود اپنی رسالت کے ثبوت کے طور پر پیش کرے اور پھر اُس میں مقابلے کا چیلنج دیا جائے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے جو معجزات عطا کیے ان میں ''یدِ بیضا'' اور ''عصا'' کی حیثیت اصل معجزے کی تھی۔ ویسے آیات اور بھی دی گئی تھیں جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ﴾ ''اور بیشک ہم نے موسیٰ کو نو روشن نشانیاں دیں''۔ مگر یہ اُس وقت کی بات ہے جب آپؑ ابھی مصر کے اندر تھے۔ پھر جب آپؑ مصر سے باہر نکلے تو عصا کی کرامات ظاہر ہوئیں کہ اس کی ضرب سے سمندر پھٹ گیا' اس کی ضرب سے چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے۔ یہ تمام چیزیں خرقِ عادت ہیں' لیکن اصل معجزے دو تھے جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعوے کے ساتھ پیش کیا کہ یہ میری رسالت کا ثبوت ہے۔

جب آپؑ فرعون کے دربار میں پہنچے اور آپ نے اپنی رسالت کی دعوت پیش کی تو دلیلِ رسالت کے طور پر فرمایا کہ میں اس کے لیے سند ﴿سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ﴾ بھی لے کر آیا ہوں۔ فرعون نے کہا کہ لاؤ پیش کرو تو آپؑ نے یہ دو معجزے پیش کیے۔ یہ دو معجزے جو اللہ کی طرف سے آپؑ کو عطا کیے گئے' آپؑ کی رسالت کی سند تھے۔ اس میں تحدی بھی تھی۔ لہٰذا مقابلہ بھی ہوا اور جادوگروں نے پہچان بھی لیا کہ یہ جادو نہیں ہے' معجزہ ہے۔ معجزہ جس میدان کا ہوتا ہے اسے اُسی میدان کے افراد ہی پہچان سکتے ہیں۔ جب جادوگروں کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تو عام دیکھنے والوں نے تو یہی سمجھا ہوگا کہ یہ بڑا جادوگر ہے اور یہ چھوٹے جادوگر ہیں' اس کا جادو زیادہ طاقتور نکلا' اس کے عصا نے بھی سانپ اور اژدھا کی شکل اختیار کی تھی اور ان جادوگروں کی رسّیوں اور چھڑیوں نے بھی سانپوں کی شکل اختیار کر لی تھی' البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کا بڑا سانپ باقی تمام سانپوں کو نگل گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مجمع ایمان نہیں لایا' لیکن جادوگر تو جانتے تھے کہ اُن کے فن کی رسائی کہاں تک ہے' اس لیے اُن پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ یہ جادو نہیں ہے' کچھ اور ہے۔

اسی طرح قرآن حکیم کے معجزہ ہونے کا اصل احساس عرب کے شعراء' خطیبوں اور زبان دانوں کو ہوا تھا۔ عام آدمی نے بھی اگرچہ محسوس کیا کہ یہ خاص کلام ہے' بہت پُرتاثیر اور میٹھا کلام ہے' لیکن اس کا معجزہ ہونا یعنی عاجز کر دینے والا معاملہ تو اسی طرح ثابت ہوا کہ قرآن مجید میں بار بار چیلنج دیا گیا کہ اس جیسا کلام پیش کرو۔ اس اعتبار سے جان لیجیے کہ رسول اللہ ﷺ کا اصل معجزہ قرآن ہے۔

آپ ﷺ کے خرقِ عادت معجزات تو بے شمار ہیں۔ شقِ قمر قرآن حکیم سے ثابت ہے' لیکن یہ آپ ﷺ نے دعوے کے ساتھ نہیں دکھایا' نہ ہی اِس پر کسی کو چیلنج کیا' بلکہ آپؐ سے جو مطالبے کیے گئے تھے کہ آپؐ یہ یہ کر کے دکھائیے' اُن میں سے کوئی بات اللہ تعالیٰ کے ہاں منظور نہیں ہوئی۔ اللہ چاہتا تو اُن کا مطالبہ پورا کرا دیتا' لیکن اُن مطالبوں کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ البتہ خرقِ عادت واقعات بے شمار ہیں۔ جانوروں کا بھی آپؐ کی بات کو سمجھنا اور آپؐ سے عقیدت کا اظہار کرنا بہت مشہور ہے۔ حجۃ الوداع کے موقع پر ۶۳ اونٹوں کو حضور ﷺ نے خود اپنے ہاتھ سے نحر کیا تھا۔ قطار میں سو اونٹ کھڑے کیے گئے تھے۔ روایات میں آتا ہے کہ ایک اونٹ جب گرتا تھا تو اگلا خود آگے آ جاتا تھا۔ اسی طرح ''ستونِ حنانہ'' کا معاملہ ہوا۔ حضور ﷺ مسجد نبویؐ میں کھجور کے ایک تنے کا سہارا لے کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے' مگر جب اِس مقصد کے لیے منبر بنا دیا گیا اور آپؐ پہلی مرتبہ منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینے لگے تو اُس سوکھے ہوئے تنے میں سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بچہ بلک بلک کر رو رہا ہو' اسی لیے تو اسے ''حنانہ'' کہتے ہیں۔ ایسے ہی کئی مواقع پر تھوڑا کھانا بہت سے لوگوں کو کفایت کر گیا۔

اِن خرقِ عادت واقعات کو بعض عقلیت پسند (Rationalists) اور سائنسی مزاج کے حامل لوگ تسلیم نہیں کرتے۔ پچھلے زمانے میں بھی لوگ ان کا انکار کرتے رہے ہیں۔ اس پر مولانا روم نے خوب فرمایا ہے کہ: ؎

فلسفی کُو منکرِ حنانہ است
از حواسِ انبیا بیگانہ است!

بہرحال خرقِ عادت واقعات حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں بہت ہیں۔ (تفصیل دیکھنا ہو تو ''سیرت النبیؐ'' از مولانا شبلی کی ایک ضخیم جلد صرف حضور ﷺ کے خرقِ عادت واقعات پر مشتمل ہے) لیکن جیسا کہ اوپر گزرا' معجزہ دعوے کے ساتھ اور رسالت کے ثبوت کے طور پر ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں اس کی دوسری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آئی ہے کہ آپؑ لوگوں سے فرماتے ہیں کہ دیکھو میں مُردوں کو زندہ کر کے دکھا رہا ہوں۔ میں گارے سے پرندے کی صورت بناتا ہوں اور اُس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے اڑتا ہوا پرندہ بن جاتا ہے۔ خرقِ عادت کا معاملہ تو غیر نبی کے لیے بھی ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کے لیے بھی اس طرح کے حالات پیدا کر سکتا ہے۔ اُن کا اللہ کے ہاں جو مقام و مرتبہ ہے اس کے اظہار کے لیے کرامات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ یہ چیزیں بعید نہیں ہیں' لیکن انبیاء کی کرامات کو عرفِ عام میں ''معجزات'' کہا جاتا ہے اور غیر انبیاء اور اولیاء کے لیے ''کرامات'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن معجزہ وہ ہے جسے اللہ کا رسول دعوے کے ساتھ پیش کرے اور چیلنج کرے۔

یہ بات کہ قرآن مجید ہی حضور ﷺ کا اصل معجزہ ہے' دو اعتبارات سے قرآن میں بیان کی گئی ہے۔ ایک مثبت انداز ہے' جیسے سورۂ یٰسٓ کی ابتدائی آیات میں فرمایا: ﴿یٰسٓ ۝۱ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۝۲ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳﴾ ''یٰسٓ۔ قسم ہے قرآن حکیم کی (اور قسم کا اصل فائدہ شہادت ہوتا ہے' یعنی گواہ ہے یہ قرآن حکیم) کہ یقیناً (اے محمد ﷺ) آپ اللہ کے رسول ہیں''۔ خطاب بظاہر حضور ﷺ سے ہے' حالانکہ حضورؐ کو یہ بتانا مقصود نہیں ہے' بلکہ مخاطبین یعنی اہلِ عرب اور اہلِ مکہ کو سنایا جا رہا ہے کہ یہ قرآن شاہد ہے' یہ ثبوت ہے' یہ دلیلِ قطعی ہے کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' یہ قرآن پکار پکار کر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن حکیم کے چار مقامات اور ہیں جن میں یہی آیت ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ مقدر ہے' اگرچہ بیان نہیں ہوئی۔ سورۂ صٓ کا آغاز ہوتا ہے: ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝۱ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝۲﴾ ''صٓ' قسم ہے اس قرآن کی جو نصیحت (یاددہانی) والا ہے۔ لیکن وہ لوگ کہ جو منکر ہیں' گھمنڈ اور ضد میں پڑے ہوئے ہیں''۔ یہاں ''صٓ'' ایک حرف ہے' لیکن اس سے آیت نہیں بنی' جبکہ ''یٰسٓ'' ایک آیت ہے۔ سورۂ صٓ کی پہلی آیت قسم پر مشتمل ہے۔ ''بَلْ'' سے جو دوسری آیت شروع ہو رہی ہے یہ ثابت کر رہی ہے کہ مُقسَم علیہ (جس چیز پر قسم کھائی جا رہی ہے) یہاں محذوف ہے اور وہ ﴿اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ ہے۔ گویا معناً اسے یوں پڑھا جائے گا: ﴿صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝۱ (اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا... اسی طرح سورۂ قٓ میں ہے: ﴿قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱ (اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَاۗءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ...﴾

ایسے ہی دو سورتیں الزخرف اور الدخان ''حٰمٓ'' سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کی پہلی دو آیات بالکل ایک جیسی ہیں: ﴿حٰمٓ ۝۱

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲﴾ پہلی آیت حروفِ مقطعات پر اور دوسری آیت قسم پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد مقسم علیہ (اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) محذوف ماننا پڑے گا۔ گویا: ﴿حٰمٓ ۝۱ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲ (اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۳﴾ اور: ﴿حٰمٓ ۝۱ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝۲ (اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ) اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝۳﴾ یہ ایک اسلوب ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو ثابت کرنے کے لیے قرآن کی قسم کھائی گئی یعنی قرآن کی گواہی اور شہادت پیش کی گئی۔ یہ اِس بات کو کہنے کا ایک اسلوب ہے کہ حضور ﷺ کی رسالت کا اصل ثبوت یا آپؐ کا اصل معجزہ قرآن ہے۔

قرآن کا دعویٰ اور چیلنج

پہلے گزر چکا ہے کہ معجزے میں تحدّی (چیلنج) بھی ضروری ہے اور دعویٰ بھی۔ لہٰذا وہ مقامات گن لیجیے جن میں چیلنج ہے کہ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ محمد ﷺ کا کلام ہے' انسانی کلام ہے جسے محمد ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے' یہ اُن کی اپنی اختراع ہے تو تم مقابلہ کرو اور ایسا ہی کلام پیش کرو۔ قرآن مجید میں ایسے پانچ مقامات ہیں۔ سورۃ الطور میں فرمایا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۳۳ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ۝۳۴﴾

''کیا اُن کا یہ کہنا ہے کہ یہ محمدؐ نے خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں۔ پھر چاہیے کہ وہ اسی طرح کا کوئی کلام پیش کریں اگر وہ سچے ہیں۔''

قَالَ' يَقُوْلُ کا معنی ہے کہنا۔ جبکہ تَقَوَّلَ' يَتَقَوَّلُ کا مفہوم ہے تکلف کر کے کہنا' یعنی محنت کر کے کلام موزوں کرنا (جس کے لیے انگریزی میں composition کا لفظ ہے۔) تو کیا اُن کا خیال ہے کہ یہ محمد ﷺ نے خود کہہ لیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں' لہٰذا اس طرح کی کٹ حجتیاں کر رہے ہیں۔ اگر یہ سچے ہیں تو ایسا ہی کلام پیش کریں۔ آخر یہ بھی انسان ہیں' اِن میں بڑے بڑے شعراء اور بڑے قادر الکلام خطیب موجود ہیں۔ ان میں وہ شعراء بھی ہیں جن کو دوسرے شعراء سجدہ کرتے ہیں۔ یہ سب کے سب مل کر ایسا کلام پیش کریں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝۸۸﴾

''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اگر تمام جن و انس جمع ہو جائیں (اور اپنی پوری قوت و صلاحیت اور اپنی تمام ذہانت و فطانت' قادر الکلامی کو جمع کر کے کوشش کریں) کہ اِس قرآن جیسی کتاب پیش کر دیں تو وہ ہرگز ایسی کتاب نہیں لا سکیں گے چاہے وہ ایک دوسرے کی کتنی ہی مدد کریں۔''

یہ تو بحیثیت مجموعی پورے قرآن مجید کی نظیر پیش کرنے سے مخلوق کے عاجز ہونے کا دعویٰ ہے جو قرآن مجید نے دو مقامات پر کیا ہے۔ سورۂ ہود میں اس سے ذرا نیچے اُتر کر' جسے بر سبیلِ تنزّل کہا جاتا ہے' فرمایا کہ پورے قرآن کی نظیر نہیں لا سکتے تو ایسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ! ارشاد ہوا:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۱۳﴾ (ھود)

''کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود گھڑ کر لے آیا ہے؟ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے پس تم بھی دس سورتیں بنا کر لے آؤ ایسی ہی گھڑی ہوئی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔''

اس کے بعد دس سے نیچے اتر کر ایک سورۃ کا چیلنج بھی دیا گیا:

﴿اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ افۡتَرٰىہُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّثۡلِہٖ وَادۡعُوۡا مَنِ اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۳۸﴾﴾ (یونس)

''کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ قرآن خود بنا کر لے آیا ہے؟ (اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے پس تم بھی ایک سورت بنا کر لے آؤ ایسی ہی اور بلا لو جس کو بلا سکو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔''

یہ چاروں مقامات تو مکی سورتوں میں ہیں۔ پہلی مدنی سورۃ ''البقرۃ'' ہے۔ اس میں بڑے اہتمام کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے:

﴿وَاِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ ۪ وَادۡعُوۡا شُہَدَآءَکُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُہَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَۃُ ۚ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۲۴﴾﴾

''اگر تم لوگوں کو شک ہے اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورۃ تم بھی (موزوں کر کے) لے آؤ اور اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو (ان سب کو جمع کر لو) اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔ اور اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے تو بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے یہ منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

یہاں یہ واضح کیا جا رہا ہے کہ حقیقت میں تم سچے نہیں ہو تمہارا دل گواہی دے رہا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے لیکن چونکہ تم زبان سے تنقید کر رہے ہو اور جھٹلا رہے ہو تو اگر واقعتاً تمہیں شک ہے تو اِس شک کو رفع کرنے کے لیے ہمارا یہ چیلنج موجود ہے۔

یہ ہیں قرآن مجید کے معجزہ ہونے کے دو اسلوب۔ ایک مثبت انداز ہے کہ قرآن گواہ ہے اس پر کہ اے محمد! (ﷺ) آپ اللہ کے رسول ہیں اور دوسرا انداز چیلنج کا ہے کہ اگر تمہیں اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شک ہے تو اس جیسا کلام تم بھی بنا کر لے آؤ۔

قرآن کس کس اعتبار سے معجزہ ہے؟

اب اس ضمن میں تیسری ذیلی بحث یہ ہوگی کہ قرآن مجید کس کس اعتبار سے معجزہ ہے۔ یہ مضمون اتنا وسیع اور اتنا متنوع الاطراف ہے کہ ''وجوہِ اعجاز القرآن'' پر پوری پوری کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر بات ہے اس وقت اِس کا احاطہ مقصود نہیں ہے صرف موٹی موٹی باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

اصل شے تو اِس کی تاثیرِ قلب ہے کہ یہ دل کو لگنے والی بات ہے۔ اس کا اصل اعجاز یہی ہے کہ یہ دل کو جا کر لگتی ہے بشرطیکہ پڑھنے والے کے اندر تعصب ضد اور ہٹ دھرمی نہ ہو اور اسے زبان سے اتنی واقفیت ہو جائے کہ براہِ راست قرآن اس کے دل پر اتر سکے۔ یہ قرآن کے اعجاز کا اصل پہلو ہے۔ لیکن اضافی طور پر جان لیجیے کہ جس وقت قرآن نازل ہوا اُس وقت کے اعتبار سے اس کے معجزہ ہونے کا نمایاں اور اہم تر پہلو اِس کی ادبیت اِس کی فصاحت و بلاغت اس میں الفاظ کا انتخاب بندشیں اور ترکیبیں اس کی مٹھاس اور اس کا صوتی آہنگ ہے۔ یہ درحقیقت نزول کے وقت قرآن کے معجزہ ہونے کا سب سے نمایاں پہلو ہے۔

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ ہر رسول کو اُسی طرز کا معجزہ دیا گیا جن چیزوں کا اُس کے زمانے میں سب سے زیادہ چرچا اور شغف تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو عام تھا لہٰذا مقابلے کے لیے آپؑ کو وہ چیزیں دی گئیں جن سے آپؑ جادوگروں کو شکست دے سکیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس قوم میں اپنی دعوت کا آغاز کیا اُس قوم کا اصل ذوق قدرتِ کلام تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اصل میں بولنے والے تو ہم ہی ہیں' باقی دنیا تو گونگی ہے۔ ان کی زبان دانی کا یہ عالَم تھا کہ وہ اپنی پسند کی اشیاء کے نام رکھنا شروع کرتے تو ہزاروں نام رکھ دیتے۔ چنانچہ عربی میں شیر اور تلوار کے لیے پانچ پانچ ہزار الفاظ ہیں۔ گھوڑے اور اونٹ کے لیے لاتعداد الفاظ ہیں۔ یہ اُن کی قادر الکلامی ہے کہ کسی شے کو اُس کی ہر ادا کے اعتبار سے نیا نام دے دیتے۔ گھوڑا اُن کی بڑی محبوب شے ہے' لہٰذا اُس کے نامعلوم کتنے نام ہیں۔ شعر و شاعری میں ان کے ذوق و شوق کا یہ عالَم تھا کہ اُن کے ہاں سالانہ مقابلے ہوتے تھے تاکہ اس سال کے سب سے بڑے شاعر کا تعین کیا جائے۔ شعراء اپنے اپنے قصیدے لکھ کر لاتے تھے' مقابلہ ہوتا تھا۔ پھر جب فیصلہ ہوتا تھا کہ کس کا قصیدہ سب پر بازی لے گیا ہے تو باقی تمام شعراء اس کی عظمت کے اعتراف کے طور پر اُس کو سجدہ کرتے تھے۔ پھر وہ قصیدہ خانۂ کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیا جاتا تھا کہ یہ ہے اس سال کا قصیدہ۔ چنانچہ اس طرح کے سات قصیدے خانہ کعبہ میں آویزاں کیے گئے تھے جنہیں "سَبْعَۃ مُعَلَّقَۃ" کہا جاتا تھا۔ سَبْعَۃ مُعَلَّقَۃ کے آخری شاعر حضرت لبید رضی اللہ عنہ تھے جو ایمان لے آئے۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے شعر کہنے چھوڑ دیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا کہ اے لبید! اب آپ شعر کیوں نہیں کہتے؟ تو جواب میں انہوں نے بڑا پیارا جملہ کہا کہ "اَبَعْدَ الْقُرْآنِ؟" یعنی کیا قرآن کے نزول کے بعد بھی؟ اب کسی کے لیے کچھ کہنے کا موقع باقی ہے؟ قرآن کے آجانے کے بعد کوئی اپنی فصاحت و بلاغت کے اظہار کی کوشش کر سکتا ہے؟ گویا زبانیں بند ہو گئیں' اُن پر تالے پڑ گئے' ملک الشعراء نے شعر کہنے چھوڑ دیے۔

جن لوگوں کی مادری زبان عربی ہے وہ آج بھی قرآن کے اِس اعجاز کو محسوس کر سکتے ہیں۔ غیر عرب لوگوں کے لیے اس کو محسوس کرنا ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی اپنی محنت سے عربی ادب کے اندر مولانا علی میاں[1] کی سی مہارت حاصل کر لے تو وہ واقعتاً اس کو محسوس کر سکے گا اور اس کی تحسین کر سکے گا کہ فصاحت و بلاغت میں قرآن کا کیا مقام ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے' البتہ اس کا صوتی آہنگ ہم محسوس کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی قراءت کے اندر ایک معجزانہ تأثیر ہے جو قلب کے اندر عجیب کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔ قرآن کا صوتی آہنگ ہماری فطرت کے تاروں کو چھیڑتا ہے۔ قرآن کی یہ معجزانہ تأثیر آج بھی ویسی ہے جیسی نزولِ قرآن کے وقت تھی۔ اس میں مرورِ ایام سے کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت' اس کی ادبیت' عذوبت اور اس کے صوتی آہنگ کی معجزانہ تأثیر پر مستزاد عہدِ حاضر میں قرآن کے اعجاز کے ضمن میں جو چیزیں بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں اُن میں سے ایک چیز تو وہ ہے جس کا قرآن مجید نے بڑے صریح الفاظ میں ذکر کیا ہے:

﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ؕ﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۵۳)

''ہم عنقریب انہیں اپنی آیات دکھائیں گے آفاق میں بھی اور اُن کی اپنی جانوں میں بھی یہاں تک کہ یہ بات اُن پر واضح ہو جائے گی کہ یہ قرآن حق ہے۔''

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی جو اب وفات پا چکے ہیں' یَغْفِرُ اللّٰہُ لَہٗ وَیَرْفَعُ دَرَجَاتِہٖ فِی الْجَنَّۃِ۔ آمین!

اِس آیت مبارکہ میں علمِ انسانی کے دائرہ میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور جدید اکتشافات وانکشافات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ آیاتِ آفاقی ہیں۔ فرانسیسی سرجن ڈاکٹر مورس بکائی کا پہلے بھی حوالہ دیا جا چکا ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس نے کہا کہ میرا دل اس پر مطمئن ہو گیا ہے کہ اس قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جسے سائنس نے غلط ثابت کیا ہو۔ البتہ اُس دَور میں جبکہ انسان کا اپنا ذہنی ظرف وسیع نہیں ہوا تھا' علومِ انسانی اور معلوماتِ انسانی کا دائرہ محدود تھا' اُس وقت سائنسی اشارات کی حامل آیاتِ قرآنیہ کا کیا مفہوم سمجھا گیا' وہ بات اور ہے۔ کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے اصل اہمیت تو قرآن کے الفاظ کو حاصل ہے۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے قرآن کا تورات کے ساتھ تقابل کیا ہے! تورات سے مراد Old Testament ہے۔ اناجیلِ اربعہ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں' اُن میں تو کئی چیزیں ایسی ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اناجیل میں زیادہ تر اخلاقی مواعظ ہیں یا پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سوانح حیات ہیں۔ تورات میں یہ مباحث موجود ہیں کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی' اللہ نے کیسے اسے بنایا۔ مختلف سائنسی phenomena اس میں موجود ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ فزکس میں آج سب سے زیادہ اہم موضوع جس پر تحقیق ہو رہی ہے' یہی ہے کہ کائنات کیسے وجود میں آئی' ابتدائی حالات کیا تھے اور بعد ازاں ان میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔ ڈاکٹر مورس بکائی نے اس اعتبار سے محسوس کیا کہ تورات میں تو ایسی چیزیں ہیں جو غلط ثابت ہو چکی ہیں۔ اس لیے کہ اصل تورات تو چھٹی صدی قبل مسیح ہی میں گم ہو گئی تھی۔ بخت نصر کے حملے میں یروشلم کو تہس نہس کر دیا گیا اور ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی' اس کی بنیادیں تک کھود ڈالی گئیں اور یروشلم کے بسنے والے چھ لاکھ کی تعداد میں قتل کر دیے گئے' جبکہ بخت نصر چھ لاکھ کو قیدی بنا کر بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے ہوئے اپنے ہمراہ بابل لے گیا۔ چنانچہ یروشلم میں ایک متنفس بھی باقی نہیں رہا۔ آپ اندازہ کریں' اگر یہ اعداد و شمار صحیح ہیں تو حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی چھ سو سال قبل یعنی آج سے ۲۶۰۰ برس قبل یروشلم بارہ لاکھ کی آبادی کا شہر تھا اور اس شہر پر کیا قیامت گزری ہو گی! اس کے بعد سے وہ اصل تورات دنیا میں نہیں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو جو احکامِ عشرہ (Ten Commandments) دیے گئے تھے وہ پتھر کی تختیوں پر لکھے ہوئے تھے۔ یہ تختیاں بھی لاپتہ ہو گئیں اور باقی تورات کا وجود بھی باقی نہ رہا۔ قرآن حکیم میں ''صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى'' کا ذکر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے پانچ ہیں جو عہد نامۂ قدیم (Old Testament) کی پہلی پانچ کتابیں ہیں۔ سانحہ یروشلم کے قریباً ڈیڑھ سو برس بعد لوگوں نے تورات کو اپنی یادداشتوں سے مرتب کیا۔ چنانچہ اُس وقت کی نوعِ انسانی کی ذہنی اور علمی سطح جو تھی وہ اس پر لازمی طور پر اثر انداز ہوئی۔

ڈاکٹر مورس بکائی کے علاوہ میں ڈاکٹر کیتھ ایل مور کا حوالہ بھی دے چکا ہوں کہ وہ قرآن حکیم میں علمِ جنین سے متعلق اشارات پا کر کس قدر حیران ہوا کہ یہ معلومات چودہ سو برس پہلے کہاں سے آ گئیں! فزیکل سائنسز کے مختلف فیلڈ ہیں' ان میں جیسے جیسے علمِ انسانی ترقی کرتا جائے گا یہ بات مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی کہ یہ کلامِ حق ہے اور یہ کلام مظاہرِ طبیعی کے اعتبار سے بھی حق ثابت ہو رہا ہے۔ یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ یہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

عہدِ حاضر کے اعتبار سے قرآن حکیم کے اعجاز کا دوسرا اہم تر پہلو اِس کی ہدایتِ عملی ہے۔ اس میں انفرادی زندگی سے متعلق بھی مکمل ہدایات ہیں اور انسانی اخلاق و کردار اور انسان کے رویہ کے بارے میں بھی پوری تفصیلات موجود ہیں۔ انفرادی زندگی سے متعلق یہ تمام چیزیں سابقہ انبیاء کی تعلیمات میں بھی موجود ہیں۔ یہ اخلاقی اقدار و رویے بھی فطرتِ انسانی کے اندر موجود ہیں۔ قرآن

کا اپنا کہنا ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸﴾ (الشمس) یعنی نفسِ انسانی کو الہامی طور پر یہ معلوم ہے کہ فجور کیا ہیں اور تقویٰ کیا ہے۔ پرہیزگاری کسے کہتے ہیں اور بدکاری کسے کہتے ہیں۔ البتہ قرآن حکیم کا اعجاز یہ ہے کہ اس میں عدل وقسط پر مبنی اجتماعی نظام دیا گیا ہے جس میں انتہائی توازن رکھا گیا ہے۔

انسان غور کرے تو معلوم ہوگا کہ نوعِ انسانی کو تین بڑے بڑے عقدہ ہائے لاینحل (dilemmas) درپیش ہیں جو توازن کے متقاضی ہیں اور ان میں عدم توازن سے انسانی تمدن فساد اور بگاڑ کا شکار ہے۔ ان میں پہلا عقدۂ لاینحل یہ ہے کہ مرد اور عورت کے حقوق وفرائض میں کیا توازن ہے؟ دوسرا یہ کہ سرمایہ اور محنت کے مابین کیا توازن ہے؟ پھر تیسرا یہ کہ فرد اور ریاست یا فرد اور اجتماعیت کے مابین حقوق وفرائض کے اعتبار سے کیا توازن ہے؟ اِن تینوں معاملات میں توازن قائم کرنا انتہائی مشکل ہے۔ اگر فرد کو ذرا زیادہ آزادی دے دی جاتی ہے تو انارکی (chaos) پھیلتی ہے۔ آزادی کے نام پر دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے! دوسری طرف اگر فرد کی آزادی پر قدغنیں اور بندشیں لگا دی جائیں تو وہ ردِّعمل ہوتا ہے جو کمیونزم کے خلاف ہوا۔ فطرتِ انسانی اور طبیعتِ انسانی نے یہ قدغنیں قبول نہیں کیں اور ان کے خلاف بغاوت کی۔

عورت اور مرد کے حقوق کے مابین توازن کا معاملہ بھی انتہائی حساس ہے۔ اس میزان کا پلڑا اگر ذرا سا مرد کی جانب جھکا دیا جائے تو عورت کی کوئی حیثیت نہیں رہتی' وہ بالکل بھیڑ بکری کی طرح مرد کی ملکیت بن کر رہ جاتی ہے' اس کا کوئی تشخص نہیں رہتا اور وہ مرد کی جوتی کی نوک قرار پاتی ہے۔ لیکن اگر دوسرا پلڑا ذرا جھکا دیا جائے تو عورت کو جو حیثیت مل جاتی ہے وہ قوموں کی قسمتوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوتی ہے۔ اس سے خاندانی ادارہ ختم ہو جاتا ہے اور گھر کے اندر کا چین اور سکون برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال سکینڈے نیوین ممالک ہیں۔ معاشی اور اقتصادی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روئے ارضی پر اگر جنت دیکھنی ہو تو ان ممالک کو دیکھ لیا جائے۔ وہاں کے شہریوں کی بنیادی ضروریات کس عمدگی کے ساتھ پوری ہو رہی ہیں! وہاں علاج اور تعلیم کی سہولیات سب کے لیے یکساں ہیں اور اس ضمن میں خیرات (charity) پر پلنے والوں اور ٹیکس ادا کرنے والوں کے مابین کوئی فرق وتفاوت نہیں ہے۔ لیکن ان ممالک میں مرد اور عورت کے حقوق کے مابین توازن برقرار نہیں رکھا گیا جس کے نتیجے میں خاندان کا ادارہ مضمحل ہوا' بلکہ ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گیا اور گھر کا سکون ناپید ہو گیا۔ چنانچہ آج خودکشی کی سب سے زیادہ شرح سویڈن میں ہے۔ اس لیے کہ گھر کا سکون ختم ہو جانے کے باعث اعصاب پر شدید تناؤ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ برقرار ہے۔ اگرچہ یہاں بھی نام نہاد طور پر بہت اونچی سطح کے لوگوں کے ہاں تو وہ صورتیں پیدا ہو گئی ہیں' تاہم مجموعی طور پر ہمارے ہاں خاندان کا ادارہ ابھی کافی حد تک محفوظ ہے۔ اس ضمن میں قرآن مجید میں لفظ ''سکون'' استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الروم کی آیت ۲۱ ملاحظہ ہو:

﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ﴾

''اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی نوع سے جوڑے بنائے' تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔''

اگر انسان کو یہ سکون نہیں ملتا تو اگرچہ اس کی کھانے پینے کی ضروریات' جنسی تسکین اور دوسری ضروریاتِ زندگی خوب پوری ہو رہی ہوں لیکن زندگی انسان کے لیے جہنم بن جائے گی۔

مذکورہ بالا تین عقدہ ہائے لاینحل میں سے معاشیات کا مسئلہ سب سے مشکل ہے۔ سرمائے کو زیادہ کھل کھیلنے کا موقع دیں گے تو صورت حال ایک انتہا کو پہنچ جائے گی اور مزدور کا بدترین استحصال ہوگا' جبکہ مزدور کو زیادہ حقوق دے دیں گے تو سرمائے کو کوئی تحفظ حاصل نہیں رہے گا۔ اگر نیشنلائزیشن ہو جائے تو لوگوں میں کام کرنے کا جذبہ ہی نہیں رہتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں نیشنلائزیشن کے بعد کیا ہوا! روس کی اقتصادی موت کی اہم وجہ یہی نیشنلائزیشن تھی۔ تو اب سرمائے اور محنت میں توازن کے لیے کیا شکل اختیار کی جائے؟ یہ ہے درحقیقت عہدِ حاضر میں قرآن کی ہدایت کا اہم ترین حصہ! آج اس پر بھرپور توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے۔ فزیکل سائنسز سے قرآن کی حقانیت کے ثبوت خود بخود ملتے چلے جائیں گے۔ جیسے جیسے سائنس ترقی کر رہی ہے نئے نئے گوشے سامنے آ رہے ہیں اور ان سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ قرآن حق ہے۔ لیکن آج ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن حکیم نے عمرانیاتِ انسانیہ اور اجتماعیات مثلاً اقتصادیات' سیاسیات اور سماجیات کے ضمن میں جو عدلِ اجتماعی دیا ہے اس کو مبرہن کیا جائے۔ علامہ اقبال کے یہ دو شعر اسی حقیقت کی نشاندہی کر رہے ہیں:

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفیٰؐ اُو را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰؐ ست!

یعنی دنیا میں جو سوشل انقلاب آیا ہے اس کی ساری چمک دمک اور روشنی یا تو نورِ مصطفیٰ ﷺ ہی سے مستعار اور ماخوذ ہے یا پھر انسان چار و ناچار حضور ﷺ کے لائے ہوئے نظام ہی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ دائیں بائیں کی ٹھوکریں اور افراط و تفریط کے دھکے کھا کر لڑکھڑاتا ہوا چار و ناچار اسی منزل کی طرف جا رہا ہے جہاں محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن حکیم نے اسے پہنچایا تھا۔

عہدِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا مظہر: علامہ اقبال

وجوہِ اعجازِ قرآن کے ضمن میں ایک اہم بات عرض کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک عہدِ حاضر میں قرآن کے اعجاز کا سب سے بڑا مظہر علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن حکیم زمان و مکان کے ایک خاص تناظر میں آج سے چودہ سو برس قبل نازل ہوا تھا۔ اس کے اوّلین مخاطب عرب کے اجڈ' دیہاتی' بدو اور ناخواندہ لوگ تھے جنہیں قرآن نے ''اُمِّیّٖنَ'' اور ''قَوْمًا لُّدًّا'' قرار دیا ہے۔ لیکن اس قرآن نے ان کے اندر بجلی دوڑا دی۔ اُن کے ذہن' قلب اور روح کو متأثر کیا' پھر اُن میں ولولہ پیدا کیا' ان کے باطن کو منور کیا۔ ان کی شخصیتوں میں انقلاب آیا اور افراد بدل گئے۔ پھر انہوں نے ایسی قوت کی حیثیت اختیار کی کہ جس نے دنیا کو ایک نیا تمدن' نئی تہذیب اور نئے قوانین دے کر ایک نئے دَور کا آغاز کیا — لیکن بیسویں صدی میں علامہ اقبال جیسا ایک شخص جس نے وقت کی اعلیٰ ترین سطح پر علم حاصل کیا' جس نے مشرق و مغرب کے فلسفے پڑھ لیے' جو قدیم اور جدید دونوں کا جامع تھا' جو جرمنی اور انگلستان میں جا کر فلسفہ پڑھتا رہا' اُس کو اِس قرآن نے اس طرح possess کیا اور اس پر اس طرح اپنی چھاپ قائم کی کہ اس کے ذہن کو سکون ملا تو صرف قرآن حکیم سے اور اس کی تشنگیٔ علم کو آسودگی حاصل ہو سکی تو صرف کتاب اللہ سے۔ گویا بقول خود اُن کے ؎

نہ کہیں جہاں میں اَماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو تیرے عفوِ بندہ نواز میں!

میرا ایک کتابچہ ''علامہ اقبال اور ہم'' ایک عرصے سے شائع ہوتا ہے۔ یہ میری ایک تقریر ہے جو میں نے ایچی سن کالج میں ۱۹۷۳ء میں کی تھی۔ اس میں مَیں نے علامہ اقبال کے لیے چند اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ ''اقبال اور قرآن'' کے عنوان سے میں نے علامہ اقبال کو (۱) عظمتِ قرآن کا نشان' (۲) واقفِ مرتبہ ومقامِ قرآن' اور (۳) داعی الی القرآن کے خطابات دیے ہیں۔ میں علامہ اقبال کو اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن سمجھتا ہوں۔ قرآن مجید کے علوم ومعارف کی جو تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے اس دَور میں کوئی دوسری شخصیت اس کے آس پاس بھی نہیں پہنچی۔ ان سے لوگوں نے چیزیں مستعار لی ہیں اور پھر اُن کو بڑے پیمانے پر پھیلایا ہے۔ ان حضرات کی یہ خدمت اپنی جگہ قابلِ قدر ہے' لیکن فکری اعتبار سے وہ تمام چیزیں علامہ اقبال کے ذہن کی پیداوار ہیں۔

مذکورہ بالا کتابچے میں مَیں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی گواہی بھی شائع کی ہے۔ کئی سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مولانا آنکھوں کے آپریشن کے لیے خانقاہ ڈوگراں سے لاہور آئے ہوئے تھے اور آپریشن میں کسی وجہ سے تاخیر ہو رہی تھی۔ گھر سے باہر ہونے کی وجہ سے اُن کا لکھنے پڑھنے کا سلسلہ معطّل ہو گیا۔ تاہم فرصت کے اُن ایام میں مولانا نے علامہ اقبال کا پورا اردو اور فارسی کلام دوبارہ پڑھ لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس کے بارے میں مجھ سے دو تأثر بیان کیے۔ مولانا کا پہلا تأثر تو یہ تھا کہ ''قرآن حکیم کے بعض مقامات کے بارے میں مجھے کچھ مان سا تھا کہ میں نے ان کی تعبیر جس اسلوب سے کی ہے شاید کوئی اور نہ کر سکے۔ لیکن علامہ اقبال کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ وہ ان کی تعبیر مجھ سے بہت پہلے اور مجھ سے بہت بہتر کر چکے ہیں!'' مولانا اصلاحی صاحب کا دوسرا تأثر یہ تھا کہ ''اقبال کا کلام پڑھنے کے بعد میرا دل بیٹھ سا گیا ہے کہ اگر ایسا مُحدی خواں اِس اُمت میں پیدا ہوا' لیکن یہ اُمت ٹس سے مَس نہ ہوئی تو ہماشما کے کرنے سے کیا ہوگا!'' جو قوم علامہ اقبال کے کلام سے حرکت میں نہیں آئی اسے کون حرکت میں لا سکے گا؟

واقعہ یہ ہے کہ میرے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور سب سے بڑا داعی الی القرآن علّامہ اقبال ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی عظمت کا جس گیرائی اور گہرائی کے ساتھ احساس علامہ اقبال کو ہوا ہے میری معلومات کی حد تک (اگرچہ میری معلومات محدود ہیں) اس درجے قرآن کی عظمت کا انکشاف کسی اور انسان پر نہیں ہوا۔ جب وہ قرآن مجید کی عظمت بیان کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ اُن کی دید اور اُن کا تجربہ ہے' کیونکہ جس انداز سے وہ بات بیان کرتے ہیں وہ تکلّف اور آورد سے ماورا انداز ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے کہ علامہ اقبال قرآن مجید کے بارے میں کیا کہتے ہیں:۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمت اُو لا یزال است و قدیم
نسخۂ اَسرارِ تکوینِ حیات
بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرفِ اُو را ریب نے' تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا است ایں
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

''وہ زندہ کتاب' قرآن حکیم' جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی!
زندگی کے وجود میں آنے کا خزینہ' جس کی حیات افروز اور قوت بخش تاثیر سے بے ثبات بھی ثبات و دوام حاصل کر سکتے ہیں۔
اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردّ و بدل کی گنجائش۔ اور اس کی آیات کسی تاویل کی محتاج نہیں۔
(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے!
یہ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ (کا کلام ہے لہٰذا اسی) کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی' اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!
(یہ کتابِ حکیم) جب کسی کے باطن میں سرایت کر جاتی ہے تو اُس کے اندر ایک انقلاب برپا ہو جاتا ہے' اور جب کسی کے اندر کی دنیا بدل جاتی ہے تو اس کے لیے پوری دنیا ہی انقلاب کی زد میں آ جاتی ہے۔''

قرآن حکیم کے بارے میں مزید لکھتے ہیں: ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست!

''اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں''۔ (گویا ہر زمانے میں یہ قرآن ایک نئی شان اور نئی آن بان کے ساتھ دنیا میں آیا ہے اور آتا رہے گا۔)

اب آپ علامہ اقبال کے تین اشعار ملاحظہ کیجیے جو انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے مناجات کرتے ہوئے کہے۔ اِن سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ انہیں کتنا یقین تھا کہ میرے فکر کا منبع قرآن حکیم ہے۔ چنانچہ ''مثنوی اَسرار و رموز'' کے آخر میں ''عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمۃ للعالمین ﷺ'' کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا کہ: ؎

گر دِلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است
پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را زخارم پاک کن!
روزِ محشر خوار و رسوا کُن مرا!
بے نصیب از بوسۂ پا کُن مرا!

''اگر میرے دل کی مثال اس آئینے کی سی ہے جس میں کوئی جوہر ہی نہ ہو' اور اگر میرے کلام میں قرآن کے سوا کسی اور شے کی ترجمانی ہے' تو (اے نبی ﷺ!) آپ میرے ناموسِ فکر کا پردہ خود چاک فرما دیں اور اس چمن کو مجھ ایسے خار سے پاک

کر دیں۔ (مزید برآں) حشر کے دن مجھے خوار و رسوا کر دیں اور (سب سے بڑھ کر یہ کہ) مجھے اپنی قدم بوسی کی سعادت سے محروم فرما دیں!''

میں نے اپنی امکانی حد تک قرآن حکیم کا پوری باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے اور اس پر غور و فکر اور سوچ بچار کیا ہے۔ میں نے علامہ اقبال کا اردو اور فارسی کلام بھی پڑھا ہے۔ اس کے بعد میں نے یہ بات ریکارڈ کرانی ضروری سمجھی ہے کہ علامہ اقبال کے بارے میں مَیں نے جو بات ۱۹۷۳ء میں کہی تھی آج بھی میں اسی بات پر قائم ہوں کہ ''اس دَور میں عظمتِ قرآن اور مرتبہ و مقامِ قرآن کا انکشاف جس شدت کے ساتھ اور جس درجہ میں علامہ اقبال پر ہوا شاید ہی کسی اور پر ہوا ہو''۔ اور یہ کہ میرے نزدیک اس دَور کا سب سے بڑا ترجمان القرآن اور داعی الی القرآن اقبال ہے۔ علامہ اقبال مسلمانوں کی قرآن سے دُوری پر مرثیہ کہتے ہیں: ؎

جانتا ہوں مَیں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مؤمن کا دیں!

مسلمانوں کو قرآن کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ؎

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسینِ او آساں بمیری!

''اس قرآن کے ساتھ تمہارا اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں رہا کہ تم کسی شخص کو عالمِ نزع میں اِس کی سورۂ یٰسٓ سنا دو تاکہ اس کی جان آسانی سے نکل جائے۔''

ہمارے ہاں صوفی اور واعظ حضرات نے قرآن کو چھوڑ کر اپنی مجالس اور اپنے وعظ کے لیے کچھ اور چیزوں کو منتخب کر لیا ہے' تو اس پر اقبال نے کس قدر دردناک مرثیے کہے ہیں اور کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے: ؎

صوفیٔ پشمینہ پوشِ حال مست
از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش
در نمی سازد بقرآں محفلش

اور ؎

واعظِ دستاں زن و افسانہ بند
معنیٔ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ او
با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو!

''ادنیٰ لباس میں ملبوس اور اپنے حال میں مست صوفی قوال کے نغمے کی شراب ہی سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقیؔ کے کسی شعر سے تو آگ سی لگ جاتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں! (دوسری طرف) واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ بھی خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھ دیتا ہے اور اس کے الفاظ بھی پُرشکوہ اور بلند و بالا ہیں' لیکن معنی کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے! اس کی ساری گفتگو (بجائے قرآن کے) یا تو خطیب بغدادی سے ماخوذ ہوتی ہے یا امام دیلمی سے' اور

اس کا سارا سرو کار بس ضعیف' شاذ اور مرسل حدیثوں سے رہ گیا ہے!''

علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے زوال و اضمحلال کا اور اُمتِ مُسلمہ کے نکبت و افلاس اور ذلّت و خواری کا اصل سبب قرآن سے دُوری اور کتابِ الٰہی سے بُعد ہی ہے۔ چنانچہ ''جوابِ شکوہ'' کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے: ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

بعد میں اسی مضمون کا اعادہ علامہ مرحوم نے فارسی میں نہایت پُرشکوہ الفاظ اور حد درجہ دردانگیز اور حسرت آمیز پیرائے میں یوں کیا: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ!

''(اے مسلمان!) تیری ذلّت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تُو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تُو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے)! اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے (جس کے ذریعے تُو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے)۔''

میں اپنا یہ تأثر ایک بار پھر دہرا رہا ہوں کہ عصرِ حاضر میں قرآن کی عظمت جس درجہ اُن پر منکشف ہوئی تھی' مَیں اپنی محدود معلومات کی حد تک کہنے کو تیار ہوں کہ وہ مجھے کہیں اور نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک علامہ اقبال دورِ حاضر میں اعجازِ قرآن کا ایک عظیم مظہر ہیں۔

❁❁❁

باب ہشتم

قرآن مجید سے ہمارا تعلق

قرآن ''حبل اللہ'' ہے!

جب ہم کہتے ہیں کہ قرآن ''حبلُ اللہ'' ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ ''حَبْل'' کے ایک معنی رسّی کے ہیں اور یہی اصل معنی ہیں۔ سورۃ اللّہب میں یہ لفظ آیا ہے: ﴿حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝۵﴾ یعنی مونج کی بٹی ہوئی رسّی۔ امام راغبؒ نے اس کی تعبیر کی ہے: ''استعیر للوصل ولکل ما یتوسل بہ الی شیء'' یعنی کسی شے سے جڑنے کے لیے اور جس شے سے جڑا جائے اس کے لیے استعارۃً یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عہد' قول وقرار اور میثاق دو فریقوں کو باہم جوڑ دیتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ عہد کے معنی میں بھی آتا ہے' اور قرآن حکیم میں یہ ایسے عہد کے لیے آیا ہے جس سے کسی کو امن مل رہا ہو' حفاظت اور امان حاصل ہو رہی ہو۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۱۲) میں یہود کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ؕ﴾

''یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلّت کی مار ہی پڑی' سوائے اس کے کہ کہیں اللہ کے ذمّہ یا انسانوں کے ذمّہ میں پناہ مل گئی۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں' ان پر محتاجی اور کم ہمتی مسلّط کر دی گئی ہے۔''

گویا خود اپنے بل پر' اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر' خود مختاری کی اساس پر اُن کے لیے عزّت کا معاملہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ یہ قرآن مجید کی پیشین گوئی ہے اور موجودہ ریاست اسرائیل اس کا واضح ثبوت ہے۔ امریکہ اگر ایک دن کے لیے بھی اپنی حفاظت ہٹا لے تو اسرائیل کا وجود باقی نہیں رہے گا۔

قرآن مجید میں اہلِ ایمان سے فرمایا گیا ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑ لو سب مل کر''۔ البتہ ''حبلُ اللہ'' کیا ہے؟ قرآن میں اس کی صراحت نہیں ہے۔ اور قرآن مجید میں جو بات پوری طرح واضح نہ ہو' مجمل ہو' اس کی تشریح اور تبیین رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل:۴۴) ''اور ہم نے (اے نبی ﷺ!) آپ کی طرف 'الذکر' نازل کیا' تاکہ جو چیز اُن کے لیے اتاری گئی ہے آپ اسے اُن پر واضح کریں''۔ چنانچہ احادیث نبویؐ میں یہ صراحت موجود ہے کہ ''حبل اللہ'' قرآن مجید ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلَا وَاِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ ، اَحَدُھُمَا کِتَابُ اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ ھُوَ حَبْلُ اللّٰہِ...))

''آگاہ رہو! میں تمہارے مابین دو خزانے چھوڑے جا رہا ہوں' اُن میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے' وہی حبلُ اللہ ہے.....''

قرآن حکیم کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے' جس میں الفاظ آئے ہیں: ((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔ یہ روایت سنن ترمذی اور سنن دارمی میں موجود ہے۔ مزید برآں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت رزین میں آئی ہے اس میں بھی یہی الفاظ ہیں: ((هُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ)) ''یہ (قرآن) ہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے''۔ سنن دارمی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ حَبْلُ اللّٰهِ وَالنُّوْرُ الْمُبِيْنُ)) ''یقیناً یہ قرآن حبل اللہ اور نورِ مبین ہے۔''

قرآن کو ''رسّی'' کس اعتبار سے کہا گیا ہے' اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو بندہ اس رسّی کے ذریعے اللہ سے جڑتا ہے۔ یہ رسی ہمیں اللہ سے جوڑنے والی ہے۔ ''تعلق مع اللہ'' اور ''تقرب الی اللہ'' دونوں تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔ تعلق کے معنی ہیں لٹک جانا۔ ''علق'' لٹکی ہوئی شے کو کہتے ہیں۔ ''تعلق مع اللہ'' کا مفہوم ہوگا اللہ سے لٹک جانا' یعنی اللہ سے چمٹ جانا' اللہ کے ساتھ جڑ جانا۔ اسی طرح ''تقرب الی اللہ'' کا مطلب ہے اللہ سے قریب سے قریب تر ہونے کی کوشش کرنا۔ سلوک اور طریقت کا مقصد یہی ہے۔ تعلق مع اللہ میں اضافے اور تقرب الی اللہ کا مؤثر ترین اور سہل ترین ذریعہ قرآن حکیم ہے۔

اس اعتبار سے دو حدیثیں ملاحظہ کیجیے۔ ایک کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلْقُرْآنُ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ)) ''یہ قرآن اللہ کی رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے''۔ یہی الفاظ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بھی روایت کیے گئے ہیں۔ یعنی اگر اللہ سے جڑنا ہے' اللہ سے تعلق قائم کرنا ہے تو اس قرآن کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو' اس سے تم اللہ سے جڑ جاؤ گے' اللہ کا قرب حاصل کر لو گے۔

دوسری معجم کبیر طبرانی کی بڑی پیاری روایت ہے۔ اس میں اِن الفاظ میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے برآمد ہوئے تو آپؐ نے مسجد کے گوشے میں دیکھا کہ کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم قرآن کا مذاکرہ کر رہے تھے' قرآن کو سمجھ اور سمجھا رہے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور بڑا پیارا سوال کیا: ((أَلَسْتُمْ تَشْهَدُوْنَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاَنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ؟)) ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا: ''بَلٰى يَارَسُوْلَ اللّٰهِ!'' یعنی ''کیوں نہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' ہم اس کے گواہ ہیں! اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((فَاسْتَبْشِرُوْا فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ طَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ وَطَرَفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ)) ''پس تم خوشیاں مناؤ' اس لیے کہ یہ قرآن وہ شے ہے جس کا ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے''۔ اِن احادیثِ مبارکہ سے ''حبلُ اللہ'' کا یہ تصور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی شے ہے۔

ابھی ہم نے جس حدیث کا مطالعہ کیا اس میں قرآن حکیم کے لیے ''جَاءَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ'' کے الفاظ آئے ہیں' کہ یہ قرآن اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ مستدرک حاکم اور مراسیل ابی داؤد میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل ہوئی ہے: ((اِنَّكُمْ لَا تَرْجِعُوْنَ اِلَى اللّٰهِ بِشَيْءٍ اَفْضَلَ مِمَّا خَرَجَ مِنْهُ يَعْنِي الْقُرْآنَ)) یعنی تم لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود اُسی (اللہ تعالیٰ) سے نکلی ہے' یعنی قرآن مجید۔ درحقیقت قرآن چونکہ اللہ کا کلام ہے اور کلام متکلم کی صفت ہوتا ہے' تو اس سے بڑھ کر قریب ہونے کا کوئی اور ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ جب کوئی شخص قرآن پڑھتا ہے تو گویا وہ اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ تبع تابعین

کے دَور کی شخصیت ہیں۔ انہوں نے اپنا معمول بنالیا تھا کہ سال میں چھ مہینے سرحدوں پر جہاد میں شریک ہوتے۔ اُس دَور میں دارالاسلام کی سرحدیں بڑھ رہی تھیں اور اس کے لیے جہاد جاری تھا۔ جبکہ چھ مہینے آپؒ گھر پر گزارتے اور اِس عرصے میں لوگوں سے ملنے جلنے سے حتی الامکان گریز کرتے۔ صرف نماز باجماعت کے لیے مسجد میں آتے' باقی وقت گھر پر ہی رہتے۔ کسی نے کہا کہ عبداللہ! آپ تنہائی پسند ہو گئے ہیں' تنہائی سے آپ کی طبیعت اکتاتی نہیں؟ انہوں نے فرمایا: ''کیا تم اُس شخص کو تنہا سمجھتے ہو جو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہے؟'' لوگ حیران ہوئے کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ جب اس کی وضاحت طلب کی گئی تو فرمایا کہ دیکھو جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو قرآن پڑھتا ہوں یا حدیث پڑھتا ہوں۔ جب قرآن پڑھتا ہوں تو اللہ سے ہم کلام ہوتا ہوں اور جب حدیث پڑھتا ہوں تو رسول اللہ ﷺ کی صحبت سے فیض یاب ہوتا ہوں۔ تم مجھے تنہا نہ سمجھو ؎

دیوانۂ چمن کی سیریں نہیں ہیں تنہا
عالم ہے اِن گلوں میں' پھولوں میں بستیاں ہیں!

مسند احمد' ترمذی' ابوداؤد' نسائی' ابن ماجہ اور صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث نبویؐ منقول ہے:

((یُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ اقْرَأْ وَارْتَقِ وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا، فَإِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَأُهَا))

''(قیامت کے دن) صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور (جنت کے درجات پر) چڑھتا جا' اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتا تھا۔ پس تیرا مقام وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔''

لیکن واضح رہے کہ صاحبِ قرآن سے مراد صرف حافظِ قرآن یا ہمارے ہاں پائے جانے والے قاری نہیں ہیں' بلکہ وہ حافظ اور قاری مراد ہیں جو قرآن کے علم و حکمت سے بھی واقف ہیں' اس کو پڑھتے بھی ہیں اور اس پر عمل پیرا بھی ہیں۔ جنت میں اس قرآن کے ذریعے ان کے درجات میں ترقی ہوتی چلی جائے گی اور ان کا آخری مقام وہاں متعین ہوگا جہاں ان کا سرمایۂ قرآن ختم ہوگا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ تقرّب الی اللہ اور وصل الی اللہ کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن حکیم ہی ہے۔ میں نے اسی لیے امام راغبؒ کے الفاظ کا حوالہ دیا تھا کہ ''حبل'' کا لفظ وصل کے لیے استعارۃً استعمال ہوتا ہے اور یہ ہر اُس شے کے لیے استعمال ہوگا جس کے ذریعے کسی شے کے ساتھ جڑا جائے۔ اس معنی میں حبل اللہ قرآن مجید ہے۔

اگر پیراشوٹ کی مثال سامنے رکھیں تو جملہ ایمانیات اس قرآن کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جس طرح پیراشوٹ کی چھتری کی رسیاں نیچے آکر ایک جگہ جڑ جاتی ہیں۔ جب پیراشوٹ کھلتا ہے تو اس کی چھتری کس قدر وسیع ہوتی ہے' لیکن اس کی ساری رسیاں ایک جگہ آکر جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر ایمانیات کے جتنے بھی شعبے ہیں وہ سب کے سب قرآن کے ساتھ منسلک ہیں۔ چنانچہ قرآن پر یہ یقین مطلوب ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے' بلکہ اس کا منبع اور سرچشمہ وہی ہے جو میری روح کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ یہ کلام بھی ذاتِ باری تعالیٰ ہی سے صادر ہوا ہے اور میری روح بھی اللہ ہی کے امرِ کُن کا ظہور ہے۔ اس انداز سے قرآن پر یقین' اللہ تعالیٰ پر یقین اور قرآن لانے والے محمد رسول اللہ ﷺ پر یقین مطلوب ہے۔ (''حقیقتِ ایمان'' کے موضوع پر میری پانچ تقاریر میں یہ مضمون آچکا ہے۔)

ایک ایمان تو تقلیدی ہے' یعنی غیر شعوری ایمان' کہ ایک یقین کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے' چاہے وہ علیٰ وجہ البصیرت نہ ہو' اور وہ بھی بہت بڑی دولت ہے' لیکن اس سے کہیں زیادہ قیمتی ایمان وہ ہے جو علیٰ وجہ البصیرت ہو۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿قُلْ هٰذِهٖ

سَبِیۡلِیۡۤ اَدۡعُوۡۤا اِلَی اللّٰہِ عَلٰی بَصِیۡرَۃٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیۡ ﴾ (یوسف:۱۰۸) ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ یہ میرا راستہ ہے' میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر اور جو میرے ساتھ ہیں (وہ بھی)''۔ علیٰ وجہ البصیرت ایمان یعنی شعوری ایمان' اکتسابی ایمان اور حقیقی ایمان کا واحد منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ مولانا ظفر علی خان بہت ہی سادہ الفاظ میں ایک بہت بڑی حقیقت بیان کر گئے ہیں: ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

عاقل یعنی غور و فکر کرنے والے اور سوچ بچار کرنے والے کے لیے ایمان کا منبع و سرچشمہ صرف قرآنِ حکیم ہے۔

قرآن حکیم کے ''حبل اللہ'' ہونے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اہلِ ایمان کو جوڑنے والی رسّی' ان کو باہم ایک دوسرے سے باندھ دینے والی شے' ان کو بنیانِ مرصوص بنانے والی چیز یہ قرآن ہے۔ اس لیے کہ قرآن حکیم میں جہاں اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کا حکم آیا ہے وہاں اس کے ساتھ ہی باہم متفرق ہونے سے روکا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا﴾ ''اور مضبوطی سے تھام لو اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر اور تفرقہ مت ڈالو!'' اہلِ ایمان کو جوڑنے والی اور بنیانِ مرصوص بنانے والی رسّی یہی قرآن حکیم ہے۔ اس لیے کہ انسانی اتحاد وہی مستحکم اور پائیدار ہوگا جو فکر و نظر کی ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔ بہت سے اتحاد وقتی طور پر وجود میں آ جاتے ہیں۔ جیسے کچھ سیاسی مصلحتیں ہیں تو اتحاد قائم کر لیا' کوئی دنیاوی مفادات ہیں تو ان کی بنا پر اتحاد قائم کر لیا۔ یہ اتحاد حقیقی نہیں ہوتے اور نہ ہی پائیدار اور مستحکم ہوتے ہیں۔ انسان حیوانِ عاقل ہے۔ یہ سوچتا ہے' غور کرتا ہے' اس کے نظریات ہیں' اس کے کچھ اہداف و مقاصد ہیں' کوئی نصب العین ہے۔ نظریات' مقاصد اور نصب العین کا بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ تو جب تک ان میں ہم آہنگی نہ ہو کوئی اتحاد پائیدار اور مستحکم نہیں ہوگا۔ اس اعتبار سے اللہ کی اس رسّی کو مضبوطی سے تھاموگے تو گویا دور شتے قائم ہو گئے۔ ایک رشتہ اہلِ ایمان کا اللہ کے ساتھ اور ایک رشتہ اہلِ ایمان کا ایک دوسرے کے ساتھ۔ جیسے کُل شریعت کو تعبیر کیا جاتا ہے کہ شریعت نام ہے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا۔ اللہ کے ساتھ جوڑنے والی سب سے بڑی عبادت نماز ہے اور بندوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے والی شے زکوٰۃ ہے۔ اسی طرح حبل اللہ ایک طرف اہلِ ایمان کو اللہ سے جوڑ رہی ہے اور دوسری طرف اہلِ ایمان کو آپس میں جوڑ رہی ہے۔ یہ انہیں بنیانِ مرصوص اور ''کَجَسَدٍ وَّاحِدٍ'' بنا دینے والی شے ہے۔ یہی وہ بات ہے جسے علامہ اقبال نے انتہائی خوبصورتی سے کہا ہے: ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کُن کہ حبلُ اللہ اوست!

''وحدتِ آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملّتِ اسلامی کے جسدِ ظاہری میں روحِ باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتاپا خاک ہی خاک ہیں' ہمارا قلب زندہ اور ہماری روح تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔ لہٰذا اے مسلمان! تُو قرآن کو مضبوطی سے تھام لے کہ 'حبل اللہ' یہی ہے۔''

حبل اللہ کے بارے میں مفسرین کے ہاں بہت سے اقوال ملتے ہیں کہ حبل اللہ سے مراد قرآن ہے' کلمہ طیبہ ہے' اسلام ہے۔ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ پر درست ہیں' لیکن احادیثِ نبویؐ کی روشنی میں اس کا مصداقِ کامل قرآن ہی ہے۔ اور پھر اس کی جس قدر عمدہ تعبیر علامہ اقبال نے کی ہے' یہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی میرے نزدیک بہت عمدہ مقام ہے: ؎

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست
اعتصامش کُن کہ حبلُ اللہ اوست!

نوٹ کیجیے کہ قرآن مجید میں ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ کے الفاظ کے بعد فرمایا گیا ہے: ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو کہ جب تم باہم دشمن تھے' پھر اُس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا تو تم اُس کے فضل سے بھائی بھائی ہو گئے''۔ یہ قرآن مجید ہی ہے جو اہلِ ایمان کے دلوں کو جوڑتا اور ان کو باہم پیوست کرتا ہے' اور یہ دلی تعلق اور دلی ہم آہنگی ہی ہے جو مسلمانوں کو بنیانِ مرصوص بنانے والی شے ہے۔

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

تعارفِ قرآن کے ضمن میں جو کچھ میں نے عرض کیا ان سب باتوں کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیے وہ کیا ہے؟ یعنی قرآن حکیم کے بارے میں مجھ پر اور آپ پر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے؟ اس کے اعتبار سے میں خاص طور پر اپنی کتاب ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہماری تحریک رجوع الی القرآن کے لیے دو بنیادوں میں سے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری اس تحریک کا آغاز ۱۹۶۵ء سے ہوا تھا۔ ابتدائی چھ سات سال تو میں تنہا تھا۔ نہ کوئی انجمن تھی' نہ کوئی ادارہ' نہ جماعت۔ پھر انجمن خدام القرآن قائم ہوئی' پھر ۱۹۷۶ء میں قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ قرآن اکیڈمی کی تعمیرات مکمل ہونے کے بعد پھر اسی کے بطن سے قرآن کالج کی ولادت ہوئی' جس کے سر پر قرآن آڈیٹوریم کا تاج سجا ہوا ہے۔ اس پوری جدوجہد کی بنیاد اور اساس دو کتابچے ہیں: (۱) ''اسلام کی نشاۃِ ثانیہ۔ کرنے کا اصل کام''۔ یہ مضمون میں نے ۱۹۶۷ء میں میثاق کے اداریے کے طور پر لکھا تھا۔ (۲) ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق''۔ یہ کتابچہ میری دو تقریروں پر مشتمل ہے جو میں نے ۱۹۶۸ء میں کی تھیں۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ اُس زمانے میں جشنِ خیبر اور جشنِ مہران وغیرہ جیسے مختلف عنوانات سے جشن منائے جا رہے تھے' جن میں راگ رنگ کی محفلیں بھی ہوتی تھیں۔ صدر ایوب خان کا زمانہ تھا۔ اگرچہ شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہو رہے تھے' لیکن ''سب اچھا ہے'' کے اظہار کے لیے یہ شاندار تقریبات منعقد کی جا رہی تھیں۔ یہ گویا اُن کے دورِ حکومت کی آخری بھڑک تھی' جیسے بجھنے سے پہلے چراغ بھڑکتا ہے۔

علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' میں ابلیس کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے: ع ''مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے!'' لیکن اُن دنوں ذکر و فکر کی بجائے لوگوں کو راگ رنگ کی محفلوں میں مست رکھنے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں مذہبی لوگوں کو رشوت کے طور پر ''جشنِ نزولِ قرآن'' عطا کیا گیا کہ تم بھی جشن مناؤ اور اپنا ذوق و شوق پورا کر لو۔ چنانچہ چودہ سو سالہ ''جشنِ نزولِ قرآن'' کا انعقاد ہوا۔ اس کے ضمن میں قراءت کی بڑی بڑی محفلیں منعقد ہوئیں' جن میں پوری دنیا سے قرّاء حضرات شریک ہوئے۔ اسی سلسلے میں سونے کے تار سے قرآن لکھنے کا پروجیکٹ شروع ہوا۔

اُس وقت میرا ذہن منتقل ہوا کہ کیا قرآن حکیم کا ہم پر یہی حق ہے؟ کیا اپنے ان کاموں سے ہم قرآن مجید کا حق ادا کر رہے ہیں؟ چنانچہ میں نے مسجد خضراء سمن آباد میں اپنے دو خطاباتِ جمعہ میں مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق بیان کیے کہ ہر مسلمان پر حسبِ استعداد قرآن مجید کے پانچ حق عائد ہوتے ہیں:

۱) اسے مانے جیسا کہ ماننے کا حق ہے۔ (ایمان وتعظیم)

۲) اسے پڑھے جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے۔ (تلاوت وترتیل)

۳) اسے سمجھے جیسا کہ سمجھنے کا حق ہے۔ (تذکر وتدبر)

۴) اس پر عمل کرے جیسا کہ عمل کرنے کا حق ہے۔ (حکم واقامت)

انفرادی زندگی میں حکم بالقرآن یہ ہے کہ ہماری ہر رائے اور ہر فیصلہ قرآن پر مبنی ہو۔ اور اجتماعی زندگی میں قرآن پر عمل کی صورت اقامت ماانزل من اللہ یعنی قرآن کے عطا کردہ نظامِ عدلِ اجتماعی کو قائم کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾

(المائدۃ:۶۸)

''اے کتاب والو! تمہارا کوئی مقام نہیں جب تک کہ تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل کو اور جو کچھ تمہاری جانب نازل کیا گیا ہے تمہارے رب کی طرف سے۔''

۵) قرآن کو دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا اور عام کرنا۔ (تبلیغ وتبیین)

ان پانچ عنوانات کے تحت الحمدللہ ثم الحمدللہ یہ بہت جامع کتابچہ مرتب ہوا اور بلا مبالغہ یہ لاکھوں کی تعداد میں چھپا ہے۔ پھر انگریزی' عربی' فارسی' پشتو' تامل' ملیشیا کی زبان اور سندھی میں اس کے تراجم ہوئے۔ جو حضرات بھی ہماری اس تحریک رجوع الی القرآن سے کچھ دلچسپی رکھتے ہیں' میرے دروس میں شریک ہوتے ہیں یا ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہیں انہیں میرا ناصحانہ مشورہ ہے کہ اس کتابچے کا مطالعہ ضرور کریں۔ یہ درحقیقت ''تعارفِ قرآن'' پر میرے خطابات کا لازمی نتیجہ اور ان کا ضروری تکملہ ہے۔

یہ بھی جان لیجیے کہ اگر ہم یہ حقوق ادا نہیں کرتے تو ازروئے قرآن ہماری حیثیت کیا ہے۔ قرآن مجید کے حقوق کو ادا نہ کرنا قرآن کو ترک کر دینے کے مترادف ہے۔ سورۃ الفرقان میں محمد رسول اللہ ﷺ کی فریاد نقل ہوئی ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿۳۰﴾﴾

''اور پیغمبر کہے گا کہ اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اس آیت کے ذیل میں حاشیہ میں لکھا ہے:

''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے' تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا' اس میں تدبر نہ کرنا' اس پر عمل نہ کرنا' اس کی تلاوت نہ کرنا' اس کی تصحیحِ قراءت کی طرف توجہ نہ کرنا' اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا' یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں۔''

بحیثیت مسلمان ہم پر قرآن مجید کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں' اگر انہیں ہم ادا نہیں کر رہے تو حضور ﷺ کے اس قول اور فریاد کا اطلاق ہم پر بھی ہوگا۔ گویا حضور ﷺ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارے خلاف مدعی کی حیثیت سے کھڑے ہوں گے۔

علامہ اقبال اسی آیتِ قرآنی کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شُدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شُدی!

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تُو قرآن سے دُور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تُو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردشِ زمانہ کو دے رہا ہے!''

قرآن مجید میں دو مقامات پر قرآن کے حقوق ادا نہ کرنے کو قرآن کی تکذیب قرار دیا گیا ہے۔ آپ لاکھ سمجھیں کہ آپ قرآن مجید پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کی تصدیق کرتے ہیں' لیکن اگر آپ اس کے حقوق کی ادائیگی اپنی استعداد کے مطابق' اپنی امکانی حد تک نہیں کر رہے تو درحقیقت قرآن کو جھٹلا رہے ہیں۔ سابقہ اُمتِ مُسلمہ یعنی یہود کے بارے میں سورۃ الجمعہ میں یہ الفاظ آئے ہیں:

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝﴾

''مثال اُن لوگوں کی جو حاملِ تورات بنائے گئے' پھر انہوں نے اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا' اُس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ بُری مثال ہے اُس قوم کی جس نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا۔ اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

ہمیں کانپنا چاہیے' لرزنا چاہیے کہ کہیں ہمارا شمار بھی انہی لوگوں میں نہ ہو جائے۔

اس ضمن میں دوسرا مقام سورۃ الواقعہ کے تیسرے رکوع کی ابتدائی آیات ہیں:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ۝ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ۝ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ۝﴾

''پس نہیں' میں قسم کھاتا ہوں تاروں کے مواقع کی' اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے' کہ یہ ایک بلند پایہ قرآن ہے' ایک محفوظ کتاب میں ثبت' جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا۔ یہ ربّ العالمین کا نازل کردہ ہے۔ پھر کیا اس کلام کے ساتھ تم بے اعتنائی برتتے ہو' اور اس نعمت میں اپنا حصہ تم نے یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو؟''

اس قرآن' اس عظمت والی کتاب' جو کتابِ کریم ہے' کتابِ مکنون ہے' کے بارے میں تمہاری یہ سستی' تمہاری یہ کسل مندی' تمہاری یہ ناقدری اور تمہارا یہ عملی تعطل کہ تم اسے جھٹلا رہے ہو! تم نے اپنا حصہ اور نصیب یہ بنا لیا ہے کہ تم اس کی تکذیب کر رہے ہو؟ تکذیب اس معنی میں بھی کہ قرآن کا انکار کیا جائے' اسے اللہ کا کلام نہ مانا جائے — اور تکذیبِ عملی کے ضمن میں وہ چیز بھی اس کے تابع اور شامل ہو گی جو میں بیان کر چکا ہوں۔ یعنی حاملِ کتابِ الٰہی ہونے کے باوجود اس کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام سے محفوظ رکھے کہ ہم بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ ہم میں سے ہر شخص کو ان حقوق کے ادا کرنے کی اپنی امکانی حد تک بھرپور کوشش کرنی چاہیے۔

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات○○


بیانُ القُرآن

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ

نحمدہٗ ونصلّی علٰی رَسولہِ الکریم

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ | بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ | اٰیَاتُھَا: ۷ رُکُوْعُھَا: ۱

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ﴿۱﴾ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۙ﴿۲﴾ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ ؕ﴿۳﴾ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ؕ﴿۴﴾ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۙ﴿۵﴾ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ۙ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ ۧ﴿۶﴾ (آمین)

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ وَیَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ وَاحْلُلْ عُقْدَۃً مِّنْ لِّسَانِیْ یَفْقَھُوْا قَوْلِیْ

سورۃ الفاتحہ اگرچہ قرآن حکیم کی مختصر سورتوں میں سے ہے‘ اس کی کل سات آیات ہیں‘ لیکن یہ قرآن حکیم کی عظیم ترین سورت ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کو اُمّ القرآن بھی کہا گیا ہے اور اساس القرآن بھی۔ یعنی یہ پورے قرآن کے لیے جڑ‘ بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ الفاتحہ کس اعتبار سے ہے؟ فَتَحَ یَفْتَحُ کے معنی ہیں کھولنا۔ چونکہ قرآن حکیم شروع اس سورت سے ہوتا ہے‘ لہٰذا یہ ’’سورۃ الفاتحۃ‘‘ (The Opening Surah of the Qur'an) ہے۔ اس کا ایک نام ’’الکافیہ‘‘ یعنی کفایت کرنے والی ہے‘ جبکہ ایک نام ’’الشافیہ‘‘ یعنی شفا دینے والی ہے۔ دوسری بات یہ نوٹ کیجیے کہ یہ سورۂ مبارکہ پہلی مکمل سورت ہے جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی ہے۔ اس سے پہلے متفرق آیات نازل ہوئیں۔ سب سے پہلے سورۃ العلق کی پانچ آیتیں‘ پھر سورۂ ن یا سورۃ القلم کی سات آیتیں‘ پھر سورۃ المزمل کی نو آیتیں‘ پھر سورۃ المدثر کی سات آیتیں اور پھر سورۃ الفاتحہ کی سات آیتیں نازل ہوئیں۔ لیکن یہ پہلی مکمل سورت ہے جو نازل ہوئی ہے رسول اللہ ﷺ پر۔ سورۃ الحجر میں ایک آیت بایں الفاظ آئی ہے:

﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ﴿۸۷﴾﴾

’’ہم نے (اے نبی ﷺ!) آپ کو سات ایسی آیات عطا کی ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں اور عظمت والا قرآن۔‘‘

سورۃ الفاتحہ کی سات آیتیں دوہرا دوہرا کر پڑھی جاتی ہیں‘ نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہیں‘ اور یہ سورۂ مبارکہ خود اپنی جگہ پر ایک قرآنِ عظیم ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ھِیَ السَّبْعُ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْآنُ الْعَظِیْمُ الَّذِیْ اُوْتِیْتُہٗ))[1]

۱۔ صحیح البخاری‘ کتاب تفسیر القرآن‘ باب قولہ ﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ﴾

''سورۃ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہی ''سبع مثانی'' اور ''قرآن عظیم'' ہے جو مجھے عطا ہوئی ہے۔''

تعداد کے اعتبار سے اس کی سات آیات متفق علیہ ہیں' البتہ اہلِ علم میں ایک اختلاف ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک' جن میں امام شافعی رحمہ اللہ بھی شامل ہیں' آیت بسم اللہ بھی سورۃ الفاتحہ کا جزء ہے۔ ان کے نزدیک ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝﴾ سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت اور ﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۵ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝﴾ ساتویں آیت ہے۔ لیکن دوسری طرف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ آیت بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا جزء نہیں ہے' بلکہ آیت بسم اللہ قرآن مجید کی کسی بھی سورۃ کا جزء نہیں ہے' سوائے ایک مقام کے جہاں وہ متن میں آئی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو جو خط لکھا تھا اس کا تذکرہ سورۃ النمل میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَیْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۳۰﴾۔ سورتوں کے آغاز میں یہ علامت کے طور پر لکھی گئی ہے کہ یہاں سے نئی سورۃ شروع ہو رہی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت اور ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ۝﴾ پانچویں آیت ہے' جبکہ ﴿صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ۵﴾ چھٹی اور ﴿غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ ۝﴾ ساتویں آیت ہے۔ جن حضرات کے نزدیک آیت بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا جزء ہے وہ نماز میں جہری قراءت کرتے ہوئے ﴿بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝﴾ بھی بالجہر پڑھتے ہیں' اور جن حضرات کے نزدیک یہ سورۃ الفاتحہ کا جزء نہیں ہے وہ جہری قراءت کرتے ہوئے بھی بسم اللہ خاموشی سے پڑھتے ہیں اور ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝﴾ سے قراءت شروع کرتے ہیں۔

نماز کا جزوِ لازم

اس سورۂ مبارکہ کا اسلوب کیا ہے؟ یہ بہت اہم اور سمجھنے کی بات ہے۔ ویسے تو یہ کلام اللہ ہے' لیکن اس کا اسلوب دعائیہ ہے۔ یہ دُعا اللہ نے ہمیں تلقین فرمائی ہے کہ مجھ سے اس طرح مخاطب ہوا کرو' جب میرے حضور میں حاضر ہو تو یہ کہا کرو۔ واقعہ یہ ہے کہ اسی بنا پر قرآن مجید کی اس سورت کو نماز کا جزوِ لازم قرار دیا گیا ہے' بلکہ سورۃ الفاتحہ ہی کو حدیث میں ''الصلاۃ'' کہا گیا ہے' یعنی اصل نماز سورۃ الفاتحہ ہے۔ باقی اضافی چیزیں ہیں' تسبیحات ہیں' رکوع و سجود ہیں' قرآن مجید کا کچھ حصہ آپ اور بھی پڑھ لیتے ہیں۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((لَا صَلَاۃَ لِمَنْ لَّمْ یَقْرَأْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ))[۲] یعنی جو شخص (نماز میں) سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھتا اس کی کوئی نماز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی احادیث میں یہ مضمون آیا ہے۔

اس اعتبار سے بھی ہمارے ہاں ایک فقہی اختلاف موجود ہے۔ بعض حضرات نے اس حدیث کو اتنا اہم سمجھا ہے کہ آپ باجماعت نماز پڑھ رہے ہیں تب بھی ان کے نزدیک آپ امام کے ساتھ ساتھ ضرور سورۃ الفاتحہ پڑھیں گے۔ چنانچہ امام ہر آیت کے بعد وقفہ دے۔ امام جب کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ تو اس کے بعد مقتدی بھی کہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ خواہ اپنے دل میں کہے۔ پھر امام کہے: الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ تو مقتدی بھی دل میں کہہ لے: اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝۔ یہ موقف ہے امام شافعی رحمہ اللہ کا کہ نماز چاہے جہری ہو چاہے سرّی ہو' اگر آپ امام کے پیچھے پڑھ رہے ہیں تو امام اپنی سورۃ الفاتحہ پڑھے گا اور آپ اپنی

۲۔ صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم... الخ۔ وصحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ... الخ۔

پڑھیں گے اور لازماً پڑھیں گے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا موقف اس کے بالکل برعکس ہے کہ امام جب سورۃ الفاتحہ پڑھے گا تو ہم پیچھے بالکل نہیں پڑھیں گے' بلکہ امام کی قراءت ہی مقتدیوں کی قراءت ہے۔ ان کا استدلال آیت قرآنی ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾﴾ (الاعراف) اور حدیثِ نبویؐ ((مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ))[۳] سے ہے۔ نیز اُن کا کہنا ہے کہ نماز باجماعت میں امام کی حیثیت سب کے نمائندے کی ہوتی ہے۔ اگر کوئی وفد کہیں جاتا ہے اور اس وفد کا کوئی سربراہ ہوتا ہے تو وہاں جا کر گفتگو وفد کا سربراہ کرتا ہے' باقی سب لوگ خاموش رہتے ہیں۔

اب اس ضمن میں ایک انتہائی معاملہ تو وہ ہو گیا جو امام شافعیؒ کا موقف ہے کہ چاہے جہری نماز ہو چاہے سرّی ہو' اس میں امام کے پیچھے مقتدی بھی سورۃ الفاتحہ پڑھیں گے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ظہر اور عصر سرّی نمازیں ہیں' ان میں امام خاموشی سے قراءت کرتا ہے' بلند آواز سے نہیں پڑھتا' جبکہ فجر' مغرب اور عشاء جہری نمازیں ہیں' جن میں سورۃ الفاتحہ اور قرآن کا مزید کچھ حصہ پہلی دو رکعتوں میں آواز کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کا موقف ہے کہ نماز خواہ جہری ہو خواہ سرّی ہو' نماز باجماعت کی صورت میں مقتدی خاموش رہے گا اور سورۃ الفاتحہ نہیں پڑھے گا۔

ان کے علاوہ ایک درمیانی مسلک بھی ہے اور وہ امام مالکؒ اور امام ابن تیمیہؒ وغیرہما کا ہے۔ اس ضمن میں اُن کا موقف یہ ہے کہ جہری رکعت میں مقتدی سورۃ الفاتحہ مت پڑھے' بلکہ امام کی قراءت خاموشی سے سنے' از روئے نص قرآنی: ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾﴾ (الاعراف) ''اور جب قرآن پڑھا جائے تو تم پوری توجہ سے اسے سنا کرو اور خود خاموش رہا کرو' تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔'' اسی طرح حدیث نبویؐ ہے: ((اِذَا قَرَأَ [الْاِمَامُ] فَاَنْصِتُوْا))[۴] ''جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو''۔ چنانچہ جب امام بالجہر قراءت کر رہا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ تو آپ سنیے اور خود خاموش رہیے' لیکن جو سرّی نماز ہے اس میں امام اپنے طور پر سورۃ الفاتحہ پڑھے اور آپ اپنے طور پر خاموشی سے پڑھیں۔ یہ درمیانی موقف ہے' اور میں نے بہرحال اسی کو اختیار کیا ہوا ہے۔

فطرتِ سلیمہ کی پکار

سورۃ الفاتحہ کے ضمن میں' مَیں نے عرض کیا کہ یہ دُعا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں تلقین کی ہے' لیکن اس سے آگے بڑھ کر ذرا قرآن مجید کی حکمت اور فلسفہ پر اگر غور کریں گے تو اس سورت کی ایک اور شان سامنے آئے گی۔ بنیادی طور پر قرآن کا فلسفہ کیا ہے؟ انسان اس دنیا میں جب آتا ہے تو فطرت لے کر آتا ہے' جسے قرآن حکیم ''فِطْرَتَ اللّٰهِ'' قرار دیتا ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ﴾ (الروم : ۳۰) یہی حقیقت حدیثِ نبویؐ میں بایں الفاظ بیان کی گئی ہے: ((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا يُوْلَدُ

۳۔ سنن ابن ماجه' كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها' باب اذا قرأ الامام فانصتوا۔ یہ حدیث مسند احمد میں بھی معمولی لفظی اختلاف کے ساتھ موجود ہے۔

۴۔ صحیح مسلم' كتاب الصلاة' باب التشهد في الصلاة۔ وسنن ابن ماجه' كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها' باب اذا قرأ الامام فانصتوا۔

عَلَى الْفِطْرَةِ، فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ))(۵) ''(نسلِ انسانی کا) ہر پیدا ہونے والا بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے' لیکن یہ اس کے والدین ہیں جو اسے یہودی' نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں''۔ ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے فطرتِ اسلام لے کر آتا ہے۔ تو انسان کی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت اور اپنی محبت ودیعت کر دی ہے۔ اس لیے کہ جو روحِ انسانی ہے وہ کہاں سے آئی ہے؟ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ روح میرے ربّ کے امر میں سے ہے''۔ ہماری روح ربّ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے' لہٰذا اس کے اندر اللہ کی معرفت بھی ہے' اللہ کی محبت بھی ہے۔ تو جب تک ایک انسان کی فطرت میں کوئی کجی نہ آئے' وہ بے راہ روی (perversion) سے محفوظ رہے تو اسے ہم کہتے ہیں فطرتِ سلیمہ' یعنی سالم اور محفوظ فطرت۔ اس فطرت والا انسان جب بلوغ کو پہنچتا ہے اور اسے عقلِ سلیم بھی مل جاتی ہے' یعنی صحیح صحیح انداز میں غور کرنے کی صلاحیت مل جاتی ہے تو ان دونوں چیزوں کے امتزاج کے نتیجہ میں ایمانیات کے کچھ بنیادی حقائق انسان پر خود منکشف ہو جاتے ہیں' خواہ اسے کوئی وحی ملے یا نہ ملے۔ یہ ہے فطرت کا معاملہ اور یہ ہے قرآن کی حکمت اور فلسفہ کا اصول۔ اس کی ایک بڑی شاندار مثال قرآن مجید میں حضرت لقمان کی دی گئی ہے' جو نہ نبی تھے نہ کسی نبی کے پیروکار اور اُمتی تھے' لیکن انہیں اللہ نے حکمت عطا فرمائی تھی۔

''حکمت'' فطرتِ سلیمہ' قلبِ سلیم اور عقلِ سلیم کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے۔ اگر فطرت بھی محفوظ ہے' عقل بھی ٹیڑھ پر نہیں چل رہی' بلکہ صحیح اور سیدھے راستے پر چل رہی ہے تو ان دونوں کے امتزاج سے جو حکمت پیدا ہوتی ہے' انسان کو جو دانائی (wisdom) میسر آتی ہے اس کے نتیجہ میں وہ پہچان لیتا ہے کہ اس کائنات کا ایک پیدا کرنے والا ہے' یہ خود بخود نہیں بنی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اکیلا ہے' تنہا ہے' کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے (لَا مِثْلَ لَهٗ وَلَا مِثَالَ لَهٗ وَلَا مَثِيْلَ لَهٗ وَلَا كُفُوَ لَهٗ وَلَا ضِدَّ لَهٗ وَلَا نِدَّ لَهٗ)۔ کوئی اس کا مدِمقابل نہیں ہے اور اس میں تمام صفاتِ کمال بتمام وکمال موجود ہیں۔ وہ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہے' بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ہے' ہر جگہ موجود ہے' اور اس کی ذات میں کوئی نقص' کوئی عیب' کوئی کوتاہی' کوئی تقصیر' کوئی کمزوری' کوئی ضعف' کوئی احتیاج قطعاً نہیں ہے۔

یہ پانچ باتیں فطرتِ سلیمہ اور عقلِ سلیم کے نتیجہ میں انسان کے علم میں آتی ہیں' چاہے اُسے ابھی کسی وحی سے فیض حاصل نہ ہوا ہو۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ چین کا بڑا فلسفی اور حکیم کنفیوشس ان تمام باتوں کو ماننے والا تھا' حالانکہ وہ نبی تو نہیں تھا! مزید برآں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ انسانی زندگی صرف یہ دنیا کی زندگی نہیں ہے' اصل زندگی ایک اور ہے جو موت کے بعد شروع ہوگی اور اس میں انسان کو اس زندگی کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا' نیکیاں کمائی ہیں تو ان کی جزا ملے گی اور بدیاں کمائی ہیں تو ان کی سزا ملے گی۔ یہ وہ حقائق ہیں کہ جہاں تک انسان اپنی عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ کی رہنمائی سے پہنچ جاتا ہے۔ پھر اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک ہستی جو یکتا ہے' وہی پیدا کرنے والا ہے' پروردگار ہے' عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ہے' بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ہے' وہی رازق ہے' وہی خالق ہے' وہی مالک ہے' وہی مشکل کشا ہے' تو اب اُسی کی بندگی ہونی چاہیے' اُسی کا حکم ماننا چاہیے' اُسی سے محبت کرنی چاہیے' اُسی کو مطلوب بنانا چاہیے' اُسی کو مقصود بنانا چاہیے۔ یہ اس کا منطقی نتیجہ ہے اور یہاں تک انسان عقلِ سلیم اور فطرتِ سلیمہ کی رہنمائی سے پہنچ جاتا ہے۔

۵۔ صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب ما قیل فی اولاد المشرکین۔ وصحیح مسلم' کتاب القدر' باب معنی کل مولود یولد علی الفطرۃ۔

درخواستِ ہدایت

البتہ اب آگے مسئلہ آتا ہے کہ میں کیا کروں کیا نہ کروں؟ اس میں بھی جہاں تک انفرادی معاملات ہیں اُن کے ضمن میں ایک روشنی اللہ نے انسان کے باطن میں رکھی ہوئی ہے اس کے ضمیر کے اندر قلب اور روح کے اندر یہ روشنی موجود ہے کہ انسان نیکی اور بدی کو خوب جانتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ (الشمس) ''قسم ہے نفسِ انسانی کی اور جو اسے سنوارا (درست کیا اس کی نوک پلک سنواری) پھر اس میں نیکی اور بدی کا علم الہامی طور پر رکھ دیا''۔ ہر انسان جانتا ہے کہ جھوٹ بولنا بُرا ہے سچ بولنا اچھا ہے وعدہ پورا کرنا اچھا ہے وعدہ خلافی بُری بات ہے پڑوسی کو ستانا بہت بری بات ہے جبکہ پڑوسی کے ساتھ خوش خلقی کے ساتھ پیش آنا انسانیت کا تقاضا ہے۔ تو انفرادی سطح پر بھی انسان صحیح اور غلط حق اور باطل میں کچھ نہ کچھ فرق کر لیتا ہے۔ لیکن جب اجتماعی زندگی کا معاملہ آتا ہے تو اس کے لیے مجبوری ہے کہ وہ نہیں سمجھ سکتا کہ اعتدال کا راستہ کون سا ہے۔ عائلی زندگی میں عورت کا مقام کیا ہونا چاہیے عورت کے حقوق کیا ہونے چاہئیں۔ چنانچہ ایک انتہا تو یہ ہے کہ دنیا میں عورت کو مرد کی ملکیت بنا لیا گیا۔ جیسے بھیڑ بکری کسی کی ملکیت ہے ایسے ہی گویا بیوی بھی خاوند کی ملکیت ہے اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں اس کے کوئی حقوق ہی نہیں اس کا کوئی legal status ہی نہیں اس کے کوئی دستوری حقوق ہی نہیں۔ وہ نہ کسی شے کی مالک ہو سکتی ہے نہ کوئی کاروبار کر سکتی ہے۔ اور ایک انتہا یہ ہوتی ہے کہ کوئی قلوپطرہ ہے جو کسی قوم کی سربراہ بن کر بیٹھ جائے اور پھر اس کا بیڑا غرق کر دے جیسے مصر کا بیڑا قلوپطرہ نے غرق کیا۔ تو یہ دو متضاد انتہائیں ہیں۔

آج ہمیں مغرب میں نظر آ رہا ہے کہ مرد و زن بالکل شانہ بشانہ اور برابر ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ فیملی لائف ختم ہو کر رہ گئی۔ اب وہاں صرف one parent family ہے۔ بل کلنٹن نے سال نو پر اپنی قوم کو جو پیغام دیا تھا اس میں کہا تھا کہ عنقریب ہماری امریکی قوم کی عظیم اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہوگی۔ (اُس نے الفاظ استعمال کیے تھے: Born without any wedlock)۔ حلال زادہ اور حرام زادہ میں یہی تو فرق ہے کہ اگر ماں باپ کا نکاح ہوا ہے شادی ہوئی ہے تو ان کے ملاپ کے نتیجے میں پیدا ہونے والا بچہ ان کی حلال اور جائز اولاد ہے۔ لیکن اگر ایک مرد اور ایک عورت نے بغیر نکاح کے تعلق قائم کر لیا ہے تو اس طرح بغیر کسی Legal marriage کے بغیر کسی شادی کے بندھن کے جو اولاد ہوگی وہ حرامی ہے۔ بل کلنٹن کو معلوم تھا کہ ان کے یہاں اب جو بچے پیدا ہو رہے ہیں وہ اکثر و بیشتر بغیر کسی شادی کے بندھن کے پیدا ہو رہے ہیں لہٰذا اس نے کہا کہ عنقریب ہماری قوم کی اکثریت حرام زادوں پر مشتمل ہوگی۔ ایک قوم کی کج روی اور perversion کی انتہا یہ ہے کہ انہوں نے بنیادی فارموں میں سے باپ کا نام ہی نکال دیا ہے۔ اس لیے کہ بہت سے بچوں کو پتا ہی نہیں ہے کہ ہمارا باپ کون ہے وہ تو اپنی ماں سے واقف ہیں باپ کے بارے میں انہیں کچھ علم نہیں ہے۔

اسی طرح سرمایہ اور محنت کے درمیان حقوق و فرائض کا توازن کیا ہو یہاں بھی انسان بے بس ہے۔ سرمایہ دار کی اپنی مصلحتیں ہیں اور مزدور کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ سرمایہ دار کو اندازہ نہیں ہو سکتا کہ مزدور پر کیا بیت رہی ہے وہ کن مشقتوں میں ہے۔ بقول علامہ اقبال ؎

تُو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات!

لہٰذا سرمایہ کے کیا حقوق ہیں اور لیبر کے کیا حقوق ہیں ان میں توازن کیا ہو یہ کس طرح معین ہوگا؟

اسی طرح کا معاملہ فرد اور معاشرے کا ہے۔ ایک طرف انفرادی حقوق اور انفرادی آزادی ہے اور دوسری طرف معاشرہ' قوم اور ریاست (state) ہے۔ کس کے حقوق زیادہ ہوں گے؟ ایک فرد کہتا ہے میں آزاد ہوں' میں مادرزاد برہنہ ہو کر سڑک پر چلوں گا' تم کون ہو مجھے روکنے والے؟ آیا اسے روکا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اگر اسے روک دیا جائے تو اس کی آزادی پر قدغن ہو جائے گی۔ اگر اسے کہا جائے کہ تم اس طرح نہیں نکل سکتے تو آزادی تو نہیں رہی' اس کی مادر پدر آزادی تو ختم ہو جائے گی! لیکن ظاہر بات ہے کہ ایک ریاست اور معاشرہ کے کچھ اصول ہیں' اس کے کچھ اخلاقیات ہیں' کچھ قواعد و قوانین ہیں۔ وہ چاہتی ہے کہ ان کی پابندی کی جائے' اور پابندی کرانے کے لیے وہ چاہتی ہے کہ اس کے پاس اختیارات ہوں' اتھارٹی ہو۔ دوسری طرف عوام یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے حقوق کا سارا معاملہ ہمارے اپنے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اب اس میں اعتدال کا راستہ کون سا ہے؟

یہ ہے وہ عقدۂ لاینحل (dilemma) کہ جس میں انسان کے لیے اس کے سوا کوئی اور شکل نہیں ہے کہ گھٹنے ٹیک کر اللہ سے دعا کرے کہ پروردگار! میں اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا' میں تجھ سے رہنمائی چاہتا ہوں۔ تو مجھے ہدایت دے' سیدھے راستہ پر چلا! میں نے تجھے پہچان لیا' میں نے یہ بھی جان لیا کہ مرنے کے بعد جی اٹھنا ہے اور حساب کتاب ہوگا اور مجھے جواب دہی کرنی پڑے گی' اور میں اس نتیجہ پر بھی پہنچ چکا ہوں کہ تیری ہی بندگی کرنی چاہیے' تیری ہی اطاعت کرنی چاہیے' تیرے ہی حکم پر چلنا چاہیے..... لیکن اس سے آگے میں کیا کروں کیا نہ کروں؟ کیا صحیح ہے کیا غلط ہے؟ کیا جائز ہے کیا ناجائز ہے؟ میرا نفس تو مجھے اپنی مرغوب چیزوں پر اُکساتا ہے۔ لیکن جس چیز کے لیے میرے نفس نے مجھے اکسایا ہے وہ جائز بھی ہے یا نہیں؟ صحیح بھی ہے یا نہیں؟ فوری طور پر تو مجھے اس سے مسرت حاصل ہو رہی ہے' مجھے اس سے لذت حاصل ہو رہی ہے' منفعت پہنچ رہی ہے' لیکن میں نہیں جانتا کہ آخر کار' نتیجے کے اعتبار سے یہ چیز معاشرے کے لیے اور خود میرے لیے نقصان دہ بھی ہو سکتی ہے؟ اے اللہ! میں نہیں جانتا' تو مجھے ہدایت دے' مجھے راستہ دکھا' سیدھا راستہ' درمیانی راستہ' ایسا راستہ جو متوازن ہو' جس میں انصاف ہو' جس میں عدل اور قسط ہو' جس میں کسی کے حقوق ساقط نہ ہوں اور کوئی جابر بن کر مسلط نہ ہو جائے' جس میں نہ کوئی حزن و ملال اور مایوسی و درماندگی (depression) ہو' نہ کوئی معاشی استحصال ہو' نہ کوئی سماجی امتیاز ہو۔ اے ربّ! ان تینوں چیزوں سے پاک ایک صراطِ مستقیم مَیں اپنے ذہن سے تلاش نہیں کر سکتا' میرے فیصلے جو ہیں غلط ہو جائیں گے۔ تو مَیں ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا ہوں کہ مجھے اس سیدھے راستے کی ہدایت بخش دے۔

یوں سمجھئے کہ پس منظر میں ایک شخص ہے جو اپنی سلامتیٔ طبع' سلامتیٔ فطرت اور سلامتیٔ عقل کی رہنمائی میں یہاں تک پہنچ گیا کہ اُس نے اللہ کو پہچان لیا' آخرت کو پہچان لیا' یہ بھی طے کر لیا کہ راستہ ایک ہی ہے اور وہ ہے اللہ کی بندگی کا راستہ' لیکن اس کے بعد اسے احتیاج محسوس ہو رہی ہے کہ مجھے بتایا جائے کہ اب میں دائیں طرف مڑوں یا بائیں طرف مڑوں؟ یہ مجھے نہیں معلوم۔ قدم قدم پر چوراہے آ رہے ہیں' سہ راہے آ رہے ہیں۔ ظاہر بات ہے ان میں سے ایک ہی راستہ ہوگا جو سیدھا منزلِ مقصود تک لے کر جائے گا۔ کہیں میں غلط موڑ مڑ گیا تو میرا حال اس شعر کے مصداق ہو جائے گا ؎

رستم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دُور شد!

ایک چھوٹی سی غلطی انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ سیدھے راستہ سے آپ ذرا سا کج ہو گئے تو جتنا آپ آگے بڑھیں گے اسی قدر اس صراطِ مستقیم سے آپ کا فاصلہ بڑھتا چلا جائے گا۔ آغاز میں تو محض دس ڈگری کا اینگل تھا' زیادہ فاصلہ نہیں تھا'

لیکن یہ دس ڈگری کا اینگل کھلتا چلا جائے گا اور آپ صراطِ مستقیم سے دُور سے دُور تر ہوتے چلے جائیں گے۔

اللہ کرے کہ سورۃ الفاتحہ کو پڑھتے ہوئے ہم بھی اسی مقام پر کھڑے ہوں کہ ہمارا دل ٹھکا ہوا ہو' ہمیں اللہ پر ایمان' اللہ کی ربوبیت پر ایمان' اللہ کی رحمانیت پر ایمان' اللہ کے مالک یوم الدین ہونے پر ایمان حاصل ہو۔ یہ بھی ہمارا عزم ہو اور ہمارا طے شدہ فیصلہ ہو کہ اُسی کی بندگی کرنی ہے' اور پھر اُس کے سامنے دست سوال دراز کریں کہ پروردگار ہمیں ہدایت عطا فرما!

سورۃ الفاتحہ کے تین حصے

اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب کے حوالے سے اب میں اس کے مضامین کا تجزیہ آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ اس سورۂ مبارکہ کو آپ تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلی تین آیات میں اللہ کی حمد وثنا ہے' آخری تین آیات میں اللہ سے دُعا ہے' جبکہ درمیان کی چوتھی آیت میں بندے کا اپنے ربّ سے ایک عہد و پیمان ہے۔ یہ گویا اللہ اور بندے کا ایک hand shake ہے۔

جزوِ اوّل: پہلی تین آیات میں انسان کی طرف سے ان حقائق کا اظہار ہے جہاں تک وہ خود پہنچ گیا ہے۔ یہ تین آیتیں مل کر ایک جملہ بنتی ہیں۔ گرامر کے اعتبار سے بھی یہ بڑی خوبصورت تقسیم ہے۔ پہلی تین آیتوں میں (جو مل کر ایک جملہ بنتی ہیں) اللہ کی حمد وثنا ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾

''کُل شکر اور کُل ثنا اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے۔ بہت رحم فرمانے والا' نہایت مہربان ہے' جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے۔''

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ اَلْحَمْدُ مبتدأ' لِلّٰهِ خبر۔ ''کُل تعریف (کُل حمد وثنا اور کُل شکر) اللہ کے لیے ہے''۔ اب وہ اللہ کون ہے؟ ﴿رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ ''جو تمام جہانوں کا مالک ہے (پروردگار ہے' پرورش کنندہ ہے)''۔ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ ''جو رحمٰن اور رحیم ہے''۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ میں لام حرفِ جر ہے لہٰذا ''اللہ'' مجرور ہے۔ اس کے بعد آنے والے کلمات رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ''اللہ'' کا بدل ہونے کے باعث مجرور ہیں۔ یہ گویا ایک جملہ چلا آ رہا ہے: کُل حمد' کُل ثنا' کُل شکر اُس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا مالک ہے' مختار ہے' آقا ہے' پروردگار ہے' رحمٰن ہے اور رحیم ہے۔

نوٹ کر لیجیے کہ آیت بسم اللہ میں بھی اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ یہ دونوں صفاتی نام ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' آئے ہیں۔ بلکہ دونوں جگہ اللہ کے لیے تین نام ہیں۔ سب سے پہلا نام ''اللہ'' ہے۔ اسے کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات ہے۔ اگرچہ میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ یہ بھی ایک صفاتی نام ہے۔ ''الٰہ'' پر ''ال'' داخل ہو کر ''اللہ'' بن گیا۔ لیکن بہرحال ''اللہ'' کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے اور عرب میں سب سے زیادہ معروف یہی نام تھا۔ جب قرآن نے رحمٰن کا تذکرہ کرنا شروع کیا تو وہ حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ یہ رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ (مَا الرَّحْمٰنُ) تب یہ کہا گیا: ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۱۰) ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دو کہ اُسے اللہ کہہ کر پکار لو یا رحمٰن کہہ کر پکار لو' جو کہہ کر بھی پکارو گے تو تمام اچھے نام اُسی کے ہیں''۔ یہ تمام صفاتِ کمال اُسی کی ذات میں موجود ہیں۔ (Call the rose by any name it will smell as sweet)

اسم ''اللہ'' کے تین معنی ہیں۔ تفصیل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عرض کر رہا ہوں کہ عوام کے نزدیک اللہ سے مراد حاجت روا ہے' جس کی طرف انسان تکلیف اور مصیبت میں' مشکلات میں' رزق کے لیے اور اپنی دیگر حاجات کے لیے رجوع کرتا ہے۔ ''اللہ'' کا ایک

اور مفہوم یہ ہے کہ وہ ہستی جو انسان کو سب سے زیادہ محبوب ہو ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ یہ صوفیاء کرام کا تصور ہے۔ اور ایک ہے فلاسفہ کا تصور کہ ''اللہ'' وہ ہستی ہے جس کی کُنہ سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا' اس کے بارے میں غور و فکر سے سوائے تحیّر کے اور کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ تو اس مادہ ''ا ل ہ'' یا ''و ل ہ'' کے اندر تین معانی ہیں ـــــ (۱) وہ ہستی کہ جس کی طرف اپنی تکلیف و مصیبت کے رفع کرنے کے لیے اور اپنی ضروریات پوری کرانے کے لیے رجوع کیا جائے۔ (۲) وہ ہستی جس سے انتہائی محبت ہو۔ (۳) جس کی ہستی کا ادراک ممکن نہیں' جس کی کُنہ ہمارے فہم اور ہمارے تصوّر سے ماوراء' وراء الوراء' ثم وراء الوراء ہے۔

﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ رحمت کے مادہ سے یہ اللہ کے دو اسماء ہیں۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ رَحْمٰن، فَعْلَان کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے' چنانچہ اس کے اندر مبالغہ کی کیفیت ہے' یعنی انتہائی رحم کرنے والا۔ اس لیے کہ عرب جو اس وزن پر کوئی لفظ لاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نہایت شدت ہے۔ مثلاً غَضْبَان ''غُصّہ میں لال بھبھوکا شخص''۔ سورۃ الاعراف میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لیے الفاظ آئے ہیں: ﴿غَضْبَانَ اَسِفًا﴾ ''غصہ اور رنج میں بھرا ہوا''۔ عرب کہے گا: اَنَا عَطْشَانُ: میں پیاس سے مرا جا رہا ہوں۔ اَنَا جَوْعَانُ: میں بھوک سے مرا جا رہا ہوں۔ تو رحمٰن وہ ہستی ہے جس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی مانند ہے۔

اور ''رَحِيْم'' فعیل کے وزن پر صفتِ مشبہ ہے۔ جب کوئی صفت کسی کی ذات میں مستقل اور دائم ہو جائے تو وہ فعیل کے وزن پر آتی ہے۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ دونوں صفات اکٹھی ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کی رحمت ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند بھی ہے اور اس کی رحمت میں دوام بھی ہے' وہ ایک دریا کی طرح مستقل رواں دواں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی یہ دونوں شانیں بیک وقت موجود ہیں۔ ہم اس کا کچھ اندازہ ایک مثال سے کر سکتے ہیں۔ فرض کیجیے کہیں کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہو اور وہاں آپ دیکھیں کہ کوئی خاتون بے چاری مر گئی ہے اور اس کا دودھ پیتا بچہ اس کی چھاتی کے ساتھ چمٹا ہوا ہے۔ یہ بھی پتا نہیں ہے کہ وہ کون ہے' کہاں سے آئی ہے' کوئی اس کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کیفیت کو دیکھ کر ہر شخص کا دل پسیج جائے گا اور ہر وہ شخص جس کی طبیعت کے اندر نیکی کا کچھ مادہ ہے چاہے گا کہ اس لاوارث بچے کی کفالت اور اس کی پرورش کی ذمہ داری میں اٹھا لوں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ جذبات کے جوش میں آپ یہ کام تو کر جائیں لیکن کچھ دنوں کے بعد آپ کو پچھتاوا لاحق ہو جائے کہ میں خواہ مخواہ یہ ذمہ داری لے بیٹھا اور میں نے ایک بوجھ اپنے اوپر ناحق طاری کر لیا۔ چنانچہ ہمارے اندر رحم کا جو جذبہ ابھرتا ہے وہ جلد ہی ختم ہو جاتا ہے' وہ مستقل اور دائم نہیں ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں جوش بھی ہے اور دوام بھی ہے' دونوں چیزیں بیک وقت موجود ہیں۔

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ ''وہ جزا اور سزا کے دن کا مالک ہے''۔ وہ مختارِ مطلق ہے۔ قیامت کے دن انسانوں کے اعمال کے مطابق جزا اور سزا کے فیصلے ہوں گے۔ کسی کی وہاں کوئی سفارش نہیں چلے گی' کسی کا وہاں زور نہیں چلے گا' کوئی دے دلا کر چھوٹ نہیں سکے گا' کسی کو کہیں سے مطلقاً کوئی مدد نہیں ملے گی۔ اُس روز کہا جائے گا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ؕ﴾ ''آج کس کے ہاتھ میں اختیار اور بادشاہی ہے؟'' ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝۱۶﴾ (المؤمن) ''اُس اللہ کے ہاتھ میں ہے جو اکیلا ہے اور پوری کائنات پر چھایا ہوا ہے۔''

اب دیکھئے گرامر کی رو سے یہ ایک جملہ مکمل ہوا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ ''کُل حمد و ثنا اور شکر اُس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار اور مالک ہے' جو رحمٰن ہے' رحیم ہے' اور جو جزا و سزا کے دن کا مالک اور مختارِ مطلق ہے۔''

جزوِ ثانی: سورۃ الفاتحہ کا دوسرا حصہ صرف ایک آیت پر مشتمل ہے' جو ہر اعتبار سے اس سورۃ کی مرکزی آیت ہے:

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾

''ہم صرف تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے اور ہم صرف تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہتے رہیں گے۔''

ضمیر مخاطب ''کَ'' کو مقدم کرنے سے حصر کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ پھر عربی میں فعل مضارع' زمانہ حال اور مستقبل دونوں کے لیے آتا ہے' لہٰذا میں نے ترجمہ میں ان باتوں کا لحاظ رکھا ہے۔ یہ بندے کا اپنے پروردگار سے عہد و پیمان ہے جسے میں نے hand shake سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا صحیح تصوّر ایک حدیث قدسی کی روشنی میں سامنے آتا ہے' جسے میں بعد میں پیش کروں گا۔ یہاں سمجھنے کا اصل نکتہ یہ ہے کہ یہ فیصلہ کر لینا تو آسان ہے کہ اے اللہ! میں تیری ہی بندگی کروں گا' لیکن اس فیصلہ کو نبھانا بہت مشکل ہے ؎

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اللہ کی بندگی کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنا آسان نہیں ہے' لہٰذا بندگی کا عہد کرنے کے فوراً بعد اللہ کی پناہ میں آنا ہے کہ اے اللہ! میں اس ضمن میں تیری ہی مدد چاہتا ہوں۔ فیصلہ تو میں نے کر لیا ہے کہ تیری ہی بندگی کروں گا اور اس کا وعدہ کر رہا ہوں' لیکن اس پر کاربند رہنے کے لیے مجھے تیری مدد درکار ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اذکارِ ماثورہ میں ہر نماز کے بعد آپ ﷺ کا ایک ذکر یہ بھی ہے: ((رَبِّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ)) [۶] ''پروردگار! میری مدد فرما کہ میں تجھے یاد رکھ سکوں' تیرا شکر ادا کر سکوں اور تیری بندگی احسن طریقے سے بجا لاؤں''۔ تیری مدد کے بغیر میں یہ نہیں کر سکوں گا۔

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾ جب بھی آپ اس آیت کو پڑھیں تو آپ کے اوپر ایک خاص کیفیت طاری ہونی چاہیے کہ پہلے کپکپی طاری ہو جائے کہ اے اللہ! میں تیری بندگی کا وعدہ تو کر رہا ہوں' میں نے ارادہ تو کر لیا ہے کہ تیرا بندہ بن کر زندگی گزاروں گا' میں تیری جناب میں اس کا اقرار کر رہا ہوں' لیکن اے اللہ! میں تیری مدد کا محتاج ہوں' تیری طرف سے توفیق ہوگی' تیسیر ہوگی' تعاون ہوگا' نصرت ہوگی تب ہی میں یہ عہد و پیمان پورا کر سکوں گا' ورنہ نہیں۔

﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾ آیت ایک ہے' لیکن جملے دو ہیں۔ ''اِیَّاکَ نَعۡبُدُ'' مکمل جملہ ہے' جملہ فعلیہ انشائیہ' اور ''اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ'' دوسرا جملہ ہے۔ بیچ میں حرفِ عطف واؤ ہے۔ اس سے پہلے اس سورۂ مبارکہ میں کوئی حرفِ عطف نہیں آیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ساری صفات اُس کی ذات میں بیک وقت موجود ہیں۔ یہاں حرفِ عطف آ گیا: ''اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے'' اور ''تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور مانگتے رہیں گے''۔ ہمارا سارا دارومدار اور توکل تجھ ہی پر ہے۔ ہم تیری مدد ہی کے سہارے پر اتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں کہ اے اللہ! ہم تیری ہی بندگی کرتے رہیں گے۔

ہم نمازِ وتر میں جو دعائے قنوت پڑھتے ہیں کبھی آپ نے اس کے مفہوم پر بھی غور کیا ہے؟ اس میں ہم اللہ تعالیٰ کے حضور بہت بڑا اقرار کرتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسۡتَعِیۡنُکَ وَنَسۡتَغۡفِرُکَ وَنُؤۡمِنُ بِکَ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡکَ وَنُثۡنِیۡ عَلَیۡکَ الۡخَیۡرَ وَنَشۡکُرُکَ وَلَا نَکۡفُرُکَ، وَنَخۡلَعُ وَنَتۡرُکُ مَنۡ یَّفۡجُرُکَ، اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیۡ وَنَسۡجُدُ وَاِلَیۡکَ

۶۔ سنن النسائی' کتاب السھو' باب نوع آخر من الدعاء۔

نَسْعٰی وَنَحْفِدُ ، وَنَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَنَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ

''اے اللہ! ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں' اور تجھ ہی سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہیں' اور ہم تجھ پر ایمان رکھتے ہیں' اور تجھ پر توکّل کرتے ہیں' اور تیری تعریف کرتے ہیں' اور تیرا شکر ادا کرتے ہیں اور تیری ناشکری نہیں کرتے۔ اور ہم علیحدہ کر دیتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں ہر اُس شخص کو جو تیری نافرمانی کرے۔ اے اللہ! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیرے ہی لیے نماز پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں' اور ہم تیری طرف کوشش کرتے ہیں اور ہم حاضری دیتے ہیں۔ اور ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیرے عذاب سے ڈرتے ہیں' بے شک تیرا عذاب کافروں کو پہنچنے والا ہے۔''

واقعہ یہ ہے کہ اس دعا کو پڑھتے ہوئے لرزہ طاری ہوتا ہے کہ کتنی بڑی بڑی باتیں ہم اپنی زبان سے نکال رہے ہیں۔ ہم زبان سے تو کہتے ہیں کہ ''اے اللہ! ہم صرف تیری ہی مدد چاہتے ہیں'' لیکن نہ معلوم کس کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہیں اور کس کس کے سامنے جبیں سائی کرتے ہیں' کس کس کے سامنے اپنی عزتِ نفس کا دھیلا کرتے ہیں۔ پھر یہ الفاظ دیکھئے: نَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ کہ جو بھی تیری نافرمانی کرے اسے ہم علیحدہ کر دیتے ہیں' اس کو ہم چھوڑ دیتے ہیں' اس سے ترکِ تعلق کر لیتے ہیں۔ لیکن کیا واقعۃً ہم کسی سے ترکِ تعلق کرتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں دوستی ہے' رشتہ داری ہے کیا کریں' وہ اپنا عمل جانیں میں اپنا عمل جانوں۔ ہمارا طرزِ عمل تو یہ ہے۔ تو کتنا بڑا دعویٰ ہے اس دُعا کے اندر؟ اور وہ پورا دعویٰ اس ایک جملے میں مضمر ہے: اِیَّاکَ نَعْبُدُ ''پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے''۔ چنانچہ اُس وقت فوری طور پر بندے کے سامنے یہ کیفیت آ جانی چاہیے کہ اے اللہ میں یہ اسی صورت میں کر سکوں گا اگر تیری مدد شاملِ حال رہے۔

جزوِ ثالث: سورۃ الفاتحہ کا تیسرا حصہ تین آیات پر مشتمل ہے' تاہم یہ ایک ہی جملہ بنتا ہے۔

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

(آمین!)

''(اے ربّ ہمارے!) ہمیں ہدایت بخش سیدھی راہ کی۔ راہ اُن لوگوں کی جن پر تیرا انعام ہوا' جو نہ تو مغضوب ہوئے اور نہ گمراہ۔''

اب دیکھئے' یہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہی کی تشریح ہے جو آخری تین آیتوں میں ہے۔ ہمیں اللہ سے کیا مدد چاہیے؟ پیسہ چاہیے؟ دولت چاہیے؟ نہیں نہیں! اے اللہ ہمیں یہ نہیں چاہیے۔ پھر کیا چاہیے؟ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ ''ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما''۔ یہ جو زندگی کے مختلف معاملات میں دوراہے' سہ راہے اور چوراہے آ جاتے ہیں' وہاں ہم فیصلہ نہیں کر سکتے کہ صحیح کیا ہے' غلط کیا ہے۔ لہٰذا اے اللہ! ہمیں سیدھے راستہ کی طرف ہدایت بخش۔ ''اِهْدِ'' ہدایت سے فعل امر ہے کہ ہمیں ہدایت دے۔ ہدایت کا ایک درجہ یہ بھی ہے کہ سیدھا راستہ بتا دیا جائے۔ ہدایت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ سیدھا راستہ دکھا دیا جائے' اور ہدایت کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ انگلی پکڑ کر سیدھے راستے پر چلایا جائے' جیسے بچوں کو لے کر آتے ہیں۔ لہٰذا سیدھے راستے کی ہدایت کی دعا میں یہ سارے مفہوم شامل ہوں گے۔ اے اللہ! ہمیں سیدھا راستہ دکھا دے۔ اے اللہ! اس سیدھے راستے کے لیے ہمارے سینوں کو کھول دے۔ اَللّٰھُمَّ نَوِّرْ قُلُوْبَنَا بِالْاِیْمَانِ وَاشْرَحْ صُدُوْرَنَا لِلْاِسْلَامِ ''اے اللہ! ہمارے دلوں کو ایمان کی روشنی سے منوّر کر دے اور ہمارے سینوں کو اسلام کے لیے کھول دے''۔ ہمیں اس پر انشراحِ صدر ہو جائے۔ اور پھر یہ کہ ہمیں اس سیدھے راستے کے اوپر چلا۔

اب آگے اس صراطِ مستقیم کی بھی وضاحت ہے' اور یہ وضاحت دو طرح سے ہے۔ صراطِ مستقیم کی وضاحت ایک مثبت انداز میں

اور ایک منفی انداز میں کی گئی ہے۔ مثبت انداز یہ ہے کہ ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۵﴾ ''(اے اللہ!) اُن لوگوں کے راستہ پر (ہمیں چلا) جن پر تُو نے اپنا انعام نازل فرمایا''۔ یہ مضمون جا کر سورۃ النساء میں کھلے گا کہ منعم علیہم چار گروہ ہیں: ﴿مِنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝۶۹﴾ ''کہ وہ نبی، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ اور بہت ہی خوب ہے ان کی رفاقت''۔ اے اللہ! ان کے راستہ پر ہمیں چلا۔ یہ تو مثبت بات ہوگئی۔ منفی انداز یہ اختیار فرمایا: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ ''نہ اُن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ہی وہ گمراہ ہوئے''۔ جو لوگ صراطِ مستقیم سے بھٹک گئے وہ دو قسم کے ہیں۔ ان میں فرق یہ ہے کہ جو شرارتِ نفس کی وجہ سے غلط راستے پر چلتا ہے اس پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے، اور جس کی نیت تو غلط نہیں ہوتی، لیکن وہ غلو کر کے جذبات میں آ کر کوئی غلط راستے اختیار کر لیتا ہے تو وہ ضالّ (گمراہ) ہے۔ چنانچہ ''مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ'' کی سب سے بڑی مثال یہود ہیں کہ اللہ کی کتاب ان کے پاس تھی، شریعت موجود تھی، لیکن شرارتِ نفس اور تکبّر کی وجہ سے وہ غلط راستہ پر چل پڑے۔ جبکہ نصاریٰ ''ضَآلِّيْن'' ہیں، انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں صرف غلو کیا ہے۔ جیسے ہمارے یہاں بھی بعض نعت گو اور نعت خواں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بیان کرتے ہیں تو مبالغہ آرائی کرتے ہوئے کبھی انہیں اللہ سے بھی اوپر لے جاتے ہیں۔ یہ غلو ہوتا ہے، لیکن ہوتا ہے نیک نیتی سے، محبت سے۔ چنانچہ نصاریٰ نے حُبِّ رسول میں غلو سے کام لیتے ہوئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ ہمارے شیعہ بھائیوں میں سے بھی بعض لوگ ہیں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خدا ہی بنا بیٹھے ہیں۔ مثلاً ع

''لیکن نہیں ہے ذاتِ خدا سے جدا علی!''

بہرحال یہ غلو ہوتا ہے جو انسان کو گمراہ کر دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے: ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾ (المائدۃ:۷۷) ''اے کتاب والو! اپنے دین میں ناحق غلو سے کام نہ لو''۔ لیکن نصاریٰ نے اپنے دین میں اور حضرت عیسیٰؑ کی محبت میں غلو سے کام لیا تو وہ گمراہ ہو گئے۔ تو اے اللہ! ان سب کے راستے سے ہمیں بچا کر سیدھے راستے پر چلا، جو صدیقین کا، انبیاء کا، شہداء کا اور صالحین کا راستہ ہے۔

حدیثِ قدسی

آخر میں وہ حدیث قدسی پیش کر رہا ہوں جس میں سورۃ الفاتحہ ہی کو الصَّلَاۃ (نماز) قرار دیا گیا ہے۔ یہ مسلم شریف کی روایت ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے راوی ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ الْعَبْدُ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ، وَإِذَا قَالَ ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: أَثْنٰى عَلَيَّ عَبْدِيْ، وَإِذَا قَالَ ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ قَالَ مَجَّدَنِيْ عَبْدِيْ —— وَقَالَ مَرَّةً: فَوَّضَ إِلَيَّ عَبْدِيْ —— فَإِذَا قَالَ ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ قَالَ هٰذَا بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ، فَإِذَا قَالَ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ قَالَ هٰذَا لِعَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَاسَأَلَ)) [۷]

۷۔ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ... الخ

''میں نے نماز کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے (اس کا نصف حصہ میرے لیے اور نصف حصہ میرے بندے کے لیے ہے) اور میرے بندے کو وہ عطا کیا گیا جو اُس نے طلب کیا۔ جب بندہ کہتا ہے: ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی (میرا شکر ادا کیا)۔ جب بندہ کہتا ہے: ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری ثنا کی۔ جب بندہ کہتا ہے: ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' تو اللہ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری بزرگی اور بڑائی بیان کی — اور ایک مرتبہ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''میرے بندے نے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا —— (گویا یہ پہلا حصہ کُل کا کُل اللہ کے لیے ہے۔) پھر جب بندہ کہتا ہے: ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ حصہ میرے اور میرے بندے کے مابین مشترک ہے اور میں نے اپنے بندے کو بخشا جو اُس نے مانگا۔ (گویا یہ حصہ ایک قول و قرار اور عہد و میثاق ہے۔ اسے میں نے کہا تھا کہ یہ اللہ اور بندے کے درمیان hand shake ہے۔) پھر جب بندہ کہتا ہے: ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ'' تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ حصہ (کُل کا کُل) میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مجھ سے طلب کیا وہ میں نے اُسے بخشا۔''

اس حدیث کی رو سے سورۃ الفاتحہ کے تین حصے بن جائیں گے۔ پہلا حصہ کلیتاً اللہ کے لیے ہے اور آخری حصہ کلیتاً بندے کے لیے، جبکہ درمیانی و مرکزی آیت: ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ'' بندے اور اللہ کے مابین قول و قرار ہے۔ گویا اس کا بھی نصف اوّل اللہ کے لیے اور نصفِ ثانی بندے کے لیے ہے۔ اس طرح نصف نصف کی تقسیم بتمام و کمال پوری ہو گئی!

ایک بات یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ اس حدیثِ قدسی میں ''قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ'' کے بعد آیت ''بسم اللہ'' کا ذکر نہیں ہے، بلکہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' سے بات براہِ راست آگے بڑھتی ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس ضمن میں امام ابوحنیفہؒ کا موقف درست ہے کہ آیت بسم اللہ سورۃ الفاتحہ کا جزو نہیں ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کے اختتام پر ''آمین'' کہنا مسنون ہے۔ ''آمین'' کے معنی ہیں ''اے اللہ ایسا ہی ہو!'' اس سورۂ مبارکہ کا اسلوب چونکہ دعائیہ ہے، لہٰذا دعا کے اختتام پر ''آمین'' کہہ کر بندہ گویا پھر بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ اے پروردگار! میں نے یہ عرضداشت تیرے حضور پیش کی ہے، تُو اسے شرفِ قبول عطا فرما!

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایاکم بالآیات والذّکر الحکیم

سُوْرَةُ البَقَرَةِ

تمہیدی کلمات

قرآن حکیم کی پہلی سورت سورۃ الفاتحہ ہے' جس کا مطالعہ ہم کر چکے ہیں۔ یہ بات آپ کے سامنے آ چکی ہے کہ یہ وہ پہلی سورت ہے جو رسول اللہ ﷺ پر پوری کی پوری نازل ہوئی۔ اس سے پہلے صرف متفرق آیات نازل ہوئی تھیں۔ یعنی سورۃ العلق' سورۃ القلم' سورۃ المزمل اور سورۃ المدثر کی ابتدائی آیات۔

یہ بات بھی آپ کے سامنے آ چکی ہے کہ قرآن حکیم میں مکی اور مدنی سورتوں کے مجموعوں کے اعتبار سے بھی سات گروپ ہیں۔ پہلا گروپ وہ ہے جس کا ہم سورۃ الفاتحہ سے آغاز کر چکے ہیں۔ اس گروپ میں جو مکی سورت ہے وہ صرف سورۃ الفاتحہ ہے۔ یہ حجم کے اعتبار سے بہت چھوٹی لیکن اپنے مقام و مرتبہ اور فضیلت کے اعتبار سے بہت بڑی ہے' یہاں تک کہ اسے ''القرآن العظیم'' بھی کہا گیا۔ گویا یہ اپنی جگہ پر خود ایک عظیم قرآن ہے۔ اس کے بعد مدنی سورتیں چار ہیں۔ یہ طویل ترین مدنی سورتیں ہیں اور دو دو سورتوں کے دو جوڑوں پر مشتمل ہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن حکیم کی اکثر سورتیں جوڑوں کی شکل میں ہیں' جبکہ کچھ منفرد بھی ہیں۔ سورۃ الفاتحہ منفرد ہے' اس کا کوئی جوڑا نہیں ہے' اگرچہ اس کی معنوی مناسبت قرآن مجید کی آخری سورت سورۃ الناس کے ساتھ جڑتی ہے' لیکن بہرحال اُس کا جوڑا سورۃ الفلق ہے۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ دونوں سورتوں پر مشتمل ایک جوڑا ہے' لہٰذا سورۃ الفاتحہ کا کوئی جوڑا نہیں ہے' یا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پورا قرآن ہی اس کا جوڑا ہے۔

سورۃ الفاتحہ کے بعد جو چار سورتیں ہیں یہ جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران ایک جوڑا ہے جبکہ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ دوسرا جوڑا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں علامت یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران دونوں کا آغاز حروفِ مقطعات ''الٓمّٓ'' سے ہوتا ہے' جبکہ سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ دونوں میں بغیر کسی تمہید کے گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ سورۃ النساء کا آغاز ہوتا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ...﴾ اور سورۃ المائدۃ شروع ہوتی ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ پہلے کوئی تمہیدی بات نہیں کی گئی۔

سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کا یہ جو جوڑا ہے' ان دونوں کو رسول اللہ ﷺ نے ''الزَّهْرَاوَیْن'' کا نام عطا فرمایا ہے۔ ''زَہراء'' کا مطلب ہے بہت تابناک' روشن۔ یہ لفظ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام کا جزء بن چکا ہے اور انہیں فاطمۃ الزہراء کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی لختِ جگر' نورِ چشم حضرت فاطمہؓ بہت ہی روشن چہرے والی خاتون تھیں۔ حضور ﷺ کے الفاظ کے مطابق سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران ''الزَّهْرَاوَیْن'' یعنی دو انتہائی تابناک اور روشن سورتیں ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید کی آخری دو سورتوں کو ''المُعَوِّذَتَیْن'' کا نام دیا گیا ہے۔

پہلے گروپ کی ان مدنی سورتوں کے مضامین کے بارے میں جان لیجیے کہ دو مضمون ہیں جو اِن میں متوازی چلتے ہیں۔ پہلا مضمون شریعت اسلامی کا ہے' اس لیے کہ اس سے پہلے تقریباً دو تہائی قرآن نازل ہو چکا ہے۔ سورۃ البقرۃ پہلی مدنی سورۃ ہے' اس سے پہلے زمانی اعتبار سے پورا مکی قرآن نازل ہو چکا تھا' اگرچہ ترتیب میں وہ بعد میں آئے گا۔ اس میں شریعت کے احکام نہیں تھے۔ لہٰذا اب جبکہ مدینہ میں مسلمانوں کا ایک آزاد معاشرہ قائم ہو گیا' یا یوں کہہ لیجیے کہ مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی حکومت قائم ہو گئی' جہاں اپنے قواعد' اپنے قوانین' اپنے اصولوں کے مطابق سارے معاملات طے کیے جا سکتے تھے' تب شریعت کا نزول شروع ہوا۔ سورۃ البقرۃ میں یوں سمجھئے کہ احکامِ شریعت کی ابتدا ہوتی ہے۔ کوئی بھی تعمیر کرنی ہو تو پہلے اس کا ابتدائی خاکہ بنتا ہے' اس کے بعد اس کے تفصیلی نقشے بنتے ہیں۔ تو ابتدائی خاکہ جو ہے شریعتِ محمدی ﷺ کا وہ سورۃ البقرۃ میں ہے۔ پھر سورۃ النساء میں اس کے اندر مزید اضافہ ہوتا ہے' اور سورۃ المائدۃ میں شریعت کے تکمیلی احکام آتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ تکمیلِ شریعت کی سورت ہے۔ اسی میں وہ آیت ہے: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (آیت ۳)

دوسرا مضمون جو اِن سورتوں میں چلتا ہے وہ ہے اہلِ کتاب سے خطاب۔ مکی قرآن میں سارا خطاب مشرکین سے تھا' یعنی عرب کے وہ لوگ جو مکہ میں اور اس کے اردگرد آباد تھے۔ وہاں کوئی یہودی یا کوئی نصرانی نہیں تھا' سب کے سب مشرکینِ عرب تھے۔ تو پورے مکی قرآن میں انہی سے ردّوقدح ہے' گفتگو ہے' بحث و نزاع ہے' ان کے اعتراضات کے جوابات ہیں اور ان پر اتمامِ حجت کیا گیا ہے۔ اگرچہ اہلِ کتاب کا تذکرہ حوالہ کے طور پر موجود ہے' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا ذکر موجود ہے' لیکن بنی اسرائیل سے' یہودیوں سے' یا نصاریٰ سے کوئی خطاب نہیں ہوا۔ ان سے خطاب مدینہ میں آ کر شروع ہوا ہے' کیونکہ وہاں یہودی آباد تھے۔ مدینہ میں یہود کے تین مضبوط قبیلے موجود تھے۔ تو یہ ہیں دو بنیادی مضمون اس پہلے گروپ کے۔ ان میں آپ کو ایک اور تقسیم نظر آ جائے گی کہ اہلِ کتاب میں سے جن سے ''يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ'' کے الفاظ سے خطاب ہو رہا ہے یعنی یہود' ان سے ساری گفتگو سورۃ البقرۃ میں ہے' جبکہ جو نصاریٰ ہیں ان سے گفتگو سورۂ آل عمران میں ہے۔

سورۃ البقرۃ کی اہمیت و فضیلت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ اسے حضور ﷺ نے قرآن مجید کا ذروۂ سنام یعنی کلائمکس قرار دیا ہے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ((اَلْبَقَرَةُ سَنَامُ الْقُرْآنِ وَذُرْوَتُهُ)) (مسند احمد) حجم کے اعتبار سے بھی قرآن کی سب سے بڑی سورت یہی ہے' ۲۸۶ آیات پر مشتمل ڈھائی پاروں پر پھیلی ہوئی ہے۔

سورۃ البقرۃ کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور اس اعتبار سے میں نے اس کا ایک نام تجویز کیا ہے ''سُوْرَةُ الْاُمَّتَيْن'' یعنی دو اُمتوں کی سورت۔ اس کے نصف اوّل میں اصل روئے سخن اُمتِ سابق یہود کی طرف ہے' جو اُس وقت تک اللہ کے نمائندہ تھے اور زمین پر وہی اُمتِ مُسلمہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی بداعمالی کی وجہ سے اپنے آپ کو اس مقام کا نااہل ثابت کیا' لہٰذا وہ معزول کیے گئے اور ایک نئی اُمت اُمتِ محمد ﷺ اس مقام پر فائز کی گئی۔ تو نصفِ اوّل میں سابق اُمت سے گفتگو ہے اور ان پر گویا فردِ جرم عائد کی گئی ہے کہ تم نے یہ کیا' یہ کیا اور یہ کیا۔ ہم نے تم پر یہ احسانات کیے' ہم نے یہ بھلائیاں کیں' تمہارے اوپر ہماری یہ رحمتیں ہوئیں' لیکن تمہارا طرزِ عمل یہ ہے' جس کی بنا پر اب تم معزول کیے جا رہے ہو۔ یہ مضمون ہے پہلے نصف کا۔ اور اب جو دوسری اُمت قائم ہوئی ہے یعنی اُمتِ محمد ﷺ' اس سے خطاب ہے نصفِ ثانی کے اندر۔ تو اس کی یہ ترتیب ذہن میں رکھیے۔ پہلا حصہ اٹھارہ رکوعوں پر مشتمل ہے اور اس کی آیات کی تعداد ۱۵۲ ہے۔ جبکہ دوسرا حصہ بائیس رکوعوں پر مشتمل ہے' لیکن تعدادِ آیات ۱۳۴ ہے۔ اِس طرح یہ دونوں حصے تقریباً برابر بن جاتے ہیں۔

نصفِ اوّل کے جو اٹھارہ رکوع ہیں ان کو بھی تین حصوں میں تقسیم کر لیجیے۔ پہلے چار رکوع تمہیدی ہیں۔ پھر دس رکوعوں میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ پھر چار رکوع تحویلی ہیں۔ تمہیدی رکوعوں میں سے پہلے دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانوں کی ایک تقسیم بیان کر دی گئی جو دنیا میں ہمیشہ پائے جائیں گے۔ جب بھی کوئی نئی دعوت آئے گی تو کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اسے تہِ دِل سے قبول کریں گے اور اس کے لیے ''ہر چہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم'' کے مصداق سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔ کچھ لوگ وہ ہوں گے جو اس کی مخالفت پر اوّل روز سے کمر کس لیں گے اور اسے ہرگز نہیں مانیں گے۔ اور کچھ وہ ہوں گے جو بین بین رہیں گے۔ ان کا طرزِ عمل یہ رہے گا کہ بات کچھ اچھی لگتی بھی ہے لیکن اس کے لیے قربانی دینا کٹھن ہے' اس کے تقاضے بڑے مشکل ہیں۔ بات اچھی ہے' قبول بھی کرتے ہیں' لیکن عملاً اس کے تقاضے پورے نہیں کرتے۔ ان کے لیے سورۃ النساء میں ﴿لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ تفصیل پہلے دو رکوعوں میں آئی ہے۔

اس کے بعد دوسرے دو رکوعوں میں گویا مکّی قرآن کا خلاصہ آ گیا ہے۔ ایک رکوع میں قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ اور ایک رکوع میں قرآن مجید کا فلسفہ بیان کر دیا گیا۔ یہ مضامین اصل میں مکّی سورتوں کے ہیں اور وہاں تفصیل سے زیر بحث آ چکے ہیں۔ سورۃ البقرۃ کے نزول سے پہلے ان مضامین پر بہت مفصل بحثیں ہو چکی ہیں' لیکن چونکہ حکمتِ خداوندی میں اس مصحف کی ترتیب میں سب سے پہلے سورۃ البقرۃ ہے' لہٰذا سورۃ البقرۃ میں ان مضامین کا خلاصہ درج کر دیا گیا' تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے وہ مضامین ذہن نشین کر لیے جائیں۔

اب بسم اللہ کر کے ہم سورۃ البقرۃ کے مطالعہ کا آغاز کر رہے ہیں۔

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۲۸۶ رُكُوْعَاتُهَا: ۴۰

الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۲﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ
الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ
بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى
سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۠ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۷﴾

الجزء الاول (۱) ع

آیت ﴿الٓمّٓ ۝۱﴾ ''ا۔ل۔م۔''

یہ حروفِ مقطّعات ہیں جن کے بارے میں یہ جان لیجیے کہ ان کے حقیقی' حتمی اور یقینی مفہوم کو کوئی نہیں جانتا سوائے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے۔ یہ ایک راز ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مابین۔ حروفِ مقطّعات کے بارے میں اگرچہ بہت سی آراء ظاہر کی گئی ہیں' لیکن ان میں سے کوئی شے رسول اللہ ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ البتہ یہ بات ثابت ہے کہ اس طرح کے حروفِ مقطّعات کا کلام میں استعمال عرب میں معروف تھا' اس لیے کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔ قرآن مجید کی ۱۱۴ میں سے ۲۹ سورتیں ایسی ہیں جن کا آغاز حروفِ مقطّعات سے ہوا ہے۔ سورۂ قٓ' سورۃ القلم اور سورۂ صٓ کے آغاز میں ایک ایک حرف ہے۔ حٰمٓ، طٰہٰ اور یٰسٓ دو دو حرف ہیں۔ الٓمّٓ اور الٓرٰ تین تین حروف ہیں جو کئی سورتوں کے آغاز میں آئے ہیں۔ الٓمّٓصٓ اور الٓمّٓرٰ چار چار حروف ہیں۔

حروفِ مقطعات میں زیادہ سے زیادہ پانچ حروف یکجا آتے ہیں۔ چنانچہ کٓهٰیٰعٓصٓ سورۂ مریم کے آغاز میں اور حٰمٓ عٓسٓقٓ سورۃ الشوریٰ کے آغاز میں آئے ہیں۔ ان کے بارے میں اس وقت مجھے اس سے زائد کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔ اپنے مفصل درسِ قرآن میں مَیں نے ان پر تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔

آیت ۲ ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ ''یہ الکتاب ہے اس میں کچھ شک نہیں۔'' یا ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔''

آیت کے اس ٹکڑے کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں۔ پہلے ترجمے کی رو سے یہ ہے وہ کتابِ موعود جس کی خبر دی گئی تھی کہ نبی آخر الزماں ﷺ آئیں گے اور اُن کو ہم ایک کتاب دیں گے۔ یہ گویا حوالہ ہے محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں پیشین گوئیوں کی طرف کہ جو تورات میں موجود تھیں۔ آج بھی ''کتابِ مقدس'' کی کتاب استثناء (Deuteronomy) کے اٹھارہویں باب کی اٹھارہویں آیت کے اندر یہ الفاظ موجود ہیں کہ: ''میں ان (بنی اسرائیل) کے لیے ان کے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا''۔ تو یہ بائبل میں حضرت محمد ﷺ کی پیشین گوئیاں تھیں۔ آگے چل کر سورۃ الاعراف میں ہم اسے تفصیل سے پڑھ بھی لیں گے۔ یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہی وہ کتابِ موعود ہے کہ جو نازل کر دی گئی ہے محمد رسول اللہ ﷺ پر۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں ہر شے اپنی جگہ پر یقینی ہے' حتمی ہے' اٹل ہے' اور یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جو یہ دعویٰ لے کر اٹھی ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ جو کتابیں آسمانی کہلائی جاتی ہیں اُن کے اندر بھی یہ دعویٰ کہیں موجود نہیں ہے' انسانی کتابوں میں تو اس کا سوال ہی نہیں ہے۔ علامہ اقبال جیسے نابغہ عصر فلسفی بھی اپنے لیکچرز کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ سب صحیح ہے' ہو سکتا ہے جیسے جیسے علم آگے بڑھے مزید نئی باتیں سامنے آئیں۔ لیکن قرآن کا دعویٰ ہے کہ لَا رَيْبَ فِيْهِ ''اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے''۔ پہلے ترجمہ کی رو سے ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ'' ایک جملہ مکمل ہو گیا اور ''لَا رَيْبَ فِيْهِ'' دوسرا جملہ ہے' جبکہ دوسرے ترجمہ کی رو سے ''ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ'' مکمل جملہ ہے۔ یعنی ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔''

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ ''ہدایت ہے پرہیزگار لوگوں کے لیے۔''

یعنی ان لوگوں کے لیے جو بچنا چاہیں۔ تقویٰ کا لفظی معنی ہے بچنا۔ ''وَقٰی۔ یَقِی'' کا مفہوم ہے ''کسی کو بچانا'' جبکہ تقویٰ کا معنی ہے خود بچنا۔ یعنی کج روی سے بچنا' غلط روی سے بچنا اور افراط وتفریط کے دھکوں سے بچنا۔ جن لوگوں کے اندر فطرتِ سلیمہ ہوتی ہے اُن کے اندر یہ اخلاقی حس موجود ہوتی ہے کہ وہ بھلائی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ہر بُری چیز سے بچنا چاہتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو قرآن مجید کے اصل مخاطبین ہیں۔ گویا جس کے اندر بھی بچنے کی خواہش ہے اس کے لیے یہ کتابِ ہدایت ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں ہماری فطرت کی ترجمانی کی گئی تھی اور ہم سے یہ کہلوایا گیا تھا: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ ''(اے پروردگار!) ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت بخش''۔ آیت زیرِ مطالعہ گویا اس کا جواب ہے: ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲﴾ لو وہ کتاب موجود ہے کہ جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے اور یہ ان تمام لوگوں کے لیے ہدایت کے تقاضوں کے اعتبار سے کفایت کرتی ہے جن میں غلط روی سے بچنے کی خواہش موجود ہے۔

وہ لوگ کون ہیں؟ اب یہاں دیکھئے تاویلِ خاص کا معاملہ آ جائے گا کہ اُس وقت رسول اللہ ﷺ کی تیرہ برس کی محنت کے نتیجہ میں مہاجرین وانصار کی ایک جماعت وجود میں آ گئی تھی' جس میں حضراتِ ابوبکر' عمر' عثمان' علی' طلحہ' زبیر' سعد بن عبادہ اور سعد بن

معاذ رضی اللہ عنہ جیسے نفوسِ قدسیہ شامل تھے۔ تو گویا اشارہ کر کے دکھایا جا رہا ہے کہ دیکھو یہ وہ لوگ ہیں' دیکھ لو ان میں کیا اوصاف ہیں۔

آیت ۳ ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ ''جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر''

یہ متقین کے اوصاف میں سے پہلا وصف ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بس جو کچھ ہماری آنکھوں سے نظر آ رہا ہے' حواسِ خمسہ کی زد میں ہے بس وہی کُل حقیقت ہے۔ نہیں! اصل حقیقت تو ہمارے حواس کی سرحدوں سے بہت پرے واقع ہوئی ہے۔

ہدایتِ قرآنی کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ انسان یہ سمجھ لے کہ جو اصل حقیقت ہے وہ اس کی نگاہوں سے مستور ہے۔ انگلستان کے بہت بڑے فلسفی بریڈلے (Bradley) کی کتاب کا عنوان ہے: ''Appearance and Reality''۔ اس نے لکھا ہے کہ جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ حقیقت نہیں ہے' حقیقت اس کے پیچھے ہے۔ کنفیوشس (۵۵۱ تا ۴۷۹ ق م) چین کا بہت بڑا حکیم اور فلسفی تھا' اس کی تعلیمات میں اخلاقی رنگ بہت نمایاں ہے۔ اُس کا ایک جملہ ہے:

There is nothing more real than what can not be seen; and there is nothing more certain than what can not be heard.

یعنی وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے اور کانوں سے سنے نہیں جا سکتے اُن سے زیادہ یقینی اور واقعی حقائق کوئی اور نہیں ہیں۔

﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کرتے ہیں''

اللہ کے ساتھ اپنا ایک ذہنی و قلبی اور روحانی رشتہ استوار کرنے کے لیے نماز قائم کرتے ہیں۔

﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳﴾ ''اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔''

یعنی خیر میں' بھلائی میں' نیکی میں' لوگوں کی تکالیف دور کرنے میں اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے' اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔

آیت ۴ ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ﴾ ''اور جو ایمان رکھتے ہیں اُس پر بھی جو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے''

﴿وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ ''اور اُس پر بھی (ایمان رکھتے ہیں) جو آپؐ سے پہلے نازل کیا گیا۔''

یہ بہت اہم الفاظ ہیں۔ عام طور پر آج کل ہمارے ہاں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ سابقہ آسمانی کُتب تورات اور انجیل وغیرہ کے پڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں' اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ''کوئی ضرورت نہیں'' کی حد تک تو شاید بات صحیح ہو' لیکن ''کوئی فائدہ نہیں'' والی بات بالکل غلط ہے۔ دیکھئے قرآن کے آغاز ہی میں کس قدر اہتمام کے ساتھ کہا جا رہا ہے کہ ایمان صرف قرآن پر ہی نہیں' اس پر بھی ضروری ہے جو اس سے پہلے نازل کیا گیا۔ سورۃ النساء کوئی چھ ہجری میں جا کر نازل ہوئی ہے' اور اس کی آیت ۱۳۶ کے الفاظ ملاحظہ کیجیے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسول پر اور اُس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کی ہے اور ہر اُس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔''

چنانچہ تورات' انجیل' زبور اور صُحفِ ابراہیمؑ پر اجمالی ایمان کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ البتہ چونکہ ہم سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ان کتابوں میں تحریف ہو گئی ہے لہٰذا ان کتابوں کی کوئی شے قرآن پر حجت نہیں ہو گی۔ جو چیز قرآن سے ٹکرائے گی ہم اس کو ردّ

کر دیں گے اور ان کتابوں کی کسی شے کو دلیل کے طور پر نہیں لائیں گے۔ لیکن جہاں قرآن مجید کی کسی بات کی نفی نہ ہو رہی ہو وہاں ان سے استفادہ میں کوئی حرج نہیں۔ بہت سے حقائق ایسے ہیں جو ہمیں ان کتابوں ہی سے ملتے ہیں۔ مثلاً انبیاء علیہم السلام کے درمیان زمانی ترتیب (Chronological Order) ہمیں تورات سے ملتی ہے' جو قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن میں کبھی حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر بعد میں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پہلے آ جاتا ہے۔ یہاں تو کسی اور پہلو سے ترتیب آتی ہے' لیکن تورات میں ہمیں حضراتِ ابراہیم' اسحاق' یعقوب' انبیاءِ بنی اسرائیل موسیٰ اور عیسیٰ (علیٰ نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام) کی تاریخ ملتی ہے۔ اس اعتبار سے سابقہ کُتبِ سماویہ کی اہمیت پیش نظر رہنی چاہیے۔

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾ ''اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔''

یہاں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ باقی سب چیزوں کے لیے تو لفظ ایمان آیا ہے جبکہ آخرت کے لیے ''ایقان'' آیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کے عمل کے اعتبار سے سب سے زیادہ مؤثر شے ایمان بالآخرۃ ہے۔ اگر انسان کو یہ یقین ہے کہ آخرت کی زندگی میں مجھے اللہ کے حضور حاضر ہو کر اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے تو اس کا عمل صحیح ہوگا۔ لیکن اگر اس یقین میں کمی واقع ہو گئی تو توحید بھی محض ایک عقیدہ (Dogma) بن کر رہ جائے گی اور ایمان بالرسالت بھی بدعات کو جنم دے گا۔ پھر ایمان بالرسالت کے مظاہر یہ رہ جائیں گے کہ بس عید میلاد النبیؐ منا لیجیے اور نعتیہ اشعار کہہ دیجیے' اللہ اللہ خیر صلا۔ انسان کا عمل تو آخرت کے یقین کے ساتھ درست ہوتا ہے۔

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴﴾ کے الفاظ میں یہ مفہوم بھی ہے کہ ''آخرت پر انہی کا یقین ہے''۔ یہاں گویا حصر بھی ہے۔ اس اعتبار سے کہ یہودی بھی مدعی تھے کہ ہم آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہاں تضاد (contrast) دکھایا جا رہا ہے کہ آخرت پر یقین رکھنے والے تو یہ لوگ ہیں! تاویلِ خاص کے اعتبار سے یہ کہا جائے گا کہ یہ لوگ تمہاری نگاہوں کے سامنے موجود ہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کی تیرہ برس کی کمائی ہیں۔ جو انقلابِ نبویؐ کے اساسی منہاج یعنی تلاوتِ آیات' تزکیہ اور تعلیم کتاب وحکمت کا نتیجہ ہیں۔

آیت ۵ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۡ﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے ربّ کی طرف سے ہدایت پر ہیں''

وہ ابتدائی ہدایت بھی ان کے پاس تھی اور اس تکمیلی ہدایت یعنی قرآن پر بھی ان کا پورا یقین ہے' اور محمد ﷺ کا اتباع بھی وہ کر رہے ہیں۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵﴾ ''اور یہی وہ لوگ ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔''

''فلاح'' کا لفظ بھی قرآن مجید کی بہت اہم اصطلاح ہے۔ اس کا معنی ہے منزلِ مراد کو پہنچ جانا' کسی باطنی حقیقت کا عیاں ہو جانا۔ اس پر اِن شاء اللہ سورۃ المؤمنون کے شروع میں گفتگو ہوگی۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ فلاح پانے والے' کامیاب ہونے والے' منزلِ مراد کو پہنچنے والے اصل میں یہی لوگ ہیں۔ تاویل خاص کے اعتبار سے یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف اشارہ ہو گیا' جبکہ تاویلِ عام کے اعتبار سے ہر شخص کو بتا دیا گیا کہ اگر قرآن کی ہدایت سے مستفید ہونا ہے تو یہ اوصاف اپنے اندر پیدا کرو۔

آیت ۶ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶﴾ ''یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا (یعنی وہ لوگ کہ جو کفر پر اڑ گئے) ان کے لیے برابر ہے (اے محمد ﷺ) کہ آپ انہیں انذار فرمائیں یا نہ فرمائیں' وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔''

''اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا'' سے مراد یہاں وہ لوگ ہیں جو اپنے کفر پر اڑ گئے۔ اس کو ہم تاویل عام میں نہیں لے سکتے۔ اس لیے کہ اس صورت میں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جس شخص نے کسی بھی وقت کفر کیا اب وہ ہدایت پر آ ہی نہیں سکتا! یہاں یہ بات مراد نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مغالطہ کی بنا پر یا عدم توجہی کی بنا پر کفر میں ہے' حق اس پر واضح نہیں ہوا ہے تو انذار و تبشیر سے اسے فائدہ ہو جائے گا۔ آپ اسے وعظ و نصیحت کریں تو وہ اس کا اثر قبول کرے گا۔ لیکن جو لوگ حق کو حق سمجھنے اور پہچاننے کے باوجود محض ضد' ہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے یا تکبر اور حسد کی وجہ سے کفر پر اڑے رہے تو ان کی قسمت میں ہدایت نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کا معاملہ یہ ہے کہ اے نبی (ﷺ)! ان کے لیے برابر ہے خواہ آپؐ انہیں سمجھائیں یا نہ سمجھائیں' ڈرائیں یا نہ ڈرائیں' انذار فرمائیں یا نہ فرمائیں' وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اس لیے کہ سوتے کو تو جگایا جا سکتا ہے' جاگتے کو آپ کیسے جگائیں گے؟ یہ گویا مکّہ کے سرداروں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ ان کے دل اور دماغ گواہی دے چکے ہیں کہ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور قرآن ان پر اتمامِ حجت کر چکا ہے اور وہ مان چکے ہیں کہ قرآن کا مقابلہ ہم نہیں کر سکتے' یہ محمد (ﷺ) کا مکمل معجزہ ہے' اس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے۔

آیت ۷ ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰی سَمۡعِهِمۡ ؕ﴾ ''اللہ نے مہر کر دی ہے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر۔''

ایسا کیوں ہوا؟ ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر ابتدا ہی میں نہیں لگا دی گئی' بلکہ جب انہوں نے حق کو پہچاننے کے بعد رد کر دیا تو اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی اور ان کی سماعت پر بھی۔

﴿وَعَلٰۤی اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ ۫﴾ ''اور ان کی آنکھوں کے سامنے پردہ پڑ چکا ہے''

یہ مضمون سورۂ یٰسٓ کے شروع میں بہت شرح و بسط کے ساتھ دوبارہ آئے گا۔

﴿وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ۝۷﴾ ''اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

یہ دوسرے گروہ کا تذکرہ ہو گیا۔ ایک رکوع (کُل سات آیات) میں دو گروہوں کا ذکر سمیٹ لیا گیا۔ ایک وہ گروہ جس نے قرآن کریم کی دعوت سے صحیح صحیح استفادہ کیا' اُن میں طلب ہدایت کا مادہ موجود تھا' ان کی فطرتیں سلیم تھیں' ان کے سامنے دعوت آئی تو انہوں نے قبول کی اور قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔ وہ گلستانِ محمدیؐ کے گلہائے سرسبد ہیں۔ وہ شجرۂ قرآنی کے نہایت مبارک اور مقدس پھل ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس نے حق کو پہچان بھی لیا' لیکن اپنے تعصب یا ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس کو رد کر دیا۔ اُن کا ذکر بھی بہت اختصار کے ساتھ آ گیا۔ ان کا تفصیلی ذکر آپ کو مکّی سورتوں میں ملے گا۔ اب آگے تیسرے گروہ کا ذکر آ رہا ہے۔

آیات ۸ تا ۲۰

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّقُوۡلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ مَا هُمۡ بِمُؤۡمِنِیۡنَ ۘ﴿۸﴾ یُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَ
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ۚ وَ مَا یَخۡدَعُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡفُسَهُمۡ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۹﴾ فِیۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ
اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۢ بِمَا کَانُوۡا یَکۡذِبُوۡنَ ﴿۱۰﴾ وَ اِذَا قِیۡلَ لَهُمۡ لَا تُفۡسِدُوۡا فِی
الۡاَرۡضِ ۙ قَالُوۡۤا اِنَّمَا نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾ اَلَاۤ اِنَّهُمۡ هُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ وَ لٰکِنۡ لَّا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۲﴾

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾ مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ؕ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾

آیت ۸ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾﴾ ''اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے تو یہ ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر بھی اور یوم آخر پر بھی' مگر وہ حقیقت میں مؤمن نہیں ہیں۔''

یہاں ایک بات سمجھ لیجیے! اکثر و بیشتر مفسرین نے اس تیسری قسم (category) کے بارے میں یہی رائے قائم کی ہے کہ یہ منافقین کا تذکرہ ہے' اگرچہ یہاں لفظ منافق یا لفظِ نفاق نہیں آیا۔ لیکن مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اس کے بارے میں ایک رائے ظاہر کی ہے جو بڑی قیمتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں ایک کردار کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے' غور کرنے والے غور کر لیں' دیکھ لیں کہ وہ کس پر چسپاں ہو رہا ہے۔ اور جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں تو اِن میں شخصیات کی کردار نگاری کا یہ جو نقشہ کھینچا جا رہا ہے یہ بالفعل دو طبقات کے اوپر راست آ رہا تھا۔ ایک طبقہ علماءِ یہود کا تھا۔ وہ بھی کہتے تھے کہ ہم بھی اللہ کو مانتے ہیں' آخرت کو بھی مانتے ہیں۔ (اسی لیے یہاں رسالت کا ذکر نہیں ہے۔) وہ کہتے تھے کہ اگر سوا لاکھ نبی آئے ہیں تو ان سوا لاکھ کو تو ہم مانتے ہیں' بس ایک محمد (ﷺ) کو ہم نے نہیں مانا اور ایک عیسیٰ (علیہ السلام) کو نہیں مانا' تو ہمیں بھی تسلیم کیا جانا چاہیے کہ ہم مسلمان ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہاں جس انداز میں تذکرہ ہو رہا ہے اس سے ان کا کردار بھی جھلک رہا ہے اور روئے سخن بھی اُن کی طرف جا رہا ہے۔ مجھے یاد ہے دسویں جماعت کے زمانے میں دہلی میں مَیں نے جوتوں کی ایک دکان پر دیکھا تھا کہ ایک بہت بڑا جوتا لٹکایا ہوا تھا اور ساتھ لکھا تھا: Free to Whom it Fits. یعنی جس کے پاؤں میں یہ ٹھیک آ جائے وہ اسے مفت لے جائے! تو یہاں بھی ایک کردار کا نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔ اب یہ کردار جس کے اوپر بھی فٹ بیٹھ جائے وہ اس کا مصداق شمار ہوگا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا' زیادہ تر مفسرین کی رائے تو یہی ہے کہ یہ منافقین کا تذکرہ ہے' لیکن یہ کردار بعینہٖ یہود کے علماء پر بھی منطبق ہو رہا ہے۔ یہاں یہ بات بھی نوٹ کر لیجیے کہ مدینہ منورہ میں نفاق کا پودا' بلکہ صحیح تر الفاظ میں نفاق کا جھاڑ جھنکاڑ جو پروان چڑھا ہے وہ یہودی علماء کے زیر اثر پروان چڑھا ہے۔ جیسے جنگل کے اندر بڑے بڑے درخت بھی ہوتے ہیں اور ان کے نیچے جھاڑیاں بھی ہوتی ہیں۔ تو یہ نفاق کا جھاڑ جھنکاڑ دراصل یہودی علماء کا جو بہت بڑا پودا تھا اُس کے سائے میں پروان چڑھا ہے اور ان دونوں میں

معنوی ربط بھی موجود ہے۔

آیت ۹ ﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ﴾ ''وہ دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں اللہ کو اور اہلِ ایمان کو۔''

یُخٰدِعُوْنَ باب مفاعلہ ہے۔ اس باب کا خاصہ ہے کہ اس میں ایک کشمکش اور کشاکش موجود ہوتی ہے۔ لہٰذا میں نے اس کا ترجمہ کیا: ''وہ دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

﴿وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ ﴾ ''اور نہیں دھوکہ دے رہے مگر صرف اپنے آپ کو''

یہ بات یقینی ہے کہ اپنے آپ کو تو دھوکہ دے رہے ہیں' لیکن یہ اللہ' اُس کے رسولؐ کو اور اہلِ ایمان کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۴۲ میں منافقین کے بارے میں یہی بات بڑے واضح انداز میں بایں الفاظ آئی ہے: ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ﴾ ''یقیناً منافقین اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں' حالانکہ اللہ ہی انہیں دھوکے میں ڈالنے والا ہے۔''

﴿وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۝۹﴾ ''اور انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔''

یہ بات بہت اچھی طرح نوٹ کر لیجیے کہ منافقین کی بھی اکثریت وہ تھی جنہیں اپنے نفاق کا شعور نہیں تھا۔ وہ اپنے تئیں خود کو مسلمان سمجھتے تھے۔ وہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کہتے تھے کہ انہوں نے خواہ مخواہ اہلِ مکہ کے ساتھ لڑائی مول لے لی ہے' اس کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں امن کے ساتھ رہنا چاہیے اور امن و آشتی کے ماحول میں ان سے بات کرنی چاہیے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم خیر خواہ ہیں' ہم بھلی بات کہہ رہے ہیں' جبکہ یہ بیوقوف لوگ ہیں۔ دیکھتے نہیں کہ کس سے ٹکرا رہے ہیں! ہاتھ میں اسلحہ نہیں ہے اور لڑائی کے لیے جا رہے ہیں۔ چنانچہ یہ تو بیوقوف ہیں۔ اپنے بارے میں وہ سمجھتے تھے کہ ہم تو بڑے مخلص ہیں۔ جان لیجیے کہ منافقین میں یقیناً بعض لوگ ایسے بھی تھے کہ جو اسلام میں داخل ہی دھوکہ دینے کی خاطر ہوتے تھے اور اُن پر پہلے دن سے یہ واضح ہوتا تھا کہ ہم مسلمان نہیں ہیں' ہم نے مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لیے اسلام کا محض لبادہ اوڑھا ہے۔ ایسے منافقین کا ذکر سورۂ آلِ عمران کی آیت ۷۲ میں آئے گا۔ لیکن اکثر و بیشتر منافقین دوسری طرح کے تھے' جنہیں اپنے نفاق کا شعور حاصل نہیں تھا۔

آیت ۱۰ ﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ﴾ ''اُن کے دلوں میں ایک روگ ہے''

یہ روگ اور بیماری کیا ہے؟ ایک لفظ میں اس کو ''کردار کی کمزوری'' (weakness of character) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ایک شخص وہ ہوتا ہے جو حق کو حق سمجھ کر قبول کر لیتا ہے اور پھر ''ہر چہ باداباد'' (جو ہو سو ہو) کی کیفیت کے ساتھ اس کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کو تیار ہو جاتا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے جو حق کو پہچان لینے کے باوجود رد کر دیتا ہے۔ اسے ''کافر'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ ایک شخص وہ بھی ہے جو حق کو حق پہچان کر آیا تو سہی' لیکن کردار کی کمزوری کی وجہ سے اس کی قوتِ ارادی کمزور ہے۔ ایسے لوگ آخرت بھی چاہتے ہیں لیکن دنیا بھی ہاتھ سے دینے کے لیے تیار نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ یہاں کا بھی کوئی نقصان نہ ہو اور آخرت کا بھی سارا بھلا ہمیں مل جائے۔ درحقیقت یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے بارے میں کہا گیا کہ ان کے دلوں میں ایک روگ ہے۔

﴿فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ﴾ ''تو اللہ نے ان کے روگ میں اضافہ کر دیا۔''

یہ اللہ کی سُنّت ہے۔ آپ حق پر چلنا چاہیں تو اللہ تعالیٰ حق کا راستہ آپ پر آسان کر دے گا' لیکن اگر آپ برائی کی طرف جانا چاہیں تو بڑی سے بڑی بُرائی آپ کے لیے ہلکی ہوتی چلی جائے گی۔ آپ خیال کریں گے کہ کوئی خاص بات نہیں' جب یہ کر لیا تو اب یہ بھی کر گزرو اور اگر کوئی بین بین لٹکنا چاہے تو اللہ اس کو اُسی راہ پر چھوڑ دیتا ہے۔ ٹھیک ہے' وہ سمجھتے ہیں ہم کامیاب ہو رہے ہیں کہ ہم نے

مسلمانوں کو بھی دھوکہ دے لیا' وہ ہمیں مسلمان سمجھتے ہیں اور یہودیوں کو بھی دھوکہ دے لیا' وہ سمجھتے ہیں کہ ہم اُن کے ساتھی ہیں۔ تو ان کا یہ سمجھنا کہ ہم کامیاب ہو رہے ہیں' بالکل غلط ہے۔ حقیقت میں یہ کامیابی نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ نے وہ تباہ کن راستہ ان کے لیے آسان کر دیا ہے جو انہوں نے خود منتخب کیا تھا۔ ان کے دلوں میں جو روگ موجود تھا اللہ نے اس میں اضافہ فرما دیا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ ''اور ان کے لیے تو دردناک عذاب ہے''

اوپر کفار کے لیے الفاظ آئے تھے: ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷﴾ اور یہاں عَذَابٌ اَلِيْمٌ کا لفظ آیا ہے کہ اُن کے لیے دردناک اور المناک عذاب ہے۔

﴿بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝۱۰﴾ ''بسبب اس جھوٹ کے جو وہ بول رہے تھے۔''

آیت ۱۱ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ ''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ مت فساد کرو زمین میں''

اس سے مراد یہ ہے کہ جب تم نے محمد ﷺ کو اللہ کا رسول مان لیا تو اب ان کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرو' انؐ کے پیچھے چلو۔ انؐ کا حکم ہے تو جنگ کے لیے نکلو۔ انؐ کی طرف سے تقاضا آتا ہے تو مال پیش کرو۔ اور اگر تم اس سے کتراتے ہو تو پھر جماعتی زندگی کے اندر فتنہ و فساد پھیلا رہے ہو۔

﴿قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝۱۱﴾ ''وہ کہتے ہیں ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔''

ہم تو صلح کرانے والے ہیں۔ ہماری نظر میں یہ لڑنا بھڑنا کوئی اچھی بات نہیں ہے' ٹکراؤ اور تصادم کوئی اچھے کام تھوڑے ہی ہیں۔ بس لوگوں کو ٹھنڈے ٹھنڈے دعوت دیتے رہو' جو چاہے قبول کر لے اور جو چاہے رد کر دے۔ یہ خواہ مخواہ دشمن سے ٹکرانا اور جنگ کرنا کس لیے؟ اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے قربانیاں دینے' مصیبتیں جھیلنے اور مشقتیں برداشت کرنے کے مطالبے کاہے کے لیے؟

آیت ۱۲ ﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ حقیقت میں یہی لوگ مفسد ہیں' مگر انہیں شعور نہیں ہے۔''

یہی تو ہیں جو فساد پھیلانے والے ہیں۔ اس لیے کہ محمد ﷺ کی دعوت تو زمین میں اصلاح کے لیے ہے۔ اس اصلاح کے لیے کچھ آپریشن کرنا پڑے گا۔ اس لیے کہ مریض اس درجے کو پہنچ چکا ہے کہ آپریشن کے بغیر اس کی شفا ممکن نہیں ہے۔ اب اگر تم اس آپریشن کے راستے میں رکاوٹ بنتے ہو تو درحقیقت تم فساد مچا رہے ہو' لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں۔ آیت کے آخری الفاظ ﴿وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝۱۲﴾ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ شعوری نفاق اور شے ہے' جبکہ یہاں سارا تذکرہ غیر شعوری نفاق کا ہو رہا ہے۔

آیت ۱۳ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ﴾ ''اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ' جس طرح دوسرے لوگ ایمان لائے ہیں''

آخر دیکھو' یہ دوسرے اہلِ ایمان ہیں' جب بلاوا آتا ہے تو فوراً لبیک کہتے ہوئے حاضر ہوتے ہیں' جبکہ تم نے اور ہی روش اختیار کر رکھی ہے۔

﴿قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ﴾ ''وہ کہتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جیسے یہ بیوقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟''

منافقین سچے اہلِ ایمان کے بارے میں کہتے تھے کہ انہیں تو اپنے نفع کی فکر ہے نہ نقصان کی' نہ خطرات کا کوئی خیال ہے نہ

اندیشوں کا کوئی گمان۔ جان' مال اور اولاد کی کوئی پروا نہیں۔ یہ گھر بار کو چھوڑ کر آ گئے ہیں' اپنے بال بچے کفارِ مکہ کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے ہیں کہ سردارانِ قریش اُن کے ساتھ جو چاہیں سلوک کریں' تو یہ تو بیوقوف لوگ ہیں۔ (آج کل آپ ایسے لوگوں کو fanatics کہتے ہیں) بھئی دیکھ بھال کر چلنا چاہیے' دائیں بائیں دیکھ کر چلنا چاہیے۔ اپنے نفع و نقصان کا خیال کر کے چلنا چاہیے۔ ٹھیک ہے' اسلام دینِ حق ہے' لیکن بہرحال اپنی اور اپنے اہل و عیال کی مصلحتوں کو بھی دیکھنا چاہیے۔ یہ لوگ تو معلوم ہوتا ہے بالکل دیوانے اور fanatics ہو گئے ہیں۔

﴿اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۳﴾ ''آگاہ ہو جاؤ کہ وہی بیوقوف ہیں' لیکن انہیں علم نہیں۔''

وہ صادق الایمان جو ایمان کے ہر تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہر وقت حاضر ہیں' ان سے بڑا عقل مند اور ان سے بڑا سمجھ دار کوئی نہیں۔ انہوں نے یہ جان لیا ہے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے' یہ زندگی تو عارضی ہے' تو اگر کل کے بجائے آج ختم ہو جائے یا ابھی ختم ہو جائے تو کیا فرق پڑے گا؟ یہاں سے جانا تو ہے' آج نہیں تو کل' کل نہیں تو پرسوں' جانا تو ہے۔ تو عقل تو ان کے اندر ہے۔

آیت ۱۴ ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ﴾ ''اور جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان رکھتے ہیں۔''

عام یہودی بھی کہتے تھے کہ ہم بھی تو آخر اللہ کو اور آخرت کو مانتے ہیں' جبکہ منافق تو رسولؐ کو بھی مانتے تھے۔

﴿وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ﴾ ''اور جب یہ خلوت میں ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس''

یہاں ''شیاطین'' سے مراد یہود کے علماء بھی ہو سکتے ہیں اور منافقین کے سردار بھی۔ عبداللہ بن اُبی منافقینِ مدینہ کا سردار تھا۔ اگر وہ کبھی انہیں ملامت کرتا کہ معلوم ہوتا ہے تم تو بالکل پوری طرح سے مسلمانوں میں شامل ہی ہو گئے ہو' تمہیں کیا ہو گیا ہے تم محمد (ﷺ) کی ہر بات مان رہے ہو' تو اب انہیں اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے کہنا پڑتا تھا کہ نہیں نہیں' ہم تو مسلمانوں کو بیوقوف بنا رہے ہیں' ہم ان سے ذرا تمسخر کر رہے ہیں' ہم آپ ہی کے ساتھ ہیں' آپ فکر نہ کریں۔ منافق تو ہوتا ہی دورخا ہے۔ ''نفق'' کہتے ہیں سرنگ کو' جس کے دو راستے ہوتے ہیں۔ ''نافقاء'' گوہ کے بل کو کہا جاتا ہے۔ گوہ اپنے بل کے دو منہ رکھتا ہے کہ اگر کُتا شکار کے لیے ایک طرف سے داخل ہو جائے تو وہ دوسری طرف سے نکل بھاگے۔ تو منافق بھی ایسا شخص ہے جس کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ سورۃ النساء میں منافقین کے بارے میں کہا گیا ہے: ﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ﴾ (آیت ۱۴۳) یعنی کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں' مذبذب ہو کر رہ گئے ہیں۔ نہ اِدھر کے ہیں نہ اُدھر کے ہیں۔

لفظ ''شَیْطٰن'' کے بارے میں دو رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا مادہ ''ش ط ن'' ہے اور دوسری یہ کہ یہ ''ش و ط'' مادہ سے ہے۔ شَطَنَ کے معنی ہیں تَبَعَّدَ یعنی بہت دور ہو گیا۔ پس شیطان سے مراد ہے جو اللہ کی رحمت سے بہت دور ہو گیا۔ جبکہ شَاطَ یَشُوْطُ کے معنی ہیں اِحْتَرَقَ غَضَبًا وَحَسَدًا یعنی کوئی شخص غصے اور حسد کے اندر جل اٹھا۔ اس سے فَعْلَان کے وزن پر ''شیطان'' ہے' یعنی وہ جو حسد اور غضب کی آگ میں جل رہا ہے۔ چنانچہ ایک تو شیطان وہ ہے جو جنّات میں سے ہے' جس کا نام پہلے ''عزازیل'' تھا' اب ہم اسے ابلیس کے نام سے جانتے ہیں۔ پھر یہ کہ دنیا میں جو بھی اُس کے پیروکار ہیں اور اس کے مشن میں شریک کار ہیں' خواہ انسانوں میں سے ہوں یا جنّوں میں سے' وہ بھی شیاطین ہیں۔ اسی طرح اہلِ کفر اور اہلِ زیغ کے جو بڑے بڑے سردار ہوتے ہیں ان کو بھی شیاطین سے تعبیر کیا گیا۔ آیت زیر مطالعہ میں شیاطین سے یہی سردار مراد ہیں۔

﴿قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝۱۴﴾ ''کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے تو محض مذاق کر رہے ہیں۔''

جب وہ علیحدگی میں اپنے شیطانوں یعنی سرداروں سے ملتے ہیں تو اُن سے کہتے ہیں کہ اصل میں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں' ان مسلمانوں کو تو ہم بیوقوف بنا رہے ہیں' ان سے استہزاء اور تمسخر کر رہے ہیں جو ان کے سامنے ''اٰمَنَّا'' کہہ دیتے ہیں کہ ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔

آیت ۱۵ ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ۝۱۵﴾ ''درحقیقت اللہ اُن کا مذاق اڑا رہا ہے اور اُن کو ان کی سرکشی میں ڈھیل دے رہا ہے کہ وہ اپنے عقل کے اندھے پن میں بڑھتے چلے جائیں۔''

اللہ تعالیٰ سرکشوں کی رسّی دراز کرتا ہے۔ کوئی شخص سرکشی کے راستے پر چل پڑے تو اللہ تعالیٰ اسے فوراً نہیں پکڑتا' بلکہ اسے ڈھیل دیتا ہے کہ چلتے جاؤ جہاں تک جانا چاہتے ہو۔ تو ان کی بھی اللہ تعالیٰ رسّی دراز کر رہا ہے' لیکن یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اصل میں مذاق تو اللہ کے نزدیک اُن کا اڑ رہا ہے۔

لفظ ''يَعْمَهُوْنَ'' عقل کے اندھے پن کے لیے آیا ہے۔ اس کا مادہ ''ع م ھ'' ہے۔ آگے آیت ۱۸ میں لفظ ''عُمْیٌ'' آ رہا ہے جو ''ع م ی'' سے ہے۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ''عَمِهَ يَعْمَهُ'' بصیرت سے محرومی کے لیے آتا ہے اور ''عَمِیَ يَعْمٰی'' بصارت سے محرومی کے لیے۔

آیت ۱۶ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ہدایت کے عوض گمراہی خرید لی ہے۔''

یہ بڑا پیارا اندازِ بیان ہے۔ ان کے سامنے دونوں options تھے۔ ایک شخص نے گمراہی کو چھوڑا اور ہدایت لے لی۔ اسے اس کی بھاری قیمت دینا پڑی۔ اسے تکلیفیں اٹھانی پڑیں' آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا' قربانیاں دینا پڑیں۔ اس نے یہ سب کچھ منظور کیا اور ہدایت لے لی' جبکہ ایک شخص نے ہدایت دے کر گمراہی لے لی ہے۔ آسانی تو ہو گئی' فوری تکلیف سے تو بچ گئے' دونوں طرف سے اپنے مفادات کو بچا لیا' لیکن حقیقت میں سب سے زیادہ گھاٹے کا سودا یہی ہے۔

﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝۱۶﴾ ''سو نافع نہ ہوئی ان کی تجارت اُن کے حق میں اور نہ ہوئے راہ پانے والے۔''

''رَبِحَ يَرْبَحُ'' کے معنی ہیں تجارت وغیرہ میں نفع اٹھانا' جو ایک صحیح اور جائز نفع ہے' جبکہ ''ر ب و'' مادہ سے رَبَا يَرْبُوْ کے معنی بھی مال میں اضافہ اور بڑھوتری کے ہیں' لیکن وہ حرام ہے۔ تجارت کے اندر جو نفع ہو جائے وہ ''رِبح'' ہے' جو جائز نفع ہے اور اپنا مال کسی کو قرض دے کر اُس سے سود وصول کرنا ''رِبا'' ہے جو حرام ہے۔

اب یہاں دو بڑی پیاری تمثیلیں آ رہی ہیں۔ پہلی تمثیل کفار کے بارے میں ہے اور دوسری تمثیل منافقین کے بارے میں۔

آیت ۱۷ ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ﴾ ''اُن کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی۔''

﴿فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ﴾ ''پھر جب اُس آگ نے سارے ماحول کو روشن کر دیا''

﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾ ''تو اللہ نے اُن کا نورِ بصارت سلب کر لیا''

﴿وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴾ ''اور چھوڑ دیا ان کو ان اندھیروں کے اندر کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔''

یہاں ایک شبِ تاریک کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں ؎

اندھیری شب ہے جُدا اپنے قافلے سے ہے تُو
ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل!

اندھیری شب ہے۔ قافلہ بھٹک رہا ہے۔ کچھ لوگ بڑی ہمت کرتے ہیں کہ اندھیرے میں بھی اِدھر اُدھر سے لکڑیاں جمع کرتے ہیں اور آگ روشن کر دیتے ہیں۔ لیکن عین اُس وقت جب آگ روشن ہوتی ہے تو کچھ لوگوں کی بینائی سلب ہو جاتی ہے۔ پہلے وہ اندھیرے میں اس لیے تھے کہ خارج میں روشنی نہیں تھی۔ اب بھی وہ اندھیرے ہی میں رہ گئے کہ خارج میں تو روشنی آ گئی مگر ان کے اندر کی روشنی گُل ہو گئی' ان کی بصارت سلب ہو گئی۔ یہ مثال ہے اُن کُفار کی جو اسلام کی روشنی پھیلنے کے باوجود اس سے محروم رہے' حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد سے پہلے ہر سُو تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی حقیقت واضح نہیں تھی۔ قافلۂ انسانیت اندھیری شب میں بھٹک رہا تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور انہوں نے آگ روشن کر دی۔ اس طرح ہدایت واضح ہو گئی۔ لیکن کچھ ضد' تعصب' تکبر یا حسد کی بنیاد پر کچھ لوگوں کی اندر کی بینائی زائل ہو گئی۔ چنانچہ وہ تو ویسے کے ویسے بھٹک رہے ہیں۔ جیسے پہلے اندھیرے میں تھے ویسے ہی اب بھی اندھیرے میں ہیں۔ روشنی میں آنے والے تو وہ ہیں جن کا ذکر سب سے پہلے ''المُتّقین'' کے نام سے ہوا ہے۔

آیت ۱۸ ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴾ ''یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں' سو اب یہ نہیں لوٹیں گے۔''

اَصَمُّ بہرے کو کہتے ہیں' صُمٌّ اس کی جمع ہے' اَبْکَمُ گونگے کو کہا جاتا ہے' بُکْمٌ اس کی جمع ہے۔ اَعْمٰی اندھے کو کہتے ہیں' عُمْیٌ اس کی جمع ہے۔ فرمایا کہ یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں' اب یہ لوٹنے والے نہیں ہیں۔ یہ کون ہیں؟ ابوجہل' ابولہب' ولید بن مغیرہ اور عُقبہ بن ابی مُعَیط سب کے سب ابھی زندہ تھے جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں۔ یہ سب تو غزوۂ بدر میں واصلِ جہنم ہوئے جو سن ۲ ہجری میں ہوا۔ تو یہ لوگ اس مثال کا مصداقِ کامل تھے۔ آگے اب دوسری مثال بیان کی جا رہی ہے۔

آیت ۱۹ ﴿اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ﴾ ''یا اُن کی مثال ایسی ہے جیسے بڑے زور کی بارش برس رہی ہے آسمان سے' اُس میں اندھیرے بھی ہیں اور گرج اور بجلی (کی چمک) بھی۔''

﴿يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ﴾ ''یہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں کے اندر ٹھونسے لیتے ہیں مارے کڑک کے' موت کے ڈر سے۔''

یعنی اس ہیبت ناک کڑک سے کہیں اُن کی جانیں نہ نکل جائیں۔

﴿وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴾ ''اور اللہ ایسے کافروں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

وہ ان منکرینِ حق کو ہر طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہے' یہ بچ کر کہاں جائیں گے؟

آیت ۲۰ ﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۭ﴾ ''قریب ہے کہ بجلی اُچک لے ان کی آنکھیں۔''

﴿كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ﴾ ''جب چمکتی ہے ان پر تو چلنے لگتے ہیں اس کی روشنی میں۔''

جونہی انہیں ذرا روشنی محسوس ہوتی ہے اور دائیں بائیں کچھ نظر آتا ہے تو کچھ دور چل لیتے ہیں۔

﴿وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا﴾ ''اور جب ان پر تاریکی طاری ہو جاتی ہے تو کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں۔''

یہ ایک نقشہ کھینچا گیا ہے کہ ایک طرف بارش ہو رہی ہے۔ یعنی قرآن مجید آسمان سے نازل ہو رہا ہے۔ بارش کو قرآن مجید ''مَاءً مُّبٰرَكًا'' قرار دیتا ہے اور یہ خود ''كِتٰبٌ مُّبٰرَكٌ'' ہے۔ لیکن یہ کہ اس کے ساتھ کڑکے ہیں' گرج ہے' کفر سے مقابلہ ہے' کفر کی طرف سے دھمکیاں ہیں' اندیشے اور خطرات ہیں' امتحانات اور آزمائشیں ہیں۔ چنانچہ منافقین کا معاملہ یہ ہے کہ ذرا کہیں حالات کچھ بہتر ہوئے' کچھ breething space ملی تو مسلمانوں کے شانہ بشانہ تھوڑا سا چل لیے کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ جب وہ دیکھتے کہ حالات کچھ پُرسکون ہیں' کسی جنگ کے لیے بلایا نہیں جا رہا ہے تو بڑھ چڑھ کر باتیں کرتے اور اپنے ایمان کا اظہار بھی کرتے' لیکن جیسے ہی کوئی آزمائش آتی ٹھٹک کر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ﴾ ''اور اللہ چاہتا تو ان کی سماعت اور بصارت کو سلب کر لیتا۔''

لیکن اللہ کا قانون یہی ہے کہ وہ فوری گرفت نہیں کرتا۔ اُس نے انسان کو ارادے اور عمل کی آزادی دی ہے۔ تم اگر مؤمنِ صادق بن کر رہنا چاہتے ہو تو اللہ تعالیٰ اُس روش کو تمہارے لیے آسان کر دے گا۔ اور اگر تم نے اپنے تعصب یا تکبر کی وجہ سے کفر کا راستہ اختیار کیا تو اللہ اُسی کو تمہارے لیے کھول دے گا۔ اور اگر تم بیچ میں لٹکنا چاہتے ہو ﴿لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ﴾ تو لٹکتے رہو۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو جبراً حق پر لائے گا اور نہ ہی کسی کو جبراً باطل کی راہ پر لے کر جائے گا۔ اس لیے کہ اگر جبر کا معاملہ ہو تو پھر امتحان کیسا؟ پھر تو جزا و سزا کا تصور غیر منطقی اور غیر معقول ٹھہرتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٠﴾﴾ ''یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

سورۃ البقرۃ کے یہ ابتدائی دو رکوع اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں انسانی شخصیتوں کی تین گروہوں میں تقسیم کر دی گئی ہے' اور تاویلِ عام ذہن میں رکھیے کہ جب بھی کوئی دعوتِ حق اُٹھے گی' اگر وہ واقعتاً کُل کی کُل حق کی دعوت ہو اور اُس میں انقلابی رنگ ہو کہ باطل سے پنجہ آزمائی کر کے اسے نیچا دکھانا ہے اور حق کو غالب کرنا ہے' تو یہ تین قسم کے افراد لازماً وجود میں آ جائیں گے۔ ان کو پہچاننا اور ان کے کردار کے پیچھے جو اصل پس منظر ہے اس کو جاننا بہت ضروری ہے۔

آیات ۲۱ تا ۲۹

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٢١﴾ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ
الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۖ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا
تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٢﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ
مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٢٣﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا
النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٤﴾ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۖ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا
مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ۖ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْىٖٓ

اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا ؕ وَ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِیۡنَ یَنۡقُضُوۡنَ عَہۡدَ اللّٰہِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِیۡثَاقِہٖ ۪ وَ یَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖۤ اَنۡ یُّوۡصَلَ وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾ کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ وَ کُنۡتُمۡ اَمۡوَاتًا فَاَحۡیَاکُمۡ ۚ ثُمَّ یُمِیۡتُکُمۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡکُمۡ ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۲۸﴾ ہُوَ الَّذِیۡ خَلَقَ لَکُمۡ مَّا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا ۚ ثُمَّ اسۡتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىہُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۹﴾ ع

سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع میں قرآن کی دعوت کا خلاصہ آ گیا ہے کہ قرآن اپنے مخاطب کو کیا ماننے کی دعوت دیتا ہے اور اُس کی پکار کیا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' سورۃ البقرۃ کے نزول سے قبل دو تہائی قرآن نازل ہو چکا تھا۔ ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے وہ قرآن بعد میں آئے گا' لیکن ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے وہ پس منظر میں موجود ہے۔ لہٰذا سورۃ البقرۃ کے پہلے دو رکوعوں میں مکی قرآن کے مباحث کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے اور تیسرے رکوع میں قرآن مجید کی دعوت کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب آ گیا ہے' جبکہ قرآن مجید کا فلسفہ اور بعض نہایت اہم موضوعات و مسائل کا خلاصہ چوتھے رکوع میں بیان ہوا ہے۔ اب ہم تیسرے رکوع کا مطالعہ کر رہے ہیں:

آیت ۲۱ ﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّکُمُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس ربّ (مالک) کی جس نے تم کو پیدا کیا اور تم سے پہلے جتنے لوگ گزرے ہیں (انہیں بھی پیدا کیا) تاکہ تم بچ سکو۔''

یہ قرآن کی دعوت کا خلاصہ ہے اور یہی تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام کی دعوت تھی۔ سورۃ الاعراف اور سورۂ ہود میں ایک ایک رسول کا نام لے کر اس کی دعوت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: ﴿یٰقَوۡمِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ مَا لَکُمۡ مِّنۡ اِلٰہٍ غَیۡرُہٗ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو' تمہارا کوئی اور الٰہ اُس کے سوا نہیں ہے''۔ سورۃ الشعراء میں رسولوں کی دعوت کے ضمن میں بار بار یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۱۰﴾﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔ سورۂ نوح میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت ان الفاظ میں بیان ہوئی: ﴿اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۳﴾﴾ ''کہ اللہ کی بندگی کرو' اس کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو!''

پھر از روئے قرآن یہی عبادتِ ربّ انسان کی غایتِ تخلیق ہے: ﴿وَ مَا خَلَقۡتُ الۡجِنَّ وَ الۡاِنۡسَ اِلَّا لِیَعۡبُدُوۡنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت) ''اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی صرف اس لیے کیا ہے کہ ہماری بندگی کریں''۔ چنانچہ تمام رسولوں کی دعوت یہی ''عبادتِ ربّ'' ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی یہی ہے' لیکن یہاں ایک بہت بڑا فرق واقع ہو گیا ہے۔ وہ یہ کہ باقی تمام رسولوں کی دعوت کے ضمن میں صیغۂ خطاب ''یٰقَوۡمِ'' ہے۔ یعنی ''اے میری قوم کے لوگو!'' جبکہ یہاں صیغۂ خطاب ہے: ''یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ'' یعنی ''اے بنی نوعِ انسان!'' معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام رسول علیہم السلام صرف اپنی اپنی قوموں کی طرف آئے' جبکہ پیغمبرِ آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری اور کامل رسول ہیں جن کی دعوت آفاقی ہے۔

عام طور پر لوگ جو غلط راستہ اختیار کر لیتے ہیں اُس پر اس دلیل سے جمے رہتے ہیں کہ ہمارے آباء و اجداد کا راستہ یہی تھا۔

﴿الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ کے الفاظ میں اس دلیل کا ردّ بھی موجود ہے کہ جیسے تم مخلوق ہو ویسے ہی تمہارے آباء و اجداد بھی مخلوق تھے' جیسے تم خطا کر سکتے ہو اسی طرح وہ بھی تو خطا کر سکتے تھے۔ لہٰذا یہ نہ دیکھو کہ آباء و اجداد کا راستہ کیا تھا' بلکہ یہ دیکھو کہ حق کیا ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''تاکہ تم بچ سکو۔''

یعنی دنیا میں افراط و تفریط کے دھکوں سے بچ سکو اور آخرت میں اللہ کے عذاب سے بچ سکو۔ ان دونوں سے اگر بچنا ہے تو اللہ کی بندگی کی روش اختیار کرو۔

آیت ۲۲ ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪﴾ ''جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنا دیا اور آسمان کو چھت بنا دیا۔''

﴿وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ ''اور آسمان سے پانی برسایا''

﴿فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ﴾ ''پھر اُس (پانی) کے ذریعے سے (زمین سے) ہر طرح کی پیداوار نکال کر تمہارے لیے رزق بہم پہنچایا۔''

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''تو ہرگز اللہ کے مدِمقابل نہ ٹھہراؤ جانتے بوجھتے۔''

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جب تم بھی مانتے ہو کہ اس کائنات کا خالق اللہ کے سوا کوئی نہیں' تو پھر اس کے شریک کیوں ٹھہراتے ہو؟ اہلِ عرب یہ بات مانتے تھے کہ کائنات کا خالق صرف اور صرف اللہ ہے' البتہ جو اُن کے دیوی دیوتا تھے انہیں وہ سمجھتے تھے کہ یہ اللہ کے اَوتار ہیں یا اللہ کے ہاں بہت پسندیدہ ہیں' اُس کے محبوب ہیں' اُس کے اولیاء ہیں' اُس کی بیٹیاں ہیں' لہٰذا یہ شفاعت کریں گے تو ہمارا بیڑا پار ہو جائے گا۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ جب تم یہ مانتے ہو کہ کائنات کا خالق ایک اللہ ہے' وہی اس کا مدبّر ہے تو اب کسی کو اس کا مدِمقابل نہ بناؤ۔

اَنْدَاد ''نِدّ'' کی جمع ہے' اس کا معنی مدِمقابل ہے۔ خطبۂ جمعہ میں آپ نے یہ الفاظ سنے ہوں گے: ''لَا ضِدَّ لَهٗ وَلَا نِدَّ لَهٗ''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا: اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ))[1] ''یہ کہ تو اس کا کوئی مدِمقابل ٹھہرائے حالانکہ اُس نے تجھے پیدا کیا ہے''۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا کسی درجے میں کوئی شریک یا مدِمقابل نہیں ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ اُمت کو اس درجے توحید کی باریکیوں تک پہنچا کر گئے ہیں کہ ایسے تصورات کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے۔ ایک صحابیؓ نے آپ ﷺ کے سامنے ایسے ہی کہہ دیا: ''مَاشَاءَ اللّٰهُ وَمَا شِئْتَ'' یعنی جو اللہ چاہے اور جو آپؐ چاہیں۔ آپ ﷺ نے انہیں فوراً ٹوک دیا اور فرمایا: ((اَجَعَلْتَنِیْ لِلّٰهِ نِدًّا؟ مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ)) ''کیا تو نے مجھے اللہ کا مدِمقابل بنا دیا ہے؟ (بلکہ وہی ہوگا) جو تنہا اللہ چاہے۔''[2]

۱۔ صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قولہ تعالیٰ: ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب کون الشرک اقبح الذنوب... الخ۔

۲۔ ان الفاظ میں یہ حدیث علامہ محمد بن عبدالوہاب نے ''کتاب التوحید'' میں نسائی کے حوالے سے درج کی ہے۔ مسند احمد میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((اَجَعَلْتَنِیْ وَاللّٰهَ عَدْلًا؟)) کیا تو نے مجھے اور اللہ کو برابر کر دیا؟'' (مرتب)

اس کائنات میں مشیت صرف ایک ہستی کی چلتی ہے۔ کسی اور کی مشیت اس کی مشیت کے تابع پوری ہو جائے تو ہو جائے' لیکن مشیتِ مطلقہ صرف اُس کی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن حکیم میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (القصص:۵۶) ''(اے نبی ﷺ!) یقیناً آپ جسے چاہیں اُسے ہدایت نہیں دے سکتے' بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے''۔ اگر ہدایت کا معاملہ رسول اللہ ﷺ کے اختیار میں ہوتا تو ابوطالب دنیا سے ایمان لائے بغیر رخصت نہ ہوتے۔

ان دو آیتوں میں توحید کے دونوں پہلو بیان ہو گئے' توحیدِ نظری بھی اور توحیدِ عملی بھی۔ توحیدِ عملی یہ ہے کہ بندگی صرف اُسی کی ہے۔ اب اگلی آیت میں ایمان بالرسالت کا بیان آ رہا ہے۔

آیت ۲۳ ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا﴾ ''اور اگر تم واقعتاً شک میں ہو اس کلام کے بارے میں جو ہم نے اتارا اپنے بندے پر (کہ یہ ہمارا نازل کردہ ہے یا نہیں)''

﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ ''تو لے آؤ ایک ہی سورت اِس جیسی۔''

''تعارفِ قرآن'' میں یہ بات تفصیل سے بیان کی گئی تھی کہ قرآن حکیم میں ایسے پانچ مقامات ہیں جہاں پر یہ چیلنج موجود ہے کہ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ کلام محمد (ﷺ) کی اختراع ہے تو تم بھی مقابلے میں ایسا ہی کلام پیش کرو۔ سورۃ الطور کی آیات ۳۳'۳۴ میں ارشاد ہوا: ''کیا ان کا یہ کہنا ہے کہ اسے محمد (ﷺ) نے خود گھڑ لیا ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے کو تیار نہیں۔ پھر چاہیے کہ وہ اسی طرح کا کوئی کلام پیش کریں اگر وہ سچے ہیں''۔ سورۂ بنی اسراءیل (آیت ۸۸) میں فرمایا گیا کہ ''اگر تمام جن وانس جمع ہو کر بھی اس قرآن جیسی کتاب پیش کرنا چاہیں تو ہرگز نہیں کر سکیں گے' چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں''۔ پھر سورۂ ہود (آیت ۱۳) میں فرمایا گیا: ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہہ دیجیے (اگر پورے قرآن کی نظیر نہیں لا سکتے) تو ایسی دس سورتیں ہی گھڑ کر لے آؤ!'' اس کے بعد مزید نیچے اتر کر' جسے برسبیلِ تنزل کہا جاتا ہے' سورۂ یونس (آیت ۳۸) میں اس جیسی ایک ہی سورت بنا کر لے آنے کا چیلنج دیا گیا۔ مذکورہ بالا تمام مقامات مکی سورتوں میں ہیں۔ پہلی مدنی سورۃ ''البقرۃ'' کی آیت زیر مطالعہ میں یہی بات بڑے اہتمام کے ساتھ فرمائی گئی کہ اگر تم لوگوں کو اس کلام کے بارے میں کوئی شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے (کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے) تو اس جیسی ایک سورت تم بھی موزوں کر کے لے آؤ! یہ ایک سورت سورۃ العصر کے مساوی بھی ہو سکتی تھی' سورۃ الکوثر کے مساوی بھی ہو سکتی تھی۔

﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۲۳﴾ ''اور بلا لو اپنے سارے مددگاروں کو اللہ کے سوا اگر تم سچے ہو۔''

قریش کا خیال یہ تھا کہ شعراء کے پاس جن ہوتے ہیں' جو انہیں شعر سکھاتے ہیں' ورنہ عام آدمی تو شعر نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ فرمایا کہ جو بھی تمہارے مددگار ہوں' ایک اللہ کو چھوڑ کر جس کی بھی تم مدد حاصل کر سکتے ہو' جنات ہوں یا انسان ہوں' خطیب ہوں' شعراء ہوں یا ادیب ہوں' ان سب کو جمع کر لو اور اس قرآن جیسی ایک ہی سورت بنا کر لے آؤ' اگر تم سچے ہو۔

قرآن کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے اندر جھانکنے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں گویا آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ کہا جا رہا ہے کہ حقیقت میں تمہیں اس قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے' یہ تو تم محض بات بنا رہے ہو۔ اگر تمہیں واقعتاً شک ہے' اگر تم

اپنے دعوے میں سچے ہو تو آؤ میدان میں اور اس جیسی ایک ہی سورت بنا لاؤ!

آیت ۲۴ ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ ''پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو اور ہرگز نہ کر سکو گے!''

ذرا انداز دیکھئے' کیسا تحدی اور چیلنج کا ہے! اور یہ چیلنج اللہ کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ یہ انداز دنیا کی کسی کتاب کا نہیں ہے' یہ دعویٰ صرف قرآن کا ہے۔ کیسا دوٹوک انداز ہے: ''پھر اگر تم نہ کر پاؤ' اور تم ہرگز نہیں کر پاؤ گے۔''

﴿فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ﴾ ''تو پھر بچو اُس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے انسان اور پتھر۔''

جہنم کے ایندھن کے طور پر پتھروں کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے۔ اس کے دو امکانات ہیں۔ ایک تو یہ کہ آپ کو معلوم ہے پتھر کے کوئلے کی آگ عام لکڑی کے کوئلے کے مقابلے میں بڑی سخت ہوتی ہے' لہٰذا جہنم کی آگ بہت بڑے بڑے پتھروں سے دہکائی جائے گی۔ دوسرے یہ کہ مشرکین نے جو معبود تراش رکھے تھے وہ پتھر کے ہوتے تھے۔ مشرکین کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ تمہارے ساتھ تمہارے ان معبودوں کو بھی جہنم میں جھونکا جائے گا تاکہ تمہاری حسرت کے اندر اضافہ ہو کہ یہ ہیں وہ معبودانِ باطل جن سے ہم دعائیں مانگا کرتے تھے' جن کے سامنے ماتھے ٹیکتے تھے' جن کے سامنے ڈنڈوت کرتے تھے' جن کو چڑھاوے چڑھاتے تھے!

﴿اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ۝۲۴﴾ ''تیار کی گئی ہے کافروں کے لیے۔''

یہ جہنم منکرینِ حق کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اب یہاں گویا ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت کے بعد ایمان بالآخرت کا ذکر آ گیا۔

آیت ۲۵ ﴿وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اور بشارت دے دیجیے (اے نبی ﷺ!) ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے''

﴿اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ﴾ ''کہ اُن کے لیے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے ندیاں بہتی ہوں گی۔''

یہ لفظی ترجمہ ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ اس لیے کہ فطری باغ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جس میں ذرا اُونچائی پر درخت لگے ہوئے ہیں اور دامن میں ندی بہہ رہی ہے' جس سے خود بخود آب پاشی ہو رہی ہے اور درختوں کی جڑوں تک پانی پہنچ رہا ہے۔

﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ﴾ ''جب بھی انہیں دیا جائے گا وہاں کا کوئی پھل رزق کے طور پر (یعنی کھانے کے لیے)''

﴿قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ﴾ ''وہ کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہمیں پہلے بھی ملتا تھا''

﴿وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ﴾ ''اور دیے جائیں گے ان کو پھل ایک صورت کے۔''

اس کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ جنت میں اہلِ جنت کی جو ابتدائی دعوت یا ابتدائی ضیافت (نُزُل) ہو گی اس میں انہیں وہی پھل پیش کیے جائیں گے جو دنیا میں معروف ہیں' مثلاً انار' انگور' سیب' کھجور وغیرہ۔ اہلِ جنت انہیں دیکھ کر کہیں گے کہ یہ تو وہی پھل ہیں جو ہم دنیا میں کھاتے آئے ہیں' لیکن جب انہیں چکھیں گے تو ظاہری مشابہت کے باوجود ذائقے میں زمین و آسمان کا فرق پائیں گے۔ اور ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ اہلِ جنت کو جنت میں بھی وہی پھل ملتے رہیں گے' لیکن ہر بار اُن کا ذائقہ بدلتا رہے گا۔ ان کی شکل و صورت

وہی رہے گی لیکن ذائقہ وہ نہیں رہے گا۔ لہٰذا یہ دنیا والا معاملہ نہیں ہوگا کہ ایک ہی شے کو کھاتے کھاتے انسان کی طبیعت بھر جاتی ہے۔

﴿وَلَهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ﴾ ''اور ان کے لیے اُس (جنت) میں نہایت پاکباز بیویاں ہوں گی۔''

﴿وَهُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٥﴾﴾ ''اور وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش۔''

ان پانچ آیات (۲۱ تا ۲۵) میں ایمانیاتِ ثلاثہ یعنی ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور ایمان بالآخرۃ کی دعوت آ گئی۔ اب آگے کچھ ضمنی مسائل زیر بحث آئیں گے۔

آیت ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي - أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ﴾ ''یقیناً اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ بیان کرے کوئی مثال مچھر کی یا اُس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے۔''

کفار کی طرف سے قرآن کے بارے میں کئی اعتراضات اٹھائے جاتے تھے۔ وہ کبھی بھی اُس چیلنج کا مقابلہ تو نہ کر سکے جو قرآن نے انہیں ﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ﴾ کے الفاظ میں دیا تھا، لیکن خواہ مخواہ کے اعتراضات اٹھاتے رہے۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے کسی مصوّر کی تصویر پر اعتراض کرنے والے تو بہت تھے لیکن جب کہا گیا کہ یہ برش لیجیے اور ذرا اس کو ٹھیک کر دیجیے تو سب پیچھے ہٹ گئے۔ قرآن کے مقابلے میں کوئی سورت لانا تو ان کے لیے ممکن نہیں تھا لیکن اِدھر اُدھر سے اعتراضات کرنے کے لیے ان کی زبانیں کھلتی تھیں۔ اُن میں سے ان کا ایک اعتراض یہاں نقل کیا جا رہا ہے کہ قرآن مجید میں مکھی کی تشبیہ آئی ہے، یہ تو بہت حقیر سی شے ہے۔ کوئی اعلیٰ متکلم اپنے اعلیٰ کلام میں ایسی حقیر چیزوں کا تذکرہ نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں مکڑی جیسی حقیر شے کا بھی ذکر ہے، چنانچہ یہ کوئی اعلیٰ کلام نہیں ہے۔ یہاں اس کا جواب دیا جا رہا ہے۔ دراصل تشبیہ اور تمثیل کے اندر مشبّہ اور مشبّہ بہٖ میں مناسبت اور مطابقت ہونی چاہیے۔ یعنی کوئی تمثیل یا تشبیہ بیان کرنی ہو تو جس شے کے لیے تشبیہ دی جا رہی ہے اُس سے مطابقت اور مناسبت رکھنے والی شے سے تشبیہ دی جانی چاہیے۔ کوئی شے اگر بہت حقیر ہے تو اسے کسی عظمت والی شے سے آخر کیسے تشبیہ دی جائے گی؟ اسے تو کسی حقیر شے ہی سے تشبیہ دی جائے گی تو تشبیہ کا اصل مقصد پورا ہوگا۔ چنانچہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کوئی شرم یا عار کی بات نہیں ہے کہ وہ مچھر کی مثال بیان کرے یا اس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے۔ لفظ ''فَوْقَهَا'' (اس سے اوپر) میں دونوں معنی موجود ہیں۔ یعنی کمتر اور حقیر ہونے میں اس سے بھی بڑھ کر یا یہ کہ اُس سے اوپر کی کوئی شے۔ اس لیے کہ مکھی یا مکڑی بہرحال مچھر سے ذرا بڑی شے ہے۔

﴿فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۖ﴾ ''تو جو لوگ صاحبِ ایمان ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ یقیناً حق ہے اُن کے ربّ کی طرف سے۔''

﴿وَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَيَقُولُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَٰذَا مَثَلًا ۘ﴾ ''اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں کہ کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے؟''

حق کے منکر ناک بھوں چڑھا رہے ہیں اور اعتراض کر رہے ہیں کہ اس مثال سے اللہ نے کیا مراد لی ہے؟ اس ضمن میں اگلا جملہ بہت اہم ہے۔

﴿يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا ۚ وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۚ﴾ ''گمراہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے بہتوں کو اور ہدایت دیتا ہے اسی کے ذریعے سے بہتوں کو۔''

اِن مثالوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہت سوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہدایت اور گمراہی کا دار و مدار انسان کی اپنی داخلی کیفیت (subjective condition) پر ہے۔ آپ کے دل میں خیر ہے' بھلائی ہے' آپ کی نیت طلبِ ہدایت اور طلبِ علم کی ہے تو آپ کو اس قرآن سے ہدایت مل جائے گی' اور اگر دل میں زیغ ہے' کجی ہے' نیت میں ٹیڑھ اور فساد ہے تو اسی کے ذریعے سے اللہ آپ کی گمراہی میں اضافہ کر دے گا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا کسی کو ہدایت دینا اور کسی کو گمراہی میں مبتلا کر دینا الل ٹپ نہیں ہے' کسی قاعدے اور قانون کے بغیر نہیں ہے۔

﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۶﴾ ''اور نہیں گمراہ کرتا وہ اس کے ذریعے سے مگر صرف سرکش لوگوں کو۔''

اس سے گمراہی میں وہ صرف انہی کو مبتلا کرتا ہے جن میں سرکشی ہے' تعدی ہے' تکبر ہے۔ اگلی آیت میں اُن کے اوصاف بیان کر دیے گئے۔

آیت ۲۷ ﴿الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠﴾ ''جو توڑ دیتے ہیں اللہ کے (ساتھ کیے ہوئے) عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد۔''

اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان سب سے بڑا عہد ''عہدِ الست'' ہے' جس کا ذکر سورۃ الاعراف میں آئے گا۔ یہ عہد عالمِ ارواح میں تمام ارواحِ انسانیہ نے کیا تھا' ان میں مَیں بھی تھا' آپ بھی تھے' سب تھے۔ الغرض تمام کے تمام انسان جتنے آج تک دنیا میں آ چکے ہیں اور جو قیامت تک ابھی آنے والے ہیں' اس عہد کے وقت موجود تھے' لیکن صرف ارواح کی شکل میں تھے' جسم موجود نہیں تھے۔ اور یہ بات یاد رکھیے کہ انسان کا روحانی وجود مکمل وجود ہے اور اوّلاً تخلیق اُسی کی ہوئی تھی۔ ''عہدِ الست'' میں تمام بنی آدم سے اللہ تعالیٰ نے دریافت فرمایا: اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں؟) سب نے ایک ہی جواب دیا: بَلٰى (کیوں نہیں!) تو یہ جو فاسق ہیں' نافرمان ہیں' سرکش ہیں' انہوں نے اس عہد کو توڑا اور اللہ کو اپنا مالک' اپنا خالق اور اپنا حاکم ماننے کی بجائے خود حاکم بن کر بیٹھ گئے اور اس طرح کے دعوے کیے: ﴿اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ﴾ ''کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے؟'' غیر اللہ کی حاکمیّت (sovereignty) کو تسلیم کرنا سب سے بڑی بغاوت' سرکشی' فسق اور نافرمانی ہے' خواہ وہ ملوکیت کی صورت میں ہو یا عوامی حاکمیّت (popular sovereignty) کی صورت میں۔

﴿وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾ ''اور کاٹتے ہیں اُس چیز کو جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے''

اللہ نے صلہ رحمی کا حکم دیا ہے' یہ قطع رحمی کرتے ہیں۔ مال کی طلب میں' اُس کے مال کو ہتھیانے کے لیے بھائی بھائی کو ختم کر دیتا ہے۔ انسان اپنی ذاتی اغراض کے لیے' اپنے تکبر اور تعلّی کی خاطر تمام اخلاقی حدود کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ ہماری شریعت کا فلسفہ یہ ہے کہ ہمیں دو طرح کے تعلقات جوڑنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک تعلق ہے بندے کا اللہ کے ساتھ۔ اس کا تعلق ''حقوق اللہ'' سے ہے۔ جبکہ ایک تعلق ہے بندوں کا بندوں کے ساتھ۔ یہ ''حقوق العباد'' سے متعلق ہے۔ اللہ کا حق یہ ہے کہ اُسے حاکم اور مالک سمجھو اور خود اُس کے بندے بنو۔ جبکہ انسانوں کا حق یہ ہے کہ: ((كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا)) [۳] ''سب آپس میں بھائی بھائی ہو کر اللہ کے بندے بن جاؤ''۔ اس ضمن میں اہم ترین رحمی رشتہ ہے' یعنی سگے بہن بھائی۔ پھر دادا دادی کی اولاد میں تمام چچا زاد وغیرہ (cousins)

۳۔ صحیح البخاری' کتاب الادب' باب ما ینھی عن التحاسد والتدابر' وباب الھجرۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب تحریم التحاسد والتباغض والتدابر۔

آ جائیں گے۔ اس کے اوپر پردادا پردادی کی اولاد کا دائرہ مزید وسیع ہو جائے گا۔ اسی طرح اوپر چلتے جائیں یہاں تک کہ آدم وحوا پر تمام انسان جمع ہو جائیں گے۔ تو رحمی رشتہ کی بڑی اہمیت ہے —— یہاں فاسقین کی دو صفات بیان کر دی گئیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کے عہد کو مضبوطی سے باندھنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور دوسرے یہ کہ جن رشتوں کو اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے یہ انہیں قطع کرتے ہیں۔

﴿وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔''

متذکرہ بالا دونوں چیزوں کے نتیجے میں زمین میں فساد پیدا ہوتا ہے۔ انسان اللہ کی اطاعت سے باغی ہو جائیں یا آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگیں تو اس کا نتیجہ فساد فی الارض کی صورت میں نکلتا ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷﴾ ''یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

یہی لوگ ہیں جو بالآخر آخری اور دائمی خسارے میں رہنے والے ہیں۔

آیت ۲۸ ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ﴾ ''تم کیسے کفر کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم مُردہ تھے' پھر اُس نے تمہیں زندہ کیا۔''

﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۸﴾ ''پھر وہ تمہیں مارے گا' پھر جلائے گا' پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔''

اس مقام پر ایک بڑی گہری حکمت اور فلسفے کی بات بیان کی گئی ہے جو آج نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو چکی ہے۔ وہ یہ کہ ہم دنیا میں آنے سے پہلے مردہ تھے (كُنْتُمْ اَمْوَاتًا) ۔ اس کے کیا معنی ہیں؟

یہ مضمون سورۂ غافر رسورۃ المؤمن میں زیادہ وضاحت سے آیا ہے' جو سورۃ البقرۃ سے پہلے نازل ہو چکی تھی۔ لہٰذا یہاں اجمالی تذکرہ ہے۔ وہاں اہلِ جہنم کا قول بایں الفاظ نقل ہوا ہے: ﴿رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝۱۱﴾ ''اے ہمارے ربّ! تُو نے دو مرتبہ ہم پر موت وارد کی اور دو مرتبہ ہمیں زندہ کیا' اب ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے' تو اب یہاں سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟'' اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ انسان کی تخلیقِ اوّل عالمِ ارواح میں صرف ارواح کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ احادیث میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ((اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ)) (متفق علیہ) یعنی ارواح جمع شدہ لشکروں کی صورت میں تھیں۔ ان ارواح سے وہ عہد لیا گیا جو ''عہدِ الست'' کہلاتا ہے۔ پھر انہیں سلا دیا گیا۔ یہ گویا پہلی موت تھی جو ہم گزار آئے ہیں۔ (آپ جانتے ہیں کہ مردہ معدوم نہیں ہوتا' بے جان ہوتا ہے' ایک طرح سے سویا ہوا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں موت اور نیند کو باہم تشبیہہ دی گئی ہے۔) پھر دنیا میں عالمِ خلق کا مرحلہ آیا' جس میں تناسل کے ذریعے سے اجسادِ انسانیہ کی تخلیق ہوتی ہے اور اُن میں ارواح پھونکی جاتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی متفق علیہ حدیث کے مطابق رحمِ مادر میں جنین جب چار ماہ کا ہو جاتا ہے تو اُس میں وہ روح لا کر پھونک دی جاتی ہے۔ یہ گویا پہلی مرتبہ کا زندہ کیا جانا ہو گیا۔ ہم اِس دنیا میں اپنے جسد کے ساتھ زندہ ہو گئے' ہمیں پہلی موت کی نیند سے جگا دیا گیا۔ اب ہمیں جو موت آئے گی وہ ہماری دوسری موت ہو گی اور اس کے نتیجے میں ہمارا جسد وہیں چلا جائے گا جہاں سے آیا تھا (یعنی مٹی میں) اور ہماری روح بھی جہاں سے آئی تھی وہیں واپس چلی جائے گی۔ یہ فلسفہ وحکمتِ قرآنی کا بہت گہرا نکتہ ہے۔

آیت ۲۹ ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۚ﴾ ''وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ بھی زمین میں ہے۔''

اس آیت میں خلافت کا مضمون شروع ہو گیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے: ((اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَكُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْاٰخِرَةِ))[۴] ''یہ دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے بنائے گئے ہو''۔ اگلی آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کی خلافتِ ارضی کا ذکر ہے۔ گویا زمین میں جو کچھ بھی پیدا کیا گیا ہے وہ انسان کی خلافت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ﴾ ''پھر وہ متوجہ ہوا آسمانوں کی طرف اور انہیں ٹھیک ٹھیک سات آسمانوں کی شکل میں بنا دیا۔''

یہ آیت تا حال آیاتِ متشابہات میں سے ہے۔ سات آسمانوں کی کیا حقیقت ہے' ہم ابھی تک پورے طور پر اس سے واقف نہیں ہیں۔

﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝۲۹﴾ ''اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

اُسے ہر شے کا علم حقیقی حاصل ہے۔

آیات ۳۰ تا ۳۹

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۳۰ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَی الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۳۱ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝۳۲ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝۳۳ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ۝۳۴ وَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝۳۵ فَاَزَلَّهُمَا الشَّیْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِیْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰی حِیْنٍ ۝۳۶ فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝۳۷ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝۳۸ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۳۹ ع

۴۔ تخریج الاحیاء للعراقی ۲۵۲/۳۔ حافظ عراقی نے اسے منقطع قرار دیا ہے۔

آیت ۳۰ ﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ﴾ ''اور یاد کرو جب کہ کہا تھا تمہارے ربّ نے فرشتوں سے کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ۔''

خلیفہ درحقیقت نائب کو کہتے ہیں۔ عام طور پر لوگوں کو مغالطہ لاحق ہوتا ہے کہ خلیفہ اور جانشین کسی کی موت کے بعد مقرر ہوتا ہے' زندگی میں نہیں ہوتا۔ لیکن اس دنیا میں انسان کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لیے وائسرائے کا تصور ذہن میں رکھیے۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے ہم انگریز کے غلام تھے۔ ہمارا اصل حاکم (بادشاہ یا ملکہ) انگلستان میں تھا' جبکہ دہلی میں وائسرائے ہوتا تھا۔ وائسرائے کا کام یہ تھا کہ His Majesty یا Her Majesty کی حکومت کا جو بھی حکم موصول ہو اُسے بلاچون و چرا بغیر کسی تغیر اور تبدّل کے نافذ کرے۔ البتہ وائسرائے کو اختیار حاصل تھا کہ اگر کسی معاملے میں انگلستان سے حکم نہ آئے تو وہ یہاں کے حالات کے مطابق اپنی بہترین رائے قائم کرے۔ وہ غور و فکر کرے کہ یہاں کی مصلحتیں کیا ہیں اور جو چیز بھی سلطنت کی مصلحت میں ہو اُس کے مطابق فیصلہ کرے۔ بعینہٖ یہی رشتہ کائنات کے اصل حاکم اور زمین پر اُس کے خلیفہ کے مابین ہے۔ کائنات کا اصل حاکم اور مالک اللہ تعالیٰ ہے' لیکن اُس نے اپنے آپ کو غیب کے پردے میں چھپا لیا ہے۔ زمین پر انسان اس کا خلیفہ ہے۔ اب انسان کا کام یہ ہے کہ جو ہدایت اللہ کی طرف سے آ رہی ہے اس پر تو بے چون و چرا عمل کرے اور جس معاملے میں کوئی واضح ہدایت نہیں ہے وہاں غور و فکر اور سوچ بچار کرے اور استنباط و اجتہاد سے کام لیتے ہوئے جو بات روحِ دین سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھنے والی ہو اسے اختیار کرے۔ یہی درحقیقت رشتۂ خلافت ہے جو اللہ اور انسان کے مابین ہے۔

یہ حیثیت تمام انسانوں کو دی گئی ہے اور بِالقُوّۃ (potentially) ہر انسان اللہ کا خلیفہ ہے' لیکن جو اللہ کا باغی ہو جائے' جو خود حاکمیت کا مدعی ہو جائے تو وہ اس خلافت کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر کسی بادشاہ کا ولی عہد اپنے باپ کی زندگی ہی میں بغاوت کر دے اور حکومت حاصل کرنا چاہے تو اب وہ واجب القتل ہے۔ اسی طرح جو لوگ بھی اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کے منکر ہو کر خود حاکمیت کے مدعی ہو گئے اگرچہ وہ واجب القتل ہیں' لیکن دنیا میں انہیں مہلت دی گئی ہے۔ اس لیے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ انہیں فوراً ختم نہیں کرتا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۴) ''اور اگر ایک بات پہلے سے طے نہ ہو چکی ہوتی ایک وقتِ معیّن تک تمہارے ربّ کی طرف سے تو ان کے درمیان فیصلہ چکا دیا جاتا''۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک وقتِ معیّن تک کے لیے مہلت دی ہے لہٰذا انہیں فوری طور پر ختم نہیں کیا جاتا' لیکن کم از کم اتنی سزا ضرور ملتی ہے کہ اب وہ خلافت کے حق سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ گویا اب دنیا میں خلافت صرف خلافت المسلمین ہوگی۔ صرف وہ شخص جو اللہ کو اپنا حاکمِ مطلق مانے' وہی خلافت کا اہل ہے۔ تو یہ چند باتیں خلافت کی اصل حقیقت کے ضمن میں یہیں پر سمجھ لیجیے: ﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ﴾ ''اور یاد کرو جب تمہارے ربّ نے کہا تھا فرشتوں سے کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔''

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾ ''انہوں نے کہا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا؟''

﴿وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ﴾ ''اور ہم آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح اور آپ کی تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔''

﴿قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۳۰﴾ ''فرمایا: میں جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔''

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فرشتوں کو انسان کے بارے میں یہ گمان یا یہ خیال کیسے ہوا؟ اس کے ضمن میں دو آراء ہیں۔ ایک تو یہ کہ انسان کی تخلیق سے پہلے اس زمین پر جِنّات موجود تھے اور انہیں بھی اللہ نے کچھ تھوڑا سا اختیار دیا تھا اور انہوں نے یہاں فساد برپا کر رکھا تھا۔ ان ہی پر قیاس کرتے ہوئے فرشتوں نے سمجھا کہ انسان بھی زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا۔ ایک دوسری اُصولی بات یہ کہی گئی ہے کہ جب خلافت کا لفظ استعمال ہوا تو فرشتے سمجھ گئے کہ انسان کو زمین میں کوئی نہ کوئی اختیار بھی ملے گا۔ جِنّات کے بارے میں خلافت کا لفظ کہیں نہیں آیا' یہ صرف انسان کے بارے میں آ رہا ہے۔ اور خلیفہ بالکل بے اختیار نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا جہاں واضح حکم ہے اس کا کام اس کی تنفیذ ہے اور جہاں نہیں ہے وہاں اپنے غور و فکر اور سوچ بچار کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسے بہتر سے بہتر رائے قائم کرنا ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے جہاں اختیار ہوگا وہاں اس کے صحیح استعمال کا بھی امکان ہے اور غلط کا بھی۔ پولیٹیکل سائنس کا تو یہ مسلّمہ اصول (axiom) ہے:

"Authority tends to corrupt and absolute authority corrupts absolutely."

چنانچہ اختیار کے اندر بدعنوانی کا رُجحان موجود ہے۔ اس بنا پر انہوں نے قیاس کیا کہ انسان کو زمین میں اختیار ملے گا تو یہاں فساد ہوگا' خون ریزی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنی حکمتوں سے مَیں خود واقف ہوں۔ میں انسان کو خلیفہ کیوں بنا رہا ہوں' یہ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

آیت ۳۱ ﴿وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ ''اور اللہ نے سکھا دیے آدم کو تمام کے تمام نام''

مفسرین کا تقریباً اجماع ہے کہ اس سے مراد تمام اشیاء کے نام ہیں اور تمام اشیاء کے ناموں سے مراد اُن کی حقیقت کا علم ہے۔ آپ انسانی علم (Human Knowledge) کا تجزیہ کریں تو وہ یہی ہے کہ انسان ایک چیز کو پہچانتا ہے' پھر اس کا ایک نام رکھتا ہے یا اس کے لیے کوئی اصطلاح (term) قائم کرتا ہے۔ وہ اُس نام اور اُس اصطلاح کے حوالے سے اُس چیز کے بارے میں بہت سے حقائق کو اپنے ذہن میں محفوظ کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام نام سکھا دیے۔ گویا کُل مادّی کائنات کے اندر جو کچھ وجود میں آنے والا تھا' ان سب کی حقیقت سے حضرت آدم علیہ السلام کو امکانی طور پر (potentially) آگاہ کر دیا۔ یہ انسان کا اکتسابی علم (Acquired Knowledge) ہے جو اسے سمع و بصر اور عقل و دماغ سے حاصل ہوتا ہے۔

انسان کو حاصل ہونے والے علم کے دو حصے ہیں۔ ایک الہامی علم (Revealed Knowledge) ہے جو اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے سے بھیجتا ہے' جبکہ ایک علم بالحواس یا اکتسابی علم (Acquired Knowledge) ہے جو انسان خود حاصل کرتا ہے۔ اُس نے آنکھوں سے دیکھا' کانوں سے سنا' نتیجہ نکالا اور دماغ کے کمپیوٹر نے اُس کو پراسیس کر کے اُس نتیجے کو کہیں حافظے (memory) کے اندر محفوظ کر لیا۔ پھر کچھ اور دیکھا' کچھ اور سنا' کچھ چھو کر' کچھ چکھ کر' کچھ سونگھ کر معلوم ہوا اور کچھ اور نتیجہ نکالا تو اسے سابقہ یادداشت کے ساتھ tally کر کے نتیجہ نکالا۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا ۝﴾ (بنی اسراءیل) انسان کو یہ اکتسابی علم (Acquired Knowledge) تین چیزوں سے حاصل ہو رہا ہے: سماعت' بصارت اور عقل۔ عقل اُس تمام sense data کو جو اسے مہیا ہوتا ہے' حواس (sense organs) کے ذریعے سے پراسیس کرتی ہے اور فائدہ اخذ کرتی ہے۔ یہ علم ہے جو بالقوّۃ (potentially) حضرت آدم علیہ السلام کو دے دیا گیا۔ اب اس کی exfoliation ہو رہی ہے اور درجہ بدرجہ وہ علم پھیل رہا ہے' بڑھ رہا ہے۔ بڑھتے بڑھتے یہ کہاں تک پہنچے گا' ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ انسان کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے!

اس نصف صدی میں علمِ انسانی میں جو explosion ہوا ہے میں اور آپ اس کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ اکثر بڑے بڑے سائنسدانوں کو بھی اس کا ادراک و شعور نہیں ہے کہ انسانی علم نے کتنی بڑی زقند لگائی ہے۔ اس لیے کہ ایک شخص اپنی لائن کے بارے میں تو جانتا ہے کہ اس میں کیا کچھ ہو گیا۔ مثلاً ایک سائنس دان صرف فزکس یا اس کی بھی کسی شاخ کے بارے میں جانتا ہے' باقی دوسری شاخوں کے بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں۔ یہ دَور سپیشلائزیشن کا دَور ہے' لہٰذا علم کے میدان میں جو بڑا دھماکہ (explosion) ہوا ہے اس کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہے۔ ایک چیز جو آج ایجاد ہوتی ہے چند دنوں کے اندر اندر اُس کا نیا version آ جاتا ہے اور یہ چیز متروک (outdated) ہو جاتی ہے۔ ابلاغ اور مواصلات (communications) کے اندر انقلابِ عظیم برپا ہوا ہے۔ آپ یہ سمجھئے کہ اقبال نے جو یہ شعر کبھی کہا تھا' اس کی تعبیر قریب سے قریب تر آ رہی ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے!

اور یہ ''مہِ کامل'' اُس وقت بنے گا جب دجّال کی شکل اختیار کرے گا۔ دجّال وہ شخص ہو گا جو ان تمام قواعدِ طبیعیہ (Physical Laws) کے اوپر قابو پا لے گا۔ جب چاہے گا' جہاں چاہے گا بارش برسائے گا۔ وہ رزق کے تمام خزانے اپنے ہاتھ میں لے لے گا اور اعلان کر دے گا کہ جو اُس پر ایمان لائے گا اُسی کو رزق ملے گا' کسی اور کو نہیں ملے گا۔ اُس کی آواز پوری دنیا میں سنائی دے گی۔ وہ چند دنوں کے اندر پوری دنیا کا چکّر لگا لے گا۔ یہ ساری باتیں حدیث میں دجال کے بارے میں آئی ہیں۔ وہ آدم کے اس اکتسابی علم (Acquired Knowledge) کی اس حد کو پہنچ جائے گا کہ فطرت کے تمام اسرار (mysteries) اس پر منکشف ہو جائیں اور اسے قواعدِ طبیعیہ پر تصرف حاصل ہو جائے' وہ انہیں harness کر لے' قابو میں لے آئے اور انہیں استعمال کرے۔

انسان نے جو سب سے پہلا ذریعہ توانائی (source of energy) دریافت کیا وہ آگ تھا۔ آج سے ہزاروں سال پہلے ہمارے کسی جدِّ امجد نے دیکھا کہ کوئی چٹان اوپر سے گری' پتھر سے پتھر ٹکرایا تو اس میں سے آگ کا شعلہ نکلا۔ اُس کا یہ مشاہدہ آگ پیدا کرنے کے لیے کافی ہو گیا کہ پتھروں کو آپس میں ٹکراؤ اور آگ پیدا کر لو۔ چنانچہ آگ اُس دَور کی سب سے بڑی ایجاد اور اوّلین ذریعۂ توانائی تھی۔ اب وہ توانائی (energy) کہاں سے کہاں پہنچی! پہلے اُس آگ نے بھاپ کی شکل اختیار کی' پھر ہم نے بجلی ایجاد کی اور اب ایٹمی توانائی (Atomic Energy) حاصل کر لی ہے اور ابھی نمعلوم اور کیا کیا حاصل ہونا ہے۔ واللہ اعلم! ان تمام چیزوں کا تعلق خلافتِ ارضی کے ساتھ ہے۔ لہٰذا فرشتوں کو بتایا گیا کہ آدم کو صرف اختیار ہی نہیں' علم بھی دیا جا رہا ہے۔

﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ ''پھر اُن (تمام اشیاء) کو پیش کیا فرشتوں کے سامنے''

﴿فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۱﴾ ''اور فرمایا کہ بتاؤ مجھے ان چیزوں کے نام اگر تم سچے ہو۔''

اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ کسی خلیفہ کے تقرر سے زمین کا انتظام بگڑ جائے گا۔

آیت ۳۲ ﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ﴾ ''انہوں نے کہا (پروردگار!) نقص سے پاک تو آپ ہی کی ذات ہے''

آپ ہر نقص سے' ہر عیب سے' ہر ضعف سے' ہر احتیاج سے مبرّا اور منزّہ ہیں' اعلیٰ اور ارفع ہیں۔

﴿لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ ''ہمیں کوئی علم حاصل نہیں سوائے اُس کے جو آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے۔''

اس کی یہی تعبیر بہتر معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس کائناتی حکومت میں ملائکہ کی حیثیت درحقیقت اس کے کارندوں (یا civil

servants) کی ہے۔ چنانچہ ہر ایک کو صرف اس کے شعبے کے مطابق علم دیا گیا ہے' ان کا علم جامع نہیں ہے اور ان کے پاس تمام چیزوں کا مجموعی علم حاصل کرنے کی استعداد نہیں ہے۔ مثلاً کوئی فرشتہ بارش کے انتظام پر مامور ہے' کوئی پہاڑوں پر مامور ہے' جس کا ذکر سیرت میں آتا ہے کہ جب طائف میں رسول اللہ ﷺ پر پتھراؤ ہوا تو اس کے بعد ایک فرشتہ حاضر ہوا کہ میں مَلَکُ الجبال ہوں' اللہ نے مجھے پہاڑوں پر مامور کیا ہوا ہے' اگر آپ فرمائیں تو میں ان دو پہاڑوں کو آپس میں ٹکرا دوں جن کے درمیان طائف کی یہ وادی واقع ہے اور اس طرح اہل طائف پس کر سُرمہ بن جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے۔ تو فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف خدمات پر مامور ہیں اور ان کو جو علم دیا گیا ہے وہ صرف اُن کے اپنے فرائضِ منصبی اور اُن کے اپنے اپنے شعبے سے متعلق دیا گیا ہے' جبکہ حضرت آدم علیہ السلام کو علم کی جامعیت بالقوۃ (potentially) دے دی گئی' جو بڑھتے بڑھتے اب ایک بہت تناور درخت بن چکا ہے۔

﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝۳۲﴾ ''یقیناً آپ ہی ہیں جو سب کچھ جاننے والے کامل حکمت والے ہیں۔''

آپ ہی کی ذات ہے جو کُل کے کُل علم کی مالک ہے اور جس کی حکمت بھی کامل ہے۔ باقی تو مخلوق میں سے ہر ایک کا علم ناقص ہے۔

آیت ۳۳ ﴿قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ﴾ ''اللہ نے فرمایا کہ اے آدم' ان کو بتاؤ ان چیزوں کے نام!''

﴿فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ﴾ ''تو جب اُس نے بتا دیے ان کو اُن سب کے نام''

﴿قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ﴾ ''تو (اللہ نے) فرمایا: کیا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی تمام چھپی ہوئی چیزوں کو'' جو تمہاری نگاہوں سے اوجھل اور مخفی ہیں۔

﴿وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝۳۳﴾ ''اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کر رہے تھے اور جو کچھ تم چھپا رہے تھے۔''

ان الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ فرشتوں کی خواہش یہ تھی کہ خلافت ہمیں ملے' ہم خُدّامِ ادب ہیں' ہر وقت تسبیح و تحمید اور تقدیس میں مصروف ہیں' جو حکم ملتا ہے بجا لاتے ہیں' تو یہ خلافت کسی اور مخلوق کو کیوں دی جا رہی ہے۔

اب آگے چونکہ تیسری مخلوق کا ذکر بھی آئے گا لہٰذا یہاں نوٹ کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی تین مخلوقات ایسی ہیں جو صاحبِ تشخص اور صاحبِ شعور ہیں اور جن میں ''اَنَا'' (میں) کا شعور ہے۔ ایک ملائکہ ہیں' ان کی تخلیق نور سے ہوئی ہے۔ دوسرے انسان ہیں' جن کی تخلیق گارے سے ہوئی ہے اور تیسرے جنّات ہیں' جن کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے۔ باقی حیوانات ہیں' اُن میں شعور (consciousness) تو ہے' خود شعوری (self consciousness) نہیں ہے۔ انسان جب دیکھتا ہے تو اس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں' جبکہ کُتّا یا بلّا دیکھتا ہے تو اسے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ مَیں دیکھ رہا ہوں۔ حیوانات میں ''مَیں'' کا شعور نہیں ہے۔ یہ اَنَا، Self یا Ego صرف فرشتوں میں' انسان میں اور جنّات میں ہے۔ ان میں سے ایک نوری مخلوق ہے' ایک ناری مخلوق ہے اور ایک خاکی ہے' جو زمین کے اس قشر (crust) میں مٹی اور پانی کے ملغوبے یعنی گارے سے وجود میں آئی ہے۔

آیت ۳۴ ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ﴾ ''اور یاد کرو جب ہم نے کہا فرشتوں سے کہ

سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدے میں گر پڑے سوائے ابلیس کے۔''

یہاں ایک بات تو یہ سمجھئے کہ آدمؑ کو تمام ملائکہ کے سجدے کی ضرورت کیا تھی؟ کیا یہ صرف تعظیماً تھا؟ اور اگر تعظیماً تھا تو کیا آدمِ خاکی کی تعظیم مقصود تھی یا کسی اور شے کی تعظیم تھی؟ مکّی سورتوں میں یہ بات دو جگہ بایں الفاظ واضح کی گئی ہے: ﴿فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝﴾ (الحجر:۲۹ و ص:۷۲) ''پھر جب مَیں اس (آدم) کی تخلیق مکمل کرلوں اور اس میں اپنی روح میں سے پھونک دوں تب گر پڑنا اُس کے سامنے سجدے میں''۔ چنانچہ تعظیم اگر ہے تو آدمِ خاکی کی نہیں ہے' اس کے اندر موجود ''روحِ ربانی'' کی ہے' جو ایک Divine Element یا Divine Spark ہے' جسے خود خالق نے ''مِنْ رُّوْحِيْ'' سے تعبیر فرمایا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سجدے کی حکمت کیا ہے؟ اس کی عِلّت اور غرض و غایت کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا' اس کائنات یعنی اس آفاقی حکومت کے کارندے تو فرشتے ہیں اور خلیفہ بنایا جا رہا ہے انسان کو۔ لہٰذا جب تک یہ ساری سول سروس اس کے تابع نہ ہو وہ خلافت کیسے کرے گا! جب ہم کسی کام کا ارادہ کرتے ہیں اور کوئی فعل کرنا چاہتے ہیں تو اس فعل کے پورا ہونے میں' اُس کے ظہور پذیر ہونے میں نمعلوم کون کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں اور فطرت کی کون کون سی قوتیں (forces) ہمارے ساتھ موافقت کرتی ہیں تو ہم وہ کام کر سکتے ہیں' اور ان سب پر فرشتے مأمور ہیں۔ ہر ایک کی اپنی اقلیم (domain) ہے۔ اگر وہ انسان کے تابع نہ ہوں تو خلافت کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ اسے خلافت دی گئی ہے' یہ جدھر جانا چاہتا ہے جانے دو' یہ نماز کے لیے مسجد میں جانا چاہتا ہے جانے دو' یہ چوری کے لیے نکلا ہے نکلنے دو۔ انسان کو جو اختیار دیا گیا ہے اس کے استعمال میں یہ تمام قوتیں اس کے ساتھ موافقت کرتی ہیں تب ہی اُس کا کوئی ارادہ' خواہ اچھا ہو یا برا' پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ اس موافقت کی علامت کے طور پر تمام فرشتوں کو انسان کے آگے جھکا دیا گیا۔

اس آیت میں ''اِلَّآ اِبْلِيْسَ'' (سوائے ابلیس کے) سے یہ مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید ابلیس بھی فرشتہ تھا۔ اس لیے کہ سجدے کا حکم تو فرشتوں کو دیا گیا تھا۔ اس مغالطے کا ازالہ سورۃ الکہف میں کر دیا گیا جو سورۃ البقرۃ سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی۔ وہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ (آیت ۵۰) ''وہ جنوں میں سے تھا' پس اس نے سرکشی کی اپنے ربّ کے حکم سے''۔ فرشتوں میں سے ہوتا تو نافرمانی کر ہی نہ سکتا۔ فرشتوں کی شان تو یہ ہے کہ وہ اللہ کے کسی حکم سے سرتابی نہیں کر سکتے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝﴾ (التحریم) ''وہ اللہ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم بھی انہیں دیا جاتا ہے اُسے بجالاتے ہیں''۔ جنّات بھی انسانوں کی طرح ایک ذی اختیار مخلوق ہے جسے ایمان و کفر اور طاعت و معصیت دونوں کی قدرت بخشی گئی ہے۔ چنانچہ جنّات میں نیک بھی ہیں بد بھی ہیں' اعلیٰ بھی ہیں ادنیٰ بھی ہیں' جیسے انسانوں میں ہیں۔ لیکن یہ ''عزازیل'' جو جن تھا' علم اور عبادت دونوں کے اعتبار سے بہت بلند ہو گیا تھا اور فرشتوں کا ہم نشین تھا۔ یہ فرشتوں کے ساتھ اس طور پر شامل تھا جیسے بہت سے انسان بھی اگر اپنی بندگی میں' زُہد میں' نیکی میں ترقی کریں تو اُن کا عالَمِ ارواح کے ساتھ' عالَمِ ملائکہ کے ساتھ اور ملأ اعلیٰ کے ساتھ ایک رابطہ قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح عزازیل بھی جن ہونے کے باوجود اپنی نیکی' عبادت' پارسائی اور اپنے علم میں فرشتوں سے بہت آگے تھا' اس لیے ''مُعَلِّمُ الْمَلَكُوْت'' کی حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اسے اپنی اس حیثیت کا بڑا زعم تھا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا' قرآن حکیم میں قصۂ آدم و ابلیس کے ضمن میں یہ بات سات مرتبہ آئی ہے کہ فرشتوں کو حکم ہوا کہ آدم کو سجدہ

کرو' سب جھک گئے مگر ابلیس نے سجدے سے انکار کر دیا۔ آیات زیر مطالعہ میں قصۂ آدم و ابلیس ساتویں مرتبہ آ رہا ہے۔ اگرچہ مصحف میں یہ پہلی مرتبہ آ رہا ہے لیکن ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے یہاں ساتویں مرتبہ آ رہا ہے۔ آدم و ابلیس کا یہ قصہ سورۃ البقرۃ کے بعد سورۃ الاعراف میں' پھر سورۃ الحجر میں' پھر سورۂ بنی اسرائیل میں' پھر سورۃ الکہف میں' پھر سورۂ طٰہٰ میں اور پھر سورۂ صٓ میں آئے گا۔ یعنی یہ قصہ قرآن حکیم میں چھ مرتبہ مکی سورتوں میں آیا ہے اور ایک مرتبہ مدنی سورت سورۃ البقرۃ میں۔

ابلیس کا اصل نام ''عزازیل'' تھا' ابلیس اب اس کا صفاتی نام ہے۔ اس لیے کہ اَبْلَسَ' یُبْلِسُ کے معنی ہوتے ہیں مایوس ہو جانا۔ یہ اللہ کی رحمت سے بالکل مایوس ہے اور جو اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائے وہ شیطان ہو جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اب میرا تو چھٹکارا نہیں ہے' میری تو عاقبت خراب ہو ہی چکی ہے' لہٰذا میں اپنے ساتھ اور جنتوں کو برباد کر سکتا ہوں کر لوں۔ ع ''ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے!'' اب وہ شیطان اس معنی میں ہے کہ انسان کی عداوت اس کی گھٹی میں پڑ گئی۔ اُس نے اللہ سے اجازت بھی لے لی کہ مجھے مہلت دے دے قیامت کے دن تک کے لیے ﴿اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ﴾ تو میں ثابت کر دوں گا کہ یہ آدم اُس رُتبے کا حق دار نہ تھا جو اسے دیا گیا۔

﴿اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ ۫﴾ ''اُس نے انکار کیا اور تکبر کیا۔''

قرآن حکیم میں دوسرے مقامات پر اس کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ﴿اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ۚ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝﴾ (الاعراف:۱۲ و صٓ:۷۶) ''میں اس سے بہتر ہوں' تُو نے مجھے آگ سے بنایا اور اسے گارے سے بنایا''۔ درحقیقت یہی وہ تکبر ہے جس نے اسے راندۂ درگاہِ حق کر دیا ؎

تکبر عزازیل را خوار کرد کہ در طوقِ لعنت گرفتار کرد

﴿وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۴﴾ ''اور ہو گیا وہ کافروں میں سے''۔ یا ''اور تھا وہ کافروں میں سے۔''

کَانَ عربی زبان میں دو طرح کا ہوتا ہے: ''تامہ'' اور ''ناقصہ''۔ کَانَ ناقصہ کے اعتبار سے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ اپنے اس استکبار اور انکار کی وجہ سے وہ کافروں میں سے ہو گیا۔ جبکہ کَانَ تامہ کے اعتبار سے یہ معنی ہوں گے کہ وہ تھا ہی کافروں میں سے۔ یعنی اس کے اندر سرکشی چھپی ہوئی تھی' اب ظاہر ہو گئی۔ ایسا معاملہ کبھی ہمارے مشاہدے میں بھی آتا ہے کہ کسی شخص کی بدنیتی پر نیکی اور زُہد کے پردے پڑے رہتے ہیں اور کسی خاص وقت میں آ کر وہ ننگا ہو جاتا ہے اور اس کی باطنی حقیقت سامنے آ جاتی ہے۔

آیت ۳۵ ﴿وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ﴾ ''اور ہم نے کہا اے آدم! رہو تم اور تمہاری بیوی جنت میں''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جنت کون سی ہے؟ اکثر حضرات کے نزدیک یہ جنت کہیں آسمان ہی میں تھی اور آسمان ہی میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ البتہ یہ سب مانتے ہیں کہ یہ وہ جنت الفردوس نہیں تھی جس میں جانے کے بعد نکلنے کا کوئی سوال نہیں۔ اس جنت میں تو آخرت میں لوگوں کو جا کر داخل ہونا ہے اور اس میں داخلے کے بعد پھر وہاں سے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے' اور میرا رُجحان اسی رائے کی طرف ہے' کہ تخلیقِ آدمؑ اسی زمین پر ہوئی ہے۔ وہ تخلیق جن مراحل سے گزری وہ اس وقت ہمارا موضوعِ بحث نہیں ہے۔ بائیولوجی اور وحی دونوں اس پر متفق ہیں کہ قشرِ ارض (Crust of the Earth) یعنی مٹی سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس کے بعد کسی اونچے مقام پر کسی سرسبز و شاداب علاقے میں حضرت آدمؑ کو رکھا گیا' جہاں ہر قسم کے میوے تھے' ہر شے بافراغت میسّر تھی۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ۝۱۱۸ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ۝۱۱۹﴾ (طٰہٰ)

''یہاں تمہارے لیے یہ آسائشیں موجود ہیں کہ نہ تمہیں اس میں بھوک لگے گی نہ عریانی لاحق ہوگی۔ اور یہ کہ نہ تمہیں اس میں پیاس تنگ کرے گی نہ دھوپ ستائے گی''۔ حضرت آدمؑ اور ان کی بیوی کو وہاں ہر طرح کی آسائشیں حاصل تھیں۔ البتہ یہ جنت صرف ایک demonstration کے لیے تھی کہ انہیں نظر آ جائے کہ شیطان ان کا اور اُن کی اولاد کا ازلی دشمن ہے' وہ انہیں ورغلائے گا اور طرح طرح سے وسوسہ اندازی کرے گا۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کسی شخص کا انتخاب تو ہو گیا اور وہ CSP cadre میں آ گیا' لیکن اس کی تعیناتی (posting) سے پہلے اسے سول سروس اکیڈمی میں زیر تربیت رکھا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں جو لفظ ھبوط (اُترنا) آ رہا ہے وہ صرف اسی ایک معنی میں نہیں آتا' اس کے دوسرے معانی بھی ہیں۔ یہ چیزیں پھر متشابہات میں سے رہیں گی۔ اس لیے ان کے بارے میں غور و فکر سے کوئی ایک یا دوسری رائے اختیار کی جا سکتی ہے۔ واللہ اعلم!

﴿وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪﴾ ''اور کھاؤ اس میں سے بافراغت جہاں سے چاہو۔''

یہاں ہر طرح کے پھل موجود ہیں' جو چاہو بلا روک ٹوک کھاؤ۔

﴿وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ ''مگر اس درخت کے قریب مت جانا۔''

یہاں پر اس درخت کا نام نہیں لیا گیا' اشارہ کر دیا گیا کہ اس درخت کے قریب بھی مت جانا۔

﴿فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۳۵﴾ ''ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔''

تم حد سے گزرنے والوں میں شمار ہو گے۔

اب اس کی بھی حکمت سمجھئے کہ یہ اس demonstration کا حصہ ہے کہ دنیا میں کھانے پینے کی ہزاروں چیزیں مباح ہیں' صرف چند چیزیں حرام ہیں۔ اب اگر تم ہزاروں مباح چیزوں کو چھوڑ کر حرام میں مُنہ مارتے ہو تو یہ نافرمانی شمار ہو گی۔ اللہ نے مباحات کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے۔ چند رشتے ہیں جو بیان کر دیے گئے کہ یہ حرام ہیں' محرماتِ ابدیہ ہیں' ان سے تو شادی نہیں ہو سکتی' باقی ایک مسلمان مرد کسی مسلمان عورت سے دنیا کے کسی بھی کونے میں شادی کر سکتا ہے' اس کے لیے کروڑوں options کھلے ہیں۔ پھر ایک نہیں' دو دو' تین تین' چار چار تک عورتوں سے شادی کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کے باوجود انسان شادی نہ کرے اور زنا کرے' تو یہ گویا اس کی اپنی خباثتِ نفس ہے۔ چنانچہ آدم و حوا (علیہما السلام) کو بتا دیا گیا کہ یہ پورا باغ تمہارے لیے مباح ہے' بس یہ ایک درخت ہے' اس کے پاس نہ جانا۔ درخت کا نام لینے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ تو صرف ایک آزمائش اور اس کی demonstration تھی۔

آیت ۳۶ ﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا﴾ ''پھر پھسلا دیا اُن دونوں کو شیطان نے اُس درخت کے بارے میں''

اس کی تفصیل سورۂ طٰہٰ میں آئی ہے کہ شیطان نے انہیں کس کس طریقے سے پھسلایا اور انہیں اس درخت کا پھل چکھنے پر آمادہ کیا۔

﴿فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪﴾ ''تو نکلوا دیا ان دونوں کو اُس کیفیت میں سے جس میں وہ تھے۔''

وہ کیا کیفیت تھی کہ نہ کوئی مشقت ہے' نہ کوئی محنت ہے اور انسان کو ہر طرح کا اچھے سے اچھا پھل مل رہا ہے' تمام ضروریات فراہم ہیں اور خاص خلعتِ فاخرہ سے بھی نوازا گیا ہے' جنت کا خاص لباس عطا کیا گیا ہے۔ لیکن ان کیفیات سے نکال کر انہیں کہا گیا کہ اچھا اب جاؤ اور زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا کرو۔ یاد رکھنا کہ شیطان تمہارا اور تمہاری نسل کا دشمن ہے اور وہ تمہیں پھسلائے گا جیسے آج پھسلایا ہے' تم اس کی شرارتوں سے ہوشیار رہنا: ﴿اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ؕ﴾ (فاطر:۶) ''یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے' اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو''۔ لیکن اگر کچھ لوگ اسے اپنا دوست بنا لیں اور اس کے ایجنٹ اور کارندے بن جائیں تو

یہ اُن کا اختیار ہے جس کی سزا انہیں ملے گی۔

﴿وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ﴾ ''اور ہم نے کہا تم سب اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔''

نوٹ کیجیے یہاں جمع کا صیغہ آیا ہے کہ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے۔ تو ایک دشمنی تو شیطان اور آدم اور ذُریت آدم کی ہے جبکہ ایک اور دشمنی انسانوں میں مرد اور عورت کے مابین ہے۔ عورت مرد کو پھسلاتی ہے اور غلط راستے پر ڈالتی ہے اور مرد عورتوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ (التغابن:۱۴) ''اے اہلِ ایمان! یقیناً تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں تمہارے دشمن ہیں' ان سے ہوشیار رہو''۔ کہیں ان کی محبت تمہیں راہِ حق سے منحرف نہ کر دے۔ شوہر ایک اچھا کام کرنا چاہتا ہے لیکن بیوی رکاوٹ بن گئی یا بیوی کوئی اچھا کام کرنا چاہتی ہے اور شوہر رکاوٹ بن گیا تو یہ محبت نہیں عداوت ہے۔

﴿وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۳۶﴾ ''اور تمہارے لیے اب زمین میں ٹھکانا ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک خاص وقت تک۔''

اب زمین تمہاری جائے قیام ہے اور یہاں ضرورت کی تمام چیزیں ہم نے فراہم کر دی ہیں' لیکن یہ ایک وقتِ معین تک کے لیے ہے' یہ ابدی نہیں ہے' ایک وقت آئے گا کہ ہم یہ بساط لپیٹ دیں گے: ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ﴾ (الانبیاء:۱۰۴) ''جس دن کہ ہم تمام آسمانوں کو اس طرح لپیٹ لیں گے جیسے اوراق کا طومار لپیٹ لیا جاتا ہے''۔ یہ تخلیق ابدی نہیں ہے' ''اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى'' ہے' ''اِلٰى حِيْنٍ'' ہے۔

آیت ۳۷ ﴿فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ ''پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے ربّ سے چند کلمات' تو اللہ نے اُس کی توبہ قبول کر لی۔''

اس کی وضاحت سورۃ الاعراف میں ہے۔ جب حضرت آدمؑ نے اللہ تعالیٰ کا حکم عتاب آمیز سنا اور جنت سے باہر آ گئے تو سخت پشیمانی اور ندامت پیدا ہوئی کہ یہ میں نے کیا کیا' مجھ سے کیسی خطا سرزد ہو گئی کہ میں نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر ڈالی۔ لیکن ان کے پاس توبہ و استغفار کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ کن الفاظ میں اللہ تعالیٰ سے معافی چاہیں۔ اللہ کی رحمت یہ ہوئی کہ اُس نے الفاظ انہیں خود تلقین فرما دیے۔ یہ اللہ کی شانِ رحیمی ہے۔ توبہ کی اصل حقیقت انسان کے اندر گناہ پر ندامت کا پیدا ہو جانا ہے۔ اقبال نے عنفوانِ شباب میں جو اشعار کہے تھے ان میں سے ایک شعر کو سن کر اُس وقت کے اساتذہ بھی پھڑک اُٹھے تھے ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

یعنی شرمندگی کے باعث میری پیشانی پر پسینے کے جو قطرے نمودار ہو گئے میرے پروردگار کو وہ اتنے عزیز ہوئے کہ اُس نے انہیں موتیوں کی طرح چُن لیا۔ حضرات آدم و حوا علیہما السلام کو جب اپنی غلطی پر ندامت ہوئی تو وہ گریہ و زاری میں مشغول ہو گئے۔ اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے انہیں چند کلمات القا فرمائے جن سے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ وہ کلمات سورۃ الاعراف میں بیان ہوئے ہیں: ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ۖ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳﴾ ''اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اور اگر تُو نے ہمیں بخش نہ دیا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہم ضرور خسارہ پانے والوں میں ہو جائیں گے''۔ تباہ و برباد

ہو جائیں گے۔

اس مقام پر شیطنت اور آدمیت کا فوری تقابل موجود ہے۔ غلطی ابلیس سے بھی ہوئی' اللہ کے حکم سے سرتابی ہوئی' لیکن اُسے اس پر ندامت نہیں ہوئی بلکہ وہ تکبّر کی بنا پر مزید اکڑ گیا کہ ''اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ'' اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا۔ دوسری طرف غلطی آدم سے بھی ہوئی' نافرمانی ہوئی' لیکن وہ اس پر پشیمان ہوئے اور توبہ کی۔ وہ طرزِ عمل شیطنت ہے اور یہ آدمیت ہے۔ ورنہ کوئی انسان گناہ سے اور معصیت سے مبرّا نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے:

((کُلُّ بَنِیْ آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ))(۵)

''آدمؑ کی تمام اولاد خطا کار ہے' اور اِن خطا کاروں میں بہتر وہ ہیں جو توبہ کر لیں۔''

حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی ہوئی۔ انہیں اس پر ندامت ہوئی' انہوں نے توبہ کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمالی۔

﴿اِنَّہٗ ہُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیۡمُ ﴿۳۷﴾﴾ ''یقیناً وہی تو ہے توبہ کا بہت قبول کرنے والا' بہت رحم فرمانے والا۔''

توبہ کا لفظ دونوں طرف سے آتا ہے۔ بندہ بھی توّاب ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیۡنَ وَیُحِبُّ الۡمُتَطَہِّرِیۡنَ ﴿۲۲۲﴾﴾ (البقرۃ) جبکہ توّاب اللہ تعالیٰ بھی ہے۔ اس کی اصل حقیقت سمجھ لیجیے۔ بندے نے خطا کی اور اللہ سے دور ہو گیا تو اللہ نے اپنی رحمت کی نگاہ اُس سے پھیر لی۔ بندے نے توبہ کی تو اللہ پھر اپنی رحمت کے ساتھ اُس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ توبہ کے معنی ہیں پلٹنا۔ بندہ معصیت سے توبہ کر کے اپنی اصلاح کی طرف' بندگی کی طرف' اطاعت کی طرف پلٹ آیا' اور اللہ نے جو اپنی نظرِ رحمت بندے سے پھیر لی تھی' پھر اپنی شانِ غفاری اور رحیمی کے ساتھ بندے کی طرف توجہ فرمالی۔ اس کے لیے حدیث میں الفاظ آتے ہیں:

((... وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ بِشِبْرٍ تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ ذِرَاعًا وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَیَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَیْہِ بَاعًا، وَاِنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُہٗ ھَرْوَلَۃً))(۶)

''..... اور اگر وہ (میرا بندہ) بالشت بھر میری طرف آتا ہے تو میں ہاتھ بھر اُس کی طرف آتا ہوں' اور اگر وہ ہاتھ بھر میری طرف آتا ہے تو میں دو ہاتھ اُس کی طرف آتا ہوں' اور اگر وہ چل کر میری طرف آتا ہے تو میں دوڑ کر اس کی طرف آتا ہوں۔''

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے راہ رَوِ منزل ہی نہیں!

وہ تو توّاب ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ ''تَابَ'' بندے کے لیے آئے گا تو ''اِلٰی'' کے صلہ کے ساتھ آئے گا۔ جیسے ﴿اِنِّیۡ تُبۡتُ اِلَیۡکَ﴾ اور جب اللہ کے لیے آئے گا تو ''عَلٰی'' کے صلہ کے ساتھ ''تَابَ عَلٰی'' آئے گا' جیسے آیت زیر مطالعہ میں آیا: ﴿فَتَابَ عَلَیۡہِ﴾۔ اللہ کی شان بہت بلند ہے۔ انسان توبہ کرتا ہے تو اُس کی طرف توبہ کرتا ہے' جبکہ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ بندے پر توبہ کرتا ہے۔

آیت ۳۸ ﴿قُلۡنَا اہۡبِطُوۡا مِنۡہَا جَمِیۡعًا ۚ﴾ ''ہم نے کہا: تم سب کے سب یہاں سے اتر جاؤ۔''

اب یہاں لفظ ''اِہۡبِطُوۡا'' آیا ہے جو اس سے پہلے بھی آیا ہے۔ جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ تخلیقِ آدمؑ آسمانوں پر ہوئی ہے اور وہ

۵۔ سنن ابن ماجہ' کتاب الزھد۔ وسنن الترمذی' کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع۔ (الفاظ ابن ماجہ کے ہیں)

۶۔ صحیح البخاری' کتاب التوحید' باب ذکر النبی وروایتہ عن ربہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب فضل الذکر والدعاء والتقرب الی اللہ تعالیٰ۔

جنت بھی آسمانوں پر ہی تھی جہاں حضرت آدمؑ آزمائش یا تربیت کے لیے رکھے گئے تھے وہ ''اِهْبِطُوْا'' کا ترجمہ کریں گے کہ انہیں آسمان سے زمین پر اترنے کا حکم دیا گیا۔ لیکن جو لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کو زمین پر ہی کسی بلند مقام پر رکھا گیا تھا وہ کہتے ہیں کہ ''اِهْبِطُوْا'' سے مراد بلند جگہ سے نیچے اترنا ہے نہ کہ آسمان سے زمین پر اترنا۔ وہ آزمائشی جنت کسی اونچی سطح مرتفع پر تھی۔ وہاں پر حکم دیا گیا کہ نیچے اترو اور جاؤ' اب تمہیں زمین میں ہل چلانا پڑے گا اور روٹی حاصل کرنے کے لیے محنت کرنا پڑے گی۔ یہ نعمتوں کے دسترخوان جو یہاں بچھے ہوئے تھے اب تمہارے لیے نہیں ہیں۔ اس معنی میں اس لفظ کا استعمال اسی سورۃ البقرۃ کے ساتویں رکوع میں ہوا ہے: ﴿اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ﴾ (آیت ۶۱)

﴿فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾﴾ ''تو جب بھی آئے تمہارے پاس میری جانب سے کوئی ہدایت' تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔''

یہ ہے علمِ انسانی کا دوسرا گوشہ' یعنی علم بالوحی (Revealed Knowledge)۔ اس چوتھے رکوع کا حسن ملاحظہ کیجیے کہ اس کے شروع میں علم بالحواس یا اکتسابی علم (Acquired Knowledge) کا ذکر ہے جو بالقُوّۃ (potentially) حضرت آدمؑ میں رکھ دیا گیا اور جسے انسان نے پھر اپنی محنت سے' اپنے حواس اور عقل کے ذریعے سے آگے بڑھایا۔ یہ علم مسلسل ترقی پذیر ہے اور آج مغربی اقوام اس میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ کبھی ایک زمانے میں مسلمان بہت آگے نکل گئے تھے' لیکن ظاہر ہے کہ اس دنیا میں عروج تو انہی کو ہوگا جنہیں سب سے زیادہ اس کی آگہی حاصل ہوگی۔ البتہ وہ علم جو آسمان سے نازل ہوتا ہے وہ عطائی (given) ہے' جو وحی پر مبنی ہے۔ اور انسان کے مقامِ خلافت کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جو احکام اس کے پاس آئیں' وہ جو ہدایات بھی بھیجے ان کی پورے پورے طور پر پیروی کرے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا کہ جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔

آیت ۳۹ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''اور جو کفر کریں گے''

ہماری اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کریں گے' ناشکری کریں گے۔

﴿وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ﴾ ''اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے''

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''وہ آگ والے (جہنمی) ہوں گے' اس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

یہ گویا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوعِ انسانی کو ابدی منشور (charter) عطا کر دیا گیا جب زمین پر خلیفہ کی حیثیت سے انسان کا تقرر کیا گیا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ البقرۃ کے یہ ابتدائی چار رکوع قرآن کی دعوت اور قرآن کے بنیادی فلسفہ پر مشتمل ہیں' اور ان میں مکی سورتوں کے مضامین کا خلاصہ آ گیا ہے۔

آیات ۴۰ تا ۴۶

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۠ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَي الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾ ع

اب یہاں سے بنی اسرائیل سے خطاب شروع ہو رہا ہے۔ یہ خطاب پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک' مسلسل دس رکوعات پر محیط ہے' البتہ ان میں ایک تقسیم ہے۔ پہلا رکوع دعوت پر مشتمل ہے' اور جب کسی گروہ کو دعوت دی جاتی ہے تو تشویق و ترغیب' دلجوئی اور نرمی کا انداز اختیار کیا جاتا ہے' جو دعوت کے اجزاءِ لاینفک ہیں۔ اس انداز کے بغیر دعوت مؤثر نہیں ہوتی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ یہ سات آیات (پانچواں رکوع) ان دس رکوعوں کے لیے بمنزلۂ فاتحہ ہیں۔ بنی اسرائیل کی حیثیت سابقہ اُمتِ مُسلمہ کی تھی' جن کو یہاں دعوت دی جا رہی ہے۔ وہ بھی مسلمان ہی تھے' لیکن حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کا انکار کر کے کافر ہو گئے۔ ورنہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے' شریعت اُن کے پاس تھی' بڑے بڑے علماء اُن میں تھے' علم کا چرچا اُن میں تھا۔ غرضیکہ سب کچھ تھا۔ یہاں ان کو دعوت دی جا رہی ہے۔ اس سے ہمیں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ آج مسلمانوں میں' جو اپنی حقیقت کو بھول گئے ہیں' اپنے فرضِ منصبی سے غافل ہو گئے ہیں اور دنیا کی دیگر قوموں کی طرح ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں' اگر کوئی ایک داعی گروہ کھڑا ہو تو ظاہر بات ہے سب سے پہلے اُسے اسی اُمت کو دعوت دینی ہوگی۔ اس لیے کہ دنیا تو اسلام کو اِسی اُمت کے حوالے سے پہچانے گی (Physician heals thyself)۔ پہلے یہ خود ٹھیک ہو اور صحیح اسلام کا نمونہ پیش کرے تو دنیا کو دعوت دے سکے گی کہ آؤ دیکھو یہ ہے اسلام! چنانچہ ان کو دعوت دینے کا جو اسلوب ہونا چاہیے وہ اس اسلوب کا عکس ہوگا جو ان سات آیات میں ہمارے سامنے آئے گا۔

آیت ۴۰ ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو مَیں نے تم پر کیا''

''بنی اسرائیل'' کی ترکیب کو سمجھ لیجیے کہ یہ مرکب اضافی ہے۔ ''اسر'' کا معنی ہے بندہ یا غلام۔ اسی سے ''اسیر'' بنا ہے جو کسی کا قیدی ہوتا ہے۔ اور لفظ ''ئیل'' عبرانی میں اللہ کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ اسرائیل کا ترجمہ ہوگا ''عبداللہ'' یعنی اللہ کا غلام' اللہ کی اطاعت کے قلادے کے اندر بندھا ہوا۔ ''اسرائیل'' لقب ہے حضرت یعقوب علیہ السلام کا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے اور ان سے جو نسل چلی وہ بنی اسرائیل ہے۔ ان ہی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی اور انہیں تورات دی گئی۔ پھر یہ ایک بہت بڑی اُمت بنے۔ قرآن مجید کے نزول کے وقت تک ان پر عروج و زوال کے چار ادوار آ چکے تھے۔ دو مرتبہ ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کی بارشیں ہوئیں اور انہیں

عروج نصیب ہوا' جبکہ دو مرتبہ دنیا پرستی' شہوت پرستی اور اللہ کے احکام کو پسِ پشت ڈال دینے کی سزا میں ان پر اللہ کے عذاب کے کوڑے برسے۔ اس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع میں آئے گا۔ اُس وقت جبکہ قرآن نازل ہو رہا تھا وہ اپنے اس زوال کے دور میں تھے۔ حال یہ تھا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے ہی ان کا ''معبدِ ثانی'' (Second Temple) بھی منہدم کیا جا چکا تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جو ہیکل سلیمانی بنایا تھا' جس کو یہ ''معبدِ اوّل'' (First Temple) کہتے ہیں' اسے بخت نصر (Nebukadnezar) نے حضرت مسیح علیہ السلام سے بھی چھ سو سال پہلے گرا دیا تھا۔ اسے انہوں نے دوبارہ تعمیر کیا تھا جو ''معبدِ ثانی'' کہلاتا تھا۔ لیکن ۷۰ عیسوی میں محمد عربی ﷺ کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے رومیوں نے حملہ کر کے یروشلم کو تباہ و برباد کر دیا' یہودیوں کا قتلِ عام کیا اور جو ''معبدِ ثانی'' انہوں نے تعمیر کیا تھا اُسے بھی مسمار کر دیا' جو اب تک گرا پڑا ہے' صرف ایک دیوارِ گریہ (Wailing Wall) باقی ہے جس کے پاس جا کر یہودی ماتم اور گریہ وزاری کر لیتے ہیں' اور اب وہ اسے سہ بارہ بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کے ''معبدِ ثالث'' (Third Temple) کے نقشے بن چکے ہیں' اس کا ابتدائی خاکہ تیار ہو چکا ہے۔ بہرحال جس وقت قرآن نازل ہو رہا تھا اُس وقت یہ بہت ہی پستی میں تھے۔ اس وقت ان سے فرمایا گیا: ''اے بنی اسرائیل! ذرا یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا تھا''۔ وہ انعام کیا ہے؟ میں نے تم کو اپنی کتاب دی' نبوت سے سرفراز فرمایا' اپنی شریعت تمہیں عطا فرمائی۔ تمہارے اندر داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے بادشاہ اٹھائے' جو بادشاہ بھی تھے' نبی بھی تھے۔

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ﴾ ''اور تم میرے وعدے کو پورا کرو تا کہ میں بھی تمہارے وعدے کو پورا کروں۔''

بنی اسرائیل سے نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا۔ تورات میں کتابِ استثناء یا سفرِ استثناء (Deuteronomy) کے اٹھارہویں باب کی آیات ۱۸۔۱۹ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب کر کے یہ الفاظ فرمائے:

''میں اُن کے لیے اُن ہی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری اُن باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا' نہ سنے تو میں اُن کا حساب اُس سے لوں گا۔''

یہ گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت کو بتایا جا رہا تھا کہ نبی آخر الزماں (ﷺ) آئیں گے اور تمہیں ان کی نبوت کو تسلیم کرنا ہے۔ قرآن مجید میں اس کا تفصیلی ذکر سورۃ الاعراف میں آئے گا۔ یہاں فرمایا کہ تم میرا عہد پورا کرو' میرے اس نبیؐ کو تسلیم کرو' اُس پر ایمان لاؤ' اس کی صدا پر لبیک کہو تو میرے انعام و اکرام مزید بڑھتے چلے جائیں گے۔

﴿وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾﴾ ''اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔''

آیت ۴۱ ﴿وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ ''اور ایمان لاؤ اُس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے جو تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے اُس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے''

ان الفاظ کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان لاؤ اس قرآن پر جو تصدیق کرتا ہے تورات کی اور انجیل کی۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ﴾ (المائدۃ:۴۴) ''ہم نے نازل کی تورات جس میں ہدایت اور روشنی تھی''۔ ﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (المائدۃ:۴۶) ''اور ہم نے اُس (عیسیٰ علیہ السلام) کو دی انجیل جس میں ہدایت اور روشنی تھی''۔ اور دوسرے یہ کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ اُن پیشین گوئیوں کے مصداق بن کر آئے ہیں جو تورات میں تھیں۔ ورنہ وہ پیشین گوئیاں جھوٹی

ثابت ہوتیں۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠﴾ ''اور تم ہی سب سے پہلے اس کا کفر کرنے والے نہ بن جاؤ۔''

یعنی قرآن کی دیدہ ودانستہ تکذیب کرنے والوں میں اوّل مت ہو۔ تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے۔ تم جانتے ہو کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کتاب اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ تم تو آخری نبی ﷺ کے انتظار میں تھے اور اُن کے حوالے سے دعائیں کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! اس نبی آخر الزماں ﷺ کے واسطے سے ہماری مدد فرما اور کافروں کے مقابلے میں ہمیں فتح عطا فرما۔ (یہ مضمون آگے چل کر اسی سورۃ البقرۃ ہی میں آئے گا۔) لیکن اب تم ہی اس کے اوّلین منکر ہو گئے ہو اور تم ہی اس کے سب سے بڑھ کر دشمن ہو گئے ہو۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۠﴾ ''اور میری آیات کے عوض حقیری قیمت قبول نہ کرو۔''

یہ آیاتِ الٰہیہ ہیں اور تم ان کو صرف اس لیے رد کر رہے ہو کہ کہیں تمہاری حیثیت' تمہاری مسندوں اور تمہاری چودھراہٹوں پر کوئی آنچ نہ آ جائے۔ یہ تو حقیری چیزیں ہیں۔ یہ صرف اس دنیا کا سامان ہیں' اس کے سوا کچھ نہیں۔

﴿وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿٤١﴾﴾ ''اور صرف میرا تقویٰ اختیار کرو۔''

مجھ ہی سے بچتے رہو!

آیت ۴۲ ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٢﴾﴾ ''اور نہ گڈمڈ کرو حق کے ساتھ باطل کو اور نہ چھپاؤ حق کو درانحالیکہ تم جانتے ہو۔''

یہ بات اچھی طرح نوٹ کر لیجیے کہ مغالطے میں غلط راہ پر پڑ جانا ضلالت اور گمراہی ہے' لیکن جانتے بوجھتے حق کو پہچان کر اُسے رد کرنا اور باطل کی روش اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔ اسی سورۃ البقرۃ میں آگے چل کر آئے گا کہ علماءِ یہود محمد رسول اللہ ﷺ کو اور قرآن کو اس طرح پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے تھے: ﴿يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ﴾ (آیت ۱۴۶) لیکن اس کے باوجود انہوں نے محض اپنی دُنیوی مصلحتوں کے پیشِ نظر آپ ﷺ اور قرآن کی تکذیب کی۔

آیت ۴۳ ﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ ''اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو''

﴿وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾﴾ ''اور جھکو (نماز میں) جھکنے والوں کے ساتھ۔''

یعنی باجماعت نماز ادا کیا کرو۔

اوّل تو یہود نے رکوع کو اپنے ہاں سے خارج کر دیا تھا' ثانیاً باجماعت نماز ان کے ہاں ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ انہیں رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ گویا صراحت کی جا رہی ہے کہ نبی آخر الزماں ﷺ پر صرف ایمان لانا ہی نجات کے لیے کافی نہیں' بلکہ تمام اصول میں آپؐ کی پیروی ضروری ہے۔ نماز بھی آپؐ کے طریقے پر پڑھو جس میں رکوع بھی ہو اور جو باجماعت ہو۔

آیت ۴۴ ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟''

ان آیات کے اصل مخاطب علماء یہود ہیں' جو لوگوں کو تقویٰ اور پارسائی کی تعلیم دیتے تھے' لیکن ان کا اپنا کردار اس کے برعکس

تھا۔ ہمارے ہاں بھی علماء اور واعظین کا حال اکثر و بیشتر یہی ہے کہ اونچے سے اونچا وعظ کہیں گے‘ اعلیٰ سے اعلیٰ بات کہیں گے‘ لیکن ان کے اپنے کردار کو اُس بات سے کوئی مناسبت ہی نہیں ہوتی جس کی وہ لوگوں کو دعوت دے رہے ہوتے ہیں۔ یہی درحقیقت علماءِ یہود کا کردار بن چکا تھا۔ چنانچہ ان سے کہا گیا کہ ’’کیا تم لوگوں کو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کے لیے کہتے ہو مگر خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟‘‘

﴿وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ﴾ ’’حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔‘‘

تم یہ کچھ کر رہے ہو اس حال میں کہ تم اللہ کی کتاب بھی پڑھتے ہو۔ یعنی تورات پڑھتے ہو‘ تم صاحبِ تورات ہو۔ ہمارے ہاں بھی بہت سے علماء کا‘ جنہیں ہم علماءِ سُوء کہتے ہیں‘ یہی حال ہو چکا ہے۔ بقول اقبال: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

قرآن حکیم کے ترجمے میں‘ اس کے مفہوم میں‘ اس کی تفسیر میں بڑی بڑی تحریفیں موجود ہیں۔ الحمد للہ کہ اس کا متن بچا ہوا ہے۔ اس لیے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ’’کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟‘‘

آیت ۴۵ ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ﴾ ’’اور مدد حاصل کرو صبر سے اور نماز سے۔‘‘

یہاں پر صبر کا لفظ بہت بامعنی ہے۔ علماءِ سُوء کیوں وجود میں آتے ہیں؟ جب وہ صبر اور قناعت کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں تو حُبِ مال ان کے دل میں گھر کر لیتی ہے اور وہ دنیا کے کُتے بن جاتے ہیں۔ پھر وہ دین کو بدنام کرنے والے ہوتے ہیں۔ بظاہر دینی مراسم کے پابند نظر آتے ہیں‘ لیکن دراصل ان کے پردے میں دنیاداری کا معاملہ ہوتا ہے۔ چنانچہ انہیں صبر کی تاکید کی جا رہی ہے۔ سورۃ المائدۃ میں یہود کے علماء و مشائخ پر بایں الفاظ تنقید کی گئی ہے: ﴿لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ﴾ (المائدۃ:۶۳) ’’کیوں نہیں روکتے انہیں ان کے علماء اور صوفیاء جھوٹ بولنے سے اور حرام کھانے سے؟‘‘ اگر کوئی عالم یا پیر اپنے ارادت مندوں کو ان چیزوں سے روکے گا تو پھر اس کو نذرانے تو نہیں ملیں گے‘ اس کی خدمتیں تو نہیں ہوں گی۔ چنانچہ اگر تو دنیا میں صبر اختیار کرنا ہے‘ تب تو آپ حق بات کہہ سکتے ہیں‘ اور اگر دُنیوی خواہشات (ambitions) مقدم ہیں تو پھر آپ کو کہیں نہ کہیں سمجھوتا (compromise) کرنا پڑے گا۔

صبر کے ساتھ جس دوسری شے کی تاکید کی گئی وہ نماز ہے۔ علماءِ یہود وضوحِ حق کے باوجود جو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لاتے تھے اس کی بڑی وجہ حُبِ مال اور حُبِ جاہ تھی۔ یہاں دونوں کا علاج بتا دیا گیا کہ حُبِ مال کا مداوا صبر سے ہوگا‘ جبکہ نماز سے عبودیت و تذلّل پیدا ہوگا اور حُبِ جاہ کا خاتمہ ہوگا۔

﴿وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ﴾ ’’اور یقیناً یہ بہت بھاری شے ہے‘‘

عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ اِنَّهَا کی ضمیر صرف صلوٰۃ کے لیے ہے۔ یعنی نماز بہت بھاری اور مشکل کام ہے۔ لیکن ایک رائے یہ ہے کہ یہ درحقیقت اس پورے طرزِ عمل کی طرف اشارہ ہے کہ دنیا کے شدائد اور ابتلاءات کا مقابلہ صبر اور نماز کی مدد سے کیا جائے۔ مطلوب طرزِ عمل یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کے متعلقات میں کم سے کم پر قانع ہو جاؤ اور حق کا بول بالا کرنے کے لیے میدان میں آ جاؤ۔ اس کے ساتھ ساتھ نماز کو اپنے معمولاتِ حیات کا محور بناؤ‘ جو کہ عماد الدین ہے۔ فرمایا کہ یہ روش یقیناً بہت بھاری ہے‘ اور

نماز بھی بہت بھاری ہے۔

﴿اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''مگر اُن عاجزوں پر (بھاری نہیں ہے)۔''

اُن خشوع رکھنے والوں پر' اُن ڈرنے والوں پر یہ روش بھاری نہیں ہے جن کے دل اللہ کے آگے جھک گئے ہیں۔

آیت ﴿الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ﴾ ''جنہیں یہ یقین ہے کہ وہ اپنے ربّ سے ملاقات کرنے والے ہیں''

میں نے شروع میں ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾﴾ کے ذیل میں توجہ دلائی تھی کہ یہ ایمان بالآخرت ہی ہے جو انسان کو عمل کے میدان میں سیدھا رکھتا ہے۔

﴿وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ ''اور (جنہیں یہ یقین ہے کہ) بالآخر انہیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

انہیں اس کے رُوبرو حاضر ہونا ہے۔

آیات ۴۷ تا ۵۹

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۷﴾ وَاتَّقُوْا
يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ
لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ
وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾ وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ
فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾ وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ
اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى
لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾ وَاِذْ
قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾
ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ
الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ
سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا
غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع ۱۳

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع سے چودھویں رکوع تک' بلکہ پندرھویں رکوع کی پہلی دو آیات بھی شامل کر لیجیے' یہ دس رکوعوں سے دو آیات زائد ہیں کہ جن میں خطاب کُل کا کُل بنی اسرائیل سے ہے۔ البتہ ان میں سے پہلا رکوع

دعوت پر مشتمل ہے' جس میں انہیں نبی کریم ﷺ پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت دی گئی ہے' جبکہ بقیہ نو رکوع اُس فردِ قرارداد جرم پر مشتمل ہیں جو بنی اسرائیل پر عائد کی جا رہی ہے کہ ہم نے تمہارے ساتھ یہ احسان واکرام کیا' تم پر یہ فضل کیا' تم پر یہ کرم کیا' تمہیں یہ حیثیت دی' تمہیں یہ مقام دیا اور تم نے اس اس طور سے اپنے اس مشن کی خلاف ورزی کی جو تمہارے سپرد کیا گیا تھا اور اپنے مقام و مرتبہ کو چھوڑ کر دُنیا پرستی کی روش اختیار کی۔ ان نو رکوعوں میں بنی اسرائیل کی تاریخ کا تو ایک بہت بڑا حصہ اُس کے خدوخال (features) سمیت آ گیا ہے' لیکن اصل میں یہ اُمتِ مُسلمہ کے لیے بھی ایک پیشگی تنبیہ ہے کہ کوئی مسلمان اُمت جب بگڑتی ہے تو اُس میں یہ اور یہ خرابیاں آ جاتی ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث بھی موجود ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَاءِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ)) (۷)

''میری اُمت پر بھی وہ سب حالات وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر آئے تھے' بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں جو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل ہوا ہے:

((لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ)) قُلْنَا: يَارَسُوْلَ اللّٰهِ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ: ((فَمَنْ؟)) (۸)

''تم لازماً اپنے سے پہلوں کے طور طریقوں کی پیروی کرو گے' بالشت کے مقابلے میں بالشت اور ہاتھ کے مقابلے میں ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی گھس کر رہو گے''۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! یہود و نصاریٰ کی؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو اور کس کی؟''

ترمذی کی مذکورہ بالا حدیث میں تو یہاں تک الفاظ آتے ہیں کہ: ((حَتّٰى اِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ اَتٰى اُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ اُمَّتِيْ مَنْ يَصْنَعُ ذٰلِكَ)) یعنی اگر اُن میں کوئی بدبخت ایسا اٹھا ہوگا جس نے اپنی ماں سے علی الاعلان زنا کیا تھا تو تم میں سے بھی کوئی شقی ایسا ضرور اٹھے گا جو یہ حرکت کرے گا۔ اس اعتبار سے ان رکوعوں کو پڑھتے ہوئے یہ نہ سمجھئے کہ یہ محض اگلوں کی داستان ہے' بلکہ: ؎

''خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں''

کے مصداق یہ ہمارے لیے ایک آئینہ ہے اور ہمیں ہر مرحلے پر سوچنا ہوگا' دروں بینی کرنی ہوگی کہ کہیں اسی گمراہی میں ہم بھی تو مبتلا نہیں؟

دوسرا اہم نکتہ پہلے سے ہی یہ سمجھ لیجیے کہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۴۷۔۴۸ جن سے اس چھٹے رکوع کا آغاز ہو رہا ہے' یہ دو آیتیں بعینہٖ پندرہویں رکوع کے آغاز میں پھر آئیں گی۔ ان میں سے پہلی آیت میں تو شوشے بھر کا فرق بھی نہیں ہے' جبکہ دوسری آیت میں صرف الفاظ کی ترتیب بدلی ہے' مضمون وہی ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہ گویا دو بریکٹ ہیں اور نو (۹) رکوعوں کے مضامین ان دو بریکٹوں کے درمیان ہیں۔ اور سورۃ البقرۃ کا پانچواں رکوع جو ان بریکٹوں سے باہر ہے' اس کے مضامین بریکٹوں کے اندر کے سارے مضامین سے

۷۔ سنن الترمذی' کتاب الایمان' باب ماجاء فی افتراق هذه الامة۔

۸۔ صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ و صحیح مسلم' کتاب العلم' باب اتباع سنن الیهود و النصاری۔

ضرب کھا رہے ہیں۔ یہ حساب کا بہت ہی عام فہم سا قاعدہ ہے کہ بریکٹ کے باہر لکھی ہوئی رقم' جس کے بعد جمع یا تفریق وغیرہ کی کوئی علامت نہ ہو' وہ بریکٹ کے اندر موجود تمام اقدار (values) کے ساتھ ضرب کھائے گی۔ تو گویا اس پورے معاملے میں ہر ہر قدم پر رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت موجود ہے۔ یہ وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ اس حصے میں بعض آیات ایسی آ گئی ہیں جن سے کچھ لوگوں کو مغالطہ پیدا ہوا یا جن سے کچھ لوگوں نے جان بوجھ کر فتنہ پیدا کیا کہ نجاتِ اُخروی کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان ضروری نہیں ہے۔ اس فتنے نے ایک بار اکبر کے زمانے میں ''دینِ الٰہی'' کی شکل میں جنم لیا تھا کہ آخرت میں نجات کے لیے صرف خدا کو مان لینا' آخرت کو مان لینا اور نیک اعمال کرنا کافی ہے' کسی رسول پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔ یہ فتنہ صوفیاء میں بھی بہت بڑے پیمانے پر پھیلا اور ''مسجد مندر بکرد و نور'' کے فلسفے کی تشہیر کی گئی۔ یعنی مسجد میں اور مندر میں ایک ہی نور ہے' سب مذاہب اصل میں ایک ہی ہیں' سارا فرق شریعتوں کا اور عبادات کی ظاہری شکل کا ہے' اور وہ رسولوں سے متعلق ہے۔ چنانچہ رسولوں کو بیچ میں سے نکال دیجیے تو یہ ''دینِ الٰہی'' (اللہ کا دین) رہ جائے گا۔ یہ ایک بہت بڑا فتنہ تھا جو ہندوستان میں اُس وقت اٹھا جب سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کا اقتدار چوٹی (climax) پر تھا۔ یہ فتنہ جس مسلمان حکمران کا اٹھایا ہوا تھا وہ ''اکبرِ اعظم'' اور ''مغلِ اعظم'' کہلاتا تھا۔ اس کے پیش کردہ ''دین'' کا فلسفہ یہ تھا کہ دینِ محمدی ﷺ کا دَور ختم ہو گیا (نعوذ باللہ) وہ ایک ہزار سال کے لیے تھا' اب دوسرا ہزار سال (الف ثانی) ہے اور اس کے لیے نیا دین ہے۔ اُسے ''دینِ اکبری'' بھی کہا گیا اور ''دینِ الٰہی'' بھی۔ سورۃ البقرۃ کے اس حصے میں ایک آیت آئے گی جس سے کچھ لوگوں نے اس ''دینِ الٰہی'' کے لیے استدلال کیا تھا۔

ہندوستان میں بیسویں صدی میں یہ فتنہ پھر اٹھا جب گاندھی جی نے ''متحدہ وطنی قومیت'' کا نظریہ پیش کیا۔ اس موقع پر مسلمانوں میں سے ایک بہت بڑا نابغہ (genius) انسان ابوالکلام آزاد بھی اس فتنے کا شکار ہو گیا۔ گاندھی جی اپنی پرارتھنا میں کچھ قرآن کی تلاوت بھی کرواتے' کچھ گیتا بھی پڑھواتے' کچھ اُپنشدوں سے' کچھ بائبل سے اور کچھ گُرو گرنتھ سے بھی استفادہ کیا جاتا۔ متحدہ وطنی قومیت کا تصور یہ تھا کہ ایک وطن کے رہنے والے لوگ ایک قوم ہیں' لہٰذا ان سب کو ایک ہونا چاہیے' مذہب تو انفرادی معاملہ ہے' کوئی مسجد میں چلا جائے' کوئی مندر میں چلا جائے' کوئی گُردوارے میں چلا جائے' کوئی کلیسا' سینگاگ یا چرچ میں چلا جائے تو اس سے کیا فرق واقع ہوتا ہے؟ اس طرح کے نظریات اور تصورات کا توڑ یہی ہے کہ یوں سمجھ لیجیے کہ پانچویں رکوع کی سات آیات بریکٹ کے باہر ہیں اور یہ بریکٹوں کے اندر کے مضمون سے مسلسل ضرب کھا رہی ہیں۔ چنانچہ ان بریکٹوں کے درمیان جتنا بھی مضمون آ رہا ہے وہ ان کے تابع ہو گا۔ گویا جہاں تک محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کا معاملہ ہے وہ ہر مرحلے پر مقدّر (understood) سمجھا جائے گا۔ اب ہم ان آیات کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

آیت ۴۰ ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ ''اے یعقوب کی اولاد! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا''

اس کی وضاحت گزشتہ رکوع میں ہو چکی ہے' لیکن یہاں آگے جو الفاظ آ رہے ہیں بہت زوردار ہیں:

﴿وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۴۷﴾ ''اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت عطا کی تمام جہانوں پر۔''

عربی نحو کا یہ قاعدہ ہے کہ کہیں ظرف کا تذکرہ ہوتا ہے (یعنی جس میں کوئی شے ہے) لیکن اس سے مراد مظروف ہوتا ہے (یعنی ظرف کے اندر جو شے ہے)۔ یہاں بھی ظرف کی جمع لائی گئی ہے لیکن اس سے مظروف کی جمع مراد ہے۔ ''تمام جہانوں پر فضیلت''

سے مراد ''جہان والوں پر فضیلت'' ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں تمام اقوامِ عالم پر فضیلت عطا کی۔ عالمِ انسانیت کے اندر جتنے بھی مختلف گروہ، نسلیں اور طبقات ہیں اُن میں فضیلت عطا کی۔

آیت ۴۸ ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی''

قبل ازیں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ انسان کے عمل کے اعتبار سے سب سے مؤثر شے ایمان بالآخرۃ ہے۔ محاسبۂ آخرت اگر مستحضر رہے گا تو انسان سیدھا رہے گا' اور اگر اس میں ضعف آ جائے تو ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت بھی نامعلوم کیا کیا شکلیں اختیار کر لیں۔ اس آیت کے اندر چار اعتبارات سے محاسبۂ اُخروی پر زور دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے فرمایا کہ ڈرو اُس دن سے جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے گی۔

﴿وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی''

﴿وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ ''اور نہ کسی سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا''

﴿وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۸﴾ ''اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

ایمان بالآخرۃ کے ضمن میں لوگوں نے طرح طرح کے عقیدے گھڑ رکھے ہیں' جن میں شفاعتِ باطلہ کا تصور بھی ہے۔ اہلِ عرب سمجھتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ انہوں نے لات' منات اور عُزّیٰ وغیرہ کے نام سے اُن کے بُت بنا رکھے تھے' جنہیں وہ پوجتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کی یہ لاڈلی بیٹیاں ہمیں اپنے ''ابا جان'' سے چھڑا لیں گی۔ (نعوذ باللہ من ذٰلک!) ہمارے ہاں بھی شفاعتِ باطلہ کا تصور موجود ہے کہ اولیاء اللہ ہمیں چھڑا لیں گے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے بارے میں غلط تصورات موجود ہیں۔ ایک شفاعتِ حقہ ہے' جو برحق ہے' اس کی وضاحت کا یہ موقع نہیں ہے۔ اسی سورۂ مبارکہ میں جب ہم آیۃ الکرسی کا مطالعہ کریں گے تو اِن شاء اللہ اس کی وضاحت بھی ہو گی۔ یہ سارے تصورات اور خیالات جو ہم نے گھڑ رکھے ہیں' ان کی نفی اس آیت کے اندر دوٹوک انداز میں کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بنی اسرائیل پر جو احسانات و انعامات ہوئے اور ان کی طرف سے جو ناشکریاں ہوئیں ان کا تذکرہ بڑی تیزی کے ساتھ کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ یہ واقعات کئی سو برس پر محیط ہیں اور ان کی تفصیل مکی سورتوں میں آ گئی ہے۔ ان واقعات کی سب سے زیادہ تفصیل سورۃ الاعراف میں موجود ہے۔ یہاں پر تو واقعات کا پے بہ پے تذکرہ کیا جا رہا ہے' جیسے کسی ملزم پر فردِ قرارداد جرم عائد کی جاتی ہے تو اُس میں سب کچھ گنوایا جاتا ہے کہ تم نے یہ کیا' یہ کیا اور یہ کیا۔

آیت ۴۹ ﴿وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ﴾ ''اور ذرا یاد کرو جب کہ ہم نے تمہیں نجات دی تھی فرعون کی قوم سے''

﴿يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ﴾ ''وہ تمہیں بدترین عذاب میں مبتلا کیے ہوئے تھے''

﴿يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ﴾ ''تمہارے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے۔''

فرعون نے حکم دیا تھا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی لڑکا پیدا ہو اُس کو قتل کر دیا جائے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے تاکہ ان سے خدمت لی جا سکے اور انہیں لونڈیاں بنایا جا سکے۔ بنی اسرائیل کے ساتھ یہ معاملہ دو مواقع پر ہوا ہے۔ اس کی تفصیل

ان شاء اللہ بعد میں آئے گی۔

﴿وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ﴿۴۹﴾﴾ ''اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے بڑی آزمائش تھی۔''

آیت ۵۰ ﴿وَاِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ہم نے تمہاری خاطر سمندر کو (یا دریا کو) پھاڑ دیا''

یہ ایک مختلف فیہ بات ہے کہ بنی اسرائیل نے مصر سے جزیرہ نمائے سینا آنے کے لیے کس سمندر یا دریا کو عبور کیا تھا۔ ایک رائے یہ ہے کہ دریائے نیل کو عبور کر کے گئے تھے' لیکن یہ بات اس اعتبار سے غلط ہے کہ دریائے نیل تو مصر کے اندر بہتا ہے' وہ کبھی بھی مصر کی حد نہیں بنا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے خلیج سویز کو عبور کیا تھا۔ بحیرۂ قلزم (Red Sea) اوپر جا کر دو کھاڑیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے' مشرق کی طرف خلیج عقبہ اور مغرب کی طرف خلیج سویز ہے اور ان کے درمیان جزیرہ نمائے سینا (Sinai Peninsula) ہے۔ یہ اسی طرح کی تکون ہے جیسے جزیرہ نمائے ہند (Indian Peninsula) ہے۔ خلیج سویز اور بحیرۂ روم کے درمیان کئی بڑی بڑی جھیلیں تھیں' جن کو باہم جوڑ جوڑ کر درمیان میں حائل خشکی کو کاٹ کر نہر سویز بنائی گئی ہے' جو اب ایک مسلسل رابطہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل نے خلیج سویز کو عبور کیا تھا۔ مجھے خود بھی اسی رائے سے اتفاق ہے۔ اس لیے کہ کوہِ طور اس جزیرہ نمائے سینا کی نوک (tip) پر واقع ہے' جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو چالیس دن رات کے لیے بلایا گیا اور پھر انہیں تورات دی گئی۔ بنی اسرائیل نے خلیج سویز کو اس طرح عبور کیا کہ حضرت موسیٰؑ کے عصا کی ایک ضرب سے سمندر پھٹ گیا۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿فَانْفَلَقَ فَکَانَ کُلُّ فِرْقٍ کَالطَّوْدِ الْعَظِیْمِ ﴿۶۳﴾﴾ (الشعراء) ''پس سمندر پھٹ گیا اور ہو گیا ہر حصہ جیسے بڑا پہاڑ''۔ سمندر کا پانی دونوں طرف پہاڑ کی طرح کھڑا ہو گیا اور بنی اسرائیل اس کے درمیان میں سے نکل گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے جب فرعون اپنا لشکر لے کر آیا تو اُس نے سوچا کہ ہم بھی ایسے ہی نکل جائیں گے' لیکن وہ غرق ہو گئے۔ اس لیے کہ دونوں طرف کا پانی آپس میں مل گیا۔ یہ ایک معجزانہ کیفیت تھی اور یہ بات فطرت (nature) کے قوانین کے مطابق نہیں تھی۔

﴿فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾﴾ ''پھر تمہیں تو نجات دے دی اور فرعون کے لوگوں کو غرق کر دیا جبکہ تم دیکھ رہے تھے۔''

تمہاری نگاہوں کے سامنے فرعون کے لاؤ لشکر کو غرق کر دیا۔ بنی اسرائیل خلیج سویز سے گزر چکے تھے اور دوسری جانب کھڑے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اِدھر سے فرعون اور اس کا لاؤ لشکر سمندر میں داخل ہوا تو پانی دونوں طرف سے آ کر مل گیا اور یہ سب غرق ہو گئے۔

آیت ۵۱ ﴿وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً﴾ ''اور یاد کرو جب ہم نے وعدہ کیا موسیٰؑ سے چالیس رات کا''

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمانے کے لیے چالیس دن رات کے لیے کوہِ طور پر بلایا۔

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ ''پھر تم نے بنا لیا بچھڑے کو (معبود) اُس کے بعد''

بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں بچھڑے کی پرستش شروع کر دی اور اسے معبود بنا لیا۔

﴿وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾﴾ ''اور تم ظالم تھے۔''

بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے بہت بڑے ظلم کا ارتکاب کیا تھا۔ الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ﴾ کے مصداق عظیم ترین ظلم جو ہے وہ شرک ہے' اور بنی اسرائیل نے شرکِ جلی کی یہ مکروہ ترین شکل اختیار کی کہ بچھڑے کی پرستش شروع کر دی!

آیت ۵۲ ﴿ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِکَ﴾ '' پھر ہم نے تمہیں اس کے بعد بھی معاف کیا''

یہ ہمارا کرم رہا ہے' ہماری رحمت رہی ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾﴾ ''تاکہ تم شکر کرو۔''

آیت ۵۳ ﴿وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾﴾ ''اور یاد کرو جب کہ ہم نے موسیٰؑ کو کتاب اور فرقان عطا فرمائی تاکہ تم ہدایت پاؤ۔''

''فرقان'' سے مراد حق اور باطل کے درمیان فرق کر دینے والی چیز ہے اور کتاب کا لفظ عام طور پر شریعت کے لیے آتا ہے۔

آیت ۵۴ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ کہا تھا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے''

﴿يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! یقیناً تم نے اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے بچھڑے کو معبود بنا کر''

﴿فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ﴾ ''پس اب توبہ کرو اپنے پیدا کرنے والے کی جناب میں''

﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ﴾ ''تو قتل کرو اپنے آپ کو۔''

یہ واقعہ تورات میں تفصیل سے آیا ہے' قرآن میں اس کی تفصیل مذکور نہیں ہے۔ بہت سے واقعات جن کا قرآن میں اجمالاً ذکر ہے ان کی تفصیل کے لیے ہمیں تورات سے رجوع کرنا پڑتا ہے' ورنہ بعض آیات کا صحیح صحیح مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ یہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ﴾ ''مار ڈالو اپنی جانیں'' یا ''قتل کرو اپنے آپ کو''۔ اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ دراصل قتلِ مرتد کی سزا ہے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے۔ ہر قبیلے میں سے کچھ لوگوں نے یہ کفر اور شرک کیا کہ بچھڑے کو معبود بنا لیا' باقی لوگوں نے ایسا نہیں کیا۔ بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ ہر قبیلے کے وہ لوگ جو اس شرک میں ملوث نہیں ہوئے اپنے اپنے قبیلے کے ان لوگوں کو قتل کریں جو اس کفر و شرک کے مرتکب ہوئے۔ ''فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ'' سے مراد یہ ہے کہ تم اپنے قبیلے کے لوگوں کو قتل کرو۔ اس لیے کہ قبائلی زندگی بڑی حساس ہوتی ہے اور کسی دوسرے قبیلے کی مداخلت سے قبائلی عصبیت بھڑک اٹھنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس حکم پر عمل درآمد کے نتیجے میں ستر ہزار یہودی قتل ہوئے۔ اس سے بڑی توبہ اور اس سے بڑی تطہیر (purge) ممکن نہیں ہے۔ کسی بھی نظریاتی جماعت کے اندر تزکیہ اور تطہیر کا عمل بہت ضروری ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ایک نظریے کو قبول کر کے جماعت سے وابستہ ہو جاتے ہیں' لیکن رفتہ رفتہ نظریہ اوجھل ہو جاتا ہے اور اپنے مفادات اور چودھراہٹیں مقدم ہو جاتی ہیں۔ اسی سے جماعتیں خراب ہوتی ہیں اور غلط راستے پر پڑ جاتی ہیں۔ چنانچہ نظریاتی جماعتوں میں یہ عمل بہت ضروری ہوتا ہے کہ جو افراد نظریے سے منحرف ہو جائیں ان کو جماعت سے کاٹ کر علیحدہ کر دیا جائے۔

قرآن حکیم کے اس مقام سے قتلِ مرتد کی سزا ثابت ہوتی ہے' جبکہ قتلِ مرتد کا واضح حکم حدیثِ نبویؐ میں موجود ہے۔ ہمارے بعض جدید دانشور اسلام میں قتلِ مرتد کی حد کو تسلیم نہیں کرتے' لیکن میرے نزدیک یہ شریعتِ موسویؑ کا تسلسل ہے۔ شریعتِ موسویؑ کے جن احکام کے بارے میں صراحتاً یہ معلوم نہیں کہ انہیں تبدیل کر دیا گیا ہے وہ شریعتِ محمدی ﷺ کا جزو بن گئے ہیں۔ شادی شدہ زانی پر حدِ رجم کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن مجید میں حدِ رجم کی کوئی صریح آیت موجود نہیں ہے' لیکن احادیث میں یہ سزا موجود ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں مرتد کے قتل کی کوئی صریح آیت موجود نہیں ہے' لیکن یہ حدیث اور سنت سے ثابت ہے۔ البتہ ان دونوں سزاؤں کا منبع اور ماخذ دراصل تورات ہے۔ اس اعتبار سے قرآن حکیم کا یہ مقام بہت اہم ہے' لیکن اکثر لوگ یہاں سے بہت سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔

بنی اسرائیل جب مصر سے نکلے تو ان کی تعداد چھ لاکھ تھی۔ جزیرہ نمائے سینا پہنچنے کے بعد ان کی تعداد مزید بڑھ گئی ہوگی۔ اُن میں سے ستر ہزار افراد کو شرک کی پاداش میں قتل کیا گیا' اور ہر قبیلے نے جو اپنے مرتد تھے ان کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔

﴿ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ﴾ ''یہی تمہارے لیے تمہارے رب کے نزدیک بہتر بات ہے۔''

﴿فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ﴾ ''تو (اللہ نے) تمہاری توبہ قبول کر لی۔''

بنی اسرائیل کی توبہ اس طرح قبول ہوئی کہ اُمت کا تزکیہ ہوا اور ان میں سے جن لوگوں نے اتنی بڑی غلط حرکت کی تھی ان کو ذبح کر کے' قتل کر کے اُمت سے کاٹ کر پھینک دیا گیا۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۵۴﴾ ''یقیناً وہ تو ہے ہی توبہ کا بہت قبول فرمانے والا' بہت رحم فرمانے والا۔''

آیت ۵۵ ﴿وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ ''اور یاد کرو جبکہ تم نے کہا تھا اے موسیٰ! ہم تمہارا ہرگز یقین نہیں کریں گے جب تک ہم اللہ کو سامنے نہ دیکھ لیں''

اٰمَنَ يُؤْمِنُ کے بعد ''بِ'' کا صلہ ہو تو اس کے معنی ایمان لانے کے ہوتے ہیں' جبکہ ''لِ'' کے صلہ کے ساتھ اس کے معنی صرف تصدیق کے ہوتے ہیں۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم آپ کی بات کی تصدیق نہیں کریں گے جب تک ہم اپنی آنکھوں سے اللہ کو آپ سے کلام کرتے نہ دیکھ لیں۔ ہم کیسے یقین کر لیں کہ اللہ نے یہ کتاب آپ کو دی ہے؟ آپ تو ہمارے سامنے پتھر کی کچھ تختیاں لے کر آ گئے ہیں جن پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ ہمیں کیا پتا کہ یہ کس نے لکھا ہے؟ دیکھئے' ایک خواہش حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی تھی کہ ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ؕ﴾ (الاعراف:۱۴۳) ''اے میرے رب! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھ کو دیکھوں''۔ وہ کچھ اور شے تھی' وہ ع ''تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ!'' کی کیفیت تھی' لیکن یہ تخریبی ذہن کی سوچ ہے کہ ہم بھی چاہتے ہیں کہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ہمیں معلوم ہو کہ واقعی اُس نے آپ کو یہ کتاب دی ہے۔

﴿فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۵۵﴾ ''تو تمہیں آ پکڑا ایک بہت بڑی کڑک نے اور تم دیکھ رہے تھے۔'' تمہارے دیکھتے دیکھتے ایک بہت بڑی کڑک نے تمہیں آ لیا اور تم سب کے سب مُردہ ہو گئے۔

آیت ۵۶ ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾ ''پھر ہم نے تمہیں دوبارہ اٹھایا تمہاری موت کے بعد''

بعض لوگ اس کی ایک تاویل کرتے ہیں کہ یہ موت نہیں تھی' بلکہ زبردست کڑک کی وجہ سے سب کے سب بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے' لیکن میرے نزدیک یہاں تاویل کی ضرورت نہیں ہے' بعث بعد الموت اللہ کے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ﴾ کے الفاظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بالکل صریح ہیں' انہیں خواہ مخواہ کوئی اور معنی پہنانا درست نہیں ہے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۵۶﴾ ''تاکہ تم (اس احسان پر ہمارا) شکر کرو۔''

آیت ۵۷ ﴿وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ﴾ ''اور ہم نے تم پر اَبر کا سایہ کیا''

جزیرہ نمائے سینا کے لق و دق صحرا میں چھ لاکھ کا قافلہ چل رہا ہے' کوئی اوٹ نہیں' کوئی سایہ نہیں' دھوپ کی تپش سے بچنے کا کوئی انتظام نہیں۔ ان حالات میں ان پر اللہ تعالیٰ کا یہ فضل ہوا کہ تمام دن ایک بادل ان پر سایہ کیے رہتا اور جہاں جہاں وہ جاتے وہ بادل ان کے ساتھ ساتھ ہوتا۔

﴿وَاَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ؕ﴾ ''اور اتارا تم پر مَن اور سلویٰ۔''

صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا تو ان کے لیے مَنّ وسلویٰ نازل کیے گئے۔ ''مَنّ'' رات کے وقت شبنم کے قطروں کی مانند اترتا تھا' جس میں شیرینی بھی ہوتی تھی' اور اس کے قطرے زمین پر آ کر جم جاتے تھے اور دانوں کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ یہ گویا ان کا اناج ہو گیا' جس سے کاربوہائیڈریٹس کی ضرورت پوری ہو گئی۔ ''سلویٰ'' ایک خاص قسم کا بٹیر کی شکل کا پرندہ تھا۔ شام کے وقت ان پرندوں کے بڑے بڑے جھنڈ آتے اور جہاں بنی اسرائیل ڈیرہ ڈالے ہوتے اس کے گرد اُتر آتے تھے۔ رات کی تاریکی میں یہ اُن پرندوں کو آسانی سے پکڑ لیتے تھے اور بھون کر کھاتے تھے۔ چنانچہ اُن کی پروٹین کی ضرورت بھی پوری ہو رہی تھی۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُن کو مکمل غذا فراہم کر دی تھی۔

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ﴾ ''(ہم نے کہا) کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں کو جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں۔''

﴿وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۵۷﴾ ''اور انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہ کیا' بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم ڈھاتے رہے۔''

ہر قدم پر نافرمانی اور ناشکری بنی اسرائیل کا وطیرہ تھی۔ چنانچہ انہوں نے ''مَنّ وسلویٰ'' جیسی نعمت کی قدر بھی نہ کی اور ناشکری کی روش اپنائے رکھی۔ اس کا ذکر اگلی آیات میں آ جائے گا۔

آیت ۵۸ ﴿وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے کہا تھا کہ داخل ہو جاؤ اس شہر میں اور پھر کھاؤ اس میں سے بافراغت جہاں سے چاہو جو چاہو'

﴿وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ﴾ ''لیکن دیکھنا (بستی کے) دروازے میں داخل ہونا جھک کر اور کہتے رہنا مغفرت مغفرت' تو ہم تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائیں گے۔''

﴿وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۵۸﴾ ''اور محسنین کو ہم مزید فضل و کرم سے نوازیں گے۔''

بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں آنے اور تورات عطا کیے جانے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی کے زمانے میں انہیں جہاد اور قتال کا حکم ہوا' لیکن اس سے پوری قوم نے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ سزا مسلط کر دی کہ یہ چالیس برس تک اسی صحرا میں بھٹکتے پھریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ ابھی جہاد اور قتال کرتے تو ہم پورا فلسطین ان کے ہاتھ سے ابھی فتح کرا دیتے' لیکن چونکہ انہوں نے بزدلی دکھائی ہے لہٰذا اب ان کی سزا یہ ہے: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ (المائدۃ:۲۶) یعنی ارضِ فلسطین جو ان کے لیے ارضِ موعود تھی وہ ان پر چالیس سال کے لیے حرام کر دی گئی ہے' اب یہ چالیس سال تک اسی صحرا میں بھٹکتے پھریں گے۔ صحرانوردی کے اس عرصے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھی انتقال ہو گیا اور حضرت ہارون علیہ السلام کا بھی۔ اس عرصے میں ایک نئی نسل پیدا ہوئی اور وہ نسل جو مصر سے غلامی کا داغ اٹھائے ہوئے آئی تھی وہ پوری کی پوری ختم ہو گئی۔ غلامی کا یہ اثر ہوتا ہے کہ غلام قوم کے اندر اخلاق و کردار کی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ صحرانوردی کے زمانے میں جو نسل پیدا ہوئی اور صحرا ہی میں پروان چڑھی وہ ایک آزاد نسل تھی جو اُن کمزوریوں سے پاک تھی اور ان میں ایک جذبہ تھا۔ بنی اسرائیل کی اس نئی نسل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ یوشع بن نون [تورات میں ان کا نام یشوع (Joshua) آیا ہے] کی قیادت میں قتال کیا اور پہلا شہر جو فتح ہوا وہ ''اریحا'' تھا۔ یہ شہر آج بھی جریکو (Jericho) کے نام سے موجود ہے۔

یہاں پر اس فتح کے بعد کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے کہا تھا کہ اس شہر میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو جاؤ اور پھر

جو کچھ نعمتیں یہاں ہیں ان سے متمتع ہو خوب کھاؤ پیو لیکن شہر کے دروازے سے سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔ مراد یہ ہے کہ جھک کر سجدۂ شکر بجالاتے ہوئے داخل ہونا۔ ایسا نہ ہو کہ تکبر کی وجہ سے تمہاری گردنیں اکڑ جائیں۔ اللہ کا احسان مانتے ہوئے گردنیں جھکا کر داخل ہونا۔ یہ نہ سمجھنا کہ یہ فتح تم نے بزورِ بازو حاصل کی ہے۔ اس کا نقشہ ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں نظر آتا ہے کہ جب فتح مکہ کے موقع پر آپؐ مکہ میں داخل ہوئے تو جس سواری پر آپ ﷺ بیٹھے ہوئے تھے آپؐ کی پیشانی مبارک اس کی گردن کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ یہ وقت ہوتا ہے جبکہ ایک فاتح تکبر اور تعلّی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن بندۂ مؤمن کے لیے یہی وقت تواضع کا اور جھکنے کا ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہیں حکم دیا گیا: ﴿وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ﴾ ''اور کہتے جاؤ مغفرت مغفرت''۔ حِطَّةٌ کا وزن فِعْلَةٌ اور مادہ ''ح ط ط'' ہے۔ حَطَّ یَحُطُّ حَطًّا کے متعدد معنی ہیں، جن میں سے ایک ''پتے جھاڑنا'' ہے۔ مثلاً کہیں گے حَطَّ وَرَقَ الشَّجَرِ (اُس نے درخت کے پتے جھاڑ دیے)۔ حِطَّةٌ کے معنی ''استغفار، طلبِ مغفرت اور توبہ'' کے کیے جاتے ہیں۔ گویا اس میں گناہوں کو جھاڑ دینے اور خطاؤں کو معاف کر دینے کا مفہوم ہے۔ چنانچہ ''وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ'' کا مفہوم یہ ہوگا کہ مفتوح بستی میں داخل ہوتے وقت جہاں تمہاری گردنیں عاجزی کے ساتھ جھکی ہونی چاہئیں وہیں تمہاری زبان پر بھی استغفار ہونا چاہیے کہ اے اللہ ہمارے گناہ جھاڑ دے، ہماری مغفرت فرما دے، ہماری خطاؤں کو بخش دے! اگر تم ہمارے اس حکم پر عمل کرو گے تو ہم تمہاری خطائیں معاف فرما دیں گے، اور تم میں جو محسن اور نیکوکار ہوں گے انہیں مزید فضل و کرم اور انعام و اکرام سے نوازیں گے۔

آیت ﴿فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ﴾ ''پھر بدل ڈالا ظالموں نے بات کو خلاف اس کے جو اُن سے کہہ دی گئی تھی''

ان میں سے جو ظالم تھے، بدکردار تھے انہوں نے ایک اور قول اختیار کر لیا اُس قول کی جگہ جو اُن سے کہا گیا تھا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ ''حِطَّةٌ حِطَّةٌ'' کہتے ہوئے داخل ہونا، لیکن انہوں نے اس کی بجائے ''حِنْطَةٌ حِنْطَةٌ'' کہنا شروع کر دیا، یعنی ہمیں تو گیہوں چاہئے گیہوں چاہیے! اگلے رکوع میں یہ بات آ جائے گی کہ مَنّ و سلویٰ کھاتے کھاتے بنی اسرائیل کی طبیعتیں بھر گئی تھیں، ایک ہی چیز کھا کھا کر وہ اُکتا گئے تھے اور اب وہ کہہ رہے تھے کہ ہمیں زمین کی روئیدگی اور پیداوار میں سے کوئی چیز کھانے کو ملنی چاہیے۔ اس خواہش کا اظہار اُن کی زبانوں پر ''حِنْطَةٌ حِنْطَةٌ'' کی صورت میں آ گیا۔ اس طرح انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کا استہزاء و تمسخر کیا جو انہیں ''وَقُوْلُوْا حِطَّةٌ'' کے الفاظ میں دیا گیا تھا۔ اسی طرح شہر میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہونے کی بجائے انہوں نے اپنے سرینوں پر پھسلنا شروع کیا۔

﴿فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ ''پھر ہم نے اتارا ظلم کرنے والوں پر ایک بڑا عذاب آسمان سے''

جن ظالموں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کا استہزاء و تمسخر کیا تھا اُن پر آسمان سے ایک بہت بڑا عذاب نازل ہوا۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اریحا شہر میں پہنچنے کے بعد انہیں طاعون کی وبا نے آ لیا اور جنہوں نے یہ حرکت کی تھی وہ سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

﴿بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝۵۹﴾ ''بسبب اُس نافرمانی کے جو انہوں نے کی۔''

یہ اُن نافرمانیوں اور حکم عدولیوں کی سزا تھی جو وہ کر رہے تھے۔

آیات ۶۰ تا ۶۱

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾ وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِىْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِىْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۶۱﴾ ع

اب یہاں پھر صحراءِ سینا کے واقعات بیان ہو رہے ہیں۔ ان واقعات میں ترتیبِ زمانی نہیں ہے۔ اریحا کی فتح حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ہوئی، جس کا ذکر گزشتہ آیات میں ہوا، لیکن اب یہاں پھر اُس دَور کے واقعات آ رہے ہیں جب بنی اسرائیل صحرائے تیہہ میں بھٹک رہے تھے۔

آیت ۶۰ ﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ﴾ ”اور جب پانی مانگا موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے تو ہم نے کہا ضرب لگاؤ اپنے عصا سے چٹان پر۔“

صحرائے سینا میں چھ لاکھ سے زائد بنی اسرائیل پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے اور وہاں پانی نہیں تھا۔ انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پانی طلب کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لیے پانی کی دُعا کی تو انہیں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے عصا سے چٹان پر ضرب لگاؤ۔

﴿فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ﴾ ”تو اُس سے بارہ چشمے پھوٹ بہے۔“

”فَجَرَ“ کہتے ہیں کوئی چیز پھٹ کر اُس سے کسی چیز کا برآمد ہونا۔ فجر کے وقت کو فجر اسی لیے کہتے ہیں کہ اُس وقت رات کی تاریکی کا پردہ چاک ہوتا ہے اور سپیدۂ سحر نمودار ہوتا ہے۔

﴿قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ﴾ ”ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ جان لیا (اور معیّن کر لیا)۔“

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے، اگر ان کے لیے علیحدہ علیحدہ گھاٹ نہ ہوتا تو ان میں باہم لڑائی جھگڑے کا معاملہ ہوتا۔ انہیں بارہ چشمے اسی لیے دیے گئے تھے کہ آپس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ پانی تو بہت بڑی چیز ہے اور قبائلی زندگی میں اس کی بنیاد پر جنگ و جدل کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ؎

کہیں پانی پینے پلانے پہ جھگڑا کہیں گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

تو اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے یہ سہولت مہیا کی کہ بارہ چشمے پھوٹ بہے اور ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ معیّن کر لیا۔

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ﴾ ”(گویا ان سے یہ کہہ دیا گیا کہ) کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے“

﴿وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٦٠﴾﴾ ''اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو۔''

صحرا میں ان کے لیے پینے کو پانی بھی مہیا کر دیا گیا اور کھانے کے لیے مَنّ وسلویٰ اتار دیا گیا' لیکن انہوں نے ناشکری کا معاملہ کیا' جس کا ذکر ملاحظہ ہو۔

آیت ﴿وَإِذْ قُلْتُمْ يَا مُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَاحِدٍ﴾ ''اور یاد کرو جب کہ تم نے کہا تھا اے موسیٰ! ہم ایک ہی کھانے پر صبر نہیں کر سکتے''

مَنّ وسلویٰ کھا کھا کر اب ہم اُکتا گئے ہیں۔

﴿فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ﴾ ''تو ذرا اپنے ربّ سے ہمارے لیے دعا کرو''

﴿يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنبِتُ الْأَرْضُ﴾ ''کہ نکالے ہمارے لیے اس سے کہ جو زمین اُگاتی ہے''

یعنی زمین کی پیداوار میں سے' نباتاتِ ارضی میں سے ہمیں رزق دیا جائے۔

﴿مِن بَقْلِهَا وَقِثَّائِهَا﴾ ''اُس کی ترکاریاں اور ککڑیاں''

یہ لفظ کھیرے اور ککڑی وغیرہ سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

﴿وَفُومِهَا﴾ ''اور لہسن''

فُوم کا ایک ترجمہ گیہوں کیا گیا ہے' لیکن میرے نزدیک زیادہ صحیح ترجمہ لہسن ہے۔ عربی میں اس کے لیے بالعموم لفظ ''ثُوم'' استعمال کیا جاتا ہے۔ لہسن کو فارسی میں توم اور پنجابی' سرائیکی اور سندھی میں ''تھوم'' کہتے ہیں اور یہ فُوم اور ثُوم ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے' اس لیے کہ عربوں کی آمد کے باعث اُن کی زبان کے بہت سے الفاظ سندھی اور سرائیکی زبان میں شامل ہو گئے' جو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ کافی تعداد میں اب بھی موجود ہیں۔

﴿وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا﴾ ''اور مسور اور پیاز۔''

اب جو سالن کے چٹخارے اِن چیزوں سے بنتے ہیں اُن کی زبانیں وہ چٹخارے مانگ رہی تھیں۔ بنی اسرائیل صحرائے سینا میں ایک ہی طرح کی غذا ''مَنّ وسلویٰ'' کھاتے کھاتے اُکتا گئے تھے' لہٰذا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے کہ ہمیں زمین سے اُگنے والی چٹخارے دار چیزیں چاہئیں۔

﴿قَالَ أَتَسْتَبْدِلُونَ الَّذِي هُوَ أَدْنَىٰ بِالَّذِي هُوَ خَيْرٌ﴾ ''حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم وہ شے لینا چاہتے ہو جو کم تر ہے اُس کے بدلے میں جو بہتر ہے؟''

مَنّ وسلویٰ نباتاتِ ارضی سے کہیں بہتر ہے جو اللہ کی طرف سے تمہیں دیا گیا ہے۔ تو اس سے تمہارا جی بھر گیا ہے اور اس کو ہاتھ سے دے کر چاہتے ہو کہ یہ ادنیٰ چیزیں تمہیں ملیں؟

﴿اهْبِطُوا مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم مَّا سَأَلْتُمْ﴾ ''اترو کسی شہر میں تو تم کو مل جائے گا جو کچھ تم مانگتے ہو۔''

لفظ ''اِهْبِطُوْا'' پر آیت ۳۸ کے ذیل میں بات ہو چکی ہے کہ اس کا معنی بلندی سے اترنے کا ہے۔ ظاہر بات ہے یہاں یہ لفظ آسمان سے زمین پر اترنے کے لیے نہیں آیا' بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ کسی بستی میں جا کر آباد ہو جاؤ! (settle down

(somewhere) اگر تمہیں زمین کی پیداوار میں سے یہ چیزیں چاہئیں تو کہیں آباد (settle) ہو جاؤ اور کاشت کاری کرو' یہ ساری چیزیں تمہیں مل جائیں گی۔

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ﴾ ''اور ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی تھوپ دی گئی۔''

﴿وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔''

وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے۔

بنی اسرائیل وہ اُمت تھی جس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴾ (البقرۃ) اسی اُمت کا پھر یہ حشر ہوا تو کیوں ہوا؟ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے! انہیں کتاب دی گئی تھی کہ اس کی پیروی کریں اور اسے قائم کریں۔ سورۃ المائدۃ میں فرمایا گیا: ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ﴾ (آیت ۶۶) ''اگر یہ (اہلِ کتاب) تورات اور انجیل اور اُن دوسری کتابوں کو قائم کرتے جو اُن کی جانب ان کے ربّ کی طرف سے اتاری گئیں تو کھاتے اپنے اوپر سے اور اپنے قدموں کے نیچے سے''۔ یعنی ان کے سروں کے اوپر سے بھی نعمتوں کی بارش ہوتی اور زمین بھی ان کے لیے نعمتیں اُگلتی۔ لیکن انہوں نے اس کو چھوڑ کر اپنی خواہشات' اپنے نظریات' اپنے خیالات' اپنی عقل اور اپنی مصلحتوں کو مقدم کیا' اور اپنے تمرد' اپنی سرکشی اور اپنی حاکمیت کو بالاتر کیا۔ جو قوم دنیا میں اللہ کے قانون' اللہ کی ہدایت اور اللہ کی کتاب کی امین ہوتی ہے وہ اللہ کی نمائندہ (representative) ہوتی ہے' اور اگر وہ اپنے عمل سے غلط نمائندگی (misrepresent) کرے تو وہ اللہ کے نزدیک کافروں سے بڑھ کر مغضوب اور مبغوض ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ کافروں کو دین پہنچانا تو اس مسلمان اُمت کے ذمہ تھا۔ اگر یہ خود ہی دین سے منحرف ہو گئے تو کسی اور کو کیا دین پہنچائیں گے؟

آج اس مقام پر موجودہ اُمتِ مسلمہ کھڑی ہے کہ تعداد میں سوا ارب یا ڈیڑھ ارب ہونے کے باوجود ان کے حصے میں عزت نام کی کوئی شے نہیں ہے۔ دُنیا کے سارے معاملات G-7 اور G-15 ممالک کے ہاتھ میں ہیں۔ سکیورٹی کونسل کے مستقل ارکان کو ویٹو کا حق حاصل ہے' لیکن کوئی مسلمان ملک نہ تو سکیورٹی کونسل کا مستقل رکن ہے اور نہ ہی G-7' G-9 یا G-15 میں شامل ہے۔ گویا ع ''کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی!'' ہماری اپنی پالیسیاں کہیں اور طے ہوتی ہیں' ہمارے اپنے بجٹ کہیں اور بنتے ہیں' ہماری صلح اور جنگ کسی اور کے اشارے سے ریموٹ کنٹرول انداز میں ہوتی ہیں۔ یہ ذلت اور مسکنت ہے جو آج ہم پر تھوپ دی گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں کشمیر ہماری شہ رگ ہے' لیکن اس کے لیے جنگ کرنے کو ہم تیار نہیں ہیں۔ یہ خوف نہیں ہے تو کیا ہے؟ یہ مسکنت نہیں ہے تو کیا ہے؟ اگر اللہ پر یقین ہے اور اپنے حق پر ہونے کا یقین ہے تو اپنی شہ رگ دشمن کے قبضے سے آزاد کرانے کے لیے ہمت کرو۔ لیکن نہیں' ہم میں یہ ہمت موجود نہیں ہے۔ ہمارے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خبریں آتی رہیں گی کہ قابض بھارتی فوج نے ریاستی دہشت گردی کی کارروائیوں میں اتنے کشمیریوں کو شہید کر دیا' اتنی مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کر دی' لیکن ہم یہاں اپنے اپنے دھندوں میں' اپنے اپنے کاروبار میں' اپنی اپنی ملازمتوں میں اور اپنے اپنے کیریئرز میں مگن ہیں۔ بہرحال متذکرہ بالا الفاظ اگرچہ بنی اسرائیل کے لیے آئے ہیں کہ ان پر ذلت وخواری اور محتاجی وکم ہمتی مسلط کر دی گئی' لیکن اس میں آج کی اُمتِ مسلمہ کا نقشہ بھی موجود ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں!

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے''

﴿وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ﴾ ''اور اللہ کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے۔''

ہمارے ہاں بھی مجدّدینِ اُمّت کو قتل بھی کیا گیا اور اُن میں سے کتنے ہیں جو جیلوں میں ڈالے گئے۔ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سینکڑوں تابعین مستبد حکمرانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ائمۂ دین کو ایسی ایسی مار پڑی ہے کہ کہا جاتا ہے کہ ہاتھی کو بھی ایسی مار پڑے تو وہ برداشت نہ کر سکے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے ساتھ کیا کچھ ہوا! امام ابوحنیفہؒ نے جیل میں انتقال کیا اور وہاں سے اُن کا جنازہ اٹھا۔ امام دارالہجرت امام مالکؒ کے کندھے کھینچ دیے گئے اور منہ کالا کر کے انہیں اُونٹ پر بٹھا کر پھرایا گیا۔ حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو پسِ دیوارِ زنداں ڈالا گیا۔ سید احمد بریلویؒ اور ان کے ساتھیوں کو خود مسلمانوں نے شہید کروا دیا۔ ہماری تاریخ ایسی داستانوں سے بھری پڑی ہے۔ اب نبی تو کوئی نہیں آئے گا۔ اُن کے ہاں نبی تھے، ہمارے ہاں مجدّدین ہیں، علماءِ حق ہیں۔ انہوں نے جو کچھ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کیا وہی ہم نے مجدّدین کے ساتھ کیا۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾﴾ ''اور یہ اس لیے ہوا کہ وہ نافرمان تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔''

ان کو یہ سزا اُن کی نافرمانیوں کی وجہ سے اور حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے دی گئی۔ اللہ تعالیٰ تو ظالم نہیں ہے (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ نے تو انہیں اُونچا مقام دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی ''خیرِ اُمّت'' قرار دیا۔ ہم نے بھی جب اپنا مشن چھوڑ دیا تو ذلّت اور مسکنت ہمارا مقدر بن گئی۔ اللہ کا قانون اور اللہ کا عدل بے لاگ ہے۔ یہ سب کے لیے ایک ہے، ہر اُمّت کے لیے الگ الگ نہیں ہے۔ اللہ کی سُنّت بدلتی نہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کی بداعمالیوں کے سبب ان کا جو حشر ہوا آج وہ ہمارا ہو رہا ہے۔ اس ضمن میں میری کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمّتوں کا ماضی، حال اور مستقبل'' کے نام سے موجود ہے، اُس کا مطالعہ کیجیے!

آیات ۶۲ تا ۶۶

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـُٔوْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿٦٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٤﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿٦٥﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٦٦﴾

اب وہ آیت آ رہی ہے کہ جس سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ نجاتِ اُخروی کے لیے ایمان بالرسالت ضروری نہیں ہے۔

آیت ۶۲ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''یقیناً جو لوگ ایمان لائے''

اور اس سے مراد ہے جو ایمان لائے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔

﴿وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى﴾ ''اور جو یہودی ہو گئے اور نصرانی''

﴿وَالصّٰبِـُٔوْنَ﴾ ''اور صابی''

صابی وہ لوگ تھے جو عراق کے علاقے میں رہتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ ہم دینِ ابراہیمی پر ہیں۔ لیکن اُن کے ہاں بھی بہت کچھ بگڑ گیا تھا۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل بگاڑ کا شکار ہو گئی تھی اسی طرح وہ بھی بگڑ گئے تھے اور ان کے ہاں زیادہ تر ستارہ پرستی رواج پا گئی تھی۔

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''جو کوئی بھی ایمان لایا (ان میں سے) اللہ پر اور یومِ آخر پر''

﴿وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ ''اور اُس نے اچھے عمل کیے''

﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ﴾ ''تو اُن کے لیے (محفوظ) ہے اُن کا اجر اُن کے ربّ کے پاس''

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ ''اور نہ ان پر کوئی خوف ہوگا اور نہ غمگین ہوں گے۔''

ان لوگوں کو نہ تو کوئی خوف دامن گیر ہوگا اور نہ ہی وہ کسی حزن سے دوچار ہوں گے۔ ظاہر الفاظ کے اعتبار سے دیکھیں تو یہاں ایمان بالرسالت کا ذکر نہیں ہے۔ اگر کوئی اس سے غلط استدلال کرتا ہے تو اس کا پہلا اصولی جواب تو یہ ہے کہ بعض احادیث میں ایسے الفاظ بھی موجود ہیں: ((مَنْ قَالَ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ)) تو کیا اس کے یہ معانی ہیں کہ صرف لا الٰہ الا اللہ کہنے سے جنت میں داخل ہو جائیں گے' کسی عمل کی ضرورت نہیں؟ بلکہ کسی حدیث کا مفہوم اَخذ کرنے کے لیے پورے قرآن کو اور پورے ذخیرۂ احادیث کو سامنے رکھنا ہوگا۔ کسی ایک جگہ سے کوئی نتیجہ نکال لینا صحیح نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ چھٹے رکوع کے آغاز میں یہ اصولی بات بھی بیان کی جا چکی ہے کہ سورۃ البقرۃ کا پانچواں رکوع چھٹے رکوع سے شروع ہونے والے سارے مضامین سے ضرب کھا رہا ہے' جس میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ پر نازل ہونے والے قرآن پر ایمان لانے کی پُرزور دعوت بایں الفاظ موجود ہے: ﴿وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠﴾ ''اور ایمان لاؤ اس کتاب پر جو میں نے نازل کی ہے' جو تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے' اور تم ہی سب سے پہلے اس کا کفر کرنے والے نہ بن جاؤ۔''

اب فصاحت اور بلاغت کا یہ تقاضا ہے کہ ایک بات بار بار نہ دہرائی جائے۔ البتہ یہ بات ہر جگہ مقدر (understood) سمجھی جائے گی۔ اس لیے کہ ساری گفتگو اسی کے حوالے سے ہو رہی ہے۔ اس حوالے سے اب یوں سمجھئے کہ آیتِ زیر مطالعہ میں ''فِیْ اَیَّامِهِمْ'' یا ''فِیْ اَزْمِنَتِهِمْ'' (اپنے اپنے دَور میں) کے الفاظ محذوف مانے جائیں گے۔ گویا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـُٔوْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا [فِيْ اَيَّامِهِمْ] فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾﴾ یعنی نجاتِ اُخروی کے لیے اللہ تعالیٰ اور روزِ قیامت پر ایمان کے ساتھ ساتھ اپنے دَور کے نبی پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جب تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں آئے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے جو بھی یہودی موجود تھے' جو اللہ پر ایمان رکھتے تھے' آخرت کو مانتے تھے اور نیک عمل کرتے تھے ان کی نجات ہو جائے گی۔ لیکن جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد اُن کو نہیں مانا تو اب وہ کافر قرار پائے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام رسولوں پر ایمان نجاتِ اُخروی کے لیے کافی تھا' لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپؐ پر ایمان نہ لانے والے کافر قرار پائیں گے۔

آیت زیر مطالعہ میں اصل زور اس بات پر ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ کسی گروہ میں شامل ہونے سے نجات پا جاؤ گے' نجات کسی گروہ میں شامل ہونے کی وجہ سے نہیں ہے' بلکہ نجات کی بنیاد ایمان اور عمل صالح ہے۔ اپنے دَور کے رسول پر ایمان لانا تو لازم ہے' لیکن اس کے

ساتھ اگر عملِ صالح نہیں ہے تو نجات نہیں ہوگی۔ قرآن مجید کے ایک مقام پر آیا ہے: ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ﴾ (الاعراف:۳۴) ''اور ہر اُمت کے لیے ایک خاص معیّن مدت ہے''۔ ہر اُمت اس معیّنہ مدت ہی کی مکلّف ہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے فوت ہو گئے ان پر تو آپ ﷺ پر ایمان لانے کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی۔ بعثتِ نبویؐ سے قبل ایسے موحدین مکہ مکرمہ میں موجود تھے جو کعبہ کے پردے پکڑ پکڑ کر یہ کہتے تھے کہ اے اللہ! ہم صرف تیری بندگی کرنا چاہتے ہیں' لیکن جانتے نہیں کہ کیسے کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی اور فاطمہؓ بنت خطاب کے شوہر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ (جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں) کے والد زید کا یہی معاملہ تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے دنیا سے چلے گئے کہ: ''اے اللہ! میں صرف تیری بندگی کرنا چاہتا ہوں' مگر نہیں جانتا کہ کیسے کروں۔''

سورۃ الفاتحہ کے مطالعہ کے دوران میں نے کہا تھا کہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان توحید تک پہنچ جاتا ہے' آخرت کو پہچان لیتا ہے' لیکن آگے وہ نہیں جانتا کہ اب کیا کرے۔ احکامِ شریعت کی تفصیل کے لیے وہ ''رَبِّ الْعَالَمِيْنَ'' اور ''مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' کے حضور دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور ہے کہ: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ اُسی صراطِ مستقیم کی دعا کا جواب یہ قرآن حکیم ہے' اور اس میں سورۃ البقرۃ ہی سے احکامِ شریعت کا سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے کہ یہ کرو' یہ نہ کرو' یہ فرض ہے' یہ تم پر لازم کیا گیا ہے اور یہ چیزیں حرام کی گئی ہیں۔

آیت ۶۳ ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ﴾ ''اور ذرا یاد کرو جب ہم نے تم سے قول و قرار لیا اور تمہارے اوپر اٹھا دیا کوہِ طور کو۔''

بنی اسرائیل کو جب تورات دی گئی تو اُس وقت ان کے دلوں میں اللہ اور اُس کی کتاب کی ہیبت ڈالنے اور خشیت پیدا کرنے کے لیے معجزانہ طور پر ایک ایسی کیفیت پیدا کی گئی کہ اُن کے اوپر کوہِ طور اٹھا کر معلّق کر دیا گیا۔ اُس وقت ان سے کہا گیا:

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ﴾ ''پکڑو اس کو مضبوطی کے ساتھ جو ہم نے تم کو دیا ہے۔''

اس کتاب تورات کو اور اس میں بیان کردہ احکامِ شریعت کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو۔

﴿وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ﴾ ''اور یاد رکھو اسے جو کچھ کہ اس میں ہے''

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۶۳﴾ ''تاکہ تم بچ سکو۔''

آیت ۶۴ ﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ﴾ ''پھر تم نے روگردانی کی اُس کے بعد۔''

یعنی جو میثاقِ شریعت تم سے لیا گیا تھا اُس کو توڑ ڈالا۔

﴿فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۶۴﴾ ''پھر اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی نہ ہوتی تو تم (اُسی وقت) خسارہ پانے والے ہو جاتے۔''

اگر اللہ تعالیٰ کا فضل تمہارے شاملِ حال نہ ہوتا اور اس کی رحمت تمہاری دستگیری نہ کرتی رہتی' تمہیں بار بار معاف نہ کیا جاتا اور تمہیں بار بار مہلت نہ دی جاتی تو تم اُسی وقت تباہ ہو جاتے۔

آیت ۶۵ ﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ﴾ ''اور تم انہیں خوب جان چکے ہو جنہوں نے تم میں سے

زیادتی کی تھی ہفتہ کے دن میں''

تمہیں خوب معلوم ہے کہ تم میں سے وہ کون لوگ تھے جنہوں نے سبت کے قانون کو توڑا تھا اور حد سے تجاوز کیا تھا۔ یہود کی شریعت میں ہفتہ کا روز عبادت کے لیے معین کر دیا گیا تھا اور اس روز دنیاوی کام کاج کی اجازت نہیں تھی۔ آج بھی جو مذہبی یہودی (Practicing Jews) ہیں وہ اس کی پابندی بڑی شدت سے کرتے ہیں۔ لیکن ایک زمانے میں ان کے ایک خاص قبیلے نے ایک شرعی حیلہ ایجاد کر کے اس قانون کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ اس واقعہ کی تفصیل سورۃ الاعراف میں آئے گی۔

﴿فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾﴾ ''تو ہم نے کہہ دیا اُن سے کہ ہو جاؤ ذلیل بندر۔''

ان کی شکلیں مسخ کر کے انہیں بندروں کی صورت میں تبدیل کر دیا گیا۔ تین دن کے بعد یہ سب مر گئے۔

آیت ۶۶ ﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا﴾ ''پھر ہم نے اس (واقعہ کو یا اس بستی) کو عبرت کا سامان بنا دیا ان کے لیے بھی جو سامنے موجود تھے (اس زمانے کے لوگ) اور ان کے لیے بھی جو بعد میں آنے والے تھے''

﴿وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾﴾ ''اور ایک نصیحت (اور سبق آموزی کی بات) بنا دیا اہلِ تقویٰ کے لیے۔''

آیات ۶۷ تا ۷۴

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّاۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِى الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ ع ۸ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ ۚ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْىِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾ ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِىَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾

ان آیات کے مطالعے سے قبل ان کا پس منظر جان لیجیے۔ بنی اسرائیل میں عامیل نامی ایک شخص قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے سے حکم دیا کہ ایک گائے ذبح کرو اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا مُردہ شخص کے جسم پر مارو تو وہ جی اُٹھے گا اور بتا دے گا کہ میرا قاتل کون ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ میں ہمیں معجزات کا عمل دخل بہت زیادہ ملتا ہے۔ یہ بھی انہی معجزات میں سے ایک معجزہ تھا۔ گائے کو ذبح کرانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل کے قلوب واذہان میں گائے کا جو تقدس راسخ ہو چکا تھا اُس پر تلوار چلائی جائے۔ اور پھر انہیں یہ بھی دکھا دیا گیا کہ ایک مُردہ آدمی زندہ بھی ہو سکتا ہے' اس طرح بعث بعد الموت کا ایک نقشہ انہیں اس دنیا میں دکھا دیا گیا۔ بنی اسرائیل کو جب گائے ذبح کرنے کا حکم ملا تو ان کے دلوں میں جو بچھڑے کی محبت اور گائے کی تقدیس جڑ پکڑ چکی تھی اس کے باعث انہوں نے اس حکم سے کسی طرح سے بچ نکلنے کے لیے مین میخ نکالنی شروع کی اور طرح طرح کے سوال کرنے لگے کہ وہ کیسی گائے ہو؟ اس کا کیا رنگ ہو؟ کس طرح کی ہو؟ کس عمر کی ہو؟ بالآخر جب ہر طرف سے اُن کا گھیراؤ ہو گیا اور سب چیزیں ان کے سامنے واضح کر دی گئیں تب انہوں نے چار و ناچار بادلِ نخواستہ اس حکم پر عمل کیا۔ اب ہم ان آیات کا ایک رواں ترجمہ کر لیتے ہیں۔

آیت ۶۷ ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ﴾ ''اور یاد کرو جب موسیٰؑ نے کہا اپنی قوم سے کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے کو ذبح کرو۔''

﴿قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ﴾ ''انہوں نے کہا: کیا آپ ہم سے کچھ ٹھٹھا کر رہے ہیں؟''

کیا آپؑ یہ بات ہنسی مذاق میں کہہ رہے ہیں؟

﴿قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝۶۷﴾ ''فرمایا: مَیں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں اس سے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔''

ہنسی مذاق اور تمسخر و استہزا تو جاہلوں کا کام ہے اور اللہ کے نبی سے یہ بعید ہے کہ وہ دین کے معاملات کے اندر اِن چیزوں کو شامل کر لے۔

آیت ۶۸ ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ﴾ ''انہوں نے کہا (اچھا ایسی ہی بات ہے تو) ہمارے لیے ذرا اپنے ربّ سے دعا کیجیے کہ وہ ہم پر واضح کر دے کہ وہ کیسی ہو۔''

﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ﴾ ''(حضرت موسیٰؑ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بالکل بچھیا۔''

﴿عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ﴾ ''بڑھاپے اور نوجوانی کے بین بین ہو۔''

﴿فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝۶۸﴾ ''تو اب کر گزرو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے۔''

آیت ۶۹ ﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ﴾ ''اب انہوں نے کہا (ذرا ایک دفعہ پھر) ہمارے لیے دعا کیجیے اپنے ربّ سے کہ وہ ہمیں بتا دے کہ اس کا رنگ کیسا ہو۔''

﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝۶۹﴾ ''فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ گائے ہونی چاہیے زرد رنگ کی' جس کا رنگ ایسا شوخ ہو کہ دیکھنے والوں کو خوب اچھی لگے۔''

یہ خوبیاں اُس گائے کی تھیں جو اُن کے ہاں زیادہ سے زیادہ مقدس سمجھی جاتی تھی۔ اگر پہلے ہی حکم پر وہ عمل پیرا ہو جاتے تو کسی بھی گائے کو ذبح کر سکتے تھے۔ لیکن یکے بعد دیگرے سوالات کے باعث رفتہ رفتہ اُن کا گھیراؤ ہوتا گیا کہ جس گائے کے تقدس کا تاثر ان

کے ذہن میں زیادہ سے زیادہ تھا اُسی کو focus کر دیا گیا۔

آیت ﴿ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ﴾ ''انہوں نے کہا (ذرا پھر) اللہ سے ہمارے لیے دعا کیجیے کہ وہ ہم پر واضح کر دے کہ وہ گائے کیسی ہو''

﴿ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ﴾ ''کیونکہ گائے کا معاملہ یقیناً ہم پر کچھ مشتبہ ہو گیا ہے۔''

ہمیں گائے کی تعیین میں اشتباہ ہو گیا ہے۔

﴿ وَإِنَّا إِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴾ ''اور اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور راہ پالیں گے۔''

آیت ﴿ قَالَ إِنَّهُ يَقُوْلُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ﴾ ''فرمایا کہ اللہ فرماتا ہے وہ ایک ایسی گائے ہونی چاہیے کہ جس سے کوئی مشقت نہ لی جاتی ہو نہ وہ زمین میں ہل چلاتی ہو اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو۔''

﴿ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ﴾ ''وہ صحیح سالم یک رنگ ہونی چاہیے اُس میں (کسی دوسرے رنگ کا) کوئی داغ تک نہ ہو۔''

﴿ قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ﴾ ''انہوں نے کہا اب آپ لائے ہیں ٹھیک بات۔''

اب تو آپ نے بات پوری طرح واضح کر دی ہے۔

﴿ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴾ ''تب انہوں نے اُس کو ذبح کیا اور وہ لگتے نہ تھے کہ ایسا کر لیں گے۔''

اب وہ کیا کرتے' پے بہ پے سوالات کرتے کرتے وہ گھیراؤ میں آ چکے تھے' لہٰذا بادلِ نخواستہ وہ اپنی مقدس سنہری گائے کو ذبح کرنے پر مجبور ہو گئے۔

یہاں واقعہ کی ترتیب تورات سے مختلف ہے اور ذبح بقرہ کا جو سبب تھا وہ بعد میں بیان ہو رہا ہے' جبکہ تورات میں ترتیب دوسری ہے۔

آیت ﴿ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ﴾ ''اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا' اور اُس کا الزام تم ایک دوسرے پر لگا رہے تھے۔''

چنانچہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ قاتل کون ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴾ ''اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو کچھ تم چھپاتے تھے۔''

اللہ تعالیٰ فیصلہ کر چکا تھا کہ جو کچھ تم چھپا رہے ہو اسے نکال کر رہے گا اور واضح کر دے گا۔

آیت ﴿ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ﴾ ''تو ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو اُس گائے کے ایک ٹکڑے سے ضرب لگاؤ۔''

اس طرح وہ مُردہ شخص بحکمِ الٰہی تھوڑی دیر کے لیے زندہ ہو گیا اور اُس نے اپنے قاتل کا نام بتا دیا۔

﴿ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى ﴾ ''دیکھو اسی طرح اللہ مُردوں کو زندہ کر دے گا''

﴿ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴾ ''اور وہ تمہیں اپنی نشانیاں (اپنی قدرت کے نمونے) دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو۔''

اب جو الفاظ آگے آ رہے ہیں بہت سخت ہیں۔ لیکن ان کو پڑھتے ہوئے دروں بینی ضرور کیجیے گا' اپنے اندر ضرور جھانکیے گا۔

آیت ۷۴ ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ ''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد''

جب دین میں حیلے بہانے نکالے جانے لگیں اور حیلوں بہانوں سے شریعت کے احکام سے بچنے اور اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کی جائے تو اُس کا جو نتیجہ نکلتا ہے وہ دل کی سختی ہے۔

﴿فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ﴾ ''پس اب تو وہ پتھروں کی مانند ہیں' بلکہ سختی میں ان سے بھی زیادہ شدید ہیں۔''

یہ فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی قرآن حکیم کا ایک بڑا عمدہ مقام ہے۔

﴿وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ﴾ ''اور پتھروں میں سے تو یقیناً ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں۔''

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ﴾ ''اور ان (پتھروں اور چٹانوں) میں سے بے شک ایسے بھی ہوتے ہیں جو شق ہو جاتے ہیں اور ان میں سے پانی برآمد ہو جاتا ہے۔''

﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور ان میں سے یقیناً وہ بھی ہوتے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔''

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ غافل نہیں ہے اُس سے کہ جو تم کر رہے ہو۔''

قساوتِ قلبی کی یہ کیفیت اُس اُمت کے افراد کی بیان کی جا رہی ہے جسے کبھی اہلِ عالم پر فضیلت عطا کی گئی تھی۔ اس اُمت پر چودہ سو برس ایسے گزرے کہ کوئی لمحہ ایسا نہ تھا کہ ان کے ہاں کوئی نبی موجود نہ ہو۔ انہیں تین کتابیں دی گئیں۔ لیکن یہ اپنی بدعملی کے باعث قعرِ مذلت میں جا گری۔ عقائد میں ملاوٹ' اللہ اور اس کے رسول کے احکام میں میخ نکال کر اپنے آپ کو بچانے کے راستے نکالنے اور اعمال میں بھی ''کتابُ الحِیَل'' کے ذریعے سے اپنے آپ کو ذمہ داریوں سے مبرا کر لینے کی روش کا نتیجہ پھر یہی نکلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس انجامِ بد سے بچائے۔ آمین!

آیات ۷۵ تا ۸۲

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

بَلٰی مَنۡ کَسَبَ سَیِّئَۃً وَّ اَحَاطَتۡ بِہٖ خَطِیۡٓـَٔتُہٗ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۱﴾ وَ
الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۸۲﴾

اب تک ہم نے سورۃ البقرۃ کے آٹھ رکوع اور ان پر مستزاد تین آیات کا مطالعہ مکمل کیا ہے۔ سابقہ اُمّتِ مُسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ خطاب کا سلسلہ سورۃ البقرۃ کے دس رکوعوں پر محیط ہے۔ یہ سلسلہ پانچویں رکوع سے شروع ہوا تھا اور پندرہویں رکوع کے آغاز تک چلے گا۔ اس سلسلۂ خطاب کے بارے میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس میں سے پہلا رکوع دعوت پر مشتمل ہے اور وہ بہت فیصلہ کن ہے' جبکہ اگلے رکوع سے اسلوبِ کلام تبدیل ہو گیا ہے اور تہدید اور دھمکی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ پانچواں رکوع اس پورے سلسلۂ خطاب میں بمنزلۂ فاتحہ بہت اہم ہے اور جو بقیہ نو (۹) رکوع ہیں ان کے آغاز و اختتام پر بریکٹ کا انداز ہے کہ دو آیتوں سے بریکٹ شروع ہوتی ہے اور انہی دو آیتوں پر بریکٹ ختم ہوتی ہے' جبکہ پانچویں رکوع کے مضامین اس پورے سلسلۂ خطاب سے ضرب کھا رہے ہیں۔ ان رکوعوں میں بنی اسرائیل کے خلاف ایک مفصّل فردِ قرارداد جرم عائد کی گئی ہے' جس کے نتیجے میں وہ اُس منصبِ جلیلہ سے معزول کر دیے گئے جس پر دو ہزار برس سے فائز تھے اور ان کی جگہ پر اب نئی اُمّتِ مُسلمہ یعنی اُمّتِ محمد (ﷺ) کا اس منصب پر تقرر عمل میں آیا اور اس مسند نشینی کی تقریب (Installation Ceremony) کے طور پر تحویلِ قبلہ کا معاملہ ہوا۔ یہ ربطِ کلام اگر سامنے نہ رہے تو انسان قرآن مجید کی طویل سورتوں کو پڑھتے ہوئے کھو جاتا ہے کہ بات کہاں سے چلی تھی اور اب کدھر جا رہی ہے۔

ان نو رکوعوں کے مضامین میں کچھ تو تاریخ بنی اسرائیل کے واقعات بیان ہوئے ہیں کہ تم نے یہ کیا' تم نے یہ کیا! لیکن ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے بعض ایسے عظیم ابدی حقائق اور Universal Truths بیان ہوئے ہیں کہ اُن کا تعلق کسی وقت سے' کسی قوم سے یا کسی خاص گروہ سے نہیں ہے۔ وہ تو ایسے اصول ہیں جنہیں ہم سُنّت اللہ کہہ سکتے ہیں۔ اس کائنات میں ایک تو قوانینِ طبیعیہ (Physical Laws) ہیں' جبکہ ایک Moral Laws ہیں جو اللہ کی طرف سے اس دنیا میں کارفرما ہیں۔ سورۃ البقرۃ کے زیر مطالعہ نو رکوعوں میں تاریخ بنی اسرائیل کے واقعات کے بیان کے دوران تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایسی آیات آتی ہیں جو اس سلسلۂ کلام کے اندر انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔ اُن میں درحقیقت موجودہ اُمّتِ مُسلمہ کے لیے راہنمائی پوشیدہ ہے۔ مثال کے طور پر اس سلسلۂ خطاب کے دوران آیت ۶۱ میں وارد شدہ یہ الفاظ یاد کیجیے: ﴿وَضُرِبَتۡ عَلَیۡہِمُ الذِّلَّۃُ وَ الۡمَسۡکَنَۃُ ۟ وَ بَآءُوۡ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اور ان پر ذلّت و خواری اور محتاجی و کم ہمتی تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے''۔ معلوم ہوا کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان اُمّت جس پر اللہ کے بڑے فضل ہوئے ہوں' اسے بڑے انعام و اکرام سے نوازا گیا ہو' اور پھر وہ اپنی بے عملی یا بدعملی کے باعث اللہ تعالیٰ کے غضب کی مستحق ہو جائے اور ذلّت و مسکنت اُس پر تھوپ دی جائے۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جو ان الفاظ میں بیان ہو گئی۔ اُمّتِ مُسلمہ کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے کہ کیا آج ہم تو اُس مقام پر نہیں پہنچ گئے؟

دوسرا اسی طرح کا مقام گزشتہ آیت (۷۴) میں گزرا ہے' جہاں ایک عظیم ابدی حقیقت بیان ہوئی ہے: ﴿ثُمَّ قَسَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ فَہِیَ کَالۡحِجَارَۃِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَۃً ؕ﴾ ''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس سب کے بعد' پس اب تو وہ پتھروں کی مانند ہیں' بلکہ سختی میں ان سے بھی شدید تر ہیں''۔ گویا اسی اُمّتِ مُسلمہ کا یہ حال بھی ہو سکتا ہے کہ ان کے دل اتنے سخت ہو جائیں کہ سختی میں پتھروں اور چٹانوں کو مات دے جائیں۔ حالانکہ یہ وہی اُمّت ہے جس کے بارے میں فرمایا: ﴿وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی

الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۷﴾ ع ''ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!'' البتہ یہاں ایک بات واضح رہے کہ اس قساوتِ قلبی میں پوری اُمت مبتلا نہیں ہوا کرتی' بلکہ اس کیفیت میں اُمت کے قائدین مبتلا ہو جاتے ہیں اور اُمتِ مُسلمہ کے قائدین اُس کے علماء ہوتے ہیں۔ چنانچہ سب سے زیادہ شدّت کے ساتھ یہ خرابی اُن میں دَر آتی ہے۔ اس لیے کہ باقی لوگ تو پیروکار ہیں' ان کے پیچھے چلتے ہیں' ان پر اعتماد کرتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب کے پڑھنے والے اور اس کے جاننے والے ہیں۔ لیکن جو لوگ جان بوجھ کر اللہ کی کتاب میں تحریف کر رہے ہوں اور جانتے بوجھتے حق کو پہچان کر اُس کا انکار کر رہے ہوں انہیں تو پتا ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں! درحقیقت یہ سزا اُن پر آتی ہے۔ یہ بات ان آیات میں جو آج ہم پڑھنے چلے ہیں' بہت زیادہ واضح ہو جائے گی (ان شاء اللہ)۔ فرمایا:

آیت ۷۵ ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ﴾ ''تو کیا (اے مسلمانو!) تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری بات مان لیں گے؟''

عام مسلمانوں کو یہ توقع تھی کہ یہود دینِ اسلام کی مخالفت نہیں کریں گے۔ اس لیے کہ مشرکینِ مکّہ تو دینِ توحید سے بہت دُور تھے' رسالت کا ان کے ہاں کوئی تصوّر ہی نہیں تھا' کوئی کتاب ان کے پاس تھی ہی نہیں۔ جبکہ یہود تو اہلِ کتاب تھے' حاملینِ تورات تھے' موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے' توحید کے علمبردار تھے اور آخرت کا بھی اقرار کرتے تھے۔ چنانچہ عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ انہیں تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت کو جھٹ پٹ مان لینا چاہیے۔ تو مسلمانوں کے دلوں میں یہود کے بارے میں جو حسنِ ظن تھا' یہاں اس کا پردہ چاک کیا جا رہا ہے اور مسلمانوں کو اس کی حقیقت سے آگاہ کیا جا رہا ہے کہ مسلمانو! تمہیں بڑی طمع ہے' تمہاری یہ خواہش ہے' آرزو ہے' تمنا ہے' تمہیں توقع ہے کہ یہ تمہاری بات مان لیں گے۔

﴿وَقَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾﴾ ''جبکہ حال یہ ہے کہ ان میں ایک گروہ وہ بھی تھا کہ جو اللہ کا کلام سنتا تھا اور پھر خوب سمجھ بوجھ کر دانستہ اس میں تحریف کرتا تھا۔''

ظاہر بات ہے وہ گروہ ان کے علماء ہی کا تھا۔ عام آدمی تو اللہ کی کتاب میں تحریف نہیں کر سکتا۔

اب اگلی آیت میں بڑی عجیب بات سامنے آ رہی ہے۔ جس طرح مسلمانوں کے درمیان منافقین موجود تھے اسی طرح یہود میں بھی منافقین تھے۔ یہود میں سے کچھ لوگ ایسے تھے کہ جب ان پر حق منکشف ہو گیا تو اب وہ اسلام کی طرف آنا چاہتے تھے۔ لیکن ان کے لیے اپنے خاندان کو' گھر بار کو' اپنے کاروبار کو اور اپنے قبیلے کو چھوڑنا بھی ممکن نہیں تھا' جبکہ قبیلوں کی سرداری اُن کے علماء کے پاس تھی۔ ایسے لوگوں کے دل کچھ کچھ اہلِ ایمان کے قریب آ چکے تھے۔ ایسے لوگ جب اہلِ ایمان سے ملتے تھے تو کبھی کبھی وہ باتیں بھی بتا جاتے تھے جو انہوں نے علماءِ یہود سے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی تعلیمات کے بارے میں سن رکھی تھیں کہ تورات ان کی گواہی دیتی ہے۔ اس کے بعد جب وہ اپنے ''شیاطین'' یعنی علماء کے پاس جاتے تھے تو وہ انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے تھے کہ بیوقوفو! یہ کیا کر رہے ہو؟ تم انہیں یہ باتیں بتا رہے ہو تاکہ اللہ کے ہاں جا کر وہ تم پر حُجّت قائم کریں کہ انہیں پتا تھا اور پھر بھی انہوں نے نہیں مانا!

آیت ۷۶ ﴿وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ﴾ ''اور (ان میں سے کچھ لوگ ہیں کہ) جب ملتے ہیں اہلِ ایمان سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔''

﴿وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ ''اور جب وہ خلوت میں ہوتے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ''

﴿قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ﴾ ''تو کہتے ہیں کیا تم بتا رہے ہو ان کو وہ باتیں جو اللہ نے کھولی ہیں تم پر؟''

﴿لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ﴾ ''تا کہ وہ ان کے ذریعے تم پر حُجت قائم کریں تمہارے ربّ کے پاس!''

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۷۶﴾ ''کیا تمہیں عقل نہیں ہے؟''

تم ذرا عقل سے کام لو اور یہ حقیقتیں جو تورات کے ذریعے سے ہمیں معلوم ہیں' مسلمانوں کو مت بتاؤ۔ کیا تمہیں عقل نہیں ہے کہ ایسا بیوقوفی کا کام کر رہے ہو؟

ان کے اس مکالمے پر اللہ تعالیٰ کا تبصرہ یہ ہے:

آیت ۷۷ ﴿اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۝۷۷﴾ ''اور کیا یہ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ کو تو معلوم ہے وہ سب کچھ بھی جو وہ چھپاتے ہیں اور وہ سب کچھ بھی جسے وہ ظاہر کرتے ہیں۔''

تم چاہے یہ باتیں مسلمانوں کو بتاؤ یا نہ بتاؤ' اللہ کی طرف سے تو تمہارا محاسبہ ہو کر رہنا ہے۔ لہٰذا یہ بھی ان کی ناسمجھی کی دلیل ہے۔

آیت ۷۸ ﴿وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ﴾ ''اور ان میں بعض اَن پڑھ ہیں''

''اُمّی'' کا لفظ قرآن مجید میں اصلاً تو مشرکینِ عرب کے لیے آتا ہے اس لیے کہ اُن کے اندر پڑھنے لکھنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ کوئی آسمانی کتاب بھی اُن کے پاس نہیں تھی۔ لیکن یہاں یہود کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ان میں سے بھی ایک طبقہ اَن پڑھ لوگوں پر مشتمل ہے۔ جیسے آج مسلمانوں کا حال ہے کہ اکثر و بیشتر جاہل ہیں' ان میں سے بعض اگرچہ پی ایچ ڈی ہوں گے' لیکن انہیں قرآن کی ''ا' ب' ت'' نہیں آتی' دین کے ''مبادی'' تک سے ناواقف ہیں۔ چنانچہ آج پڑھے لکھے مسلمانوں کی بھی عظیم اکثریت ''پڑھے لکھے جاہلوں'' پر مشتمل ہے۔ جبکہ ہماری اکثریت ویسے ہی بغیر پڑھی لکھی ہے۔ تو اب انہیں دین کا کیا پتا؟ وہ تو سارا اعتماد کریں گے علماء پر! کوئی بریلوی ہے تو بریلوی علماء پر اعتماد کرے گا' کوئی دیوبندی ہے تو دیوبندی علماء پر اعتماد کرے گا' کوئی اہلِ حدیث ہے تو اہلِ حدیث علماء پر اعتماد کرے گا۔ اب اُمّیوں کا سہارا کیا ہوتا ہے؟

﴿لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ﴾ ''وہ کتاب کا علم نہیں رکھتے' سوائے بے بنیاد آرزوؤں کے''

ایسے لوگ کتاب سے تو واقف نہیں ہوتے' بس اپنی کچھ خواہشات اور آرزوؤں پر تکیہ کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان خواہشات کا ذکر آگے آ جائے گا۔ یہود کو یہ زعم تھا کہ ہم تو اسرائیلی ہیں' ہم اللہ کے محبوب ہیں اور اس کے بیٹوں کی مانند چہیتے ہیں' ہماری تو شفاعت ہو ہی جائے گی۔ ہمیں تو جہنم میں داخل کیا بھی گیا تو تھوڑے سے عرصے کے لیے کیا جائے گا' پھر ہمیں نکال لیا جائے گا۔ یہ ان کی ''اَمَانِیّ'' ہیں۔ ''اُمْنِیَّۃٌ'' کہتے ہیں بے بنیاد خواہش کو' اَمَانِیّ اس کی جمع ہے۔ اس کی صحیح تعبیر کے لیے انگریزی کا لفظ wishful thinkings ہے۔ یہ اپنی ان بے بنیاد خواہشات اور جھوٹی آرزوؤں کے سہارے جی رہے ہیں' کتاب کا علم ان کے پاس ہے ہی نہیں۔

﴿وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝۷۸﴾ ''اور وہ کچھ نہیں کر رہے مگر ظن و تخمین پر چلے جا رہے ہیں۔''

ان کے پاس محض وہم و گمان اور ان کے اپنے من گھڑت خیالات ہیں۔

آیت ۷۹ ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ﴾ ''پس ہلاکت اور بربادی ہے ان کے لیے جو کتاب لکھتے ہیں اپنے ہاتھ سے۔''

''وَیل'' کے بارے میں بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ جہنم کا وہ طبقہ ہے جس سے خود جہنم پناہ مانگتی ہے۔

﴿ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ''پھر کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے''

﴿لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ﴾ ''تاکہ حاصل کرلیں اُس کے بدلے حقیری قیمت۔''

یعنی لوگ علماءِ یہود سے شرعی مسائل دریافت کرتے تو وہ اپنے پاس سے مسئلے گھڑ کر فتویٰ لکھ دیتے اور لوگوں کو باور کراتے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے' یہی دین کا تقاضا ہے۔ اب اس فتویٰ نویسی میں کتنی کچھ واقعتاً انہوں نے صحیح بات کہی' کتنی ہٹ دھرمی سے کام لیا اور کس قدر کسی رشوت پر مبنی کوئی رائے دی' اللہ کے حضور سب دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ علامہ اقبال نے علماءِ سُوء کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا ہے: ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

علماءِ یہود کا کردار اسی طرح کا تھا۔

﴿فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ ''تو ہلاکت اور بربادی ہے ان کے لیے اس چیز سے کہ جو اُن کے ہاتھوں نے لکھی''

﴿وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝۷۹﴾ ''اور اُن کے لیے ہلاکت اور بربادی ہے اس کمائی سے جو وہ کر رہے ہیں۔''

یہ فتویٰ فروشی اور دین فروشی کا جو سارا دھندا ہے اس سے وہ اپنے لیے تباہی اور بربادی مول لے رہے ہیں' اس سے اُن کو اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ اب آگے ان کی بعض ''اَمَانِیّ'' کا تذکرہ ہے۔

آیت ۸۰ ﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں ہمیں تو آگ ہرگز چھو نہیں سکتی' مگر گنتی کے چند دن۔''

گویا صرف دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے ہمیں چند دن کی سزا دے دی جائے گی کہ کوئی اعتراض نہ کر دے کہ ''اے اللہ! ہمیں آگ میں پھینکا جا رہا ہے اور انہیں نہیں پھینکا جا رہا' جبکہ یہ کردار میں ہم سے بھی بدتر تھے''۔ چنانچہ اُن کا منہ بند کرنے کے لیے شاید ہمیں چند دن کے لیے آگ میں ڈال دیا جائے' پھر فوراً نکال لیا جائے گا۔

﴿قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا﴾ ''ان سے کہیے کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے؟''

کیا تمہارا اللہ سے کوئی قول و قرار ہو گیا ہے؟

﴿فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ﴾ ''کہ اب (تمہیں یہ یقین ہے کہ) اللہ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا؟''

﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰﴾ ''یا تم اللہ کے ذمے وہ باتیں لگا رہے ہو جنہیں تم نہیں جانتے؟''

حقیقت یہی ہے کہ تم اللہ کی طرف اس بات کی نسبت کر رہے ہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی فردِ قرارداد جرم کے دوران گاہ بگاہ جو اہم ترین ابدی حقائق بیان ہو رہے ہیں' ان میں سے ایک عظیم حقیقت اگلی آیت میں آ رہی ہے۔ فرمایا:

آیت ۸۱ ﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً﴾ ''کیوں نہیں' جس شخص نے جان بوجھ کر ایک گناہ کمایا''

لیکن اس سے مراد کبیرہ گناہ ہے' صغیرہ نہیں۔ سَيِّئَةً کی تنکیر ''تفخیم'' کا فائدہ بھی دے رہی ہے۔

﴿وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـَٔتُهٗ﴾ ''اور اس کا گھیراؤ کر لیا اس کے گناہ نے''

مثلاً ایک شخص سود خوری سے باز نہیں آ رہا' باقی وہ نماز کا بھی پابند ہے اور تہجد کا بھی التزام کر رہا ہے تو اس ایک گناہ کی بُرائی اس

کے گرد اس طرح چھا جائے گی کہ پھر اُس کی یہ ساری نیکیاں ختم ہو کر رہ جائیں گی۔ ہمارے مفسرین نے لکھا ہے کہ گناہ کے احاطہ کر لینے سے مراد یہ ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کر لیں کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو' حتیٰ کہ دل سے ایمان وتصدیق رخصت ہو جائے۔ علماء کے ہاں یہ اصول مانا جاتا ہے کہ "اَلْمَعَاصِیْ بَرِیْدُ الْکُفْرِ" یعنی گناہ تو کفر کی ڈاک ہوتے ہیں۔ گناہ پر مداومت کا نتیجہ بالآخر یہ نکلتا ہے کہ دل سے ایمان رخصت ہو جاتا ہے۔ ایک شخص اپنے آپ کو مسلمان سمجھتا ہے' لیکن اندر سے ایمان ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ جس طرح کسی دروازے کی چوکھٹ کو دیمک چاٹ جاتی ہے اور اوپر لکڑی کا ایک باریک پَرت (veneer) چھوڑ جاتی ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ﴾ ''پس یہی ہیں آگ والے''

﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾﴾ ''وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔''

آیت ۸۲ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اور (اس کے برعکس) جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں''

اب نیک عمل کے بارے میں ہر شخص نے اپنا ایک تصور اور نظریہ بنا رکھا ہے۔ جبکہ نیک عمل سے قرآن مجید کی مراد دین کے سارے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔ محض کوئی خیراتی ادارہ یا کوئی یتیم خانہ کھول دینا یا بیواؤں کی فلاح و بہبود کا انتظام کر دینا اور خود سودی لین دین اور دھوکہ فریب پر مبنی کاروبار ترک نہ کرنا نیکی کا مسخ شدہ تصور ہے۔ جبکہ نیکی کا جامع تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ تمام فرائض کی بجا آوری ہو' دین کے تمام تقاضے پورے کیے جائیں' اپنے مال اور جان کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد اور مجاہدہ کیا جائے اور اس کے دین کو قائم اور سربلند کرنے کی جدوجہد کی جائے۔

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ﴾ ''یہی ہیں جنت والے''

﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''وہ اسی میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

آیات ۸۳ تا ۸۶

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۭ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ۭ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ ع اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۠ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۸۶﴾

آیت ۸۳ ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۫﴾ ''اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم نہیں عبادت کرو گے کسی کی سوائے اللہ کے۔''

﴿وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا﴾ ''اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو گے''

اللہ کے حق کے فوراً بعد والدین کے حق کا ذکر قرآن مجید میں چار مقامات پر آیا ہے۔ اُن میں سے ایک مقام یہ ہے۔

﴿وَّذِی الْقُرْبٰی﴾ ''اور قرابت داروں کے ساتھ بھی (نیک سلوک کرو گے)''

﴿وَالْیَتٰمٰی﴾ ''اور یتیموں کے ساتھ بھی''

﴿وَالْمَسٰکِیْنِ﴾ ''اور محتاجوں کے ساتھ بھی''

﴿وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا﴾ ''اور لوگوں سے اچھی بات کہو''

امر بالمعروف کرتے رہو۔ نیکی کی دعوت دیتے رہو۔

﴿وَّاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ﴾ ''اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو۔''

یہ بنی اسرائیل سے معاہدہ ہو رہا ہے۔

﴿ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ﴾ ''پھر تم (اس سے) پھر گئے سوائے تم میں سے تھوڑے سے لوگوں کے''

﴿وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۸۳﴾ ''اور تم ہو ہی پھر جانے والے۔''

تمہاری یہ عادت گویا طبیعتِ ثانیہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان سے اس کے علاوہ ایک اور عہد بھی لیا تھا' جس کا ذکر بایں الفاظ کیا جا رہا ہے:

آیت ۸۴ ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ﴾ ''اور جب ہم نے تم سے یہ عہد بھی لیا تھا کہ''

﴿لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ﴾ ''تم اپنا خون نہیں بہاؤ گے''

یعنی آپس میں جنگ نہیں کرو گے' باہم خون ریزی نہیں کرو گے۔ تم بنی اسرائیل ایک وحدت بن کر رہو گے' تم سب بھائی بھائی بن کر رہو گے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آیا ہے: ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ (الحجرات: ۱۰)

﴿وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ﴾ ''اور نہ ہی تم نکالو گے اپنے لوگوں کو اُن کے گھروں سے''

﴿ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝۸۴﴾ ''پھر تم نے اس کا اقرار کیا تھا مانتے ہوئے۔''

یعنی تم نے اس قول و قرار کو پورے شعور کے ساتھ مانا تھا۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کو فتح کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلا شہر اریحا (Jericho) فتح کیا گیا۔ اس کے بعد جب سارا فلسطین فتح کر لیا تو انہوں نے ایک مرکزی حکومت قائم نہیں کی' بلکہ بارہ قبیلوں نے اپنی اپنی بارہ حکومتیں بنا لیں۔ ان حکومتوں کی باہمی آویزش کے نتیجے میں ان کی آپس میں جنگیں ہوتی تھیں اور یہ ایک دوسرے پر حملہ کر کے وہاں کے لوگوں کو نکال باہر کرتے تھے' انہیں بھاگنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ لیکن اگر ان میں سے کچھ لوگ فرار ہو کر کسی کافر ملک میں چلے جاتے اور کُفّار انہیں غلام یا قیدی بنا لیتے اور یہ اس حالت میں ان کے سامنے لائے جاتے تو

فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہارا اسرائیلی بھائی اگر کبھی اسیر ہو جائے تو اس کو فدیہ دے کر چھڑا لو۔ یہ ان کا جزوی اطاعت کا طرزِ عمل تھا کہ ایک حکم کو تو مانا نہیں اور دوسرے پر عمل ہو رہا ہے۔ اصل حکم تو یہ تھا کہ آپس میں خونریزی مت کرو اور اپنے بھائی بندوں کو ان کے گھروں سے مت نکالو۔ اس حکم کی تو پروا نہیں کی اور اسے توڑ دیا' لیکن اس وجہ سے جو اسرائیلی غلام بن گئے یا اسیر ہو گئے اب ان کو بڑے متقیانہ انداز میں چھڑا رہے ہیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے' شریعت کا حکم ہے۔ یہ ہے وہ تضاد جو مسلمان اُمتوں کے اندر پیدا ہو جاتا ہے۔

آیت ۸۵ ﴿ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ﴾ ''پھر تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے ہی لوگوں کو قتل بھی کرتے ہو''

﴿وَتُخۡرِجُوۡنَ فَرِيۡقًا مِّنۡكُمۡ مِّنۡ دِيَارِهِمۡ﴾ ''اور اپنے ہی لوگوں میں سے کچھ کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو''

﴿تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ ؕ﴾ ''اُن پر چڑھائی کرتے ہو گناہ اور ظلم و زیادتی کے ساتھ۔''

﴿وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى تُفٰدُوۡهُمۡ﴾ ''اور اگر وہ قیدی بن کر تمہارے پاس آئیں تو تم فدیہ دے کر انہیں چھڑاتے ہو''

﴿وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ ؕ﴾ ''حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم پر حرام کیا گیا تھا۔''

اب دیکھئے اس واقعہ سے جو اخلاقی سبق (moral lesson) دیا جا رہا ہے وہ ابدی ہے۔ اور جہاں بھی یہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے گا تاویلِ عام کے اعتبار سے یہ آیت اس پر منطبق ہو گی۔

﴿اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ ۚ﴾ ''تو کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے؟''

﴿فَمَا جَزَآءُ مَنۡ يَّفۡعَلُ ذٰلِكَ مِنۡكُمۡ﴾ ''تو نہیں ہے کوئی سزا اس کی جو یہ حرکت کرے تم میں سے''

﴿اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ﴾ ''سوائے ذلت و رسوائی کے دنیا کی زندگی میں۔''

﴿وَيَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ يُرَدُّوۡنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الۡعَذَابِ ؕ﴾ ''اور قیامت کے روز وہ لوٹا دیے جائیں گے شدید ترین عذاب کی طرف۔''

یہ ایک بہت بڑی آفاقی سچائی (universal truth) بیان کر دی گئی ہے' جو آج اُمتِ مسلمہ پر صد فی صد منطبق ہو رہی ہے۔ آج ہمارا طرزِ عمل بھی یہی ہے کہ ہم پورے دین پر چلنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر گروہ نے کوئی ایک شے اپنے لیے حلال کر لی ہے۔ ملازمت پیشہ طبقہ رشوت کو اس بنیاد پر حلال سمجھے بیٹھا ہے کہ کیا کریں' اس کے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ کاروباری طبقہ کے نزدیک سود حلال ہے کہ اس کے بغیر کاروبار نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ یہ جو طوائفیں ''بازارِ حسن'' سجا کر بیٹھی ہیں وہ بھی کہتی ہیں کہ کیا کریں' ہمارا یہ دھندا ہے' ہم بھی محنت کرتی ہیں' مشقت کرتی ہیں۔ ان کے ہاں بھی نیکی کا ایک تصور موجود ہے۔ چنانچہ محرم کے دنوں میں یہ اپنا دھندا بند کر دیتی ہیں' سیاہ کپڑے پہنتی ہیں اور ماتمی جلوسوں کے ساتھ بھی نکلتی ہیں۔ ان میں سے بعض مزاروں پر دھمال بھی ڈالتی ہیں۔ ان کے ہاں اس طرح کے کام نیکی شمار ہوتے ہیں اور جسم فروشی کو یہ اپنی کاروباری مجبوری سمجھتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہاں ہر طبقے میں نیکی اور بدی کا ایک امتزاج ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا مطالبہ کُلّی اطاعت کا ہے' جزوی اطاعت اس کے ہاں قبول نہیں کی جاتی' بلکہ اُلٹا منہ پر دے ماری جاتی ہے۔ آج اُمتِ مسلمہ عالمی سطح پر جس ذلت و رسوائی کا شکار ہے اس کی وجہ یہی جزوی اطاعت ہے کہ دین کے ایک حصے کو مانا جاتا ہے اور ایک حصے کو پاؤں تلے روند دیا جاتا ہے۔ اس طرزِ عمل کی پاداش میں آج ہم ''ضُرِبَتۡ عَلَيۡهِمُ الذِّلَّةُ وَالۡمَسۡكَنَةُ'' کا مصداق بن گئے ہیں اور ذلت و مسکنت ہم پر تھوپ دی گئی ہے۔ باقی رہ گیا قیامت کا معاملہ تو وہاں شدید ترین عذاب کی وعید ہے۔

اپنے طرزِ عمل سے تو ہم اُس کے مستحق ہو گئے ہیں' تاہم اللہ تعالیٰ کی رحمت دست گیری فرمالے تو اُس کا اختیار ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵﴾ ''اور اللہ غافل نہیں ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔''

سیٹھ صاحب ہر سال عمرہ فرما کر آ رہے ہیں' لیکن اللہ کو معلوم ہے کہ یہ عمرے حلال کمائی سے کیے جا رہے ہیں یا حرام سے! وہ تو سمجھتے ہیں کہ ہم نہا دھو کر آ گئے ہیں اور سال بھر جو بھی حرام کمائی کی تھی سب پاک ہو گئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ تمہارے کرتوتوں سے ناواقف نہیں ہے۔ وہ تمہاری داڑھیوں سے' تمہارے عماموں سے اور تمہاری عبا اور قبا سے دھوکہ نہیں کھائے گا۔ وہ تمہارے اعمال کا احتساب کر کے رہے گا۔

آیت ۸۶ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۪﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی اختیار کر لی ہے آخرت کو چھوڑ کر۔''

﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۸۶﴾ ''سو اب نہ تو اُن سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ہی اُن کی کوئی مدد کی جائے گی۔''

آیات ۸۷ تا ۹۶

وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۪ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ
وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا
كَذَّبْتُمْ ۪ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝۸۷ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا
يُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ
يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۪ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى
الْكٰفِرِيْنَ ۝۸۹ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ
فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰
وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ
وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۱ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ
ظٰلِمُوْنَ ۝۹۲ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ
وَّاسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ
بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۳ قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ

دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

آیت ۸۷ ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ﴾ ''اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی'' (یعنی تورات)

﴿وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۪﴾ ''اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے۔''

ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ یہاں لفظ ''الرُّسُل'' انبیاء کے معنی میں آیا ہے۔ نبی اور رسول میں کچھ فرق ہے' اسے اختصار کے ساتھ سمجھ لیجیے۔ قرآن مجید کی اصطلاحات کے تین جوڑے ایسے ہیں کہ وہ تینوں مترادف کے طور پر بھی استعمال ہو جاتے ہیں اور اپنا علیحدہ علیحدہ مفہوم بھی رکھتے ہیں۔ ان کے ضمن میں علماء کرام نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ "اِذَا اجْتَمَعَا تَفَرَّقَا وَاِذَا تَفَرَّقَا اجْتَمَعَا'' یعنی جب (ایک جوڑے کے) دونوں لفظ اکٹھے استعمال ہوں گے تو دونوں کا مفہوم مختلف ہوگا' اور جب یہ دونوں الگ الگ استعمال ہوں گے تو ایک معنی میں استعمال ہو جائیں گے۔ ان میں سے ایک جوڑا ''اسلام'' اور ''ایمان'' یا ''مسلم'' اور ''مؤمن'' کا ہے۔ عام طور پر مسلم کی جگہ مؤمن اور مؤمن کی جگہ مسلم استعمال ہو جاتا ہے' لیکن سورۃ الحجرات میں یہ دونوں الفاظ اکٹھے استعمال ہوئے ہیں تو ان کا فرق واضح ہو گیا ہے۔ فرمایا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ (آیت ۱۴) ''بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ ان سے کہیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' البتہ یہ کہو کہ ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے.....'' اسی طرح ''جہاد'' اور ''قتال'' کا معاملہ ہے۔ یہ دو مختلف الفاظ ہیں' جن کا مفہوم جدا بھی ہے' لیکن ایک دوسرے کی جگہ بھی آ جاتے ہیں۔

اس ضمن میں تیسرا جوڑا ''نبی'' اور ''رسول'' کا ہے۔ یہ دونوں لفظ بھی اکثر ایک دوسرے کی جگہ آ جاتے ہیں' لیکن ان میں فرق بھی ہے۔ ہر نبی رسول نہیں ہوتا' البتہ ہر رسول لازماً نبی ہوتا ہے۔ یعنی نبی عام ہے رسول خاص ہے۔ نبی کو جب کسی خاص قوم کی طرف معین طور پر بھیج دیا جاتا ہے تب اس کی حیثیت رسول کی ہو جاتی ہے۔ اس سے پہلے اُس کی حیثیت انتہائی اعلیٰ مرتبہ پر فائز ایک ولی اللہ کی ہے' جس پر وحی نازل ہو رہی ہے۔ عام ولی اللہ میں اور نبی میں فرق یہی ہے کہ نبی پر وحی آتی ہے' ولی پر وحی نہیں آتی۔ لیکن کسی نبی کو جب کسی معین قوم کی طرف مبعوث کر دیا جاتا تھا تو پھر وہ رسول ہوتا تھا۔ جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو حکم دیا گیا: ﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾﴾ (طٰہٰ) ''تم دونوں فرعون کی طرف جاؤ' یقیناً وہ سرکشی پر اتر آیا ہے''۔ اسی طرح دوسرے رسولوں کے بارے میں آیا ہے کہ وہ اپنی اپنی قوم کی طرف مبعوث فرمائے گئے تھے۔ مثلاً ﴿وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا﴾ (الاعراف:۸۵) ''اور مدین کی طرف بھیجا ہم نے ان کے بھائی شعیبؑ کو''۔ یہ فرق ہے نبی اور رسول کا۔ محض سمجھانے کے لیے بطور مثال عرض کر رہا ہوں کہ جیسے آپ کے یہاں خصوصی تربیت یافتہ افراد پر مشتمل CSP cadre ہے' ان میں سے کوئی ڈپٹی کمشنر لگا دیا جاتا ہے' کسی کو جائنٹ سکریٹری کی ذمہ داری تفویض کی جاتی ہے' تو کوئی بطور O.S.D خدمات انجام دیتا ہے' لیکن اس کا کاڈر (CSP) برقرار رہتا ہے۔ اسی اعتبار سے ہر نبی ہر حال میں نبی ہوتا تھا' لیکن اُسے ''رسول'' کی حیثیت سے ایک اضافی ذمہ داری اور اضافی مرتبہ عطا کیا جاتا تھا۔

نبی اور رسول کے فرق کے ضمن میں ایک بات یہ نوٹ کر لیجیے کہ نبیوں کو قتل بھی کیا گیا ہے' جبکہ رسول قتل نہیں ہو سکتے۔ اللہ کا فیصلہ

یہ ہے کہ ﴿لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ﴾ (المجادلۃ: ۲۱) ''لازماً غالب رہیں گے میں اور میرے رسول''۔ چنانچہ جب بھی کسی قوم نے کسی رسولؑ کی جان لینے کی کوشش کی تو اس قوم کو ہلاک کر دیا گیا اور رسولؑ اور اُس کے ساتھیوں کو بچا لیا گیا۔ لیکن یہ معاملہ نبیوں کے ساتھ نہیں ہوا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نبی تھے' قتل کر دیے گئے' جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول تھے' لہٰذا قتل نہیں کیے جا سکتے تھے' ان کو زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا' جو قیامت سے قبل دوبارہ زمین پر نزول فرمائیں گے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے راستے میں شہید ہونے کی شدید تمنا تھی۔ آپؐ نے اپنی اس تمنا اور آرزو کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا ہے:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنْ اُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَاُقْتَلَ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلَ)) (۹)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے! میری بڑی خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جنگ کروں تو اس میں قتل کر دیا جاؤں' پھر میں زندہ کیا جاؤں' پھر قتل کیا جاؤں' پھر میں زندہ کیا جاؤں' پھر اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر میں زندہ کیا جاؤں' پھر اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں!''

لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش پوری نہیں کی۔ اس لیے کہ آپؐ اللہ کے رسول تھے۔ آیت زیر مطالعہ میں نوٹ کیجیے کہ اگرچہ یہاں لفظ رسول آ گیا ہے' لیکن یہ نبی کے معنی میں آیا ہے: ﴿وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ ۪﴾ ''اور ہم نے موسیٰؑ کے بعد لگاتار پیغمبر بھیجے''۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد رسول تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی ہیں' درمیان میں جو پیغمبر (prophets) ہیں یہ سب انبیاء ہیں۔

﴿وَاٰتَیْنَا عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ﴾ ''اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو بڑی واضح نشانیاں دیں''

جتنے معجزات جس قدر حضرت مسیح علیہ السلام کو دیے گئے ویسے اور کسی نبی کو نہیں دیے گئے۔ ان کا تذکرہ آگے چل کر سورۂ آل عمران میں آئے گا۔

﴿وَاَیَّدْنٰہُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ﴾ ''اور ہم نے مدد کی اُن کی روح القدس کے ساتھ۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حضرت جبرائیلؑ کی خاص تائید و نصرت حاصل تھی۔ معجزات کا ظہور کسی نبی یا رسول کی اپنی طاقت سے نہیں ہوتا' اسی طرح کرامت کسی ولی اللہ کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی' یہ معاملہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کا ظہور فرشتوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

﴿اَفَکُلَّمَا جَآءَکُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَہْوٰۤی اَنْفُسُکُمُ اسْتَکْبَرْتُمْ ؕ﴾ ''پھر بھلا کیا جب بھی آیا تمہارے پاس کوئی رسول وہ چیز لے کر جو تمہاری خواہشاتِ نفس کے خلاف تھی تو تم نے تکبر کیا۔''

انبیاء و رسل علیہم السلام کے ساتھ یہود نے جو طرزِ عمل روا رکھا' خاص طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ کیا' یہاں اس پر تبصرہ ہو رہا ہے کہ جب بھی کبھی تمہارے پاس کوئی رسول تمہاری خواہشاتِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر آیا تو تمہاری روش یہی رہی کہ تم نے استکبار کیا اور سرکشی کی' وہی استکبار اور سرکشی جس کے باعث عزازیل ابلیس بن گیا تھا۔

﴿فَفَرِیْقًا کَذَّبْتُمْ ۫ وَفَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾﴾ ''پھر ایک جماعت کو تم نے جھٹلایا اور ایک جماعت کو قتل کر دیا۔''

۹۔ صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب تمنی الشهادة۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل الله۔ ومسند احمد واللفظ له۔

اللہ کے رسول چونکہ قتل نہیں ہو سکتے لہٰذا یہاں نبیوں کا قتل مراد ہے۔ مزید برآں ایک رائے یہ بھی دی گئی ہے کہ یہاں ماضی کا صیغہ ''قَتَلْتُمْ'' نہیں آیا' بلکہ فعل مضارع ''تَقْتُلُوْنَ'' آیا ہے اور مضارع کے اندر فعل جاری رہنے کی خاصیت ہوتی ہے۔ گویا تم ان کو قتل کرنے کی کوشش کرتے رہے' بعض رسولوں کی تو جان کے درپے ہو گئے۔

آیت ۸۸ ﴿وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ﴾ ''اور انہوں نے کہا کہ ہمارے دل تو غلافوں میں بند ہیں۔''

ان کے اس جواب کو آیت ۷۵ کے ساتھ ملایئے جو ہم پڑھ آئے ہیں۔ وہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ﴾ ''تو اے مسلمانو! کیا تم یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ تمہاری بات مان لیں گے؟'' بعض مسلمانوں کی اس خواہش کے جواب میں یہود کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ہمارے دل تو غلافوں میں محفوظ ہیں' تمہاری بات ہم پر اثر نہیں کر سکتی۔ اس طرح کے الفاظ آپ کو آج بھی سننے کو مل جائیں گے کہ ہمارے دل بڑے محفوظ ہیں' بڑے مضبوط اور مستحکم ہیں' تمہاری بات ان میں گھر کر ہی نہیں سکتی۔

﴿بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ ''بلکہ (حقیقت میں تو) اُن پر لعنت ہو چکی ہے اللہ کی طرف سے ان کے کفر کی وجہ سے''

یہ ان کے اس قول پر تبصرہ ہے کہ ہمارے دل محفوظ ہیں اور غلافوں میں بند ہیں۔

﴿فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸﴾ ''پس اب کم ہی (ہوں گے ان میں سے جو) ایمان لائیں گے۔''

آیت ۸۹ ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ''اور جب آ گئی ان کے پاس ایک کتاب (یعنی قرآن) اللہ کے پاس سے''

﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ﴾ ''جو اُس کی تصدیق کرنے والی ہے جو اُن کے پاس (پہلے سے موجود) ہے''

یہ وضاحت قبل ازیں کی جا چکی ہے کہ قرآن کریم ایک طرف تورات اور انجیل کی تصدیق کرتا ہے اور دوسری طرف وہ تورات اور انجیل کی پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر آیا ہے۔

﴿وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ۚ﴾ ''اور وہ پہلے سے کفار کے مقابلے میں فتح کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔''

ان کا حال یہ تھا کہ وہ اس کی آمد سے پہلے اللہ کی آخری کتاب اور آخری نبی ﷺ کے حوالے اور واسطے سے اللہ تعالیٰ سے کافروں کے خلاف فتح و نصرت کی دعائیں کیا کرتے تھے۔ یہود کے تین قبائل بنو قینقاع' بنو نضیر اور بنو قریظہ مدینہ میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ وہاں اوس اور خزرج کے قبائل بھی آباد تھے جو یمن سے آئے تھے اور اصل عرب قبائل تھے۔ پھر آس پاس کے قبائل بھی تھے۔ وہ سب اُمّیین میں سے تھے' اُن کے پاس نہ کوئی کتاب تھی' نہ کوئی شریعت اور نہ وہ کسی نبوت سے آگاہ تھے۔ ان کی جب آپس میں لڑائیاں ہوتی تھیں تو یہودی چونکہ سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے بزدل تھے لہٰذا ہمیشہ مار کھاتے تھے۔ اس پر وہ کہا کرتے تھے کہ ابھی تو تم ہمیں مار لیتے ہو' دبا لیتے ہو' نبی آخر الزماں (ﷺ) کے آنے کا وقت آ چکا ہے جو نئی کتاب لے کر آئیں گے۔ جب وہ آئیں گے اور ہم اُن کے ساتھ ہو کر جب تم سے جنگ کریں گے تو تم ہمیں شکست نہیں دے سکو گے' ہمیں فتح پر فتح حاصل ہو گی۔ وہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ! اس نبی آخر الزماں کا ظہور جلدی ہو تا کہ اُس کے واسطے سے اور اُس کے صدقے ہمیں فتح مل سکے۔

خزرج اور اوس کے قبائل نے یہود کی یہ دعائیں اور ان کی زبان سے نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد کی پیشین گوئیاں سن رکھی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۱ نبوی کے حج کے موقع پر جب مدینہ سے جانے والے خزرج کے چھ افراد کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی دعوت

پیش کی تو انہوں نے کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا کہ معلوم ہوتا ہے یہ وہی نبی ہیں، جن کا یہودی ذکر کرتے ہیں' تو اس سے پہلے کہ یہود ان پر ایمان لائیں' تم ایمان لے آؤ! اس طرح وہ علم جو بالواسطہ طور پر ان تک پہنچا تھا ان کے لیے ایک عظیم سرمایہ اور ذریعۂ نجات بن گیا۔ مگر وہی یہودی جو آنے والے نبی کے انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے' آپ ﷺ کی آمد پر اپنے تعصب اور تکبر کی وجہ سے آپؐ کے سب سے بڑھ کر مخالف بن گئے۔

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ﴾ ''پھر جب ان کے پاس آ گئی وہ چیز جسے انہوں نے پہچان لیا تو وہ اس کے منکر ہو گئے۔''

﴿فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝۸۹﴾ ''پس اللہ کی لعنت ہے ان منکرین پر۔''

آیت ۹۰ ﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ﴾ ''بہت بُری شے ہے جس کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو فروخت کر دیا''

یعنی دنیا کا حقیر سا فائدہ' یہاں کی حقیر سی منفعتیں' یہاں کی مسندیں اور چودھراہٹیں ان کے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہیں اور وہ اپنی فلاح وسعادت اور نجات کی خاطر ان حقیر سی چیزوں کی قربانی دینے کو تیار نہیں ہیں۔

﴿اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ ''کہ وہ انکار کر رہے ہیں اُس ہدایت کا جو اللہ نے نازل کی ہے''

﴿بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ﴾ ''صرف اس ضد کی بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نازل فرماتا ہے اپنے فضل (وحی ورسالت) میں سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے۔''

یہود اس امید میں تھے کہ آخری نبی بھی اسرائیلی ہی ہوگا' اس لیے کہ چودہ سو برس تک نبوت ہمارے پاس رہی ہے' یہ ''فترۃ'' کا زمانہ ہے' جسے چھ سو برس گزر گئے' اب آخری نبی آنے والے ہیں۔ ان کو یہ گمان تھا کہ وہ بنی اسرائیل ہی میں سے ہوں گے' لیکن ہوا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت اور یہ فضل بنی اسماعیل پر ہو گیا۔ اس ضِدّم ضِدّا کی وجہ سے یہود عناد اور سرکشی پر اتر آئے۔ اس ''بَغْيًا'' کے لفظ کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ دین میں جو اختلاف ہوتا ہے اس کا اصل سبب یہی ضِدّم ضِدّا والا رویہ ہوتا ہے' جسے قرآن مجید میں ''بَغْيًا'' کہا گیا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں کئی بار آیا ہے۔

عہدِ حاضر میں علم نفسیات (Psychology) میں ایڈلر کے مکتبِ فکر کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان کے جبلی افعال (instincts) اور محرکات (motives) میں ایک نہایت طاقتور محرک غالب ہونے کی طلب (Urge to dominate) ہے۔ چنانچہ کسی دوسرے کی بات ماننا نفسِ انسانی پر بہت گراں گزرتا ہے' وہ چاہتا ہے کہ میری بات مانی جائے! ''بَغْيًا'' کے معنی بھی حد سے بڑھنے اور تجاوز کرنے کے ہیں۔ دوسروں پر غالب ہونے کی خواہش میں انسان اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ یہی معاملہ یہود کا تھا کہ انہوں نے دوسروں پر رعب گانٹھنے کے لیے ضِدّم ضِدّا کی روش اختیار کی' محض اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کے ایک شخص محمد عربی ﷺ کو اپنے فضل سے نواز دیا۔

﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ﴾ ''تو وہ لوٹے غضب پر غضب لے کر۔''

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے غضب بالائے غضب کے مستحق ہو گئے۔

﴿وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰﴾ ''اور ایسے کافروں کے لیے سخت ذلت آمیز عذاب ہے۔''

''مُهِيْنٌ'' اہانت سے بنا ہے۔ ان کی اس روش کی وجہ سے ان کے لیے اہانت آمیز عذاب مقرر ہے۔

آیت ۹۱ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے ایمان لاؤ اُس پر جو اللہ نے نازل فرمایا ہے''

﴿قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ ''تو کہتے ہیں ہم ایمان رکھتے ہیں اُس پر جو ہم پر نازل ہوا''

﴿وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ﴾ ''اور وہ کفر کر رہے ہیں اس کا جو اس کے پیچھے ہے۔''

چنانچہ انہوں نے پہلے انجیل کا کفر کیا اور حضرت مسیح علیہ السلام کو نہیں مانا' اور اب انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کفر کیا ہے اور قرآن کو نہیں مانا۔

﴿وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ﴾ ''حالانکہ وہ حق ہے' تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے اُس کی جو اُن کے پاس ہے۔''

﴿قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ﴾ ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے) کہیے: تو پھر تم کیوں قتل کرتے رہے ہو اللہ کے نبیوں کو اس سے پہلے؟''

﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۹۱﴾ ''اگر تم واقعتاً ایمان رکھنے والے ہو!''

اگر تم ایسے ہی حق پرست ہو اور جو کچھ تم پر نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان رکھنے والے ہو تو تم اُن پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے رہے ہو جو خود بنی اسرائیل میں پیدا ہوئے تھے؟ تم نے زکریا علیہ السلام کو کیوں قتل کیا؟ یحییٰ علیہ السلام کو کیوں قتل کیا؟ عیسیٰ علیہ السلام کے قتل کی پلاننگ کیوں کی؟ تمہارے تو ہاتھ نبیوں کے خون سے آلودہ ہیں اور تم دعوے دار ہو ایمان کے!

آیت ۹۲ ﴿وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ''اور آ چکے تمہارے پاس موسیٰؑ صریح معجزے اور واضح تعلیمات لے کر''

﴿ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ﴾ ''پھر تم نے اُس کی غیر حاضری میں بچھڑے کو اپنا معبود بنا لیا''

﴿وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۹۲﴾ ''اور تم ظالم ہو۔''

آیت ۹۳ ﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور تمہارے اوپر کوہِ طور کو معلق کر دیا تھا۔''

﴿خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا﴾ ''پکڑو اس کو جو ہم نے تم کو دیا ہے مضبوطی کے ساتھ اور سنو!''

ہم نے تاکید کی تھی کہ جو ہدایات ہم دے رہے ہیں ان کی سختی کے ساتھ پابندی کرو اور کان لگا کر سنو۔

﴿قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ ''انہوں نے کہا ہم نے سنا اور نافرمانی کی۔''

یعنی ہم نے سن تو لیا ہے' مگر مانیں گے نہیں! قومِ یہود کی یہ بھی ایک دیرینہ بیماری تھی کہ زبان کو ذرا سا مروڑ کر الفاظ کو اس طرح بدل دیتے تھے کہ بات کا مفہوم ہی یکسر بدل جائے۔ چنانچہ ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' کے بجائے ''سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا'' کہتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو منافقین تھے ان کا بھی یہی وطیرہ تھا۔ ان کی جب سرزنش کی جاتی تو کہتے تھے کہ ہم نے تو کہا تھا ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' آپ کی اپنی سماعت میں کوئی خلل ہوگا۔

﴿وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ﴾ ''اور پلا دی گئی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت ان کے اس کفر کی پاداش میں۔''

﴿قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ﴾ ''کہیے: بہت ہی بُری ہیں یہ باتیں جن کا حکم دے رہا ہے تمہیں تمہارا ایمان''

﴿اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ﴿۹۳﴾﴾ ''اگر تم مؤمن ہو!''

یہ عجب ایمان ہے جو تمہیں ایسی بُری حرکات کا حکم دیتا ہے۔ کیا ایمان کے ساتھ ایسی حرکتیں ممکن ہوتی ہیں؟

آگے پھر ایک بہت اہم آفاقی سچائی (universal truth) کا بیان ہو رہا ہے' جس کو پڑھتے ہوئے خود دروں بینی (introspection) کی ضرورت ہے۔ یہود کو یہ زعم تھا کہ ہم تو اللہ کے بڑے چہیتے ہیں' لاڈلے ہیں' اس کے بیٹوں کی مانند ہیں' ہم اولیاء اللہ ہیں' ہم اس کے پسندیدہ اور چنیدہ لوگ ہیں' لہٰذا آخرت کا گھر ہمارے ہی لیے ہے۔ چنانچہ ان کے سامنے ایک لٹمس ٹیسٹ (litmus test) رکھا جا رہا ہے۔ واضح رہے کہ یہ ٹیسٹ میرے اور آپ کے لیے بھی ہے۔

آیت ۹۴ ﴿قُلۡ اِنۡ كَانَتۡ لَكُمُ الدَّارُ الۡاٰخِرَةُ عِنۡدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنۡ دُوۡنِ النَّاسِ﴾ ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے: اگر تمہارے لیے آخرت کا گھر اللہ کے پاس خالص کر دیا گیا ہے دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر''

یعنی تمہارے لیے جنت مخصوص (reserve) ہو چکی ہے اور تم مرتے ہی جنت میں پہنچا دیے جاؤ گے۔

﴿فَتَمَنَّوُا الۡمَوۡتَ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۹۴﴾﴾ ''تب تو تمہیں موت کی تمنا کرنی چاہیے اگر تم (اپنے اس خیال میں) سچے ہو۔''

اگر تمہیں جنت میں داخل ہونے کا اتنا ہی یقین ہے پھر تو دنیا میں رہنا تم پر گراں ہونا چاہیے۔ یہاں تو بہت سی کلفتیں ہیں' یہاں تو انسان کو بڑی مشقت اور شدید کوفت اٹھانی پڑ جاتی ہے۔ جس شخص کو یہ یقین ہو کہ اس دنیا کے بعد آخرت کی زندگی ہے اور وہاں میرا مقام جنت میں ہے تو اسے یہ زندگی اثاثہ (asset) نہیں' ذمہ داری (liability) معلوم ہونی چاہیے۔ اسے تو دنیا قید خانہ نظر آنی چاہیے' جیسے حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ)) (۱۰) ''دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے''۔ اگر کسی شخص کا آخرت پر ایمان ہے اور اللہ کے ساتھ اس کا معاملہ خلوص پر مبنی ہے نہ کہ دھوکہ بازی پر تو اس کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ اسے دنیا میں زیادہ دیر تک زندہ رہنے کی آرزو تو نہ ہو۔ اس کا جائزہ ہر شخص خود لگا سکتا ہے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿بَلِ الۡاِنۡسَانُ عَلٰى نَفۡسِهٖ بَصِيۡرَةٌ ﴿۱۴﴾﴾ (القیمۃ) ''بلکہ آدمی اپنے لیے آپ دلیل ہے''۔ ہر انسان کو خوب معلوم ہے کہ میں کہاں کھڑا ہوں۔ آپ کا دل آپ کو بتا دے گا کہ آپ اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں یا آپ کا معاملہ خلوص و اخلاص پر مبنی ہے۔ اگر واقعتاً خلوص اور اخلاص والا معاملہ ہے تو پھر تو یہ کیفیت ہونی چاہیے جس کا نقشہ اس حدیث نبویؐ میں کھینچا گیا ہے: ((كُنْ فِي الدُّنْيَا كَاَنَّكَ غَرِيْبٌ اَوْ عَابِرُ سَبِيْلٍ)) (۱۱) ''دنیا میں اس طرح رہو گویا تم اجنبی ہو یا مسافر ہو''۔ پھر تو یہ دنیا باغ نہیں قید خانہ نظر آنی چاہیے' جس میں انسان مجبوراً رہتا ہے۔ پھر زاویۂ نگاہ یہ ہونا چاہیے کہ اللہ نے مجھے یہاں بھیجا ہے' لہٰذا ایک معیّن مدت کے لیے یہاں رہنا ہے اور جو جو ذمہ داریاں اس کی طرف عائد کی گئی ہیں وہ ادا کرنی ہیں۔ لیکن اگر یہاں رہنے کی خواہش دل میں موجود ہے تو پھر یا تو آخرت پر ایمان نہیں یا اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ خلوص و اخلاص پر مبنی نہیں۔ یہ گویا لٹمس ٹیسٹ ہے۔

آیت ۹۵ ﴿وَلَنۡ يَّتَمَنَّوۡهُ اَبَدًا﴾ ''اور یہ ہرگز آرزو نہیں کریں گے موت کی''

۱۰۔ صحیح مسلم' کتاب الزھد والرقائق' عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ۔

۱۱۔ صحیح البخاری' کتاب الرقاق' باب قول النبی ﷺ کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔ وسنن الترمذی' کتاب الزھد' باب ماجاء فی قصر الأمل۔

﴿بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ﴾ ''بسبب اُن کرتوتوں کے جو ان کے ہاتھوں نے آگے بھیجے ہوئے ہیں۔''
ہر شخص کو خود معلوم ہے کہ میں نے کیا کمائی کی ہے' کیا آگے بھیجی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۹۵﴾ ''اور اللہ ان ظالموں سے بخوبی واقف ہے۔''

آیت ۹۶ ﴿وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ﴾ ''اور تم انہیں پاؤ گے تمام انسانوں سے زیادہ حریص اس (دنیا کی) زندگی پر۔''

﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ﴾ ''حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی زیادہ حریص۔''

یہ اس معاملے میں مشرکوں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں۔ مشرکین نے اہلِ ایمان کے ساتھ مقابلہ کیا تو کھل کر کیا' میدان میں آ کر ڈٹ کر کیا' اپنی جانیں اپنے باطل معبودوں کے لیے قربان کیں' جبکہ یہودیوں میں یہ ہمت و جرأت قطعاً نہیں تھی کہ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آ سکیں۔ ان کے بارے میں سورۃ الحشر میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ﴾ (آیت ۱۴) ''یہ سب مل کر بھی تم سے جنگ نہ کر سکیں گے مگر قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کی اوٹ سے''۔ چنانچہ یہود کبھی بھی سامنے آ کر مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ اس لیے کہ انہیں اپنی جانیں بہت عزیز تھیں۔

﴿يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ﴾ ''ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ کسی طرح اس کی عمر ہزار برس ہو جائے۔''

﴿وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ﴾ ''حالانکہ نہیں ہے اس کو بچانے والا عذاب سے اس قدر جینا۔''
اگر ان کو ان کی خواہش کے مطابق طویل زندگی دے بھی دی جائے تو یہ انہیں عذاب سے تو چھٹکارا نہیں دلا سکے گی۔ آخرت تو بالآخر آنی ہے اور انہیں ان کے کرتوتوں کی سزا مل کر رہنی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۹۶﴾ ''اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔''

آیات ۹۷ تا ۱۰۳

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۹۷ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝۹۸ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝۹۹ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۰ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۘ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۱ وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ

فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۫ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۲

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے' حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت یہود کے لیے بہت بڑی آزمائش ثابت ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ آخری نبوت کا وقت قریب ہے اور یہ نبی بھی حسبِ سابق بنی اسرائیل میں سے مبعوث ہوگا۔ لیکن نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت بنی اسماعیل میں سے ہوگئی۔ یہود جس احساسِ برتری کا شکار تھے اس کی رو سے وہ بنی اسماعیل کو حقیر سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ اُمّی لوگ ہیں' اَن پڑھ ہیں' ان کے پاس نہ کوئی کتاب ہے نہ شریعت ہے اور نہ کوئی قانون اور ضابطہ ہے' لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُن میں سے ایک شخص کو کیسے چُن لیا؟ ان کا خیال تھا کہ یہ سب جبرائیل کی ''شرارت'' ہے کہ وہ وحی لے کر محمد عربی (ﷺ) کے پاس چلا گیا۔ لہٰذا وہ حضرت جبرائیل کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے اور انہیں گالیاں دیتے تھے۔

یہ بات شاید آپ کو بڑی عجیب لگے کہ اہلِ تشیع میں سے فرقہ ''غرابیہ'' کا عقیدہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ حضرت مجدد الفِ ثانی شیخ احمد سرہندیؒ نے اپنے مکاتیب میں اس فرقے کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت محمد ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ دونوں کی ارواح ایک دوسرے کے بالکل ایسے مشابہ تھیں جیسے ایک غُراب (کوّا) دوسرے غراب کے مشابہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت جبرائیلؑ دھوکہ کھا گئے۔ اللہ نے تو وحی بھیجی تھی حضرت علیؓ کے پاس' لیکن وہ لے گئے حضرت محمد ﷺ کے پاس۔ یہود کے ہاں یہ عقیدہ موجود تھا کہ اللہ نے تو جبرائیل (علیہ السلام) کو بنی اسرائیل میں سے کسی کے پاس بھیجا تھا' لیکن وہ محمد (ﷺ) کے پاس چلے گئے' اور یہی مفروضہ ان کی حضرت جبرائیلؑ سے دشمنی کی بنیاد تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ((لَيَأْتِيَنَّ عَلٰى اُمَّتِيْ مَا اَتٰى عَلٰى بَنِيْ اِسْرَاءِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))[۱۲] ''میری اُمت پر بھی وہ تمام احوال لازماً وارد ہو کر رہیں گے جو بنی اسرائیل پر وارد ہوئے تھے' جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہ ہوتا ہے''۔ چنانچہ اُمتِ مُسلمہ میں سے کسی فرقے کا اس طرح کے عقائد اپنا لینا کچھ بعید نہیں ہے۔ اس سے اس حدیث کی حقیقت منکشف ہوتی ہے۔

آیت ۹۷ ﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے جو کوئی بھی دشمن ہو جبرائیلؑ کا''

﴿فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''تو (وہ یہ جان لے کہ) اُس نے تو نازل کیا ہے اس قرآن کو آپؐ کے دل پر اللہ کے حکم سے''

اس معاملے میں جبرائیلؑ کو تو کچھ اختیار حاصل نہیں۔ فرشتے جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے حکم سے کرتے ہیں' اپنے اختیار سے کچھ نہیں کرتے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ﴾ ''یہ تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے اُس کلام کی جو اس کے سامنے موجود ہے''

﴿وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾﴾ ''اور ہدایت اور بشارت ہے اہلِ ایمان کے لیے۔''

اس کے بعد اب فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ' اس کے رسولؐ اور اُس کے ملائکہ سب ایک حیاتیاتی وحدت (organic whole) کی

۱۲۔ سنن الترمذی' کتاب الایمان' باب ماجاء فی افتراق هذه الامة۔

حیثیت رکھتے ہیں' یہ ایک جماعت ہیں' ان میں کوئی اختلاف یا افتراق نہیں ہوسکتا۔ اگر کوئی جبرائیلؑ کا دشمن ہے تو وہ اللہ کا دشمن ہے' اور اگر کوئی اللہ کے سچے رسولؐ کا دشمن ہے تو وہ اللہ کا بھی دشمن ہے اور جبرائیلؑ کا بھی دشمن ہے۔

آیت ۹۸ ﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾﴾ ''(تو کان کھول کر سن لو) جو کوئی بھی دشمن ہے اللہ کا اور اُس کے فرشتوں کا اور اس کے رسولوں کا اور جبرائیل اور میکائیل کا تو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی اعلان ہے کہ) اللہ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔''

آیت ۹۹ ﴿وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کی طرف نازل کر دی ہیں روشن آیات۔''

﴿وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾﴾ ''اور انکار نہیں کرتے ان کا مگر وہی جو سرکش ہیں۔''

یاد کیجیے سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع میں یہ الفاظ آئے تھے: ﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾﴾ ''اور وہ گمراہ نہیں کرتا اس کے ذریعے سے مگر فاسقوں کو۔''

آیت ۱۰۰ ﴿اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا﴾ ''تو کیا (ہمیشہ ایسا ہی نہیں ہوتا رہا ہے کہ) جب کبھی بھی انہوں نے کوئی عہد کیا''

اللہ سے کوئی میثاق کیا یا اللہ کے رسولوں سے کوئی عہد کیا۔

﴿نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ﴾ ''ان میں سے ایک گروہ نے اسے اٹھا کر پھینک دیا۔''

﴿بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾ ''بلکہ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو یقین نہیں رکھتے۔''

ان کی اکثریت ایمان و یقین کی دولت سے تہی دامن ہے۔

یہی حال آج اُمتِ مسلمہ کا ہے کہ مسلمان تو سب ہیں' لیکن ایمانِ حقیقی' ایمانِ قلبی یعنی یقین والا ایمان کتنے لوگوں کو حاصل ہے؟ ع ''ڈھونڈ اب ان کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر!''

آیت ۱۰۱ ﴿وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ''اور جب آیا اُن کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسول (یعنی محمد ﷺ)''

﴿مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ﴾ ''تصدیق کرنے والا اُس کتاب کی جو ان کے پاس موجود ہے''

﴿نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ ''تو اہلِ کتاب میں سے ایک جماعت نے اللہ کی کتاب کو پیٹھوں کے پیچھے پھینک دیا''

﴿كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''گویا کہ وہ جانتے ہی نہیں۔''

علماءِ یہود نے نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد کی پیشین گوئیاں چھپانے کی خاطر خود تورات کو پس پشت ڈال دیا اور بالکل انجانے سے ہو کر رہ گئے۔ ان کے عوام پوچھتے ہوں گے کہ کیا یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر تم کیا کرتے تھے؟ لیکن یہ جواب میں کہتے کہ یقین سے نہیں کہہ سکتے' ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو! انہوں نے ایسا رویہ اپنا لیا جیسے انہیں کچھ علم نہیں ہے۔

اب ایک اور حقیقت نوٹ کیجیے۔ جب کسی مسلمان اُمت میں دین کی اصل حقیقت اور اصل تعلیمات سے بُعد پیدا ہوتا ہے تو

لوگوں کا رجحان جادو ٹونے ٹوٹکے تعویذ اور عملیات وغیرہ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اللہ کی کتاب تو ہدایت کا سرچشمہ بن کر اُتری تھی لیکن یہ اُس کو اپنی دُنیوی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بناتے ہیں۔ چنانچہ دشمن کو زیر کرنے اور محبوب کو قدموں میں گرانے کے لیے ''عملیاتِ قرآنی'' کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ دھندے ہمارے ہاں بھی خوب چل رہے ہیں اور شاید سب سے زیادہ منفعت بخش کاروبار یہی ہے جس میں نہ تو کوئی محنت کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی سرمایہ کاری کی۔ بنی اسرائیل کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دین کی اصل حقیقت کو چھوڑ کر جادو کے پیچھے چل پڑے تھے۔ فرمایا:

آیت ۱۰۲ ﴿وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ﴾ ''انہوں نے پیروی کی اُس علم کی جو شیاطین پڑھا کرتے تھے سلیمانؑ کی بادشاہت کے وقت''

اللہ تعالیٰ نے جنّات کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے تابع کر دیا تھا۔ اُس وقت چونکہ ان کا انسانوں کے ساتھ زیادہ میل جول رہتا تھا لہٰذا یہ انسانوں کو جادو وغیرہ سکھاتے رہتے تھے۔

﴿وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''اور سلیمانؑ نے کبھی کفر نہیں کیا بلکہ یہ تو شیاطین تھے جو کفر کرتے تھے''

﴿يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۚ﴾ ''وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔''

جادو کفر ہے لیکن آپ کو آج بھی ''نقشِ سلیمانی'' کی اصطلاح سننے کو ملے گی۔ اس طرح بعض مسلمان بھی ان چیزوں کو حضرت سلیمانؑ کی طرف منسوب کر رہے ہیں اور وہ ظلم اب بھی جاری ہے۔

﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ﴾ ''اور (وہ اُس علم کے پیچھے پڑے) جو نازل کیا گیا دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر بابل میں۔''

بابل (Babylonia) عراق کا پرانا نام تھا۔ یروشلم پر حملہ کرنے والا بخت نصر (Nebuchadnezzar) بھی یہیں کا بادشاہ تھا اور نمرود بھی بابل ہی کا بادشاہ تھا۔ نمرود عراق کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا جس کی جمع ''نماردۃ'' ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دورِ حکومت میں جنّات اور انسانوں کا باہم میل جول ہونے کی وجہ سے جنات لوگوں کو جادوگری کی تعلیم دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی آخری آزمائش کے لیے دو فرشتوں کو زمین پر اتارا جو انسانی شکل وصورت میں لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ وہ خود ہی یہ واضح کر دیتے تھے کہ دیکھو جادو کفر ہے ہم سے نہ سیکھو لیکن اس کے باوجود لوگ سیکھتے تھے۔ گویا اُن پر اتمامِ حُجّت ہو گیا کہ اب ان کے اندر خباثت پورے طریقے سے گھر کر چکی ہے۔

﴿وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ﴾ ''اور وہ نہیں سکھاتے تھے کسی کو بھی''

﴿حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ﴾ ''یہاں تک کہ وہ کہہ دیتے تھے کہ دیکھو ہم تو آزمائش کے لیے بھیجے گئے ہیں پس تم کفر مت کرو۔''

﴿فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ﴾ ''پھر وہ سیکھتے تھے اُن دونوں سے وہ شے جن کے ذریعے سے آدمی اور اُس کی بیوی کے درمیان جدائی ڈالتے تھے۔''

شوہر اور بیوی کے درمیان جدائی ڈالنا اور لوگوں کے گھروں میں فساد ڈالنا اس طرح کے کام اب بھی بعض عورتیں بڑی سرگرمی سے سرانجام دیتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے تعویذ گنڈے دھاگے اور نہ جانے کیا کچھ ذرائع اختیار کیے جاتے ہیں۔

﴿وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور نہیں تھے وہ ضرر پہنچانے والے اس کے ذریعے کسی کو بھی اللہ کے اِذن کے بغیر۔''

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ بندۂ مؤمن کو یہ یقین ہو کہ اللہ کے اذن کے بغیر نہ کوئی چیز فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ ہی نقصان۔ چاہے کوئی دوا ہو وہ بھی باذنِ ربّ کام کرے گی ورنہ نہیں۔ جو کوئی بھی اسبابِ طبعیہ ہیں ان کے اثرات تبھی ظاہر ہوں گے اگر اللہ چاہے گا' اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ جادو کا اثر بھی اگر ہوگا تو اللہ کے اذن سے ہوگا۔ چنانچہ بندۂ مؤمن کو اللہ کے بھروسے پر ڈٹے رہنا چاہیے اور مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

﴿وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ﴾ ''اور وہ سیکھتے تھے وہ چیزیں جو خود اُن کو بھی ضرر پہنچانے والی تھیں اور انہیں نفع نہیں پہنچاتی تھیں۔''

﴿وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ﴾ ''حالانکہ وہ خوب جان چکے تھے کہ جو بھی اس چیز کا خریدار بنا (یعنی جادو سیکھا) اُس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔''

﴿وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ ''اور بہت ہی بُری تھی وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو فروخت کر دیا۔''

﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۲﴾ ''کاش انہیں علم ہوتا!''

آیت ۱۰۳ ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا﴾ ''اور اگر وہ ایمان رکھتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے''

﴿لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ﴾ ''تو بدلہ پاتے اللہ کی طرف سے بہت ہی اچھا۔''

﴿لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۱۰۳﴾ ''کاش اُن کو معلوم ہوتا!''

آیات ۱۰۴ تا ۱۱۲

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۰۴
مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۱۰۵ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ
اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۰۶ اَلَمْ تَعْلَمْ
اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝۱۰۷
اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ
بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝۱۰۸ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا

حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَ قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع

آیت ۱۰۴ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا﴾ ''اے ایمان والو تم رَاعِنَا مت کہا کرو''

﴿وَقُوْلُوا انْظُرْنَا﴾ ''بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو''

﴿وَاسْمَعُوْا ؕ﴾ ''اور توجہ سے بات کو سنو!''

قبل ازیں منافقینِ بنی اسرائیل کا ذکر ہوا تھا' جن کا قول تھا: ''سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا''۔ اب یہاں اُن منافقین کا طرزِ عمل بیان ہو رہا ہے جو مسلمانوں میں شامل ہو گئے تھے اور یہود کے زیر اثر تھے۔ یہودی اور ان کے زیر اثر منافقین جب رسول اللہ ﷺ کی محفل میں بیٹھتے تھے تو اگر آپؐ کی کوئی بات انہیں سنائی نہ دیتی یا سمجھ میں نہ آتی تو وہ رَاعِنَا کہتے تھے' جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضور (ﷺ!) ذرا ہماری رعایت کیجیے' بات کو دوبارہ دہرا دیجیے' ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اہلِ ایمان بھی یہ لفظ استعمال کرنے لگے تھے۔ لیکن یہود اور منافقین اپنے خبثِ باطن کا اظہار اس طرح کرتے کہ اس لفظ کو زبان دبا کر کہتے تو ''رَاعِيْنَا'' ہو جاتا (یعنی اے ہمارے چرواہے!) اس پر دل ہی دل میں خوش ہوتے اور اس طرح اپنی خباثتِ نفس کو غذا مہیا کرتے۔ اگر کوئی ان کو ٹوک دیتا کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو تو جواب میں کہتے ہم نے تو رَاعِنَا کہا تھا' معلوم ہوتا ہے آپ کی سماعت میں کوئی خلل پیدا ہو چکا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم اس لفظ ہی کو چھوڑ دو' اس کی جگہ کہا کرو: اُنْظُرْنَا۔ یعنی اے نبیؐ ہماری طرف توجہ فرمائیے! یا ہمیں مہلت دیجیے کہ ہم بات کو سمجھ لیں۔ اور دوسرے یہ کہ توجہ سے بات کو سنا کرو تاکہ دوبارہ پوچھنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

﴿وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾﴾ ''اور ان کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۱۰۵ ﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾

''اور نہیں چاہتے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ہے اہلِ کتاب میں سے اور مشرکین میں سے کہ نازل ہو تم پر کوئی بھی خیر تمہارے ربّ کی طرف سے۔''

جن لوگوں نے دعوتِ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے' خواہ اہل کتاب میں سے ہوں یا مشرکینِ مکہ میں سے' وہ اس بات پر حسد کی آگ میں جل رہے ہیں کہ یہ کلامِ پاک آپؐ پر کیوں نازل ہو گیا اور ''خاتم النّبیّٖن'' کا یہ منصب آپؐ کو کیوں مل گیا۔ وہ نہیں چاہتے کہ اللہ کی طرف سے کوئی بھی خیر آپ کو ملے۔

﴿وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''اور اللہ خاص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے ساتھ جس کو چاہتا ہے۔''

یہ تو اس کا اختیار اور اس کا فیصلہ ہے۔

﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔''

آیت ۱۰۶ ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا﴾ ''جو بھی ہم منسوخ کرتے ہیں کوئی آیت یا اسے بھلا دیتے ہیں''

ایک تو ہے نسخ یعنی کسی آیت کو منسوخ کر دینا اور ایک ہے حافظے سے ہی کسی شے کو محو کر دینا۔

﴿نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾ ''تو ہم (اُس کی جگہ پر) لے آتے ہیں اُس سے بہتر یا (کم از کم) ویسی ہی۔''

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾﴾ ''کیا تم یہ نہیں جانتے کہ اللہ ہر شے پر قدرت رکھتا ہے؟''

اسے ہر شے کا اختیار حاصل ہے۔

اس آیت کا اصل مفہوم اور پس منظر سمجھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اللہ کا دین آدم علیہ السلام سے لے کر ایں دم تک ایک ہی ہے۔ نوح علیہ السلام کا دین، موسیٰ علیہ السلام کا دین، عیسیٰ علیہ السلام کا دین اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دین ایک ہی ہے، جبکہ شریعتوں میں فرق رہا ہے۔ اس فرق کا اصل سبب یہ ہے کہ نوعِ انسانی مختلف اعتبارات سے ارتقاء کے مراحل طے کر رہی تھی۔ ذہنی پختگی، شعور کی پختگی اور پھر تمدنی ارتقاء (social evolution) مسلسل جاری تھا۔ لہٰذا اُس ارتقاء کے جس مرحلے میں رسول آئے اسی کی مناسبت سے ان کو تعلیمات دے دی گئیں۔ ان تعلیمات کے کچھ حصے ایسے تھے جو ابدی (eternal) ہیں، وہ ہمیشہ رہیں گے، جبکہ کچھ حصے زمانے کی مناسبت سے تھے۔ چنانچہ جب اگلا رسول آتا تو اُن میں سے کچھ چیزوں میں تغیر و تبدل ہو جاتا، کچھ چیزیں نئی آ جاتیں اور کچھ پرانی ساقط ہو جاتیں۔ یہ معاملہ نسخ کہلاتا ہے۔ یا تو اللہ تعالیٰ تعین کے ساتھ کسی حکم کو منسوخ فرما دیتے ہیں اور اس کی جگہ نیا حکم بھیج دیتے ہیں، یا کسی شے کو سرے سے لوگوں کے ذہنوں سے خارج کر دیتے ہیں۔ یہودی یہ اعتراض کر رہے تھے کہ اگر یہ دین وہی ہے جو موسیٰ علیہ السلام کا تھا تو پھر شریعت پوری وہی ہونی چاہیے۔ یہاں اس اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔

پھر ناسخ و منسوخ کا مسئلہ قرآن میں بھی ہے۔ قرآن میں بھی تدریج کے ساتھ شریعت کی تکمیل ہوئی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا، شریعت کا ابتدائی خاکہ (blue print) سورۃ البقرۃ میں مل جاتا ہے، لیکن شریعت کی تکمیل سورۃ المائدۃ میں ہوئی ہے۔ یہ جو تقریباً پانچ چھ سال کا عرصہ ہے اس میں کچھ احکام دیے گئے، پھر اُن میں ردّ و بدل کر کے نئے احکام دیے گئے اور پھر آخر میں یہ ارشاد فرما دیا گیا: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:۳) ''آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کر لیا ہے''۔ تو یہ ناسخ و منسوخ کا مسئلہ صرف سابقہ شریعتوں اور شریعتِ محمدیؐ کے مابین ہی نہیں ہے، بلکہ خود شریعتِ محمدی (ﷺ) میں بھی زمانی اعتبار سے ارتقاء ہوا ہے۔ مثال کے طور پر پہلے شراب کے بارے میں حکم دیا گیا کہ اس میں گناہ کا پہلو زیادہ ہے اگرچہ کچھ فائدے بھی ہیں۔ اس کے بعد حکم آیا کہ اگر شراب کے نشے میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ۔ پھر سورۃ المائدۃ میں آخری حکم آ گیا اور اسے گندا شیطانی کام قرار دے کر فرمایا گیا: ﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾﴾ ''تو کیا اب بھی باز آتے ہو یا نہیں؟'' اس طرح تدریجاً احکام آئے اور آخری حکم میں شراب حرام کر دی گئی۔ یہاں فرمایا کہ اگر ہم کسی حکم کو منسوخ کرتے ہیں یا اسے بھلا دیتے ہیں تو اُس سے بہتر لے آتے ہیں یا کم از کم اُس جیسا دوسرا حکم لے آتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے، اُس کا اختیار کامل ہے، وہ مالک الملک ہے، دین اُس کا ہے، اس میں وہ جس طرح چاہے تبدیلی کر سکتا ہے۔

آیت ۱۰۷ ﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ ''کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہی کے لیے بادشاہی ہے آسمانوں کی اور زمین کی؟''

﴿وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾﴾ ''اور نہیں ہے تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی بھی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔''

آیت ۱۰۸ ﴿اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۭ﴾ ''کیا تم مسلمان بھی یہ چاہتے ہو کہ سوالات (اور مطالبے) کرو اپنے رسولؐ سے اُسی طرح جیسے اس سے پہلے موسیٰؑ سے کیے جا چکے ہیں؟''

مثلاً اُن سے کہا گیا کہ ہم آپ کی بات نہیں مانیں گے جب تک کہ اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں۔ اسی طرح کے اور بہت سے مطالبے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیے جاتے تھے۔ یہاں مسلمانوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اُس روش سے باز رہو' ایسی بات تمہارے اندر پیدا نہیں ہونی چاہیے۔

﴿وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾﴾ ''اور جو کوئی ایمان کے بدلے کفر لے لے گا وہ تو بھٹک چکا سیدھی راہ سے۔''

ظاہر ہے کہ جو منافقین اہلِ ایمان کی صفوں میں شامل تھے وہی ایسی حرکتیں کر رہے ہوں گے۔ اس لیے فرمایا کہ جو کوئی ایمان کو ہاتھ سے دے کر کفر کو اختیار کر لے گا وہ تو راہِ راست سے بھٹک گیا۔ منافق کا معاملہ دو طرفہ ہوتا ہے' چنانچہ قرآن حکیم میں منافقین کے لیے ''مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ اب اس کا بھی امکان ہوتا ہے کہ وہ کفر کی طرف یکسو ہو جائے اور اس کا بھی امکان ہوتا ہے کہ بالآخر ایمان کی طرف یکسو ہو جائے۔ جو شخص ایمان اور کفر کے درمیان معلق ہے اُس کے لیے یہ دونوں امکانات ہیں۔ جو کفر کی طرف جا کر مستقل طور پر اُدھر راغب ہو گیا یہاں اس کا ذکر ہے۔

آیت ۱۰۹ ﴿وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ﴾ ''اہلِ کتاب میں سے بہت سے لوگ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح تمہیں پھیر کر تمہارے ایمان کے بعد تمہیں پھر کافر بنا دیں۔''

یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی بلّی کی دُم کٹ جائے تو وہ یہ چاہے گی کہ ساری بلّیوں کی دُمیں کٹ جائیں تاکہ وہ علیحدہ سے نمایاں نہ رہے۔ چنانچہ اہلِ کتاب یہ چاہتے تھے کہ اہلِ ایمان کو بھی واپس کفر میں لے آیا جائے۔

﴿حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ﴾ ''بسبب ان کے دلی حسد کے''

ان کا یہ طرزِ عمل ان کے حسد کی وجہ سے ہے کہ یہ نعمت مسلمانوں کو کیوں دے دی گئی؟

﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ﴾ ''اس کے بعد کہ اُن پر حق بالکل واضح ہو چکا ہے۔''

وہ حق کو جان چکے ہیں اور پہچان چکے ہیں' کسی مغالطے یا غلط فہمی میں نہیں ہیں۔

﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ ''تو (اے مسلمانو!) تم معاف کرتے رہو اور صرفِ نظر سے کام لو''

یہ بہت اہم مقام ہے۔ مسلمانوں کو باور کرایا جا رہا ہے کہ ابھی تو مدنی دَور کا آغاز ہو رہا ہے' ابھی کشمکش' کشاکش اور مقابلہ و تصادم کے بڑے سخت مراحل آ رہے ہیں۔ چونکہ تمہارا سب سے پہلا محاذ کفارِ مکہ کے خلاف ہے اور وہی سب سے بڑھ کر تم پر حملے کریں گے اور ان سے تمہاری جنگیں ہوں گی' لہٰذا یہ جو آستین کے سانپ ہیں' یعنی یہود' ان کو ابھی مت چھیڑو۔ جب تک یہ خوابیدہ (dormant) پڑے رہیں انہیں پڑا رہنے دو۔ فی الحال ان کے طرزِ عمل کے بارے میں زیادہ توجہ نہ دو' بلکہ عفو و درگزر اور چشم پوشی

سے کام لیتے رہو۔

﴿حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ ؕ﴾ ''یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے۔''

ایک وقت آئے گا جب اے مسلمانو تمہیں آخری غلبہ حاصل ہو جائے گا اور جب تم باہر کے دشمنوں سے نمٹ لو گے تو پھر ان اندرونی دشمنوں کے خلاف بھی تمہیں آزادی دی جائے گی کہ ان کو بھی کیفرِ کردار تک پہنچا دو۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۰۹﴾﴾ ''یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۱۱۰ ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ ؕ﴾ ''اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔''

﴿وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْہُ عِنْدَ اللّٰہِ ؕ﴾ ''اور جو بھلائی بھی تم اپنے لیے آگے بھیجو گے اُسے اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے۔''

جو مال تم اللہ کی راہ میں خرچ کر رہے ہو وہ اللہ کے بینک میں جمع (deposit) ہو جاتا ہے اور مسلسل بڑھتا رہتا ہے' لہٰذا اس کے بارے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱۰﴾﴾ ''یقیناً جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت ۱۱۱ ﴿وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّۃَ اِلَّا مَنْ کَانَ ہُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ﴾ ''اور یہ کہتے ہیں ہرگز داخل نہ ہوگا جنت میں مگر وہی جو یہودی ہو یا نصرانی ہو۔''

جب یہ نئی اُمتِ مسلمہ تشکیل پا رہی تھی تو یہودی اور نصرانی' جو ایک دوسرے کے دشمن تھے' مسلمانوں کے مقابلے میں جمع ہو گئے۔ انہوں نے مل کر یہ کہنا شروع کیا کہ جنت میں کوئی ہرگز نہیں داخل ہوگا سوائے اس کے جو یا تو یہودی ہو یا نصرانی ہو۔ اس طرح کی مذہبی جتھے بندیاں ہمارے ہاں بھی بن جاتی ہیں۔ مثلاً اہلِ حدیث کے مقابلے میں بریلوی اور دیوبندی جمع ہو جائیں گے' اگرچہ اُن کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بیر اپنی جگہ ہے۔ جب ایک مشترکہ دشمن نظر آتا ہے تو پھر وہ لوگ جن کے اپنے اندر بڑے اختلافات ہوتے ہیں وہ بھی ایک متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کے اس مشترکہ بیان کے جواب میں فرمایا:

﴿تِلْکَ اَمَانِیُّہُمْ ؕ﴾ ''یہ ان کی تمنائیں ہیں۔''

یہ ان کی خواہشات ہیں' من گھڑت خیالات ہیں' خوش نما آرزوئیں (wishful thinkings) ہیں۔

﴿قُلْ ہَاتُوْا بُرْہَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۱﴾﴾ ''اُن سے کہو اپنی دلیل پیش کرو اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو۔''

کسی آسمانی کتاب سے دلیل لاؤ۔ کہیں تورات میں لکھا ہو یا انجیل میں لکھا ہو تو ہمیں دکھا دو! اب یہاں پر پھر ایک عالمگیر صداقت (universal truth) بیان ہو رہی ہے:

آیت ۱۱۲ ﴿بَلٰی ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْہَہٗ لِلّٰہِ وَہُوَ مُحْسِنٌ﴾ ''کیوں نہیں' ہر وہ شخص جو اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دے اور وہ محسن ہو''

اس کا سرِ تسلیم خم کر دینے کا رویہ صدق و سچائی اور حسنِ کردار پر مبنی ہو۔ سر کا جھکانا منافقانہ انداز میں نہ ہو' اس کی اطاعت جزوی نہ ہو کہ کچھ مانا کچھ نہیں مانا۔

﴿فَلَهٗۤ اَجۡرُهٗ عِنۡدَ رَبِّهٖ ۪﴾ ''تو اُس کے لیے اُس کا اجر محفوظ ہے اُس کے ربّ کے پاس۔''

﴿وَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ ''اور ایسے لوگوں کو نہ تو کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ ہی وہ کسی حزن وملال سے دوچار ہوں گے۔''

یہ دوسری آیت ہے کہ جس سے کچھ لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ نجاتِ اُخروی کے لیے ایمان بالرسالت ضروری نہیں ہے۔ اس کا جواب پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ مختصراً یہ کہ:

اوّلاً — قرآن حکیم میں ہر مقام پر ساری چیزیں بیان نہیں کی جاتیں۔ کوئی شے ایک جگہ بیان کی گئی ہے تو کوئی کہیں دوسری جگہ بیان کی گئی ہے۔ اس سے ہدایت حاصل کرنی ہے تو اس کو پورے کا پورا ایک کتاب کی حیثیت سے لینا ہوگا۔

ثانیاً — یہ سارا سلسلۂ کلام دو بریکٹوں کے درمیان آ رہا ہے اور اس سے پہلے یہ الفاظ واضح طور پر آ چکے ہیں: ﴿وَاٰمِنُوۡا بِمَاۤ اَنۡزَلۡتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمۡ وَلَا تَكُوۡنُوۡۤا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۪﴾ چنانچہ یہ عبارت ضرب کھا رہی ہے اس پورے کے پورے سلسلۂ مضامین سے جو ان دو بریکٹوں کے درمیان آ رہا ہے۔

آیات ۱۱۳ تا ۱۲۳

وَقَالَتِ الۡيَهُوۡدُ لَيۡسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَىۡءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيۡسَتِ الۡيَهُوۡدُ عَلٰى شَىۡءٍ ۙ وَّهُمۡ يَتۡلُوۡنَ الۡكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ مِثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ۚ فَاللّٰهُ يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنۡ يُّذۡكَرَ فِيۡهَا اسۡمُهٗ وَسَعٰى فِىۡ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمۡ اَنۡ يَّدۡخُلُوۡهَاۤ اِلَّا خَآئِفِيۡنَ ؕ لَهُمۡ فِى الدُّنۡيَا خِزۡىٌ وَّلَهُمۡ فِى الۡاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الۡمَشۡرِقُ وَالۡمَغۡرِبُ ۚ فَاَيۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ لَّهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوۡنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ لَوۡلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوۡ تَاۡتِيۡنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡ ؕ تَشَابَهَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ ؕ قَدۡ بَيَّنَّا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ بِالۡحَقِّ بَشِيۡرًا وَّنَذِيۡرًا ۙ وَّلَا تُسۡـَٔـلُ عَنۡ اَصۡحٰبِ الۡجَحِيۡمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنۡ تَرۡضٰى عَنۡكَ الۡيَهُوۡدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمۡ ؕ قُلۡ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الۡهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِىۡ جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيۡرٍ ﴿۱۲۰﴾ اَلَّذِيۡنَ اٰتَيۡنٰهُمُ الۡكِتٰبَ يَتۡلُوۡنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ ؕ وَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۱۲۱﴾ ع يٰبَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ اذۡكُرُوۡا نِعۡمَتِىَ الَّتِىۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ وَاَنِّىۡ فَضَّلۡتُكُمۡ عَلَى

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

آیت ۱۱۳ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ﴾ ''یہودی کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں ہیں'' ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے' کوئی جڑ بنیاد نہیں ہے۔

﴿وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ﴾ ''اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں ہیں'' اُن کی کوئی بنیاد نہیں ہے' یہ بے بنیاد لوگ ہیں' ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

﴿وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ﴾ ''حالانکہ دونوں ہی کتاب پڑھ رہے ہیں۔''

عہد نامۂ قدیم (Old Testament) یہودیوں اور عیسائیوں میں مشترک ہے۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے اور امریکہ میں جدید عیسائیت کی صورت میں ایک بہت بڑی طاقت جو اُبھر رہی ہے وہ عیسائیت کو یہودیت کے رنگ میں رنگ رہی ہے۔ رومن کیتھولک مذہب نے تو بائبل سے اپنا رشتہ توڑ لیا تھا اور سارا اختیار پوپ کے ہاتھ میں آ گیا تھا' لیکن **پروٹسٹنٹس** (Protestants) نے پھر بائبل کو قبول کیا۔ اب اس کی منطقی انتہا یہ ہے کہ عہد نامۂ قدیم پر بھی ان کی توجہ ہو رہی ہے اور وہ کہہ رہے ہیں کہ اسے بھی ہم اپنی کتاب مانتے ہیں اور اس میں جو کچھ لکھا ہے اسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ امریکہ میں ہم نے ایک سیمینار منعقد کیا تھا' جس میں ایک یہودی عالم نے کہا تھا کہ اس وقت اسرائیل کو سب سے بڑی نصرت و حمایت امریکہ کے اُن عیسائیوں سے مل رہی ہے جو Evengelists کہلاتے ہیں اور وہاں پر ایک بڑا فرقہ بن کر اُبھر رہے ہیں۔ بہرحال یہ اُن کا طرزِ عمل بیان ہوا ہے۔

﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ﴾ ''اسی طرح کہی تھی اُن لوگوں نے جو کچھ بھی نہیں جانتے' ان ہی کی سی بات۔''

یہاں اشارہ ہے مشرکینِ مکہ کی طرف۔

﴿فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾﴾ ''پس اللہ تعالیٰ فیصلہ کر دے گا ان کے مابین قیامت کے دن ان تمام باتوں کا جن میں یہ اختلاف کر رہے تھے۔''

اب دیکھئے' اس سلسلۂ کلام کی بقیہ آیات میں بھی اگرچہ خطاب تو بنی اسرائیل ہی سے ہے' لیکن اب یہاں پر اہلِ مکہ سے کچھ تعریض شروع ہو گئی ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ آئے گا' پھر تحویلِ قبلہ کا ذکر آئے گا۔ بیت اللہ چونکہ اُس وقت مشرکینِ مکہ کے قبضے میں تھا' لہٰذا اس حوالے سے کچھ متعلقہ مضامین آ رہے ہیں اور تحویلِ قبلہ کی تمہید باندھی جا رہی ہے۔ ''تحویلِ قبلہ'' دراصل اس بات کی علامت تھی کہ اب وہ سابقہ اُمّتِ مُسلمہ معزول کی جا رہی ہے اور اس مقام پر ایک نئی اُمّت' اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تقرری عمل میں لائی جا رہی ہے۔ اسی حوالے سے ﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ﴾ کے الفاظ میں مشرکینِ مکہ کی طرف اشارہ کیا گیا۔

آیت ۱۱۴ ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ﴾ ''اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی مسجدوں سے (لوگوں کو) روکے کہ ان میں اس کا نام لیا جائے؟''

مشرکینِ مکّہ نے مسلمانوں کو مسجد حرام میں حاضری سے محروم کر دیا تھا اور ان کو وہاں جانے کی اجازت نہ تھی۔ ۶ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ عمرے کے ارادے سے مکّہ کا سفر فرمایا' لیکن مشرکین نے آپؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کو مکّہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ اس موقع پر صلح حدیبیہ ہوئی اور آپؐ کو عمرہ کیے بغیر واپس آنا پڑا۔ پھر اگلے برس ۷ ہجری میں آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ عمرہ ادا کیا۔ تو یہ سات برس محمد رسول اللہ ﷺ اور اہلِ ایمان پر بہت شاق گزرے ہیں۔ یہاں مشرکینِ مکّہ کے اس ظلم کا ذکر ہو رہا ہے کہ انہوں نے اہلِ ایمان کو مسجد حرام سے روک رکھا ہے۔

﴿وَسَعٰی فِیْ خَرَابِهَا ؕ﴾ ''اور وہ ان کی تخریب کے درپے ہو؟''

خراب اور تخریب کا مادۂ اصلی ایک ہی ہے۔ تخریب دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک ظاہری تخریب کہ مسجد کو گرا دینا' اور ایک باطنی اور معنوی تخریب کہ اللہ کے گھر کو توحید کی بجائے شرک کا اڈہ بنا دینا۔ مشرکینِ مکّہ نے بیت اللہ کو بُت کدہ بنا دیا تھا: ؎

دنیا کے بُت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا!

خانہ کعبہ میں ۳۶۰ بُت رکھ دیے گئے تھے' جسے ابراہیم علیہ السلام نے توحیدِ خالص کے لیے تعمیر کیا تھا۔ مساجد کے ساتھ لفظ ''خراب'' ایک حدیث میں بھی آیا ہے۔ یہ بڑی دلدوز حدیث ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ اسے ذہن نشین کر لیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ)) ''اندیشہ ہے کہ لوگوں پر (یعنی میری اُمت پر) ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا کہ'' ((لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ)) ''اسلام میں سے اس کے نام کے سوا کچھ نہیں بچے گا'' ((وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ)) ''اور قرآن میں سے اس کے رسم الخط (الفاظ اور حروف) کے سوا کچھ نہیں بچے گا''۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کی ضمانت دی ہے کہ قرآن حکیم کے الفاظ و حروف من و عن محفوظ رہیں گے۔ ((مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِیَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰی)) ''ان کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہو جائیں گی''۔ یہاں بھی لفظ ''خراب'' نوٹ کیجیے۔ گویا معنوی اعتبار سے یہ ویران ہو جائیں گی۔ ((عُلَمَاؤُهُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَاءِ)) ''ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے کے بدترین انسان ہوں گے''۔ ((مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِیْهِمْ تَعُوْدُ))[۱۳] ''فتنہ اُن ہی کے اندر سے برآمد ہوگا اور انہی میں گھس جائے گا''۔ یعنی ان کا کام ہی فتنہ انگیزی' مخالفت اور جنگ و جدال ہوگا۔ اپنے اپنے فرقے کے لوگوں کے جذبات کو بھڑکاتے رہنا اور مسلمانوں کے اندر اختلافات کو ہوا دینا ہی اُن کا کام رہ جائے گا۔

آج جن کو ہم علماء کہتے ہیں ان کی عظیم اکثریت اس کیفیت سے دوچار ہو چکی ہے۔ جب مذہب اور دین پیشہ بن جائے تو اس میں کوئی خیر باقی نہیں رہتا۔ دین اور مذہب پیشہ نہیں تھا' لیکن اسے پیشہ بنا لیا گیا۔ اسلام میں کوئی پیشوائیت نہیں' کوئی پاپائیت نہیں' کوئی برہمنیت نہیں۔ اسلام تو ایک کھلی کتاب کی مانند ہے۔ ہر شخص کتاب اللہ پڑھے' ہر شخص عربی سیکھے اور کتاب اللہ کو سمجھے۔ ہر شخص کو عبادات کے قابل ہونا چاہیے۔ ہر شخص اپنی بچی کا نکاح خود پڑھائے' اپنے والد کا جنازہ خود پڑھائے۔ ہم نے خود اسے پیشہ بنا دیا ہے اور عبادات کے معاملے میں ایک خاص طبقے کے محتاج ہو گئے ہیں۔ مرزا غالبؔ نے کہا تھا: ع

پیشے میں عیب نہیں' رکھیے نہ فرہاد کو نام!

۱۳۔ رواہ البیهقی فی ''شعب الایمان'' وابن عدی فی ''الکامل'' وابو عمرو الدانی فی ''السنن الواردة فی الفتن''۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح' کتاب العلم' الفصل الثالث۔

ایک چیز جب پیشہ بن جاتی ہے تو اس میں پیشہ ورانہ چشمکیں اور رقابتیں در آتی ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بات واضح رہے کہ دنیا کبھی علماءِ حق سے خالی نہیں ہوگی۔ چنانچہ یہاں علماءِ حق بھی ہیں اور علماءِ سو بھی ہیں' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت کا حال وہی ہو چکا ہے جو حدیث میں بیان ہوا ہے' ورنہ اُمت کا یوں بیڑہ غرق نہ ہوتا۔

﴿اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ﴾ ''ایسے لوگوں کو تو ان میں داخل ہی نہیں ہونا چاہیے مگر ڈرتے ہوئے۔''

ان لوگوں کو لائق نہیں ہے کہ اللہ کی مسجدوں میں داخل ہوں' یہ اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں۔

﴿لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ﴾ ''ان کے لیے دنیا میں بھی ذلت و رسوائی ہے''

﴿وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾﴾ ''اور آخرت میں ان کے لیے عذابِ عظیم ہے۔''

اگلی آیت میں تحویلِ قبلہ کے لیے تمہید باندھی جا رہی ہے۔ قبلہ کی تبدیلی بڑا حساس معاملہ تھا۔ جن لوگوں کو یروشلم اور بیت المقدس کے ساتھ دلچسپی تھی ان کے دلوں میں اُس کی عقیدت جاگزیں تھی' جبکہ مکہ مکرمہ اور بیت اللہ کے ساتھ جن کو دلچسپی تھی ان کے دلوں میں اس کی محبت و عقیدت تھی۔ تو اس حوالے سے قبلہ کی تبدیلی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ہجرت کے بعد قبلہ دو دفعہ بدلا ہے۔ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ تھا۔ مدینے میں آ کر رسول اللہ ﷺ نے سولہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی اور پھر بیت اللہ کی طرف نماز پڑھنے کا حکم آیا۔ اس طرح اہلِ ایمان کے کئی امتحان ہو گئے' ان کا ذکر آگے آ جائے گا۔ لیکن یہاں اس کی تمہید بیان ہو رہی ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۱۵ ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ﴾ ''اور مشرق اور مغرب سب اللہ کے ہیں۔''

یعنی اگر ہم مغرب کی طرف رُخ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ مغرب میں ہے (معاذ اللہ)۔ اللہ تو جہت اور مقام سے ماورا ہے' وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ یہ تو یکسانیت پیدا کرنے کے لیے اور اجتماعی رنگ دینے کے لیے ایک چیز کو قبلہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ تو ایک علامت ہے۔ غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے: ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں!

قبلہ ہمارا مسجود تو نہیں ہے!

﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ﴾ ''پس جدھر بھی تم رُخ کرو گے اُدھر ہی اللہ کا رُخ ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾﴾ ''یقیناً اللہ بہت وسعت والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

وہ بہت وسعت والا ہے' وہ کسی بھی سمت میں محدود نہیں ہے' اور ہر شے کا جاننے والا ہے۔

تحویلِ قبلہ کی تمہید کے طور پر ایک آیت کہہ کر اب پھر اصل سلسلۂ کلام جوڑا جا رہا ہے:

آیت ۱۱۶ ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ﴾ ''اور ان (میں وہ بھی ہیں جن) کا قول ہے کہ اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ وہ تو ان باتوں سے پاک ہے۔''

ظاہر بات ہے یہاں پھر اہلِ مکہ ہی کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جن کا یہ قول تھا کہ اللہ نے اپنے لیے اولاد اختیار کی ہے۔ وہ کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ نصاریٰ کہتے تھے کہ مسیح علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں' اور یہودیوں کا بھی ایک گروہ ایسا تھا جو حضرت عزیر علیہ السلام

کو اللہ کا بیٹا کہتا تھا۔

﴿بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اُسی کی ملکیت ہے۔''

سب مخلوق اور مملوک ہیں' خالق اور مالک صرف وہ ہے۔

﴿كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾﴾ ''سب کے سب اُسی کے مطیع فرمان ہیں۔''

بڑے سے بڑا رسول ہو یا بڑے سے بڑا ولی یا بڑے سے بڑا فرشتہ یا بڑے بڑے اجرامِ سماویہ سب اُسی کے حکم کے پابند ہیں۔

آیت ۱۱۷ ﴿بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''وہ نیا پیدا کرنے والا ہے آسمانوں اور زمین کا۔''

وہ بغیر کسی شے کے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔ ''ابداع'' اور ''خلق'' میں فرق نوٹ کیجیے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ کے پہلے باب میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے افعال بنیادی طور پر تین ہیں: ابداع' خلق اور تدبیر۔ ابداع سے مراد ہے عدمِ محض سے کسی چیز کو وجود میں لانا' جسے انگریزی میں ''creation ex nihilo'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبکہ خلق ایک چیز سے دوسری چیز کا بنانا ہے' جیسے اللہ تعالیٰ نے گارے سے انسان بنایا' آگ سے جنات بنائے اور نور سے فرشتے بنائے' یہ تخلیق ہے۔ تو ''بدیع'' وہ ذات ہے جس نے کسی مادۂ تخلیق کے بغیر ایک نئی کائنات پیدا فرما دی۔ ہمارے ہاں ''بدعت'' وہ شے کہلاتی ہے جو دین میں نہیں تھی اور خواہ مخواہ لا کر شامل کر دی گئی۔ جس بات کی جڑ بنیاد دین میں نہیں ہے وہ بدعت ہے۔

﴿وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾﴾ ''اور جب وہ کسی معاملے کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے بس یہی کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔''

آیت ۱۱۸ ﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور کہا اُن لوگوں نے جو علم نہیں رکھتے''

یہاں پر مشرکینِ مکہ کی طرف روئے سخن ہے۔

﴿لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ﴾ ''کیوں نہیں بات کرتا ہم سے اللہ یا کیوں نہیں آ جاتی ہمارے پاس کوئی نشانی؟''

مشرکینِ مکہ کا رسول اللہ ﷺ سے بڑی شدت کے ساتھ یہ مطالبہ تھا کہ آپ کوئی ایسے معجزات ہی دکھا دیں جیسے آپ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے دکھائے تھے یا موسیٰ علیہ السلام نے دکھائے تھے۔ اگر آپ ہمارے یہ مطالبے پورے کر دیں تو ہم آپ کو اللہ کا رسول مان لیں گے۔ یہ مضمون تفصیل کے ساتھ سورۃ الانعام میں اور پھر سورۂ بنی اسرائیل میں آئے گا۔

﴿كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؘ﴾ ''اسی طرح کی باتیں جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ بھی کہتے رہے ہیں۔''

﴿تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ﴾ ''ان کے دل ایک دوسرے سے مشابہ ہو گئے ہیں۔''

﴿قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾﴾ ''ہم تو اپنی آیات واضح کر چکے ہیں ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنا چاہیں۔''

آیت ۱۱۹ ﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) بے شک ہم نے آپ کو بھیجا ہے حق کے ساتھ بشیر اور نذیر بنا کر''

آپؐ کی بنیادی حیثیت یہ ہے کہ آپؐ اہلِ حق کو جنت اور اس کی تمام تر نعمتوں کی بشارت دیں' اور جو غلط راستے پر چل پڑیں' کفر

کریں' منافقت میں مبتلا ہوں' ملحد ہوں اور بدعملی کریں اُن کو آپؐ خبردار کردیں کہ ان کے لیے جہنم تیار کردی گئی ہے۔ آپؐ کا کام دعوت' ابلاغ' تبلیغ اور نصیحت ہے۔

﴿وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۹﴾﴾ ''اور آپؐ سے سوال نہیں کیا جائے گا جہنمیوں کے بارے میں۔''

جو لوگ اپنے طرزِ عمل کی بنا پر جہنم کے مستحق قرار پا گئے ہیں ان کے بارے میں آپؐ ذمہ دار نہیں ہیں۔ آپؐ سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ یہ کیوں جہنم میں پہنچ گئے؟ آپؐ کے ہوتے ہوئے یہ جہنمی کیوں ہو گئے؟ نہیں' یہ آپؐ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ کون جنت میں جانا چاہتا ہے اور کون جہنم میں' یہ آدمی کا اپنا فیصلہ ہے۔ آپؐ کا کام حق کو واضح کر دینا ہے' اس کی وضاحت میں کمی نہ رہ جائے' حق واضح ہو جائے' کوئی اشتباہ باقی نہ رہے' بس یہ ذمہ داری آپؐ کی ہے' اس سے زیادہ نہیں۔ انسان اگر اپنی اصل مسئولیت سے زیادہ ذمہ داری اپنے سر پر ڈال لے تو خواہ مخواہ مشکل میں پھنس جاتا ہے۔ ہمارے ہاں کی بہت سی جماعتیں اسی طرح کی غلطیوں کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئیں اور پوری کی پوری تحریکیں برباد ہو گئیں۔ رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ علماءِ یہود ایمان لے آئیں اور جہنم کا ایندھن نہ بنیں۔ ان کے لیے آپ ﷺ نے اللہ کے حضور دعائیں کی ہوں گی۔ جیسے مکی دَور میں آپؐ دعائیں مانگتے تھے کہ اے اللہ! عمرو بن ہشام اور عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کو تو میری جھولی میں ڈال دے اور اس کے ذریعے سے اسلام کو قوت عطا فرما!

آیت ۱۲۰ ﴿وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ! آپ کسی مغالطے میں نہ رہیے) ہرگز راضی نہ ہوں گے آپؐ سے یہودی اور نہ نصرانی جب تک کہ آپؐ پیروی نہ کریں ان کی ملت کی۔''

لہٰذا آپ ان سے اُمید منقطع کر لیجیے۔ اس لیے کہ زیادہ اُمید ہو تو پھر مایوسی ہو جاتی ہے۔ اقبال نے بندۂ مؤمن کے بارے میں بہت خوب کہا ہے: ع ''اس کی اُمیدیں قلیل' اس کے مقاصد جلیل!'' —— مقصد اونچا ہو' لیکن امید قلیل رہنی چاہیے۔ اللہ چاہے گا تو ہو جائے گا' نہیں چاہے گا تو نہیں ہوگا۔ بندۂ مؤمن کا کام اپنی حد تک اپنا فرض ادا کر دینا ہے۔ اس سے زیادہ کی خواہش اگر اپنے دل میں پالیں گے تو کسی عُجلت پسندی میں گرفتار ہو جائیں گے اور کسی راہِ یسیر یا راہِ قصیر (short cut) کے ذریعے منزل تک پہنچنے کی کوشش کریں گے اور اپنے آپ کو بھی برباد کر لیں گے۔

﴿قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ﴾ ''کہہ دیجیے ہدایت تو بس اللہ کی ہدایت ہے۔''

جو اللہ نے بتلایا ہے وہی سیدھا راستہ ہے۔

﴿وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی اُس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے''

اگر بفرضِ محال آپؐ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی کہ چلو کچھ لو کچھ دو کا معاملہ کر لو' کچھ ان کی بات مانو کچھ اپنی بات منوا لو' تو یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کے ہاں قابلِ قبول نہ ہوگا۔ مکہ میں قریش کی طرف سے اس طرح کی پیشکش کی جاتی تھی کہ کچھ اپنی بات منوا لیجیے' کچھ ہماری مان لیجیے' compromise کر لیجیے' اور اب مدینہ میں یہود کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ چنانچہ اس پر متنبہ کیا جا رہا ہے۔

﴿مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾﴾ ''تو نہیں ہوگا اللہ کے مقابلے میں آپؐ کے لیے کوئی مددگار اور نہ حمایتی۔'' (معاذ اللہ!)

حق کی تلوار بالکل عریاں ہے۔ اللہ کا عدل ہر فرد کے لیے الگ نہیں ہے' یہ فرد سے فرد تک بدلتا نہیں ہے۔ ایسے ہی ہر قوم اور ہر اُمت کے لیے قانون تبدیل نہیں ہوتا۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی ایک قوم سے کوئی ایک معاملہ ہو اور دوسری قوم سے کوئی دوسرا معاملہ۔ اللہ کے اُصول اور قوانین غیر مبدّل ہیں۔ اس ضمن میں اس کی ایک سُنّت ہے جس کے بارے میں فرمایا: ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿۴۳﴾﴾ (فاطر) ''پس تم اللہ کے طریقے میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے' اور تم اللہ کے طریقے کو ہرگز ٹلتا ہوا نہیں پاؤ گے۔''

آیت ۱۲۱ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ﴾ ''وہ لوگ جنہیں ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔''

اس پر میں نے اپنے کتابچے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' میں بحث کی ہے کہ تلاوت کا اصل حق کیا ہے۔ ایک بات جان لیجیے کہ تلاوت کا لفظ' جو قرآن نے اپنے لیے اختیار کیا ہے' بڑا جامع لفظ ہے۔ ''تَلَا يَتْلُوْ'' کا معنی پڑھنا بھی ہے اور ''تَلَا يَتْلُوْ'' کسی کے پیچھے پیچھے چلنے (to follow) کو بھی کہتے ہیں۔ سورۃ الشمس کی پہلی دو آیات ملاحظہ کیجیے: ﴿وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا ۙ﴿۱﴾ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا ۙ﴿۲﴾﴾ ''قسم ہے سورج کی اور اس کی دھوپ کی۔ اور قسم ہے چاند کی جب وہ اس کے پیچھے آتا ہے''۔ جب آپ کوئی کتاب پڑھتے ہیں تو آپ اس کے متن (text) کے پیچھے پیچھے چل رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ بعض لوگ جو زیادہ ماہر نہیں ہوتے' کتاب پڑھتے ہوئے اپنی انگلی ساتھ ساتھ چلاتے ہیں تاکہ نگاہ اِدھر سے اُدھر نہ ہو جائے' ایک سطر سے دوسری سطر پر نہ پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ کتاب کی تلاوت کا اصل حق یہ ہوگا کہ آپ اس کتاب کو follow کریں' اسے اپنا امام بنائیں' اس کے پیچھے چلیں' اس کا اتباع کریں' اس کی پیروی کریں' جس کی ہم دعا کرتے ہیں: وَاجْعَلْهُ لِيْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً'' اور اسے میرے لیے امام اور روشنی اور ہدایت اور رحمت بنا دے!'' اللہ تعالیٰ اس قرآن کو ہمارا امام اُسی وقت بنائے گا جب ہم فیصلہ کر لیں کہ ہم اس کتاب کے پیچھے چلیں گے۔

﴿اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ﴾ ''وہی ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔''

یعنی جو اللہ کی کتاب کی تلاوت کا حق ادا کریں اور اُس کی پیروی بھی کریں۔ اور جو نہ تو تلاوت کا حق ادا کریں اور نہ کتاب کی پیروی کریں' لیکن وہ دعویٰ کریں کہ ہمارا ایمان ہے اس کتاب پر تو یہ دعویٰ جھوٹا ہے۔ از روئے حدیث نبویؐ: ((مَا آمَنَ بِالْقُرْآنِ مَنِ اسْتَحَلَّ مَحَارِمَهٗ)) (۱۴) ''جس شخص نے قرآن کی حرام کردہ چیزوں کو اپنے لیے حلال کر لیا اس کا قرآن پر کوئی ایمان نہیں ہے۔''

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾﴾ ''اور جو اس کا کفر کرے گا تو وہی لوگ ہیں خسارے میں رہنے والے۔''

اب یہود کے ساتھ اس سلسلۂ کلام کا اختتام ہو رہا ہے جس کا آغاز چھٹے رکوع سے ہوا تھا۔ اس سلسلۂ کلام کے آغاز میں جو دو آیات آئی تھیں انہیں میں نے بریکٹ سے تعبیر کیا تھا۔ وہی دو آیات یہاں دوبارہ آ رہی ہیں اور اس طرح گویا بریکٹ بند ہو رہی ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۲۲ ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾﴾ ''اے اولادِ یعقوب! یاد کرو میرے اُس انعام کو جو میں نے تم پر کیا' اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت دی تھی اہلِ عالم پر۔''

یہ آیت بعینہٖ ان الفاظ میں چھٹے رکوع کے آغاز میں آ چکی ہے۔ (آیت ۴۷) دوسری آیت بھی جوں کی توں آ رہی ہے' صرف

۱۴۔ سنن الترمذی' کتاب الفضائل' باب ماجاء فیمن قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر۔

الفاظ کی ترتیب تھوڑی سی بدلی ہے۔ عبارت کے شروع اور آخر والی بریکٹس ایک دوسرے کا عکس ہوتی ہیں۔ ایک کی گولائی دائیں طرف ہوتی ہے تو دوسری کی بائیں طرف۔ اسی طرح یہاں دوسری آیت کی ترتیب درمیان سے تھوڑی سی بدل دی گئی ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۲۳ ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی کام نہ آ سکے گی''

﴿وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ﴾ ''اور نہ اُس سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا''

وہاں الفاظ تھے: ﴿وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ اُس سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی۔''

﴿وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ اسے کوئی سفارش ہی فائدہ دے سکے گی''

یہاں عدل پہلے اور شفاعت بعد میں ہے' وہاں شفاعت پہلے ہے اور عدل بعد میں۔ بس یہی ایک تبدیلی ہے۔

﴿وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾﴾ ''اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

یہ ٹکڑا بھی جوں کا توں وہی ہے جس پر چھٹے رکوع کی دوسری آیت ختم ہوئی تھی۔

آیات ۱۲۴ تا ۱۲۹

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵

سورۃ البقرۃ کے ابتدائی اٹھارہ رکوعوں میں روئے سخن مجموعی طور پر سابقہ اُمتِ مُسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی جانب ہے۔ ابتدائی چار رکوع اگرچہ عمومی نوعیت کے حامل ہیں' لیکن ان میں بھی یہود کی طرف روئے سخن کے اشارے موجود ہیں۔ چوتھے رکوع کے آغاز سے پندرہویں رکوع کی ابتدائی دو آیات تک' ان دس رکوعوں میں ساری گفتگو صراحت کے ساتھ بنی اسرائیل ہی سے ہے' الّا یہ کہ ایک جگہ اہلِ ایمان سے خطاب کیا گیا اور کچھ مشرکینِ مکہ کا بھی تعریض کے اسلوب میں تذکرہ ہو گیا۔

اس کے بعد اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر شروع ہو رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی نسل سے بنی اسماعیل اور بنی اسرائیل دو شاخیں ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہ سے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے' جو بڑے تھے' جبکہ دوسری بیوی حضرت سارہ سے اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام تھے' جن کا لقب اسرائیل تھا۔ ان کے بارہ بیٹوں سے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے وجود میں آئے۔ حضرت اسماعیلؑ کو حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ کے پاس' وادیٔ غیر ذی زرع میں آباد کیا تھا' جن سے ایک نسل بنی اسماعیل چلی۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد نبوت حضرت اسماعیلؑ کو تو ملی' لیکن اُس کے بعد تقریباً تین ہزار سال کا فصل ہے کہ اس شاخ میں کوئی نبوت نہیں آئی۔ نبوت کا سلسلہ دوسری شاخ میں چلا۔ حضرت اسحاق کے بیٹے حضرت یعقوب اور ان کے بیٹے حضرت یوسف علیہم السلام سب نبی تھے۔ پھر حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے شروع ہو کر حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہما السلام تک چودہ سو برس مسلسل ایسے ہیں کہ بنی اسرائیل میں نبوت کا تار ٹوٹا ہی نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ایک تیسری شاخ بنی قطورہ بھی تھی۔ یہ آپؑ کی تیسری اہلیہ قطورہ سے تھی۔ ان ہی میں سے بنی مدین (یا بنی مدیان) تھے' جن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی۔ اس طرح حضرت شعیبؑ بھی حضرت ابراہیمؑ کی نسل میں سے ہیں۔

جیسا کہ عرض کیا گیا' حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد بنی اسماعیل میں نبوت کا سلسلہ منقطع رہا۔ یہاں تک کہ تقریباً تین ہزار سال بعد محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آپؐ کی بعثت کے بعد امامت الناس سابقہ اُمّتِ مُسلمہ (بنی اسرائیل) سے موجودہ اُمّتِ مُسلمہ (اُمّتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو منتقل ہو گئی۔ اس انتقالِ امامت کے وقت بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے ان کے اور بنی اسماعیل کے مابین قدرِ مشترک کا تذکرہ کیا جا رہا ہے تاکہ ان کے لیے بات کا سمجھنا آسان ہو جائے۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے جدِ امجد بھی ابراہیم علیہ السلام ہی تھے اور یہ دوسری نسل بھی ابراہیم علیہ السلام ہی کی ہے۔ اس حوالے سے یہ سمجھ لیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی اور اب اسے اہلِ توحید کا مرکز بنایا جا رہا ہے' چنانچہ پندرہویں رکوع سے اٹھارہویں رکوع تک یہ ساری گفتگو جو ہو رہی ہے اس کا اصل مضمون ''تحویلِ قبلہ'' ہے۔

آیت ۱۲۴ ﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ﴾ ''اور ذرا یاد کرو جب ابراہیمؑ کو آزمایا اُس کے ربّ نے بہت سی باتوں میں تو اُس نے ان سب کو پورا کر دکھایا۔''

''عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی'' کے عنوان سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت پر میرا ایک کتابچہ ہے جو میری ایک تقریر اور ایک تحریر پر مشتمل ہے۔ تحریر کا عنوان ہے: ''حج اور عید الاضحیٰ اور اُن کی اصل روح''۔ اپنی یہ تحریر مجھے بہت پسند ہے۔ اس میں مَیں نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے امتحانات اور آزمائشوں کا ذکر کیا ہے۔ آپؑ کے طویل سفرِ حیات کا خلاصہ اور لُبِّ لُباب ہی ''امتحان و آزمائش'' ہے' جس کے لیے قرآن کی اصطلاح ''ابتلاء'' ہے۔ اس آیت مبارکہ میں ان کی پوری داستانِ ابتلا کو چند الفاظ میں سمو دیا گیا ہے' اور ''فَاَتَمَّهُنَّ'' کا لفظ ان تمام امتحانات کا نتیجہ ظاہر کر رہا ہے کہ وہ ان سب میں پورا اُترے' ان سب میں پاس ہو گئے' ہر امتحان میں نمایاں حیثیت سے کامیابی حاصل کی۔

﴿قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ﴾ ''تب فرمایا: (اے ابراہیمؑ!) اب میں تمہیں نوعِ انسانی کا امام بنانے والا ہوں!''

﴿قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ﴾ ''اُس نے کہا: اور میری اولاد میں سے بھی!''

یعنی میری نسل کے بارے میں بھی یہ وعدہ ہے یا نہیں؟

﴿قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾﴾ ''فرمایا: میرا یہ عہد ظالموں سے متعلق نہیں ہوگا۔''

یعنی تمہاری نسل میں سے جو صاحبِ ایمان ہوں گے' نیک ہوں گے' سیدھے راستے پر چلیں گے' اُن سے متعلق ہمارا یہ وعدہ ہے۔ لیکن یہ عہد نسلیت کی بنیاد پر نہیں ہے کہ جو بھی تمہاری نسل سے ہو وہ اس کا مصداق بن جائے۔

آیت ﴿۱۲۵﴾ ﴿وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ﴾ ''اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر (بیت اللہ) کو قرار دے دیا لوگوں کے لیے اجتماع (اور زیارت) کی جگہ اور اُسے امن کا گھر قرار دے دیا۔''

﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ﴾ ''اور (ہم نے حکم دیا کہ) مقامِ ابراہیمؑ کو اپنی نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔''

دورِ جدید کے بعض علماء نے یہ کہا ہے کہ مقامِ ابراہیمؑ سے مراد کوئی خاص پتھر نہیں ہے' بلکہ اصل میں وہ پوری جگہ ہی ''مقامِ ابراہیمؑ'' ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام آباد ہوئے تھے۔ لیکن صحیح بات وہی ہے جو ہمارے سلف سے چلی آ رہی ہے اور اس کے بارے میں پختہ روایات ہیں کہ جس طرح حجرِ اسود جنت سے آیا تھا ایسے ہی یہ بھی ایک پتھر تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جنت سے لایا گیا تھا۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے دوران آپؑ اس پر کھڑے ہوتے تھے اور جیسے جیسے تعمیر اُوپر جا رہی تھی اُس کے لیے یہ پتھر خود بخود اُونچا ہوتا جاتا تھا۔ اس پتھر پر آپؑ کے قدموں کا نشان ہے۔ یہی پتھر ''مقامِ ابراہیم'' ہے جو اَب بھی محفوظ ہے۔ بیت اللہ کا طواف مکمل کر کے اس کے قریب دو رکعت نماز ادا کی جاتی ہے۔

﴿وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾﴾ ''اور ہم نے حکم کیا تھا ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کو کہ تم دونوں میرے اس گھر کو پاک رکھو طواف کرنے والوں' اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے۔''

اس سے دونوں طرح کی تطہیر مراد ہے۔ ظاہری صفائی بھی ہو' گندگی نہ ہو' تاکہ زائرین آئیں تو ان کے دلوں میں کدورت پیدا نہ ہو' انہیں کوفت نہ ہو۔ اور تطہیرِ باطنی کا بھی اہتمام ہو کہ وہاں توحید کا چرچا ہو' کسی طرح کا کوئی کفر و شرک در نہ آنے پائے۔

آیت ﴿۱۲۶﴾ ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ نے دعا کی تھی: اے میرے پروردگار! اس گھر کو امن کی جگہ بنا دے''

﴿وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ ''اور یہاں آباد ہونے والوں (یعنی بنی اسماعیلؑ) کو پھلوں کا رزق عطا کر' جو کوئی ان میں سے ایمان لائے اللہ پر اور یومِ آخر پر۔''

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود ہی احتیاط برتی اور اپنی ساری اولاد کے لیے یہ دعا نہیں کی' بلکہ صرف ان کے لیے جو اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ پہلی دعا میں ''وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ'' کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا تھا: ﴿لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾﴾ لیکن یہاں معاملہ مختلف نظر آتا ہے۔

﴿قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا﴾ ''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور (تمہاری اولاد میں سے) جو کفر کرے گا تو اُس کو بھی میں دُنیا کی چند روزہ زندگی کا ساز و سامان تو دوں گا''

جولوگ ایمان سے محروم ہوں گے انہیں میں امامت میں شامل نہیں کروں گا' لیکن بہر حال دُنیوی زندگی کا مال ومتاع تو میں اُن کو بھی دوں گا۔

﴿ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ﴾ ''پھر اُسے کشاں کشاں لے آؤں گا جہنم کے عذاب کی طرف۔''

﴿وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۲۶﴾ ''اور وہ بہت بُری جگہ ہے لوٹنے کی۔''

آیت ۱۲۷ ﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ؕ﴾ ''اور یاد کرو جب ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ ہمارے گھر کی بنیادوں کو اٹھا رہے تھے۔''

باپ بیٹا دونوں بیت اللہ کی تعمیر میں لگے ہوئے تھے۔ یہاں لفظ ''قَوَاعِدَ'' جو آیا ہے اسے نوٹ کیجیے' یہ ''قاعدہ'' کی جمع ہے اور بنیادوں کو کہا جاتا ہے۔ اس لفظ سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خانہ کعبہ کے اصل معمار اور بانی نہیں ہیں۔ کعبہ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ سورۂ آل عمران (آیت ۹۶) میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ﴾ ''بے شک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے مقرر کیا گیا یہی ہے جو مکہ میں ہے''۔ اب یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک' کم وبیش چار ہزار برس کے دوران' روئے ارضی پر کوئی مسجد تعمیر نہ ہوئی ہو؟ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے تعمیر کیا گیا سب سے پہلا گھر یہی کعبہ تھا۔ امتدادِ زمانہ سے اس کی صرف بنیادیں باقی رہ گئی تھیں' اور چونکہ یہ وادی میں واقع تھا جو سیلاب کا راستہ تھا' لہٰذا سیلاب کی وجہ سے اس کی سب دیواریں بہہ گئی تھیں۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام نے ان بنیادوں کو پھر سے اٹھایا۔ سورۃ الحج میں یہ مضمون تفصیل سے آیا ہے۔

جب وہ ان بنیادوں کو اٹھا رہے تھے تو اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہے تھے:

﴿رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہم سے یہ خدمت قبول فرما لے۔''

ہماری اس کوشش اور ہماری اس محنت ومشقت کو قبول فرما! جس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر کر رہے تھے اُس وقت حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر لگ بھگ تیرہ برس تھی' آپؑ اس کام میں اپنے والد محترم کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

﴿اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۲۷﴾ ''یقیناً تُو سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

آیت ۱۲۸ ﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ﴾ ''اور اے ہمارے رب! ہمیں اپنا مطیع فرمان بنائے رکھ''

نوٹ کیجیے' یہ دعا ابراہیم علیہ السلام کر رہے ہیں۔ تو میں اور آپ اگر اپنے بارے میں مطمئن ہو جائیں کہ میری موت لازماً حق پر ہوگی' اسلام پر ہوگی تو یہ بہت بڑا دھوکہ ہے۔ چنانچہ ڈرتے رہنا چاہیے اور اللہ کی پناہ طلب کرتے رہنا چاہیے۔

﴿وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠﴾ ''اور ہم دونوں کی نسل سے ایک اُمّت اٹھائیو جو تیری فرماں بردار ہو۔''

﴿وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ ''اور ہمیں حج کرنے کے قاعدے بتلا دے''

اے پروردگار! تیرا یہ گھر تو ہم نے بنا دیا' اب اس کی زیارت سے متعلق جو رسومات ہیں' جو مناسکِ حج ہیں وہ ہمیں سکھا دے۔

﴿وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ﴾ ''اور ہم پر اپنی توجہ فرما۔''

ہم پر اپنی شفقت کی نظر فرما۔

﴿ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ ''یقیناً تُو ہی ہے بہت زیادہ توبہ کا قبول فرمانے والا (اور شفقت کے ساتھ رجوع کرنے والا) اور رحم فرمانے والا۔''

آیت ۱۲۹ ﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ﴾ ''اور اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں اٹھائیو ایک رسول خود انہی میں سے''

فِيْهِمْ سے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کی نسل یعنی بنی اسماعیل مراد ہے۔ وہ دونوں دعا کر رہے تھے کہ پروردگار! ہماری اس نسل میں ایک رسول مبعوث فرمانا جو انہی میں سے ہو، باہر کا نہ ہو، تاکہ ان کے اور اُس کے درمیان مغائرت اور اجنبیت کا کوئی پردہ حائل نہ ہو۔

﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ ﴾ ''جو انہیں تیری آیات پڑھ کر سنائے''

﴿ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾ ''اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دے''

کتاب کا صرف پڑھ کر سنا دینا تو بہت آسان کام ہے۔ اس کے بعد کتاب اور اس میں موجود حکمت کی تعلیم دینا اور اسے دلوں میں بٹھانا اہم تر ہے۔

﴿ وَيُزَكِّيْهِمْ ﴾ ''اور ان کو پاک کرے۔''

اُن کا تزکیہ کرے اور اُن کے دلوں میں تیری محبت اور آخرت کی طلب کے سوا کوئی طلب باقی نہ رہنے دے۔

﴿ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ ''یقیناً تُو ہی ہے زبردست اور کمال حکمت والا۔''

آیات ۱۳۰ تا ۱۴۱

وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَ مَاۤ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَ مَاۤ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ

وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۚ وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ
رَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ
وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۭ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۭ
وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ
اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

آیت ۱۳۰ ﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ﴾ ''اور کون ہوگا جو ابراہیمؑ کے طریقے سے منہ موڑے؟''

رغبت کا لفظ عربی زبان میں دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ ''رَغِبَ اِلٰی'' کا مفہوم ہے کسی شے کی طرف رغبت ہونا' محبت ہونا' میلان ہونا' جبکہ ''رَغِبَ عَنْ'' کا مطلب ہے کسی شے سے متنفر ہونا' کسی شے سے اباء کرنا' اس کو چھوڑ دینا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: ((فَمَنْ رَّغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))[۱۵] ''پس جسے میری سنّت ناپسند ہو تو وہ مجھ سے نہیں ہے۔''

﴿اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ﴾ ''سوائے اُس کے جس نے اپنے آپ کو حماقت ہی میں مبتلا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہو!''

اس کے سوا اور کون ہوگا جو ابراہیم علیہ السلام کے طریقے سے مُنہ موڑے؟

﴿وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ﴾ ''اور ہم نے تو اُسے دنیا میں بھی منتخب کر لیا تھا۔''

﴿وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾﴾ ''اور یقیناً آخرت میں بھی وہ ہمارے صالح بندوں میں سے ہوگا۔''

آیت ۱۳۱ ﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾﴾ ''جب بھی کہا اُس سے اُس کے پروردگار نے کہ مطیع فرمان ہو جا تو اُس نے کہا میں مطیع فرمان ہوں تمام جہانوں کے پروردگار کا۔''

یہاں تک کہ اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنے کا حکم آیا تو اس پر بھی سرِ تسلیم خم کر دیا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سلسلۂ امتحانات کا آخری امتحان تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کا سو برس کی عمر میں لیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ مانگ کر ستاسی برس کی عمر میں بیٹا (اسماعیلؑ) لیا تھا اور اب وہ تیرہ برس کا ہو چکا تھا' باپ کا دست و بازو بن گیا تھا۔ اُس وقت اسے ذبح کرنے کا حکم ہوا تو آپؑ فوراً تیار ہو گئے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ جب بھی ہم نے ابراہیمؑ سے کہا کہ ہمارا حکم مانو تو اُسے حکم برداری کے لیے سراپا تیار پایا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس طرزِ عمل کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

آیت ۱۳۲ ﴿وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ﴾ ''اور اسی کی وصیت کی تھی ابراہیمؑ نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے بھی۔''

آگے وہ نصیحت بیان ہو رہی ہے:

﴿يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ﴾ ''اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند فرمایا ہے''

﴿فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾﴾ ''پس تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان!''

دیکھنا تمہیں موت نہ آنے پائے' مگر فرماں برداری کی حالت میں! یہی بات سورۂ آلِ عمران میں مسلمانوں سے خطاب کر کے

۱۵۔ صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب الترغیب فی النکاح۔ وصحیح مسلم' کتاب النکاح' باب استحباب النکاح...

فرمائی گئی: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم کو موت نہ آئے' مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو''۔ اور فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آیت ۱۹) ''یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے''۔ مزید فرمایا: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ (آیت ۸۵) ''اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے تو اس سے وہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا''۔

آیت ۱۳۳ ﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ﴾ ''کیا تم اُس وقت موجود تھے جب آ دھمکی یعقوب پر موت''

یعنی جب یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت آیا۔ اُس وقت حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے سب بیٹے حضرت یوسف علیہ السلام کے ذریعے مصر میں پہنچ چکے تھے۔ یہ سارا واقعہ سورۂ یوسف میں بیان ہوا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا انتقال مصر میں ہوا۔ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے انہوں نے اپنے بارہ کے بارہ بیٹوں کو جمع کیا۔

﴿اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ﴾ ''جب کہا اپنے بیٹوں سے کہ تم کس کی عبادت کرو گے میرے بعد؟''

کس کی پوجا کرو گے؟ کس کی پرستش کرو گے؟ یہ بات نہیں تھی کہ انہیں معلوم نہ تھا کہ انہیں کس کی عبادت کرنی ہے' بلکہ آپ نے قول و قرار کو مزید پختہ کرنے کے لیے یہ انداز اختیار فرمایا۔

﴿قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ﴾ ''انہوں نے کہا: ہم بندگی کریں گے آپ کے معبود کی اور آپ کے آباء ابراہیم' اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی''

﴿اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ﴾ ''وہی ایک معبود ہے''

﴿وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾﴾ ''اور ہم سب اُسی کے مطیع فرمان ہیں''۔

ہم اسی کے سامنے سر جھکاتے ہیں اور اُسی کی فرماں برداری کا اقرار کرتے ہیں۔

آیت ۱۳۴ ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ﴾ ''یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی''

یہ آیت اس رکوع میں دو مرتبہ آئی ہے۔ یہ انسانوں کا ایک گروہ تھا جو گزر گیا۔ ابراہیم' اسماعیل' اسحاق' یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد سب گزر چکے۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ﴾ ''اُن کے لیے تھا جو انہوں نے کمایا اور تمہارے لیے ہوگا جو تم کماؤ گے''

یہاں ''پدرم سلطان بود'' کا دعویٰ کوئی مقام نہیں رکھتا۔ ہر شخص کے لیے اپنا ایمان' اپنا عمل اور اپنی کمائی ہی کام آئے گی۔

﴿وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾﴾ ''تم سے نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کیا کرتے تھے''۔

تم سے تو یہی پوچھا جائے گا کہ تم کیا کر کے لائے ہو؟ تمہارا باپ سلطان ہوگا' لیکن تم اپنی بات کرو کہ تم کیا ہو؟

اس پس منظر میں اب یہود کی خباثت کو نمایاں کیا جا رہا ہے کہ ابراہیم اور یعقوب علیہم السلام کی وصیت تو یہ تھی' مگر اس وقت کے یہود و نصاریٰ کا کیا رویہ ہے۔ انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف متحدہ محاذ بنا رکھا ہے۔

آیت ۱۳۵ ﴿وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں یا تو یہودی ہو جاؤ یا نصرانی تو ہدایت پر ہو جاؤ گے''

﴿قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ﴾ ''کہہ دیجیے نہیں' بلکہ (ہم تو پیروی کریں گے) ابراہیم کے طریقے کی بالکل یکسو ہو کر''

مِلَّةَ سے قبل فعل نَتَّبِعُ محذوف ہے۔ گویا: "بَلْ نَتَّبِعُ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ۔"

﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١٣٥﴾﴾ "اور وہ مشرکوں میں سے نہیں تھے۔"

اب مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ یہود و نصاریٰ جو کچھ کہتے ہیں اس کے جواب میں تم یہ کہو:

آیت ﴿١٣٦﴾ ﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ "کہو ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر"

﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ "اور جو کچھ نازل کیا گیا ہماری جانب"

﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ "اور جو کچھ نازل کیا گیا ابراہیمؑ اسماعیلؑ اسحاقؑ یعقوبؑ اور اولادِ یعقوبؑ کی طرف"

﴿وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى﴾ "اور جو کچھ دیا گیا موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو"

﴿وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ "اور جو کچھ دیا گیا تمام نبیوں کو اُن کے ربّ کی طرف سے۔"

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ "ہم اُن میں سے کسی کے مابین تفریق نہیں کرتے۔"

ہم سب کو مانتے ہیں' کسی کا انکار نہیں کرتے۔ ایک بات سمجھ لیجیے کہ ایک ہے "تفضیل" یعنی کسی ایک کو دوسرے سے زیادہ افضل سمجھنا' یہ اور بات ہے' اس کی نفی نہیں ہے۔ سورۃ البقرۃ ہی میں الفاظ آئے ہیں: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ﴾ (آیت ۲۵۳) "یہ سب رسول فضیلت دی ہم نے بعض کو بعض پر"۔ جبکہ تفریق یہ ہے کہ ایک کو مانا جائے اور ایک کا انکار کر دیا جائے۔ اور رسولوں میں سے کسی ایک کا انکار گویا سب کا انکار ہے۔

﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾﴾ "اور ہم اُسی کے مطیع فرمان ہیں۔"

ہم نے تو اُسی کی فرماں برداری کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا ہے۔

آیت ﴿١٣٧﴾ ﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ﴾ "پھر (اے مسلمانو!) اگر وہ (یہود و نصاریٰ) بھی اُسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم ایمان لائے ہو"

یعنی وہ ضد اور ہٹ دھرمی کی روش ترک کر دیں اور ٹھیک ٹھیک وہی دین اور وہی راستہ اختیار کریں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے تمہیں دیا گیا ہے۔

﴿فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ﴾ "تب وہ ہدایت پر ہوں گے۔"

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ "اور اگر وہ پیٹھ موڑ لیں"

﴿فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ﴾ "تو پھر وہی ہیں ضد پر۔"

اگر وہ ایمان نہیں لاتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہٹ دھرمی اور ضدم ضدا میں مبتلا ہو چکے ہیں اور دشمنی اور مخالفت پر اُڑے ہوئے ہیں۔

﴿فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ﴾ "تو (اے نبی ﷺ!) آپ کے لیے ان کے مقابلے میں اللہ کافی ہے۔"

آپ فکر نہ کریں' آپ مداہنت (compromise) کی کسی دعوت کی طرف توجہ ہی نہ کریں' کچھ دو کچھ لو کا معاملہ آپ بالکل

بھی نہ سوچیں۔ آپ ان کی مخالفتوں سے مرعوب نہ ہوں اور ان کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہ لیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی حمایت کے لیے ان سب کے مقابلے میں کافی رہے گا۔

﴿وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿١٣٧﴾﴾ ''اور وہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

ایسا نہیں ہے کہ اُسے معلوم نہ ہو کہ آپ اس وقت کن حالات میں ہیں' کیسی مشکلات میں ہیں' کس طرح کی نازک صورت حال ہے جو دن بدن شکل بدل رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے حالات میں آپ کا محافظ اور مددگار رہے۔

[حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہادت کے وقت قرآن حکیم کے جس نسخے پر تلاوت فرما رہے تھے اُس میں ان الفاظ پر خون کا دھبہ آج بھی موجود ہے۔ باغیوں نے آپؓ کو قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے شہید کیا تھا۔ آپؓ کی زوجہ محترمہ نائلہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو بچانا چاہا تو اُن کی انگلیاں کٹ گئیں اور خون ان الفاظ پر پڑا۔]

آیت ۱۳۸ ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ﴾ ''ہم نے تو اختیار کر لیا ہے اللہ کے رنگ کو۔''

''مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ'' کی طرح ''صِبْغَةَ اللّٰهِ'' میں بھی مضاف کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ مرکب اضافی مفعول بہ ہے اور اس کا فعل محذوف ہے۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۠﴾ ''اور اللہ کے رنگ سے بہتر اور کس کا رنگ ہوگا؟''

﴿وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿١٣٨﴾﴾ ''اور ہم تو بس اُسی کی بندگی کرنے والے لوگ ہیں۔''

آیت ۱۳۹ ﴿قُلْ اَتُحَآجُّوْٓنَنَا فِي اللّٰهِ﴾ ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے) کہیے: کیا تم ہم سے جھگڑ رہے ہو (دلیل بازی کر رہے ہو) اللہ کے بارے میں؟''

﴿وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ﴾ ''حالانکہ وہی ہمارا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔''

رب بھی ایک ہے اور اس کا دین بھی ایک ہے' ہاں شریعتوں میں فرق ضرور ہوا ہے۔

﴿وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ﴾ ''اور ہمارے لیے ہوں گے ہمارے عمل اور تمہارے لیے ہوں گے تمہارے عمل۔''

﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿١٣٩﴾﴾ ''اور ہم تو خالص اُسی کے ہیں۔''

ہم اُس کے لیے اپنے آپ کو اور اپنی بندگی کو خالص کر چکے ہیں۔

یہاں پے در پے آنے والے تین الفاظ کو نوٹ کیجیے۔ یہ مقام میرے اور آپ کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ آیت ۱۳۶ ان الفاظ پر ختم ہوئی تھی: ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿١٣٦﴾﴾ ''ہم اُسی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں''۔ ان میں تو ہم بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد آیت ۱۳۸ کے اختتام پر یہ الفاظ آئے: ﴿وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿١٣٨﴾﴾ ''اور ہم اُسی کی بندگی کرتے ہیں''۔ صرف اسلام نہیں' عبادت یعنی پوری زندگی میں اُس کے ہر حکم کی پیروی اور اطاعت درکار ہے۔ اس سے آگے یہ بات آئی: ﴿وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿١٣٩﴾﴾ یہ عبادت اگر اخلاص کے ساتھ نہیں ہے تو منافقت ہے۔ اس عبادت سے کوئی دُنیوی منفعت پیش نظر نہ ہو۔ ع ''سوداگری نہیں' یہ عبادت خدا کی ہے!'' دین کو دنیا بنانے اور دنیا کمانے کا ذریعہ بنانے سے بڑھ کر گری ہوئی حرکت اور کوئی نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

((مَنْ صَلّٰى يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ)) (مسند احمد)

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اس نے شرک کیا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اس نے شرک کیا' اور جس نے

دکھاوے کے لیے صدقہ وخیرات کیا اس نے شرک کیا۔''

ان تینوں الفاظ کو حرزِ جان بنا لیجیے: نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ، نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ، نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ — اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ! اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ!!

آیت ﴿اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ﴾ ''کیا تمہارا کہنا یہ ہے کہ ابراہیم' اسماعیل' اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد سب یہودی تھے یا نصرانی تھے؟''

تم جو کہتے ہو کہ یہودی ہو جاؤ یا نصرانی تب ہدایت پاؤ گے' تو کیا ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے یا نصرانی؟ اور اسحاق' یعقوب' یوسف' موسیٰ اور عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کون تھے؟ یہی بات آج مسلمانوں کو سوچنی چاہیے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ دیوبندی تھے' بریلوی تھے' اہلِ حدیث تھے یا شیعہ تھے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ ان تقسیموں سے بالاتر رہا جائے۔ ٹھیک ہے ایک شخص کسی فقہی مسلک کی پیروی کر رہا ہے' لیکن اس مسلک کو اپنی شناخت بنا لینا' اسے دین پر مقدم رکھنا' اس مسلک ہی کے لیے ہے ساری محنت ومشقت اور بھاگ دوڑ کرنا' اور اُسی کی دعوت وتبلیغ کرنا' دین کی اصل حقیقت اور روح کے یکسر خلاف ہے۔

﴿قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ﴾ ''کہیے: تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟''

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور (کان کھول کر سن لو) اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی تھی جسے اس نے چھپا لیا؟''

علماءِ یہود جانتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں' جن کے وہ منتظر تھے' لیکن وہ اس گواہی کو چھپائے بیٹھے تھے۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۰﴾ ''اور اللہ ہرگز غافل نہیں ہے اُس سے جو تم کر رہے ہو۔''

آیت ﴿تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ﴾ ''وہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔''

یہ اس مقدس جماعت کے کل سربرآوردہ تھے جن کا تذکرہ ہوا۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ﴾ ''ان کے لیے ہے جو کمائی انہوں نے کی اور تمہارے لیے ہے جو کمائی تم نے کی۔''

جو عمل انہوں نے کمائے وہ ان کے لیے ہیں' تمہارے لیے نہیں۔ تمہارے لیے وہی ہوگا جو تم کماؤ گے۔

﴿وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۱﴾ ''اور تم سے اُن کے اعمال کے بارے میں سوال نہیں ہوگا۔''

تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا' تم سے تو یہ سوال ہوگا کہ تم نے کیا کیا!

آیات ۱۴۲ تا ۱۵۲

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۴۲ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾ قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَ لَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَ مَاۤ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَ مَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ وَ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۢ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ ۙ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ كَمَاۤ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِيْۤ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع ۱۸

دو رکوعوں پر مشتمل تمہید کے بعد اب تحویلِ قبلہ کا مضمون براہِ راست آ رہا ہے' جو پورے دو رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے۔ کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ کون سی ایسی بڑی بات تھی جس کے لیے قرآن مجید میں اتنے شد و مد کے ساتھ اور اس قدر تفصیل بلکہ تکرار کے ساتھ بات کی گئی ہے؟ اس کو یوں سمجھئے کہ ایک خاص مذہبی ذہنیت ہوتی ہے' جس کے حامل لوگوں کی توجہ اعمال کے ظاہر پر زیادہ مرکوز ہو جاتی ہے اور اعمال کی روح ان کی توجہ کا مرکز نہیں بنتی۔ عوام الناس کا معاملہ بالعموم یہی ہو جاتا ہے کہ ان کے ہاں اصل اہمیت دین کے ظواہر اور مراسمِ عبودیت کو حاصل ہو جاتی ہے اور جو اصل روحِ دین ہے' جو مقاصدِ دین ہیں' ان کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ نتیجتاً ظواہر میں ذرا سا فرق بھی انہیں بہت زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کی مثال یوں سامنے آتی ہے کہ احناف کی مسجد میں اگر کسی نے رفع یدین کر لیا یا کسی نے آمین ذرا اونچی آواز میں کہہ دیا تو گویا قیامت آ گئی۔ یوں محسوس ہوا جیسے ہماری مسجد میں کوئی اور ہی آ گیا۔ اس مذہبی ذہنیت کے پس منظر میں یہ کوئی چھوٹا مسئلہ نہیں تھا۔

اس کے علاوہ یہ مسئلہ قبائلی اور قومی پس منظر کے حوالے سے بھی سمجھنا چاہیے۔ مکہ مکرمہ میں جو لوگ ایمان لائے تھے ظاہر ہے ان سب کو خانہ کعبہ کے ساتھ بڑی عقیدت تھی۔ خود نبی اکرم ﷺ نے جب مکہ سے ہجرت فرمائی تو آپؐ روتے ہوئے وہاں سے نکلے تھے اور آپؐ نے فرمایا تھا کہ اے کعبہ! مجھے تجھ سے بڑی محبت ہے' لیکن تیرے یہاں کے رہنے والے مجھے یہاں رہنے نہیں دیتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب تک آپؐ مکہ میں تھے تو آپؐ کعبہ کی جنوبی دیوار کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوتے۔ یوں آپؐ کا رُخ شمال کی طرف ہوتا' کعبہ آپؐ کے سامنے ہوتا اور اس کی سیدھ میں بیت المقدس بھی آ جاتا۔ اس طرح "استقبال القِبلتَین" کا اہتمام ہو جاتا۔ لیکن مدینہ میں آ کر آپؐ نے رُخ بدل دیا اور بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے لگے۔ یہاں "استقبال القِبلتَین" ممکن نہ تھا' اس لیے کہ یروشلم مدینہ منورہ کے شمال میں ہے' جبکہ مکہ مکرمہ جنوب میں ہے۔ اب اگر خانہ کعبہ کی طرف رُخ کریں گے تو یروشلم کی طرف پیٹھ ہوگی اور یروشلم کی طرف رُخ کریں گے تو کعبہ کی طرف پیٹھ ہوگی۔ چنانچہ اب اہلِ ایمان کا امتحان ہو گیا کہ آیا وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی پیروی کرتے ہیں یا اپنی پرانی عقیدتوں اور پرانی روایات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ جو لوگ مکہ مکرمہ سے آئے تھے ان کی اتنی تربیت ہو چکی تھی کہ ان میں سے کسی کے لیے یہ مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ بقول اقبال: ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است!

حالانکہ قرآن مجید میں کہیں منقول نہیں ہے کہ اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ حکم وحیٔ خفی کے ذریعے سے دیا گیا ہو' تاہم وحیٔ جلی میں یہ حکم کہیں نہیں ہے کہ اب یروشلم کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھیے۔ یہ مسلمانوں کا اتباعِ رسولؐ کے حوالے سے ایک امتحان تھا جس میں وہ سرخرو ہوئے۔ پھر جب یہ حکم آیا کہ اپنے رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر دو تو یہ اب اُن مسلمانوں کا امتحان تھا جو مدینہ کے رہنے والے تھے۔ اس لیے کہ ان میں سے بعض یہودیت ترک کر کے ایمان لائے تھے۔ مثلاً عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ علماء یہود میں سے تھے' لیکن جو اور دوسرے لوگ تھے وہ بھی علماء یہود کے زیر اثر تھے اور ان کے دل میں بھی یروشلم کی عظمت تھی۔ اب جب انہیں بیت اللہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا تو یہ اُن کے ایمان کا امتحان ہو گیا۔

مزید برآں بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بھی پیدا ہوا ہوگا کہ اگر اصل قبلہ بیت اللہ تھا تو ہم نے اب تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے جو نمازیں پڑھی ہیں ان کا کیا بنے گا؟ کیا وہ نمازیں ضائع ہو گئیں؟ نماز تو ایمان کا رکنِ رکین ہے! چنانچہ اس اعتبار سے بھی بڑی تشویش پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مسئلہ سیاسی اعتبار سے یہ پیدا ہوا کہ یہود اب تک یہ سمجھ رہے تھے کہ مسلمانوں اور محمد ﷺ نے ہمارا قبلہ اختیار کر لیا ہے' تو یہ گویا ہمارے ہی پیروکار ہیں' لہٰذا ہمیں ان کی طرف سے کوئی خاص اندیشہ نہیں ہے۔ لیکن اب جب تحویلِ قبلہ کا حکم آ گیا تو ان کے کان کھڑے ہو گئے کہ یہ تو کوئی نئی ملّت ہے اور ایک نئی اُمّت کی تشکیل ہو رہی ہے۔ چنانچہ ان کی طرف سے مخالفت کے اندر شدت پیدا ہو گئی۔ یہ سارے مضامین یہاں پر زیر بحث آ رہے ہیں۔

آیت ۱۴۲ ﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ﴾ "عنقریب کہیں گے لوگوں میں سے احمق اور بیوقوف لوگ"

﴿مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ﴾ "کس چیز نے پھیر دیا انہیں اس قبلے سے جس پر یہ تھے؟"

یعنی سولہ سترہ مہینے تک انہوں نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی ہے' اب انہیں بیت اللہ کی طرف کس چیز نے پھیر دیا؟

﴿قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ﴾ "کہہ دیجیے کہ اللہ ہی کے ہیں مشرق اور مغرب!"

یہ وہی الفاظ ہیں جو چودہویں رکوع میں تحویلِ قبلہ کی تمہید کے طور پر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کسی ایک سمت میں محدود نہیں ہے' بلکہ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سب اُسی کے ہیں۔

﴿يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۴۲﴾ "وہ جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے دیتا ہے۔"

آیت ۱۴۳ ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾ ''اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمّتِ وَسط بنایا ہے''

اب یہ خاص بات کہی جا رہی ہے کہ اے مسلمانو! تم اس تحویلِ قبلہ کو معمولی بات نہ سمجھو' یہ علامت ہے اس بات کی کہ اب تمہیں وہ حیثیت حاصل ہو گئی ہے:

﴿لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ ''تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو۔''

اب یہ تمہارا فرضِ منصبی ہے کہ رسولؐ نے جس دین کی گواہی تم پر اپنے قول و عمل سے دی ہے اُسی دین کی گواہی تمہیں اپنے قول اور عمل سے پوری نوعِ انسانی پر دینی ہے۔ اب تم محمد رسول اللہ ﷺ اور نوعِ انسانی کے درمیان واسطہ (link) بن گئے ہو۔ اب تک نبوت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک نبی کی تعلیم ختم ہو جاتی یا اس میں تحریف ہو جاتی تو دوسرا نبی آ جاتا۔ اس طرح پے در پے انبیاء و رُسل علیہم السلام چلے آ رہے تھے اور ہر دَور میں یہ معاملہ تسلسل کے ساتھ چل رہا تھا۔ اب محمد رسول اللہ ﷺ پر نبوت ختم ہو رہی ہے' لیکن نسلِ انسانی کا سلسلہ تو قیامت تک جاری رہنا ہے۔ لہٰذا اب آگے لوگوں کو تبلیغ کرنا' ان تک دین پہنچانا' ان پر حُجت قائم کرنا اور شہادت علی الناس کا فریضہ سرانجام دینا کس کی ذمہ داری ہو گی؟ پہلے تو ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ اللہ کی طرف سے جبرائیلؑ وحی لائے اور نبی کے پاس آ گئے' نبی نے لوگوں کو سکھا دیا۔ اب یہ معاملہ اس طرح ہے کہ اللہ سے جبرائیلؑ وحی لائے محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس اور محمد ﷺ نے سکھایا تمہیں' اور اب تمہیں سکھانا ہے پوری نوعِ انسانی کو! تو اب تمہاری حیثیت درمیانی واسطے کی ہے۔ یہ مضمون سورۃ الحج کی آخری آیات میں زیادہ وضاحت کے ساتھ آئے گا۔

وَكَذٰلِكَ (اسی طرح) سے مراد یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ اس کا ایک مظہر ہے۔ اس سے اب تم اپنی ذمہ داریوں کا اندازہ کرو۔ صرف خوشیاں نہ مناؤ' بلکہ ایک بہت بڑی ذمہ داری کا جو بوجھ تم پر آ گیا ہے اس کا ادراک کرو۔ یہی بوجھ جب ہم نے اپنے بندے محمد ﷺ کے کاندھوں پر رکھا تھا تو ان سے بھی کہا تھا: ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝۵﴾ (المزمل) ''(اے نبی ﷺ!) ہم آپ پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں''۔ وہی بھاری بات بہت بڑے پیمانے پر اب تمہارے کاندھوں پر آ گئی ہے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ﴾ ''اور نہیں مقرر کیا تھا ہم نے وہ قبلہ جس پر (اے نبی ﷺ!) آپ پہلے تھے''

﴿اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ﴾ ''مگر یہ جاننے کے لیے (یہ ظاہر کرنے کے لیے) کہ کون رسولؐ کا اتباع کرتا ہے اور کون پھر جاتا ہے اُلٹے پاؤں!''

یہاں اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہجرت کے بعد وحیٔ خفی کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کو بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہو' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ آنحضور ﷺ کا اجتہاد ہو' اور اسے اللہ نے قبول فرما لیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے اجتہاد پر اگر اللہ کی طرف سے نفی نہ آئے تو وہ گویا اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا جانا ایک امتحان قرار دیا گیا کہ کون اتباعِ رسولؐ کی روش پر گامزن رہتا ہے اور کون دین سے پھر جاتا ہے۔ اس آزمائش میں تمام مسلمان کامیاب رہے اور ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ٹھیک ہے' ہمارا قبلہ وہ تھا' اب آپ نے اپنا قبلہ بدل لیا ہے تو آپ کا راستہ اور ہے ہمارا راستہ اور!

﴿وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ﴾ ''اور یقیناً یہ بہت بڑی بات تھی مگر اُن کے لیے (دشوار نہ تھی) جن کو اللہ نے ہدایت دی۔''

واقعہ یہ ہے کہ اتنی بڑی تبدیلی قبول کر لینا آسان بات نہیں ہوتی۔ یہ بڑا حساس مسئلہ ہوتا ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ﴾ ''اور اللہ ہرگز تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔''

ایمان سے یہاں مراد نماز ہے جسے دین کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات اس تشویش کے جواب میں فرمائی گئی جو بعض مسلمانوں کو لاحق ہو گئی تھی کہ ہماری ان نمازوں کا کیا بنے گا جو ہم نے سولہ مہینے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے پڑھی ہیں؟ مسلمان تو رسول اللہ ﷺ کے حکم کا پابند ہے' اُس وقت رسول کا وہ حکم تھا' وہ اللہ کے ہاں مقبول ٹھہرا' اس وقت یہ حکم ہے جو تمہیں رسول کی جانب سے مل رہا ہے' اب تم اس کی پیروی کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ انسانوں کے حق میں بہت ہی شفیق اور بہت ہی رحیم ہے۔''

آیت ۱۴۴ ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) بلاشبہ ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا دیکھتے رہے ہیں۔''

معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کو تحویلِ قبلہ کے فیصلے کا انتظار تھا اور آپ ﷺ پر بھی یہ وقفہ شاق گزر رہا تھا جس میں نماز پڑھتے ہوئے بیت اللہ کی طرف پیٹھ ہو رہی تھی۔ چنانچہ آپ کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اُٹھتی تھیں کہ کب جبریلِ امین تحویلِ قبلہ کا حکم لے کر نازل ہوں۔

﴿فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪﴾ ''سو ہم پھیر دیتے ہیں آپ کو اُسی قبلے کی طرف جو آپ کو پسند ہے۔''

اس آیت میں محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ کی طرف سے بڑی محبت' بڑی شفقت اور بڑی عنایت کا اظہار ہو رہا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بیت اللہ کے ساتھ بڑی محبت تھی' اس کے ساتھ آپ کا ایک رشتۂ قلبی تھا۔

﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ﴾ ''تو بس اب پھیر دیجیے اپنے رُخ کو مسجد حرام کی طرف!''

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں بھی تم ہو اب اپنا چہرہ (نماز میں) اسی کی طرف پھیرو۔''

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ﴾ ''اور یہ لوگ جنہیں کتاب دی گئی تھی' جانتے ہیں کہ یہ (تحویلِ قبلہ کا حکم) حق ہے ان کے پروردگار کی طرف سے۔''

تورات میں بھی یہ مذکور تھا کہ اصل قبلۂ ابراہیمیؑ بیت اللہ ہی تھا۔ بیت المقدس کو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک ہزار سال بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا' جسے ''ہیکلِ سلیمانی'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔ آنہ سے مراد یہاں بیت اللہ کا اس اُمت کے لیے قبلہ ہونا ہے۔ اس بات کا حق ہونا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا یہود پر واضح تھا اور اس کے اشارات و قرائن تورات میں موجود تھے' لیکن اپنے حسد اور عناد کے سبب اس حقیقت کو بھی دوسرے بہت سے حقائق کی طرح جانتے بوجھتے چھپاتے تھے۔ اس موضوع کو سمجھنے کے لیے مولانا حمید الدین فراہی کا رسالہ ''الرأی الصحیح فی من ھو الذّبیح'' بہت اہم ہے' جس کا اردو ترجمہ مولانا امین احسن

اصلاحی صاحب نے ''ذبیح کون ہے؟'' کے عنوان سے کیا ہے۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۴﴾ ''اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو وہ کر رہے ہیں۔''

آیت ۱۴۵ ﴿وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) اگر آپ ان اہلِ کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں پیش کر دیں تب بھی یہ آپ کے قبلے کی پیروی نہیں کریں گے۔''

﴿وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ﴾ ''اور نہ ہی اب آپ پیروی کرنے والے ہیں ان کے قبلے کی۔''

یہ تو ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ﴾ والا معاملہ ہو گیا۔

﴿وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۭ﴾ ''اور نہ ہی وہ ایک دوسرے کے قبلے کی پیروی کرنے والے ہیں۔''

حد یہ ہے کہ یہ خود آپس میں ایک دوسرے کے قبلے کی پیروی نہیں کرتے۔ اگرچہ یہود و نصاریٰ سب کا قبلہ یروشلم ہے' لیکن عین یروشلم میں جا کر یہودی ہیکلِ سلیمانی کا مغربی گوشہ اختیار کرتے تھے اور مغرب کی طرف رُخ کرتے تھے' جبکہ نصاریٰ مشرق کی طرف رُخ کرتے تھے' اس لیے کہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا نے جس مکان میں اعتکاف کیا تھا اور جہاں فرشتہ اُن کے پاس آیا تھا وہ ہیکل کے مشرقی گوشے میں تھا' جس کے لیے قرآن حکیم میں ''مَكَانًا شَرْقِيًّا'' کا لفظ آیا ہے۔ عیسائیوں نے اسی مشرقی گھر کو اپنا قبلہ بنا لیا۔

﴿وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ! بالفرض) اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی''

﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ﴾ ''اُس علم کے بعد جو آپ کے پاس آ چکا ہے''

﴿اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۴۵﴾ ''تو بلاشبہ آپ بھی ظلم کرنے والوں میں سے ہو جائیں گے۔'' (معاذ اللہ!)

آیت ۱۴۶ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ﴾ ''جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔''

یہاں یہ نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ قرآن حکیم میں تورات اور انجیل کے ماننے والوں میں سے غلط کاروں کے لیے مجہول کا صیغہ آتا ہے ﴿اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ ''جنہیں کتاب دی گئی تھی'' اور جو اُن میں سے صالحین تھے' صحیح رُخ پر تھے' ان کے لیے معروف کا صیغہ آتا ہے' جیسے یہاں آیا ہے۔ يَعْرِفُوْنَهٗ میں ضمیر (ہٗ) کا مرجع قبلہ بھی ہے' قرآن بھی ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ بھی ہیں۔

﴿وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ﴾ ''البتہ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے''

﴿لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۱۴۶﴾ ''جو جانتے بوجھتے حق کو چھپاتا ہے۔''

آیت ۱۴۷ ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ ''یہ حق ہے آپ کے ربّ کی طرف سے''

اس کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے: ''حق وہی ہے جو آپ کے ربّ کی طرف سے ہے۔''

﴿فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝۱۴۷﴾ ''تو آپ ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ بنیں۔''

خطاب کا رُخ رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے اور آپؐ کی وساطت سے دراصل ہر مسلمان سے یہ بات کہی جا رہی ہے کہ اس بارے میں کوئی شک و شبہ اپنے پاس مت آنے دو کہ یہی تو حق ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے۔

آیت ۱۴۸ ﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا﴾ ''ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ کرتا ہے''

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ﴾ ''تو (مسلمانو!) تم نیکیوں میں سبقت کرو۔''

ہم نے تمہارے لیے ایک رُخ معین کر دیا' یعنی بیت اللہ۔ اور ایک باطنی رُخ تمہیں یہ اختیار کرنا ہے کہ نیکیوں کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ جیسے نماز کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ آپ نے باوضو ہو کر قبلے کی طرف رخ کر لیا اور ارکانِ نماز ادا کیے۔ جبکہ نماز کا باطن خشوع وخضوع' حضورِ قلب اور رقت ہے۔ انسان کو یہ احساس ہو کہ وہ پروردگارِ عالم کے روبرو حاضر ہو رہا ہے۔

﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ﴾ ''جہاں کہیں بھی تم ہو گے اللہ تم سب کو جمع کر کے لے آئے گا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۱۴۹ ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ﴾ ''اور جہاں کہیں سے بھی آپؐ نکلیں تو (نماز کے وقت) آپ اپنا رُخ پھیر لیجیے مسجدِ حرام کی طرف۔''

﴿وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ﴾ ''اور یقیناً یہ حق ہے آپؐ کے ربّ کی طرف سے۔''

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾﴾ ''اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو تم کر رہے ہو۔''

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا' یہاں کلام بظاہر آنحضور ﷺ سے ہے' مگر اصل میں آپؐ کی وساطت سے تمام مسلمانوں سے خطاب ہے۔ دوبارہ فرمایا گیا:

آیت ۱۵۰ ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ﴾ ''اور جہاں کہیں سے بھی آپ نکلیں تو آپ اپنا رُخ (نماز کے وقت) مسجدِ حرام ہی کی طرف کیجیے۔''

﴿وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) جہاں کہیں بھی تم ہو تو (نماز کے وقت) اپنے چہروں کو اسی کی جانب پھیر دو۔''

تم خواہ امریکہ میں ہو یا روس میں' نماز کے وقت تمہیں بیت اللہ ہی کی طرف رُخ کرنا ہوگا۔

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۙ﴾ ''تاکہ باقی نہ رہے لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل''

یعنی اہلِ کتاب بالخصوص یہود کے لیے تمہارے خلاف بدگمانی پھیلانے کا کوئی موقع باقی نہ رہ جائے۔ تورات میں مذکور تھا کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ خانہ کعبہ ہوگا۔ اگر آنحضور ﷺ یہ قبلہ اختیار نہ کرتے تو علماءِ یہود مسلمانوں پر حُجت قائم کرتے۔ تو یہ گویا ان کے اوپر اتمامِ حُجت بھی ہو رہا ہے اور قطعِ عذر بھی۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ﴾ ''سوائے ان کے جو اُن میں سے ظالم ہیں۔''

شریر لوگ اس قطعِ حُجت کے بعد بھی باز آنے والے نہیں اور وہ اعتراض کرنے کے لیے لاکھ حیلے بہانے بنائیں گے' ان کی زبان کسی حال میں بند نہ ہوگی۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ﴾ ''تو (اے مسلمانو!) ان سے نہ ڈرو اور مجھ سے ڈرو۔''

﴿وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ ﴾ ''اور اس لیے کہ میں تم پر اپنی نعمت تمام کر دوں''

یہ جو تحویلِ قبلہ کا معاملہ ہوا ہے اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی بنیاد پر ایک نئی اُمت تشکیل دی جا رہی ہے' اسے امامت النّاس سے سرفراز کیا جا رہا ہے اور وراثتِ ابراہیمی اب اسے منتقل ہو گئی ہے' یہ اس لیے ہے تا کہ اے مسلمانو! میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں۔

﴿وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾﴾ ''اور تا کہ تم ہدایت یافتہ بن جاؤ۔''

آیت ۱۵۱ ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾﴾ ''جیسے کہ ہم نے بھیج دیا ہے تمہارے درمیان ایک رسول خود تم میں سے' وہ تلاوت کرتا ہے تم پر ہماری آیات اور تمہیں پاک کرتا ہے (تمہارا تزکیہ کرتا ہے) اور تمہیں تعلیم دیتا ہے کتاب اور حکمت کی اور تمہیں تعلیم دیتا ہے ان چیزوں کی جو تمہیں معلوم نہیں تھیں۔''

یہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا یاد کر لیجیے جو آیت ۱۲۹ میں مذکور ہوئی۔ اس دعا کا ظہور تین ہزار برس بعد بعثتِ محمدیؐ کی شکل میں ہو رہا ہے۔ یہاں ایک نکتہ بڑا اہم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی دعا میں جو ترتیب تھی' یہاں اللہ نے اس کو بدل دیا ہے۔ دعا میں ترتیب یہ تھی: تلاوتِ آیات' تعلیم کتاب وحکمت' پھر تزکیہ۔ یہاں پہلے تلاوتِ آیات' پھر تزکیہ اور پھر تعلیمِ کتاب وحکمت آیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے جو بات کہی وہ بھی غلط تو نہیں ہو سکتی' لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تنفیذ شدہ (imposed) صورت یہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی۔ اس لیے کہ تزکیہ مقدم ہے' اگر نیت صحیح نہیں ہے تو تعلیمِ کتاب وحکمت مفید نہیں ہو گی' بلکہ گمراہی میں اضافہ ہو گا۔ نیت کج ہے تو گمراہی بڑھتی چلی جائے گی۔ تزکیہ کا حاصل اخلاص ہے' یعنی نیت درست ہو جائے۔ اگر یہ نہیں ہے تو کوئی جتنا بڑا عالم ہو گا وہ اتنا بڑا شیطان بھی بن سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بڑے بڑے فتنے عالموں نے ہی اٹھائے ہیں۔ ''دینِ اکبری'' یا ''دینِ الٰہی'' کی تدوین کا خیال تو اکبر کے باپ دادا کو بھی نہیں آ سکتا تھا' یہ تو ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء تھے جنہوں نے اسے یہ پٹی پڑھائی۔ اسی طرح غلام احمد قادیانی کو بھی الٹی پٹیاں پڑھانے والا حکیم نورالدین تھا' جو ایک بہت بڑا عالم تھا۔ تو درحقیقت کوئی جتنا بڑا عالم ہو گا اگر اس کی نیت کج ہو گئی تو وہ اتنا ہی بڑا فتنہ اٹھا دے گا۔ اس پہلو سے تزکیہ مقدم ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہی مضمون سورۂ آل عمران میں اور پھر سورۃ الجمعہ میں بھی آیا ہے' وہاں بھی ترتیب یہی ہے: (۱) تلاوتِ آیات (۲) تزکیہ (۳) تعلیمِ کتاب وحکمت۔

آیت ۱۵۲ ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ''پس تم مجھے یاد رکھو' میں تمہیں یاد رکھوں گا''

یہ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے درمیان ایک بہت بڑا میثاق اور معاہدہ ہے۔ اس کی شرح ایک حدیث قدسی میں بایں الفاظ آئی ہے: ((اَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَكَرَنِيْ، فَاِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِيْ نَفْسِيْ، وَاِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَاٍ ذَكَرْتُهٗ فِيْ مَلَاٍ خَيْرٍ مِنْهُمْ)) (۱۶) ''میرا بندہ جب مجھے یاد کرتا ہے تو میں اُس کے پاس ہوتا ہوں' اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں' اور اگر وہ مجھے کسی محفل میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس سے بہت بہتر محفل میں یاد کرتا ہوں''۔ اُس کی محفل تو بہت بلند و بالا ہے' وہ ملأ اعلیٰ کی محفل ہے' ملائکہ مقربین کی محفل ہے۔ امیر خسرو معلوم نہیں کس عالم میں یہ شعر کہہ گئے تھے: ؎

۱۶۔ صحیح البخاری' کتاب التوحید' باب قولہ تعالیٰ: ﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ﴾۔ و صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء' باب الحث علی ذکر اللہ تعالیٰ۔

خدا خود میرِ محفل بود اندر لامکاں خسرو محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم!

﴿وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾﴾ ''اور میرا شکر کرو' میری ناشکری مت کرنا۔''

میری نعمتوں کا ادراک کرو' ان کا شعور حاصل کرو۔ زبان سے بھی میری نعمتوں کا شکر ادا کرو اور اپنے عمل سے بھی' اپنے اعضاء و جوارح سے بھی ان نعمتوں کا حق ادا کرو۔

یہاں اس سورۂ مبارکہ کا نصفِ اوّل مکمل ہو گیا ہے جو اٹھارہ رکوعوں پر مشتمل ہے۔

آیات ۱۵۳ تا ۱۶۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَاۗىِٕرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰۗىِٕكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا فَاُولٰۗىِٕكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾ ع ۱۹

سورۃ البقرۃ کے انیسویں رکوع سے اب اُمّتِ مُسلمہ سے براہِ راست خطاب ہے۔ اس سے قبل اس اُمّت کی غرضِ تاسیس بایں الفاظ بیان کی جا چکی ہے: ﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ (آیت ۱۴۳) ''تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو اور رسولؐ تم پر گواہی دینے والا بنے''۔ گویا اب تم ہمیشہ ہمیش کے لیے محمد رسول اللہ ﷺ اور نوعِ انسانی کے درمیان واسطہ ہو۔ ایک حدیث میں علماءِ حق کے بارے میں فرمایا گیا ہے: ((اِنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ)) [۱۷] ''یقیناً علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں''۔ اس لیے کہ اب نبوت تو ختم ہو گئی خاتم المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ پر' لیکن یہ آخری کتاب قیامت تک رہے گی' اس کو پہنچانا ہے' اس کو عام کرنا ہے' اور صرف تبلیغ سے نہیں عمل کر کے دکھانا ہے۔ وہ نظام عملاً قائم کر کے دکھانا ہے جو محمد عربی ﷺ نے قائم کیا تھا' تب حجت قائم ہو گی۔ اس کے لیے تمہیں قربانیاں دینی ہوں گی' مشکلات جھیلنی ہوں گی' جان و مال کا نقصان برداشت

۱۷۔ صحیح البخاری' کتاب العلم' باب العلم قبل القول والعمل۔ وسنن الترمذی' کتاب العلم' باب ما جاء فی فضل الفقه علی العبادة۔ وسنن ابی داؤد' کتاب العلم' باب الحث علی طلب العلم۔

کرنا ہوگا۔ آرام سے گھر بیٹھے ٹھنڈے پیٹوں حق نہیں آ جائے گا' کفر اس طرح جگہ نہیں چھوڑے گا۔ کفر کو ہٹانے کے لیے' باطل کو ختم کرنے کے لیے اور حق کو قائم کرنے کے لیے تمہیں تن من دھن لگانے ہوں گے۔ چنانچہ اب پکار آ رہی ہے:

آیت ۱۵۳ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ﴾ ''اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد چاہو۔''

پانچویں رکوع کی سات آیات کو میں نے بنی اسرائیل سے خطاب کے ضمن میں بمنزلۂ فاتحہ قرار دیا تھا۔ وہاں پر یہ الفاظ آئے تھے: ﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝۴۵ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۴۶﴾ ''اور مدد چاہو صبر اور نماز سے' اور یقیناً یہ بھاری چیز ہے مگر ان لوگوں کے لیے جو ڈرنے والے ہیں' جو گمان رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملاقات کرنے والے ہیں اور وہ اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں''۔ اب یہی بات اہلِ ایمان سے کہی جا رہی ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۳﴾ ''جان لو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی معیت سے کیا مراد ہے! ایک بات تو متفق علیہ ہے کہ اللہ کی مدد' اللہ کی تائید' اللہ کی نصرت ان کے شامل حال ہے۔ باقی یہ کہ جہاں کہیں بھی ہم ہیں اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی کیفیت ہم نہیں جانتے' لیکن خود اس کا فرمان ہے کہ ''ہم تو انسان سے اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ قریب ہیں''۔ (قٓ:۱۶)

آیت ۱۵۴ ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ﴾ ''اور مت کہو اُن کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں کہ وہ مُردہ ہیں۔''

اب پہلے ہی قدم پر اللہ کی راہ میں قتل ہونے کی بات آ گئی ع ''شرطِ اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی!'' ایمان کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ جانیں دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

﴿بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝۱۵۴﴾ ''(وہ مُردہ نہیں ہیں) بلکہ زندہ ہیں' لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔''

جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں ان کو جنت میں داخلہ کے لیے یومِ آخرت تک انتظار نہیں کرنا ہوگا' شہداء کو تو اُسی وقت براہِ راست جنت میں داخلہ ملتا ہے' لہٰذا وہ تو زندہ ہیں۔ یہی مضمون سورۂ آل عمران میں اور زیادہ نکھر کر سامنے آئے گا۔

آیت ۱۵۵ ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ﴾ ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے''

دیکھ لو' جس راہ میں تم نے قدم رکھا ہے یہاں اب آزمائشیں آئیں گی' تکلیفیں آئیں گی۔ رشتہ دار ناراض ہوں گے' شوہر اور بیوی کے درمیان تفریق ہوگی' اولاد والدین سے جدا ہوگی' فساد ہوگا' فتور ہوگا' تصادم ہوگا' جان و مال کا نقصان ہوگا۔ ہم خوف کی کیفیت سے بھی تمہاری آزمائش کریں گے اور بھوک سے بھی۔ چنانچہ صحابہ کرام ؓ نے کیسی کیسی سختیاں جھیلیں اور کئی کئی روز کے فاقے برداشت کیے۔ غزوۂ احزاب میں کیا حالات پیش آئے ہیں! اس کے بعد جیش العُسرۃ (غزوۂ تبوک) میں کیا کچھ ہوا ہے!

﴿وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ ''اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے۔''

مالی اور جانی نقصان بھی ہوں گے اور ثمرات کا نقصان بھی ہوگا۔ ''ثمرات'' یہاں دو معنی دے رہا ہے۔ مدینہ والوں کی معیشت کا دارومدار زراعت اور باغبانی پر تھا۔ خاص طور پر کھجور ان کی پیداوار تھی' جسے آج کی اصطلاح میں cash crop کہا جائے گا۔ اب ایسا بھی ہوا کہ فصل پک کر تیار کھڑی ہے اور اگر اسے درختوں سے اتارا نہ گیا تو ضائع ہو جائے گی' اُدھر سے غزوۂ تبوک کا حکم آ گیا کہ نکلو اللہ کی راہ میں! تو یہ امتحان ہے ثمرات کے نقصان کا۔ اس کے علاوہ ثمرات کا ایک اور مفہوم ہے۔ انسان بہت محنت کرتا ہے' جدّوجُہد کرتا

ہے' ایک کیریئر اپناتا ہے اور اس میں اپنا ایک مقام بنالیتا ہے۔ لیکن جب وہ دین کے راستے پر آتا ہے تو کچھ اور ہی شکل اختیار کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اپنی تجارت کے جمانے میں یا کسی پروفیشن میں اپنا مقام بنانے میں اُس نے جو محنت کی تھی وہ سب کی سب صفر ہو کر رہ جاتی ہے' اور اپنی محنت کے ثمرات سے بالکل تہی دامن ہو کر اسے اس وادی میں آنا پڑتا ہے۔

﴿وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۵۵﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) بشارت دیجیے ان صبر کرنے والوں کو۔''

آیت ۱۵۶ ﴿الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ﴾ ''وہ لوگ کہ جن کو جب بھی کوئی مصیبت آئے''

﴿قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝۱۵۶﴾ ''تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے۔''

آخر کار تو یہاں سے جانا ہے' اگر کل کی بجائے ہمیں آج ہی بلا لیا جائے تب بھی حاضر ہیں۔ بقول اقبال:

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست!

یعنی مردِ مؤمن کی تو نشانی ہی یہی ہے کہ جب موت آتی ہے تو مسرت کے ساتھ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے۔ وہ دنیا سے مسکراتا ہوا رخصت ہوتا ہے۔ یہ ایمان کی علامت ہے اور بندۂ مؤمن اس دنیا میں زیادہ دیر تک رہنے کی خواہش نہیں کر سکتا۔ اسے معلوم ہے کہ وہ دنیا میں جو لمحہ بھی گزار رہا ہے اسے اس کا حساب دینا ہوگا۔ تو جتنی عمر بڑھ رہی ہے حساب بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ حدیث میں دنیا کو مؤمن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت قرار دیا گیا ہے: ((اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ))(۱۸)

آیت ۱۵۷ ﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟﴾ ''یہی ہیں وہ لوگ کہ جن پر اُن کے ربّ کی عنایتیں ہیں اور رحمت۔''

ان پر ہر وقت اللہ کی عنایتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے اور رحمت کی بارش ہوتی رہتی ہے۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝۱۵۷﴾ ''اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔''

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے واقعتاً ہدایت کو اختیار کیا ہے۔ اور جو ایسے مرحلے پر ٹھٹک کر کھڑے رہ جائیں' پیچھے ہٹ کر بیٹھ جائیں' پیٹھ موڑ لیں تو گویا وہ ہدایت سے تہی دامن ہیں۔

آیت ۱۵۸ ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''یقیناً صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔''

یہ آیت اصل سلسلۂ بحث یعنی قبلہ کی بحث سے متعلق ہے۔ بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ حج کے مناسک میں یہ جو صفا اور مروہ کی سعی ہے تو اس کی کیا حقیقت ہے؟ فرمایا کہ یہ بھی اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔ شعائر' شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی ایسی چیز کے ہیں جو شعور بخشے' جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان ہو۔ چنانچہ وہ مظاہر جن کے ساتھ اولوالعزم پیغمبروں یا اولوالعزم اولیاء اللہ کے حالات و واقعات کا کوئی ذہنی سلسلہ قائم ہوتا ہو اور جو اللہ اور رسولؐ کی طرف سے بطور ایک نشان اور علامت مقرر کیے گئے ہوں شعائر کہلاتے ہیں۔ وہ گویا بعض معنوی حقائق کا شعور دلانے والے اور ذہن کو اللہ کی طرف لے جانے والے ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے بیت اللہ' حجر اسود' جمرات اور صفا و مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے ہیں۔

۱۸۔ صحیح مسلم' کتاب الزھد والرقائق۔ وسنن الترمذی' کتاب الزھد' باب ما جاء ان الدنیا سجن المؤمن.....

﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ﴾ ''تو جو کوئی بھی بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں ہے کہ ان دونوں کا طواف بھی کرے۔''

صفا و مروہ کے طواف سے مراد وہ سعی ہے جو ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات چکروں کی صورت میں کی جاتی ہے۔

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ﴾ ''اور جو شخص خوش دلی سے کوئی بھلائی کا کام کرتا ہے''

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾﴾ ''تو (جان لو کہ) اللہ بڑا قدردان ہے' جاننے والا ہے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ کے لیے لفظ ''شاکر'' آیا ہے۔ لفظ شکر کی نسبت جب بندے کی طرف ہو تو اس کے معنی شکر گزاری اور احسان مندی کے ہوتے ہیں' لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی قدردانی اور قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں۔ ''شاکر'' کے ساتھ دوسری صفت ''علیم'' آئی ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ چاہے کسی اور کو پتا نہ لگے اسے تو خوب معلوم ہے۔ اگر تم نے اللہ کی رضا جوئی کے لیے کسی کو کوئی مالی مدد دی ہے' اس حال میں کہ داہنے ہاتھ نے جو کچھ دیا ہے اس کی بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہیں ہونے دی' کجا یہ کہ کسی اور انسان کے سامنے اس کا تذکرہ ہو' تو یہ اللہ کے تو علم میں ہے' چنانچہ اگر اللہ سے اجر و ثواب چاہتے ہو تو اپنی نیکیوں کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کوئی ضرورت نہیں' لیکن اگر تم نے یہ سب کچھ لوگوں کو دکھانے کے لیے کیا تھا تو گویا وہ شرک ہو گیا۔

آیت ۱۵۹ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اُس شے کو جو ہم نے نازل کی بیّنات میں سے اور ہدایت میں سے''

﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ﴾ ''بعد اس کے کہ ہم نے اس کو واضح کر دیا ہے لوگوں کے لیے کتاب میں''

﴿اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ﴿۱۵۹﴾﴾ ''تو وہی لوگ ہیں کہ جن پر لعنت کرتا ہے اللہ اور لعنت کرتے ہیں تمام لعنت کرنے والے۔''

اس آیت میں یہود کی طرف اشارہ ہے' جن کی معاندانہ روش کا ذکر پہلے گزر چکا۔ یہاں اب گویا آخری قطعی صفائی (mopping up operation) کے طور پر ان کے بارے میں چند باتوں کا مزید اضافہ کیا جا رہا ہے۔ یہاں بیّنات اور ہدیٰ سے خاص طور پر وہ نشانیاں مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں نبی آخر الزماں ﷺ کے بارے میں یہود کی راہنمائی کے لیے واضح فرمائی تھیں۔ لیکن یہود نے ان نشانیوں سے راہنمائی حاصل کرنے کے بجائے ان کو چھپانے کی کوشش کی۔ آیت ۱۴۰ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی تھی جسے اُس نے چھپا لیا''۔ یہاں اسی کی وضاحت ہو رہی ہے کہ تورات اور انجیل میں کیسی کیسی کھلی شہادتیں تھیں' اور ان کو یہ چھپائے پھر رہے ہیں!

آیت ۱۶۰ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَيَّنُوْا﴾ ''سوائے اُن کے جو توبہ کریں اور اصلاح کر لیں اور (جو کچھ چھپاتے تھے اسے) واضح طور پر بیان کرنے لگیں''

﴿فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ﴾ ''تو ان کی توبہ میں قبول کروں گا۔''

میں اپنی نگاہِ التفات ان کی طرف متوجہ کردوں گا۔

﴿وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٠﴾﴾ ''اور میں تو ہوں ہی توبہ کا قبول کرنے والا' رحم فرمانے والا۔''

آیت ۱۶۱ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ ''یقیناً جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ اسی حال میں مر گئے کہ کفر پر قائم تھے''

﴿اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٦١﴾﴾ ''ان پر لعنت ہے اللہ کی بھی اور فرشتوں کی بھی اور تمام انسانوں کی بھی۔''

آیت ۱۶۲ ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ﴾ ''اسی (لعنت کی کیفیت) میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ﴾ ''نہ اُن پر سے عذاب میں کوئی کمی کی جائے گی''

﴿وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿١٦٢﴾﴾ ''اور نہ اُن کو مہلت ہی ملے گی۔''

عذاب کا تسلسل ہمیشہ قائم رہے گا۔ ایسا نہیں ہوگا کہ ذرا سی دیر کے لیے وقفہ ہو جائے یا سانس لینے کی مہلت ہی مل جائے۔

آیت ۱۶۳ ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ﴾ ''اور تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے۔''

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿١٦٣﴾﴾ ''اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے' وہ رحمٰن ہے' رحیم ہے۔''

رحمٰن اور رحیم کی وضاحت سورۃ الفاتحہ میں گزر چکی ہے۔

آیات ۱۶۴ تا ۱۶۷

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۖ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿١٦٤﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾ ع

اب جو آیت آ رہی ہے اس کے مطالعہ سے پہلے ایک بات سمجھ لیجیے کہ سورۃ البقرۃ کا نصف ثانی جو بائیس رکوعوں پر مشتمل ہے اور جس کا آغاز انیسویں رکوع سے ہوا ہے' اس میں ترتیب کیا ہے۔ سورۃ البقرۃ کے پہلے اٹھارہ رکوعوں کی تقسیم عمودی (vertical) ہے۔ یعنی چار رکوع اِدھر' دس درمیان میں' پھر چار اُدھر۔ لیکن انیسویں رکوع سے اب اُفقی (horizontal) تقسیم کا آغاز ہو گیا ہے۔ اس حصے میں چار مضامین تانے بانے کی طرح بُنے ہوئے ہیں۔ یا یوں کہہ لیں کہ چار لڑیاں ہیں جن کو بٹ کر رسّی بنا دیا گیا ہے۔ ان چار

میں سے دولڑیاں تو شریعت کی ہیں' جن میں سے ایک عبادات کی اور دوسری احکام وشرائع کی ہے کہ یہ واجب ہے' یہ کرنا ہے' یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔ نماز فرض ہے' روزہ فرض ہے' وغیرہ وغیرہ۔ احکام وشرائع میں خاص طور پر شوہر اور بیوی کے تعلق کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس لیے کہ معاشرتِ انسانی کی بنیاد یہی ہے۔ لہٰذا اس سورت میں آپ دیکھیں گے کہ عائلی قوانین کے ضمن میں تفصیلی احکام آئیں گے۔ جبکہ دوسری دولڑیاں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کی ہیں۔ جہاد بالنفس کی آخری انتہا قتال ہے جہاں انسان نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ کارزار میں حاضر ہو جاتا ہے۔

اب ان چاروں مضامین یا چاروں لڑیوں کو ایک مثال سے سمجھ لیجیے۔ فرض کیجیے ایک سرخ لڑی ہے' ایک پیلی ہے' ایک نیلی ہے اور ایک سبز ہے' اور ان چاروں لڑیوں کو ایک رسّی کی صورت میں بٹ دیا گیا ہے۔ آپ اس رسّی کو دیکھیں گے تو چاروں رنگ کٹے پھٹے نظر آئیں گے۔ پہلے سرخ' پھر پیلا' پھر نیلا اور پھر سبز نظر آئے گا' لیکن اگر رسّی کے بل کھول دیں تو ہر لڑی مسلسل نظر آئے گی۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ کے نصف آخر میں عبادات' احکامِ شریعت' جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کے چار مضامین چار لڑیوں کی مانند گُتھے ہوئے ہیں۔ یہ چاروں لڑیاں تانے بانے کی طرح بُنی ہوئی ہیں۔ لیکن اسی بُنت میں بہت بڑے بڑے پھول موجود ہیں۔ یہ پھول قرآن مجید کی عظیم ترین اور طویل آیات ہیں' جن کی نمایاں ترین مثال آیت الکرسی کی ہے۔ ان عظیم آیات میں سے ایک آیت یہاں بیسویں رکوع کے آغاز میں آ رہی ہے' جسے میں نے ''آیۃ الآیات'' کا عنوان دیا ہے۔ اس لیے کہ قرآن مجید کی کسی اور آیت میں اس قدر مظاہرِ فطرت (phenomena of nature) یکجا نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مظاہرِ فطرت کو اپنی آیات قرار دیتا ہے۔ آسمان اور زمین کی تخلیق' رات اور دن کا اُلٹ پھیر' آسمان کے ستارے اور زمین کی نباتات' یہ سب آیات ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں مختلف مقامات پر کیا گیا ہے' لیکن یہاں بہت سے مظاہرِ فطرت کو جس طرح ایک آیت میں سمویا گیا ہے یہ حکمتِ قرآنی کا ایک بہت بڑا پھول ہے جو ان چار لڑیوں کی بُنت کے اندر آ گیا ہے۔

آیت ۱۶۴ ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ﴾ ''یقیناً آسمان اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں''

﴿وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ﴾ ''اور اُن کشتیوں (اور جہازوں) میں جو سمندر میں (یا دریاؤں میں) لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں''

﴿وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ﴾ ''اور اُس پانی میں کہ جو اللہ نے آسمان سے اتارا ہے''

﴿فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ ''پھر اس سے زندگی بخشی زمین کو اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد''

بے آب وگیاہ زمین پڑی تھی' بارش ہوئی تو اسی میں سے روئیدگی آ گئی۔

﴿وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ﴾ ''اور ہر قسم کے حیوانات (اور چرند پرند) اس کے اندر پھیلا دیے۔''

﴿وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ﴾ ''اور ہواؤں کی گردش میں''

ہواؤں کی گردش کے مختلف انداز اور مختلف پہلو ہیں۔ کبھی شمالاً جنوباً چل رہی ہے' کبھی مشرق سے آ رہی ہے' کبھی مغرب سے آ رہی ہے۔ اس گردش میں بڑی حکمتیں کارفرما ہیں۔

﴿وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ ''اور ان بادلوں میں جو معلّق کر دیے گئے ہیں آسمان اور زمین کے

درمیان‘‘

﴿لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ ’’یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیں۔‘‘

ان مظاہرِ فطرت کو دیکھو اور ان کے خالق اور مدبّر کو پہچانو! ان آیاتِ آفاقی پر غور و فکر اور ان کے خالق کو پہچاننے کا جو عملی نتیجہ نکلنا چاہیے اور جس تک عام طور پر لوگ نہیں پہنچ پاتے اب اگلی آیت میں اس کا تذکرہ ہے۔ نتیجہ تو یہ نکلنا چاہیے کہ پھر محبوب اللہ ہی ہو‘ شکر اسی کا ہو‘ اطاعت اسی کی ہو‘ عبادت اسی کی ہو۔ جب سورج میں اپنا کچھ نہیں‘ اسے اللہ نے بنایا ہے اور اسے حرارت عطا کی ہے‘ چاند میں کچھ نہیں‘ ہوائیں چلانے والا بھی وہی ہے تو اور کسی شے کے لیے کوئی شکر نہیں‘ کوئی عبادت نہیں‘ کوئی ڈنڈوت نہیں‘ کوئی سجدہ نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہی مطلوب و مقصود بن جائے‘ وہی محبوب ہو۔ لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ، لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ — جن لوگوں کی یہاں تک رسائی نہیں ہو پاتی وہ کسی اور شے کو اپنا محبوب و مطلوب بنا کر اس کی پرستش شروع کر دیتے ہیں۔ خدا تک نہیں پہنچے تو ع ’’اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں‘‘ کے مصداق اپنے نفس ہی کو معبود بنا لیا اور خواہشاتِ نفس کی پیروی میں لگ گئے۔ کچھ لوگوں نے اپنی قوم کو معبود بنا لیا اور قوم کی برتری اور سربلندی کے لیے جانیں بھی دے رہے ہیں۔ بعض نے وطن کو معبود بنا لیا۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے سمجھا ہے کہ اِس دَور کا سب سے بڑا بُت وطن ہے۔ ان کی نظم ’’وطنیت‘‘ ملاحظہ کیجیے: ؎

اِس دَور میں مے اور ہے‘ جام اور ہے‘ جم اور — ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور — مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

اگلی آیت میں تمام معبودانِ باطل کی نفی کر کے ایک اللہ کو اپنا محبوب اور مطلوب و مقصود بنانے کی دعوت دی گئی ہے۔

آیت ۱۶۵ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَنْدَادًا﴾ ’’اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کو چھوڑ کر کچھ اور چیزوں کو اس کا ہمسر اور مدِمقابل بنا دیتے ہیں‘‘

﴿یُّحِبُّوْنَھُمْ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ﴾ ’’وہ ان سے ایسی محبت کرنے لگتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے۔‘‘

یہ دراصل ایک فلسفہ ہے کہ ہر باشعور انسان کسی شے کو اپنا آئیڈیل‘ نصب العین یا آدرش ٹھہراتا ہے اور پھر اس سے بھرپور محبت کرتا ہے‘ اس کے لیے جیتا ہے‘ اس کے لیے مرتا ہے‘ قربانیاں دیتا ہے‘ ایثار کرتا ہے۔ چنانچہ کوئی قوم کے لیے‘ کوئی وطن کے لیے اور کوئی خود اپنی ذات کے لیے قربانی دیتا ہے۔ لیکن بندۂ مؤمن یہ سارے کام اللہ کے لیے کرتا ہے۔ وہ اپنا مطلوب و مقصود اور محبوب صرف اللہ کو بناتا ہے۔ وہ اُسی کے لیے جیتا ہے‘ اُسی کے لیے مرتا ہے: ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) ’’بے شک میری نماز‘ میری قربانی‘ میرا جینا اور میرا مرنا اللہ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے‘‘۔ اس کے برعکس عام انسانوں کا معاملہ یہی ہوتا ہے کہ: ؎

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر
رُست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

انسان اپنے ذہن سے معبود تراشتا رہتا ہے‘ ان سے محبت کرتا ہے اور ان کے لیے قربانیاں دیتا ہے۔ یہ مضمون سورۃ الحج کے آخری رکوع میں زیادہ وضاحت کے ساتھ آئے گا۔

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ ''اور جو لوگ واقعتاً صاحبِ ایمان ہوتے ہیں ان کی شدید ترین محبت اللہ کے ساتھ ہوتی ہے۔''

ع ''گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!'' یہ گویا ٹس ٹیسٹ ہے۔ کوئی شے اگر اللہ سے بڑھ کر محبوب ہوگئی تو وہ تمہاری معبود ہے۔ تم نے اللہ کو چھوڑ کر اُس کو اپنا معبود بنا لیا' چاہے وہ دولت ہی ہو۔ حدیثِ نبویؐ ہے: ((تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ وَعَبْدُ الدِّرْهَمِ))[19] ''ہلاک اور برباد ہو جائے درہم و دینار کا بندہ''۔ نام خواہ عبدالرحمٰن ہو' حقیقت میں وہ عبدالدینار ہے۔ اس لیے کہ وہ یہ خواہش رکھتا ہے کہ دینار آنا چاہیے' خواہ حرام سے آئے یا حلال سے' جائز ذرائع سے آئے یا ناجائز ذرائع سے۔ چنانچہ اس کا معبود اللہ نہیں' دینار ہے۔ ہندو نے لکشمی دیوی کی مورتی بنا کر اسے پُوجنا شروع کر دیا کہ یہ لکشمی دیوی اگر ذرا مہربان ہو جائے گی تو دولت کی ریل پیل ہو جائے گی۔ ہم نے اس درمیانی واسطے کو بھی ہٹا کر براہِ راست ڈالر اور پیٹرو ڈالر کو پوجنا شروع کر دیا اور اس کی خاطر اپنے وطن اور اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیا۔ چنانچہ یہاں کتنے ہی لوگ سسک سسک کر مر جاتے ہیں اور آخری لمحات میں ان کا بیٹا یا بیٹی ان کے پاس موجود نہیں ہوتا بلکہ دیارِ غیر میں ڈالر کی پوجا میں مصروف ہوتا ہے۔

﴿وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ﴾ ''اور اگر یہ ظالم لوگ اُس وقت کو دیکھ لیں جب یہ دیکھیں گے عذاب کو' تو (ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ) قوت تو ساری کی ساری اللہ کے پاس ہے''

یہاں ظلم شرک کے معنی میں آیا ہے اور ظالم سے مراد مشرک ہیں۔

﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾﴾ ''اور یہ کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

اُس وقت آنکھ کھلے گی تو کیا فائدہ ہوگا؟ اب آنکھ کھلے تو فائدہ ہے۔

آیت ۱۶۶ ﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا﴾ ''اُس وقت وہ لوگ جن کی (دنیا میں) پیروی کی گئی تھی اپنے پیروؤں سے اظہارِ براءت کریں گے''

ہر انسانی معاشرے میں کچھ ایسے لوگ ضرور ہوتے ہیں جو دوسرے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیتے ہیں' چاہے اربابِ اقتدار ہوں' چاہے مذہبی مسندوں کے والی ہوں۔ لوگ انہیں اپنے پیشوا اور راہنما مان کر ان کی پیروی کرتے ہیں اور ان کی ہر سچی جھوٹی بات پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ جب عذابِ آخرت ظاہر ہوگا تو یہ پیشوا اور راہنما اس عذاب سے بچانے میں اپنے پیروؤں کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور ان سے صاف صاف اظہارِ براءت اور اعلانِ لاتعلقی کر دیں گے۔

﴿وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾﴾ ''اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تمام تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔''

جب جہنم ان کی نگاہوں کے سامنے آ جائے گی تو تمام رشتے منقطع ہو جائیں گے۔ سورۂ عبس میں اس نفسانفسی کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے: ﴿يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ﴿٣٤﴾ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿٣٥﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿٣٦﴾ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ﴿٣٧﴾﴾ ''اُس روز آدمی بھاگے گا اپنے بھائی سے' اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے' اور اپنی بیوی اور اپنی اولاد سے۔ ان میں سے

۱۹۔ صحیح البخاری' کتاب الجهاد والسیر' باب الحراسة فی الغزو فی سبیل الله۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الزهد' باب فی المکثرین۔

ہر شخص پر اُس دن ایسا وقت آ پڑے گا کہ اُسے اپنے سوا کسی کا ہوش نہ ہوگا''۔ اسی طرح سورۃ المعارج میں فرمایا گیا ہے: ﴿يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ﴿١١﴾ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ﴿١٢﴾ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ﴿١٣﴾ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ ﴿١٤﴾﴾ ''مجرم چاہے گا کہ اُس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو' اپنی بیوی کو' اپنے بھائی کو' اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا' اور روئے زمین کے سب انسانوں کو فدیہ میں دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے''۔ یہاں فرمایا: ﴿تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾﴾ ''ان کے سارے رشتے منقطع ہو جائیں گے''۔ یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ جن رشتوں کی وجہ سے ہم حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر رہے ہیں' جن کی دلجوئی کے لیے حرام کی کمائی کرتے ہیں اور جن کی ناراضی کے خوف سے دین کے راستے پر آگے نہیں بڑھ رہے ہیں' یہ سارے رشتے اسی دنیا تک محدود ہیں اور اُخروی زندگی میں یہ کچھ کام نہ آئیں گے۔

آیت ۱۶۷ ﴿وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً﴾ ''اور جو اُن کے پیروکار تھے وہ کہیں گے کہ اگر کہیں ہمیں دنیا میں ایک بار لوٹنا نصیب ہو جائے''

﴿فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا﴾ ''تو ہم بھی ان سے اسی طرح اظہارِ براءت کریں گے جیسے آج یہ ہم سے بیزاری ظاہر کر رہے ہیں۔''

﴿كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ﴾ ''اس طرح اللہ ان کو ان کے اعمال حسرتیں بنا کر دکھائے گا۔''

وہ کہیں گے کاش ہم نے سمجھا ہوتا' کاش ہم نے ان کی پیروی نہ کی ہوتی' کاش ہم نے ان کو اپنا لیڈر اور اپنا ہادی و رہنما نہ مانا ہوتا!!

﴿وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾﴾ ''لیکن وہ اب آگ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے۔''

اب ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔

آیات ۱۶۸ تا ۱۷۶

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ﴿١٦٨﴾ إِنَّمَا يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَن تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۚ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٧٣﴾ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٧٤﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَا

اَصۡبَرَهُمۡ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِى الۡكِتٰبِ لَفِىۡ شِقَاقٍۢ بَعِيۡدٍ ﴿۱۷۶﴾

آیت ۱۶۸ ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوۡا مِمَّا فِى الۡاَرۡضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۫﴾ ''اے لوگو! زمین میں جو کچھ حلال اور طیب ہے اسے کھاؤ''

﴿وَّلَا تَتَّبِعُوۡا خُطُوٰتِ الشَّيۡطٰنِ ؕ﴾ ''اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔''

﴿اِنَّهٗ لَكُمۡ عَدُوٌّ مُّبِيۡنٌ ﴿۱۶۸﴾﴾ ''یقیناً وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔''

یہ بحث دراصل سورۃ الانعام میں زیادہ وضاحت سے آئے گی۔ عرب میں یہ رواج تھا کہ بُتوں کے نام پر کوئی جانور چھوڑ دیتے تھے' جس کو ذبح کرنا وہ حرام سمجھتے تھے۔ ایسی روایات ہندوؤں میں بھی تھیں جنہیں ہم نے بچپن میں دیکھا ہے۔ مثلاً کوئی سانڈ چھوڑ دیا' کسی کے کان چیر دیے کہ یہ فلاں بُت کے لیے یا فلاں دیوی کے لیے ہے۔ ایسے جانور جہاں چاہیں مُنہ ماریں' انہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ ظاہر ہے ان کا گوشت کیسے کھایا جا سکتا تھا! تو عرب میں بھی یہ رواج تھے اور ظہورِ اسلام کے بعد بھی ان کے کچھ نہ کچھ اثرات ابھی باقی تھے۔ آباء و اجداد کی رسمیں جو قرنوں سے چلی آ رہی ہوں وہ آسانی سے چھوٹتی نہیں ہیں' کچھ نہ کچھ اثرات رہتے ہیں۔ جیسے آج بھی ہمارے ہاں ہندوانہ اثرات موجود ہیں۔ تو ایسے لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ مشرکانہ توہمات کی بنیاد پر تمہارے مشرک باپ دادا نے اگر کچھ چیزوں کو حرام ٹھہرا لیا تھا اور کچھ کو حلال قرار دے لیا تھا تو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ تم شیطان کی پیروی میں مشرکانہ توہمات کے تحت اللہ تعالیٰ کی حلال ٹھہرائی ہوئی چیزوں کو حرام مت ٹھہراؤ۔ جو چیز بھی اصلاً حلال اور پاکیزہ و طیب ہے اسے کھاؤ۔

آیت ۱۶۹ ﴿اِنَّمَا يَاۡمُرُكُمۡ بِالسُّوۡٓءِ وَالۡفَحۡشَآءِ﴾ ''وہ (شیطان) تو بس تمہیں بدی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے''

﴿وَاَنۡ تَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۶۹﴾﴾ ''اور اس کا کہ تم اللہ کی طرف وہ باتیں منسوب کرو جن کے بارے میں تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔''

آیت ۱۷۰ ﴿وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمُ اتَّبِعُوۡا مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس کی جو اللہ نے نازل کیا ہے''

﴿قَالُوۡا بَلۡ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلۡفَيۡنَا عَلَيۡهِ اٰبَآءَنَا ؕ﴾ ''وہ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم تو پیروی کریں گے اُس طریقے کی جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا ہے۔''

﴿اَوَلَوۡ كَانَ اٰبَآؤُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ شَيۡـًٔا وَّلَا يَهۡتَدُوۡنَ ﴿۱۷۰﴾﴾ ''اگرچہ ان کے آباء و اجداد نہ کسی بات کو سمجھ پائے ہوں اور نہ ہدایت یافتہ ہوئے ہوں (پھر بھی وہ اپنے آباء و اجداد ہی کی پیروی کرتے رہیں گے)؟''

سورۃ البقرۃ کے تیسرے رکوع کی پہلی آیت (جہاں نوعِ انسانی کو خطاب کر کے عبادتِ ربّ کی دعوت دی گئی) کے ضمن میں وضاحت کی گئی تھی کہ جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں وہ بھی تو مخلوق تھے جیسے تم مخلوق ہو' جیسے تم سے خطا ہو سکتی ہے ان سے بھی ہوئی' جیسے تم غلطی کر سکتے ہو انہوں نے بھی کی۔

آیت ۱۷۱ ﴿وَمَثَلُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا كَمَثَلِ الَّذِىۡ يَنۡعِقُ بِمَا لَا يَسۡمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ﴾ ''اور ان لوگوں کی مثال

جنہوں نے کفر کیا' ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایسی چیز کو پکارے جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہ سمجھتی ہو۔''

جو لوگ محض باپ دادا کی تقلید میں اپنے کفر پر اڑ گئے ہیں اُن کی تشبیہ جانوروں سے دی گئی ہے جنہیں پکارا جائے تو وہ پکارنے والے کی پکار اور آواز تو سنتے ہیں' لیکن سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ تمثیل سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مسلمان ان لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ اس دعوت پر کان دھرنے کو تیار نہیں ہیں۔

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾﴾ ''وہ بہرے بھی ہیں' گونگے بھی ہیں' اندھے بھی ہیں' پس وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔''

آیت ۱۷۲ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! کھاؤ اُن تمام پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمہیں دی ہیں''

﴿وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ﴾ ''اور اللہ کا شکر ادا کرو''

﴿اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾﴾ ''اگر تم واقعتاً اُسی کی عبادت کرنے والے ہو۔''

جیسا کہ میں نے عرض کیا سورۃ الانعام میں یہ ساری چیزیں تفصیل سے آئیں گی۔

آیت ۱۷۳ ﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ﴾ ''اُس نے تو تم پر یہی حرام کیا ہے مُردار اور خون''

جو جانور اپنی موت آپ مر گیا' ذبح نہیں کیا گیا وہ حرام ہے اور خون حرام ہے' نجس ہے۔ اسی لیے اہلِ اسلام کا ذبح کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ صرف گردن کو کاٹا جائے' تاکہ اس میں شریانیں وغیرہ کٹ جائیں اور جسم کا اکثر خون نکل جائے۔ لیکن اگر جھٹکا کیا جائے' یعنی تیز دھار آلے کے ایک ہی وار سے جانور کی گردن الگ کر دی جائے' جیسے سکھ کرتے ہیں یا جیسے یورپ وغیرہ میں ہوتا ہے' تو پھر خون جسم کے اندر رہ جاتا ہے۔ اس طریقے سے مارا گیا جانور حرام ہے۔

﴿وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ﴾ ''اور خنزیر کا گوشت''

﴿وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اور جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام پکارا گیا ہو۔''

یعنی کسی جانور کو ذبح کرتے ہوئے کسی بت کا' کسی دیوی کا' کسی دیوتا کا' الغرض اللہ کے سوا کسی کا بھی نام لیا گیا تو وہ حرام ہو گیا' اس کا گوشت کھانا حرامِ مطلق ہے' لیکن اسی کے تابع یہ صورت بھی ہے کہ کسی بزرگ کا قرب حاصل کرنے کے لیے جانور کو اس کے مزار پر لے جا کر وہاں ذبح کیا جائے' اگرچہ دعویٰ یہ ہو کہ یہ صاحبِ مزار کے ایصالِ ثواب کی خاطر اللہ تعالیٰ کے لیے ذبح کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ ایصالِ ثواب کی خاطر تو یہ عمل گھر پر بھی کیا جا سکتا ہے۔

وہ کھانے جو اہلِ عرب میں اُس وقت رائج تھے' اللہ تعالیٰ نے بنیادی طور پر ان میں سے چار چیزوں کی حرمت کا قرآن حکیم میں بار بار اعلان کیا ہے۔ مکّی سورتوں میں بھی ان چیزوں کی حرمت کا متعدد بار بیان ہوا ہے اور یہاں سورۃ البقرۃ میں بھی جو مدنی سورت ہے۔ اس کے بعد سورۃ المائدۃ میں یہ مضمون پھر آئے گا۔ ان چار چیزوں کی حرمت کے بیان سے حلال و حرام کی تفصیل پیش کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے' بلکہ مشرکین کی تردید ہے۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ﴾ ''پھر جو کوئی مجبور ہو جائے اور وہ خواہش مند اور حد سے آگے

بڑھنے والا نہ ہو تو اُس پر کوئی گناہ نہیں۔''

اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو گیا ہے' جان نکل رہی ہے اور کوئی شے کھانے کو نہیں ہے تو وہ جان بچانے کے لیے حرام کردہ چیز بھی کھا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے دو شرطیں عائد کی گئی ہیں' ایک تو وہ اس حرام کی طرف رغبت اور میلان نہ رکھتا ہو اور دوسرے یہ کہ جان بچانے کے لیے جو ناگزیر مقدار ہے اس سے آگے نہ بڑھے۔ ان دو شرطوں کے ساتھ جان بچانے کے لیے حرام چیز بھی کھائی جا سکتی ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۷۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ بخشنے والا' رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۱۷۴ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو چھپاتے ہیں اس کو جو اللہ نے نازل کیا ہے کتاب میں سے اور فروخت کرتے ہیں اسے بہت حقیری قیمت پر''

یعنی اس کے عوض دُنیوی فائدوں کی صورت میں حقیر قیمت قبول کرتے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ﴾ ''یہ لوگ نہیں بھر رہے اپنے پیٹوں میں مگر آگ''

﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ ''اور اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا قیامت کے دن۔''

﴿وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۚ﴾ ''اور نہ انہیں پاک کرے گا۔''

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۴﴾﴾ ''اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۱۷۵ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے ہدایت دے کر گمراہی خرید لی ہے''

﴿وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ﴾ ''اور (اللہ کی) مغفرت ہاتھ سے دے کر عذاب خرید لیا ہے۔''

﴿فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۷۵﴾﴾ ''تو یہ کس قدر صبر کرنے والے ہیں دوزخ پر!''

ان کا کتنا حوصلہ ہے کہ جہنّم کا عذاب برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں! اس کے لیے کس طرح تیاری کر رہے ہیں!

آیت ۱۷۶ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۭ﴾ ''یہ اس لیے کہ اللہ نے تو کتاب نازل کی حق کے ساتھ۔''

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿۱۷۶﴾﴾ ''اور یقیناً جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف ڈالا وہ ضد اور مخالفت میں بہت دور نکل گئے۔''

جن لوگوں نے اللہ کی کتاب اور شریعت میں اختلاف کی پگڈنڈیاں نکالیں وہ ضد' ہٹ دھرمی' شقاوت اور دشمنی میں مبتلا ہو گئے اور اس میں بہت دور نکل گئے۔ اعاذنا اللہ مِنْ ذٰلِکَ!

آیات ۱۷۷ تا ۱۸۲

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ

الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ
الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي
الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ
فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ
اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ
تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَ
الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى
الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ
بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس سورۂ مبارکہ میں کئی ایسی عظیم آیات آئی ہیں جو حجم کے اعتبار سے بھی اور معنی و حکمت کے اعتبار سے بھی بہت عظیم ہیں' جیسے دو رکوع پہلے ''آیت الآیات'' گزر چکی ہے۔ اسی طرح سے اب یہ ''آیت البر'' آ رہی ہے' جس میں نیکی کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں نیکی کے مختلف تصوّرات ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایک طبقہ وہ ہے جس کا نیکی کا تصوّر یہ ہے کہ بس سچ بولنا چاہیے' کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہیے' کسی کا حق نہیں مارنا چاہیے' یہ نیکی ہے' باقی کوئی نماز روزہ کی پابندی کرے یا نہ کرے' اس سے کیا فرق پڑتا ہے! ایک طبقہ وہ ہے جس میں چور' اُچکے' گرہ کٹ' ڈاکو اور بدمعاش شامل ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو یتیموں اور بیواؤں کی مدد بھی کرتے ہیں اور یہ کام ان کے ہاں نیکی شمار ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ جسم فروش خواتین بھی اپنے ہاں نیکی کا ایک تصوّر رکھتی ہیں' وہ خیرات بھی کرتی ہیں اور مسجدیں بھی تعمیر کراتی ہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی طبقات میں ایک طبقہ وہ ہے جو مذہب کے ظاہر کو لے کر بیٹھ جاتا ہے اور وہ اس کی روح سے ناآشنا ہوتا ہے۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ ''مچھر چھانتے ہیں اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہیں''۔ ان کے اختلافات اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ رفع یدین کے بغیر نماز ہوئی یا نہیں؟ تراویح آٹھ ہیں یا بیس ہیں؟ باقی یہ کہ سودی کاروبار تم بھی کرو اور ہم بھی' اس سے کسی کی حنفیت یا اہلِ حدیثیت پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ نیکی کے یہ سارے تصوّرات مسخ شدہ (perverted) ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے اندھوں نے ایک ہاتھی کو دیکھ کر اندازہ کرنا چاہا تھا کہ وہ کیسا ہے۔ کسی نے اُس کے پیر کو ٹٹول کر کہا کہ یہ تو ستون کی مانند ہے' جس کا ہاتھ اُس کے کان پر پڑ گیا اُس نے کہا یہ چھاج کی طرح ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں نیکی کا تصور تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔ بقول اقبال: ؎

اڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

یہ آیت اس اعتبار سے قرآن مجید کی عظیم ترین آیت ہے کہ نیکی کی حقیقت کیا ہے' اس کی جڑ بنیاد کیا ہے' اس کی روح کیا ہے' اس کے مظاہر کیا ہیں؟ پھر ان مظاہر میں اہم ترین کون سے ہیں اور ثانوی حیثیت کن کی ہے؟ چنانچہ اس ایک آیت کی روشنی میں قرآن کے

علم الاخلاق پر ایک جامع کتاب تصنیف کی جاسکتی ہے۔ گویا اخلاقیاتِ قرآنی (Quranic Ethics) کے لیے یہ آیت جڑ اور بنیاد ہے۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ یہ آیت یہاں کیونکر آئی ہے۔ اس کے پس منظر میں بھی وہی تحویلِ قبلہ ہے۔ تحویلِ قبلہ کے بارے میں چار رکوع (۱۵ تا ۱۸) تو مسلسل ہیں۔ اس سے پہلے چودھویں رکوع میں آیت آئی ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ﴾ (آیت ۱۱۵) اِدھر بھی اٹھارہویں رکوع کے بعد اتنی آیتیں چھوڑ کر یہ آیت آ رہی ہے۔ فرمایا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾ ''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو''

اس عمل کے نیکی ہونے کی نفی نہیں کی گئی۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ کوئی نیکی ہی نہیں ہے۔ یہ بھی نیکی ہے۔ نیکی کا جو ظاہر ہے وہ بھی نیکی ہے' لیکن اصل شے اس کا باطن ہے۔ اگر باطن صحیح ہے تو حقیقت میں نیکی نیکی ہے' ورنہ نہیں۔

﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ﴾ ''بلکہ نیکی تو اُس کی ہے''

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ﴾ ''جو ایمان لائے اللہ پر' یومِ آخرت پر' فرشتوں پر' کتاب پر اور نبیوں پر۔''

سب سے پہلے نیکی کی جڑ بنیاد بیان کر دی گئی کہ یہ ایمان ہے' تاکہ تصحیحِ نیت ہو جائے۔ ایمانیات میں سب سے پہلے اللہ پر ایمان ہے۔ یعنی جو نیکی کر رہا ہے وہ صرف اللہ سے اجر کا طالب ہے۔ پھر قیامت کے دن پر ایمان کا ذکر ہوا کہ اس نیکی کا اجر دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں مطلوب ہے۔ ورنہ تو یہ سوداگری ہو گئی۔ اور آدمی اگر سوداگری اور دکانداری کرے تو دنیا کی چیزیں بیچے' دین تو نہ بیچے۔ دین کا کام کر رہا ہے تو اس کے لیے سوائے اُخروی نجات کے اور اللہ کی رضا کے کوئی اور شے مقصود نہ ہو۔ یومِ آخرت کے بعد فرشتوں' کتابوں اور انبیاء (علیہم السلام) پر ایمان کا ذکر کیا گیا۔ یہ تینوں مل کر ایک یونٹ بنتے ہیں۔ فرشتہ وحی کی صورت میں کتاب لے کر آیا' جو انبیاء کرامؑ پر نازل ہوئی۔ ایمان بالرسالت کا تعلق نیکی کے ساتھ یہ ہے کہ نیکی کا ایک مجسمہ' ایک ماڈل' ایک آئیڈیل ''اُسوۂ رسولؐ'' کی صورت میں انسانوں کے سامنے رہے۔ ایسا نہ ہو کہ اونچ نیچ ہو جائے۔ نیکیوں کے معاملے میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی جذبات میں ایک طرف کو نکل گیا اور کوئی دوسری طرف کو نکل گیا۔ اس گمراہی سے بچنے کی ایک ہی شکل ہے کہ ایک مکمل اُسوہ سامنے رہے' جس میں تمام چیزیں معتدل ہوں اور وہ اُسوہ ہمارے لیے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت ہے۔ نیکی کے ظاہر کے لیے ہم آپؐ ہی کو معیار سمجھیں گے۔ جو شے جتنی آپؐ کی سیرت میں ہے' اُس سے زیادہ نہ ہو اور اُس سے کم نہ ہو۔ کوشش یہ ہو کہ انسان بالکل رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ کاملہ کی پیروی کرے۔

﴿وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ﴾ ''اور وہ خرچ کرے مال اس کی محبت کے باوجود''

یعنی مال کی محبت کے علی الرغم۔ ''عَلٰى حُبِّهٖ'' میں ضمیر متصل اللہ کے لیے نہیں ہے بلکہ مال کے لیے ہے۔ مال اگرچہ محبوب ہے' پھر بھی وہ خرچ کر رہا ہے۔

﴿ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ﴾ ''قرابت داروں' یتیموں' محتاجوں' مسافروں اور مانگنے والوں پر اور گردنوں کے چھڑانے میں۔''

گویا نیکی کے مظاہر میں اوّلین مظہر انسانی ہمدردی ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو نیکی کا وجود نہیں ہے۔ عبادات کے انبار لگے ہوں مگر

دل میں شقاوت ہو' انسان کو حاجت میں دیکھ کر دل نہ پسیجے' کسی کو تکلیف میں دیکھ کر تجوری کی طرف ہاتھ نہ بڑھے' حالانکہ تجوری میں مال موجود ہو' تو یہ طرزِ عمل دین کی روح سے بالکل خالی ہے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۹۲) میں الفاظ آئے ہیں: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ ''تم نیکی کے مقام کو پہنچ ہی نہیں سکتے جب تک کہ خرچ نہ کرو اس میں سے جو تمہیں محبوب ہے''۔ یہ نہیں کہ جس شے سے طبیعت اکتا گئی ہو' جو کپڑے بوسیدہ ہو گئے ہوں وہ کسی کو دے کر حاتم طائی کی قبر پر لات ماردی جائے۔ جو شے خود کو پسند ہو' عزیز ہو' اگر اس میں سے نہیں دیتے تو تم نیکی کو پہنچ ہی نہیں سکتے۔

﴿وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ﴾ ''اور قائم کرے نماز اور ادا کرے زکوٰۃ۔''

حکمتِ دین ملاحظہ کیجیے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایمان اور انسانی ہمدردی کے بعد آیا ہے۔ اس لیے کہ روحِ دین ''ایمان'' ہے اور نیکی کے مظاہر میں سے مظہرِ اوّل انسانی ہمدردی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیجیے کہ یہاں ''زکوٰۃ'' کا علیحدہ ذکر کیا گیا ہے' جبکہ اس سے قبل ایتائے مال کا ذکر ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اِنَّ فِی الْمَالِ لَحَقًّا سِوَی الزَّکَاۃِ)) (۲۰) ''یقیناً مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔'' یعنی اگر کچھ لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس ہم نے اپنے مال میں سے زکوٰۃ نکال دی تو پورا حق ادا ہو گیا' تو یہ ان کی خام خیالی ہے' مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔ اور آپ ﷺ نے یہی مذکورہ بالا آیت پڑھی۔

ایمان اور انسانی ہمدردی کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ایمان کو تر و تازہ رکھنے کے لیے نماز ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴿۱۴﴾﴾ (طٰہٰ) ''نماز قائم کرو میری یاد کے لیے''۔ اور انسانی ہمدردی میں مال خرچ کرنے کے جذبے کو پروان چڑھانے اور برقرار رکھنے کے لیے زکوٰۃ ہے کہ اتنا تو کم سے کم دینا ہوگا' تاکہ بوتل کا منہ تو کھلے۔ اگر بوتل کا کارک نکل جائے گا تو اُمید ہے کہ اس میں سے کوئی شربت اور بھی نکل آئے گا۔ چنانچہ اڑھائی فیصد تو فرض زکوٰۃ ہے۔ جو یہ بھی نہیں دیتا وہ مزید کیا دے گا؟

﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ﴾ ''اور جو پورا کرنے والے ہیں اپنے عہد کو جب کوئی عہد کر لیں۔''

انسان نے سب سے بڑا عہد اپنے پروردگار سے کیا تھا جو ''عہدِ الست'' کہلاتا ہے' پھر شریعت کا عہد ہے جو ہم نے اللہ کے ساتھ کر رکھا ہے۔ پھر آپس میں جو بھی معاہدے ہوں ان کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ معاملاتِ انسانی سارے کے سارے معاہدات کی شکل میں ہیں۔ شادی بھی شوہر اور بیوی کے مابین ایک سماجی معاہدہ (social contract) ہے۔ شوہر کی بھی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں اور بیوی کی بھی کچھ ذمہ داریاں اور فرائض ہیں۔ شوہر کے بیوی پر حقوق ہیں' بیوی کے شوہر پر حقوق ہیں۔ پھر آجر اور مستاجر کا جو باہمی تعلق ہے وہ بھی ایک معاہدہ ہے۔ تمام بڑے بڑے کاروبار معاہدوں پر ہی چلتے ہیں۔ پھر ہمارا جو سیاسی نظام ہے وہ بھی معاہدوں پر مبنی ہے۔ تو اگر لوگوں میں ایک چیز پیدا ہو جائے کہ جو عہد کر لیا ہے اسے پورا کرنا ہے تو تمام معاملات سدھر جائیں گے' ان کی stream lining ہو جائے گی۔

﴿وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾ ''اور خاص طور پر صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف میں اور جنگ کی حالت میں۔''

یہ نیکی بدھ مت کے بھکشوؤں کی نیکی سے مختلف ہے۔ یہ نیکی باطل کو چیلنج کرتی ہے۔ یہ نیکی خانقاہوں تک محدود نہیں ہوتی' صرف

۲۰۔ سنن الترمذی' کتاب الزکاۃ' باب ما جاء ان فی المال حقا سوی الزکاۃ۔

انفرادی سطح تک محدود نہیں رہتی' بلکہ اللہ کو جو نیکی مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ اب باطل کا سر کچلنے کے لیے میدان میں آؤ۔ اور جب باطل کا سر کچلنے کے لیے میدان میں آؤ گے تو خود بھی تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ اس راہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں اور جانیں دینی پڑی ہیں۔ اللہ کا کلمہ سربلند کرنے کے لیے سینکڑوں صحابہ کرامؓ نے جامِ شہادت نوش کیا ہے۔ دنیا کے ہر نظامِ اخلاق میں ''خیرِ اعلیٰ'' (summum bonum) کا ایک تصور ہوتا ہے کہ سب سے اونچی نیکی کیا ہے! قرآن کی رو سے سب سے اعلیٰ نیکی یہ ہے کہ حق کے غلبے کے لیے' صداقت' دیانت اور امانت کی بالادستی کے لیے اپنی گردن کٹا دی جائے۔ وہ آیت یاد کر لیجیے جو چند رکوع پہلے ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴾ ''اور جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں (جامِ شہادت نوش کر لیں) انہیں مُردہ مت کہو' بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور حاصل نہیں ہے۔''

﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ جو سچے ہیں۔''

راست بازی اور نیکوکاری کا دعویٰ تو بہت سوں کو ہے' لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعوے میں سچے ہیں۔

﴿وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ ''اور یہی حقیقت میں متقی ہیں۔''

ہمارے ذہنوں میں نیکی اور تقویٰ کے کچھ اور نقشے بیٹھے ہوئے ہیں کہ شاید تقویٰ کسی مخصوص لباس اور خاص وضع قطع کا نام ہے۔ یہاں قرآن حکیم نے نیکی اور تقویٰ کی حامل انسانی شخصیت کا ایک ہیولا اور اس کے کردار کا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ اس کے باطن میں روحِ ایمان موجود ہے اور خارج میں اس ترتیب کے ساتھ دین کے یہ تقاضے اور نیکی کے یہ مظاہر موجود ہیں۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ' اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ (آمین یا ربّ العالمین)

اس کے بعد وہی جو انسانی معاملات ہیں ان پر بحث چلے گی۔ سورۃ البقرۃ کے نصف ثانی کے مضامین کے بارے میں یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ یہ گویا چار لڑیوں پر مشتمل ہیں' جن میں سے دو لڑیاں عبادات اور احکام و شرائع کی ہیں۔

آیت ۱۷۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ﴾ ''اے اہلِ ایمان! تم پر لازم کر دیا گیا ہے مقتولوں کا بدلہ لینا۔''

قَتْلٰى ''قَتِيْلٌ'' کی جمع ہے جس کے معنی مقتول کے ہیں۔ ''كُتِبَ'' کے بعد ''عَلٰى'' فرضیت کے لیے آتا ہے' یعنی تم پر یہ فرض کر دیا گیا ہے' اس معاملے میں سہل انگاری صحیح نہیں ہے۔ جب کسی معاشرے میں انسان کا خون بہانا عام ہو جائے تو تمدن کی جڑ کٹ جائے گی' لہٰذا قصاص تم پر واجب ہے۔

﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ﴾ ''آزاد آزاد کے بدلے''

اگر کسی آزاد آدمی نے قتل کیا ہے تو قصاص میں وہ آزاد ہی قتل ہوگا۔ یہ نہیں کہ وہ کہہ دے کہ میرا غلام لے جاؤ' یا میری جگہ میرے دو غلام لے جا کر قتل کر دو۔

﴿وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ ''اور غلام غلام کے بدلے''

اگر غلام قاتل ہے تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے گا۔

﴿وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ﴾ ''اور عورت عورت کے بدلے۔''

اگر قتل کرنے والی عورت ہے تو وہ عورت ہی قتل ہو گی۔ قصاص و دیت کے معاملے میں اسلام سے پہلے عرب میں مختلف معیارات قائم تھے۔ مثلاً اگر اوسی خزرجی کو قتل کر دے تو تین گنا خون بہا وصول کیا جائے گا اور خزرجی اوسی کو قتل کرے تو ایک تہائی خون بہا ادا کیا جائے گا۔ یہ ان کا قانون تھا۔ اسی طرح آزاد اور غلام میں بھی فرق روا رکھا جاتا تھا۔ لیکن شریعتِ اسلامی نے اس ضمن میں کامل مساوات قائم کی اور زمانۂ جاہلیت کی ہر طرح کی عدمِ مساوات کا خاتمہ کر دیا۔ اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول یہی ہے کہ تمام مسلمان آپس میں "کُفو" (برابر) ہیں لہٰذا قتل کے مقدمات میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔

﴿فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ﴾ "پھر جس کو معاف کر دی جائے کوئی شے اُس کے بھائی کی جانب سے"

یعنی مقتول کے ورثاء اگر قاتل کو کچھ رعایت دے دیں کہ ہم اس کی جان بخشی کرنے کو تیار ہیں، چاہے وہ خون بہا لے لیں، چاہے ویسے ہی معاف کر دیں، تو جو بھی خون بہا طے ہوا ہو اُس کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ﴾ "تو (اس کی) پیروی کی جائے معروف طریقے پر اور ادائیگی کی جائے خوبصورتی کے ساتھ۔"

﴿ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ﴾ "یہ تمہارے ربّ کی طرف سے ایک تخفیف اور رحمت ہے۔"

اس کا رحمت ہونا بہت واضح ہے۔ اگر یہ شکل نہ ہو تو پھر قتل در قتل کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ لیکن اگر قاتل کو لا کر مقتول کے ورثاء کے سامنے کھڑا کر دیا جائے کہ اب تمہارے ہاتھ میں اس کی جان ہے، تم چاہو تو اس کو قتل کر دیا جائے گا، اور اگر تم احسان کرنا چاہو اس کی جان بخشی کرنا چاہو تو تمہیں اختیار حاصل ہے۔ چاہو تو ویسے ہی بخش دو، چاہو تو خون بہا لے لو۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ دشمنیوں کا دائرہ سمٹ جاتا ہے، بڑھتا نہیں ہے۔ اس میں اللہ کی طرف سے بڑی رحمت ہے۔ اسلامی معاشرے میں قاتل کی گرفتاری اور قصاص کی تنفیذ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے، لیکن اس میں مدعی ریاست نہیں ہوتی۔ آج کل ہمارے نظام میں غلطی یہ ہے کہ ریاست ہی مدعی بن جاتی ہے، حالانکہ مدعی تو مقتول کے ورثاء ہیں۔ اسلامی نظام میں کسی صدر یا وزیر اعظم کو اختیار نہیں ہے کہ کسی قاتل کو معاف کر دے۔ قاتل کو معاف کرنے کا اختیار صرف مقتول کے ورثاء کو ہے، لیکن ہمارے ملکی دستور کی رو سے صدرِ مملکت کو سزائے موت معاف کرنے کا حق دیا گیا ہے۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾﴾ "تو اس کے بعد بھی جو حد سے تجاوز کرے گا تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

یعنی جو لوگ اس رعایت سے فائدہ اٹھانے کے بعد ظلم و زیادتی کا وطیرہ اپنائیں گے ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

آیت ۱۷۹ ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾﴾ "اور اے ہوشمندو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے، تاکہ تم بچ سکو۔"

معاشرتی زندگی میں عفو و درگزر اگرچہ ایک اچھی قدر ہے اور اسلام اس کی تعلیم دیتا ہے: ﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾﴾ (التغابن) "اور اگر تم معاف کر دیا کرو اور چشم پوشی سے کام لو اور بخش دیا کرو تو بے شک اللہ بھی بخشنے والا"

رحم کرنے والا ہے''۔ لیکن قتل کے مقدمات میں سہل انگاری اور چشم پوشی کو قصاص کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہیے' بلکہ شدت کے ساتھ پیروی ہونی چاہیے' تاکہ اس سے آگے قتل کا سلسلہ بند ہو۔ آیت کے آخر میں فرمایا: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ ''تاکہ تم بچ سکو''۔ یعنی اللہ کی حدود کی خلاف ورزی اور ایک دوسرے پر ظلم وتعدی سے بچو۔

آیت ۱۸۰ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ ''جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ کچھ مال چھوڑ رہا ہو تو تم پر فرض کر دیا گیا ہے والدین اور رشتہ داروں کے حق میں انصاف کے ساتھ وصیت کرنا''

ابھی قانونِ وراثت نازل نہیں ہوا تھا' اس ضمن میں یہ ابتدائی قدم اٹھایا گیا۔ دورِ جاہلیت میں وراثت کی تقسیم اس طرح ہوتی تھی' جیسے آج بھی ہندوؤں میں ہوتی ہے' کہ مرنے والے کی ساری جائیداد کا مالک بڑا بیٹا بن جاتا تھا۔ اس کی بیوی' بیٹیاں' حتیٰ کہ دوسرے بیٹے بھی وراثت سے محروم رہتے۔ چنانچہ یہاں وراثت کے بارے میں پہلا حکم دیا گیا کہ مرنے والا والدین اور اقرباء کے بارے میں وصیت کر جائے تاکہ ان کے حقوق کا تحفظ ہو سکے۔ پھر جب سورۃ النساء میں پورا قانونِ وراثت آ گیا تو اب یہ آیت منسوخ شمار ہوتی ہے۔ البتہ اس کے ایک جزو کو رسول اللہ ﷺ نے باقی رکھا ہے کہ مرنے والا اپنے ایک تہائی مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے' اس سے زیادہ نہیں' اور یہ کہ جس شخص کا وراثت میں حق مقرر ہو چکا ہے' اُس کے لیے وصیت نہیں ہوگی۔ وصیت غیر وارث کے لیے ہوگی۔ مرنے والا کسی یتیم کو' بیوہ کو' کسی یتیم خانہ کو یا کسی دینی ادارے کو اپنی وراثت میں سے کچھ دینا چاہے تو اسے حق حاصل ہے کہ ایک تہائی کی وصیت کر دے۔ باقی دو تہائی میں لازمی طور پر قانونی وراثت کی تنفیذ ہوگی۔

﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۸۰﴾ ''اللہ تعالیٰ کا تقویٰ رکھنے والوں پر یہ حق ہے۔''

ان پر واجب اور ضروری ہے کہ وہ وصیت کر جائیں کہ ہمارے والدین کو یہ مل جائے' فلاں رشتہ دار کو یہ مل جائے' باقی جو بھی ورثاء ہیں ان کے حصے میں یہ آ جائے۔

آیت ۱۸۱ ﴿فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَمَا سَمِعَهٗ﴾ ''تو جس نے بدل دیا اس وصیت کو اس کے بعد کہ اس کو سنا تھا''

﴿فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ﴾ ''تو اس کا گناہ ان ہی پر آئے گا جو اسے تبدیل کرتے ہیں۔''

وصیت کرنے والا ان کے اس گناہ سے بَری ہے' اُس نے تو صحیح وصیت کی تھی۔ اگر گواہوں نے بعد میں وصیت میں تحریف اور تبدیلی کی تو اُس کا وبال اور اس کا بوجھ ان ہی پر آئے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۸۱﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔''

آیت ۱۸۲ ﴿فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا﴾ ''پھر جس کو اندیشہ ہو کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے جانب داری یا حق تلفی کا''

اگر کسی کو یہ اندیشہ ہو اور دیانت داری کے ساتھ اس کی یہ رائے ہو کہ وصیت کرنے والے نے ٹھیک وصیت نہیں کی' بلکہ بے جا جانبداری کا مظاہرہ کیا ہے یا کسی کی حق تلفی کر کے گناہ کمایا ہے۔

﴿فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ﴾ ''اور وہ ان کے مابین صلح کرا دے''

اس طرح کے اندیشے کے بعد کسی نے ورثاء کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ دیکھو ان کی وصیت تو یہ تھی' لیکن اس میں یہ زیادتی والی بات ہے' اگر تم لوگ متفق ہو جاؤ تو اس میں اتنی تبدیلی کر دی جائے؟

﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ﴾ ''تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔''

یعنی ایسی بات نہیں ہے کہ اس وصیت کو ایسا تقدس حاصل ہو گیا کہ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی' بلکہ باہمی مشورے سے اور اصلاح کے جذبے سے وصیت میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۸۲﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝۱۸۳ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ وَعَلَي الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ۭ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۭ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۴ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝۱۸۶ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَاۗىِٕكُمْ ۭ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۭ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۱۸۷ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَا اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۸ ع

سورۃ البقرۃ کے نصفِ آخر کے مضامین کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ چار لڑیوں کی مانند ہیں جو آپس میں گُتھی ہوئی ہیں۔ اب ان میں سے عبادات والی لڑی آ رہی ہے اور زیر مطالعہ رکوع میں ''صوم'' کی عبادت کا تذکرہ ہے۔ جہاں تک ''صلوٰۃ'' (نماز) کا تعلق ہے تو اس کا ذکر مکی سورتوں میں بے تحاشا آیا ہے' لیکن مکی دور میں ''صوم'' کا بطور عبادت کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

عربوں کے ہاں صوم یا صیام کے لفظ کا اطلاق اور مفہوم کیا تھا اور اس سے وہ کیا مراد لیتے تھے' اسے ذرا سمجھ لیجیے! عرب خود تو روزہ نہیں رکھتے تھے' البتہ اپنے گھوڑوں کو رکھواتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر عربوں کا پیشہ غارت گری اور لوٹ مار تھا۔ پھر مختلف قبائل کے مابین وقفہ وقفہ سے جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کاموں کے لیے ان کو گھوڑوں کی ضرورت تھی اور گھوڑا اس مقصد کے لیے نہایت موزوں جانور تھا کہ اس پر بیٹھ کر تیزی سے جائیں' لوٹ مار کریں' شب خون ماریں اور تیزی سے واپس آ جائیں۔ اونٹ تیز رفتار جانور نہیں ہے' پھر وہ گھوڑے کے مقابلے میں تیزی سے اپنا رُخ بھی نہیں پھیر سکتا۔ مگر گھوڑا جہاں تیز رفتار جانور ہے' وہاں تنک مزاج اور نازک مزاج بھی ہے۔ چنانچہ وہ تربیت کے لیے ان گھوڑوں سے یہ مشقت کراتے تھے کہ ان کو بھوکا پیاسا رکھتے تھے اور ان کے مُنہ پر ایک ''توبڑا'' چڑھا دیتے تھے۔ اس عمل کو وہ ''صوم'' کہتے تھے اور جس گھوڑے پر یہ عمل کیا جائے اسے وہ ''صائم'' کہتے تھے' یعنی یہ روزہ سے ہے۔ اس طرح وہ گھوڑوں کو بھوک پیاس جھیلنے کا عادی بناتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مہم کے دوران گھوڑا بھوک پیاس برداشت نہ کر سکے اور جی ہار دے۔ اس طرح تو سوار کی جان شدید خطرے میں پڑ جائے گی اور اسے زندگی کے لالے پڑ جائیں گے! مزید یہ کہ عرب اس طور پر گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر موسم گرما اور لُو کی حالت میں انہیں لے کر میدان میں جا کھڑے ہوتے تھے۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے اپنے سروں پر ڈھاٹے باندھ کر اور جسم پر کپڑے وغیرہ لپیٹ کر اُن گھوڑوں کی پیٹھ پر سوار رہتے تھے اور ان گھوڑوں کا مُنہ سیدھا لُو اور بادِ صرصر کے تھپیڑوں کی طرف رکھتے تھے' تاکہ اُن کے اندر بھوک پیاس کے ساتھ ساتھ لُو کے ان تھپیڑوں کو برداشت کرنے کی عادت بھی پڑ جائے' تاکہ کسی ڈاکے کی مہم یا قبائلی جنگ کے موقع پر گھوڑا سوار کے قابو میں رہے اور بھوک پیاس یا بادِ صَرصَر کے تھپیڑوں کو برداشت کر کے سوار کی مرضی کے مطابق مطلوبہ رخ برقرار رکھے اور اس سے مُنہ نہ پھیرے۔ تو عرب اپنے گھوڑوں کو بھوکا پیاسا رکھ کر جو مشقت کراتے تھے اس پر وہ ''صوم'' کے لفظ یعنی روزہ کا اطلاق کرتے تھے۔

لیکن رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہود کے ہاں روزہ رکھنے کا رواج تھا۔ وہ عاشورہ کا روزہ بھی رکھتے تھے' اس لیے کہ اس روز بنی اسرائیل کو فرعونیوں سے نجات ملی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ابتداءً ہر مہینے ''ایامِ بیض'' کے تین روزے رکھنے کا حکم دیا۔ اس رکوع کی ابتدائی دو آیات میں غالباً اسی کی توثیق ہے۔ اگر ابتدا ہی میں پورے مہینے کے روزے فرض کر دیے جاتے تو وہ یقیناً شاق گزرتے۔ ظاہر بات ہے کہ مہینے سخت گرم بھی ہو سکتے ہیں۔ اب اگر تیس کے تیس روزے ایک ہی مہینے میں فرض کر دیے گئے ہوتے اور وہ جون جولائی کے ہوتے تو جان ہی تو نکل جاتی۔ چنانچہ بہترین تدبیر یہ کی گئی کہ ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا اور یہ روزے مختلف موسموں میں آتے رہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد رمضان کے روزے فرض کیے گئے۔ ہر مہینے میں تین دن کے روزوں کا جو ابتدائی حکم تھا اس میں علی الاطلاق یہ اجازت تھی کہ جو شخص یہ روزہ نہ رکھے وہ اس کا فدیہ دے' اگرچہ وہ بیمار یا مسافر نہ ہو اور روزہ رکھنے کی طاقت بھی رکھتا ہو۔ جب رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم آ گیا تو اب یہ رخصت ختم کر دی گئی۔ البتہ رسول اللہ ﷺ نے فدیہ کی اس رخصت کو ایسے شخص کے لیے باقی رکھا جو بہت بوڑھا ہے' یا کسی ایسی سخت بیماری میں مبتلا ہے کہ روزہ رکھنے سے اس کے لیے جان کی ہلاکت کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ یہ ہے ان آیات کی تاویل جس پر میں بہت عرصہ پہلے پہنچ گیا تھا' لیکن چونکہ اکثر مفسرین نے یہ بات نہیں لکھی اس لیے میں اسے بیان کرنے سے جھجکتا رہا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کی رائے یہی ہے تو مجھے اپنی رائے پر اعتماد ہو گیا۔ پھر مجھے اس کا ذکر تفسیر کبیر میں امام رازیؒ کے ہاں بھی مل گیا کہ متقدمین کے ہاں یہ رائے موجود ہے کہ روزے سے متعلق پہلی دو آیتیں (۱۸۳' ۱۸۴) رمضان کے روزے سے متعلق نہیں ہیں' بلکہ وہ ایامِ بیض کے روزوں سے متعلق ہیں۔ ایامِ بیض کے روزے رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد بھی نفلاً

رکھے ہیں۔

روزے کے احکام پر مشتمل یہ رکوع چھ آیتوں پر مشتمل ہے اور یہ اس اعتبار سے ایک عجیب مقام ہے کہ اس ایک جگہ روزے کا تذکرہ جامعیت کے ساتھ آ گیا ہے۔ قرآن مجید میں دیگر احکام بہت دفعہ آئے ہیں۔ نماز کے احکام بہت سے مقامات پر آئے ہیں۔ کہیں وضو کے احکام آئے ہیں تو کہیں تیمم کے' کہیں نمازِ قصر اور نمازِ خوف کا ذکر ہے۔ لیکن ''صوم'' کی عبادت پر یہ کُل چھ آیات ہیں' جن میں اس کی حکمت' اس کی غرض و غایت اور اس کے احکام سب کے سب ایک جگہ آ گئے ہیں۔ فرمایا:

آیت ۱۸۳ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ ''اے ایمان والو! تم پر بھی روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسے کہ فرض کیا گیا تھا تم سے پہلوں پر تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو جائے۔''

وہ جنگ کے لیے گھوڑے کو تیار کرواتے تھے' تمہیں تقویٰ کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا ہے۔ روزے کی مشق تم سے اس لیے کرائی جا رہی ہے تاکہ تم بھوک کو قابو میں رکھ سکو' شہوت کو قابو میں رکھ سکو' پیاس کو برداشت کر سکو۔ تمہیں اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلنا ہوگا' اس میں بھوک بھی آئے گی' پیاس بھی آئے گی۔ اپنے آپ کو جہاد و قتال کے لیے تیار کرو۔ سورۃ البقرۃ کے اگلے رکوع سے قتال کی بحث شروع ہو جائے گی۔ چنانچہ روزے کی یہ بحث گویا قتال کے لیے بطور تمہید آ رہی ہے۔

آیت ۱۸۴ ﴿ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾ ''گنتی کے چند دن ہیں۔''

''مَعْدُوْدٰت'' جمع قلت ہے' جو تین سے نو تک کے لیے آتی ہے۔ یہ گویا اس کا ثبوت ہے کہ یہاں مہینے بھر کے روزے مراد نہیں ہیں۔

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ ﴾ ''اس پر بھی جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو''

﴿ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ ''تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں۔''

﴿ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ﴾ ''اور جو اس کی طاقت رکھتے ہوں (اور وہ روزہ نہ رکھیں) اُن پر فدیہ ہے ایک مسکین کا کھانا کھلانا۔''

ان آیات کی تفسیر میں' جیسا کہ عرض کیا گیا' مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ میں نے اپنے مطالعے کے بعد جو رائے قائم کی ہے میں صرف وہی بیان کر رہا ہوں کہ اُس وقت امام رازیؒ کے بقول یہ فرضیت علی التعیین نہیں تھی بلکہ علی التخییر تھی۔ یعنی روزہ فرض تو کیا گیا ہے لیکن اس کا بدل بھی دیا جا رہا ہے کہ اگر تم روزہ رکھنے کی استطاعت کے باوجود نہیں رکھنا چاہتے تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دو۔ چونکہ روزے کے وہ پہلے سے عادی نہیں تھے' لہٰذا انہیں تدریجاً اس کا خوگر بنایا جا رہا تھا۔

﴿ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ﴾ ''اور جو اپنی مرضی سے کوئی خیر کرنا چاہے تو اُس کے لیے خیر ہے۔''

اگر کوئی روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلائے تو یہ اس کے لیے بہتر ہوگا۔

﴿ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾ ''اور روزہ رکھو' یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔''

یہاں بھی ایک طرح کی رعایت کا انداز ہے۔ یہ دو آیات ہیں جن میں میرے نزدیک روزے کا پہلا حکم دیا گیا' جس کے تحت

رسول اللہ ﷺ اور اہلِ ایمان نے ہر مہینے میں تین دن کے روزے رکھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان روزوں کا حکم رسول اللہ ﷺ نے اہلِ ایمان کو اپنے طور پر دیا ہو اور بعد میں ان آیات نے اس کی توثیق کر دی ہو۔

اب وہ آیات آ رہی ہیں جو خاص رمضان کے روزے سے متعلق ہیں۔ ان میں سے دو آیات میں روزے کی حکمت اور غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ پھر ایک طویل آیت روزہ کے احکام پر مشتمل ہے اور آخر میں ایک آیت گویا لٹمس ٹیسٹ ہے۔

آیت ۱۸۵ ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا''

﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾ ''لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر اور ہدایت اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کی روشن دلیلوں کے ساتھ۔''

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ﴾ ''تو جو کوئی بھی تم میں سے اس مہینے کو پائے (یا جو شخص بھی اس مہینے میں مقیم ہو) اس پر لازم ہے کہ روزہ رکھے۔''

اب وہ وجوب علی التخییر کا معاملہ ختم ہو گیا اور وجوب علی التعیین ہو گیا کہ یہ لازم ہے' یہ رکھنا ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ﴾ ''اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ تعداد پوری کر لے دوسرے دنوں میں۔''

یہ رعایت حسبِ سابق برقرار رکھی گئی۔

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ﴾ ''اللہ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ سختی نہیں چاہتا۔''

لوگ خواہ مخواہ اپنے اوپر سختیاں جھیلتے ہیں' شدید سفر کے اندر بھی روزے رکھتے ہیں' حالانکہ اللہ تعالیٰ نے دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنے کی اجازت دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک سفر میں ان لوگوں پر کافی سرزنش کی جنہوں نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ جہاد و قتال کے لیے نکلے تھے کہ کچھ لوگوں نے اس سفر میں بھی روزہ رکھ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سفر کے بعد جہاں منزل پر جا کر خیمے لگانے تھے وہ نڈھال ہو کر گر گئے اور جن لوگوں کا روزہ نہیں تھا انہوں نے خیمے لگائے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ)) (۲۱) ''سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں ہے''۔ لیکن ہمارا نیکی کا تصور مختلف ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ خواہ ۱۰۵ بخار چڑھا ہوا ہو وہ کہیں گے کہ روزہ تو میں نہیں چھوڑوں گا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی رعایت سے فائدہ نہ اٹھانا ایک طرح کا کفرانِ نعمت ہے۔

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ ''تاکہ تم تعداد پوری کرو''

مرض یا سفر کے دوران جو روزے چھوٹ جائیں تمہیں دوسرے دنوں میں ان کی تعداد پوری کرنی ہوگی۔ وہ جو ایک رعایت تھی کہ فدیہ دے کر فارغ ہو جاؤ وہ اب منسوخ ہو گئی۔

۲۱۔ صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب قول النبی ﷺ لمن ظلل علیه واشتد الحر لیس من البر الصوم فی السفر۔ واللفظ له۔ وفی روایة المسلم: ((لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ اَنْ تَصُوْمُوْا فِي السَّفَرِ)) کتاب الصیام' باب جواز السفر والفطر فی شهر رمضان للمسافر...

﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ ''اور تا کہ تم بڑائی کرو اللہ کی اس پر جو ہدایت اُس نے تمہیں بخشی ہے''

﴿وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵﴾ ''اور تا کہ تم شکر کر سکو۔''

وہ نعمتِ عظمیٰ جو قرآن حکیم کی شکل میں تمہیں دی گئی ہے' تم اس کا شکر ادا کرو۔ اس موضوع پر میرے دو کتابچوں ''عظمتِ صوم'' اور ''عظمتِ صیام و قیامِ رمضان مبارک'' کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ ان میں یہ سارے مضامین تفصیل سے آئے ہیں کہ روزے کی کیا حکمت ہے' کیا غرض و غایت ہے' کیا مقصد ہے اور آخری منزل کیا ہے۔ مطلوب تو یہ ہے کہ تمہارا یہ جو جسم حیوانی ہے' یہ کچھ کمزور پڑے اور روحِ ربانی جو تم میں پھونکی گئی ہے اسے تقویت حاصل ہو۔ چنانچہ دن میں روزہ رکھو اور اس حیوانی وجود کو ذرا کمزور کرو' اس کے تقاضوں کو دباؤ۔ پھر راتوں کو کھڑے ہو جاؤ اور اللہ کا کلام سنو اور پڑھو' تا کہ تمہاری روح کی آبیاری ہو' اس پر آبِ حیات کا ترشح ہو۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ خود تمہارے اندر سے تقرب الی اللہ کی ایک پیاس اُبھرے گی۔

آیت ۱۸۶ ﴿وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو (ان کو بتا دیجیے کہ) میں قریب ہوں۔''

میرے نزدیک یہ دنیا میں حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta) ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے۔ فصل اگر ہے تو وہ تمہاری اپنی خباثت ہے۔ اگر تمہاری نیت میں فساد ہے کہ حرام خوری تو کرنی ہی کرنی ہے تو اب کس مُنہ سے اللہ سے دعا کرو گے؟ لہٰذا کسی پیر کے پاس جاؤ گے کہ آپ دعا کر دیجیے' یہ نذرانہ حاضر ہے۔ بندے اور خدا کے درمیان خود انسان کا نفس حائل ہے اور کوئی نہیں' ورنہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ تو یہ ہے کہ: ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں راہ دکھلائیں کسے' راہ رو منزل ہی نہیں!

اُس تک پہنچنے کا واسطہ کوئی پوپ نہیں' کوئی پادری نہیں' کوئی پنڈت نہیں' کوئی پروہت نہیں' کوئی پیر نہیں۔ جب چاہو اللہ سے ہم کلام ہو جاؤ۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے: ؎

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے؟ پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اٹھا دو!

اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے کہ میرا ہر بندہ جب چاہے' جہاں چاہے مجھ سے ہم کلام ہو سکتا ہے۔

﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ﴾ ''میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے''

''اجابت'' کے مفہوم میں کسی کی پکار کا سننا' اس کا جواب دینا اور اسے قبول کرنا' یہ تینوں چیزیں شامل ہیں۔ لیکن اس کے لیے ایک شرط عائد کی جا رہی ہے:

﴿فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ﴾ ''پس انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں''

﴿وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ﴾ ''اور مجھ پر ایمان رکھیں''

یہ یک طرفہ بات نہیں ہے' بلکہ یہ دو طرفہ معاملہ ہے۔ جیسے ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ ''پس تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا'' تم میرا شکر کرو گے تو میں تمہاری قدر دانی کروں گا۔ تم میری طرف چل کر آؤ گے تو میں دوڑ کر آؤں گا۔ تم بالشت بھر آؤ گے تو میں ہاتھ بھر آؤں گا۔ لیکن اگر تم رُخ موڑ لو گے تو ہم بھی رُخ موڑ لیں گے۔ ہماری تو کوئی غرض نہیں ہے' غرض تو تمہاری ہے۔ تم

رجوع کرو گے تو ہم بھی رجوع کریں گے۔ تم توبہ کرو گے تو ہم اپنی نظرِ کرم تم پر متوجہ کر دیں گے۔ سورۂ محمدؐ میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ يَنۡصُرۡكُمۡ﴾ (آیت ۷) ''اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد کرے گا''۔ لیکن اگر تم اللہ کے دشمنوں کے ساتھ دوستی کی پینگیں بڑھاؤ' ان کے ساتھ تمہاری ساز باز ہو اور کھڑے ہو جاؤ قنوتِ نازلہ میں اللہ سے مدد مانگنے کے لیے تو تم سے بڑا بے وقوف کون ہوگا؟ پہلے اللہ کی طرف اپنا رُخ تو کرو' اللہ سے اپنا معاملہ تو درست کرو۔ اس میں یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ پہلے ولیٔ کامل بن جاؤ' بلکہ اسی وقت خلوصِ نیت سے توبہ کرو' سارے پردے ہٹ جائیں گے۔ آیت کے آخر میں فرمایا:

﴿لَعَلَّهُمۡ يَرۡشُدُوۡنَ ۝۱۸۶﴾ ''تاکہ وہ صحیح راہ پر رہیں۔''

اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے اور اس کے احکام پر چلنے کا یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ رشد و ہدایت کی راہ پر گامزن ہو جائیں گے۔

آیت ۱۸۷ ﴿اُحِلَّ لَكُمۡ لَيۡلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمۡ ؕ﴾ ''حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لیے روزے کی راتوں میں بے حجاب ہونا اپنی بیویوں سے۔''

احکامِ روزہ سے متعلق یہ آیت بڑی طویل ہے۔ یہود کے ہاں شریعتِ موسوی میں روزہ شام کو ہی شروع ہو جاتا تھا اور رات بھی روزے میں شامل تھی۔ چنانچہ تعلقِ زن و شو بھی قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے ہاں سحری وغیرہ کا بھی کوئی تصور نہیں تھا۔ جیسے ہی رات کو سوتے روزہ شروع ہو جاتا اور اگلے دن غروبِ آفتاب تک روزہ رہتا۔ ہمارے ہاں روزے میں نرمی کی گئی ہے۔ ایک تو یہ کہ رات کو روزے سے خارج کر دیا گیا۔ روزہ بس دن کا ہے اور رات کے وقت روزے کی ساری پابندیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ رات کو تعلقِ زن و شو بھی قائم کیا جا سکتا ہے اور کھانے پینے کی بھی اجازت ہے۔ لیکن بعض مسلمان یہ سمجھ رہے تھے کہ شاید ہمارے ہاں بھی روزے کے وہی احکام ہیں جو یہود کے ہاں ہیں۔ اس لیے ایسا بھی ہوتا تھا کہ روزوں کی راتوں میں بعض لوگ جذبات میں بیویوں سے مقاربت کر لیتے تھے' لیکن دل میں سمجھتے تھے کہ شاید ہم نے غلط کام کیا ہے۔ یہاں اب ان کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ تمہارے لیے روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں کے پاس جانا حلال کر دیا گیا ہے۔

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ﴾ ''وہ پوشاک ہیں تمہارے لیے اور تم پوشاک ہو اُن کے لیے۔''

یہ بڑا لطیف کنایہ ہے کہ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس ہو۔ جیسے لباس میں اور جسم میں کوئی پردہ نہیں ایسے ہی بیوی میں اور شوہر میں کوئی پردہ نہیں ہے۔ خود لباس ہی تو پردہ ہے۔ ویسے بھی مرد کے اخلاق کی حفاظت کرنے والی بیوی ہے اور بیوی کے اخلاق کی حفاظت کرنے والا مرد ہے۔ مجھے اقبال کا شعر یاد آ گیا: ؎

نے پردہ نہ تعلیم' نئی ہو کہ پرانی نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

بہر حال مرد و عورت ایک دوسرے کے لیے ایک ضرورت بھی ہیں اور ایک دوسرے کی پردہ پوشی بھی کرتے ہیں۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمۡ كُنۡتُمۡ تَخۡتَانُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ﴾ ''اللہ کے علم میں ہے کہ تم اپنے آپ کے ساتھ خیانت کر رہے تھے''

تم ایک کام کر رہے تھے جو گناہ نہیں ہے' لیکن تم سمجھتے تھے کہ گناہ ہے' پھر بھی اس کا ارتکاب کر رہے تھے۔ اس طرح تم اپنے آپ سے خیانت کے مرتکب ہو رہے تھے۔

﴿فَتَابَ عَلَيۡكُمۡ﴾ ''تو اللہ نے تم پر نظرِ رحمت فرمائی''

﴿وَعَفَا عَنۡكُمۡ ۚ﴾ ''اور تمہیں معاف کر دیا۔''

اس سلسلے میں جو بھی خطائیں ہوگئی ہیں وہ سب کی سب معاف سمجھو۔

﴿فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ﴾ ''تو اب تم ان کے ساتھ تعلقِ زن وشو قائم کرو''

﴿وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ﴾ ''اور تلاش کرو اس کو جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے۔''

یعنی اولاد جو تعلقِ زن وشو کا اصل مقصد ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس تعلقِ زن وشو کو سکون وراحت کا ذریعہ بنایا ہے۔ جیسے قرآن مجید میں ﴿لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا﴾ کے الفاظ آئے ہیں۔ اس تعلق کے بعد اعصاب کے تناؤ میں ایک سکون کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اس میں یہی حکمت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ہر سفر میں ایک زوجۂ محترمہ کو ضرور ساتھ رکھتے تھے۔ اس لیے کہ قائد اور سپہ سالار کو کسی وقت کسی ایسی پریشان کن صورت حال میں فیصلے کرنے پڑتے ہیں کہ جذبات پر اور اعصاب پر دباؤ ہوتا ہے۔

﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۡ﴾ ''اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ واضح ہوجائے تمہارے لیے فجر کی سفید دھاری (رات کی) سیاہ دھاری سے۔''

یہ پو پھٹنے کے لیے استعارہ ہے۔ یعنی جب سپیدۂ سحر نمایاں ہوتا ہے' صبح صادق ہوتی ہے اُس وقت تک کھانے پینے کی چھوٹ ہے۔ بلکہ یہاں ﴿وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾ ''اور کھاؤ اور پیو'' امر کے صیغے آئے ہیں۔ سحری کرنے کی حدیث میں بھی تاکید آئی ہے اور رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہمارے اور یہود کے روزے کے مابین سحری کا فرق ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے: ((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِي السَّحُوْرِ بَرَكَةً)) (۲۲) ''سحری ضرور کیا کرو' اس لیے کہ سحری میں برکت ہے۔''

﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ﴾ ''پھر رات تک روزے کو پورا کرو۔''

''رات تک'' سے اکثر فقہاء کے نزدیک غروبِ آفتاب مراد ہے۔ اہلِ تشیع اس سے ذرا آگے جاتے ہیں کہ غروبِ آفتاب پر چند منٹ مزید گزر جائیں۔

﴿وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ۭ﴾ ''اور ان سے مباشرت مت کرو جبکہ تم مسجدوں میں حالتِ اعتکاف میں ہو۔''

یہ رعایت جو تمہیں دی جارہی ہے اس میں ایک استثناء ہے کہ جب تم مسجدوں میں معتکف ہو تو پھر اپنی بیویوں سے رات کے دوران بھی کوئی تعلق قائم نہ کرو۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ۭ﴾ ''یہ اللہ کی (مقرر کی ہوئی) حدود ہیں' پس ان کے قریب بھی مت جاؤ۔''

بعض مقامات پر آتا ہے: ﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا﴾ ''یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' پس ان سے تجاوز نہ کرو' ان کو عبور نہ کرو۔ اصلاً حرام تو وہی شے ہوگی کہ حدود سے تجاوز کیا جائے۔ لیکن بہرحال احتیاط اس میں ہے کہ ان حدود سے دور رہا جائے (to keep at a safe distance) آخری حد تک چلے جاؤ گے تو اندیشہ ہے کہ کہیں اس حد کو عبور نہ کر جاؤ۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ﴾ ''اسی طرح اللہ واضح کرتا ہے اپنی نشانیاں لوگوں کے لیے''

۲۲۔ صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب برکة السحور من غیر ایجاب۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل السحور...

﴿لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ ''تا کہ وہ تقویٰ کی روش اختیار کر سکیں۔''

اب اس رکوع کی آخری آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ تقویٰ کا معیار اور اس کی کسوٹی کیا ہے۔ روزہ اس لیے فرض کیا گیا ہے اور یہ سارے احکام تمہیں اسی لیے دیے جا رہے ہیں تا کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو جائے —— اور تقویٰ کا ٹیسٹ ہے ''اکلِ حلال''۔ اگر یہ نہیں ہے تو کوئی نیکی نیکی نہیں ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۸۸ ﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ''اور تم اپنے مال آپس میں باطل طریقوں سے ہڑپ نہ کرو''

﴿وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ﴾ ''اور اس کو ذریعہ نہ بناؤ حکام تک پہنچنے کا''

﴿لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ﴾ ''تا کہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ ہڑپ کر سکو گناہ کے ساتھ''

﴿وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور تم اس کو جانتے بوجھتے کر رہے ہو۔''

یہ تقویٰ کے لیے معیار اور کسوٹی ہے۔ جو شخص اکلِ حلال پر قانع ہو گیا اور حرام خوری سے بچ گیا وہ متقی ہے۔ ورنہ نمازوں اور روزوں کے انبار کے ساتھ ساتھ جو شخص حرام خوری کی روش اختیار کیے ہوئے ہے وہ متقی نہیں ہے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ احکام کی آیات کے درمیان یہ آیت کیونکر آئی ہے۔ اس سے پہلے روزے کے احکام آئے ہیں' آگے حج کے احکام آ رہے ہیں' پھر قتال کے احکام آئیں گے۔ ان کے درمیان میں اس آیت کی کیا حکمت ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ جیسے روزے کی حکمت کا نقطۂ عروج یہ ہے کہ روحِ انسانی میں تقرب الی اللہ کی طلب پیدا ہو جائے اسی طرح احکامِ صوم کا نقطۂ عروج ''اکلِ حلال'' ہے۔

آیات ۱۸۹ تا ۱۹۶

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ

حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۪ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ ع ۲۳ ۸

آیت ۱۸۹ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے پوچھ رہے ہیں چاند کی گھٹتی بڑھتی صورتوں کے بارے میں۔''

﴿قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ؕ﴾ ''کہہ دیجیے یہ لوگوں کے لیے اوقات کا تعین ہے اور حج کے لیے ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ نے ایک کیلنڈر رائج کا دیا ہے۔ ہلال کو دیکھ کر معلوم ہو گیا کہ چاند کی پہلی تاریخ ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد نصف چاند دیکھ کر پتا چل گیا کہ اب ایک ہفتہ گزر گیا ہے۔ دو ہفتے ہو گئے تو پورا چاند ہو گیا۔ اب اس نے گھٹنا شروع کیا۔ تو یہ نظام گویا لوگوں کے لیے اوقاتِ کار کی تعیین کے لیے ہے اور اس ضمن میں خاص طور پر سب سے اہم معاملہ حج کا ہے۔ یہ نوٹ کیجیے کہ صوم کے بعد حج اور حج کے ساتھ ہی قتال کا ذکر آ رہا ہے۔ اس لیے کہ ''حج'' وہ عبادت ہے جو ایک خاص جگہ پر ہو سکتی ہے۔ نماز اور روزہ ہر جگہ ہو سکتے ہیں' زکوٰۃ ہر جگہ دی جا سکتی ہے' لیکن ''حج'' تو مکہ مکرمہ ہی میں ہو گا' اور وہ مشرکین کے زیر تسلط تھا اور اسے مشرکین کے تسلط سے نکالنے کے لیے قتال لازم تھا۔ قتال کے لیے پہلے صبر کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ پہلے روزے کا حکم دیا گیا کہ جیسے اپنے گھوڑوں کو روزہ رکھواتے تھے ایسے ہی خود روزہ رکھو۔ سورۃ البقرۃ میں صوم' حج اور قتال کے احکام کے درمیان یہ ترتیب اور ربط ہے۔

﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ﴾ ''اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کی پشت کی طرف سے داخل ہو' بلکہ نیکی تو اُس کی ہے جس نے تقویٰ اختیار کیا۔''

اہلِ عرب ایامِ جاہلیت میں بھی حج تو کر رہے تھے' مناسکِ حج کی کچھ بگڑی ہوئی شکلیں بھی موجود تھیں' اور اس کے ساتھ انہوں نے کچھ بدعات و رسوم کا اضافہ بھی کر لیا تھا۔ ان میں سے ایک بدعت یہ تھی کہ جب وہ احرام باندھ کر گھر سے نکل پڑتے تو اس کے بعد اگر انہیں گھروں میں داخل ہونے کی ضرورت پیش آتی تو گھروں کے دروازوں سے داخل نہ ہوتے بلکہ پچھواڑے سے دیوار پھاند کر آتے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ بڑا تقویٰ ہے۔ فرمایا یہ سرے سے کوئی نیکی کی بات نہیں ہے کہ تم گھروں میں ان کے پچھواڑوں سے داخل ہو' بلکہ اصل نیکی تو اس کی نیکی ہے جو تقویٰ کی روش اختیار کرے اور حدودِ الٰہی کا احترام ملحوظ رکھے۔ یہاں پوری ''آیۃ البر'' کو ذہن میں رکھ لیجیے جس کے آخر میں الفاظ آئے تھے: ﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ چنانچہ آیت زیر مطالعہ میں ﴿وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ﴾ کے الفاظ میں نیکی کا وہ پورا تصور مضمر ہے جو آیۃ البر میں بیان ہو چکا ہے۔

﴿وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪﴾ ''اور گھروں میں داخل ہو اُن کے دروازوں سے۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

آیت ۱۹۰ ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ ''اور قتال کرو اللہ کی راہ میں اُن سے جو تم سے قتال کر رہے ہیں''

لیجیے قتال کا حکم آ گیا۔ سورۃ البقرۃ کے نصف ثانی کے مضامین کی جو چار لڑیاں میں نے گنوائی تھیں — یعنی عبادات' معاملات' انفاق اور قتال — یہ ان میں سے چوتھی لڑی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کی راہ میں ان سے قتال کرو جو تم سے قتال کر رہے ہیں۔

﴿وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ﴾ ''لیکن حد سے تجاوز نہ کرو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

آیت ۱۹۱ ﴿وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ ''اور انہیں قتل کرو جہاں کہیں بھی انہیں پاؤ''

﴿وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ ''اور نکالو ان کو وہاں سے جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے''

مہاجرین مکہ مکرمہ سے نکالے گئے تھے' وہاں پر محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی اہلِ ایمان پر قافیہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا۔ تبھی تو آپؐ نے ہجرت کی۔ اب حکم دیا جا رہا ہے کہ نکالو انہیں وہاں سے جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔

﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ﴾ ''اور فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر ہے۔''

کفار و مشرکین سے قتال کے ضمن میں کہیں یہ خیال نہ آئے کہ قتل اور خونریزی بُری بات ہے۔ یاد رکھو کہ فتنہ اس سے بھی زیادہ بُری بات ہے۔ فتنہ کیا ہے؟ ایسے حالات جن میں انسان خدائے واحد کی بندگی نہ کر سکے' اسے غلط کاموں پر مجبور کیا جائے' وہ حرام خوری پر مجبور ہو گیا ہو' یہ سارے حالات فتنہ ہیں۔ تو واضح رہے کہ قتل اور خونریزی اتنی بُری شے نہیں ہے جتنی فتنہ ہے۔

﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ﴾ ''ہاں مسجدِ حرام کے پاس (جسے امن کی جگہ بنا دیا گیا ہے) اُن سے جنگ مت کرو جب تک وہ تم سے اس میں جنگ نہ چھیڑیں۔''

﴿فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ﴾ ''پھر اگر وہ تم سے جنگ کریں تو اُن کو قتل کرو۔''

﴿كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾﴾ ''یہی بدلہ ہے کافروں کا۔''

آیت ۱۹۲ ﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾﴾ ''پھر اگر وہ باز آ جائیں تو یقیناً اللہ بخشنے والا بہت مہربان ہے۔''

آیت ۱۹۳ ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ﴾ ''اور لڑو اُن سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔''

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾﴾ ''پھر اگر وہ باز آ جائیں تو کوئی زیادتی جائز نہیں ہے مگر ظالموں پر۔''

دعوتِ محمدی ﷺ کے ضمن میں اب یہ جنگ کا مرحلہ شروع ہو گیا ہے۔ مسلمان نوجوان لو' ایک دَور وہ تھا کہ بارہ تیرہ برس تک تمہیں حکم تھا ﴿كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ ''اپنے ہاتھ باندھے رکھو!'' ماریں کھاؤ لیکن ہاتھ مت اٹھانا۔ اب تمہاری دعوت اور تحریک نئے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ اب جب تمہاری تلواریں نیام سے باہر آ گئی ہیں تو یہ نیام میں نہ جائیں جب تک کہ فتنہ بالکل ختم نہ ہو جائے اور دین اللہ ہی کے لیے ہو جائے' اللہ کا دین قائم ہو جائے' پوری زندگی میں اس کے احکام کی تنفیذ ہو رہی ہو۔ یہ آیت دوبارہ سورۃ الانفال میں زیادہ نکھری ہوئی شان کے ساتھ آئی ہے: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (آیت ۳۹) ''اور جنگ کرو اُن سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ کے لیے ہو جائے''۔ دین کی بالادستی جزوی طور پر نہیں بلکہ کُلی طور پر

پوری انسانی زندگی پر قائم ہو جائے' انفرادی زندگی پر بھی اور اجتماعی زندگی پر بھی۔ اور اجتماعی زندگی کے بھی سارے پہلو (Politico-Socio-Economic System) کُلّی طور پر اللہ کے احکام کے تابع ہوں۔

آیت ۱۹۴ ﴿اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ﴾ ''حرمت والا مہینہ بدلہ ہے حرمت والے مہینے کا''

﴿وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ﴾ ''اور حرمات کے اندر بھی بدلہ ہے۔''

یعنی اگر انہوں نے اَشہرِ حُرم کی بے حرمتی کی ہے تو اُس کے بدلے میں یہ نہیں ہوگا کہ ہم تو ہاتھ پر ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں کہ یہ تو اَشہرِ حُرم ہیں۔ حدودِ حرم اور اَشہرِ حُرم کی حرمت اہلِ عرب کے ہاں مسلّم تھی۔ ان کے ہاں یہ طے تھا کہ ان چار مہینوں میں کوئی خونریزی' کوئی جنگ نہیں ہوگی' یہاں تک کہ کوئی اپنے باپ کے قاتل کو پالے تو وہ اس کو بھی قتل نہیں کرے گا۔ یہاں وضاحت کی جا رہی ہے کہ اَشہرِ حُرم اور حدودِ حرم میں جنگ واقعتاً بہت بڑا گناہ ہے' لیکن اگر کُفّار کی طرف سے ان کی حرمت کا لحاظ نہ رکھا جائے اور وہ اقدام کریں تو اب یہ نہیں ہوگا کہ ہاتھ پاؤں باندھ کر اپنے آپ کو پیش کر دیا جائے' بلکہ جوابی کارروائی کرنا ہوگی۔ اس جوابی اقدام میں اگر حدودِ حرم یا اَشہرِ حُرم کی بے حرمتی کرنی پڑے تو اس کا وبال بھی ان پر آئے گا جنہوں نے اس معاملے میں پہل کی۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠﴾ ''تو جو کوئی بھی تم پر زیادتی کرتا ہے تو تم بھی اس کے خلاف کارروائی کرو (اقدام کرو) جیسے کہ اس نے تم پر زیادتی کی۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۹۴﴾ ''اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔''

یعنی اللہ کی تائید و نصرت اور اس کی مدد اہلِ تقویٰ کے لیے آئے گی۔ اب آگے ''انفاق'' کا حکم آ رہا ہے جو مضامین کی چار لڑیوں میں سے تیسری لڑی ہے۔ قتال کے لیے انفاقِ مال لازم ہے۔ اگر فوج کے لیے ساز و سامان نہ ہو' رسد کا اہتمام نہ ہو' ہتھیار نہ ہوں' سواریاں نہ ہوں تو جنگ کیسے ہوگی؟

آیت ۱۹۵ ﴿وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ﴾ ''اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور مت ڈالو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں۔''

یعنی جس وقت اللہ کے دین کو روپے پیسے کی ضرورت ہو اُس وقت جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے جی چراتے ہیں وہ اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر عام اپیل کی اور اُس وقت جو لوگ اپنے مال کو سمیٹ کر بیٹھے رہے تو گویا انہوں نے اپنے آپ کو خود ہلاکت میں ڈال دیا۔

﴿وَاَحْسِنُوْا ۛ﴾ ''اور احسان کی روش اختیار کرو۔''

اپنے دین کے اندر خوبصورتی پیدا کرو۔ دین میں بہتر سے بہتر مقام حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ دنیا میں آگے سے آگے اور دین میں پیچھے سے پیچھے رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دین میں یہ دیکھیں گے کہ کم سے کم پر گزارا ہو جائے' جبکہ دنیا کے معاملے میں آگے سے آگے نکلنے کی کوشش ہوگی ع ''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!'' یہ جستجو دنیا میں ہے اس سے کہیں بڑھ کر دین میں ہونی چاہیے' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ ''پس تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے

کی کوشش کرو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ محسنین کو (ان لوگوں کو جو درجۂ احسان پر فائز ہو جائیں) پسند کرتا ہے۔''

حدیثِ جبریلؑ (جسے اُمّ السُّنّۃ کہا جاتا ہے) میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین سوال کیے تھے: (۱) اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِسْلَامِ ''مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے (کہ اسلام کیا ہے؟) (۲) اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ ''مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے (کہ ایمان کیا ہے؟)'' (۳) اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ ''مجھے احسان کے بارے میں بتائیے (کہ احسان کیا ہے؟) احسان کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ، فَاِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) (۲۳) ''(احسان یہ ہے) کہ تُو اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے کرے گویا تُو اسے دیکھ رہا ہے' پھر اگر تُو اسے نہ دیکھ سکے (یعنی یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے) تو (کم از کم یہ خیال رہے کہ) وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے''۔ دین کے سارے کام' عبادات' انفاق اور جہاد و قتال ایسی کیفیت میں اور ایسے اخلاص کے ساتھ ہوں گویا تم اپنی آنکھوں سے اللہ کو دیکھ رہے ہو' اور اگر یہ مقام اور کیفیت حاصل نہ ہو تو کم سے کم یہ کیفیت تو ہو جائے کہ تمہیں مستحضر رہے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہ احسان ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ اس انداز میں نہیں کیا گیا۔ اس کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ ویسے یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ سورۃ المائدۃ میں آئے گا۔

آیت ۱۹۶ ﴿وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ﴾ ''اور حج اور عمرہ مکمل کرو اللہ کے لیے۔''

عمرہ کے لیے احرام تو مدینہ منورہ سے سات میل باہر نکل کر ہی باندھ لیا جائے گا' لیکن حج مکمل تب ہو گا جب طواف بھی ہو گا' وقوفِ عرفہ بھی ہو گا اور اس کے سارے مناسک ادا کیے جائیں گے۔ لہٰذا جو شخص بھی حج یا عمرہ کی نیت کر لے تو پھر اسے تمام مناسک کو مکمل کرنا چاہیے' کوئی کمی نہ رہے۔

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ﴾ ''پھر اگر تمہیں گھیر لیا جائے''

یعنی روک دیا جائے' جیسا کہ ۶ ہجری میں ہوا کہ مسلمانوں کو صلح حدیبیہ کرنی پڑی اور عمرہ ادا کیے بغیر واپس جانا پڑا۔ مشرکینِ مکہ اڑ گئے تھے کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔

﴿فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ﴾ ''تو جو کوئی بھی قربانی میسر ہو وہ پیش کر دو۔''

یہ دمِ احصار کہلاتا ہے کہ چونکہ اب ہم آگے نہیں جا سکتے' ہمیں یہیں احرام کھولنا پڑ رہا ہے تو ہم اللہ کے نام پر یہ جانور دے رہے ہیں۔ یہ ایک طرح سے اس کا کفارہ ہے۔

﴿وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ﴾ ''اور اپنے سر اُس وقت تک نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔''

یعنی جہاں جا کر قربانی کا جانور ذبح ہونا ہے وہاں پہنچ نہ جائے۔ اگر آپ کو حج یا عمرہ سے روک دیا گیا اور آپ نے قربانی کے جانور آگے بھیج دیے تو آپ کو روکنے والے ان جانوروں کو نہیں روکیں گے' اس لیے کہ ان کا گوشت تو انہیں کھانے کو ملے گا۔ اب اندازہ کر لیا جائے کہ اتنا وقت گزر گیا ہے کہ قربانی کا جانور اپنے مقام پر پہنچ گیا ہو گا۔

۲۳۔ صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام والاحسان۔

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ﴾ ''پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو'' یعنی سر میں کوئی زخم وغیرہ ہو اور اُس کی وجہ سے بال کٹوانے ضروری ہو جائیں۔

﴿فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ﴾ ''تو وہ فدیہ کے طور پر روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی کرے۔'' اگر اس ہدی کے جانور کے کعبہ پہنچنے سے پہلے پہلے تمہیں اپنے بال کاٹنے پڑیں تو فدیہ ادا کرنا ہوگا۔ یعنی ایک کمی جو رہ گئی ہے اس کی تلافی کے لیے کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کفارے کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں: روزے یا صدقہ یا قربانی۔ اس کی وضاحت احادیثِ نبویہ سے ہوتی ہے کہ یا تو تین دن کے روزے رکھے جائیں' یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا کم از کم ایک بکری کی قربانی دی جائے۔ اس قربانی کو دمِ جنایت کہتے ہیں۔

﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۪﴾ ''پھر جب تمہیں امن حاصل ہو (اور تم سیدھے بیت اللہ پہنچ سکتے ہو)''

﴿فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ﴾ ''تو جو کوئی بھی فائدہ اٹھائے عمرے کا حج سے قبل تو وہ قربانی پیش کرے جو بھی اسے میسر ہو۔''

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے اہلِ عرب کے ہاں ایک سفر میں حج اور عمرہ دونوں کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ ان کے نزدیک یہ کعبہ کی توہین تھی۔ ان کے ہاں حج کے لیے تین مہینے شوال' ذوالقعدہ اور ذوالحجہ تھے' جبکہ رجب کا مہینہ عمرے کے لیے مخصوص تھا۔ وہ عمرے کے لیے علیحدہ سفر کرتے اور حج کے لیے علیحدہ۔ یہ بات حدودِ حرم میں رہنے والوں کے لیے تو آسان تھی' لیکن اس اُمت کو تو پوری دنیا میں پھیلنا تھا اور دور دراز سے سفر کر کے آنے والوں کے لیے اس میں مشقت تھی۔ لہٰذا شریعتِ محمدیؐ میں لوگوں کے لیے جہاں اور آسانیاں پیدا کی گئیں وہاں حج وعمرہ کے ضمن میں یہ آسانی بھی پیدا کی گئی کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں کو جمع کر لیا جائے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے عمرہ کر کے احرام کھول دیا جائے اور پھر آٹھویں ذوالحجہ کو حج کا احرام باندھ لیا جائے۔ یہ ''حج تمتع'' کہلاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ حج کے لیے احرام باندھا تھا' جاتے ہی عمرہ بھی کر لیا' لیکن احرام کھولا نہیں اور اسی احرام میں حج بھی کر لیا۔ یہ ''حج قران'' کہلاتا ہے۔ لیکن اگر شروع ہی سے صرف حج کا احرام باندھا جائے اور عمرہ نہ کیا جائے تو یہ ''حج افراد'' کہلاتا ہے۔ قران یا تمتع کرنے والے پر قربانی ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اسے دمِ شکر کہتے ہیں اور قربانی کرنے والے کو اس میں سے کھانے کی اجازت دیتے ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک یہ دمِ جبر ہے اور قربانی کرنے والے کو اس میں سے کھانے کی اجازت نہیں ہے۔

﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ﴾ ''جس کو قربانی نہ ملے تو وہ تین دن کے روزے ایامِ حج میں رکھے'' یعنی عین ایامِ حج میں ساتویں' آٹھویں اور نویں ذوالحجہ کو روزہ رکھے۔ دسویں کا روزہ نہیں ہو سکتا' وہ عید کا دن (یوم النحر) ہے۔

﴿وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ﴾ ''اور سات روزے رکھو جبکہ تم واپس پہنچ جاؤ۔'' اپنے گھروں میں جا کر سات روزے رکھو۔

﴿تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ﴾ ''یہ کُل دس (روزے) ہوں گے۔''

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ﴾ ''یہ (رعایت) اس کے لیے ہے جس کے گھر والے

مسجد حرام کے قریب نہ رہتے ہوں۔''

یعنی ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ کو جمع کرنے کی رعایت' خواہ تمتع کی صورت میں ہو یا قران کی صورت میں' صرف آفاقی کے لیے ہے' جس کے اہل وعیال جوارِ حرم میں نہ رہتے ہوں' یعنی جو حدودِ حرم کے باہر سے حج کرنے آیا ہو۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿١٩٦﴾﴾ ''اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بھی بہت سخت ہے۔''

آیات ۱۹۷ تا ۲۰۳

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَ اتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿١٩٧﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَ اذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّاۗلِّيْنَ ﴿١٩٨﴾ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَ اسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٩٩﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَاۗءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَ اللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَ مَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٢٠٣﴾

پچھلے رکوع سے مناسکِ حج کا تذکرہ شروع ہو چکا ہے۔ اب اس پچیسویں رکوع میں حج کا اصل فلسفہ' اس کی اصل حکمت اور اس کی اصل روح کا بیان ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۹۷ ﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ﴾ ''حج کے معلوم مہینے ہیں۔''

یعنی عرب میں جو بھی پہلے سے رواج چلا آ رہا تھا اُس کی توثیق فرما دی گئی کہ واقعی حج کے مواقیت کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ﴾ ''تو جس نے اپنے اوپر لازم کر لیا ان مہینوں میں حج کو''

لازم کرنے سے مراد حج کا عزم اور نیت پختہ کرنا ہے اور اس کی علامت احرام باندھ لینا ہے۔

﴿فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۭ﴾ ''تو (اس کو خبردار رہنا چاہیے کہ) دورانِ حج نہ تو شہوت کی کوئی بات کرنی ہے' نہ فسق و فجور کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی۔''

زمانۂ حج میں جن باتوں سے روکا گیا ہے ان میں اوّلین یہ ہے کہ شہوت کی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے۔ میاں بیوی بھی اگر ساتھ

حج کر رہے ہوں تو احرام کی حالت میں ان کے لیے وہی قید ہے جو اعتکاف کی حالت میں ہے۔ باقی یہ کہ فسوق و جدال یعنی اللہ کی نافرمانی اور باہم لڑائی جھگڑا تو ویسے ہی ناجائز ہے' دورانِ حج اس سے خاص طور پر روک دیا گیا۔ اس لیے کہ بہت بڑی تعداد میں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے' سفر میں بھی لوگ ساتھ ہوتے ہیں۔ اس حالت میں لوگوں کے غصّوں کے پارے جلدی چڑھ جانے کا امکان ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سے خاص طور پر روکا گیا تاکہ مناسکِ حج کی ادائیگی کے دوران امن اور سکون ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ آج بھی یہ بات معجزات میں سے ہے کہ دنیا بھر سے اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کے جمع ہونے کے باوجود وہاں امن و سکون رہتا ہے اور جنگ و جدال اور جھگڑا و فساد وغیرہ کہیں نظر نہیں آتا۔ مجھے الحمدللہ پانچ چھ مرتبہ حج کی سعادت حاصل ہوئی ہے' لیکن وہاں پر جھگڑا اور گالم گلوچ کی کیفیت میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ﴾ ''اور نیکی کے جو کام بھی تم کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے۔''

حج کے دوران مناسکِ حج پر مستزاد جو بھی نیکی کے کام کر سکو' مثلاً نوافل پڑھو یا اضافی طواف کرو تو تمہاری یہ نیکیاں اللہ کے علم میں ہوں گی' کسی اور کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫﴾ ''اور زادِ راہ ساتھ لے لیا کرو' یقیناً بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔''

اس کے دو معنی لیے گئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ یعنی سفرِ حج میں مادی زادِ راہ کے علاوہ تقویٰ کی پونجی بھی ضروری ہے۔ اگر آپ نے اخراجاتِ سفر کے لیے روپیہ پیسہ تو وافر لے لیا' لیکن تقویٰ کی پونجی سے تہی دامن رہے تو دورانِ حج اچھی سہولیات تو حاصل کر لیں گے مگر حج کی روح اور اس کی برکات سے محروم رہیں گے۔

لیکن اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی بہت اہم ہے کہ اگر انسان خود اپنا زادِ راہ ساتھ نہ لے تو پھر وہاں دوسروں سے مانگنا پڑتا ہے۔ اس طرح یہاں ''تقویٰ'' سے مراد سوال سے بچنا ہے۔ یعنی بہتر یہ ہے کہ زادِ راہ لے کر چلو تاکہ تمہیں کسی کے سامنے سائل نہ بننا پڑے۔ اگر تم صاحبِ استطاعت نہیں ہو تو حج تم پر فرض ہی نہیں ہے۔ اور ایک شے جو تم پر فرض نہیں ہے اس کے لیے خواہ مخواہ وہاں جا کر بھیک مانگنا یا یہاں سے بھیک مانگ کر یا چندہ اکٹھا کر کے جانا قطعاً غلط حرکت ہے۔

﴿وَاتَّقُوْنِ يٰۤاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾﴾ ''اور میرا ہی تقویٰ اختیار کرو اے ہوش مندو!''

آیت ۱۹۸ ﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ ''تم پر اس امر میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم (سفرِ حج کے دوران) اپنے ربّ کا فضل بھی تلاش کرو۔''

آدمی ہندوستان سے یا پاکستان سے حج کے لیے جا رہا ہے اور وہ اپنے ساتھ کچھ ایسی اجناس لے جائے جنہیں وہاں پر بیچ کر کچھ نفع حاصل کر لے تو یہ تقویٰ کے منافی نہیں ہے۔

﴿فَاِذَاۤ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۪﴾ ''پس جب تم عرفات سے واپس لوٹو تو اللہ کو یاد کرو مشعرِ حرام کے نزدیک۔''

وقوفِ عرفات حج کا رکنِ اعظم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلْحَجُّ عَرَفَةُ)) (۲۴) یعنی اصل حج تو عرفہ ہی ہے۔ اگر کسی سے حج کے باقی تمام مناسک رہ جائیں' صرف قیامِ عرفہ میں شمولیت ہو جائے تو اس کا حج ہو گیا' باقی جو چیزیں رہ گئی ہیں ان کا

۲۴۔ سنن الترمذی' کتاب الحج' باب ما جاء فیمن ادرک الامام بجمع فقد ادرک الحج۔

کفارہ ادا کیا جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص عرفات کے قیام میں ہی شریک نہیں ہوا تو پھر اس کا حج نہیں ہوا۔ ایامِ حج کا ٹائم ٹیبل نوٹ کیجیے کہ ۸ ذوالحجہ کو مکہ مکرمہ سے نکل کر رات منیٰ میں گزارنا ہوتی ہے۔ اگلا دن ۹ ذوالحجہ یومِ عرفہ ہے۔ اس روز صبح کو عرفات کے لیے قافلے چلتے ہیں اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ دوپہر سے پہلے وہاں پہنچ جایا جائے۔ وہاں پر ظہر کے وقت ظہر اور عصر دونوں نمازیں ملا کر پڑھی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سے غروبِ آفتاب تک عرفات کا قیام ہے' جس میں کوئی نماز نہیں۔ یعنی روایتی عبادت کے سب دروازے بند ہیں۔ اب تو صرف دعا ہے۔ اگر آپ کے اندر دعا کی ایک روح پیدا ہو چکی ہے' آپ اپنے ربّ سے ہم کلام ہو سکتے ہیں اور آپ کو حلاوتِ مناجات حاصل ہو گئی ہے تو بس دعا مانگتے رہیے۔ قیامِ عرفہ کے دوران کھڑے ہو کر یا بیٹھے ہوئے' جس طرح بھی ہو اللہ سے مناجات کی جائے۔ یا اس میں اگر کسی وجہ سے کمی ہو جائے تو آدمی تلاوت کرے۔ لیکن عام نماز اب کوئی نہیں۔ ۹ ذوالحجہ کو وقوفِ عرفات کے بعد مغرب کی نماز کا وقت ہو چکنے کے بعد عرفات سے روانگی ہے' لیکن وہاں مغرب کی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔ بلکہ اب مزدلفہ میں جا کر مغرب اور عشاء دونوں نمازیں جمع کر کے ادا کرنی ہیں اور رات وہیں کھلے آسمان تلے بسر کرنی ہے۔ یہ مزدلفہ کا قیام ہے۔ مشعرِ حرام ایک پہاڑ کا نام ہے جو مزدلفہ میں واقع ہے۔

﴿وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ﴾ ''اور یاد کرو اُسے جیسے کہ اُس نے تمہیں ہدایت کی ہے۔''

یعنی اللہ کا ذکر کرو جس طرح اللہ نے تمہیں اپنے رسول ﷺ کے ذریعے سکھایا ہے۔ ذکر کے جو طور طریقے رسول اللہ ﷺ نے سکھائے ہیں انہیں اختیار کرو اور زمانۂ جاہلیت کے طریقے ترک کر دو۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿۱۹۸﴾﴾ ''اور یقیناً اس سے پہلے تو تم گمراہ لوگوں میں سے تھے۔''

تم حج کی حقیقت سے ناواقف تھے۔ حج کی بس شکل باقی رہ گئی تھی' اس کی روح ختم ہو گئی تھی' اس کے مناسک میں بھی ردّوبدل کر دیا گیا تھا۔

آیت ۱۹۹ ﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ ''پھر تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے سب لوگ پلٹتے ہیں''

زمانۂ جاہلیت میں قریشِ مکہ عرفات تک نہ جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری خاص حیثیت ہے' لہٰذا ہم منیٰ ہی میں مقیم رہیں گے' باہر سے آنے والے لوگ عرفات جائیں اور وہاں سے طواف کے لیے واپس لوٹیں' یہ سارے مناسک ہمارے لیے نہیں ہیں۔ یہاں فرمایا گیا کہ یہ ایک غلط بات ہے جو تم نے ایجاد کر لی ہے۔ تم بھی وہیں سے طواف کے لیے واپس لوٹو جہاں سے دوسرے لوگ لوٹتے ہیں' یعنی عرفات سے۔

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ﴾ ''اور اللہ سے استغفار کرتے رہو۔''

اپنی اگلی تقصیر پر نادم ہو اور اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت چاہو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۹﴾﴾ ''یقیناً اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

آیت ۲۰۰ ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ﴾ ''اور جب تم اپنے مناسکِ حج ادا کر چکو''

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ﴾ ''تو اب اللہ کا ذکر کرو جیسے کہ تم اپنے آباء و اجداد کا ذکر کرتے رہے ہو''

﴿اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ﴾ ''بلکہ اس سے بھی زیادہ شد و مد کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو۔''

یعنی دسویں ذوالحجہ کو جب افعالِ حج سے فراغت پا چکو تو قیامِ منیٰ کے دوران اللہ کا خوب ذکر کرو جیسے زمانۂ جاہلیت میں اپنے آباء واَجداد کا ذکر کیا کرتے تھے' بلکہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر اللہ کا ذکر کرو۔ ان کا قدیم دستور تھا کہ حج سے فارغ ہو کر تین دن منیٰ میں قیام کرتے اور بازار لگاتے۔ وہاں میلے کا سا سماں ہوتا جہاں مختلف قبائل کے شعراء اپنے قبیلوں کی مدح سرائی کرتے تھے اور اپنے اسلاف کی عظمت بیان کرتے تھے۔ اللہ کا ذکر ختم ہو چکا تھا۔ فرمایا کہ جس شدومد کے ساتھ تم اپنے آباء واَجداد کا ذکر کرتے رہے ہو اب اسی انداز سے' بلکہ اُس سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو۔

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾﴾ ''لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو یہی کہتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے ربّ! ہمیں دنیا ہی میں دے دے' اور ایسے لوگوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔''

یعنی ارضِ حرم میں پہنچ کر دورانِ حج بھی اُن کی ساری دُعائیں دُنیوی چیزوں ہی کے لیے ہیں۔ چنانچہ وہ مال کے لیے' اولاد کے لیے' ترقی کے لیے' دُنیوی ضروریات کے لیے اور اپنی مشکلات کے حل کے لیے دعا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں دنیا رَچی بسی ہوئی ہے۔ جیسے بنی اسرائیل کے دلوں میں بچھڑے کا تقدس اور اس کی محبت جاگزیں کر دی گئی تھی اُسی طرح ہمارے دلوں میں دنیا کی محبت گھر کر چکی ہے' لہٰذا وہاں جا کر بھی دنیا ہی کی دعائیں مانگتے ہیں۔ یہاں واضح فرما دیا گیا کہ ایسے لوگوں کے لیے پھر آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

آیت ۲۰۱ ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ﴾ ''اور اُن میں سے وہ بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں''

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾﴾ ''پروردگار! ہمیں اس دنیا میں بھی خیر عطا فرما اور آخرت میں بھی خیر عطا فرما اور ہمیں بچا لے آگ کے عذاب سے۔''

یہی وہ دعا ہے جو طواف کے ہر چکر میں رکنِ یمانی سے حجرِ اسود کے درمیان چلتے ہوئے مانگی جاتی ہے۔ دنیا کا سب سے بڑا خیر ایمان اور ہدایت ہے۔ دنیا کا کوئی خیر خیر نہیں ہے جب تک کہ اس کے ساتھ ہدایت اور ایمان نہ ہو۔ چنانچہ سب سے پہلے انسان ہدایت' ایمان اور استقامت طلب کرے' پھر اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دنیا میں کشادگی اور رزق میں کشائش کی دعا بھی کرے تو یہ بات پسندیدہ ہے۔

آیت ۲۰۲ ﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ﴾ ''ان ہی لوگوں کے لیے حصہ ہوگا اُس میں سے جو انہوں نے کمایا۔''

یہ الفاظ بہت اہم ہیں۔ محض دعا کافی نہیں ہو جائے گی' بلکہ اپنا عمل بھی ضروری ہے۔ یہاں پر یہ جو فرمایا کہ ''ان کے لیے حصہ ہے اُس میں سے جو انہوں نے کمایا'' اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں سے کیوں؟ وہ تو سارا ملنا چاہیے! لیکن نہیں' بندے کو اپنے اعمال پر غرّہ نہیں ہونا چاہیے' اسے ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں کسی مسئلے میں میری نیت میں فساد نہ آ گیا ہو' ممکن ہے میرے کسی عمل کے اندر کوئی کمی یا کوتاہی ہو گئی ہو۔ اس لیے یہ نہ سمجھ لیں کہ جو کچھ بھی کیا ہے اس کا اجر لازماً ملے گا۔ جو کچھ انہوں نے کمایا ہے اُس میں اگر خلوص ہے' ریا کاری نہیں ہے' اس کے تمام آداب اور شرائط ملحوظ رکھے گئے ہیں تو اُن کو ان کا حصہ ملے گا۔

﴿وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾﴾ ''اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کو حساب چکانے میں دیر نہیں لگتی' وہ بہت جلدی حساب کر لے گا۔ اب تو ہمارے لیے یہ سمجھ لینا کچھ مشکل نہیں رہا ہمارے ہاں کمپیوٹرز پر کتنی جلدی حساب ہو جاتا ہے' اللہ کے ہاں تو پتا نہیں کیسا سُپر کمپیوٹر ہو گا کہ اسے حساب نکالنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگے گی!

آیت ۲۰۳ ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ﴾ ''اور ذکر کرو اللہ کا گنتی کے چند دنوں میں۔''

اس سے مراد ذوالحجہ کی گیارہویں' بارہویں اور تیرہویں تاریخیں ہیں جن میں یوم نحر کے بعد منیٰ میں قیام کیا جاتا ہے۔ ان تین دنوں میں کنکریاں مارنے کے وقت اور ہر نماز کے بعد تکبیر کہنے کا حکم ہے۔ دیگر اوقات میں بھی ان دنوں میں تکبیر اور ذکرِ الٰہی کثرت سے کرنا چاہیے۔

﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ﴾ ''تو جو کوئی دو دن ہی میں جلدی سے واپس آ جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔''

یعنی جو کوئی تین دن پورے نہیں کرتا' بلکہ دو دن ہی میں واپسی اختیار کر لیتا ہے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

﴿وَمَنْ تَاَخَّرَ﴾ ''اور جو پیچھے رہے''

یعنی منیٰ میں ٹھہرا رہے اور تین دن کی مقدار پوری کرے۔

﴿فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ﴾ ''تو اس پر بھی کوئی گناہ نہیں' بشرطیکہ وہ تقویٰ اختیار کرے۔''

اصل چیز تقویٰ ہے۔ جو کوئی زمانۂ حج میں پرہیزگاری کی روش اختیار کیے رکھے تو اس پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں کہ منیٰ میں دو دن قیام کرے یا تین دن۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا اجر محفوظ ہے۔ اگر کسی شخص نے منیٰ میں قیام تو تین دن کا کیا' لیکن تیسرے دن اُس نے کچھ اور ہی حرکتیں شروع کر دیں' اس لیے کہ جی اکتایا ہوا ہے اور طبیعت کے اندر ٹھہراؤ نہیں ہے تو وہ تیسرا دن اس کے لیے کچھ خاص مفید ثابت نہیں ہو گا۔ اصل شے جو اللہ کے ہاں قبولیت کے لیے شرطِ لازم ہے' وہ تقویٰ ہے۔ آگے پھر فرمایا:

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور خوب جان رکھو کہ یقیناً تمہیں اُسی کی جانب جمع کر دیا جائے گا۔''

تم سب کے سب ہانک کر اُسی کی جناب میں لے جائے جاؤ گے۔

آیات ۲۰۴ تا ۲۱۰

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۴ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۲۰۶ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ

مُّبِيْنٍ ﴿۲۰۹﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۱۰﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع

آیت ۲۰۴ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''اور لوگوں میں سے کوئی شخص ایسا بھی ہے جس کی باتیں تمہیں بہت اچھی لگتی ہیں دنیا کی زندگی میں''

یہ منافقین میں سے ایک خاص گروہ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ منافقین میں سے بعض تو ایسے تھے کہ ان کی زبانوں پر بھی نفاق واضح طور پر ظاہر ہو جاتا تھا' جبکہ منافقین کی ایک قسم وہ تھی کہ بڑے چاپلوس اور چرب زبان تھے۔ ان کی گفتگو ایسی ہوتی تھی گویا وہ تو بڑے ہی مخلص اور بڑے ہی فدا کار ہیں۔ اپنا موقف اس انداز سے پیش کرتے کہ یوں لگتا تھا کہ بڑی ہی نیک نیتی پر مبنی ہے' لیکن ان کا کردار انتہائی گھناؤنا تھا۔ ان کی ساری بھاگ دوڑ رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی مخالفت کی راہ میں ہوتی تھی۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ بعض لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کی باتیں دنیا کی زندگی میں تمہیں بہت اچھی لگتی ہیں۔

﴿وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰي مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ﴾ ''اور وہ اللہ کو بھی گواہ ٹھہراتا ہے اپنے دل کی بات پر۔''

اس کا اندازِ کلام یہ ہوتا ہے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اللہ جانتا ہے کہ خلوص سے کہہ رہا ہوں' پوری نیک نیتی سے کہہ رہا ہوں۔ منافق کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو قابلِ اعتبار ثابت کرنے کے لیے بات بات پر قسم کھاتا ہے۔

﴿وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾﴾ ''حالانکہ فی الواقع وہ شدید ترین دشمن ہے۔''

آیت ۲۰۵ ﴿وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ﴾ ''اور جب وہ پیٹھ پھیر کر جاتا ہے تو زمین میں بھاگ دوڑ کرتا ہے''

﴿لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ﴾ ''تاکہ اس میں فساد مچائے اور کھیتی اور نسل کو تباہ کرے۔''

یہ لوگ جب آپ ﷺ کے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد مچائیں اور لوگوں کی کھیتیاں اور جانیں تباہ و برباد کریں۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کو فساد بالکل پسند نہیں ہے۔''

آیت ۲۰۶ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ ''اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو جھوٹی عزتِ نفس اس کو گناہ پر اور جما دیتی ہے''

جب ایسے شخص سے کہا جاتا ہے کہ تم اللہ کا خوف کرو' اللہ سے ڈرو' تم باتیں ایسی خوبصورت کرتے ہو اور عمل تمہارا اتنا گھناؤنا ہے' ذرا سوچو تو سہی' تو اُس کو اپنی جھوٹی اَنا اور عزتِ نفس گناہ پر اور جما دیتی ہے۔ ایک شخص وہ ہوتا ہے جس سے خطا ہو گئی تو اُس نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور اپنی اصلاح کر لی۔ جبکہ ایک شخص وہ ہے جس کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ میں کیسے مان لوں کہ میری غلطی ہے؟ اس کی جھوٹی اَنا اور جھوٹی عزتِ نفس اسے گناہ سے ہٹنے نہیں دیتی بلکہ مزید آمادہ کرتی ہے۔

﴿فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ﴾ ''سو اُس کے لیے جہنم کافی ہے۔''

﴿وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾﴾ ''اور یقیناً وہ بُرا ٹھکانہ ہے۔''

روایات میں آتا ہے کہ منافقینِ مدینہ میں ایک شخص اخنس بن شُریق تھا' یہ اُس کا کردار بیان ہوا ہے۔ شانِ نزول کے اعتبار سے یہ بات ٹھیک ہے اور تاویلِ خاص میں اس کو بھی سامنے رکھا جائے گا' لیکن درحقیقت یہ ایک کردار ہے جو آپ کو ہر جگہ ملے گا۔ اصل میں اس کردار کو پہچاننا چاہیے اور اس کے حوالے سے اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کرنی چاہیے کہ اس کردار سے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

آیت ۲۰۷ ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور لوگوں میں ایک شخص وہ ہے جو بیچ دیتا ہے اپنی جان کو اللہ کی رضا کے لیے۔''

قرآن کا یہ عام اسلوب ہے کہ کرداروں کا فوری تقابل (simultaneous contrast) کرتا ہے۔ چنانچہ ایک ناپسندیدہ کردار کے ذکر کے فوراً بعد پسندیدہ کردار کا ذکر کیا گیا کہ لوگوں میں سے وہ بھی ہیں جو اپنے آپ کو اللہ کی رضا جوئی کے لیے تج دیتے ہیں اور اپنا تن من دھن قربان کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام) ﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾﴾ ''اور اللہ اپنے ایسے بندوں کے حق میں بہت شفیق ہے۔''

جس شخص نے اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنا سب کچھ تج دینے کا ارادہ کر لیا ہو' نیت کر لی ہو' اُس سے بھی کبھی کوئی کوتاہی ہو سکتی ہے' کبھی جذبات میں آ کر کوئی غلط قدم اٹھ سکتا ہے۔ اپنے ایسے بندوں کو اللہ تعالیٰ بڑی شفقت اور مہربانی کے ساتھ معاف فرمائے گا۔

آیت ۲۰۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠﴾ ''اے اہلِ ایمان! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے۔''

اہلِ ایمان سے اب وہ بات کہی جا رہی ہے جس کا معکوس (converse) ہم بنی اسرائیل سے خطاب کے ذیل میں (آیت ۸۵ میں) پڑھ چکے ہیں: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ﴾ ''کیا تم ہماری کتاب (اور دین و شریعت) کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو ردّ کر دیتے ہو؟ سو جو کوئی بھی تم میں سے یہ روش اختیار کریں ان کی کوئی سزا اس کے سوا نہیں ہے کہ دنیا میں ذِلّت و خواری ان پر مسلّط کر دی جائے اور قیامت کے دن ان کو شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے۔''

اب مثبت پیرائے میں مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ کی اطاعت میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ —— تحفظات (reservations) اور استثناءات (exceptions) کے ساتھ نہیں۔ یہ طرزِ عمل نہ ہو کہ اللہ کی بندگی تو کرنی ہے' مگر فلاں معاملے میں نہیں۔ اللہ کا حکم تو ماننا ہے لیکن یہ حکم میں نہیں مان سکتا۔ اللہ کے احکام میں سے کسی ایک کی نفی سے کُل کی نفی ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ جزوی اطاعت قبول نہیں کرتا۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ﴾ ''اور شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی نہ کرو۔''

﴿اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۲۰۸﴾﴾ ''وہ تو یقیناً تمہارا بڑا کھلا دشمن ہے۔''

آیت ۲۰۹ ﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ ''پھر اگر تم پھسل گئے اس کے بعد بھی کہ تمہارے پاس یہ واضح تعلیمات آ چکی ہیں''

﴿فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۰۹﴾﴾ ''تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

اس میں تہدید اور دھمکی کا پہلو ہے کہ پھر اللہ کی پکڑ بھی بہت سخت ہوگی۔ اور پھر یہ کہ وہ حکیم بھی ہے' اس کی پکڑ میں بھی حکمت ہے' اگر اس کی طرف سے پکڑ کا معاملہ نہ ہو تو پھر دین کا پورا نظام بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے کسی گناہ پر پکڑ ہی نہیں ہے تو پھر یہ آزمائش کیا ہوئی؟ پھر جزا و سزا اور جنت و دوزخ کا معاملہ کیا ہوا؟

آیت ۲۱۰ ﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ۭ﴾ ''کیا یہ اسی کا انتظار کر رہے ہیں کہ آ جائے ان پر اللہ تعالیٰ بادلوں کے سائبانوں میں اور فرشتے اور فیصلہ چکا دیا جائے؟''

یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح احکامات اور تنبیہات آ جانے کے بعد بھی کج روی سے باز نہیں آتے تو کیا وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنا جلال دکھائے اور فرشتوں کی افواج قاہرہ کے ساتھ ظاہر ہو کر ان کا حساب چکا دے؟

انسان کا نفس اسے ایک تو یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ دین کے اس حصے پر تو آرام سے عمل کرتے رہو جو آسان ہے' باقی پھر دیکھا جائے گا۔ گویا ''میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو''۔ دوسری پٹی یہ پڑھاتا ہے کہ ٹھیک ہے یہ بھی اللہ کا حکم ہے اور دین کا بھی تقاضا ہے' لیکن ابھی ذرا ذمہ داریوں سے فارغ ہو جائیں' ابھی ذرا بچوں کے معاملات ہیں' بچے برسرِ روزگار ہو جائیں' بچیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں' میں ریٹائرمنٹ لے لوں اور اپنا مکان بنا لوں' پھر میں اپنے آپ کو دین کے لیے خالص کر لوں گا۔ یہ نفس کا سب سے بڑا دھوکہ ہے۔ اس طرح وقت گزرتے گزرتے انسان موت کی وادی میں چلا جاتا ہے۔ کیا معلوم موت کی گھڑی کب آ جائے! یہ مہلتِ عمر تو اچانک ختم ہو سکتی ہے۔ پوری دنیا کی قیامت بھی جب آئے گی اچانک آئے گی اور ہر شخص کی ذاتی قیامت تو اُس کے سر پر تلوار کی طرح لٹکی ہوئی ہے۔ از روئے حدیثِ نبویؐ: ((مَنْ مَّاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهٗ))[۲۵] ''جو مر گیا اس کی قیامت تو آ گئی!'' تو کیا تمہارے پاس کوئی گارنٹی ہے کہ یہ سارے کام کر لو گے اور یہ سارے کام کر چکنے کے بعد زندہ رہو گے اور تمہارے جسم میں توانائی کی کوئی رمق بھی باقی رہ جائے گی کہ دین کا کوئی کام کر سکو؟ تو پھر تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو؟ ہو سکتا ہے اچانک اللہ کی طرف سے مہلت ختم ہو جائے۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾﴾ ''اور یقیناً تمام معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔''

آیات ۲۱۱ تا ۲۱۶

سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ ۭ وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۣ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۠ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۭ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ

۲۵۔ تخریج الکشاف للزیلعی ۴۳۶/۱ وتخریج الاحیاء للعراقی ۷۹/۴' سلسلة الاحادیث الضعیفة للالبانی' ح ۱۱۶۶' راوی انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾

آیت ۲۱۱ ﴿سَلْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۭ بَيِّنَةٍ ؕ﴾ ''پوچھ لو بنی اسرائیل سے، ہم نے انہیں کتنی روشن نشانیاں دیں۔''

یعنی اے مسلمانو! دیکھو کہیں تم بھی ان ہی کے راستے پر نہ چلنا۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ فرمایا تھا:

((لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَذِرَاعًا بِذِرَاعٍ ،حَتّٰى لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ)) قُلْنَا : يَارَسُوْلَ اللّٰهِ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ : ((فَمَنْ؟)) (۲۶)

''تم لازماً اپنے سے پہلوں کے طور طریقوں کی پیروی کرو گے بالشت کے مقابلے میں بالشت اور ہاتھ کے مقابلے میں ہاتھ۔ یہاں تک کہ اگر وہ گوہ کے بل میں گھسے ہوں گے تو تم بھی گھس کر رہو گے''۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہود و نصاریٰ کی؟ آپؐ نے فرمایا: ''تو اور کس کی؟''

﴿وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾﴾ ''اور جو کوئی بدل ڈالے اللہ کی نعمت کو بعد اس کے کہ وہ اس کے پاس آ گئی ہو تو (وہ جان لے کہ) اللہ سزا دینے میں بھی سخت ہے۔''

جو کوئی اللہ کی نعمت کو پانے کے بعد اس میں تبدیلی کرتا ہے، یا اس میں تحریف کرتا ہے یا خود غلط روش اختیار کرتا ہے تو اس کو جان لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس طرزِ عمل پر بہت سخت سزا دیتا ہے۔ بنی اسرائیل ہی کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ قرآن حکیم میں ان سے دو مرتبہ فرمایا گیا: ﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (البقرۃ:۴۷ و ۱۲۲) ''اے بنی اسرائیل! یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ میں نے تمہیں فضیلت عطا کی تمام اہلِ عالم پر''۔ لیکن پھر ان ہی کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ۗ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۶۱) ''اور اُن پر ذلت و خواری اور محتاجی و کم ہمتی تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے''۔ اور یہ مضمون بھی سورۂ آلِ عمران میں دوبارہ آئے گا۔

۲۶۔ صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ماذکر عن بنی اسرائیل۔ و صحیح مسلم، کتاب العلم، باب اتباع سنن الیھود و النصاری۔

آیت ﴿ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ﴾ ''ان کافروں کے لیے دنیا کی زندگی بڑی مزین کر دی گئی ہے''

یہاں کی چمک دمک اور شان وشوکت ان کے لیے بڑی محبوب و دل پسند بنا دی گئی ہے۔ ویسے تو نئے ماڈل کی لمبی لمبی چمکیلی کاریں' اونچی اونچی عمارتیں اور وسیع وعریض کوٹھیاں کس کو اچھی نہیں لگتیں' لیکن کفار کے دلوں میں مال واسبابِ دُنیوی کی محبت اتنی گھر کر جاتی ہے کہ پھر کوئی اچھی بات ان کی زندگی میں نہیں رہتی' اور نہ ہی کوئی اچھی بات ان کے اوپر اثر کرتی ہے۔ اہلِ ایمان کو بھی اگر ایمان کے ساتھ یہ نعمتیں ملیں تو یہ مستحسن ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ﴾ (الاعراف:۳۲) ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے) کہیے' کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کھانے پینے کی پاکیزہ چیزیں؟'' اچھا کھانا' اچھا پینا' اچھا پہننا حرام نہیں ہے۔ اللہ نے اس کو لوگوں کے لیے ممنوع نہیں کیا۔ ایک مسلمان دین کے تقاضے ادا کر کے' اللہ کا حق ادا کر کے اور حلال سے کما کر ان چیزوں کو حاصل کرے تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ وہ حدیث بھی ذہن میں لے آیئے: ((اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ))[۲۷] ''دنیا مؤمن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے باغ ہے۔''

﴿وَيَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ﴾ ''اور وہ مذاق اڑاتے ہیں اہلِ ایمان کا۔''

ایسے لوگ ایمان کی راہ اختیار کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں کہ ذرا ان پاگلوں کو' ان بے وقوفوں کو' ان fanatics کو دیکھو' جنہیں اپنے نفع ونقصان کا کچھ ہوش نہیں ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ ''اور جن لوگوں نے تقویٰ کی روش اختیار کی تھی قیامت کے دن وہ ان کے اوپر ہوں گے۔''

وہ ان کافروں کے مقابلے میں عالی مرتبت اور عالی مقام ہوں گے' بلکہ سورۃ المُطفّفین میں تو یہاں تک آیا ہے کہ جنت میں جانے کے بعد اہلِ ایمان کفار کا مذاق اڑائیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ رزق عطا فرمائے گا جس کو چاہے گا بے حساب۔''

یہ جنت کی طرف اشارہ ہے۔ اب پھر ایک طویل آیت آ رہی ہے جس میں ایک اہم مضمون بیان ہو رہا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ سورۃ البقرۃ میں جا بجا علم وحکمت اور معرفتِ الٰہی کے بڑے حسین اور خوش نما پھول آئے ہیں جو اس بُنتی میں بُن دیے گئے ہیں۔ دو لڑیاں شریعت کی ہیں' یعنی عبادات اور معاملات' جبکہ دو لڑیاں جہاد کی' یعنی جہاد بالمال (انفاق) اور جہاد بالنفس (قتال)' اور ان کے درمیان یہ عظیم پھول آ جاتے ہیں۔ اس آیت کو میں نے ''آیۃ الاختلاف'' کا عنوان دیا ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ لوگوں کے درمیان اختلاف کیوں ہوتا رہا ہے' اور یہ بہت اہم مضمون ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں وحدتِ ادیان کا جو فلسفہ کچھ لوگوں کی طرف سے پیش ہوتا ہے اس کا ایک حصہ صحیح ہے اور ایک حصہ غلط ہے۔ صحیح کون سا ہے اور غلط کون سا ہے' وہ اس آیت سے معلوم ہو گا۔

آیت ﴿ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ﴾ ''تمام انسان ایک ہی اُمت تھے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں سب کے سب انسان ایک ہی اُمت تھے۔ تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور حضرت آدمؑ نبی ہیں۔ چنانچہ اُمت تو ایک ہی تھی۔ جب تک ان میں گمراہی پیدا نہیں ہوئی' اختلافات پیدا نہیں ہوئے' شیطان نے کچھ

۲۷۔ صحیح مسلم' کتاب الزھد والرقائق' عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ۔

لوگوں کو نہیں ورغلایا' اُس وقت تک تو تمام انسان ایک ہی اُمت تھے۔ اب یہاں پر ایک لفظ محذوف ہے: ''ثُمَّ اخْتَلَفُوْا'' (پھر ان میں اختلافات ہوئے)۔ اختلاف کے نتیجے میں فساد پیدا ہوا اور کچھ لوگوں نے گمراہی کی روش اختیار کر لی۔ آدمؑ کا ایک بیٹا اگر ہابیل تھا تو دوسرا قابیل بھی تھا۔

﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪﴾ ''تو اللہ نے (اپنے) نبی بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے۔''

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ جاری فرمایا جو نیکوکاروں کو بشارت دیتے تھے اور غلط کاروں کو خبردار کرتے تھے۔

﴿وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ﴾ ''اور ان کے ساتھ (اپنی) کتاب نازل فرمائی حق کے ساتھ' تاکہ وہ فیصلہ کر دے لوگوں کے مابین ان امور میں جن میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔''

﴿وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ﴾ ''اور کتاب میں اختلاف نہیں کیا مگر ان ہی لوگوں نے جنہیں یہ دی گئی تھی' اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن ہدایات آ چکی تھیں' محض باہمی ضِدم ضِدا کے سبب سے۔''

''بَغْيًۢا'' کا لفظ قبل ازیں آیت ۹۰ میں آ چکا ہے۔ وہاں میں نے وضاحت کی تھی کہ دین میں اختلاف کا اصل سبب یہی ضِدم ضِدا والا رویہ ہوتا ہے۔ انسان میں غالب ہونے کی جو طلب اور اُمنگ (The urge to dominate) موجود ہے وہ حق کو قبول کرنے میں مزاحم ہو جاتی ہے۔ دوسرے کی بات ماننا نفسِ انسانی پر بہت گراں گزرتا ہے۔ آدمی کہتا ہے میں اس کی بات کیوں مانوں' یہ میری کیوں نہ مانے؟ انسان کے اندر جہاں اچھے میلانات رکھے گئے ہیں وہاں بُری اُمنگیں اور میلانات بھی رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ انسان کے باطن میں حق و باطل کی ایک کشاکش چلتی ہے۔ اسی طرح کی کشاکش خارج میں بھی چلتی ہے۔ تو فرمایا کہ جب انسانوں میں اختلافات رونما ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو بھیجا جو مبشر اور منذر بن کر آئے۔

﴿فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ ''پس اللہ نے ہدایت بخشی ان لوگوں کو جو ایمان لائے اُس حق کے معاملے میں جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا' اپنے حکم سے۔''

﴿وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۱۳﴾ ''اور اللہ ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے سیدھے راستے کی طرف۔''

سلسلۂ انبیاء و رُسل کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن حکیم نازل فرما کر' اپنی توفیق سے' اس نزاع و اختلاف میں حق کی راہ اہلِ ایمان پر کھولی ہے۔ اور اللہ ہی ہے جو اپنی مشیت اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق جس کو چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔

اب بڑی سخت آیت آ رہی ہے' جو بڑی لرزا دینے والی آیت ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک بڑی تعداد مہاجرین کی تھی جو مکہ کی سختیاں جھیل کر آئے تھے۔ ان کے لیے تو اب جو بھی مراحل آئندہ آنے والے تھے وہ بھی کوئی ایسے مشکل نہیں تھے۔ لیکن جو حضرات مدینہ منورہ میں ایمان لائے تھے' یعنی انصار' اُن کے لیے تو یہ نئی نئی بات تھی۔ اس لیے کہ انہوں نے تو وہ سختیاں نہیں جھیلی تھیں

جو مکہ میں مہاجرین نے جھیلی تھیں۔ تو اب روئے سخن خاص طور پر ان سے ہے' اگرچہ خطاب عام ہے۔ قرآن مجید میں یہ اسلوب عام طور پر ملتا ہے کہ الفاظ عام ہیں' لیکن روئے سخن کسی خاص طبقہ کی طرف ہے۔ تو درحقیقت یہاں انصار کو بتایا جا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا پھولوں کی سیج نہیں ہے۔

آیت ۲۱۴ ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے''

﴿وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ﴾ ''حالانکہ ابھی تک تمہارے اوپر وہ حالات و واقعات وارد نہیں ہوئے جو تم سے پہلوں پر ہوئے تھے۔''

﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا﴾ ''پہنچی ان کو سختی بھوک کی اور تکلیف اور وہ ہلا مارے گئے''

﴿حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ﴾ ''یہاں تک کہ (وقت کا) رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان پکار اٹھے کہ کب آئے گی اللہ کی مدد؟''

﴿اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝۲۱۴﴾ ''(اب انہیں یہ خوشخبری دی گئی کہ) آگاہ ہو جاؤ' یقیناً اللہ کی مدد قریب ہے۔''

یعنی اللہ تو اہلِ ایمان کو آزماتا ہے' اسے کھوٹے اور کھرے کو الگ کرنا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو اس سے پہلے انیسویں رکوع کے بالکل آغاز میں آ چکی ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (آیت ۱۵۵) ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مال و جان اور ثمرات کے نقصان سے''۔ یہ کوئی پھولوں بھرا راستہ نہیں ہے' پھولوں کی سیج نہیں ہے' حق کا راستہ کانٹوں بھرا راستہ ہے' اس کے لیے ذہناً تیار ہو جاؤ۔ ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے — شرطِ اوّل قدم این است کہ مجنوں باشی!

اور: ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا!

اس راستے میں اللہ کی مدد ضرور آتی ہے' لیکن آزمائشوں اور قربانیوں کے بعد۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پھر سورۃ الصف میں فتح و نصرت کی خوشخبری سنائی گئی' جبکہ غزوۂ احزاب واقع ہو چکا تھا اور محمد رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی اہلِ ایمان رضی اللہ عنہم شدید ترین امتحان سے کامیابی کے ساتھ گزر چکے تھے۔ تب انہیں بایں الفاظ خوشخبری دی گئی: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ﴾ (آیت ۱۳) ''اور جو دوسری چیز تمہیں پسند ہے (وہ بھی تمہیں ملے گی)' اللہ کی طرف سے نصرت اور قریب ہی میں حاصل ہو جانے والی فتح''۔ ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) اہلِ ایمان کو بشارت دے دیجیے!'' اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کو بشارت دے دیجیے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اللہ کی نصرت کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے۔

آیت ۲۱۵ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ﴾ ''یہ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟''

یعنی انفاق کے لیے جو کہا جا رہا ہے تو ہم کیا خرچ کریں؟ کتنا خرچ کریں؟ انسان بھلائی کے لیے جو بھی خرچ کرے تو اس میں سب سے پہلا حق کن کا ہے؟

﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ﴾ ''کہہ دیجیے جو بھی تم خرچ کرو مال و اسباب میں سے''

﴿فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ﴾ ''تو والدین' رشتے داروں' یتیموں' مسکینوں

اور مسافروں کے لیے (خرچ کرو)۔''

سب سے پہلا حق والدین کا ہے' اس کے بعد درجہ بدرجہ قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے۔

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝۲۱۵﴾ ''اور جو خیر بھی تم کماؤ گے اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔''

تم جو بھی اچھا کام کرو گے تو جان لو کہ وہ اللہ کے علم میں ہے۔ ضرورت نہیں ہے کہ دنیا اس سے واقف ہو' تمہیں اگر اللہ سے اجر لینا ہے تو وہ تو رات کے اندھیرے میں بھی دیکھ رہا ہے۔ اگر تمہارے دائیں ہاتھ نے دیا ہے اور بائیں کو پتا نہیں چلا تو اللہ کو تو پھر بھی پتا چل گیا ہے۔ تو تم خاطر جمع رکھو' تمہاری ہر نیکی اللہ کے علم میں ہے اور وہ اسے ضائع نہیں کرے گا۔

اب اگلی آیت میں قتال کے مضمون کا تسلسل ہے۔ میں نے سورۃ البقرۃ کے نصفِ آخر کے مضامین کو چار مختلف رنگوں کی لڑیوں سے تشبیہ دی تھی' جن کو باہم بٹ لیا جائے تو چاروں رنگ کٹے پھٹے نظر آتے ہیں اور اگر انہیں کھول دیا جائے تو ہر رنگ مسلسل نظر آتا ہے۔

آیت ۲۱۶ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ﴾ ''(مسلمانو!) اب تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے اور وہ تمہیں گراں گزر رہی ہے۔''

واضح رہے کہ سورۃ البقرۃ سے پہلے سورۂ محمد ﷺ نازل ہو چکی تھی اور اس میں قتال کی فرضیت آ چکی تھی۔ (چنانچہ اس کا ایک نام سورۃ القتال بھی ہے۔) لہٰذا اس حوالے سے کچھ لوگ پریشان ہو رہے تھے۔ خاص طور پر منافقین یہ کہتے تھے کہ بھائی صلح جوئی سے کام لو' بس دعوت و تبلیغ کے ذریعے سے لوگوں کو سیدھے راستے کی طرف لاؤ' یہ جنگ و جدال اور لڑائی بھڑائی تو کوئی اچھا کام نہیں ہے' اس میں تو بہت خرابی ہے۔ ان کے علاوہ ایسے مسلمان جن کا ایمان قدرے کمزور تھا' اگرچہ وہ منافق تو نہیں تھے' لیکن ان کا ایمان ابھی پختہ نہیں تھا' ابھی تازہ تازہ ایمان لائے تھے اور تربیت کے مراحل سے ابھی نہیں گزرے تھے' ان میں سے بھی بعض لوگوں کے دلوں میں انقباض پیدا ہو رہا تھا۔ یہاں قتال کی فرضیت کے لیے ''كُتِبَ'' کا لفظ آیا ہے۔ اس سے پہلے یہ لفظ روزے' قصاص اور وصیت کے ضمن میں آ چکا ہے۔ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ... كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ... كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ ...﴾ فرمایا کہ تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے اور وہ تمہیں بُری لگ رہی ہے۔

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ﴾ ''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔''

﴿وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ﴾ ''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بُری ہو۔''

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶﴾ ''اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

تم اپنی عقل پر ایمان نہ رکھو' اللہ کی وحی پر ایمان رکھو' اللہ کے رسول ﷺ پر ایمان رکھو۔ جس وقت کے لیے جو حکم موزوں تھا وہی تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے دیا گیا۔ چودہ برس تک تمہیں قتال سے منع کیا گیا۔ اُس وقت تمہارے لیے حکم تھا: ''كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ'' (اپنے ہاتھ روکے رکھو!) اب تم پر قتال فرض کیا جا رہا ہے' لہٰذا اب اس حکم پر سرِ تسلیم خم کرنا تمہارے لیے لازم ہے۔

آیات ۲۱۷ تا ۲۲۱

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۬ۙ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾ وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾ ع

آیت ۲۱۷ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں حرمت والے مہینے میں جنگ کے بارے میں۔''

قتال کا حکم آنے کے بعد اب وہ پوچھتے تھے کہ یہ جو حرمت والے مہینے ہیں ان میں جنگ کرنا کیسا ہے؟ اس لیے کہ سیرت میں یہ واقعہ آتا ہے کہ ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کو چند افراد کے دستے کا کمانڈر بنا کر ہدایت فرمائی تھی کہ مکہ اور طائف کے درمیان جا کر وادیٔ نخلہ میں قیام کریں اور قریش کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ وادیٔ نخلہ میں قیام کے دوران وہاں قریش کے ایک مختصر سے قافلے کے ساتھ مڈبھیڑ ہو گئی اور مسلمانوں کے ہاتھوں ایک مشرک عمرو بن عبداللہ الحضرمی مارا گیا۔ اُس روز رجب کی آخری تاریخ تھی اور رجب کا مہینہ اشہرِ حُرم میں سے ہے۔ یہ ہجرت کے بعد پہلا خون تھا جو مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا۔ اس پر مشرکین نے بہت واویلا کیا کہ ان لوگوں کا کیا حال ہے' بنے پھرتے ہیں اللہ والے' رسولؐ والے' دین والے' آخرت والے اور انہوں نے حرمت والے مہینے کو بٹہ لگا دیا' اس میں جنگ کی۔ تو یہ دراصل اللہ تعالیٰ اپنے ان مؤمن بندوں کی طرف سے گویا خود صفائی پیش کر رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ حرمت والے مہینوں میں قتال کا کیا حکم ہے؟

﴿قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ﴾ ''کہہ دیجیے کہ اس میں جنگ کرنا بہت بڑی (گناہ کی) بات ہے۔''

﴿وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌ ۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۙ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ﴾ ''لیکن اللہ کے راستے سے روکنا' اس کا کفر کرنا' مسجدِ حرام سے روکنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے کہیں بڑا گناہ ہے۔''

یہ وہ سنگین جرائم ہیں جن کا ارتکاب مشرکینِ مکہ کی جانب سے ہو رہا تھا۔ یہاں فرمایا گیا کہ یہ سب کام اشہرِ حرم میں جنگ کرنے سے بھی بڑے جرائم ہیں۔ لہٰذا ان کے سدباب کے لیے اگر اشہرِ حرم میں جنگ کرنی پڑ جائے تو کوئی حرج نہیں۔

﴿وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ﴾ ''اور فتنہ قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔''

قبل ازیں آیت ۱۹۱ میں الفاظ آ چکے ہیں: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ﴾ فتنہ ہر وہ کیفیت ہے جس میں صاحبِ ایمان کے لیے ایمان پر قائم رہنا اور اسلام پر عمل کرنا مشکل ہو جائے۔ آج کا پورا معاشرہ فتنہ ہے۔ اسلام پر عمل کرنا مشکل ہے' بدمعاشی اور حرام خوری کے راستے کھلے ہوئے ہیں' اکلِ حلال اس قدر مشکل بنا دیا گیا ہے کہ دانتوں پسینہ آئے تو شاید نصیب ہو۔ نکاح اور شادی کے جائز راستوں پر بڑی بڑی شرطیں اور قدغنیں عائد ہیں' جبکہ ناجائز مراسم اور زنا کے راستے کھلے ہیں۔ جس معاشرے کے اندر باطل کا غلبہ ہو جائے اور حق پر چلنا ممکن نہ رہے وہ بڑے فتنے میں مبتلا ہے۔ باطل کا غلبہ سب سے بڑا فتنہ ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ فتنہ قتل کے مقابلے میں بہت بڑی شے ہے۔

﴿وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ﴾ ''اور یہ لوگ تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ لوٹا دیں تمہیں اپنے دین سے اگر وہ ایسا کر سکتے ہوں۔''

وہ تو اس پر تُلے ہوئے ہیں کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔ یہاں مشرکینِ مکہ کی طرف اشارہ ہو رہا ہے' کیونکہ اب یہ غزوۂ بدر کی تمہید چل رہی ہے۔ اس کے بعد غزوۂ بدر ہونے والا ہے' اس کے لیے اہلِ ایمان کو ذہنی طور پر تیار کیا جا رہا ہے اور انہیں آگاہ کیا جا رہا ہے کہ مشرکین کی جنگ کا مقصد تمہیں تمہارے دین سے برگشتہ کرنا ہے' وہ تو اپنی بھرپور کوشش کرتے رہیں گے کہ اگر ان کا بس چلے تو تمہیں تمہارے دین سے لوٹا کر واپس لے جائیں۔

﴿وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ﴾ ''اور (سن لو) جو کوئی بھی تم میں سے اپنے دین سے پھر گیا''

﴿فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ﴾ ''اور اُسی حالت میں اس کی موت آ گئی کہ وہ کافر ہی تھا''

﴿فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ﴾ ''تو یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت جائیں گے۔''

پہلے خواہ کتنی ہی نیکیاں کی ہوئی تھیں' کتنی ہی نمازیں پڑھی ہوئی تھیں' کتنا ہی انفاق کیا ہوا تھا' صدقات دیے تھے' جو کچھ بھی کیا تھا سب کا سب صفر ہو جائے گا۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾﴾ ''اور وہ ہوں گے جہنم والے' وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔''

آیت ۲۱۸ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''(اس

کے برعکس) جولوگ ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں تو یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔''

یہاں اُن لوگوں پر بڑا لطیف طنز ہے جو خود تو حرام کے راستے پر جا رہے ہیں' لیکن یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ اللہ ان پر رحم فرمائے گا۔ اللہ ایسی روش اختیار کرنے والوں پر رحمت نہیں فرماتا' اللہ کی رحمت کا مستحق بننا پڑتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت کا مستحق وہی ہے جو ایمان' ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کا راستہ اختیار کرتا ہے۔ ایسے لوگ بجا طور پر اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ غفور ہے' رحیم ہے۔''

وہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا اور اپنی رحمت سے انہیں نوازنے والا ہے۔

آیت ۲۱۹ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں (کہ ان کا کیا حکم ہے؟)''

ان احکام سے شریعت کا ابتدائی خاکہ (blue print) تیار ہونا شروع ہو گیا ہے' کچھ احکام پہلے آ چکے ہیں اور کچھ اب آ رہے ہیں۔ شراب اور جوئے کے بارے میں یہاں ابتدائی حکم بیان ہوا ہے اور اس پر محض اظہارِ ناراضگی فرمایا گیا ہے۔

﴿قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ﴾ ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ ان دونوں کے اندر بہت بڑے گناہ کے پہلو ہیں۔''

﴿وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫﴾ ''اور لوگوں کے لیے کچھ منفعتیں بھی ہیں۔''

﴿وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ﴾ ''البتہ ان کا گناہ کا پہلو نفع کے پہلو سے بڑا ہے۔''

یعنی اشارہ کر دیا گیا کہ ان کو چھوڑ دو۔ اب معاملہ تمہاری عقلِ سلیم کے حوالے ہے' حقیقت تم پر کھول دی گئی ہے۔ یہ ابتدائی حکم ہے' لیکن حکم کے پیرائے میں نہیں۔ بس واضح کر دیا گیا کہ ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے' اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ بقول غالب: ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو؟ اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے!

اور: ؎

میں میکدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا!

یہ حکمت سمجھ لیجیے کہ شراب اور جوئے میں کیا چیز مشترک ہے کہ یہاں دونوں کو جمع کیا گیا؟ شراب کے نشے میں بھی انسان اپنے آپ کو حقائق سے منقطع کرتا ہے اور محنت سے جی چراتا ہے۔ وہ زندگی کے تلخ حقائق کا مواجہہ کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ ع ''اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے!'' —— اور جوئے کی بنیاد بھی محنت کی نفی پر ہے۔ ایک رویہ تو یہ ہے کہ محنت سے ایک آدمی کما رہا ہے' مشقت کر رہا ہے' کوئی کھوکھا' چھابڑی یا ریڑھی لگا کر کچھ کمائی کر رہا ہے' جبکہ ایک ہے چانس اور داؤ کی بنیاد پر پیسے کمانا۔ یہ محنت کی نفی ہے۔ چنانچہ شراب اور جوئے کے اندر اصل میں علت ایک ہی ہے۔

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ﴾ ''اور یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں؟''

آیت ۱۹۵ میں انفاق کا حکم بایں الفاظ آچکا ہے: ﴿وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ﴾ ''اور خرچ کرو اللہ کی راہ میں اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ جھونکو''۔ تو سوال کیا گیا کہ ''کتنا خرچ کریں؟'' ہمیں کچھ مقدار بھی بتا دی جائے۔ فرمایا:

﴿قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ ''کہہ دیجیے: جو بھی تمہاری ضرورت سے زائد ہو۔''

اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ نہیں ہے کہ تم اپنی ضرورتوں کو پیچھے ڈال دو بلکہ تم پہلے اپنی ضرورتیں پوری کرو پھر جو تمہارے پاس بچ جائے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ کمیونزم کے فلسفہ میں ایک اصطلاح ''قدرِ زائد'' (surplus value) استعمال ہوتی ہے۔ یہ ہے ''اَلْعَفْوَ''۔ جو بھی تمہاری ضروریات سے زائد ہے یہ surplus value ہے اسے اللہ کی راہ میں دے دو۔ اس کو بچا کر رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ پر بے اعتمادی کا اظہار کر رہے ہیں کہ اللہ نے آج تو دے دیا ہے کل نہیں دے گا۔ لیکن یہ کہ انسان کی ضرورتیں کیا ہیں کتنی ہیں اس کا اللہ نے کوئی پیمانہ مقرر نہیں کیا۔ اس کا تعلق باطنی روح سے ہے۔ ایک مسلمان کے اندر اللہ کی محبت اور آخرت پر ایمان جوں جوں بڑھتا جائے گا اتنا ہی وہ اپنی ضرورتیں کم کرے گا اپنے معیارِ زندگی کو پست کرے گا اور زیادہ سے زیادہ اللہ کی راہ میں دے گا۔ اصول یہ ہے کہ ہر شخص یہ دیکھے کہ جو میری ضرورت سے زائد ہے اسے میں بچا بچا کر نہ رکھوں بلکہ اللہ کی راہ میں دے دوں۔ انفاق فی سبیل اللہ پر اس سورۂ مبارکہ میں پورے دو رکوع آگے آنے والے ہیں۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴾ ''اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے لیے واضح کر رہا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔''

آیت ۲۱۹ ﴿فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ﴾ ''دنیا اور آخرت (کے معاملات) میں۔''

تمہارا یہ غور و فکر دنیا کے بارے میں بھی ہونا چاہیے اور آخرت کے بارے میں بھی۔ دنیا میں بھی اسلام رہبانیت نہیں سکھاتا۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ نہ کھاؤ نہ پیو چلے کشی کرو جنگلوں میں نکل جاؤ! نہیں اسلام تو متمدن زندگی کی تعلیم دیتا ہے گھر گرہستی اور شادی بیاہ کی ترغیب دیتا ہے بیوی بچوں کے حقوق بتاتا ہے اور ان کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تمہیں آخرت کی بھی فکر کرنی چاہیے اور دنیا و آخرت کے معاملات میں ایک نسبت و تناسب (ratio proportion) قائم رہنا چاہیے۔ دنیا کی کتنی قدر و قیمت ہے اور اس کے مقابلے میں آخرت کی کتنی قدر و قیمت ہے اس کا صحیح طور پر اندازہ کرنا چاہیے۔ اگر یہ اندازہ غلط ہو گیا اور کوئی غلط تناسب قائم کر لیا گیا تو ہر چیز تلپٹ ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر ایک دوا کے نسخے میں کوئی چیز کم تھی کوئی زیادہ تھی۔ اگر آپ نے جو چیز کم تھی اسے زیادہ کر دیا اور جو زیادہ تھی اسے کم کر دیا تو اب ہو سکتا ہے یہ نسخہ شفا نہ رہے نسخۂ ہلاکت بن جائے۔

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ﴾ ''اور یہ آپ سے پوچھ رہے ہیں یتیموں کے بارے میں۔''

﴿قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ﴾ ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ (جس طرزِ عمل میں) ان کی بھلائی اور مصلحت (ہو وہی اختیار کرنا) بہتر ہے۔''

ان کی مصلحت کو پیش نظر رکھنا بہتر ہے نیکی ہے بھلائی ہے۔ اصل میں لوگوں کے سامنے سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیت تھی: ﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ (آیت ۳۴) ''اور مالِ یتیم کے قریب تک نہ پھٹکو مگر ایسے طریقے پر جو (یتیم کے حق میں) بہتر ہو''۔ چنانچہ وہ مالِ یتیم کے بارے میں انتہائی احتیاط کر رہے تھے اور انہوں نے یتامیٰ کی ہنڈیاں بھی علیحدہ کر دی تھیں کہ

مبادا اُن کے حصے کی کوئی بوٹی ہمارے پیٹ میں چلی جائے۔لیکن اس طرح یتامیٰ کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ تکلیف اور حرج میں مبتلا ہو گئے تھے۔کسی کے گھر میں یتیم پرورش پا رہا ہے تو اس کا خرچ الگ طور پر اس کے مال میں سے نکالا جا رہا ہے اور اس کے لیے الگ ہنڈیا پکائی جا رہی ہے۔فرمایا کہ اُس حکم سے یہ مقصد نہیں تھا' مقصد یہ تھا کہ تم کہیں ان کے مال ہڑپ نہ کر جاؤ' ان کے لیے اصلاح اور بھلائی کا معاملہ کرنا بہتر طرزِ عمل ہے۔

﴿وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ﴾ ''اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ ملائے رکھو تو وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔''

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ﴾ ''اور اللہ جانتا ہے مُفسِد کو بھی اور مصلح کو بھی۔''

وہ جانتا ہے کہ کون بدنیتی سے یتیم کا مال ہڑپ کرنا چاہتا ہے اور کون یتیم کی خیر خواہی چاہتا ہے۔یہ ہنڈیا علیحدہ کر کے بھی گڑبڑ کر سکتا ہے اور یہ وہ شخص ہے جو ہنڈیا مشترک کر کے بھی حق پر رہ سکتا ہے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں سختی ہی میں ڈالے رکھتا۔''

لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہیں مشقت اور سختی سے بچایا اور تم پر آسانی فرمائی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

وہ انتہائی مشقت پر مبنی سخت سے سخت حکم بھی دے سکتا ہے' اس لیے کہ وہ زبردست ہے' لیکن وہ انسانوں کو مشقت میں نہیں ڈالتا' بلکہ اس کے ہر حکم کے اندر حکمت ہوتی ہے۔اور جہاں حکمت نرمی کی متقاضی ہوتی ہے وہاں وہ رعایت دیتا ہے۔

آیت ﴿۲۲۱﴾ ﴿وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ﴾ ''اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔''

﴿وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ﴾ ''اور ایک مؤمنہ لونڈی بہتر ہے ایک آزاد مشرکہ عورت سے اگرچہ وہ تمہیں اچھی بھی لگتی ہو۔''

﴿وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ﴾ ''اور اپنی عورتیں مشرکوں کے نکاح میں مت دو جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔''

﴿وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ﴾ ''اور ایک مؤمن غلام بہتر ہے ایک آزاد مشرک مرد سے اگرچہ وہ تمہیں پسند بھی ہو۔''

خواہ وہ صاحبِ حیثیت اور مال دار ہو' لیکن دولت ایمان سے محروم ہو تو تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ اپنی بہن یا بیٹی اس کے نکاح میں دے دو۔

﴿اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۚ﴾ ''یہ لوگ آگ کی طرف بلا رہے ہیں۔''

اگر ان سے رشتے ناتے جوڑو گے تو وہ تمہیں بھی جہنم میں لے جائیں گے اور تمہاری اولاد کو بھی۔

﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ ''اور اللہ تمہیں بلا رہا ہے جنت کی طرف اور مغفرت کی طرف اپنے حکم سے۔''

﴿وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾﴾ ''اور وہ اپنی آیات واضح کر رہا ہے لوگوں کے لیے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

آیات ۲۲۲ تا ۲۲۸

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۪ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾ وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾ وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾ ع ۲۸ ۱۲

آیت ۲۲۲ ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ﴾ ''اور وہ عورتوں کی ماہواری کے بارے میں آپ سے سوال کر رہے ہیں۔''

﴿قُلْ هُوَ اَذًى ۙ﴾ ''کہہ دیجیے وہ ایک ناپاکی بھی ہے اور ایک تکلیف کا مسئلہ بھی ہے''

﴿فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ﴾ ''تو حیض کی حالت میں عورتوں سے علیحدہ رہو''

﴿وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ﴾ ''اور ان سے مقاربت نہ کرو یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں۔''

﴿فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ﴾ ''پھر جب وہ خوب پاک ہو جائیں تو اب ان کی طرف جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔''

معلوم ہوا کہ بدیہیاتِ فطرت اللہ تعالیٰ کے اوامر میں شامل ہیں۔ عورتوں کے ساتھ مجامعت کا طریقہ انسان کو فطری طور پر معلوم ہے، یہ ایک امرِ طبعی ہے۔ ہر حیوان کو بھی جبلی طور پر معلوم ہے کہ اسے اپنی مادہ کے ساتھ کیسا تعلق قائم کرنا ہے۔ لیکن اگر انسان فطری طریقہ چھوڑ کر غیر فطری طریقہ اختیار کرے اور عورتوں کے ساتھ بھی قومِ لوط والا عمل کرنے لگے تو یہ حرام ہے۔ صحیح راستہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری فطرت میں ڈالا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾﴾ ''یقیناً اللہ محبت کرتا ہے بہت توبہ کرنے والوں سے اور محبت

کرتا ہے بہت پاکبازی اختیار کرنے والوں سے۔''

ان سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس سے توبہ کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں سے دور رہتے ہیں۔

آیت ۲۲۳ ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠﴾ ''تمہاری بیویاں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی ہیں۔''

جیسے کھیت میں بیج بوتے ہو' پھر فصل کاٹتے ہو' اسی طرح بیویوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ تمہیں اولاد عطا کرتا ہے۔

﴿فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۪﴾ ''تو اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ۔''

تم اپنی کھیتی میں جدھر سے چاہو آؤ' تمہارے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ہے' آگے سے یا داہنی طرف سے یا بائیں طرف سے' جدھر سے بھی چاہو' مگر یہ ضرور ہے کہ تخم ریزی اسی خاص جگہ میں ہو جہاں سے پیداوار کی امید ہو سکتی ہے۔

﴿وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾ ''اور اپنے آگے کے لیے سامان کرو۔''

یعنی اپنے مستقبل کی فکر کرو اور اپنی نسل کو آگے بڑھانے کی کوشش کرو۔ اولاد انسان کا اثاثہ ہوتی ہے اور بڑھاپے میں اس کا سہارا بنتی ہے۔ آج تو اُلٹی گنگا بہائی جا رہی ہے اور اولاد کم سے کم پیدا کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے' جبکہ ایک زمانے میں اولاد عصائے پیری شمار ہوتی تھی۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان لو کہ تمہیں اُس سے مل کر رہنا ہے۔''

نوٹ کیجیے کہ قرآن حکیم میں شریعت کے ہر حکم کے ساتھ تقویٰ کا ذکر بار بار آ رہا ہے۔ اس لیے کہ کسی قانون کی لاکھ پیروی کی جا رہی ہو مگر تقویٰ نہ ہو تو وہ قانون مذاق بن جائے گا' کھیل تماشا بن جائے گا۔ اس کی بعض مثالیں ابھی آئیں گی۔

﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۲۳﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) اہلِ ایمان کو بشارت دے دیجیے۔''

آیت ۲۲۴ ﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ﴾ ''اور اللہ کے نام کو تختۂ مشق نہ بنالو اپنی قسموں کے لیے''

﴿اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ﴾ ''کہ بھلائی نہ کرو گے' پرہیزگاری نہ کرو گے اور لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ گے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ کے عظیم نام کو استعمال کرتے ہوئے ایسی قسمیں مت کھاؤ جو نیکی و تقویٰ اور مقصدِ اصلاح کے خلاف ہوں۔ کسی وقت غصے میں آ کر آدمی قسم کھا بیٹھتا ہے کہ میں فلاں شخص سے کبھی حسنِ سلوک اور بھلائی نہیں کروں گا' اس سے روکا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اسی طرح کی قسم کھالی تھی۔ مِسطح ایک غریب مسلمان تھے' جو آپؓ کے قرابت دار بھی تھے۔ آپؓ ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی تو مِسطح بھی اُس آگ کے بھڑکانے والوں میں شامل ہو گئے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے طرزِ عمل سے بہت رنجیدہ خاطر ہوئے کہ میں تو اس کی سرپرستی کرتا رہا اور یہ میری بیٹی پر تہمت لگانے والوں میں شامل ہو گیا۔ آپؓ نے قسم کھائی کہ اب میں کبھی اس کی مدد نہیں کروں گا۔ یہ واقعہ سورۃ النور میں آئے گا۔ مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم ایسا نہ کرو' تم اپنی نیکی کے دروازے کیوں بند کرتے ہو؟ جس نے ایسی قسم کھالی ہے وہ اس قسم کو کھول دے اور قسم کا کفارہ دے دے۔ اسی طرح لوگوں کے مابین مصالحت کرانا بھی ضروری ہے۔ دو بھائیوں کے درمیان جھگڑا تھا' آپ نے مصالحت کی کوشش کی لیکن آپ کی بات نہیں مانی گئی' اس پر آپ نے غصے میں آ کر کہہ دیا کہ اللہ کی قسم' اب میں ان کے معاملے میں دخل نہیں دوں گا۔ اس طرح کی قسمیں

کھانے سے روکا گیا ہے۔ اور اگر کسی نے ایسی کوئی قسم کھائی ہے تو وہ اسے توڑ دے اور اس کا کفارہ دے دے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٢٥﴾﴾ ''اور اللہ سننے والا' جاننے والا ہے۔''

آیت ۲۲۵ ﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ﴾ ''اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرے گا تم سے تمہاری بے معنی قسموں پر (جو تم عزم و ارادہ کے بغیر کھا بیٹھتے ہو)''

عربوں کا اندازِ گفتگو اس طرح کا ہے کہ وَاللہِ' بِاللہ کے بغیر ان کا کوئی جملہ شروع ہی نہیں ہوتا۔ اس سے درحقیقت ان کی نیت قسم کھانے کی نہیں ہوتی بلکہ یہ ان کا گفتگو کا ایک اسلوب ہے۔ اس طرح کی قسموں پر مؤاخذہ نہیں ہے۔

﴿وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ﴾ ''لیکن ان قسموں پر تم سے ضرور مؤاخذہ کرے گا جو تم نے اپنے دلی ارادے کے ساتھ کھائی ہوں۔''

ایسی قسموں کو توڑو گے تو کفارہ دینا ہوگا۔ کفارے کا حکم سورۃ المائدۃ میں بیان ہوا ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ سورۃ البقرۃ میں شریعت اسلامی کا ابتدائی خاکہ دے دیا گیا ہے اور اس کے تکمیلی احکام کچھ سورۃ النساء میں اور کچھ سورۃ المائدۃ میں بیان ہوئے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٢٥﴾﴾ ''اور اللہ بخشنے والا ہے اور حلیم ہے۔''

وہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔ وہ فوراً نہیں پکڑتا' بلکہ اصلاح کی مہلت دیتا ہے۔

آیت ۲۲۶ ﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ﴾ ''جو لوگ اپنی بیویوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔''

اگر کوئی مرد کسی وقت ناراض ہو کر یا غصے میں آ کر یہ قسم کھا لے کہ اب میں اپنی بیوی کے قریب نہیں جاؤں گا' اس سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گا' تو یہ ایلاء کہلاتا ہے۔ خود آنحضور ﷺ نے بھی اپنی ازواجِ مطہرات سے ایلاء فرمایا تھا۔ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے عرض کیا تھا کہ اب عام مسلمانوں کے ہاں بھی خوشحالی آ گئی ہے تو ہمارے ہاں یہ تنگی اور سختی کیوں ہے؟ اب ہمارے بھی نفقات بڑھائے جائیں۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ان سے ایلاء کیا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔ عام طور پر ہوتا یہ تھا کہ لوگ قسم تو کھا بیٹھتے تھے کہ بیوی کے پاس نہ جائیں گے' مگر بعد میں اس پر پچھتاتے تھے کہ کیا کریں۔ اب وہ بیوی بے چاری معلّق ہو کر رہ جاتی۔ اس آیت میں ایلاء کی مہلت مقرر کر دی گئی کہ زیادہ سے زیادہ چار ماہ تک انتظار کیا جا سکتا ہے۔

﴿فَاِنْ فَاۗءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢٦﴾﴾ ''پس اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا' مہربان ہے۔''

ان چار ماہ کے دوران اگر وہ اپنی قسم کو ختم کریں اور رجوع کر لیں' تعلقِ زن و شو قائم کر لیں تو اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے۔

آیت ۲۲۷ ﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٢٧﴾﴾ ''اور اگر وہ طلاق کا ارادہ کر چکے ہوں تو اللہ سننے والا' جاننے والا ہے۔''

یعنی چار ماہ کا عرصہ گزر جانے پر شوہر کو بہرحال فیصلہ کرنا ہے کہ وہ یا تو رجوع کرے یا طلاق دے۔ اب عورت کو مزید معلّق نہیں رکھا جا سکتا۔ رجوع کی صورت میں چونکہ قسم توڑنا ہوگی لہٰذا اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ حکم جاری کیا تھا کہ جو لوگ جہاد کے لیے گھروں سے دور گئے ہوں انہیں چار ماہ بعد لازمی طور پر گھر بھیجا جائے۔ آپؓ نے یہ حکم غالباً

اسی آیت سے استنباط کرتے ہوئے جاری فرمایا تھا۔ اس کے لیے آپؐ نے اُمّ المومنین حضرت حفصہ ؓ سے مشاورت بھی فرمائی تھی۔ اگرچہ آپؐ کا حضرت حفصہؓ سے باپ بیٹی کا رشتہ ہے' مگر دین کے معاملات میں شرم وحیا آڑے نہیں آتی' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ لَا يَسْتَحْيٖ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الاحزاب: ۵۳) ''اور اللہ شرماتا نہیں حق بات بتلانے میں''۔ آپؐ نے ان سے پوچھا کہ ایک عورت کتنا عرصہ اپنی عفت وعصمت کو سنبھال کر اپنے شوہر کا انتظار کر سکتی ہے؟ حضرت حفصہؓ نے کہا: چار ماہ۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے مجاہدین کے بارے میں یہ حکم جاری فرما دیا کہ انہیں چار ماہ سے زیادہ گھروں سے دُور نہ رکھا جائے۔

آیت ۲۲۸ ﴿وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ﴾ ''اور جن عورتوں کو طلاق دے دی جائے اُن پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو تین حیض تک روکے رکھیں۔''

طلاق کے بعد عورت کے لیے تین ماہ کی عدت ہے۔ اس عدت میں شوہر چاہے تو رجوع کر سکتا ہے' اگر اس نے ایک یا دو طلاقیں دی ہوں۔ البتہ تیسری طلاق کے بعد رجوع کا حق نہیں ہے۔ طلاقِ رجعی کے بعد اگر عدت ختم ہو جائے تو اب شوہر کا رجوع کا حق ختم ہو جائے گا اور عورت آزاد ہو گی' لیکن اس مدت کے اندر وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔

﴿وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ﴾ ''اور اُن کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے ارحام میں جو کچھ پیدا کر دیا ہو وہ اسے چھپائیں''

﴿اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ ''اگر وہ فی الواقع اللہ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتی ہیں۔''

تین حیض کی مدت اسی لیے مقرر کی گئی ہے کہ معلوم ہو جائے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں۔ اگر عورت حاملہ ہو لیکن وہ اپنا حمل چھپا رہی ہو تاکہ اس کے پیٹ میں پلنے والا اس کا بچہ اس کے پاس ہی رہے' تو یہ اس کے لیے جائز نہیں ہے۔

﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ﴾ ''اور اُن کے شوہر اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ انہیں لوٹا لیں اس عدت کے دوران میں اگر وہ واقعۃً اصلاح چاہتے ہوں۔''

اسے رجعت کہتے ہیں۔ شوہروں کو حق حاصل ہے کہ وہ عدت کے اندر اندر رجوع کر سکتے ہیں' لیکن یہ حق تیسری طلاق کے بعد حاصل نہیں رہتا۔ پہلی یا دوسری طلاق کے بعد عدت ختم ہونے سے پہلے شوہر کو اس کا اختیار حاصل ہے کہ وہ رجوع کر لے۔ اس پر بیوی کو انکار کرنے کا اختیار نہیں ہے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی کہ تم تو مجھے طلاق دے چکے ہو' اب میں تمہاری بات ماننے کو تیار نہیں ہوں۔

﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠﴾ ''اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق۔''

یعنی ان کے لیے جو حقوق ہیں وہ ان کی ذمہ داریوں کی مناسبت سے ہیں۔

﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ﴾ ''اور مَردوں کے لیے ان پر ایک درجہ فوقیت کا ہے۔''

اس زمانے میں اس آیت کی بہت غلط تعبیر بھی کی گئی ہے اور اس سے مساواتِ مرد وزن کا فلسفہ ثابت کیا گیا ہے۔ چنانچہ بعض مترجمین نے ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠﴾ کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ ''عورتوں کے حقوق بھی مَردوں پر ویسے ہی ہیں جیسے مَردوں کے اُن پر حقوق ہیں''۔ یہ ترجمہ درست نہیں ہے' اس لیے کہ اسلامی شریعت میں مرد اور عورت کے درمیان یعنی شوہر اور

بیوی کے درمیان مساوات نہیں ہے۔ اس آیت کا مفہوم سمجھنے کے لیے عربی میں ''لِ'' اور ''عَلٰی'' کا استعمال معلوم ہونا چاہیے۔ ''لِ'' کسی کے حق کے لیے اور ''عَلٰی'' کسی کی ذمہ داری کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ اس ٹکڑے کا ترجمہ اس طرح ہوگا: لَهُنَّ ''ان کے لیے حقوق ہیں''۔ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ ''جیسی کہ ان پر ذمہ داریاں ہیں''۔ اللہ تعالیٰ نے جیسی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے ویسے حقوق اس کو دیے ہیں اور جیسی ذمہ داری عورت پر ڈالی ہے اُس کی مناسبت سے اس کو بھی حقوق دے دیے ہیں۔ اور اس بات کو کھول دیا کہ ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ﴾ یعنی مَردوں کو اُن پر ایک درجہ فوقیت کا حاصل ہے۔ اب مساوات کیونکر ہوسکتی ہے؟ آخر میں فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝۲۲۸﴾ ''اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

خواہ تمہیں یہ بات پسند ہو خواہ ناپسند ہو' یہ اُس کا حکم ہے۔ وہ عزیز ہے' زبردست ہے' جو چاہے حکم دے۔ اور حکیم ہے' حکمت والا ہے' اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔

اس آیت میں جو مضمون بیان ہوا ہے اس پر قدرے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔ دیکھئے' انسانی تمدّن کا اہم ترین اور بنیادی ترین مسئلہ کیا ہے؟ ایک ہے انسانی زندگی کا مسئلہ۔ انسانی زندگی کا سب سے پہلا مسئلہ تو وہی ہے جو حیوانی زندگی کا بھی ہے' یعنی اپنی مادی ضروریات۔ ہر حیوان کی طرح انسان کے ساتھ بھی پیٹ لگا ہوا ہے جو کھانے کو مانگتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب دو انسان ملتے ہیں اور اس سے تمدن کا آغاز ہوتا ہے تو اس کا سب سے بڑا مسئلہ انسان کی شہوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دو جنسیں بنادی ہیں اور ان دونوں کے مابین تعلق سے نسل آگے چلتی ہے۔ اب اس معاملے کو کیسے منظم کیا جائے' اس کی کیا حدود و قیود ہوں؟ یہ جذبہ واقعۃً بہت زور آور (potent) ہے۔ اس کے بارے میں فرائیڈ نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل بے بنیاد نہیں ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ اس نے ذرا زیادہ مرچ مسالا لگا دیا ہے' ورنہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا جنسی جذبہ نہایت قوی اور زور آور جذبہ ہے۔ اور جو شے جتنی قوی ہو اسے حدود میں رکھنے کے لیے اس پر اسی قدر زیادہ قدغنیں عائد کرنی پڑتی ہیں۔ کوئی گھوڑا جتنا مُنہ زور ہوا تنا ہی اسے لگام دینا آسان نہیں ہوتا' اس کے لیے پھر مشقت کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ اگر اس جنسی جذبے کو بے لگام چھوڑ دیا جاتا تو تمدن میں فساد ہو جاتا۔ لہٰذا اس کے لیے شادی کا معاملہ رکھا گیا کہ ایک عورت کا ایک مرد کے ساتھ رشتہ قائم ہو جائے' سب کو معلوم ہو کہ یہ اس کی بیوی ہے یہ اس کا شوہر ہے' تاکہ اس طرح نسب کا معاملہ بھی چلے اور ایک خاندانی ادارہ وجود میں آئے۔ ورنہ آزاد شہوت رانی (free sex) سے تو خاندانی ادارہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ نکاح کے ذریعے ازدواجی بندھن کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سکھایا اور اس طرح خاندانی ادارہ وجود میں آیا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس ادارے میں مَرد اور عورت دونوں برابر ہیں؟ اس نظریے سے بڑی حماقت اور کوئی نہیں ہے۔ اس لیے کہ سیدھی سی بات ہے کہ کسی بھی ادارے کے دو برابر کے سربراہ نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ کسی محکمے کے دو ڈائریکٹر بنا دیں تو وہ ادارہ تباہ ہو جائے گا۔ اوپر مینیجنگ ڈائریکٹر ایک ہی ہوگا' اس کے نیچے آپ دس ڈائریکٹر بھی بنا دیں تو کوئی حرج نہیں۔ کسی ادارے کا جنرل مینیجر ایک ہی ہوگا' اس کے ماتحت آپ ہر شعبے کا ایک مینیجر بنا دیجیے۔ کسی بھی ادارے میں اگر نظم قائم کرنا ہے تو اس کا چوٹی (top) کا سربراہ ایک ہی ہونا چاہیے۔ لہٰذا جب ایک مرد اور ایک عورت سے ایک خاندانی ادارہ وجود میں آئے تو اس کا سربراہ کون ہوگا —— مرد یا عورت؟ مرد اور عورت انسان ہونے کے ناطے بالکل برابر ہیں' ایک ہی باپ کے نطفے سے بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی۔ ایک ہی ماں کے رحم میں بہن نے بھی پرورش پائی ہے اور بھائی نے بھی۔ لہٰذا اس اعتبار سے شرفِ انسانیت میں' نوعِ انسانیت کے فرد کی حیثیت سے' دونوں برابر ہیں۔ لیکن جب ایک مرد اور ایک عورت مل کر خاندان کی بنیاد رکھتے ہیں تو اب یہ برابر نہیں رہے۔ جیسے انسان سب برابر ہیں' لیکن

ایک دفتر میں چپڑاسی اور افسر برابر نہیں ہیں' ان کے الگ الگ اختیارات اور فرائض ہیں۔

قرآن حکیم میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ جو احکام دیے گئے ہیں وہ خاندانی نظام اور عائلی معاملات ہی سے متعلق ہیں۔ اس لیے کہ انسانی تمدن کی جڑ اور بنیاد یہی ہے۔ یہاں سے خاندان بنتا ہے اور خاندانوں کے اجتماع کا نام معاشرہ ہے۔ پاکستانی معاشرے کی مثال لے لیجیے۔ اگر ہماری آبادی اِس وقت چودہ کروڑ ہے اور آپ ایک خاندان کے سات افراد شمار کرلیں تو ہمارا معاشرہ دو کروڑ خاندانوں پر مشتمل ہے۔ خاندان کا ادارہ مستحکم ہوگا تو معاشرہ مستحکم ہو جائے گا۔ خاندان کے ادارے میں صلاح اور فلاح ہوگی تو معاشرے میں بھی صلاح وفلاح نظر آئے گی۔ اگر خاندان کے ادارے میں فساد' بے چینی' ظلم اور ناانصافی ہوگی' میاں اور بیوی میں جھگڑے ہو رہے ہوں گے تو پھر وہاں اولاد کی تربیت صحیح نہیں ہو سکتی' ان کی تربیت میں یہ منفی چیزیں شامل ہو جائیں گی اور اسی کا عکس پورے معاشرے پر پڑے گا۔ چنانچہ خاندانی ادارے کی اصلاح اور اس کے استحکام کے لیے قرآن مجید میں بڑی تفصیل سے احکام دیے گئے ہیں' جنہیں عائلی قوانین کہا جاتا ہے۔

اس ضمن میں طلاق ایک اہم معاملہ ہے۔ اس میں مرد اور عورت کو برابر کا اختیار نہیں دیا گیا۔ جہاں تک شادی کا تعلق ہے اس میں عورت کی رضامندی ضروری ہے' اسے شادی سے انکار کرنے کا حق حاصل ہے' اس پر جبر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک مرتبہ جب وہ نکاح میں آ گئی ہے تو اب شوہر کا پلڑا بھاری ہے' وہ اسے طلاق دے سکتا ہے۔ اگر ظلم کے ساتھ دے گا تو اللہ کے ہاں جواب دہی کرنی پڑے گی اور پکڑ ہو جائے گی۔ لیکن بہرحال اسے اختیار حاصل ہے۔ عورت خود طلاق نہیں دے سکتی' البتہ طلاق حاصل کر سکتی ہے' جسے ہم ''خلع'' کہتے ہیں۔ وہ عدالت کے ذریعے سے یا خاندان کے بڑوں کے ذریعے سے خلع حاصل کر سکتی ہے' لیکن اسے مرد کی طرح طلاق دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح اگر مرد نے ایک یا دو طلاقیں دے دیں اور ابھی عدت پوری نہیں ہوئی تو اسے رجوع کا حق حاصل ہے۔ اس پر عورت انکار نہیں کر سکتی۔ یہ تمام چیزیں ایسی ہیں جو موجودہ زمانے میں خواتین کو اچھی نہیں لگتیں۔ اس لیے کہ آج کی دنیا میں مساواتِ مرد وزن کا فلسفہ شیطان کا سب سے بڑا فلسفہ اور معاشرے میں فتنہ وفساد اور گندگی پیدا کرنے کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اور اب ہمارے ایشیائی ممالک خاص طور پر مسلمان ممالک میں خاندانی نظام کی جو بچی کھچی شکل باقی رہ گئی ہے اور جو کچھ رہی سہی اقدار موجود ہیں' انہیں تباہ و برباد کرنے کی سرتوڑ کوششیں ہو رہی ہیں۔ قاہرہ کانفرنس اور بیجنگ کانفرنس کا مقصد یہی ہے کہ ایشیا کا مشرق اور مغرب دونوں طرف سے گھیراؤ کیا جائے تاکہ یہاں کی عورت کو آزادی دلائی جائے۔ مرد وعورت کی مساوات اور عورتوں کی آزادی (emancipation) کے نام پر ہمارے خاندانی نظام کو اسی طرح برباد کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے جس طرح ان کے ہاں برباد ہو چکا ہے۔ امریکی صدر بل کلنٹن نے اپنے سالِ نو کے پیغام میں کہا تھا کہ جلد ہی ہماری قوم کی اکثریت ''حرام زادوں'' (born without any wedlock) پر مشتمل ہوگی۔ وہاں اب محض ''one parent family'' رہ گئی ہے۔ ماں کی حیثیت باپ کی بھی ہے اور ماں کی بھی۔ وہاں کے بچے اپنے باپ کو جانتے ہی نہیں۔ اب وہاں ایک مہم زور وشور سے اٹھ رہی ہے کہ ہر انسان کا حق ہے کہ اسے معلوم ہو کہ اس کا باپ کون ہے۔ یہ عظیم تباہی ہے جو مغربی معاشرے پر آ چکی ہے اور ہمارے ہاں بھی لوگ اس معاشرے کی نقالی اختیار کر رہے ہیں اور یہ نظریۂ مساواتِ مرد وزن بہت ہی تابناک اور خوشنما الفاظ کے ساتھ سامنے آ رہا ہے۔

البتہ اس معاملے کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے۔ اسلام نے عورتوں کو جو حقوق دیے ہیں بدقسمتی سے ہم مسلمانوں نے وہ بھی ان کو نہیں دیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہنوں پر ابھی تک ہمارا ہندوانہ پس منظر مسلط ہے اور ہندوؤں کے معاشرے میں عورت کی

قطعاً کوئی حیثیت ہی نہیں۔ وراثت کا حق تو بہت دُور کی بات ہے‘ اسے تو اپنے شوہر کی موت کے بعد زندہ رہنے کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔ اسے تو شوہر کی چِتا کے ساتھ ہی جل کر ستی ہو جانا چاہیے۔ گویا اس کا تو کوئی قانونی وجود (legal entity) ہے ہی نہیں۔ ہمارے آباء و اَجداد مسلمان تو ہو گئے تھے‘ لیکن اسلامی تعلیمات کے مطابق ان کی تربیت نہیں ہو سکی تھی‘ لہٰذا ہمارے ذہنوں پر وہی ہندوانہ تصوّرات مسلط ہیں کہ عورت تو مرد کے پاؤں کی جوتی کی طرح ہے۔ یہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں کہ ان کے جائز حقوق بھی ان کو نہیں دیتے‘ اس کے نتیجے میں ہم اپنے اوپر ہونے والی مغربی یلغار کو مؤثر کرنے میں خود مدد دے رہے ہیں۔ اگر ہم اپنی خواتین کو وہ حقوق نہیں دیں گے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے ان کے لیے مقرر کیے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ آزادیٔ نسواں‘ حقوقِ نسواں اور مساواتِ مرد و زن جیسے خوش نما عنوانات سے جو دعوت اٹھی ہے وہ لازماً انہیں کھینچ کر لے جائے گی۔ لہٰذا اس طرف بھی دھیان رکھیے۔ ہمارے ہاں دین دار گھرانوں میں خاص طور پر عورتوں کے حقوق نظر انداز ہوتے ہیں۔ اس کو سمجھنا چاہیے کہ اسلام میں عورتوں کے کیا حقوق ہیں اور ان کی کس قدر دلجوئی کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِاَهْلِهٖ وَاَنَا خَيْرُكُمْ لِاَهْلِيْ)) (۲۸) ”تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو اپنے گھر والوں کے لیے اچھے ہوں۔ اور جان لو کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے اچھا ہوں“۔ لہٰذا ضروری ہے کہ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک ہو‘ ان کی دلجوئی ہو‘ ان کے احساسات کا بھی پاس کیا جائے۔ البتہ جہاں دین اور شریعت کا معاملہ آ جائے وہاں کسی لچک کی گنجائش نہ ہو‘ وہاں آپ شمشیر برہنہ ہو جائیں اور صاف صاف کہہ دیں کہ یہ معاملہ دین کا ہے‘ اس میں مَیں تمہاری کوئی رعایت نہیں کر سکتا‘ ہاں اپنے معاملات کے اندر مَیں ضرور نرمی کروں گا۔

اس ساری بحث کو ذہن میں رکھیے۔ ہمارے جدید دانشور اس آیت کے درمیانی الفاظ کو تو لے لیتے ہیں: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠﴾ اور اس سے مساواتِ مرد و زن کا مفہوم نکالنے کی کوشش کرتے ہیں‘ لیکن ان سے پہلے والے الفاظ ﴿وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ﴾ اور بعد والے الفاظ ﴿وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ سے صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل بالکل غلط ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت سے جو خاندانی ادارہ وجود میں آتا ہے‘ اسلام اس کا سربراہ مرد کو ٹھہراتا ہے۔ یہ فلسفہ زیادہ وضاحت سے سورۃ النساء میں بیان ہوگا جہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ...﴾ (آیت ۳۴)۔ یہاں اس کی تمہید آ گئی ہے تاکہ یہ کڑوی گولی خواتین کے حلق سے ذرا نیچے اترنی شروع ہو جائے۔ اس آیت کا ترجمہ ایک بار پھر دیکھ لیجیے: ”اور ان کے شوہر اس کے زیادہ حق دار ہیں کہ انہیں لوٹا لیں اس عدت کے دوران میں اگر وہ واقعۃً اصلاح چاہتے ہوں۔ اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق۔ اور مَردوں کے لیے ان پر ایک درجہ فوقیت کا ہے۔ اور اللہ زبردست ہے‘ حکیم ہے“۔ اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داریاں عورت کے حوالے کی ہیں‘ جس طرح کے اس پر فرائض عائد کیے ہیں ویسے ہی اس کو حقوق بھی عطا کیے ہیں۔ یہ دنیا کا مسلّمہ اصول ہے کہ حقوق و فرائض باہم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اگر آپ کی ذمہ داری زیادہ ہے تو حقوق اور اختیارات بھی زیادہ ہوں گے۔ اگر آپ پر ذمہ داری بہت زیادہ ڈال دی جائے لیکن حقوق اور اختیارات اس کی مناسبت سے نہ ہوں تو آپ اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر سکتے۔ جہاں ذمہ داری کم ہوگی وہاں حقوق اور اختیارات بھی کم ہوں گے۔ یہ دونوں چیزیں متناسب (proportionate) چلتی ہیں۔

اب ہم اگلی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

۲۸۔ سنن الترمذی‘ کتاب المناقب‘ باب فضل ازواج النبی۔

آیات ۲۲۹ تا ۲۳۱

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـئًا اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ فَلَا تَعۡتَدُوۡهَا ۚ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنۡۢ بَعۡدُ حَتّٰى تَنۡكِحَ زَوۡجًا غَيۡرَهٗ ؕ فَاِنۡ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَاۤ اَنۡ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنۡ ظَنَّاۤ اَنۡ يُّقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوۡمٍ يَّعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۳۰﴾ وَاِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغۡنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ سَرِّحُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ ۪ وَّلَا تُمۡسِكُوۡهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوۡا ۚ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوۡۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۠ وَّاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمَاۤ اَنۡزَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنَ الۡكِتٰبِ وَالۡحِكۡمَةِ يَعِظُكُمۡ بِهٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع

آیت ۲۲۹ ﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪﴾ ''طلاق دو مرتبہ ہے۔''

یعنی ایک شوہر کو دو مرتبہ طلاق دے کر رجوع کر لینے کا حق ہے۔ ایک دفعہ طلاق دی اور عدت کے اندر اندر رجوع کر لیا تو ٹھیک ہے۔ پھر طلاق دے دی اور عدت کے اندر اندر رجوع کر لیا تو بھی ٹھیک ہے۔ تیسری مرتبہ طلاق دے دی تو اب وہ رجوع نہیں کر سکتا۔

﴿فَاِمۡسَاكٌۢ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ ؕ﴾ ''پھر یا تو معروف طریقے سے روک لینا ہے یا پھر خوبصورتی کے ساتھ رخصت کر دینا ہے۔''

یعنی دو مرتبہ طلاق دینے کے بعد اب فیصلہ کرو۔ یا تو اپنی بیوی کو نیکی اور بھلائی کے ساتھ گھر میں روک لو' تنگ کرنے اور پریشان کرنے کے لیے نہیں' یا پھر بھلے طریقے سے' بھلے مانسوں کی طرح اسے رخصت کر دو۔

﴿وَلَا يَحِلُّ لَـكُمۡ اَنۡ تَاۡخُذُوۡا مِمَّاۤ اٰتَيۡتُمُوۡهُنَّ شَيۡـئًا﴾ ''اور تمہارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جو کچھ تم نے انہیں دیا تھا اس میں سے کچھ بھی واپس لو''

جب تم طلاق دے رہے ہو تو تم نے انہیں جو مہر دیا تھا اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتے۔ ہاں اگر عورت خود طلاق مانگے تو اسے اپنے مہر میں سے کچھ چھوڑنا پڑ سکتا ہے۔ لیکن جب مرد طلاق دے رہا ہو تو وہ اس میں سے کچھ بھی واپس نہیں لے سکتا جو وہ اپنی بیوی کو دے چکا ہے۔ سورۃ النساء (آیت ۲۰) میں یہاں تک الفاظ آئے ہیں کہ اگر چہ تم نے سونے کا ڈھیر (قِنطار) دے دیا ہو پھر بھی اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

﴿اِلَّاۤ اَنۡ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''سوائے اس کے کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔''

مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازدواجی زندگی کے ضمن میں جو اہداف و مقاصد معین فرمائے ہیں‘ اس کے لیے جو احکام دیے ہیں اور جو آداب بتائے ہیں‘ فریقین اگر یہ محسوس کریں کہ ہم انہیں ملحوظ نہیں رکھ سکتے تو یہ ایک استثنائی صورت ہے‘ جس میں عورت کوئی مال یا رقم فدیہ کے طور پر دے کر ایسے شوہر سے خلاصی حاصل کر سکتی ہے۔

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ﴾ ’’پس اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ وہ دونوں حدودِ الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے‘ تو ان دونوں پر اس معاملے میں کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیہ میں دے۔‘‘

یعنی ایسی صورت میں عورت اگر فدیہ کے طور پر کچھ دے دلا کر اپنے آپ کو چھڑا لے تو اس میں فریقین پر کوئی گناہ نہیں۔ مثلاً کسی عورت کا مہر دس لاکھ تھا‘ وہ اس میں سے پانچ لاکھ شوہر کو واپس دے کر اس سے خلع لے لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ﴾ ’’یہ اللہ کی حدود ہیں‘ پس ان سے تجاوز مت کرو۔‘‘

دیکھئے روزے وغیرہ کے ضمن میں حدود اللہ کے ساتھ ﴿فَلَا تَقْرَبُوْهَا﴾ فرمایا تھا۔ یہاں فرمایا: ﴿فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ﴾ اس لیے کہ ان معاملات میں لوگ بڑے دھڑلے سے اللہ کی مقرر کردہ حدود کو پامال کر جاتے ہیں۔ اگرچہ قانون باقی رہ جاتا ہے مگر اس کی روح ختم ہو جاتی ہے۔

﴿وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۲۹﴾ ’’اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔‘‘

آیت ۲۳۰ ﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَیْرَهٗ ؕ﴾ ’’پھر اگر وہ (تیسری مرتبہ) اسے طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لیے جائز نہیں ہے‘ جب تک کہ وہ عورت کسی اور شوہر سے نکاح نہ کرے۔‘‘

تیسری طلاق دے چکنے کے بعد اگر کوئی شخص پھر اسی عورت سے نکاح کرنا چاہے تو جب تک وہ عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اور وہ اسے طلاق نہ دے اس وقت تک یہ عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔ اسے ’’حلالہ‘‘ کہا جاتا ہے۔ لیکن ’’حلالہ‘‘ کے نام سے ہمارے ہاں جو مکروہ دھندا مروّج ہے کہ ایک معاہدے کے تحت عورت کا نکاح کسی مرد سے کیا جاتا ہے کہ تم پھر اسے طلاق دے دینا‘ اس پر رسول اللہ ﷺ نے لعنت فرمائی ہے۔

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا﴾ ’’پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے‘‘

یعنی وہ عورت دوسری جگہ پر شادی کر لے‘ لیکن دوسرے شوہر سے بھی اس کی نہ بنے اور وہ بھی اس کو طلاق دے دے۔

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِمَآ اَنْ یَّتَرَاجَعَآ﴾ ’’تو اب کوئی گناہ نہیں ہوگا ان دونوں پر کہ وہ مراجعت کر لیں‘‘

اب وہ عورت اپنے سابقہ شوہر سے نکاح کر سکتی ہے۔ دوسرے شوہر سے نکاح کے بعد عورت کو شاید عقل آ جائے کہ زیادتی میری ہی تھی کہ پہلے شوہر کے ہاں بس نہیں سکی۔ اب دوسری مرتبہ تجربہ ہونے پر ممکن ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔ اب اگر وہ دوبارہ اپنے سابقہ شوہر کی طرف رجوع کرنا چاہے تو اس کی اجازت ہے کہ وہ پھر سے نکاح کر لیں۔

﴿اِنْ ظَنَّآ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اگر ان کو یہ یقین ہو کہ وہ اللہ کی حدود کی پاسداری کر سکیں گے۔‘‘

ازدواجی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے جو حدود مقرر کی ہیں اور جو احکام دیے ہیں ان کو بہرحال مدِنظر رکھنا ہے اور تمام معاملات پر فائق رکھنا ہے۔

﴿وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ﴾ ''اور یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' جن کو وہ واضح کر رہا ہے ان لوگوں کے لیے جو علم حاصل کرنا چاہیں۔''

يَعْلَمُوْنَ کا ترجمہ ہے ''جو جانتے ہیں'' یعنی جنہیں علم حاصل ہے' لیکن یہاں اس کا مفہوم ہے ''جو علم کے طالب ہیں''۔ بعض اوقات فعل کو طلبِ فعل کے معانی میں استعمال کیا جاتا ہے۔

آیت ﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ ''اور جب تم لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دو اور پھر وہ اپنی عدّت پوری کر لیں''

﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ ''تو یا تو معروف طریقے سے انہیں روک لو یا اچھے انداز سے انہیں رخصت کر دو۔''

﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا﴾ ''اور تم انہیں مت روکو نقصان پہنچانے کے ارادے سے کہ تم حدود سے تجاوز کرو۔''

دیکھو ایسا مت کرو کہ تم انہیں تنگ کرنے کے لیے روک لو کہ میں اس کی ذرا اور خبر لے لوں' اگر طلاق ہو جائے گی تو یہ آزاد ہو جائے گی۔ غُصّہ اتنا چڑھا ہوا ہے کہ ابھی بھی ٹھنڈا نہیں ہو رہا اور وہ اس لیے رجوع کر رہا ہے تاکہ عورت کو مزید پریشان کرے' اسے اور تکلیفیں پہنچائے۔ اس طرح تو اس نے قانون کا مذاق اڑایا اور اللہ کی دی ہوئی اس اجازت کا ناجائز استعمال کیا۔

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ﴾ ''اور جو کوئی بھی یہ کام کرے گا وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا۔''

﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ ''اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بنالو۔''

ضروری ہے کہ احکامِ شریعت پر ان کی روح کے مطابق عمل کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں خاص طور پر ازدواجی زندگی کے ضمن میں بار بار اللہ کے خوف اور تقویٰ کی تاکید کی گئی ہے۔ اگر تمہارے دل اس سے خالی ہوں گے تو تم اللہ کی شریعت کو کھیل تماشا بنا دو گے' ٹھٹھا اور مذاق بنا دو گے۔

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ﴾ ''اور یاد کرو اللہ کے جو انعامات تم پر ہوئے ہیں''

﴿وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ﴾ ''اور جو اُس نے نازل فرمائی تم پر اپنی کتاب اور حکمت۔''

﴿يَعِظُكُمْ بِهٖ﴾ ''وہ اس کے ذریعے سے تمہیں نصیحت کر رہا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی ایسی عظیم نعمتیں پانے کے بعد بھی اگر تم نے اس کی حدود کو توڑا اور اس کی شریعت کو مذاق بنایا تو پھر تمہیں اس کی گرفت سے ڈرنا چاہیے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو''

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ ''اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا حقیقی علم حاصل ہے۔''

آیات ۲۳۲ تا ۲۳۷

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا
بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ
اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَ الْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ
حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ
وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَا ؕ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾ وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ
وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ
سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَ لٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ؕ وَ لَا تَعْزِمُوْا
عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ
وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ ع ۱۴
تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا
بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ
لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ
اَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

آیت ۲۳۲ ﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ﴾ ''اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو' پھر وہ اپنی عدت پوری کر لیں' تو مت آڑے آؤ اس میں کہ وہ عورتیں پھر نکاح کر لیں اپنے سابق ازواج سے' جبکہ وہ آپس میں رضامند ہو جائیں بھلے طریقے پر۔''

جو عورت طلاق پا کر اپنی عدت پوری کر چکی ہو وہ آزاد ہے کہ جہاں چاہے اپنی پسند سے نکاح کر لے۔ اس کے اس ارادے میں طلاق دینے والے شوہر یا اس کے خاندان والوں کو کوئی رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہیے۔ اسی طرح اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاق دی اور عدت کے دوران رجوع نہیں کیا تو اب عدت کے بعد عورت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو اسی شوہر سے نکاحِ ثانی

کرسکتی ہے۔ آیت ۲۲۸ کے ذیل میں یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ ایک یا دو طلاق کی صورت میں شوہر کو عدت کے دوران رجوع کا حق حاصل ہے۔ لیکن اگر عدت پوری ہو گئی تو اب یہ طلاق رجعی نہیں رہی' طلاقِ بائن ہو گئی۔ اب شوہر اور بیوی کا جو رشتہ تھا وہ ٹوٹ گیا۔ اب اگر یہ رشتہ پھر سے جوڑنا ہے تو دوبارہ نکاح کرنا ہوگا اور اس میں عورت کی مرضی کو دخل ہے۔ عدت کے اندر اندر رجوع کی صورت میں عورت کی مرضی کو دخل نہیں ہے۔ لیکن عدت کے بعد اب عورت کو اختیار ہے' وہ چاہے تو اسی سابق شوہر سے نکاحِ ثانی کر لے اور چاہے تو اپنی مرضی سے کسی اور شخص سے نکاح کر لے۔ البتہ طلاقِ مغلّظ (تیسری طلاق) کے بعد جب تک اس عورت کا نکاح کسی اور مرد سے نہ ہو جائے اور وہ بھی اسے طلاق نہ دے دے' سابق شوہر کے ساتھ اس کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ طلاقِ بائن کے بعد اگر وہی عورت اور وہی مرد پھر سے نکاح کرنا چاہیں تو اب کسی کو اس میں آڑے نہیں آنا چاہیے۔ عام طور پر عورت کے قریبی رشتے دار اس میں رکاوٹ بنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس شخص نے پہلے بھی تمہیں ستایا تھا' اب تم پھر اُسی سے نکاح کرنا چاہتی ہو' ہم تمہیں ایسا نہیں کرنے دیں گے۔

﴿ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ ''یہ وہ چیز ہے جس کی نصیحت کی جا رہی ہے تم میں سے اُس کو جو واقعتاً ایمان رکھتا ہو اللہ پر اور یومِ آخرت پر۔''

جن کے اندر ایمان ہی نہیں ہے ان کے لیے تو یہ ساری نصیحت گویا بھینس کے آگے بین بجانا ہے' جس سے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ﴾ ''یہی طریقہ تمہارے لیے زیادہ پاک اور زیادہ عمدہ ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۲﴾ ''اور اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

لہٰذا تم اپنی عقل کو مقدم نہ رکھو' بلکہ اللہ کے احکام کو مقدم رکھو۔ مرد اور عورت دونوں کا خالق وہی ہے' اسے مرد بھی عزیز ہے اور عورت بھی عزیز ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ)) [۲۹] یعنی تمام مخلوق اللہ کے کُنبے کی مانند ہے۔ لہٰذا اللہ کو تو ہر انسان محبوب ہے' خواہ مرد ہو یا عورت ہو۔ انسان اُس کی تخلیق کا شاہکار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس کا علم بھی کامل ہے' وہ جانتا ہے کہ عورت کے کیا حقوق ہونے چاہئیں اور مرد کے کیا ہونے چاہئیں۔

آیت ۲۳۳ ﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ﴾ ''اور مائیں اپنی اولاد کو دودھ پلائیں پورے دو سال''

﴿لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ﴾ ''اُس شخص کے لیے جو مدتِ رضاعت پوری کرانا چاہتا ہو۔''

اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ مطلقہ عورت اُس کے بچے کو دودھ پلائے اور رضاعت کی مدت پوری کرے تو دو سال تک وہ عورت اس ذمہ داری سے انکار نہیں کر سکتی۔

﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ﴾ ''اور بچے والے کے ذمے ہے بچوں کی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق۔''

اس مدت میں بچے کے باپ پر مطلقہ کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری ہے' جسے ہم نان نفقہ کہتے ہیں' اس لیے کہ قانوناً اولاد

۲۹۔ رواه البيهقي في شعب الايمان والهيثمي في مجمع الزوائد عن عبد الله بن مسعود وعن انس بن مالك رضی اللہ عنہم۔ اسناده ضعيف۔

شوہر کی ہے۔ اس سلسلے میں دستور کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ یعنی مرد کی حیثیت اور عورت کی ضروریات کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ مرد کروڑ پتی ہو لیکن وہ مطلقہ بیوی کو اپنی خادماؤں کی طرح کا نان نفقہ دینا چاہے۔

﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ﴾ ''کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی مگر اس کی وسعت کے مطابق۔''

﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا﴾ ''نہ تو تکلیف پہنچائی جائے کسی والدہ کو اپنے بچے کی وجہ سے''

﴿وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ﴾ ''اور نہ اُس کو جس کا وہ بچہ ہے (یعنی باپ) اُس کے بچے کی وجہ سے۔''

یعنی دونوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے' جیسا کہ حدیث نبویؐ ہے: ((لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ)) (۳۰) یعنی نہ تو نقصان پہنچانا ہے اور نہ ہی نقصان اٹھانا ہے۔

﴿وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ﴾ ''اور وارث پر بھی اسی طرح کی ذمہ داری ہے۔''

اگر بچے کا باپ فوت ہو جائے تو بچے کو دودھ پلانے والی مطلقہ عورت کا نان نفقہ مرحوم کے وارثوں کے ذمے رہے گا۔

﴿فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ﴾ ''پھر اگر ماں باپ چاہیں کہ دودھ چھڑا لیں (دو برس کے اندر ہی) باہمی رضامندی اور صلاح سے''

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ﴾ ''تو ان دونوں پر کچھ گناہ نہیں۔''

﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ﴾ ''اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو''

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو بھی تم پر کچھ گناہ نہیں''

اگر بچے کا باپ یا اُس کے ورثاء بچے کی والدہ کی جگہ کسی اور عورت سے بچے کو دودھ پلوانا چاہتے ہوں تو بھی کوئی حرج نہیں' انہیں اس کی اجازت ہے' بشرطیکہ.....

﴿اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ﴾ ''جب کہ تم (بچے کی ماں کو) وہ سب کچھ دے دو جس کا تم نے دینا ٹھہرایا تھا دستور کے موافق۔''

یہ نہ ہو کہ نان نفقہ بچانے کے لیے اب تم مدتِ رضاعت کے درمیان بچے کی ماں کے بجائے کسی اور عورت سے اس لیے دودھ پلوانے لگو کہ اُسے معاوضہ کم دینا پڑے گا۔ اگر تم کسی دایہ وغیرہ سے دودھ پلوانا چاہتے ہو تو پہلے بچے کی ماں کو بھلے طریقے پر وہ سب کچھ ادا کر دو جو تم نے طے کیا تھا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا﴾ ''اور جو تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں''

﴿يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ﴾ ''تو وہ عورتیں روکے رکھیں اپنے آپ کو چار ماہ دس دن تک۔''

۳۰۔ مسند احمد۔ وسنن ابن ماجہ' کتاب الاحکام' باب من بنی فی حقہ مایضر بجارہ' عن عبادۃ بن الصامت وعن ابن عباس رضی اللہ عنہم۔ قال النووی فی الاربعین: حدیث حسن۔

قبل ازیں آیت ۲۲۸ میں مطلقہ عورت کی عدت تین حیض بیان ہوئی ہے۔ یہاں بیوہ عورتوں کی عدّت بیان کی جارہی ہے کہ وہ شوہر کی وفات کے چار ماہ دس دن بعد تک اپنے آپ کو شادی سے روکے رکھیں۔

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ﴾ ''پس جب وہ اپنی اس مدّت تک پہنچ جائیں (یعنی عدّت گزار لیں)''

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ﴾ ''تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس معاملے میں جو کچھ وہ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں۔''

عدّت گزار چکنے کے بعد وہ آزاد ہیں' جہاں مناسب سمجھیں نکاح کر سکتی ہیں۔ اب تم انہیں روکنا چاہو کہ ہماری ناک کٹ جائے گی' یہ بیوہ ہو کر صبر سے بیٹھ نہیں سکی' اس سے رہا نہیں گیا' اس طرح کی باتیں بالکل غلط ہیں' اب تمہارا کوئی اختیار نہیں کہ تم انہیں روکو۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

آیت ۲۳۵ ﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاۗءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ﴾ ''اور تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اس میں کہ کنایہ و اشارہ میں ظاہر کر دو اُن عورتوں سے پیغامِ نکاح یا پوشیدہ رکھو اپنے دلوں میں۔''

کسی عورت کا عدّت کے دوران نکاح تو نہیں ہو سکتا' نہ ہی اسے واضح طور پر پیغامِ نکاح دیا جا سکتا ہے' البتہ اشارے کنائے میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مجھے اس میں دلچسپی ہے۔ یا پھر یہ بات اپنے دل ہی میں پوشیدہ رکھی جائے اور عدت ختم ہونے کا انتظار کیا جائے۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ﴾ ''اللہ کو معلوم ہے کہ تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے''

آخر تمہیں ان کا خیال تو آئے گا کہ یہ عورت بیوہ ہو گئی ہے' اب میں اس سے شادی کر سکتا ہوں۔ کوئی آدمی یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ یہ جو میرے دل میں بیوہ کے بارے میں خیال آ رہا ہے اور اس سے نکاح کی رغبت پیدا ہو رہی ہے تو شاید میں گناہگار ہو گیا ہوں۔ یہاں اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ ایسے خیال کا آنا گناہ نہیں ہے' یہ قانونِ فطرت ہے۔

﴿وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا﴾ ''لیکن ان سے نکاح کا وعدہ نہ کر رکھو چھپ کر''

ایسا نہ ہو کہ خفیہ ہی خفیہ نکاح کی بات پکّی ہو جائے۔

﴿اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۭ﴾ ''سوائے اس کے کہ کوئی بات کہہ دو معروف طریقے سے۔''

بس کوئی ایسی معروف بات کہہ سکتے ہو جس سے انہیں اشارہ مل جائے۔

﴿وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ۭ﴾ ''اور مت باندھو گرہ نکاح کی جب تک کہ قانونِ شریعت اپنی مدّت کو نہ پہنچ جائے۔''

یعنی اللہ کی مقرر کردہ عدّت جب تک پوری نہ ہو جائے۔ یہاں کتاب سے مراد قانونِ شریعت ہے۔ کتاب اللہ میں بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن مقرر کر دی گئی' اس کا پورا ہونا ضروری ہے' اس سے پہلے نکاح نہیں ہو سکتا۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ﴾ ''اور جان رکھو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے' پس اُس سے ڈرتے رہو۔''

اُس کی پکڑ سے بچنے کی کوشش کرو۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾﴾ ''اور یہ بھی جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا اور بُردبار ہے۔''

اللہ غفور ہے' بخشنے والا ہے' کوئی خطا ہوگئی ہے تو استغفار کرو' توبہ کرو' اللہ معاف فرمائے گا۔ اور وہ حلیم ہے' تحمل کرنے والا ہے' فوراً نہیں پکڑتا' بلکہ ڈھیل دیتا ہے' مہلت دیتا ہے کہ اگر چاہو تو تم توبہ کرلو۔

آیت ﴿۲۳۶﴾ ﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖ﴾ ''تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اگر تم ایسی بیویوں کو طلاق دے دو جن کو نہ تو تم نے ابھی چھوا ہو اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا ہو۔''

اگر کوئی شخص اپنی منکوحہ کو اس حال میں طلاق دینا چاہے کہ نہ تو اس کے ساتھ خلوتِ صحیحہ کی نوبت آئی ہو اور نہ ہی اس کے لیے مہر مقرر کیا گیا ہو تو وہ دے سکتا ہے۔

﴿وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ﴾ ''اور ان کو کچھ خرچ دو۔''

اس صورت میں اگرچہ مہر کی ادائیگی لازم نہیں ہے' لیکن مرد کو چاہیے کہ وہ اسے کچھ نہ کچھ مال و متاعِ دُنیوی کپڑے وغیرہ دے دلا کر فارغ کرے۔

﴿عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ﴾ ''صاحبِ وسعت پر اپنی حیثیت کے مطابق ضروری ہے اور تنگ دست پر اپنی حیثیت کے مطابق۔''

جو وسعت والا ہے' غنی ہے' جس کو کشائش حاصل ہے وہ اپنی حیثیت کے مطابق ادا کرے اور جو تنگ دست ہے وہ اپنی حیثیت کے مطابق۔

﴿مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ ''جو خرچ کہ قاعدہ کے موافق ہے۔''

یہ ساز و سامانِ دنیا جو ہے یہ بھی بھلے انداز میں دیا جائے' ایسا نہ ہو کہ جیسے خیرات دی جا رہی ہو۔

﴿حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾﴾ ''یہ حق ہے محسنین پر۔''

نیکی کرنے والے' بھلے لوگ یہ سمجھ لیں کہ یہ ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ ایک ذمہ داری ہے۔

آیت ﴿۲۳۷﴾ ﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً﴾ ''اور اگر تم عورتوں کو طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور تم ٹھہرا چکے تھے ان کے لیے ایک متعین مہر''

﴿فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾ ''تو جو مہر تم نے طے کیا تھا اب اُس کا آدھا ادا کرنا لازم ہے''

اس صورت میں مقرر شدہ مہر کا آدھا تو تمہیں دینا ہی دینا ہے۔

﴿اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ﴾ ''اِلّا یہ کہ وہ معاف کردیں''

یعنی کوئی عورت خود کہے کہ مجھے آدھا بھی نہیں چاہیے یا کوئی کہے کہ مجھے چوتھائی دے دیجیے۔

﴿اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۭ﴾ ''یا وہ شخص درگزر سے کام لے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔''

اور یہ گرہ مرد کے ہاتھ میں ہے' وہ اسے کھول سکتا ہے۔ عورت از خود طلاق دے نہیں سکتی' لہٰذا مَردوں کے لیے ترغیب ہے کہ وہ اس معاملے میں فراخ دلی سے کام لیں۔

﴿وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ﴾ ''اور یہ کہ تم مَرد درگزر کرو تو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔''

﴿وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ﴾ ''اور اپنے مابین احسان کرنا مت بھلا دو۔''

اس کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے: ''اور تمہارے درمیان ایک کو دوسرے پر جو فضیلت ہے اس کو مت بھولو''۔ یعنی اللہ نے جو فضیلت تم مَردوں کو عورتوں پر دی ہے اس کو مت بھولو۔ چنانچہ تمہارا طرزِ عمل بھی ایسا ہونا چاہیے کہ تم اپنے بڑے ہونے کے حساب سے ان کے ساتھ نرمی کرو اور ان کو زیادہ دو۔ تم نے ان کا جتنا بھی مہر مقرر کیا تھا وہ نصف کے بجائے پورا دے دو اور انہیں معروف طریقے سے عزّت و تکریم کے ساتھ رخصت کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾﴾ ''یقیناً جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔''

آیات ۲۳۸ تا ۲۴۲

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع ۱۵

آیت ۲۳۸ ﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ﴾ ''محافظت کرو تمام نمازوں کی اور خاص طور پر بیچ والی نماز کی۔''

یہ جو بار بار آ رہا ہے کہ جان لو اللہ ہر شے کا جاننے والا ہے' جان رکھو کہ اللہ تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے' جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کی نگاہ میں ہے' جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے' تو اس سب کو قلب و ذہن میں مستحضر رکھنے کے لیے تمہیں پنج وقتہ نماز دی گئی ہے کہ اس کی نگہداشت کرو۔ دنیا کے کاروبار سے نکلو اور اللہ کے حضور حاضر ہو کر اس سے کیا ہوا عہد تازہ کرو۔ حفیظ کا ایک شعر ہے: ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی — آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں!

''صلوٰۃِ وُسطیٰ'' (بیچ والی نماز) کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں' لیکن عام طور پر اس سے مراد عصر کی نماز لی جاتی ہے۔ اس لیے کہ دن میں دو نمازیں فجر اور ظہر اس سے پہلے ہیں اور دو ہی نمازیں مغرب اور عشاء اس کے بعد میں ہیں۔

﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾﴾ ''اور کھڑے ہوا کرو اللہ کے سامنے پورے ادب کے ساتھ۔''

قیام' رکوع اور سجدہ فرائضِ نماز میں سے ہیں۔ رکوع میں بندہ اپنے ربّ کے حضور عاجزی سے جھک جاتا ہے' سجدہ اس جھکنے کی انتہا ہے۔ مطلوب یہ ہے کہ قیام بھی قنوت' عاجزی اور انکساری کے ساتھ ہو' معلوم ہو کہ ایک بندہ اپنے آقا کے سامنے باادب کھڑا ہے۔

آیت ۲۳۹ ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ﴾ ''پھر اگر تم خطرے کی حالت میں ہو تو چاہے پیادہ پڑھ لو یا سوار۔''

دشمن اگر پیچھا کر رہا ہے اور آپ رُک کر تمام شرائط و آداب کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کر دیں گے تو وہ آپ کے سر پر پہنچ جائے گا۔ یا آپ نے کہیں جا کر فوری طور پر حملہ کرنا ہے اور آپ نماز کے لیے رُک جائیں گے تو مطلوبہ ہدف حاصل نہیں کر سکیں گے۔ چنانچہ دشمن سے خطرے کی حالت میں پیدل یا سوار جس حال میں بھی ہوں نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ﴾ ''پھر جب تم امن میں ہو جاؤ''

خطرہ دور ہو جائے اور امن کی حالت ہو۔

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾﴾ ''پھر اللہ کو یاد کرو جیسے کہ تمہیں اُس نے سکھایا ہے جس کو تم نہیں جانتے تھے۔''

اُمت کو نماز کا طریقہ محمد رسول اللہ ﷺ نے سکھایا ہے اور حکم دیا ہے: ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ))[۳۱] ''نماز پڑھو جیسے کہ تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو''۔ نماز کا یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کا سکھایا ہوا ہے۔ روایات سے ثابت ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آ کر محمد رسول اللہ ﷺ کو دو دن نماز پڑھائی ہے۔ ایک دن پانچوں نمازیں اوّل وقت میں اور دوسرے دن پانچوں نمازیں آخری وقت میں پڑھائیں اور بتا دیا کہ ان نمازوں کا وقت ان اوقات کے درمیان ہے۔ چنانچہ نماز کے معاملے میں آنحضور ﷺ کے معلّم حضرت جبرائیلؑ ہیں اور آپ ﷺ پوری اُمت کے لیے معلّم ہیں۔

اب بیوہ عورتوں کے بارے میں مزید ہدایات آ رہی ہیں۔

آیت ۲۴۰ ﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚ﴾ ''اور جو لوگ تم میں سے وفات دے دیے جائیں اور وہ چھوڑ جائیں بیویاں''

﴿وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ﴾ ''تو وہ وصیت کر جائیں اپنی بیویوں کے لیے ایک سال تک کے لیے نان نفقہ کی' بغیر اس کے کہ انہیں گھروں سے نکالا جائے۔''

مثال کے طور پر ایک شخص فوت ہوا ہے اور اس کی چار بیویاں ہیں' جن میں سے ایک کے ہاں اولاد ہے' جبکہ باقی تین اس اولاد کی سوتیلی مائیں ہیں۔ اب یہ اولاد سگی ماں کو تو اپنی ماں سمجھ کر اس کی خدمت کرے گی اور باقی تین کو خواہ مخواہ کی ذمہ داری (liability) سمجھے گی۔ تو فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ ان بیواؤں کو فوراً گھر سے نکال دو' کہ جاؤ اپنا راستہ لو' جس سے تمہاری شادی تھی وہ تو فوت ہو گیا' بلکہ ایک سال کے لیے انہیں گھر سے نہ نکالا جائے اور ان کا نان نفقہ دیا جائے۔ ان آیات کے نزول تک قانونِ وراثت ابھی نہیں آیا تھا' لہٰذا بیواؤں کے بارے میں وصیت کا عبوری حکم دیا گیا' جیسا کہ قبل ازیں آیت ۱۸۰ میں والدین اور قرابت داروں کے لیے وصیت کا عبوری حکم دیا گیا۔ سورۃ النساء میں قانونِ وراثت نازل ہوا تو اس میں والدین کا حق بھی معیّن کر دیا گیا اور شوہر کی وفات کی صورت میں بیوی کے حق کا اور بیوی کی وفات کی صورت میں شوہر کے حق کا بھی تعیّن کر دیا گیا اور اب والدین و عزیز و اقارب اور بیوگان کے حق میں وصیت کی ہدایات منسوخ ہو گئیں۔

﴿فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۭ﴾ ''پھر اگر وہ عورتیں خود نکل جائیں

۳۱۔ صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر اذا کانوا جماعة۔ عن مالک بن الحویرث رضی اللہ عنہ۔

تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں جو کچھ وہ اپنے حق میں معروف طریقے پر کریں۔''

اگر کوئی عورت عدت گزارنے کے بعد دوسری شادی کر کے کہیں بسنا چاہے تو تم اسے سال بھر کے لیے روک نہیں سکتے۔ وہ اپنے حق میں معروف طریقے پر جو بھی فیصلہ کریں وہ اس کی مجاز ہیں' اس کا کوئی الزام تم پر نہیں آئے گا۔

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۴۰﴾ ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

آیت ۲۴۱ ﴿وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ ''اور مطلقہ عورتوں کو بھی ساز و سامانِ زندگی دینا ہے معروف طریقے پر۔''

﴿حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۴۱﴾ ''یہ لازم ہے پرہیزگاروں پر۔''

واضح رہے کہ یہ ہدایت عدت کے وقت تک کے لیے ہے' اُس کے بعد نہیں۔ اسی معاملے میں کلکتہ ہائی کورٹ نے شاہ بانو کیس میں جو ایک فیصلہ دیا تھا اس پر ہندوستان میں شدید احتجاج ہوا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ کوئی مسلمان اگر اپنی بیوی کو طلاق دے دے تو وہ بیوی اگر تو دوسری شادی کر لے تب تو بات دوسری ہے' ورنہ جب تک وہ زندہ رہے گی اس کا نان نفقہ طلاق دینے والے کے ذمے رہے گا۔ اس پر بھارت کے مسلمانوں نے کہا کہ یہ ہماری شریعت میں دخل اندازی ہے' شریعت نے مطلقہ کے لیے صرف عدت تک نان نفقہ کا حق رکھا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے اس مسئلے پر احتجاجی تحریک چلائی' جس میں بہت سے لوگوں نے جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ آخر کار راجیو گاندھی کی حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے اور پھر وہاں یہ قانون بنا دیا گیا کہ ہندوستان کی کوئی عدالت بشمول سپریم کورٹ مسلمانوں کے عائلی قوانین میں دخل نہیں دے سکتی۔ اس پر میں مسلمانانِ بھارت کی عظمت کو سلام پیش کیا کرتا ہوں۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں یہ ہوا کہ ایک فوجی آمر نے عائلی قوانین بنائے جن کے بارے میں سُنّی' شیعہ' اہلِ حدیث' دیوبندی' بریلوی تمام علماء اور جماعت اسلامی کی چوٹی کی قیادت سب نے متفقہ طور پر یہ کہا کہ یہ قوانین خلافِ اسلام ہیں' مگر وہ آج تک چل رہے ہیں۔ ایک اور فوجی آمر گیارہ برس تک یہاں پر کوسِ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ بجاتا رہا اور اسلام اسلام کا راگ بھی الاپتا رہا' لیکن اس نے بھی ان قوانین کو جوں کا توں برقرار رکھا۔ اسی بنیاد پر میں نے اس کی شوریٰ سے استعفاد یا تھا۔ لیکن ہندوستان کے مسلمانوں نے وہاں پر یہ بات نہیں ہونے دی۔

آیت ۲۴۲ ﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲۴۲﴾ ''اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح کر رہا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو (اور سمجھو)۔''

آیات ۲۴۳ تا ۲۵۳

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۲۴۳ وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۴۴ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۴۵ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ

سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا
نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ
تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۴۶﴾ وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ
لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ
يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ
وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۷﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ
يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ
الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ ع ۲۱
اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ اِلَّا
مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ
كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَلَمَّا بَرَزُوْا
لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَاۤ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ
عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ ۙ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ الجزء الثالث (۳)
دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا
اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ
وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾ ع ۲۲

اب جو دو رکوع زیر مطالعہ آ رہے ہیں یہ اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں اس جنگ کا تذکرہ ہے جس کی حیثیت گویا تاریخ بنی اسرائیل کے غزوۂ بدر کی ہے۔ قبل ازیں یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل نے یوشع بن نون کی سرکردگی میں جہاد و قتال کیا تو فلسطین فتح ہو گیا۔ لیکن انہوں نے ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کی بجائے چھوٹی چھوٹی بارہ حکومتیں بنا لیں اور آپس میں لڑتے بھی رہے۔ لیکن تین سو برس کے بعد پھر یہ صورت حال پیدا ہوئی کہ جب ان کے اوپر دنیا تنگ ہو گئی اور آس پاس کی کافر اور مشرک قوموں نے انہیں دبا لیا اور بہت سوں کو اُن کے گھروں اور ان کے ملکوں سے نکال دیا تو پھر تنگ آ کر انہوں نے اُس وقت کے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ یعنی سپہ سالار مقرر کر دیجیے اب ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے۔ چنانچہ وہ جو جنگ

ہوئی ہے طالوت اور جالوت کی' اس کے بعد گویا بنی اسرائیل کا دورِ خلافتِ راشدہ شروع ہوا۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کا یہ دور جسے میں ''خلافتِ راشدہ'' سے تعبیر کر رہا ہوں' ان کے رسولؑ کے انتقال کے تین سو برس بعد شروع ہوا' جبکہ اس اُمتِ مُسلمہ کی خلافتِ راشدہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے ساتھ متصل ہے۔ اس لیے کہ صحابہ کرام ؓ نے جانیں دیں' خون دیا' قربانیاں دیں اور اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہی میں دین غالب ہو گیا اور اسلامی ریاست قائم ہو گئی۔ نتیجتاً آپؐ کے انتقال کے بعد خلافت کا دَور شروع ہو گیا' لیکن وہاں تین سو برس گزرنے کے بعد ان کا دَورِ خلافت آیا ہے۔ اس میں بھی تین خلافتیں تو متفق علیہ ہیں۔ یعنی حضرت طالوت' حضرت داؤد اور حضرت سلیمان ؑ کی خلافت' لیکن چوتھی خلافت پر آ کر تقسیم ہو گئی۔ جیسے حضرت علی ؓ خلیفۂ رابع کے زمانے میں عالمِ اسلام منقسم ہو گیا کہ مصر اور شام نے حضرت علیؓ کی خلافت کو تسلیم نہیں کیا۔ اسی طرح فلسطین کی مملکت حضرت سلیمانؑ کے دو بیٹوں میں تقسیم ہو گئی' اور اسرائیل اور یہودیہ کے نام سے دو ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ قرآن حکیم میں اس مقام پر طالوت اور جالوت کی اس جنگ کا تذکرہ آ رہا ہے جس کے بعد تاریخ بنی اسرائیل میں اسلام کے غلبے اور خلافتِ راشدہ کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ درحقیقت صحابہ کرام ؓ کو ایک آئینہ دکھایا جا رہا ہے کہ اب یہی مرحلہ تمہیں درپیش ہے' غزوۂ بدر پیش آیا چاہتا ہے۔

آیت ۲۴۳ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ ''کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جو نکل کھڑے ہوئے اپنے گھروں سے''

﴿وَهُمْ اُلُوْفٌ﴾ ''جبکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے''

﴿حَذَرَ الْمَوْتِ ۪﴾ ''موت کے ڈر کی وجہ سے۔''

یعنی جب کفّار اور مشرکین نے ان پر غلبہ کر لیا اور یہ دہشت زدہ ہو کر' اپنے ملک چھوڑ کر' اپنے گھروں سے نکل بھاگے۔

﴿فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫﴾ ''تو اللہ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ!''

﴿ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ﴾ ''پھر (اللہ نے) انہیں زندہ کیا۔''

یہاں موت سے مراد خوف اور بزدلی کی موت بھی ہو سکتی ہے جو اُن پر بیس برس طاری رہی' پھر سیموئیل نبی کی اصلاح و تجدید کی کوششوں سے ان کی نشاۃِ ثانیہ ہوئی اور اللہ نے ان کے اندر ایک جذبہ پیدا کر دیا۔ گویا یہاں پر موت اور احیاء سے مراد معنوی اور روحانی و اخلاقی موت اور احیاء ہے۔ لیکن بالفعل جسدی موت اور احیاء بھی اللہ کے اختیار سے باہر نہیں' اس کی قدرت میں ہے' وہ سب کو مار کر بھی دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ تو لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔''

اکثر لوگ شکر گزاری کی روش اختیار کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے احسانات کی ناقدری کرتے ہیں۔

اب سابقہ اُمتِ مُسلمہ کے ''غزوۂ بدر'' کا حال بیان کرنے سے پہلے مسلمانوں سے گفتگو ہو رہی ہے۔ اس لیے کہ یہ سب کچھ ان کی ہدایت کے لیے بیان ہو رہا ہے' تاریخ بیان کرنا قرآن کا مقصد نہیں ہے۔ یہ تو محمد رسول اللہ ﷺ کی انقلابی جدّوجُہد کی تحریک جس مرحلے سے گزر رہی تھی اور انقلابی عمل جس سٹیج پر پہنچ چکا تھا اس کی مناسبت سے سابقہ اُمتِ مُسلمہ کی تاریخ سے واقعات بھی لائے

جارہے ہیں اور اُسی کی مناسبت سے احکام بھی دیے جارہے ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

آیت ۲۴۴ ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۴۴﴾ ''اور جنگ کرو اللہ کی راہ میں' اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا (اور) سب کچھ جاننے والا ہے۔''

آیت ۲۴۵ ﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۭ﴾ ''کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے تو اللہ اُس کو اس کے لیے کئی گنا بڑھاتا رہے۔''

جو انفاق خالص اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے کیا جاتا ہے اسے اللہ اپنے ذمے قرضِ حسنہ سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم میرے دین کو غالب کرنا چاہتے ہو' میری حکومت قائم کرنا چاہتے ہو' تو جو کچھ اس پر خرچ کرو گے وہ مجھ پر قرض ہے' جسے میں کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کروں گا۔

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠﴾ ''اور اللہ تنگ دستی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی دیتا ہے۔''

اللہ ہی کے اختیار میں ہے کسی چیز کو سکیڑ دینا اور کھول دینا' کسی کے رزق کو تنگ کر دینا یا اس میں کشائش کر دینا۔

﴿وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۴۵﴾ ''اور اُسی کی طرف تمہیں لوٹا دیا جائے گا۔''

یہاں دیکھئے جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں چیزوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔ جہاد بالنفس کی آخری شکل قتال ہے اور جہاد بالمال کے لیے پہلے لفظ ''انفاق'' آرہا تھا' اب قرضِ حسنہ لایا جارہا ہے۔

آیت ۲۴۶ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ﴾ ''کیا تم نے غور نہیں کیا بنی اسرائیل کے سرداروں کے معاملے میں' جو انہیں موسیٰؑ کے بعد پیش آیا؟''

﴿اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''جبکہ انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دیجیے' تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔

یہاں بادشاہ سے مراد امیر اور سپہ سالار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نبی کی موجودگی میں بلند ترین مرتبہ تو نبی ہی کا رہے گا' لیکن ایک ایسا امیر نامزد کر دیجیے جو نبی کے تابع ہو کر جنگ کی سپہ سالاری کر سکے۔ میں حدیث بیان کر چکا ہوں کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کوئی نہ کوئی نبی ضرور موجود رہا ہے۔ اُس وقت سیموئیل نبی تھے جن سے سردارانِ بنی اسرائیل نے یہ فرمائش کی تھی۔

﴿قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ﴾ ''انہوں نے کہا کہ تم سے اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ جب تم پر جنگ فرض کر دی جائے تو اُس وقت تم جنگ نہ کرو۔''

یعنی ابھی تو تمہارے بڑے دعوے ہیں' بڑے جوش و خروش اور بہادری کا اظہار کر رہے ہو' لیکن کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ میں اللہ تعالیٰ سے جنگ کی اجازت بھی لوں اور تمہارے لیے کوئی سپہ سالار یا بادشاہ بھی مقرر کر دوں اور پھر تم جنگ سے کنی کترا جاؤ؟

﴿قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ ''انہوں نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں قتال نہ کریں؟''

﴿وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَاۗىِٕنَا ۭ﴾ ''جبکہ ہمیں نکال دیا گیا ہے ہمارے گھروں سے اور اپنے بیٹوں سے۔''

دشمنوں نے ان کے بیٹوں کو غلام اور ان کی عورتوں کو باندیاں بنا لیا تھا اور یہ اپنے ملکوں سے خوف کے مارے بھاگے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اب ہم جنگ نہیں کریں گے تو کیا کریں گے؟

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ﴾ ''پھر جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی''

﴿تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ﴾ ''تو سب پیٹھ پھیر گئے سوائے ان کی ایک قلیل تعداد کے۔''

یہ گویا مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم بھی بہت کہتے رہے ہو کہ حضور ہمیں جنگ کی اجازت ملنی چاہیے لیکن ایسا نہ ہو کہ جب جنگ کا حکم آئے تو وہ تمہیں ناگوار گزرے۔ آیت ۲۱۶ میں ہم یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ﴾ ''تم پر جنگ فرض کی گئی ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۲۴۶﴾ ''اور اللہ ایسے ظالموں سے خوب باخبر ہے۔''

آیت ۲۴۷ ﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ﴾ ''اور اُن سے کہا ان کے نبیؑ نے کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔''

ان کا نام تورات میں ساؤل (Saul) آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اصل نام ساؤل ہو لیکن چونکہ وہ بہت قد آور تھے اس لیے ان کا ایک صفاتی نام یا لقب ''طالوت'' ہو۔ طالوت کے معنی ''لمبے تڑنگے'' کے ہیں۔

﴿قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا﴾ ''انہوں نے کہا کہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسے ہمارے اوپر بادشاہت ملے؟''

﴿وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ﴾ ''جبکہ ہم اس سے زیادہ حق دار ہیں بادشاہت کے''

﴿وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ﴾ ''اور اسے تو مال کی وسعت بھی نہیں دی گئی۔''

وہ تو مفلس ہے اسے تو اللہ تعالیٰ نے زیادہ دولت بھی نہیں دی ہے۔ کیونکہ ان کے معیارات یہی تھے کہ جو دولت مند ہے وہی صاحبِ عزت ہے۔

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ﴾ ''(نبیؑ نے) کہا: (اب جو چاہو کہو) یقیناً اللہ نے اس کو چُن لیا ہے تم پر۔''

یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ (Divine Decision) ہے جسے کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ اللہ نے اُسی کو تمہاری سرداری کے لیے چنا ہے۔

﴿وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ﴾ ''اور اسے کشادگی عطا کی ہے علم اور جسم دونوں چیزوں میں۔''

وہ نہ صرف قد آور اور طاقت ور ہے بلکہ اللہ نے اسے علم اور فہم بھی وافر عطا فرمایا ہے اسے امورِ جنگ سے بھی واقفیت ہے۔ تمہارے نزدیک عزت اور سرداری کا معیار دولت ہے مگر اللہ نے اسے ان دو چیزوں کی بنا پر چنا ہے۔ ایک تو وہ جسمانی طور پر مضبوط اور طاقتور ہے۔ اُس دور میں ظاہر بات ہے اس کی بہت ضرورت تھی۔ اور دوسرے یہ کہ اسے علم، فہم، سمجھ اور دانش دی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی بادشاہت دے دیتا ہے۔''

اللہ کو اختیار ہے کہ اپنا ملک جس کو چاہے دے، وہ جسے چاہے اپنی طرف سے اقتدار بخشے۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۴۷﴾ ''اور اللہ بہت سمائی والا ہے، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس کی وسعت اتھاہ ہے' کوئی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا' اور وہ بڑا علم رکھنے والا ہے' سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ جس کو جو کچھ دیتا ہے بر بنائے علم دیتا ہے کہ کون اس کا مستحق ہے۔

آیت ۲۴۸ ﴿وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ﴾ ''اور ان سے کہا ان کے نبی نے کہ طالوت کی بادشاہت کی ایک نشانی یہ ہوگی کہ تمہارے پاس وہ صندوق آ جائے گا (جو تم سے چھن چکا ہے) جس میں تمہارے لیے تسکین کا سامان ہے تمہارے ربّ کی طرف سے اور کچھ آلِ موسیٰؑ اور آلِ ہارونؑ کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں' وہ صندوق فرشتوں کی تحویل میں ہے۔''

طالوت کی امارت اور بادشاہی کی علامت کے طور پر وہ صندوق تمہارے پاس واپس آ جائے گا۔ اصل میں یہ ''تابوتِ سکینہ'' لکڑی کا ایک بہت بڑا صندوق تھا' جس میں بنی اسرائیل کے انبیاء کرام علیہم السلام کے تبرکات محفوظ تھے۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ صندوق اب بھی مسجد اقصیٰ کے نیچے سرنگ میں موجود ہے۔ انہوں نے بعض ذرائع سے فوٹو لے کر اس کی دستاویزی فلم بھی دکھا دی ہے۔ یہ ''تابوتِ سکینہ'' حضرت سلیمان علیہ السلام کے تعمیر کردہ ہیکل کے تہہ خانے میں رکھا ہوا تھا اور وہیں پر ربانی (رَبَّانِيِّيْنَ) بھی موجود تھے۔ جب اس ہیکل کو منہدم کیا گیا تو وہ اسی میں دب گئے۔ وہ تہہ خانہ چاروں طرف سے بند ہو گیا ہوگا اور ان کی لاشیں اور تابوتِ سکینہ اس کے اندر ہی ہوں گے۔ تابوتِ سکینہ میں بنی اسرائیل کے لیے بہت بڑی روحانی تسکین کا سامان تھا کہ ہمارے پاس حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے تبرکات ہیں۔ اس میں عصائے موسیٰ بھی تھا اور وہ الواح بھی جو حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پر دی گئی تھیں اور جن پر تورات لکھی ہوئی تھی۔ اس تابوت کو دیکھ کر بنی اسرائیل کو اسی طرح تسکین ہوتی تھی جیسے ایک مسلمان کو خانۂ کعبہ کو دیکھ کر تسکین ہوتی ہے۔ اسرائیلیوں کو جب ان کے پڑوسی ملکوں نے شکست دی تو وہ تابوتِ سکینہ بھی چھین کر لے گئے۔ پوری قوم نے اس عظیم سانحے پر ماتم کیا اور اسے بنی اسرائیل سے ساری عزت و حشمت چھن جانے سے تعبیر کیا گیا۔ چنانچہ اس سے ان کے حوصلے مزید پست ہو گئے۔ اب جبکہ اسرائیلیوں نے جنگ کا ارادہ کیا اور وقت کے نبی حضرت سیموئیل علیہ السلام نے طالوت کو ان کا امیر مقرر کیا تو انہیں یہ بھی بتایا کہ طالوت کو اللہ کی طرف سے نامزد کیے جانے کی ایک علامت یہ ہوگی کہ تمہاری تسکین کا سامان ''تابوتِ سکینہ'' جو تم سے چھن گیا تھا' ان کے عہدِ امارت میں تمہیں واپس مل جائے گا اور اس وقت وہ فرشتوں کی تحویل میں ہے۔ ہوا یہ کہ ان کے دشمن جب تابوت چھین کر لے گئے تو وہ ان کے لیے ایک مصیبت بن گیا۔ وہ اسے جہاں رکھتے وہاں طاعون اور دوسری وبائیں پھوٹ پڑتیں۔ بالآخر انہوں نے اسے نحوست کا باعث سمجھتے ہوئے ایک چھکڑے پر رکھا اور بیلوں کو ہانک دیا کہ جدھر چاہیں لے جائیں۔ بیل سیدھے چلتے چلتے اسے بنی اسرائیل کے علاقے میں لے آئے۔ ظاہر ہے کہ یہ معاملہ فرشتوں کی راہنمائی سے ہوا۔ اس طرح وہ تابوتِ سکینہ ان کے پاس واپس پہنچ گیا جو برسوں پہلے ان سے چھن چکا تھا۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۲۴۸﴾ ''یقیناً اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ماننے والے ہو۔''

آیت ۲۴۹ ﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ﴾ ''پھر جب طالوت اپنے لشکروں کو لے کر چلے''

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ﴾ ''تو انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری آزمائش کرے گا ایک دریا سے (یعنی دریائے اُردن)۔''

﴿فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ﴾ ''تو جو اس میں سے (پیٹ بھر کر) پانی پئے گا وہ میرا ساتھی نہیں ہے۔''

﴿وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ﴾ ''اور جو اُس میں سے پانی نہیں پئے گا وہ میرا ساتھی ہے''

﴿اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً ۢ بِيَدِهٖ ۚ﴾ ''سوائے اس کے کہ کوئی اپنے ہاتھ سے صرف چُلّو بھر پانی لے کر پی لے۔''

اصل میں ہر کمانڈر کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ کسی بھی بڑی جنگ سے پہلے اپنے ساتھیوں کے جوش و جذبہ اور عزم و حوصلہ (morale) کو پرکھے اور نظم (discipline) کی حالت کو دیکھے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی غزوۂ بدر سے قبل مشاورت کی تھی کہ مسلمانو! ایک طرف جنوب سے کیل کانٹے سے لیس ایک لشکر آ رہا ہے اور دوسری طرف شمال سے مال و اسباب سے لدا پھندا ایک قافلہ آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان دونوں میں سے ایک تمہیں ضرور ملے گا۔ بتاؤ کدھر چلیں؟ کچھ لوگ جو کمزوری دکھا رہے تھے انہوں نے کہا کہ چلیں پہلے قافلہ لوٹ لیں! اور جو لوگ باہمت تھے انہوں نے کہا حضور! جو آپؐ کا ارادہ ہو' جو آپؐ کی منشا ہو' آپؐ اس کے مطابق فیصلہ فرمائیے' ہم حاضر ہیں! تو یہاں بھی طالوت نے اپنے لشکریوں کا ٹیسٹ لیا کہ وہ میرے حکم کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔

﴿فَشَرِبُوْا مِنْهُ﴾ ''تو انہوں نے اس میں سے (خوب جی بھر کر) پانی پیا''

﴿اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ﴾ ''سوائے اُن میں سے ایک قلیل تعداد کے۔''

﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ﴾ ''تو جب دریا پار کر کے آگے بڑھے طالوت اور اُس کے ساتھی اہلِ ایمان''

واضح رہے کہ سب سے پہلی سکریننگ قبل ازیں ہو چکی تھی۔ ان میں سے جو قتال ہی کے منکر ہو گئے تھے وہ پہلے ہی الگ ہو چکے تھے۔ اب یہ دوسری چھلنی تھی۔ جو اُس میں سے نہیں نکل سکے وہ پانی پی کر بے سدھ ہو گئے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے غزوۂ اُحد میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک ہزار آدمی مدینہ منورہ سے نکلے تھے اور پھر عین وقت پر تین سو افراد ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ تو جب طالوت اور اُن کے ان ساتھیوں نے جو ایمان پر ثابت قدم رہے تھے' دریا پار کر لیا.....

﴿قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۭ﴾ ''تو اُنہوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔''

جالوت (Goliath) بڑا قوی ہیکل اور گرانڈیل انسان تھا۔ زرہ بکتر میں اس کا پورا جسم اس طرح چھپا ہوا تھا کہ سوائے آنکھ کے سوراخ کے جسم کا کوئی حصہ کھلا نہیں تھا۔ اُس کی مبارزت کے جواب میں کوئی بھی مقابلے پر نہیں آ رہا تھا۔

﴿قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''تو کہا اُن لوگوں نے جو یقین رکھتے تھے کہ انہیں (ایک دن) اللہ سے ملاقات کرنی ہے' کہ کتنی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ ایک چھوٹی جماعت بڑی جماعت پر غالب آ گئی اللہ کے حکم سے۔''

سو تم آگے بڑھو' ہمت کرو' اپنی کم ہمتی کا ثبوت نہ دو۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد سے تمہیں فتح حاصل ہو جائے گی۔

﴿وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝۲۴۹﴾ ''اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

آیت ۲۵۰ ﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ ''اور جب وہ مقابلے پر نکلے جالوت اور اس کے لشکروں کے''

بَرَزَ کے معنی ہیں ظاہر ہو جانا' آمنے سامنے آ جانا۔ اب دونوں لشکر میدانِ جنگ میں آمنے سامنے آئے۔ اِدھر طالوت کا لشکر ہے اور اُدھر جالوت کا۔

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا﴾ ''تو انہوں نے دعا کی کہ اے ہمارے ربّ! ہم پر صبر اُنڈیل دے''

''اَفْرَغَ'' کا مفہوم ہے کسی برتن سے کسی کے اوپر پانی اس طرح گرا دینا کہ وہ برتن خالی ہو جائے۔ طالوت اور ان کے ساتھی اہلِ ایمان نے دشمن کے مدِمقابل آنے پر دعا کی کہ اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر کا فیضان فرما' صبر کی بارش فرما دے۔

﴿وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا﴾ ''اور (میدانِ جنگ میں) ہمارے قدموں کو جما دے''

﴿وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۵۰﴾ ''اور ہماری مدد فرما ان کافروں کے مقابلے میں۔''

یہ دعا گویا اہلِ ایمان کو تلقین کی جا رہی ہے کہ جب بدر کے موقع پر تمہارا کُفّار سے مقابلہ ہو گا تو تمہیں یہ دعا کرنی چاہیے۔

آیت ۲۵۱ ﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۙ﴾ ''تو انہوں نے مار بھگایا اُن کو اللہ کے حکم سے۔''

اہلِ ایمان نے اللہ کے اذن سے اور اللہ کی مشیت سے دشمنوں کو شکست دی۔

﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ﴾ ''اور داؤدؑ نے جالوت کو قتل کر دیا''

یہ داؤد وہی حضرت داؤد علیہ السلام ہیں جو جلیل القدر نبی اور بادشاہ ہوئے۔ ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ داؤد ایک گڈریے تھے اور جنگل میں اپنی بھیڑ بکریاں چرایا کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک گوپیا ہوتا تھا' جس کے اندر پتھر رکھ کر وہ اس کو گھما کر مارتے تھے۔ نشانہ اتنا صحیح تھا کہ اس سے وہ اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے جنگلی جانوروں کے جبڑے توڑ دیا کرتے تھے۔ جب طالوت اور جالوت کے لشکر آمنے سامنے تھے تو داؤد اتفاقاً وہاں آ نکلے۔ انہوں نے دیکھا کہ جالوت للکار رہا ہے کہ ہے کوئی جو میرے مقابلہ میں آئے؟ لیکن اِدھر سب کے سب سہمے کھڑے ہیں' کوئی آگے نہیں بڑھ رہا۔ یہ دیکھ کر اُن کی غیرت کو جوش آ گیا۔ انہوں نے طالوت سے اس کے مقابلے کی اجازت مانگی اور کہنے لگے کہ میں تو اپنے گوپیے سے شیروں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں' بھلا اس نامختون کی کیا حیثیت ہے' میں ابھی اس کو کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہوں۔ (واضح رہے کہ ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنّت ہے اور یہ ملّتِ ابراہیمی میں ہمیشہ رائج رہا ہے۔ لیکن کُفّار اور مشرکین کے ہاں ختنہ کا رواج نہیں تھا۔ چنانچہ ''نامختون'' بنی اسرائیل کے ہاں سب سے بڑی گالی تھی۔) داؤدؑ نے سپہ سالار کی اجازت سے اپنا گوپیا اور چند پتھر اٹھائے اور دیوہیکل جالوت کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ جالوت نے ان کا مذاق اڑایا' لیکن انہوں نے اپنے گوپیے میں ایک پتھر رکھ کر ایسے گھما کر چھوڑا کہ وہ سیدھا آنکھ کے سوراخ سے پار ہو کر اس کے بھیجے کے اندر اتر گیا اور جالوت وہیں ڈھیر ہو گیا۔

﴿وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ﴾ ''اور اللہ نے اسے سلطنت اور حکمت عطا کی اور جو کچھ چاہا اسے سکھا دیا۔''

طالوت نے داؤدؑ سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا' اس طرح وہ طالوت کے داماد ہو گئے۔ پھر طالوت نے انہی کو اپنا وارث بنایا اور یہ بادشاہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حکومت و سلطنت بھی عطا فرمائی اور حکمت و نبوت سے بھی نوازا۔ ان دونوں اعتبارات سے اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو سرفراز فرمایا۔ یہ سب انعامات اس واقعے کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام پر ہوئے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اللہ نے

انہیں سکھایا جو کچھ کہ اللہ نے چاہا۔

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ﴾ ''اور اگر (اس طریقے سے) اللہ ایک گروہ کو دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا''

زمین میں جب بھی فساد ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کوئی شکل ایسی پیدا کرتا ہے کہ کسی اور گروہ کو سامنے لا کر مفسدوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو زمین میں فساد ہی فساد پھیل گیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے جنگوں کے ذریعہ سے فسادی گروہوں کا خاتمہ فرمایا ہے۔ ہر بڑا فرعون جو آتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے مقابل کسی موسیٰ کو کھڑا کر دیتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر سرکش اور فسادی کے لیے کوئی نہ کوئی علاج تجویز کیا ہوا ہے۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۵۱﴾ ''لیکن اللہ تعالیٰ تو تمام جہانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔''

آیت ۲۵۲ ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں حق کے ساتھ۔''

یہ قول گویا حضرت جبرائیلؑ کی طرف منسوب ہوگا۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپؐ کو سنا رہے ہیں حق کے ساتھ۔ یہ ایک بامقصد سلسلہ ہے۔

﴿وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۲۵۲﴾ ''اور یقیناً (اے محمد ﷺ) آپ (اللہ کے) رسولوں میں سے ہیں۔''

آیت ۲۵۳ ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ﴾ ''ان رسولوںؑ میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔''

یہ ایک بہت اہم اصول بیان ہو رہا ہے۔ یہ بات قبل ازیں بیان کی جا چکی ہے کہ ''تفریق بین الرسل'' کفر ہے جبکہ ''تفضیل'' قرآن سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اور اس اعتبار سے وہ دوسروں پر ممتاز ہے۔ چنانچہ جزوی فضیلتیں مختلف رسولوں کی ہو سکتی ہیں' البتہ کُلی فضیلت تمام انبیاء و رسل علیہم السلام پر محمد رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے۔

﴿مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ﴾ ''ان میں سے وہ بھی تھے جن سے اللہ نے کلام فرمایا''

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت کا خاص پہلو ہے۔

﴿وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ﴾ ''اور بعض کے درجات (کسی اور اعتبار سے) بڑھا دیے۔''

﴿وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ﴾ ''اور ہم نے عیسیٰ ابن مریمؑ کو بڑے کھلے معجزے دیے''

﴿وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ﴾ ''اور ان کی مدد فرمائی روح القدس (حضرت جبرائیل علیہ السلام) کے ساتھ۔''

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد آنے والے آپس میں نہ لڑتے جھگڑتے''

یعنی نہ تو یہودیوں کی آپس میں جنگیں ہوتیں' نہ یہودیوں اور نصرانیوں کی لڑائیاں ہوتیں' اور نہ ہی نصرانیوں کے فرقے

ایک دوسرے سے لڑتے۔

﴿مِّنۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ﴾ ''اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح تعلیمات آ چکی تھیں''

﴿وَلٰكِنِ اخۡتَلَفُوۡا﴾ ''لیکن انہوں نے اختلاف کیا''

﴿فَمِنۡهُمۡ مَّنۡ اٰمَنَ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ كَفَرَ ؕ﴾ ''پھر کوئی تو اُن میں سے ایمان لایا اور کوئی کفر پر اڑا رہا۔''

﴿وَلَوۡ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقۡتَتَلُوۡا ۟﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو وہ آپس میں نہ لڑتے۔''

یعنی اگر اللہ تعالیٰ جبراً تکوینی طور پر ان پر لازم کر دیتا تو وہ اختلاف نہ کرتے اور آپس میں جنگ وجدال سے باز رہتے۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ ۝۲۵۳﴾ ''لیکن اللہ تو کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے دنیا کو اس حکمت پر بنایا ہے کہ دنیا کی یہ زندگی آزمائش ہے۔ چنانچہ آزمائش کے لیے اُس نے انسان کو آزادی دی ہے۔ تو جو شخص غلط راستے پر جانا چاہتا ہے اسے بھی آزادی ہے اور جو صحیح راستے پر آنا چاہے اسے بھی آزادی ہے۔

آیات ۲۵۴ تا ۲۵۷

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّ لَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝۲۵۴ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلۡحَىُّ الۡقَيُّوۡمُ ۚ لَا تَاۡخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوۡمٌ ؕ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ ؕ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ ۚ وَلَا يُحِيۡطُوۡنَ بِشَىۡءٍ مِّنۡ عِلۡمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرۡسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ ۚ وَلَا يَـُٔوۡدُهٗ حِفۡظُهُمَا ۚ وَهُوَ الۡعَلِىُّ الۡعَظِيۡمُ ۝۲۵۵ لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ قَدۡ تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ ۚ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى ۗ لَا انۡفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۝۲۵۶ اَللّٰهُ وَلِىُّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا ۙ يُخۡرِجُهُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوۡرِ ؕ وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَوۡلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوۡتُ ۙ يُخۡرِجُوۡنَهُمۡ مِّنَ النُّوۡرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ۝۲۵۷ ع ۳۲

تقریباً دو رکوعوں پر مشتمل طالوت اور جالوت کی جنگ کے واقعات ہم پڑھ چکے ہیں اور اب گویا غزوۂ بدر کے لیے ذہنی اور نفسیاتی تیاری ہو رہی ہے۔ غزوات کے لیے جہاں سرفروشی کی ضرورت ہے وہاں انفاقِ مال بھی ناگزیر ہے۔ چنانچہ اب یہاں بڑے زوردار انداز میں انفاقِ مال کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' سورۃ البقرۃ کے نصف آخر میں چار مضامین تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ یعنی انفاقِ مال' قتال' عبادات اور معاملات۔ یہ گویا چار ڈوریاں ہیں جو ان بائیس رکوعوں کے اندر تانے بانے کی طرح گتھی ہوئی ہیں۔

آیت ۲۵۴ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِمَّا رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ﴾ ''اے اہلِ ایمان! خرچ کرو اُس میں سے جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس سے پہلے کہ وہ دن آ دھمکے جس میں نہ

کوئی خرید وفروخت ہوگی' نہ کوئی دوستی کام آئے گی اور نہ کوئی شفاعت مفید ہوگی۔''

﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾﴾ ''اور جو انکار کرنے والے ہیں وہی تو ظالم ہیں۔''

یہاں کافر سے مراد اصطلاحی کافر نہیں' بلکہ معنوی کافر ہیں' یعنی اللہ کے حکم کا انکار کرنے والے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے اس حکم انفاق کی تعمیل نہیں کرتا' دیکھتا ہے کہ دین مغلوب ہے اور اس کو غالب کرنے کی جدوجہد ہو رہی ہے' اس کے کچھ تقاضے ہیں' اس کی مالی ضرورتیں ہیں اور اللہ نے اسے مقدرت دی ہے کہ اس میں خرچ کر سکتا ہے لیکن نہیں کرتا' وہ ہے اصل کافر۔

اس کے بعد اب وہ آیت آ رہی ہے جو از روئے فرمانِ نبوی ﷺ قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت ہے' یعنی ''آیۃ الکرسی''۔ اس کا نام بھی معروف ہے۔ میں نے آپ کو سورۃ البقرۃ میں آنے والے حکمت کے بڑے بڑے موتی اور بڑے بڑے پھول گنوائے ہیں' مثلاً آیۃ الآیات' آیۃ البر' آیۃ الاختلاف' اور اب یہ آیۃ الکرسی ہے جو توحید کے عظیم ترین خزانوں میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے تمام آیاتِ قرآنی کی سردار قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((لِكُلِّ شَيْءٍ سَنَامٌ وَإِنَّ سَنَامَ الْقُرْآنِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ ' وَفِيْهَا آيَةٌ هِيَ سَيِّدَةُ آيِ الْقُرْآنِ' هِيَ آيَةُ الْكُرْسِيِّ)) (۳۲)

''ہر شے کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور یقیناً قرآن حکیم کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے' اس میں ایک آیت ہے جو آیاتِ قرآنی کی سردار ہے' یہ آیۃ الکرسی ہے۔''

جس طرح آیۃ البر اور سورۃ العصر میں ایک نسبت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور نجات کی ساری کی ساری شرائط ایک چھوٹی سی سورۃ میں جمع کر دیں: ﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾ لیکن اس کی تفصیل ایک آیت میں بیان ہوئی ہے اور وہ آیۃ البر ہے۔ چنانچہ ہم نے مطالعۂ قرآن حکیم کا جو منتخب نصاب مرتب کیا ہے اُس میں پہلا درس سورۃ العصر کا ہے اور دوسرا آیۃ البر کا ہے۔ یہی نسبت آیۃ الکرسی اور سورۃ الاخلاص میں ہے۔ سورۃ العصر ایک مختصر سی سورت ہے جبکہ آیۃ البر ایک طویل آیت ہے۔ اسی طرح سورۃ الاخلاص چار آیات پر مشتمل ایک چھوٹی سی سورت ہے اور یہ آیۃ الکرسی ایک طویل آیت ہے۔ سورۃ الاخلاص توحید کا عظیم ترین خزانہ ہے اور توحید کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین سورت ہے' چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اسے ثُلثِ قرآن قرار دیا ہے' جبکہ توحید اور خاص طور پر توحید فی الصفات کے موضوع پر قرآن کریم کی عظیم ترین آیت یہ آیۃ الکرسی ہے۔

آیت ۲۵۵ ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ﴾ ''اللہ وہ معبودِ برحق ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔''

﴿اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ﴾ ''وہ زندہ ہے' سب کا قائم رکھنے والا ہے۔''

وہ از خود اور باخود زندہ ہے۔ اس کی زندگی مستعار نہیں ہے۔ اس کی زندگی ہماری زندگی کی مانند نہیں ہے' جس کے بارے میں بہادر شاہ ظفر نے کہا تھا ؎

عمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں!

اللہ تعالیٰ کی زندگی ''حیاتِ مستعار'' نہیں ہے' وہ کسی کی دی ہوئی نہیں ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ضعف' کوئی کمزوری اور کوئی احتیاج

۳۲۔ سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فی فضل سورۃ البقرۃ وآیۃ الکرسی۔

نہیں ہے۔ وہ خود اپنی جگہ زندہ و جاوید ہستی ہے اور باقی ہر شے کا وجود اس کے حکم سے قائم ہے۔ وہ ''اَلْقَیُّوْمُ'' ہے۔ اُس کے اِذن کے بغیر کوئی شے قائم نہیں ہے۔ سورۃ الاخلاص میں اللہ تعالیٰ کے لیے دو الفاظ ''اَلْاَحَدُ'' اور ''اَلصَّمَدُ'' آئے ہیں۔ وہ اپنی جگہ ''اَلْاَحَدُ'' ہے لیکن باقی پوری کائنات کے لیے ''اَلصَّمَدُ'' ہے۔ اسی طرح وہ از خود ''اَلْحَیُّ'' ہے اور باقی پوری کائنات کے لیے ''اَلْقَیُّوْمُ'' ہے۔

﴿لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ﴾ ''نہ اس پر اونگھ غالب آتی ہے نہ نیند۔''

﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ ''جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اُسی کا ہے۔''

ہر شے کی ملکیتِ تامہ اور ملکیتِ حقیقی اُسی کی ہے۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ ''کون ہے وہ جو شفاعت کر سکے اُس کے پاس کسی کی مگر اُس کی اجازت سے!''

سورۃ البقرۃ میں قبل ازیں تین مرتبہ قیامت کے روز کسی شفاعت کا دوٹوک انداز میں انکار (categorical denial) کیا گیا ہے کہ کوئی شفاعت نہیں! یہاں بھی بہت ہی جلالی انداز اختیار کیا گیا ہے: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗ﴾ یعنی کس کی یہ حیثیت ہے' کس کا یہ مقام ہے' کس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اپنی حیثیت کی بنیاد پر اللہ کے حضور کسی کی شفاعت کر سکے؟ ﴿اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ﴾ ہاں' جس کے لیے اللہ اجازت دے دے! یہاں پہلی مرتبہ استثناء کے ساتھ شفاعت کا ذکر آیا ہے' ورنہ سورۃ البقرۃ کے چھٹے رکوع کی دوسری آیت میں ہم الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ (اُس روز) کسی کی طرف سے کوئی شفاعت قبول کی جائے گی''۔ اسی طرح پندرہویں رکوع کی دوسری آیت میں الفاظ آئے ہیں: ﴿وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ اُس کو کسی کی شفاعت ہی فائدہ دے گی''۔ اور اب اس رکوع کی پہلی آیت میں آ چکا ہے: ﴿وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ ''اور نہ کوئی شفاعت مفید ہوگی''۔ لیکن یہاں ایک استثناء بیان کیا جا رہا ہے کہ جس کو اللہ کی طرف سے اِذنِ شفاعت حاصل ہوگا وہ اُس کے حق میں شفاعت کر سکے گا جس کے لیے اِذن ہوگا۔ یہ ذرا باریک مسئلہ ہے کہ شفاعتِ حقہ کیا ہے اور شفاعتِ باطلہ کیا ہے۔ دورۂ ترجمہ قرآن کے دوران اس پر تفصیل کے ساتھ بحث نہیں کی جا سکتی۔ اس پر میں اپنے تفصیلی درس ریکارڈ کرا چکا ہوں۔ ☆

﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ﴾ ''وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے۔''

عام طور پر دنیا میں ہم کسی کی سفارش کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بھئی میں اس شخص کو بہتر جانتا ہوں' اصل میں یہ جیسا کچھ نظر آتا ہے ویسا نہیں ہے' اس کے بارے میں جو معلومات آپ تک پہنچی ہیں وہ مبنی بر حقیقت نہیں ہیں' اصل حقائق کچھ اور ہیں' وہ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ یہ بات اللہ کے سامنے کون کہہ سکتا ہے؟ جبکہ اللہ تو جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے۔

﴿وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ﴾ ''اور وہ احاطہ نہیں کر سکتے اللہ کے علم میں سے کسی شے کا بھی سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔''

باقی ہر ایک کے پاس جو علم ہے وہ اللہ کا دیا ہوا' عطائی علم ہے۔ بڑے سے بڑے ولی' بڑے سے بڑے رسول اور بڑے سے بڑے فرشتے کا علم بھی محدود ہے۔ فرشتوں کا قول ﴿لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا﴾ ہم چوتھے رکوع میں پڑھ آئے ہیں۔

☆ محترم ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ نے قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ۲۳ / مارچ ۱۹۹۷ء کو آیۃ الکرسی کے درس کے حوالے سے مسئلہ شفاعت پر تفصیلی روشنی ڈالی تھی۔ یہ درس ترتیب و تسوید کے بعد مئی ۲۰۰۲ء کے میثاق میں شائع ہو چکا ہے۔ (مرتب)

﴿وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ﴾ ''اُس کی کرسی تمام آسمانوں اور زمین کو محیط ہے۔''

یہاں کرسی کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس کا اقتدار' اس کی قدرت اور اس کا اختیار (Authority) پوری کائنات کے اوپر حاوی ہے۔ نیز یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اقتدار کی علامت کے طور پر واقعتاً کوئی مجسم شے بھی ہو جس کو ہم کرسی کہہ سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے عرش اور کرسی کے بارے میں یہ دونوں باتیں ذہن میں رکھیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی کوئی مجسم حقیقت ہو جو ہمارے ذہن اور تخیل سے ماورا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے استعارہ مراد ہو کہ اس کا اختیار اور اقتدار آسمانوں اور زمین پر چھایا ہوا ہے۔

﴿وَلَا يَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ﴾ ''اور اس پر گراں نہیں گزرتی ان دونوں کی حفاظت۔''

آسمانوں اور زمین کی حفاظت اور ان کا تھامنا اُس پر ذرا بھی گراں نہیں اور اس سے اس پر کوئی تکان طاری نہیں ہوتی۔

﴿وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۝۲۵۵﴾ ''اور وہ بلند و بالا (اور) بڑی عظمت والا ہے۔''

یہ آیۃ الکرسی ہے جو تمام آیاتِ قرآنی کی سردار اور توحید الٰہی کا ایک بہت بڑا خزانہ ہے۔ اس کے بعد آنے والی دو آیات بھی حکمت اور فلسفۂ دین کے اعتبار سے بڑی عظیم آیات ہیں۔

آیت ۲۵۶ ﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ﴾ ''دین میں کوئی جبر نہیں ہے۔''

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ اسلام میں کسی فرد کو جبراً مسلمان بنانا حرام ہے۔ لیکن اس آیت کا یہ مطلب نکال لینا کہ نظامِ باطل کو ختم کرنے کے لیے بھی کوئی طاقت استعمال نہیں ہو سکتی' پرلے درجے کی حماقت ہے۔ نظامِ باطل ظلم پر مبنی ہے اور یہ لوگوں کا استحصال کر رہا ہے۔ یہ اللہ اور بندوں کے درمیان حجاب اور آڑ بن گیا ہے۔ لہٰذا نظامِ باطل کو طاقت کے ساتھ ختم کرنا مسلمان کا فرض ہے۔ اگر طاقت موجود نہیں ہے تو طاقت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے' لیکن جس مسلمان کا دل نظامِ باطل کو ختم کرنے کی آرزو اور ارادے سے خالی ہے اس کے دل میں ایمان نہیں ہے۔ طاقت اور جبر نظامِ باطل کو ختم کرنے پر صرف کیا جائے گا' کسی فرد کو مجبوراً مسلمان نہیں بنایا جائے گا۔ یہ ہے اصل میں اس آیت کا مفہوم۔

﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ﴾ ''ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔''

جتنی بھی کجیاں ہیں' غلط راستے ہیں' شیطانی پگڈنڈیاں ہیں صراطِ مستقیم کو ان سے بالکل مبرہن کر دیا گیا ہے۔

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ﴾ ''تو جو کوئی بھی طاغوت کا انکار کرے''

دیکھئے' اللہ پر ایمان لانے سے پہلے طاغوت کا انکار ضروری ہے۔ جیسے کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ'' میں پہلے ہر الٰہ کی نفی ہے اور پھر اللہ کا اثبات ہے۔ طاغوت طَغٰی سے ہے' یعنی سرکش۔ تو جس نے اپنی حاکمیت کا اعلان کیا وہ طاغوت ہے' جس نے غیر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کیا وہ بھی طاغوت ہے اور غیر اللہ کی حاکمیت کے تحت بننے والے سارے ادارے طاغوت ہیں' خواہ وہ کتنے ہی خوشنما ادارے ہوں۔ ''عدلیہ'' کے نام سے ایک ادارہ اگر اللہ کے قانون کے مطابق فیصلے نہیں کر رہا' کچھ اور لوگوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق فیصلے کر رہا ہے تو وہ طاغوت ہے۔ ''مقننہ'' کا ادارہ اگر اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق قانون سازی نہیں کر رہا تو وہ بھی طاغوت ہے۔ جو کوئی بھی اللہ کے حدودِ بندگی سے تجاوز کرتا ہے وہ طاغوت ہے۔ دریا جب اپنی حدوں سے باہر نکلتا ہے تو یہ طغیانی ہے: ؎

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام — کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے!

طغٰی اور بغٰی دونوں بڑے قریب کے الفاظ ہیں' جن کا مفہوم طغیانی اور بغاوت ہے۔ فرمایا کہ ''جو کوئی کفر کرے طاغوت کے ساتھ۔''

﴿وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ﴾ ''اور پھر اللہ پر ایمان لائے''

طاغوت سے دوستی اور اللہ پر ایمان دونوں چیزیں یکجا نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کے دشمنوں سے بھی یارانہ ہو اور اللہ کے ساتھ وفاداری کا دعویٰ بھی ہو یہی تو منافقت ہے۔ جبکہ اسلام تو ﴿حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ کے مصداق کامل یکسوئی کے ساتھ اطاعت شعاری کا مطالبہ کرتا ہے۔

﴿فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى﴾ ''تو اُس نے بہت مضبوط حلقہ تھام لیا۔''

جس شخص نے یہ کام کر لیا کہ طاغوت کی نفی کی اور اللہ پر ایمان لایا اس نے ایک مضبوط کُنڈا تھام لیا۔ یوں سمجھئے اگر کوئی شخص سمندری جہاز کے عرشے سے سمندر میں گر جائے' اسے تیرنا بھی نہ آتا ہو اور کسی طرح ہاتھ پیر مار کر وہ جہاز کے کسی کُنڈے کو تھام لے تو اب وہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی اسی سے وابستہ ہے' اب میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ وہ کُنڈا اگر کمزور ہے تو اس کا سہارا نہیں بن سکے گا اور اس کے وزن سے ہی اکھڑ جائے گا یا ٹوٹ جائے گا' لیکن اگر وہ کُنڈا مضبوط ہے تو وہ اس کی زندگی کا ضامن بن جائے گا۔ یہاں فرمایا کہ طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لانے والے شخص نے بہت مضبوط کُنڈے پر ہاتھ ڈال دیا ہے۔

﴿لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ﴾ ''جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے۔''

کبھی علیحدہ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ بہت مضبوط سہارا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے ایک خطبہ میں یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں: ((وَاَوْثَقُ الْعُرٰى كَلِمَةُ التَّقْوٰى)) [۳۳] یعنی تمام کُنڈوں میں سب سے مضبوط کُنڈا تقویٰ کا کُنڈا ہے۔ لہٰذا اس کو مضبوطی کے ساتھ تھامنے کی ضرورت ہے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۵۶﴾ ''اور اللہ سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

آیت ۲۵۷ ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ﴾ ''اللہ ولی ہے اہلِ ایمان کا''

ایمان درحقیقت اللہ اور بندے کے درمیان ایک دوستی کا رشتہ قائم کرتا ہے۔ یہ ولایتِ باہمی یعنی دوطرفہ دوستی ہے۔ ایک طرف مطلوب یہ ہے کہ بندہ اللہ کا ولی بن جائے: ﴿اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۶۲ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝۶۳﴾ (یونس) ''یاد رکھو اللہ کے دوستوں کے لیے نہ تو کسی طرح کا خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور انہوں نے تقویٰ اختیار کیا''۔ دوسری طرف اللہ بھی اہلِ ایمان کا ولی ہے' یعنی دوست ہے' پشت پناہ ہے' مددگار ہے' کارساز ہے۔

﴿يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ ''وہ انہیں نکالتا رہتا ہے تاریکیوں سے نور کی طرف۔''

آپ نوٹ کریں گے کہ قرآن میں ''نُور'' ہمیشہ واحد آتا ہے۔ ''اَنوار'' کا لفظ قرآن میں نہیں آیا' اس لیے کہ نور ایک حقیقتِ واحدہ ہے۔ لیکن ''ظُلُمٰت'' ہمیشہ جمع میں آتا ہے' اس لیے کہ تاریکی کے shades مختلف ہیں۔ ایک بہت گہری تاریکی ہے' ایک ذرا اُس سے کم ہے' پھر اُس سے کمتر ہے۔ کفر' شرک' الحاد' مادہ پرستی' لاادریت (Agnosticism) وغیرہ مختلف قسم کی تاریکیاں ہیں۔ تو جتنے بھی غلط فلسفے ہیں' جتنے بھی غلط نظریات ہیں' جتنی بھی عمل کی غلط راہیں ہیں' ان سب کے اندھیاروں سے نکال کر اللہ اہلِ ایمان کو ایمان کی روشنی کے اندر لاتا رہتا ہے۔

۳۳۔ سلسلة الاحادیث الضعیفة للالبانی' ج ۲۰۵۹' عن زید بن خالد الجهنی رضی اللہ عنہ۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ﴾ ''اور (ان کے برعکس) جنہوں نے کفر کیا' اُن کے اولیاء (پشت پناہ' ساتھی اور مددگار) طاغوت ہیں۔''

﴿يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ﴾ ''وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں کی طرف لے جاتے ہیں۔''

اگر کہیں نور کی تھوڑی بہت رمق انہیں ملی بھی تھی تو اس سے انہیں محروم کر کے انہیں تاریکیوں کی طرف دھکیلتے رہتے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ ''یہی لوگ ہیں آگ والے' یہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْ عِبَادِکَ الْمُؤْمِنِیْنَ، اَللّٰھُمَّ اَخْرِجْنَا مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ آمین یا ربّ العالمین!

اس کے بعد حضرت ابراہیم اور حضرت عزیر علیہما السلام کی زندگی کے کچھ واقعات بیان کیے جا رہے ہیں۔

آیات ۲۵۸ تا ۲۶۰

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۵۸ۙ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰي قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ۭ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۵۹ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰي كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۶۰ ع

آیت ۲۵۸ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ﴾ ''کیا تم نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جس نے حُجت بازی کی تھی ابراہیمؑ سے اُس کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ اللہ نے اُسے بادشاہی دی ہوئی تھی۔''

یہ بابل (عراق) کا بادشاہ نمرود تھا۔ یہ ذہن میں رکھیے کہ نمرود اصل میں لقب تھا' کسی کا نام نہیں تھا۔ جیسے فرعون (ج فراعنہ) مصر کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا اسی طرح نمرود (ج نمارودہ) بابل (عراق) کے بادشاہوں کا لقب تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ''اُر'' میں ہوئی تھی جو بابل (Babylonia) کا ایک شہر تھا اور وہاں نمرود کی بادشاہت تھی۔ جیسے فرعون نے مصر میں اپنی بادشاہت اور اپنی خدائی کا دعویٰ کیا تھا اسی طرح کا دعویٰ نمرود کا بھی تھا۔ فرعون اور نمرود کا خدائی کا دعویٰ درحقیقت سیاسی بادشاہت اور اقتدار کا دعویٰ تھا کہ اختیارِ مطلق ہمارے ہاتھ میں ہے' ہم جس چیز کو چاہیں غلط قرار دے دیں اور جس چیز کو چاہیں صحیح قرار دے دیں۔

یہی اصل میں خدائی اختیار ہے جو انہوں نے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ تحلیل وتحریم اللہ تعالیٰ کا حق ہے' کسی شے کو حلال کرنے یا کسی شے کو حرام کرنے کا اختیارِ واحد اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور جس شخص نے بھی قانون سازی کا یہ اختیار اللہ کے قانون سے آزاد ہو کر اپنے ہاتھ میں لے لیا وہی طاغوت ہے' وہی شیطان ہے' وہی نمرود ہے' وہی فرعون ہے۔ ورنہ فرعون اور نمرود نے یہ دعویٰ تو نہیں کیا تھا کہ یہ دنیا ہم نے پیدا کی ہے۔

﴿ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ ۭ ﴾ ''جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو اُس نے کہا کہ میں بھی زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔''

نمرود نے جیل سے سزائے موت کے دو قیدی منگوائے' ان میں سے ایک کی گردن وہیں اڑا دی اور دوسرے کی سزائے موت معاف کرتے ہوئے اسے رہا کر دیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہنے لگا کہ دیکھو' میں نے جس کو چاہا زندہ رکھا اور جس کو چاہا مار دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دیکھا کہ یہ کٹ حجتی پر اترا ہوا ہے' اسے ایسا جواب دیا جانا چاہیے جو اُس کو چپ کرا دے۔

﴿ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ ﴾ ''ابراہیمؑ نے کہا کہ اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے (اگر تُو خدائی کا مدعی ہے) تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا''

﴿ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ۭ ﴾ ''تو مبہوت ہو کر رہ گیا وہ کافر۔''

اب اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ یہ بات سن کر بھونچکا اور ششدر ہو کر رہ گیا۔

﴿ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۵۸ ﴾ ''اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔''

اللہ نے اسے راہ یاب نہیں کیا' لیکن وہ چپ ہو گیا' اُس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کا کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ اس کے بعد اس نے بُت کدے کے پجاریوں کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ ابراہیمؑ کو آگ میں جھونک دیا جائے۔

آیت ۲۵۹ ﴿ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰي قَرْيَةٍ وَّهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰي عُرُوْشِهَا ۚ ﴾ ''یا پھر جیسے کہ وہ شخص (اس کا واقعہ ذرا یاد کرو) جس کا گزر ہوا ایک بستی پر اور وہ اوندھی پڑی ہوئی تھی اپنی چھتوں پر۔''

تفاسیر میں اگرچہ اس واقعے کی مختلف تعبیرات ملتی ہیں' لیکن یہ دراصل حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ ہے جن کا گزر یروشلم شہر پر ہوا تھا جو تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ بابل (عراق) کے بادشاہ بخت نصر (Nebuchadnezzar) نے ۵۸۶ ق م میں فلسطین پر حملہ کیا تھا اور یروشلم کو تاخت وتاراج کر دیا تھا۔ اس وقت بھی عراق اور اسرائیل کی آپس میں بدترین دشمنی ہے۔ یہ دشمنی درحقیقت ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ بخت نصر کے حملے کے وقت یروشلم بارہ لاکھ کی آبادی کا شہر تھا۔ بخت نصر نے چھ لاکھ نفوس کو قتل کر دیا اور باقی چھ لاکھ کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا ہوا قیدی بنا کر لے گیا۔ یہ لوگ ڈیڑھ سو برس تک اسیری (captivity) میں رہے ہیں اور یروشلم اُجڑا رہا ہے۔ وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں بچا تھا۔ بخت نصر نے یروشلم کو اس طرح تباہ و برباد کیا تھا کہ کوئی دو اینٹیں سلامت نہیں چھوڑیں۔ اُس نے ہیکلِ سلیمانی کو بھی مکمل طور پر شہید کر دیا تھا۔ یہودیوں کے مطابق ہیکل کے ایک تہہ خانے میں ''تابوتِ سکینہ'' بھی تھا اور وہاں ان کے ربانی بھی موجود تھے۔ ہیکل مسمار ہونے پر وہیں ان کی موت واقع ہوئی اور تابوتِ سکینہ بھی وہیں دفن ہو گیا۔ تو جس زمانے میں یہ بستی اُجڑی ہوئی تھی' حضرت عزیر علیہ السلام کا اُدھر سے گزر ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں کوئی متنفس زندہ نہیں اور کوئی عمارت سلامت نہیں۔

﴿ قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ ﴾ ''اُس نے کہا کہ اللہ اس بستی کو اس کے اس طرح مردہ اور برباد ہو جانے

کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟''

ان کا یہ سوال اظہارِ حیرت کی نوعیت کا تھا کہ اس طرح اُجڑی ہوئی بستی میں دوبارہ کیسے احیا ہو سکتا ہے؟ دوبارہ کیسے اس میں لوگ آ کر آباد ہو سکتے ہیں؟ اتنی بڑی تباہی و بربادی کہ کوئی متنفس باقی نہیں' کوئی دو اینٹیں سلامت نہیں!

﴿فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ﴾ ''تو اللہ نے اس پر موت وارد کر دی سو برس کے لیے اور پھر اس کو اٹھایا۔''

﴿قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ﴾ ''پوچھا کتنا عرصہ یہاں رہے ہو؟''

﴿قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ﴾ ''کہنے لگا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ۔''

ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے تھوڑی دیر کے لیے سویا تھا' شاید ایک دن یا دن کا کچھ حصہ میں یہاں رہا ہوں۔

﴿قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ﴾ ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا بلکہ تم پورے سو سال اس حال میں رہے ہو''

﴿فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ﴾ ''تو ذرا تم اپنے کھانے اور اپنے مشروب کو (جو سفر میں تمہارے ساتھ تھا) دیکھو' ان کے اندر کوئی بساند پیدا نہیں ہوئی۔''

ان میں سے کوئی شے گلی سڑی نہیں' ان کے اندر کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی۔

﴿وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ﴾ ''اور (دوسری طرف) اپنے گدھے کو دیکھو (ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں)''

حضرت عزیر علیہ السلام کی سواری کا گدھا اس عرصے میں بالکل ختم ہو چکا تھا' اس کی بوسیدہ ہڈیاں ہی باقی رہ گئی تھیں' گوشت گل سڑ چکا تھا۔

﴿وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ﴾ ''اور تا کہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنائیں''

یعنی اے عزیرؑ! ہم نے تو خود تمہیں لوگوں کے لیے ایک نشانی بنانا ہے' اس لیے ہم تمہیں اپنی یہ نشانی دکھا رہے ہیں تا کہ تمہیں دوبارہ اٹھائے جانے پر یقینِ کامل حاصل ہو۔

﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ ''اور اب ان ہڈیوں کو دیکھو' کس طرح ہم انہیں اٹھاتے ہیں''

﴿ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ﴾ ''پھر (تمہاری نگاہوں کے سامنے) ان کو گوشت پہناتے ہیں۔''

چنانچہ حضرت عزیرؑ کے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے گدھے کی ہڈیاں جمع ہو کر اس کا ڈھانچہ کھڑا ہو گیا اور پھر اس پر گوشت بھی چڑھ گیا۔

﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ﴾ ''پس جب اُس کے سامنے یہ بات واضح ہو گئی''

حضرت عزیر علیہ السلام نے بچشمِ سر ایک مُردہ جسم کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کر لیا۔

﴿قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾﴾ ''وہ پکار اٹھا کہ میں نے پوری طرح جان لیا (اور مجھے یقینِ کامل حاصل ہو گیا) کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے۔''

انہیں یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اس اُجڑی ہوئی بستی کو بھی دوبارہ آباد کر سکتا ہے' اس کی آبادی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی نشأۃِ ثانیہ (Renaissance) کے نقیب کی حیثیت حاصل ہے۔ بابل کی اسارت کے دوران یہود اخلاقی زوال کا شکار تھے۔ جب حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے متذکرہ بالا مشاہدات کرا دیے تو آپؑ نے وہاں جا کر

یہود کو دین کی تعلیم دی اور ان کے اندر روحِ دین کو بیدار کیا۔ اس کے بعد ایران کے بادشاہ کیخورس ☆ (Cyrus) نے جب بابل (عراق) پر حملہ کیا تو یہودیوں کو اسارت (captivity) سے نجات دی اور انہیں دوبارہ فلسطین میں جا کر آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ اس طرح یروشلم کی تعمیرِ نو ہوئی اور یہ بستی ۱۳۶ سال بعد دوبارہ آباد ہوئی۔ پھر یہودیوں نے وہاں ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر کیا جس کو وہ معبدِ ثانی (Second Temple) کہتے ہیں۔ پھر یہ ہیکل ۷۰ عیسوی میں رومن جنرل ٹائٹس کے ہاتھوں تباہ ہو گیا اور اب تک دوبارہ تعمیر نہیں ہو سکا۔ دو ہزار برس ہونے کو آئے ہیں کہ ان کا کعبہ زمین بوس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا بھر کے یہودیوں کے دلوں میں آگ سی لگی ہوئی ہے اور وہ مسجد اقصیٰ کو مسمار کر کے وہاں ہیکل سلیمانی (معبد ثالث) تعمیر کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔ اس کے نقشے بھی تیار ہو چکے ہیں۔ بس کسی دن کوئی ایک دھماکہ ہوگا اور خبر آ جائے گی کہ کسی جنونی (fanatic) نے وہاں جا کر بم رکھ دیا تھا' جس کے نتیجے میں مسجد اقصیٰ شہید ہو گئی ہے۔ آپ کے علم میں ہوگا کہ ایک جنونی یہودی ڈاکٹر نے مسجد الخلیل میں ۷۰ مسلمانوں کو شہید کر کے خود بھی خودکشی کر لی تھی۔ اسی طرح کوئی جنونی یہودی مسجد اقصیٰ میں بم نصب کر کے اس کو گرا دے گا اور پھر یہودی کہیں گے کہ جب مسجد مسمار ہو ہی گئی ہے تو اب ہمیں یہاں ہیکل تعمیر کرنے دیں۔ جیسے ایودھیا میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد ہندوؤں کا موقف تھا کہ جب مسجد گر ہی گئی ہے تو اب یہاں پر ہمیں رام مندر بنانے دو! بہرحال یہ حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ تھا۔ اب اسی طرح کا ایک معاملہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مشاہدہ ہے۔

آیت ۲۶۰ ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ؕ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ ابراہیمؑ نے بھی کہا تھا: پروردگار! ذرا مجھے مشاہدہ کرا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟''

﴿قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ﴾ ''(اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: کیا تم (اس بات پر) ایمان نہیں رکھتے؟''

﴿قَالَ بَلٰى﴾ ''کہا: کیوں نہیں! (ایمان تو رکھتا ہوں)''

﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ ؕ﴾ ''لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔''

یہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا معاملہ ہے کہ انہیں عین الیقین اور حق الیقین کے درجے کا ایمان عطا کیا جاتا ہے۔ انہیں چونکہ ایمان اور یقین کی ایک ایسی بھٹی (furnace) بنانا ہوتا ہے کہ جس سے ایمان اور یقین دوسروں میں سرایت کرے' تو ان کے ایمان و یقین کے لیے ان کو ایسے مشاہدات کروا دیے جاتے ہیں کہ ایمان ان کے لیے صرف ایمان بالغیب نہیں رہتا بلکہ وہ ایمان بالشہادۃ بھی ہو جاتا ہے۔ سورۃ الانعام میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کے نظامِ حکومت کا مشاہدہ کرایا تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج میں آسمانوں پر لے جایا گیا کہ وہ ہر شے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ان مشاہدات سے انبیاء کو ان ایمانی حقائق پر یقینِ کامل ہو جاتا ہے جن کی وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ گویا وہ خود ایمان اور یقین کی ایک بھٹی بن جاتے ہیں۔

﴿قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ﴾ ''فرمایا: اچھا تو چار پرندے لے لو اور انہیں اپنے ساتھ ہلا لو' انہیں اپنے ساتھ اس طرح مانوس کر لو کہ وہ تمہاری آواز سن کر تمہارے پاس آ جایا کریں۔

﴿ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا﴾ ''پھر اُن کے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑ پر ان کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو'

☆ کیخورس کا ذکر سورۃ الکہف میں ''ذوالقرنین'' کے نام سے آیا ہے۔

﴿ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِيْنَكَ سَعْيًا ۭ﴾ ''پھر اُن کو پکارو تو وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔''

اس کی تفصیل میں آتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاروں پرندوں کے سر' دھڑ' ٹانگیں اور اُن کے پر علیحدہ علیحدہ کیے۔ پھر ایک پہاڑ پر چاروں کے سر' دوسرے پہاڑ پر چاروں کے دھڑ' تیسرے پہاڑ پر چاروں کی ٹانگیں اور چوتھے پہاڑ پر چاروں کے پَر رکھ دیے۔ اس طرح انہیں مختلف اجزاء میں تقسیم کر دیا۔ پھر انہیں پکارا تو اُن کے اجزاء مجتمع ہو کر چاروں پرندے اپنی سابقہ ہیئت میں زندہ ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس دوڑتے ہوئے آ گئے۔

﴿وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۲۶۰﴾ ''اور (اس بات کو یقین کے ساتھ) جان لو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے' کمال حکمت والا ہے۔''

آیات ۲۶۱ تا ۲۷۳

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۲۶۱ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۲۶۲ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ۭ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۲۶۳ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۗءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۲۶۴ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۲۶۵ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاۗءُ ۠ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۲۶۶ ع يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۲۶۷ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۲۶۸ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۲۶۹ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ

نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾ اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِىَ ۚ وَاِنۡ
تُخۡفُوۡهَا وَتُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ مِّنۡ سَيِّاٰتِكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ
خَبِيۡرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيۡسَ عَلَيۡكَ هُدٰىهُمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهۡدِىۡ مَنۡ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ
فَلِاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ يُّوَفَّ اِلَيۡكُمۡ وَاَنۡتُمۡ
لَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ضَرۡبًا فِى الۡاَرۡضِ ۫
يَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعۡرِفُهُمۡ بِسِيۡمٰهُمۡ ۚ لَا يَسۡـَٔـلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا ؕ وَمَا
تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ﴿۲۷۳﴾ ع ۳۵

اب جو دو رکوع آ رہے ہیں' ان کا موضوع اِنفاق فی سبیل اللہ ہے' اور اس موضوع پر یہ قرآن مجید کا ذروۃ التسنام (climax) ہے۔ ان کے مطالعہ سے پہلے یہ بات نوٹ کر لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے اپنا مال خرچ کرنے کے لیے دین میں کئی اصطلاحات ہیں۔ سب سے پہلی "اِطعامُ الطّعام" (کھانا کھلانا) ہے: ﴿وَيُطۡعِمُوۡنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسۡكِيۡنًا وَّيَتِيۡمًا وَّاَسِيۡرًا ﴿۸﴾﴾ (الدھر) دوسری اصطلاح ایتائے مال ہے: ﴿وَاٰتَى الۡمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنَ ... الخ﴾ (البقرۃ:۱۷۷) پھر اس سے آگے صدقہ' زکوٰۃ' انفاق اور قرضِ حسنہ جیسی اصطلاحات آتی ہیں۔ یہ پانچ چھ اصطلاحات (terms) ہیں' لیکن ان کے اندر ایک تقسیم ذہن میں رکھیے۔ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے مال خرچ کرنے کی دو بڑی بڑی مدیں ہیں۔ ایک مدّ اَبنائے نوع پر خرچ کرنے کی ہے۔ یعنی قرابت دار' غرباء' یتامیٰ' مساکین' محتاج اور بیواؤں پر خرچ کرنا۔ یہ آپ کے معاشرے کے اجزاء ہیں' آپ کے بھائی بند ہیں' آپ کے عزیز و اقرباء ہیں۔ ان کے لیے خرچ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے اور اس کا اجر ملے گا۔ یہ بھی گویا آپ نے اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خرچ کیا۔ جبکہ دوسری مد ہے عین اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا۔

قرآن حکیم میں انفاق اور قرضِ حسنہ کی اصطلاحیں اس دوسری مد کے لیے آتی ہیں اور پہلی مد کے لیے اطعامُ الطعام' ایتائے مال' صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ کی اصطلاحات ہیں۔ چنانچہ انفاقِ مال یا انفاق فی سبیل اللہ سے مراد ہے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا' اللہ کے دین کی دعوت کو عام کرنے اور اللہ کی کتاب کے پیغام کو عام کرنے کے لیے خرچ کرنا۔ اللہ کے دین کی دعوت کو اس طرح ابھارنا کہ باطل کے ساتھ زور آزمائی کرنے والی ایک طاقت پیدا ہو جائے' ایک جماعت وجود میں آئے۔ اس جماعت کے لیے ساز و سامان فراہم کرنا تاکہ غلبۂ دین کے ہر مرحلے کے جو تقاضے اور ضرورتیں ہیں وہ پوری ہو سکیں' اس کام میں جو مال صرف ہوگا وہ ہے انفاق فی سبیل اللہ یا اللہ کے ذمہ قرضِ حسنہ۔ تو یہاں اصل میں اس انفاق کی بات ہو رہی ہے۔ عام طور پر فی سبیل اللہ کا مفہوم بہت عام سمجھ لیا جاتا ہے اور پانی کی کوئی "سبیل" بنا کر اسے بھی "فی سبیل اللہ" قرار دے دیا جاتا ہے۔ ٹھیک ہے' وہ بھی سبیل تو ہے' نیکی کا وہ بھی راستہ ہے' سبیل اللہ ہے' لیکن "انفاق فی سبیل اللہ" کا مفہوم بالکل اور ہے۔ فقراء و مساکین اور اہلِ حاجت کے لیے صدقات و خیرات ہیں۔ زکوٰۃ بھی اصلاً غریبوں کا حق ہے' لیکن اس میں بھی ایک مد "فی سبیل اللہ" کی رکھی گئی ہے۔ اگر آپ کے عزیز و اقارب اور قرب و جوار میں اہلِ حاجت ہیں' غرباء ہیں تو صدقہ و زکوٰۃ میں ان کا حق فائق ہے' پہلے ان کو دیجیے۔ اس کے بعد اس میں سے جو بھی ہے وہ دین کے کام کے لیے لگائیے۔ جب دین یتیمی کی حالت کو آ گیا ہو تو سب سے بڑا یتیم دین ہے۔ اور آج واقعتاً

دین کی یہی حالت ہے۔ اب ہم ان آیات کا مطالعہ کرتے ہیں:

آیت ۲۶۱ ﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ﴾ ''مثال اُن کی جو اپنے مال اللہ کی راہ میں (اللہ کے دین کے لیے) خرچ کرتے ہیں ایسے ہے جیسے ایک دانہ کہ اُس سے سات بالیاں (خوشے) پیدا ہوں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔''

اس طرح ایک دانے سے سات سو دانے وجود میں آ گئے۔ یہ اُس اضافے کی مثال ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ کیے ہوئے مال کے اجر و ثواب میں ہوگا۔ جو کوئی بھی اللہ کے دین کے لیے اپنا مال خرچ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے مال میں اضافہ کرے گا' اس کو جزا دے گا اور اپنے یہاں اس اجر و ثواب کو بڑھاتا رہے گا۔

﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''اللہ جس کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے۔''

یہ سات سو گنا اضافہ تو تمہیں تمثیلاً بتایا ہے' اللہ اس سے بھی زیادہ اضافہ کرے گا جس کے لیے چاہے گا۔ صرف سات سو گنا نہیں' اور بھی جتنا چاہے گا بڑھاتا چلا جائے گا۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۶۱﴾ ''اور اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں اور اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔

آیت ۲۶۲ ﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''جو لوگ اپنے مال خرچ کرتے ہیں اللہ کی راہ میں''

﴿ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ﴾ ''پھر جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اس کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں''

ان کا طرزِ عمل یہ نہیں ہوتا کہ دیکھئے جی' میں نے اُس وقت اتنا چندہ دیا تھا' معلوم ہوا کہ میرا حق زیادہ ہے' ہم چندے زیادہ دیتے ہیں تو پھر بات بھی تو ہماری مانی جانی چاہیے! یا اگر کوئی شخص اللہ کے دین کے کام میں لگا ہوا ہے اور آپ اس کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں تاکہ وہ فکرِ معاش سے آزاد ہو کر اپنا پورا وقت دین کی خدمت میں لگائے' لیکن اگر کہیں آپ نے اس کو جتا بھی دیا' اس پر احسان بھی رکھ دیا' کوئی تکلیف دہ کلمہ کہہ دیا' کوئی دل آزاری کی بات کہہ دی تو آپ کا جو اجر و ثواب تھا وہ صفر ہو جائے گا۔

﴿لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۶۲﴾ ''ان کا اجر اُن کے ربّ کے پاس محفوظ ہے' اور نہ تو اُن کے لیے کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ کسی رنج و غم سے دوچار ہوں گے۔''

آیت ۲۶۳ ﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ﴾ ''بھلی بات کہنا اور درگزر کرنا''

﴿خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ﴾ ''بہتر ہے اس خیرات سے جس کے بعد اذیت پہنچائی جائے۔''

اگر آپ کے پاس کوئی ضرورت مند آ گیا ہے' کسی نے ہاتھ پھیلا دیا ہے تو اگر آپ اس کی مدد نہیں کر سکتے تو دلداری کا ایک کلمہ کہہ دیجیے' نرمی کے ساتھ جواب دے دیجیے' معذرت کر لیجیے۔ یا اگر کسی سائل نے آپ کے ساتھ درشت رویہ اختیار کیا ہے تو پھر بھی اسے ڈانٹئے نہیں: ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝۱۰﴾ (الضحیٰ) بلکہ درگزر سے کام لیجیے۔ یہ طرزِ عمل اس سے کہیں بہتر ہے کہ ضرورت مند کو کچھ دے تو دیا لیکن اس کے بعد اسے دو چار جملے بھی سنا دیے' اس کی دل آزاری بھی کر دی۔ تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

﴿وَاللّٰهُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ﴿۲۶۳﴾﴾ ''اللہ تعالیٰ غنی ہے اور حلیم ہے۔''

وہ بے نیاز بھی ہے اور بُردبار بھی۔ اگر تم کسی کو کچھ دے رہے ہو تو اصل میں اللہ کو دے رہے ہو۔ اس ضمن میں ایک حدیث قدسی میں بڑی وضاحت آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''قیامت کے دن اللہ عزّوجل فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار ہوا تُو نے میری تیمارداری نہیں کی۔ وہ کہے گا: اے پروردگار! میں تیری تیمارداری کیسے کرتا جبکہ تُو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تُو نہیں جانتا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اور تُو نے اس کی تیمارداری نہیں کی؟ کیا تُو نہیں جانتا کہ اگر تو اس کی تیمارداری کرتا تو مجھے اس کے پاس موجود پاتا! — اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا' تُو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ وہ کہے گا: اے میرے ربّ! میں تجھ کو کھانا کیسے کھلاتا جبکہ تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تُو نہیں جانتا کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا' تُو نے اس کو کھانا نہیں کھلایا؟ کیا تُو نہیں جانتا کہ اگر تُو اسے کھانا کھلاتا تو اس کھانے کو میرے پاس موجود پاتا! — اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا' تُو نے مجھے پانی نہیں پلایا۔ وہ کہے گا: پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاتا جبکہ تُو تو ربّ العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھ سے میرے فلاں بندے نے پانی مانگا تھا' تُو نے اس کو پانی نہیں پلایا تھا' کیا ایسا نہیں ہے کہ اگر تُو اس کو پانی پلا دیتا تو اپنے اس عمل کو میرے پاس موجود پاتا!''(۳۴)

چنانچہ یاد رکھو کہ جو کچھ تم کسی ضرورت مند کو دے رہے ہو وہ درحقیقت اللہ کو دے رہے ہو' جو غنی ہے' جس نے تمہیں سب کچھ عطا کیا ہے۔ اور تمہارے طرزِ عمل کے باوجود بھی اگر وہ تم سے درگزر کر رہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حلیم ہے' بردبار ہے۔ اگر تم اپنے دل سے اُتری ہوئی شے اللہ کے نام پر دیتے ہو' کوئی بے کار اور ردّی چیز اللہ کے نام پر دے دیتے ہو تو اللہ تعالیٰ کی غیرت اگر اسی وقت جوش میں آ جائے تو تمہیں ہر نعمت سے محروم کر دے۔ وہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے' لیکن نہیں کرتا' اس لیے کہ وہ حلیم ہے۔

آیت ۲۶۴ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى﴾ ''اے اہلِ ایمان! اپنے صدقات کو باطل نہ کر لو احسان جتلا کر اور کوئی اذیت بخش بات کہہ کر''

﴿كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ ''اُس شخص کی طرح جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کو دکھانے کے لیے''

اگرچہ اپنا مال خرچ کر رہا ہے' لوگوں کو صدقات دے رہا ہے' بڑے بڑے خیراتی ادارے قائم کر دیے ہیں' لیکن یہ سب کچھ ریاکاری کے لیے' سرکار دربار میں رسائی کے لیے' کچھ اپنے ٹیکس بچانے کے لیے اور کچھ اپنی ناموری کے لیے ہے۔ یہ سارے کام جو ہوتے ہیں اللہ جانتا ہے کہ ان میں کس کی کیا نیت ہے۔

﴿وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''اور وہ ایمان نہیں رکھتا اللہ اور یومِ آخرت پر۔''

جو کوئی ریاکاری کر رہا ہے وہ حقیقت میں اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ ریا اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں' جیسا کہ یہ حدیث ہم متعدد بار پڑھ چکے ہیں:

((مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ، وَمَنْ صَامَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ وَمَنْ تَصَدَّقَ یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَکَ))(۳۵)

۳۴۔ صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب فضل عیادة المریض۔

۳۵۔ مسند احمد: ۱۶۵۱۷۔

''جس نے دکھاوے کے لیے نماز پڑھی اُس نے شرک کیا' جس نے دکھاوے کے لیے روزہ رکھا اُس نے شرک کیا' اور جس نے دکھاوے کے لیے لوگوں کو صدقہ وخیرات دیا اُس نے شرک کیا۔''

﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ﴾ ''تو اس کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر کچھ مٹی (جم گئی) ہو''

اگر کسی چٹان پر مٹی کی تھوڑی سی تہہ جم گئی ہو اور وہاں آپ نے کچھ بیج ڈال دیے ہوں تو ہوسکتا ہے کہ وہاں کوئی فصل بھی اُگ آئے' لیکن وہ انتہائی ناپائیدار ہوگی۔

﴿فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ﴾ ''پھر اس پر زوردار بارش پڑے تو وہ اس کو بالکل صاف پتھر چھوڑ دے۔''

بارش کے ایک ہی زوردار چھینٹے میں چٹان کے اُوپر جمی ہوئی مٹی کی تہہ بھی بہہ گئی' آپ کی محنت بھی ضائع ہوگئی' آپ کا بیج بھی اکارت گیا اور آپ کی فصل بھی گئی۔ بارش سے دھل کر وہ چٹان اندر سے بالکل صاف اور چمٹیل نکل آئی۔ یعنی سب کچھ گیا اور کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاکاری کا یہی انجام ہوتا ہے کہ ہاتھ سے مال بھی دیا اور حاصل کچھ نہ ہوا۔ اللہ کے ہاں کسی اجروثواب کا سوال ہی نہیں۔

﴿لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ﴾ ''ان کی کمائی میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔''

ایسے لوگ اپنے تئیں صدقہ وخیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں اس میں سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۲۶۴﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

وہ ناشکروں اور منکرینِ نعمت کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا اور انہیں بامراد نہیں کرتا۔

اگلی آیت میں فوری تقابل (simultaneous contrast) کے طور پر ان لوگوں کے لیے بھی مثال بیان کی جارہی ہے جو واقعتاً اللہ تعالیٰ سے اجروثواب کی اُمید رکھتے ہوئے خلوص واخلاص سے خرچ کرتے ہیں۔

آیت ۲۶۵ ﴿وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ﴾ ''اور مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال اللہ کی رضاجوئی کے لیے''

﴿وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ ''اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لیے''

﴿كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ﴾ ''اُس باغ کی مانند ہے جو بلندی پر واقع ہو''

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ قدرتی باغ کا یہی تصور ہوتا تھا کہ ذرا اونچائی پر واقع ہے' اس کے دامن میں کوئی ندی بہہ رہی ہے جس سے خود بخود آب پاشی ہو رہی ہے اور وہ سیراب ہو رہا ہے۔

[قادیانیوں نے اسی لفظ ''ربوہ'' کے نام پر پاکستان میں اپنا شہر بنایا۔]

﴿اَصَابَهَا وَابِلٌ﴾ ''اب اگر اس باغ کے اوپر زوردار بارش برسے''

﴿فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ﴾ ''تو دوگنا پھل لائے۔''

﴿فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ﴾ ''اور اگر زوردار بارش نہ بھی برسے تو ہلکی سی پھوار (ہی اس کے لیے کافی ہوجائے)۔''

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۶۵﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہا ہے۔''

لہٰذا تم دروں بینی (intro spection) کرتے رہا کرو کہ تم جو یہ مال خرچ کر رہے ہو واقعتاً خلوصِ دل اور اخلاصِ نیت کے ساتھ اللہ ہی کے لیے کر رہے ہو۔ کہیں غیر شعوری طور پر تمہارا کوئی اور جذبہ اس میں شامل نہ ہو جائے۔ چنانچہ اپنے گریبانوں میں جھانکتے رہو۔

آیت ۲۶۶ ﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ﴾ ''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو' جس کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں''

اہلِ عرب کے نزدیک یہ ایک آئیڈیل باغ کا نقشہ ہے' جس میں کھجور کے درخت بھی ہوں اور انگور کی بیلیں بھی ہوں' پھر اس میں آب پاشی کا قدرتی انتظام ہو۔

﴿لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ﴾ ''اُس کے لیے اس باغ میں ہر طرح کے پھل ہوں''

﴿وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۪﴾ ''اور اس پر بڑھاپا طاری ہو جائے جبکہ اس کی اولاد ابھی ناتواں ہو۔''

﴿فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ﴾ ''اور عین اُس وقت اُس باغ پر ایک ایسا بگولا پھر جائے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جھلس کر رہ جائے؟''

یعنی ایک انسان ساری عمر یہ سمجھتا رہا کہ میں نے تو نیکیوں کے انبار لگائے ہیں' میں نے خیراتی ادارے قائم کیے' میں نے فاؤنڈیشن بنائی' میں نے مدرسہ قائم کیا' میں نے یتیم خانہ بنا دیا' لیکن جب اُس کا نامۂ اعمال پیش ہوگا تو اچانک اسے معلوم ہوگا کہ یہ تو کچھ بھی نہ تھا۔ ع ''جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا!'' بس بادِ سموم کا ایک بگولا آیا اور سب کچھ جلا گیا۔ اس لیے کہ اس میں اخلاص تھا ہی نہیں' نیت میں کھوٹ تھا' اس میں ریاکاری تھی' لوگوں کو دکھانا مقصود تھا۔ پھر اس کا حال وہی ہوگا جس طرح کہ وہ بوڑھا اب کفِ افسوس مل رہا ہے جس کا باغ جل کر خاک ہو گیا اور اس کے کمسن بچے ابھی کسی لائق نہیں۔ وہ خود بوڑھا ہو چکا ہے اور اب دوبارہ باغ نہیں لگا سکتا۔ اس شخص کی مہلتِ عمر بھی ختم ہو چکی ہوگی اور سوائے کفِ افسوس ملنے کے اس کے پاس کوئی چارہ نہ ہوگا۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۶۶﴾ ''اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر کرو۔''

آیت ۲۶۷ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ ''اے ایمان والو! اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو۔''

اللہ کے دین کے لیے خرچ کرنا ہے' اللہ کے نام پر دینا ہے تو جو کچھ تم نے کمایا ہے اس میں سے اچھی چیز' پاکیزہ چیز' بہتر چیز نکالو۔

﴿وَمِمَّاۤ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪﴾ ''اور اس میں سے خرچ کرو جو کچھ ہم نے نکالا ہے تمہارے لیے زمین سے۔''

ظاہر بات ہے کہ زمین سے جو بھی نباتات باہر آ رہی ہیں ان کا پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ چاہے کوئی چراگاہ ہے تو اس کے اندر جو ہریاول ہے وہ اللہ ہی نے پیدا کی ہے۔ کھیت کے اندر آپ نے محنت کی ہے' ہل چلایا ہے' بیج ڈالے ہیں' لیکن فصل کا اُگانا تو آپ کے اختیار میں نہیں ہے' یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ع ''پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟'' چنانچہ فرمایا کہ جو کچھ ہم نے تمہارے لیے

زمین سے نکالا ہے اُس میں سے ہماری راہ میں خرچ کرو!

﴿وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ﴾ ''اور اس میں سے ردّی مال کا ارادہ نہ کرو کہ اسے خرچ کر دو!''

ایسا نہ ہو کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے ردّی اور ناکارہ مال چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو۔ مثلاً بھیڑ بکریوں کا گلہ ہے' اس میں سے تمہیں زکوٰۃ کے لیے بھیڑیں اور بکریاں نکالنی ہیں تو ایسا ہرگز نہ ہو کہ جو کمزور ہیں' ذرا لاغر ہیں' بیمار ہیں' نقص والی ہیں انہیں نکال کر گنتی پوری کر دو۔ اسی طرح عُشر نکالنا ہے تو ایسا نہ کرو کہ گندم کے جس حصے پر بارش پڑ گئی تھی وہ نکال دو۔ تیمم کے معنی قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں۔

﴿وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ﴾ ''اور تم ہرگز نہیں ہو گے اس کو لینے والے (اگر وہ شے تم کو دی جائے) اِلّا یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ۔''

ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم محتاج ہو جاؤ اور تمہیں ضرورت پڑ جائے' پھر اگر تمہیں کوئی ایسی چیز دے گا تو تم قبول نہیں کرو گے' اِلا یہ کہ چشم پوشی کرنے پر مجبور ہو جاؤ۔ احتیاج اس درجے کی ہو کہ نفیس یا خبیث جو شے بھی مل جائے چشم پوشی کرتے ہوئے اسے قبول کر لو۔ ورنہ آدمی اپنے طیبِ خاطر کے ساتھ ردّی شے قبول نہیں کر سکتا۔

﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝۲۶۷﴾ ''اور خوب جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ غنی ہے اور حمید ہے۔''

یہاں ''غنی'' کا لفظ دوبارہ آیا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ تم کسی محتاج اور ضرورت مند کو دے رہے ہو' بلکہ یوں سمجھو کہ اللہ کو دے رہے ہو' جو غنی ہے' سب کی ضرورتیں پوری کرنے والا ہے اور حمید ہے' یعنی اپنی ذات میں خود محمود ہے۔ ایک تو کسی شے کی اچھائی یا حسن یا کمال ایسا ہوتا ہے کہ جسے ظاہر کیا جائے کہ بھئی دیکھو اس میں یہ خوبصورتی ہے۔ اور ایک وہ خوبصورتی ہوتی ہے جو از خود ظاہر ہو۔ ع ''حاجتِ مشاطہ نیست روئے دل آرام را!'' تو اللہ تعالیٰ اتنا ستودہ صفات ہے کہ وہ اپنی ذات میں از خود محمود ہے' اسے کسی حمد کی حاجت نہیں ہے۔

آیت ۲۶۸ ﴿اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ﴾ ''شیطان تمہیں فقر کا اندیشہ دلاتا ہے اور بے حیائی کے کاموں کی ترغیب دیتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ﴾ ''اور اللہ وعدہ کر رہا ہے تم سے اپنی طرف سے مغفرت کا اور فضل کا۔''

اب دیکھ لو' تمہیں کون سا طرزِ عمل اختیار کرنا ہے: ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے!

شیطان تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے کہ اس طرح تمہارا مال کم ہو جائے گا اور تم فقر و فاقہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ اب اگر واقعی تم یہ خوف رکھتے ہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھ پر فقر آ جائے' لہٰذا مجھے اپنا مال سنبھال سنبھال کر' سینت سینت کر رکھنا چاہیے تو تم شیطان کے جال میں پھنس چکے ہو' تم اس کی پیروی کر رہے ہو۔ اور اگر تم نے اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیا اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے کہ وہ میری ساری حاجتیں آج بھی پوری کر رہا ہے' کل بھی پوری کرے گا (اِن شاء اللہ) تو اللہ کی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ پورا ہو کر رہے گا۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۶۸﴾ ''اللہ بہت وسعت والا ہے' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

تم اس کے خزانوں کی محدودیت کا کوئی تصور اپنے ذہن میں نہ رکھو۔

آیت ۲۶۹ ﴿ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ ﴾ ''وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔''

یہ حکمت کی باتیں ہیں' جن کا سمجھنا ہر کس و ناکس کے لیے ممکن نہیں۔ ایک چیزوں کا ظاہر ہے اور ایک باطن ہے' جو حکمت سے نظر آتا ہے۔ ظاہر تو سب کو نظر آ رہا ہے' لیکن کسی شے کی حقیقت کیا ہے' یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے: ؎

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا؟

جس کسی پر یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے وہ حکیم ہے۔ اور حکمت اصل میں انسان کی عقل اور شعور کی پختگی کا نام ہے۔ استحکام اسی ''حکمت'' سے ہی بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ عقل و فہم اور شعور کی یہ پختگی اور حقائق تک پہنچ جانے کی صلاحیت جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

﴿ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ ﴾ ''اور جسے حکمت دے دی گئی اسے تو خیرِ کثیر عطا ہو گیا۔''

اس سے بڑا خیر کا خزانہ تو اور کوئی ہے ہی نہیں۔

﴿ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴾ ''اور نہیں نصیحت حاصل کر سکتے مگر وہی لوگ جو ہوش مند ہیں۔''

ان باتوں سے صرف وہی لوگ سبق لیتے ہیں جو اولوالالباب ہیں' عقل مند ہیں۔ لیکن جو دنیا پر ریجھ گئے ہیں' جن کا سارا دلی اطمینان اپنے مال و زر' جائیداد' اثاثہ جات اور بینک بیلنس پر ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ اولوالالباب (عقل مند) نہیں ہیں۔

آیت ۲۷۰ ﴿ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۭ ﴾ ''اور جو کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو (صدقہ و خیرات دیتے ہو) یا جو بھی تم (اللہ کے نام پر) منت مانتے ہو' تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس سب کو جانتا ہے۔''

﴿ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴾ ''اور (یاد رکھو کہ) ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔''

آیت ۲۷۱ ﴿ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ ﴾ ''اگر تم صدقات کو علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے۔''

خاص طور پر زکوٰۃ کا معاملہ تو علانیہ ہی ہے۔ تو اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو یہ بھی ٹھیک ہے۔ اس لیے کہ کم سے کم فقراء کا حق تو ادا ہو گیا' کسی کی ضرورت تو پوری ہو گئی۔

﴿ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ ﴾ ''اور اگر تم انہیں چھپاؤ اور چپکے سے ضرورت مندوں کو دے دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔''

یاد رہے کہ یہ بات صدقاتِ نافلہ کے لیے ہے۔ لیکن جو صدقاتِ واجبہ ہیں' جو لازماً دینے ہیں' مثلاً زکوٰۃ اور عُشر' ان کے لیے اخفاء نہیں ہے۔ یہ دین کی حکمت ہے' اس کو ذہن میں رکھیے کہ فرض عبادات علانیہ ادا کی جائیں گی۔ یہ وسوسہ بھی شیطان بہت سوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے کہ کیا پانچ وقت مسجد میں جا کر نماز پڑھنے سے لوگوں پر اپنے تقویٰ کا رعب ڈالنا چاہتے ہو؟ گھر میں پڑھ لیا کرو! یا داڑھی اس لیے رکھو گے کہ لوگ تمہیں سمجھیں کہ بڑا متقی ہے؟ ایسے وساوسِ شیطانی کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہیے اور جو چیز فرض و واجب ہے' وہ علی الاعلان کرنی چاہیے' اس کے اظہار میں کوئی رکاوٹ نہیں آنی چاہیے۔ ہاں جو نفلی عبادات ہیں' صدقاتِ نافلہ ہیں یا نفل نماز ہے اسے چھپا کر کرنا چاہیے۔ نفل عبادت کا اظہار بہت بڑا فتنہ ہے۔ لہٰذا فرمایا کہ اگر تم اپنے صدقات چھپا کر چپکے سے ضرورت مندوں کو دے دو تو وہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔

﴿وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ تم سے تمہاری بُرائیوں کو دور کر دے گا۔''

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝۲۷۱﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔''

آیت ۲۷۲ ﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کے ذمہ نہیں ہے کہ ان کو ہدایت دے دیں''

ان کو ہدایت دینے کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے' آپ پر ذمہ داری تبلیغ کی ہے۔ ہم نے آپ کو بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾ ''اور جو بھی مال تم خرچ کرو گے وہ تمہارے اپنے لیے بہتر ہے۔''

اس کا اجر و ثواب بڑھا چڑھا کر تم ہی کو دیا جائے گا' سات سو گنا' چودہ سو گنا یا اس سے بھی زیادہ۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور تم نہیں خرچ کرو گے مگر اللہ کی رضا جوئی کے لیے۔''

تبھی تمہیں اس قدر اجر ملے گا۔ اگر ریا کارانہ خرچ کیا تھا تو اجر کا کیا سوال؟ وہ تو شرک بن جائے گا۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝۲۷۲﴾ ''اور جو بھی مال تم خرچ کرو گے وہ پورا پورا تمہیں لوٹا دیا جائے گا اور تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا۔''

تمہاری ذرا بھی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

اب واضح کیا جا رہا ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا سب سے بڑھ کر حق دار کون ہے۔

آیت ۲۷۳ ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''یہ اُن ضرورت مندوں کے لیے ہے جو گھر کر رہ گئے ہیں اللہ کی راہ میں''

جیسے رسول اللہ ﷺ کے دور میں اصحابِ صُفّہ تھے کہ مسجدِ نبویؐ میں آ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنا وقت تلاشِ معاش میں صَرف نہیں کر رہے' آنحضور ﷺ سے علم سیکھ رہے ہیں اور جہاں جہاں سے مطالبہ آ رہا ہے کہ معلّمین اور مبلّغین کی ضرورت ہے وہاں ان کو بھیجا جا رہا ہے۔ اگر وہ معاش کی جدّوجُہد کرتے تو یہ تعلیم کیسے حاصل کرتے؟ اسی طرح دین کی کسی خدمت کے لیے کچھ لوگ اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں تو وہ اس کا مصداق ہوں گے۔ آپ نے دین کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لیے کوئی تحریک اٹھائی ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ ہمہ وقتی کارکن درکار ہوں گے۔ ان کارکنوں کی معاش کا مسئلہ ہوگا۔ وہ آٹھ آٹھ گھنٹے دفتروں میں جا کر کام کریں اور وہاں افسروں کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سنیں' آنے جانے میں بھی دو دو گھنٹے لگائیں تو اب وہ دین کے کام کے لیے کون سا وقت نکالیں گے اور کیا کام کریں گے؟ لہٰذا کچھ لوگ تو ہونے چاہئیں جو اس کام میں ہمہ وقت لگ جائیں۔ لیکن پیٹ تو ان کے ساتھ بھی ہیں' اولاد تو ان کی بھی ہوگی۔

﴿لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫﴾ ''وہ (اپنے کسبِ معاش کے لیے) زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔''

زمین کے اندر گھوم پھر کر تجارت کرنے کا ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔

﴿يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ﴾ ''ناواقف آدمی اُن کو خوشحال خیال کرتا ہے ان کی خودداری کے سبب۔''

یہ اس طرح کے فقیر تو ہیں نہیں جو لپٹ کر مانگتے ہوں۔ ان کی خودداری کی وجہ سے عام طور پر جو ناواقف شخص ہے وہ سمجھتا ہے کہ

یہ غنی ہیں، خوشحال ہیں، انہیں کوئی ضرورت ہی نہیں، انہوں نے کبھی مانگا ہی نہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح کے سوالی نہیں ہیں، وہ فقیر نہیں ہیں، انہوں نے تو اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے اپنے آپ کو لگا دیا ہے۔ یہ تمہارا کام ہے کہ انہیں تلاش کرو اور ان کی ضروریات پوری کرو۔

﴿تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ﴾ ''تم پہچان لو گے انہیں ان کے چہروں سے۔''

ظاہر بات ہے کہ فقر و احتیاج کا اثر چہرے پر تو آ جاتا ہے۔ اگر کسی کو صحیح غذا نہیں مل رہی ہے تو چہرے پر اس کا اثر ظاہر ہوگا۔

﴿لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ﴾ ''وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔''

وہ ان سائلوں کی طرح نہیں ہیں جو اصل میں اپنی محنت کا صلہ وصول کرتے ہیں کہ آپ کے سر ہو کر آپ سے زبردستی کچھ نہ کچھ نکلوا لیتے ہیں۔ یہ بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اقامتِ دین کی جدوجہد میں جو لوگ ہمہ وقت لگ جائیں، آخر ان کے لیے ذریعۂ معاش کیا ہو؟ اس وقت اس پر تفصیل سے گفتگو ممکن نہیں۔ بہرحال یہ سمجھ لیجیے کہ یہ دو رکوع انفاق کے موضوع پر قرآن حکیم کا نقطۂ عروج ہیں اور یہ آخری آیت ان میں اہم ترین ہے۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾﴾ ''اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔''

یہ نہ سمجھنا کہ تمہارا انفاق اللہ کے علم میں نہیں ہے۔ تم خاموشی کے ساتھ، اخفا کے ساتھ لوگوں کے ساتھ تعاون کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بھرپور بدلہ دے گا۔

آیات ۲۷۴ تا ۲۸۱

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع ۳۸

اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا جو رکوع پڑھ رہے ہیں یہ آج کے حالات میں اہم ترین ہے۔ یہ رکوع سود کی حرمت اور شناعت پر قرآن حکیم کا انتہائی اہم مقام ہے۔ اِس دَور میں اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کی سب سے بڑی صورت تو غیر اللہ کی حاکمیت کا تصور ہے' جو سب سے بڑا شرک ہے۔ اگرچہ نفسیاتی اور داخلی اعتبار سے سب سے بڑا شرک مادّے پر توکّل ہے' لیکن خارجی اور واقعاتی دنیا میں اس وقت سب سے بڑا شرک غیر اللہ کی حاکمیت ہے' جو اَب ''عوامی حاکمیت'' کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس کے بعد اس وقت کے گناہوں اور بدعملی میں سب سے بڑا فتنہ اور فساد سود کی بنیاد پر ہے۔ اِس وقت دنیا میں سب سے بڑی شیطنت جو یہودیوں کے ذریعے سے پورے کرۂ ارضی کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے بے تاب ہے' وہ یہی سود کا ہتھکنڈا ہے۔ یہاں اس کی حرمت دوٹوک انداز میں بیان کر دی گئی۔ اس مقام پر میرے ذہن میں کبھی کبھی ایک سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس رکوع کی پہلی آیت کا تعلق تو انفاق فی سبیل اللہ سے ہے' لہٰذا اسے پچھلے رکوع کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا' لیکن بعد میں یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوئی کہ اس آیت کو بڑی حکمت کے ساتھ اس رکوع کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔ وہ حکمت مَیں بعد میں بیان کروں گا۔

آیت ۲۷۴ ﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ﴾ ''جو لوگ اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں رات کو بھی اور دن میں بھی''

﴿سِرًّا وَّعَلَانِيَةً﴾ ''خفیہ طور پر بھی اور علانیہ بھی''

صدقاتِ واجبہ علانیہ اور صدقاتِ نافلہ خفیہ طور پر دیتے ہیں۔

﴿فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۷۴﴾ ''اُن کے لیے ان کا اجر (محفوظ) ہے ان کے ربّ کے پاس' نہ تو اُن پر کوئی خوف طاری ہوگا اور نہ ہی وہ کسی حزن سے دوچار ہوں گے۔''

اس کے برعکس معاملہ اُن کا ہے جو سود کھاتے ہیں۔ وجہ کیا ہے؟ اصل مسئلہ ہے ''قدرِ زائد'' (surplus value) کا! آپ کا کوئی شغل ہے' کوئی کاروبار ہے یا ملازمت ہے' آپ کما رہے ہیں' اس سے آپ کا خرچ پورا ہو رہا ہے' کچھ بچت بھی ہو رہی ہے۔ اب اس بچت کا اصل مصرف کیا ہے؟ آیت ۲۱۹ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۭ﴾ ''لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ (اللہ کی راہ میں) کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو بھی زائد از ضرورت ہو!'' چنانچہ اصل راستہ تو یہ ہے کہ اپنی بچت کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔ یا محتاجوں کو دے دو یا اللہ کے دین کی نشر و اشاعت اور سربلندی میں لگا دو۔ لیکن سود خورانہ ذہنیت یہ ہے کہ اس بچت کو بھی مزید کمائی کا ذریعہ بناؤ۔ لہٰذا اصل میں سود خوری انفاق فی سبیل اللہ کی ضد ہے۔ یہ عقدہ مجھ پر اُس وقت کھلا جب میں نے ''اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا'' کے اصول کے تحت سورۃ الروم کی آیت ۳۹ کا مطالعہ کیا۔ وہاں بھی ان دونوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لایا گیا ہے' اللہ کی رضا جوئی کے لیے انفاق اور اس کے مقابلے میں ربا' یعنی سود پر رقم دینا۔ فرمایا: ﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا۟ فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اور جو مال تم دیتے ہو سود پر تا کہ لوگوں کے اموال میں (شامل ہو کر) بڑھ جائے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا''۔ محنت کوئی کر رہا ہے اور آپ اس کی کمائی میں سے اپنے سرمائے کی وجہ سے وصول کر رہے ہیں تو آپ کا مال اس کے مال میں شامل ہو کر اس کی محنت سے بڑھ رہا ہے۔ لیکن اللہ کے ہاں اس کی بڑھوتری نہیں ہوتی۔ ﴿وَمَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝۳۹﴾ ''اور وہ جو تم زکوٰۃ (اور صدقات) میں دے دیتے ہو محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے تو یہی لوگ (اپنے مال اللہ کے ہاں) بڑھا رہے ہیں''۔ ان کا مال مسلسل بڑھ رہا ہے' اس کی بڑھوتری ہو رہی ہے۔

چنانچہ انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات وزکوٰۃ وغیرہ کا معاملہ سود کے بالمقابل اور اس کے برعکس ہے۔ اپنے اس بچت کے مال کو یا تو کوئی اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا یا پھر سودی منافع حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے گا۔ اور آپ کو معلوم ہے کہ آج کے بینکنگ کے نظام میں سب سے زیادہ زور بچت (saving) پر دیا جاتا ہے اور اس کے لیے سیونگ اکاؤنٹ اور بہت سی پُرکشش منافع بخش سکیمیں متعارف کرائی جاتی ہیں۔ ان کی طرف سے یہی ترغیب دی جاتی ہے کہ بچت کرو مزید کمانے کے لیے! بچت اس لیے نہیں کہ اپنا پیٹ کاٹو اور غرباء کی ضروریات پوری کرو' اپنا معیارِ زندگی کم کرو اور اللہ کے دین کے لیے خرچ کرو۔ نہیں' بلکہ اس لیے کہ جو کچھ تم بچاؤ وہ ہمیں دو' تاکہ وہ ہم زیادہ شرح سود پر دوسروں کو دیں اور تھوڑی شرح سود تمہیں دے دیں۔ چنانچہ انفاق اور سود ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ فرمایا:

آیت ۲۷۵ ﴿اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا﴾ ''جو لوگ سود کھاتے ہیں۔''

﴿لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ﴾ ''وہ نہیں کھڑے ہوتے مگر اُس شخص کی طرح جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔''

یہاں عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ قیامت کے دن کا نقشہ ہے۔ قیامت کے دن کا یہ نقشہ تو ہوگا ہی' اس دنیا میں بھی سود خوروں کا حال یہی ہوتا ہے' اور ان کا یہ نقشہ کسی سٹاک ایکسچینج میں جا کر بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوگا گویا دیوانے ہیں' پاگل ہیں' جو چیخ رہے ہیں' دوڑ رہے ہیں' بھاگ رہے ہیں۔ وہ نارمل انسان نظر نہیں آتے' مخبوط الحواس لوگ نظر آتے ہیں جن پر گویا آسیب کا سایہ ہو۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ﴾ ''اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے۔''

کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ میں نے سو روپے کا مال خریدا' ۱۱۰ روپے میں بیچ دیا' دس روپے بچ گئے' یہ ربح (منافع) ہے' جو جائز ہے' لیکن اگر سو روپے کسی کو دیے اور ۱۱۰ واپس لیے تو یہ ربا (سود) ہے' یہ حرام کیوں ہو گیا؟ ایک شخص نے دس لاکھ کا مکان بنایا' چار ہزار روپے ماہانہ کرایے پر دے دیا تو جائز ہو گیا' اور دس لاکھ روپے کسی کو قرض دیے اور اُس سے چار ہزار روپے مہینہ لینا شروع کیے تو یہ سود ہو گیا' حرام ہو گیا' ایسا کیوں ہے؟ عقلی طور پر اس طرح کی باتیں سود کے حامیوں کی طرف سے کہی جاتی ہیں۔ (ربح اور ربا کا فرق سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶ کے ضمن میں بیان ہو چکا ہے۔) اس ظاہری مناسبت کی وجہ سے یہ مخبوط الحواس سود خور لوگ ان دونوں کے اندر کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا عقلی جواب نہیں دیا' بلکہ فرمایا:

﴿وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ﴾ ''حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام ٹھہرایا ہے۔''

اب تم یہ بات کرو کہ اللہ کو مانتے ہو یا نہیں؟ رسول اللہ ﷺ کو مانتے ہو یا نہیں؟ قرآن کو مانتے ہو یا نہیں؟ یا محض اپنی عقل کو مانتے ہو؟ اگر تم مسلمان ہو' مؤمن ہو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کرو: ﴿وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ (الحشر:۷) ''جو کچھ رسول تمہیں دیں اسے لے لو اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ''۔ یہ تو شریعت کا معاملہ ہے۔ ویسے معاشیات کے اعتبار سے اس میں یہ فرق واقع ہوتا ہے کہ ایک ہے fluid capital اور ایک ہے fixed capital۔ جہاں تک مکان کا معاملہ ہے تو وہ fixed capital ہے۔ دس لاکھ روپے کے مکان میں جو شخص رہ رہا ہے وہ اس سے کیا فائدہ اٹھائے گا؟ وہ اس میں رہائش اختیار کرے گا اور اس کے عوض ماہانہ کرایہ ادا کرے گا۔ اس کے برعکس اگر آپ نے دس لاکھ روپے کسی کو نقد دے دیے تو وہ انہیں کسی کام میں لگائے گا۔ اس میں یہ بھی امکان ہے کہ دس لاکھ کے بارہ لاکھ یا پندرہ لاکھ بن

جائیں اور یہ بھی کہ آٹھ لاکھ رہ جائیں۔ چنانچہ اس صورت میں اگر آپ نے پہلے سے طے شدہ (fix) منافع وصول کیا تو یہ حرام ہو جائے گا۔ تو ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے عقلی جواب نہیں دیا۔ جواب دیا کہ ''اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا ہے اور ربا کو حرام۔''

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ﴾ ''تو جس شخص کے پاس اُس کے ربّ کی طرف سے یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ پہلے لے چکا ہے وہ اُس کا ہے۔''

وہ اُس سے واپس نہیں لیا جائے گا۔ حساب کتاب نہیں کیا جائے گا کہ تم اتنا سود کھا چکے ہو' واپس کرو۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ اس پر اس کا کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

﴿وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾ ''اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔''

اللہ تعالیٰ چاہے گا تو معاف کر دے گا اور چاہے گا تو پچھلے سود پر بھی سرزنش ہوگی۔

﴿وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۷۵﴾ ''اور جس نے (اس نصیحت کے آ جانے کے بعد بھی) دوبارہ یہ حرکت کی تو یہ لوگ جہنمی ہیں' وہ اس میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

آیت ۲۷۶ ﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ﴾ ''اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔''

ہمارے زمانے میں شیخ محمود احمد (مرحوم) نے اپنی کتاب ''Man & Money'' میں ثابت کیا ہے کہ تین چیزیں سود کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ جتنا سود بڑھے گا اسی قدر بے روزگاری بڑھے گی' افراطِ زر (inflation) میں اضافہ ہوگا اور اس کے نتیجے میں شرح سود (interest rate) بڑھے گا۔ شرح سود کے بڑھنے سے بے روزگاری مزید بڑھے گی اور افراطِ زر میں اور زیادہ اضافہ ہوگا۔ یہ ایک دائرۂ خبیثہ (vicious circle) ہے اور اس کے نتیجے میں کسی ملک کی معیشت بالکل تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ تباہی ایک وقت تک پوشیدہ رہتی ہے' لیکن پھر یک دم اس کا ظہور بڑے بڑے بینکوں کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ابھی جو کوریا کا حشر ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس سے پہلے روس کا جو حشر ہو چکا ہے وہ پوری دنیا کے لیے باعث عبرت ہے۔ سودی معیشت کا معاملہ تو گویا شیش محل کی طرح ہے' اس میں تو ایک پتھر آ کر لگے گا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس معاملہ صدقات کا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ پالتا ہے' بڑھاتا ہے' جیسا کہ سورۃ الروم کی آیت ۳۹ میں ارشاد ہوا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝۲۷۶﴾ ''اور اللہ کسی ناشکرے اور گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔''

اللہ تعالیٰ کو وہ سب لوگ ہرگز پسند نہیں ہیں جو ناشکرے اور گناہگار ہیں۔

آیت ۲۷۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ﴾ ''ہاں جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور نماز قائم کرتے رہے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہے ان کے لیے ان کا اجر اُن کے ربّ کے پاس محفوظ ہے۔''

نیک عمل میں ظاہر بات ہے جو شے حرام ہے اس کا چھوڑ دینا بھی لازم ہے۔

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۲۷۷﴾ ''اور نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔''

آیت ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا ﴾ ''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سود میں سے جو باقی رہ گیا ہے اُسے چھوڑ دو''

آج فیصلہ کرلو کہ جو کچھ بھی تم نے کسی کو قرض دیا تھا اب اس کا سود چھوڑ دینا ہے۔

﴿ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴾ ''اگر تم واقعی مؤمن ہو۔''

آیت ﴿ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ ﴾ ''پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا تو خبردار ہو جاؤ کہ اللہ اور اُس کے رسول کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔''

سود خوری سے باز نہ آنے پر یہ الٹی میٹم ہے۔ قرآن و حدیث میں کسی اور گناہ پر یہ بات نہیں آئی ہے۔ یہ واحد گناہ ہے جس پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

﴿ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ ﴾ ''اور اگر تم توبہ کرلو تو پھر اصل اموال تمہارے ہی ہیں۔''

تمہارے جو اصل رأس المال ہیں وہ تمہیں لوٹا دیے جائیں گے۔ چنانچہ سود چھوڑ دو اور اپنے رأس المال واپس لے لو۔

﴿ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴾ ''نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔''

نہ تم کسی پر ظلم کرو کہ اس سے سود وصول کرو اور نہ ہی تم پر ظلم کیا جائے کہ تمہارا رأس المال بھی دبا دیا جائے۔

آیت ﴿ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ ﴾ ''اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو فراخی حاصل ہونے تک اسے مہلت دو۔''

اسے مہلت دو کہ اس کے ہاں کشادگی پیدا ہو جائے تاکہ وہ آسانی سے آپ کا قرض آپ کو واپس کر سکے۔

﴿ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ ''اور اگر تم صدقہ ہی کر دو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے''

تمہارا بھائی غریب تھا' اس کو تم نے قرض دیا تھا' اس پر کچھ سود لے کر کھا بھی چکے ہو' باقی سود کو تو چھوڑا ہی ہے' اگر اپنا رأس المال بھی اس کو بخش دو تو یہ انفاق ہو جائے گا' یہ اللہ کو قرضِ حسنہ ہو جائے گا اور تمہارے لیے ذخیرۂ آخرت بن جائے گا۔ یہ بات سمجھ لیجیے کہ آپ کی جو بچت ہے' جسے میں نے قدرِ زائد (surplus value) کہا تھا' اسلامی معیشت کے اندر اُس کا سب سے اونچا مصرف انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو' صدقہ کر دو۔ اس سے کم تر ''قرضِ حسنہ'' ہے۔ آپ کے کسی بھائی کا کاروبار رُک گیا ہے' اس کو قرض دے دو' اس کا کاروبار چل پڑے گا اور پھر وہ تمہیں تمہاری اصل رقم واپس کر دے گا۔ یہ قرضِ حسنہ ہے' اس کا درجہ انفاق سے کم تر ہے۔ تیسرا درجہ مضاربت کا ہے' جو جائز تو ہے مگر پسندیدہ نہیں ہے۔ اگر تم زیادہ ہی خسیس ہو تو چلو اپنا سرمایہ اپنے کسی بھائی کو مضاربت پر دے دو۔ اور مضاربت یہ ہے کہ رقم تمہاری ہوگی اور کام وہ کرے گا۔ اگر بچت ہو جائے تو اس میں تمہارا بھی حصہ ہوگا' لیکن اگر نقصان ہو جائے تو وہ کُل کا کُل تمہارا ہوگا' تم اس سے کوئی تاوان نہیں لے سکتے۔ اس کے بعد ان تین درجوں سے بھی نیچے اتر کر اگر تم کہو کہ میں یہ رقم تمہیں دے رہا ہوں' اس پر اتنے فیصد منافع تو تم نے بہرحال دینا ہی دینا ہے' تو اس سے بڑھ کر حرام شے کوئی نہیں ہے۔

اس آیت میں ہدایت کی جا رہی ہے کہ اگر تمہارا مقروض تنگی میں ہے تو پھر انتظار کرو' اُسے اس کی کشائش اور فراخی تک مہلت دے دو۔ اور اگر تم صدقہ ہی کر دو' خیرات کر دو' بخش دو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔

﴿اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۰﴾﴾ ''اگر تم جانتے ہو۔''

اگر تمہیں اللہ نے حکمت عطا کر دی ہے' اگر تم اولوالالباب ہو' اگر تم سمجھ دار ہو تو تم اُس بچت کے امیدوار بنو جو اللہ کے ہاں اجر و ثواب کی صورت میں تمہیں ملے گی۔ اس کے مقابلے میں اس رقم کی کوئی حیثیت نہیں جو تمہیں مقروض سے واپس ملنی ہے۔

اگلی آیت نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کی آخری آیت ہے۔

آیت ۲۸۱ ﴿وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِيۡهِ اِلَى اللّٰهِ ۫﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن تم لوٹا دیے جاؤ گے اللہ کی طرف۔''

یہاں وہ آیت یاد کیجیے جو سورۃ البقرۃ میں الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ دو بار آ چکی ہے: ﴿وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤۡخَذُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی اور نہ کسی سے کوئی فدیہ وصول کیا جائے گا اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی''۔ اور ﴿وَاتَّقُوۡا يَوۡمًا لَّا تَجۡزِىۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَيۡـًٔا وَّلَا يُقۡبَلُ مِنۡهَا عَدۡلٌ وَّلَا تَنۡفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۱۲۳﴾﴾ ''اور ڈرو اُس دن سے کہ جس دن کام نہ آ سکے گی کوئی جان کسی دوسری جان کے کچھ بھی اور نہ کسی سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کسی کو کوئی سفارش فائدہ پہنچا سکے گی اور نہ انہیں کوئی مدد مل سکے گی۔''

﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ﴾ ''پھر ہر جان کو پورا پورا دے دیا جائے گا جو اُس نے کمایا ہوگا۔''

﴿وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۸۱﴾﴾ ''اور اُن پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔''

آیات ۲۸۲' ۲۸۳

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا تَدَايَنۡتُمۡ بِدَيۡنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكۡتُبُوۡهُ ؕ وَلۡيَكۡتُبۡ بَّيۡنَكُمۡ كَاتِبٌۢ بِالۡعَدۡلِ ۪ وَلَا يَاۡبَ كَاتِبٌ اَنۡ يَّكۡتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلۡيَكۡتُبۡ ۚ وَلۡيُمۡلِلِ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَقُّ وَلۡيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبۡخَسۡ مِنۡهُ شَيۡـًٔا ؕ فَاِنۡ كَانَ الَّذِىۡ عَلَيۡهِ الۡحَقُّ سَفِيۡهًا اَوۡ ضَعِيۡفًا اَوۡ لَا يَسۡتَطِيۡعُ اَنۡ يُّمِلَّ هُوَ فَلۡيُمۡلِلۡ وَلِيُّهٗ بِالۡعَدۡلِ ؕ وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰٮهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰٮهُمَا الۡاُخۡرٰى ؕ وَلَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡا ؕ وَلَا تَسۡـَٔمُوۡۤا اَنۡ تَكۡتُبُوۡهُ صَغِيۡرًا اَوۡ كَبِيۡرًا اِلٰۤى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَاَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدۡنٰۤى اَلَّا تَرۡتَابُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَلَّا تَكۡتُبُوۡهَا ؕ وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيۡدٌ ؕ وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ فُسُوۡقٌۢ بِكُمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۸۲﴾ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمۡ تَجِدُوۡا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ

مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ
وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

آیت ۲۸۲ 'جو زیر مطالعہ ہے' قرآن حکیم کی طویل ترین آیت ہے اور اسے ''آیتِ دَین'' یا ''آیتِ مُدَایَنَہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ اس آیت میں ہدایت کی گئی ہے کہ کوئی قرض کا باہم لین دین ہو یا آپس میں کاروباری معاملہ ہو تو اسے باقاعدہ طور پر لکھ لیا جائے اور اس پر دو گواہ مقرر کیے جائیں۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس قرآنی ہدایت کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور کسی بھائی' دوست یا عزیز کو قرض دیتے ہوئے یا کوئی کاروباری معاملہ کرتے ہوئے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے کیا لکھوانا ہے' وہ کہے گا کہ انہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے۔ چنانچہ تمام معاملات زبانی طے کر لیے جاتے ہیں' اور بعد میں جب معاملات میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو پھر لوگ شکوہ و شکایت اور چیخ و پکار کرتے ہیں۔ اگر شروع ہی میں قرآنی ہدایات کے مطابق مالی معاملات کو تحریر کر لیا جائے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچے گی۔ حدیثِ نبویؐ کا مفہوم ہے کہ جو شخص قرض دیتے ہوئے یا کوئی مالی معاملہ کرتے ہوئے لکھواتا نہیں ہے' اگر اس کا مال ضائع ہو جاتا ہے تو اسے اس پر کوئی اجر نہیں ملتا' اور اگر وہ مقروض کے حق میں بددعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی فریاد نہیں سنتا' کیونکہ اُس نے اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔

آیت ۲۸۲ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ﴾ ''اے اہلِ ایمان! جب بھی تم قرض کا کوئی معاملہ کرو ایک وقت معین تک کے لیے تو اس کو لکھ لیا کرو۔''

آیت کے اس ٹکڑے سے دو حکم معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرض کا وقت معین ہونا چاہیے کہ یہ کب واپس ہوگا اور دوسرے یہ کہ اسے لکھ لیا جائے۔ فَاكْتُبُوْهُ فعل امر ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔

﴿وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪﴾ ''اور چاہیے کہ اس کو لکھے کوئی لکھنے والا تمہارے مابین عدل کے ساتھ۔'' لکھنے والا کوئی ڈنڈی نہ مار جائے' اسے چاہیے کہ وہ صحیح صحیح لکھے۔

﴿وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ﴾ ''اور جو لکھنا جانتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے' جس طرح اللہ نے اس کو سکھایا ہے' پس چاہیے کہ وہ لکھ دے۔''

یہ ہدایت تاکید کے ساتھ کی گئی' اس لیے کہ اُس معاشرے میں پڑھے لکھے لوگ بہت کم ہوتے تھے۔ اب بھی مالی معاملات اور معاہدات بالعموم وثیقہ نویس تحریر کرتے ہیں۔

﴿وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ﴾ ''اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے''

یعنی جس نے قرض لیا ہے وہ دستاویز لکھوائے کہ میں کیا ذمہ داری لے رہا ہوں' جس کا مال ہے وہ نہ لکھوائے۔

﴿وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ ''اور وہ اللہ سے ڈرتا رہے اپنے رب سے''

﴿وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''اور (لکھواتے ہوئے) اس میں سے کوئی شے کم نہ کر دے۔''

﴿فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا﴾ ''پھر اگر وہ شخص جس پر حق عائد ہوتا ہے' ناسمجھ یا ضعیف ہو''

﴿اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ﴾ ''یا اس کے اندر اتنی صلاحیت نہ ہو کہ املا کروا سکے''

﴿فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ﴾ ''تو جو اُس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے۔''

اگر قرض لینے والا ناسمجھ ہو' ضعیف ہو یا دستاویز نہ لکھوا سکتا ہو تو اُس کا کوئی ولی' کوئی وکیل یا مختار (attorney) اُس کی طرف سے انصاف کے ساتھ دستاویز تحریر کرائے۔ یہاں ''اِملال'' اِملا کے معنی میں آیا ہے۔

﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ﴾ ''اور اس پر گواہ بنالیا کرو اپنے مَردوں میں سے دو آدمیوں کو۔''

﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ﴾ ''پھر اگر دو مرد دستیاب نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں''

﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ﴾ ''یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں''

جن کی گواہی ہر دو فریق کے نزدیک مقبول ہو اور ان پر دونوں کو اعتماد ہو۔ اگر مذکورہ صفات کے دو مرد دستیاب نہ ہو سکیں تو گواہی کے لیے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کر لیا جائے۔ یعنی گواہوں میں ایک مرد کا ہونا لازم ہے' محض عورت کی گواہی نہیں چلے گی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ہر قسم کے معاملات میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر ہے یا یہ معاملہ صرف قرض اور مالی معاملات میں دستاویز تحریر کرتے وقت کا ہے' اس کی تفصیل فقہاء کے ہاں ملتی ہے۔

﴿اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ﴾ ''تاکہ ان میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری یاد کروا دے۔''

یہاں عقلی سوال پیدا ہو گیا کہ کیا مرد نہیں بھول سکتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعتاً اللہ تعالیٰ نے عورت کے اندر نسیان کا مادّہ زیادہ رکھا ہے۔ ﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾﴾ (الملک) ''کیا وہی نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے؟ وہ بڑا باریک بین اور ہر شے کی خبر رکھنے والا ہے''۔ جس نے پیدا کیا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ کس میں کون سا مادّہ زیادہ ہے۔ عورت میں نسیان کا مادّہ کیوں زیادہ رکھا گیا ہے' یہ بھی سمجھ لیجیے۔ یہ بڑی عقلی اور منطقی بات ہے۔ دراصل عورت کو مرد کے تابع رہنا ہوتا ہے' لہٰذا اُس کے احساسات کو کبھی ٹھیس پہنچ سکتی ہے' اُس کے جذبات کے اوپر کبھی کوئی کدورت آتی ہے۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر بھول جانے کا مادہ ''سیفٹی والو'' کے طور پر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ تو ان کا معاملہ اس شعر کے مصداق ہو جائے ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا!

چنانچہ یہ نسیان بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے' ورنہ تو کوئی صدمہ دل سے اترنے ہی نہ پائے' کوئی غصہ کبھی ختم ہی نہ ہو۔ بہرحال خواہ کسی حکم کی علت یا حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے' اللہ کا حکم تو بہرصورت ماننا ہے۔

﴿وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ﴾ ''اور نہ انکار کریں گواہ جبکہ ان کو بلایا جائے۔''

گواہوں کو جب گواہی کے لیے بلایا جائے تو آ کر گواہی دیں' اس سے انکار نہ کریں۔ اسی سورۂ مبارکہ کی آیت ۱۴۰ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور اُس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک شہادت موجود ہو اور وہ اسے چھپائے؟''

﴿وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ﴾ ''اور تساہل مت کرو اس کے لکھنے میں' معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اس کی معیّن مدّت کے لیے۔''

قرض خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اس کی دستاویز تحریر ہونی چاہیے کہ میں اتنی رقم لے رہا ہوں اور اتنے وقت میں اسے لوٹا دوں گا۔ اس کے بعد قرض خواہ اس مدّت کو بڑھا بھی سکتا ہے' مزید مہلت دے سکتا ہے' بلکہ معاف بھی کر سکتا ہے۔ لیکن قرض دیتے وقت اس

کی مدت معین ہونی چاہیے۔

﴿ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ﴾ ''یہ اللہ کے نزدیک بھی زیادہ مبنی برانصاف ہے''

﴿وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ﴾ ''اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے''

معاملہ ضبطِ تحریر میں آ جائے گا تو بہت واضح رہے گا' ورنہ زبانی یادداشت کے اندر تو کہیں تعبیر ہی میں فرق ہو جاتا ہے۔

﴿وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا﴾ ''اور یہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ تم شبہ میں نہیں پڑو گے''

﴿اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ﴾ ''اِلّا یہ کہ کوئی تجارتی لین دین ہو جو تم دست بدست کرتے ہو'' مثلاً آپ کسی دکاندار سے کوئی شے خریدتے ہیں اور نقد پیسے ادا کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ آپ اس کا کیش میمو بھی لیں۔ اگر آپ چاہیں تو دکاندار سے کیش میمو طلب کر سکتے ہیں۔

﴿فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۭ﴾ ''تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ اسے نہ لکھو۔''

﴿وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠﴾ ''اور گواہ بنا لیا کرو جب کوئی (مستقبل کا) سودا کرو۔''

''بیع سَلَم'' جو ہوتی ہے یہ مستقبل کا سودا ہے' اور یہ بھی ایک طرح کا قرض ہے۔ مثال کے طور پر آپ کسی زمیندار سے طے کرتے ہیں کہ آئندہ فصل کے موقع پر آپ اس سے اتنے روپے فی من کے حساب سے پانچ سو من گندم خریدیں گے۔ یہ بیع سَلَم کہلاتی ہے اور اس میں لازم ہے کہ آپ پوری قیمت ابھی ادا کر دیں اور آپ کو گندم فصل کے موقع پر ملے گی۔ اس طرح کا لین دین بھی باقاعدہ تحریر میں آ جانا چاہیے اور اس پر دو گواہ مقرر ہونے چاہئیں۔

﴿وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۭ﴾ ''اور نہ نقصان پہنچایا جائے کسی لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو۔'' یا ''اور نہ نقصان پہنچائے کوئی لکھنے والا اور نہ گواہ۔''

''يُضَاۗرَّ'' میں یہ دونوں مفہوم موجود ہیں۔ اس لیے کہ یہ معروف بھی ہے اور مجہول بھی۔

﴿وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ﴾ ''اور اگر تم ایسا کرو گے (نقصان پہنچاؤ گے) تو یہ تمہارے حق میں گناہ کی بات ہوگی۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ﴾ ''اور اللہ سے ڈرتے رہو۔''

﴿وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ﴾ ''اور اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

یہ ایک آیت مکمل ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آخری پارے کی چار پانچ چھوٹی سورتیں جمع کر لیں تو ان کا حجم اس ایک آیت کے برابر ہوگا۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ آیات کی تعیین توقیفی ہے۔ اس کا ہمارے حساب کتاب سے' گرامر سے' منطق سے اور علمِ بیان سے کوئی تعلق نہیں۔

آیت ۲۸۳ ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰي سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا﴾ ''اور اگر تم سفر پر ہو اور کوئی لکھنے والا نہ پاؤ''

اگر دورانِ سفر کوئی لین دین کا یا قرض کا معاملہ ہو جائے اور کوئی کاتب نہ مل سکے۔

﴿فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ﴾ ''تو کوئی شے گروی رکھ لو قبضے میں۔''

قرض لینے والا اپنی کوئی شے قرض دینے والے کے حوالے کر دے کہ میری یہ شے آپ کے قبضے میں رہے گی' آپ اتنے پیسے مجھے دے دیجیے' میں جب یہ واپس کر دوں گا آپ میری چیز مجھے لوٹا دیجیے گا۔ یہ رہن بالقبضہ ہے۔ لیکن رہن (گروی) رکھی ہوئی چیز سے کوئی فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے' وہ سود ہو جائے گا۔ مثلاً اگر مکان رہن رکھا گیا ہے تو اس پر قبضہ تو قرض دینے والا کا ہو گا' لیکن وہ اس سے استفادہ نہیں کر سکتا' اس کا کرایہ نہیں لے سکتا' کرایہ مالک کو جائے گا۔

﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا﴾ ''پھر اگر تم میں سے ایک دوسرے پر اعتماد کرے''

یعنی ایک شخص دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے بغیر رہن کے اسے قرض دے دیتا ہے۔

﴿فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ﴾ ''تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے اُس کو چاہیے کہ وہ اس کی امانت واپس کرے''

ایک شخص کے پاس رہن دینے کو کچھ نہیں تھا یا یہ کہ دوسرے بھائی نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے اُس سے کوئی شے رہن نہیں لی اور اس کو قرض دے دیا تو یہ مال جو اُس نے قرض لیا ہے یہ اس کے پاس قرض دینے والے کی امانت ہے' جس کا واپس لوٹانا اس کے ذمے فرض ہے۔

﴿وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ﴾ ''اور اللہ سے ڈرے جو اُس کا ربّ ہے۔''

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ﴾ ''اور گواہی کو چھپایا نہ کرو۔''

﴿وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ﴾ ''اور جو کوئی گواہی کو چھپائے گا تو اُس کا دل گنہگار ہو گا۔''

بعض گناہوں کا اثر انسان کے ظاہری اعضاء تک محدود ہوتا ہے' جبکہ بعض کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ شہادت کا چھپانا بھی اسی نوعیت کا گناہ ہے۔ اور اگر کسی کا دل داغ دار ہو گیا تو باقی کیا رہ گیا؟

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے۔''

آیات ۲۸۴ تا ۲۸۶

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۫ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۫ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۫ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع ۳۰

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم سورۃ البقرۃ کے آخری رکوع پر پہنچ گئے ہیں۔ یہ عظیم الشان رکوع تین آیات پر مشتمل ہے۔ قبل ازیں ہم اسی طرح کا ایک عظیم رکوع پڑھ آئے ہیں جس کی چار آیات ہیں اور اس میں آیت الکرسی بھی ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں رکوع اپنی عظمت اور اپنے مقام کے اعتبار سے ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں۔ آیت الکرسی توحید کے موضوع پر قرآن حکیم کی جامع ترین آیت ہے' اور اس رکوع کی آخری آیت جامع ترین دعا پر مشتمل ہے۔

آیت ۲۸۴ ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ ''اللہ ہی کا ہے جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے۔''

آپ دیکھیں گے کہ اکثر و بیشتر اس طرح کے الفاظ سورتوں کے اختتام پر آتے ہیں۔

﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ۭ﴾ ''اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خواہ تم اسے ظاہر کرو خواہ چھپاؤ اللہ تم سے اس کا محاسبہ کر لے گا۔''

تمہاری نیتیں اس کے علم میں ہیں۔ ایک حدیث میں الفاظ آتے ہیں: ((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ))[۳۶] ''یقیناً اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو اور تمہارے مال و دولت کو نہیں دیکھتا' بلکہ تمہارے دلوں کو اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے''۔ تو تمہارے دل میں جو کچھ ہے خواہ اسے کتنا ہی چھپا لو اللہ کے محاسبے سے نہیں بچ سکو گے۔

﴿فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ﴾ ''پھر وہ بخش دے گا جس کو چاہے گا اور عذاب دے گا جس کو چاہے گا۔''

اختیارِ مطلق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارے ہاں اہلِ سنّت کا عقیدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ پر لازم نہیں ہے کہ نیکوکار کو اس کی جزا ضرور دے اور بدکار کو اس کی سزا ضرور دے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ ایسا کرے گا' لیکن اللہ کی شان اس سے بہت اعلیٰ و ارفع ہے کہ اس پر کسی شے کو لازم قرار دیا جائے۔ اس کا اختیار مطلق ہے' وہ ﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ۝۱۶﴾ (البروج) کی شان کا حامل ہے۔ سورۃ الحج میں الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝۱۸﴾ ''یقیناً اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے''۔ اہلِ تشیع کا موقف یہ ہے کہ اللہ پر عدل واجب ہے۔ اہلِ سنّت کہتے ہیں کہ اللہ عدل کرے گا' جزاء و سزا میں عدل ہوگا' لیکن عدل کرنا اس پر واجب نہیں ہے' بلکہ اللہ نے جو شے اپنے اوپر واجب کی ہے وہ ''رحمت'' ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۭ﴾ (الانعام:۱۲) اور: ﴿كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ﴾ (الانعام:۵۴) ''تمہارے ربّ نے رحمت کو اپنے اوپر واجب کر لیا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۸۴﴾ ''اور اللہ ہر چیز کی قدرت رکھتا ہے۔''

آیت ۲۸۵ ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ﴾ ''ایمان لائے رسول (ﷺ) اُس چیز پر جو نازل کی گئی اُن کی جانب اُن کے ربّ کی طرف سے اور مؤمنین بھی (ایمان لائے۔)''

یہ ایک غور طلب بات اور بڑا باریک نکتہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ پر جب وحی آئی تو آپؐ نے کیسے پہچان لیا کہ یہ بدروح نہیں ہے' یہ جبریلِ امینؑ ہیں؟ آخر کوئی اشتباہ بھی تو ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ پہلا تجربہ تھا۔ اس سے پہلے نہ تو آپ ﷺ نے کہانت سیکھی اور نہ آپ نے کوئی نفسیاتی ریاضتیں کیں۔ آپ ﷺ تو ایک کاروباری آدمی تھے اور اہل و عیال کے ساتھ بہت ہی بھرپور زندگی گزار

۳۶۔ صحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب تحریم ظلم المسلم وخذله واحتقاره... الخ۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الزهد' باب القناعة۔ ومسند احمد: ۷۶۸۲ و ۱۰۵۷۷۔

رہے تھے۔ آپ ﷺ کا بلند ترین سطح کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا۔ یہ درحقیقت آپ ﷺ کی فطرتِ سلیمہ تھی جس نے وحی لانے والے فرشتے کو پہچان لیا اور آپؐ اس وحی پر ایمان لے آئے۔ نبی کی فطرت اتنی پاک اور صاف ہوتی ہے کہ اس کے اوپر کسی بدروح وغیرہ کا کوئی اثر ہو ہی نہیں سکتا۔ بہرحال ہمارے لیے بڑی تسکین کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کے ایمان کے تذکرے کے ساتھ ہمارے ایمان کا تذکرہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اصحابِ ایمان میں شامل فرمائے۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ!

﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ﴾ ''یہ سب ایمان لائے اللہ پر' اُس کے فرشتوں پر' اُس کی کتابوں پر اور اُس کے رسولوں پر۔''

سورۃ البقرۃ میں یہ دوسرا مقام ہے جہاں ایمان کے اجزاء کو گنا گیا ہے۔ قبل ازیں آیۃ البر (آیت ۱۷۷) میں اجزائے ایمان کی تفصیل بیان ہو چکی ہے۔

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ﴾ ''(یہ کہتے ہیں کہ) ہم اللہ کے رسولوں میں کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔''

یہ بات تیسری مرتبہ آگئی ہے کہ اللہ کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جائے گی۔ سولہویں رکوع میں ہم یہ الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۭ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝﴾ ''ہم ان میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے فرماں بردار ہیں''۔ اور سب سے پہلے آیت ۴ میں یہ الفاظ آ چکے ہیں: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ﴾ ''وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں اس پر بھی جو (اے نبی ﷺ) آپ پر نازل کیا گیا اور اُس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا''۔ البتہ رسولوں کے درمیان تفضیل ثابت ہے اور ہم یہ آیت پڑھ چکے ہیں: ﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ﴾ (آیت ۲۵۳) ''یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں سے وہ بھی تھے جن سے اللہ نے کلام کیا اور بعض کے درجے (کسی اور اعتبار سے) بلند کر دیے۔''

﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔''

﴿غُفْرَانَكَ رَبَّنَا﴾ ''پروردگار! ہم تیری بخشش مانگتے ہیں''

غُفْرَانَكَ مفعول ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی نَسْئَلُكَ غُفْرَانَكَ اے اللہ! ہم تجھ سے تیری مغفرت طلب کرتے ہیں' ہم تیری بخشش کے طلب گار ہیں۔

﴿وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝﴾ ''اور تیری ہی جانب لوٹ جانا ہے۔''

یہاں پر ایمان بالآخرۃ کا ذکر بھی آ گیا جو اوپر ان الفاظ میں نہیں آیا تھا: ﴿كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ﴾ اب آخری آیت آ رہی ہے۔

آیت ۲۸۶ ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ﴾ ''اللہ تعالیٰ نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اُس کی وسعت کے مطابق۔''

یہ آیت اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے فضل و کرم کا مظہر ہے۔ میں نے آیت ۱۸۶ کے بارے میں کہا تھا کہ یہ دنیا میں حقوقِ انسانی کا سب سے بڑا منشور (Magna Carta) ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے: ﴿اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ ''میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں جب بھی (اور جہاں بھی) وہ مجھے پکارے''۔ ﴿فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ﴾ ''پس انہیں بھی چاہیے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان رکھیں''۔ گویا دوطرفہ بات چلے گی' یک طرفہ نہیں۔ میری مانو' اپنی منواؤ! تم

دعائیں کرو گے‘ ہم قبول کریں گے! لیکن اگر تم ہماری بات نہیں مانتے تو پھر تمہاری دعا تمہارے مُنہ پر دے ماری جائے گی‘ خواہ قنوتِ نازلہ چالیس دن تو کیا اسّی دن تک پڑھتے رہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری دعاؤں کے باوجود تمہیں سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ دیکھنا پڑا‘ تمہیں یہودیوں کے ہاتھوں شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اگرچہ ان مواقع پر حرمین شریفین میں قنوتِ نازلہ پڑھی جاتی رہی‘ لیکن تمہاری دعائیں کیونکر قبول ہوتیں! تمہارا جرم یہ ہے کہ تم نے اللہ کو پیٹھ دکھائی ہوئی ہے‘ اس کے دین کو پاؤں تلے روندا ہوا ہے‘ اللہ کے باغیوں سے دوستی رکھی ہوئی ہے۔ کسی نے ماسکو کو اپنا قبلہ بنا رکھا تھا تو کسی نے واشنگٹن کو۔ لہٰذا تمہاری دعائیں تمہارے منہ پر دے ماری گئیں۔

لیکن آیت زیر مطالعہ اس اعتبار سے بہت بڑی رحمت کا مظہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اندھے کی لاٹھی والا معاملہ نہیں ہے کہ تمام انسانوں سے محاسبہ ایک ہی سطح پر ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ کس کی کتنی وسعت ہے اور اسی کے مطابق کسی کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اور یہ وسعت موروثی اور ماحولیاتی عوامل پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر شخص کو جو genes ملتے ہیں وہ دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور ان genes کی اپنی اپنی خصوصیات (properties) اور تحدیدات (limitations) ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کو دوسرے سے مختلف ماحول میسر آتا ہے۔ تو ان موروثی عوامل (hereditary factors) اور ماحولیاتی عوامل (environmental factors) کے حاصل ضرب سے انسان کی شخصیت کا ایک ہیولیٰ بنتا ہے‘ جس کو مستری لوگ ’’پاٹن‘‘ کہتے ہیں۔ جب لوہے کی کوئی شے ڈھالنی مقصود ہو تو اس کے لیے پہلے مٹی یا لکڑی کا ایک سانچہ (pattern) بنایا جاتا ہے۔ اس کو ہمارے ہاں کاریگر اپنی بولی میں ’’پاٹن‘‘ کہتے ہیں۔ اب آپ لوہے کو پگھلا کر اس میں ڈالیں گے تو وہ اسی صورت میں ڈھل جائے گا۔ قرآن کی اصطلاح میں یہ ’’شاکلہ‘‘ ہے جو ہر انسان کا بن جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ۭ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۝﴾ (بنی اسراءیل) ’’کہہ دیجیے کہ ہر کوئی اپنے شاکلہ کے مطابق عمل کر رہا ہے۔ پس آپ کا ربّ ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سیدھی راہ پر ہے‘‘۔ اس شاکلہ کے اندر اندر آپ کو محنت کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ کس کا شاکلہ وسیع تھا اور کس کا تنگ تھا‘ کس کے genes اعلیٰ تھے اور کس کے ادنیٰ تھے‘ کس کے ہاں ذہانت زیادہ تھی اور کس کے ہاں جسمانی قوت زیادہ تھی۔ اسے خوب معلوم ہے کہ کس کو کیسی صلاحیتیں ودیعت کی گئیں اور کیسا ماحول عطا کیا گیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے ماحولیاتی عوامل اور موروثی عوامل کو ملحوظ رکھ کر اُس کی استعدادات کے مطابق حساب لے گا۔ فرض کیجیے ایک شخص کے اندر استعداد ہی ۲۰ درجے کی ہے اور اس نے ۱۸ درجے کام کر دکھایا تو وہ کامیاب ہو گیا۔ لیکن اگر کسی میں استعداد سو درجے کی تھی اور اس نے ۵۰ درجے کام کیا تو وہ ناکام ہو گیا۔ حالانکہ کمیت کے اعتبار سے ۵۰ درجے ۱۸ درجے سے زیادہ ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کا محاسبہ جو ہے وہ انفرادی سطح پر ہے۔ اس لیے فرمایا گیا: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ۝﴾ (مریم) ’’اور سب لوگ قیامت کے دن اس کے حضور فرداً فرداً حاضر ہوں گے‘‘۔ وہاں ہر ایک کا حساب اکیلے اکیلے ہوگا اور وہ اس کی وسعت کے مطابق ہوگا۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ﴾ کے الفاظ میں جو ایک اہم اصول بیان کر دیا گیا ہے‘ بعض لوگ دنیا کی زندگی میں اس کا غلط نتیجہ نکال بیٹھتے ہیں۔ وہ دنیا کے معاملات میں تو خوب بھاگ دوڑ کرتے ہیں لیکن دین کے معاملے میں کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے اندر صلاحیت اور استعداد ہی نہیں ہے۔ یہ محض خود فریبی ہے۔ استعداد و استطاعت اور ذہانت و صلاحیت کے بغیر تو دنیا میں بھی آپ محنت نہیں کر سکتے‘ کوئی نتائج حاصل نہیں کر سکتے‘ کچھ کما نہیں سکتے۔ لہٰذا اپنے آپ کو یہ دھوکہ نہ دیجیے اور جو کچھ کر سکتے ہوں‘ وہ ضرور کیجیے۔ اپنی شخصیت کو کھود کھود کر اس میں سے جو کچھ نکال سکتے ہوں وہ نکالیے! ہاں آپ نکال سکیں گے اتنا ہی جتنا آپ کے اندر ودیعت ہے۔

زیادہ کہاں سے لے آئیں گے؟ اور اللہ نے کس میں کیا ودیعت کیا ہے' وہ وہی جانتا ہے۔ تمہارا محاسبہ اسی کی بنیاد پر ہوگا جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے۔ اس مضمون کی اہمیت کا اندازہ کیجیے کہ یہ قرآن مجید میں پانچ مرتبہ آیا ہے۔

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ﴾ ''اُسی جان کے لیے ہے جو اُس نے کمایا اور اُسی کے اوپر وبال بنے گا جو اس نے بُرائی کمائی۔''

اس مقام پر بھی ''ل'' اور ''عَلٰی'' کے استعمال پر غور کیجیے۔ ﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ﴾ سے مراد ہے جو بھی نیکی اُس نے کمائی ہوگی وہ اس کے لیے ہے' اس کے حق میں ہے' اس کا اجر وثواب اسے ملے گا۔ ﴿وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ﴾ سے مراد ہے کہ جو بدی اُس نے کمائی ہوگی اس کا وبال اسی پر آئے گا' اس کی سزا اسی کو ملے گی۔

اب وہ دعا آ گئی ہے جو قرآن مجید کی جامع ترین اور عظیم ترین دعا ہے:

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے۔''

ایمان اور عملِ صالح کے راستے پر چلتے ہوئے اپنی شخصیت کے کونوں کھدروں میں سے امکان بھر اپنی باقی ماندہ توانائیوں (residual energies) کو بھی نکال نکال کر اللہ کی راہ میں لگا لیں' لیکن اس کے بعد بھی اپنی محنت پر' اپنی نیکی' اپنی کمائی اور اپنے کارناموں پر کوئی غرّہ نہ ہو' کوئی غرور نہ ہو' کہیں انسان دھوکہ نہ کھا جائے' بلکہ اس کی کیفیت تواضع' عجز اور انکساری کی رہنی چاہیے۔ اور اسے یہ دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اے پروردگار! ہماری بھول چوک پر ہم سے مؤاخذہ نہ فرمانا۔

انسان کے اندر خطا اور نسیان دونوں چیزیں گندھی ہوئی ہیں: (اَلْاِنْسَانُ مُرَكَّبٌ مِنَ الْخَطَأِ وَالنِّسْيَانِ) خطا یہ ہے کہ آپ نے اپنی امکانی حد تک تو نشانہ ٹھیک لگایا تھا' لیکن نشانہ خطا ہو گیا۔ اس پر آپ کی گرفت نہیں ہوگی' اس لیے کہ آپ کی نیت صحیح تھی۔ ایک اجتہاد کرنے والا اجتہاد کر رہا ہے' اس نے امکانی حد تک کوشش کی ہے کہ صحیح رائے تک پہنچے' لیکن خطا ہو گئی۔ اللہ معاف کرے گا۔ مجتہد مخطی بھی ہو تو اس کو ثواب ملے گا اور مجتہد مصیب ہو' صحیح رائے پر پہنچ جائے تو اس کو دوہرا ثواب ملے گا۔ اور نسیان یہ ہے کہ بھولے سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ)) (۳۷) ''اللہ تعالیٰ نے میری اُمّت سے خطا اور نسیان معاف فرما دیا ہے۔''

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ﴾ ''اور اے ربّ ہمارے! ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا تھا جو ہم سے پہلے تھے۔''

ایک حمل (بوجھ) وہ ہوتا ہے جس کو لے کر انسان چلتا ہے۔ اسی سے ''حمّال'' بنا ہے جو ایک بوری کو یا بوجھ کو اٹھا کر چل رہا ہے۔ جو بوجھ آپ کی طاقت میں ہے اور جسے لے کر آپ چل سکیں وہ ''حمل'' ہے' اور جس بوجھ کو آپ اٹھا نہ سکیں اور وہ آپ کو بٹھا دے اس کو ''اِصر'' کہتے ہیں۔ یہ لفظ سورۃ الاعراف (آیت ۱۵۷) میں پھر آئے گا: ﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ﴾ ان الفاظ میں محمد رسول اللہ ﷺ کی یہ شان بیان ہوئی ہے کہ انہوں نے لوگوں کے وہ بوجھ جو اُن کی طاقت سے بڑھ کر تھے' ان کے کندھوں سے اتار دیے۔ ہم سے پہلے لوگوں پر بڑے بھاری بوجھ ڈالے گئے تھے۔ شریعتِ موسوی ہماری شریعت کی نسبت بہت

۳۷۔ سنن ابن ماجه' کتاب الطلاق' باب طلاق المکره والناسی۔

بھاری تھی۔ جیسے ان کے ہاں روزہ رات ہی سے شروع ہو جاتا تھا' لیکن ہمارے لیے یہ کتنا آسان کر دیا گیا کہ روزے سے رات کو نکال دیا گیا اور سحری کرنے کی تاکید فرمائی گئی: ((تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السُّحُوْرِ بَرَکَۃً))(۳۸) ''سحری ضرور کیا کرو' اس لیے کہ سحریوں میں برکت رکھی گئی ہے''۔ پھر رات میں تعلق زن وشو کی اجازت دی گئی۔ ان کے روزے میں خاموشی بھی شامل تھی۔ یعنی نہ کھانا' نہ پینا' نہ تعلقِ زن وشو اور نہ گفتگو۔ ہمارے لیے کتنی آسانی کر دی گئی ہے! ان کے ہاں یومِ سبت کا حکم اتنا سخت تھا کہ پورا دن کوئی کام نہیں کرو گے۔ ہمارے ہاں جمعہ کی اذان سے لے کر نماز کے ادا ہو جانے تک ہر کاروبارِ دنیوی حرام ہے۔ لیکن اس سے پہلے اور اس کے بعد آپ کاروبار کر سکتے ہیں۔

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ﴾ ''اور اے ربّ ہمارے! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈالنا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو۔''

﴿وَاعْفُ عَنَّا ۟﴾ ''اور ہم سے درگزر فرما تا رہ!''

ہماری لغزشوں کو معاف کرتا رہ!

﴿وَاغْفِرْ لَنَا ۟﴾ ''اور ہمیں بخشتا رہ!''

ہماری خطاؤں کی پردہ پوشی فرما دے!

مغفرت کے لفظ کو سمجھ لیجیے۔ اس میں ڈھانپ لینے کا مفہوم ہے۔ مِغْفَرْ' خود (ہیلمٹ) کو کہتے ہیں' جو جنگ میں سر پر پہنا جاتا ہے۔ یہ سر کو چھپا لیتا ہے اور اسے گولی یا تلوار کے وار سے بچاتا ہے۔ تو مغفرت یہ ہے کہ گناہوں کو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ڈھانپ دے' ان کی پردہ پوشی فرما دے۔

﴿وَارْحَمْنَا ۟﴾ ''اور ہم پر رحم فرما۔''

﴿اَنْتَ مَوْلٰىنَا﴾ ''تو ہمارا مولا ہے۔''

تو ہمارا پشت پناہ ہے' ہمارا والی ہے' ہمارا حامی و مددگار ہے۔ ہم یہ آیت پڑھ آئے ہیں: ﴿اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ (آیت ۲۵۷)

﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِیْنَ ۝۲۸۶﴾ ''پس ہماری مدد فرما کافروں کے مقابلے میں۔''

انہی الفاظ پر وہ دعا ختم ہوئی تھی جو طالوت کے ساتھیوں نے کی تھی۔ اب اہلِ ایمان کو یہ دعا تلقین کی جا رہی ہے' اس لیے کہ مرحلہ سخت آ رہا ہے۔ گویا: ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالب مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز!

اب کُفّار کے ساتھ مقابلے کا مرحلہ آ رہا ہے اور اس کے لیے مسلمانوں کو تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ درحقیقت غزوۂ بدر کی تمہید ہے۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم' ونفعنی وایاکم بالآیات والذِّکر الحکیم۝۝

۳۸۔ صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب برکۃ السحور من غیر ایجاب۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل السحور وتاکید استحبابہ واستحباب تأخیرہ۔

سُوْرَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ

تمہیدی کلمات

قرآن حکیم کے آغاز میں واقع مکی اور مدنی سورتوں کے پہلے گروپ میں مدنی سورتوں کے جو دو جوڑے آئے ہیں' ان میں سے پہلے جوڑے کی پہلی سورت یعنی ''سورۃ البقرۃ'' کے ترجمے اور مختصر تشریح کی ہم تکمیل کر چکے ہیں' اور اب ہمیں اس جوڑے کی دوسری سورت ''آل عمران'' کا مطالعہ کرنا ہے۔ واضح رہے کہ دو چیزوں کے مابین جوڑے کا تعلق یا نسبتِ زوجیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں میں گہری مشابہت بھی ہے لیکن کچھ فرق بھی ہے' اور یہ فرق ایک دوسرے کے لیے تکمیلی (complementary) نوعیت کا ہے' یعنی ان کے باہم اکٹھے ہونے سے کسی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ نسبتِ زوجیت کی اصطلاح کے اس مفہوم کو حیوانات کے جوڑوں کے حوالے سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران میں مشابہت کے نمایاں پہلو یہ ہیں کہ یہ دونوں سورتیں حروفِ مقطعات ''الٓمّٓ'' سے شروع ہوتی ہیں۔ دونوں کے آغاز میں قرآن مجید کی عظمت کا بیان ہے' پھر یہ کہ دونوں کے اختتام پر بڑی عظیم آیات آئی ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آخری آیت کو قرآن حکیم کی عظیم ترین دعاؤں میں شمار کیا جا سکتا ہے: ﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ...﴾ سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں بھی ایسی ہی ایک نہایت جامع دعا آئی ہے جو تین چار آیتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ پھر جیسے کہ سورۃ البقرۃ کے تعارف میں ذکر ہو چکا ہے' سورۃ البقرۃ سُوْرَۃُ الْاُمَّتَیْن ہے' یعنی اس میں دو اُمتوں سے خطاب ہے تو یہی معاملہ سورۃ آل عمران کا بھی ہے۔ فرق یہ ہے کہ سورۃ البقرۃ میں زیادہ گفتگو یہود کے بارے میں ہے جبکہ سورۂ آلِ عمران میں زیادہ زور نصاریٰ سے خطاب پر ہے۔ اس طرح اہلِ کتاب سے گفتگو سے متعلق جس مضمون کا آغاز سورۃ البقرۃ میں ہوا تھا سورۂ آل عمران میں آ کر اس کی تکمیل ہو گئی ہے۔ پھر جیسے سورۃ البقرۃ کے دو تقریباً مساوی حصے ہیں' پہلا نصف اٹھارہ رکوعوں اور ۱۵۲ آیات پر مشتمل ہے جبکہ نصفِ ثانی ۲۲ رکوعوں اور ۱۳۴ آیات پر مشتمل ہے' وہی کیفیت یہاں سورۃ آل عمران میں بھی بتمام و کمال ملتی ہے۔ سورۂ آل عمران کے بھی دو مساوی حصے ہیں۔ اس کے کُل ۲۰ رکوع ہیں' ۱۰ رکوع نصفِ اوّل میں ہیں اور ۱۰ رکوع ہی نصفِ ثانی میں۔ پہلے دس رکوعوں میں ۱۰۱ آیات جبکہ دوسرے دس رکوعوں میں ۹۹ آیات ہیں۔ یعنی صرف ایک آیت کا فرق ہے۔ پھر جیسے سورۃ البقرۃ میں نصفِ اوّل کے تین حصے ہیں ویسے ہی سورۂ آل عمران کا نصفِ اوّل بھی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ لیکن تین حصوں کی یہ تقسیم رکوعوں کے اعتبار سے نہیں بلکہ آیات کے اعتبار سے ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی ۳۲ آیات اسی طرح تمہیدی کلام پر مشتمل ہیں جیسے سورۃ البقرۃ کے ابتدائی چار رکوع تمہیدی گفتگو سے متعلق ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں روئے سخن ابتدا ہی سے یہود کی طرف ہو گیا ہے' جبکہ یہاں روئے سخن ابتدا ہی سے نصاریٰ کی طرف ہے۔

ابتدائی ۳۲ آیات کے بعد کی ۳۱ آیات میں نصاریٰ سے براہِ راست خطاب ہے۔ ان آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی

ولادت' ان کے مقام و مرتبہ اور ان کے خلاف یہودیوں کی سازشوں کے انجام جیسے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کا اکثر و بیشتر حصہ ۳ ہجری میں غزوۂ اُحد کے بعد نازل ہوا ہے' لیکن ۳۱ آیات پر مشتمل یہ حصہ ۹ ہجری میں وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر نازل ہوا۔ ''نجران'' عرب کے جنوب میں یمن کی جانب عیسائیوں کی ایک بستی تھی۔ وہاں کے عیسائی سردار اور پادری تقریباً ستر آدمیوں کا ایک وفد لے کر ۹ ہجری میں رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو سمجھنے کے لیے آپؐ کی خدمت میں مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ وہ لوگ کئی دن مدینہ میں مقیم رہے۔ انہوں نے بات پوری طرح سمجھ بھی لی لیکن حضور ﷺ کی نبوت کا اقرار کرنے سے گریزاں رہے۔ اس پر آنحضور ﷺ نے انہیں مباہلے کی دعوت دی' لیکن وہ اس چیلنج کو قبول کیے بغیر وہاں سے چلے گئے۔ انہوں نے نہ تو رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی شدت کے ساتھ تردید کی اور نہ ہی اسے قبول کیا۔ سورۂ آل عمران کی مذکورہ ۳۱ آیات نجران کے ان عیسائیوں سے خطاب کے طور پر نازل ہوئیں۔ ان آیات کے مقابل سورۃ البقرۃ کے رکوع ۳۸ کی وہ آیات بھی ۹ ہجری کے لگ بھگ نازل ہوئیں جن میں سود سے متعلق آخری احکام کا ذکر ہے۔ گویا مشابہت کا ایک یہ پہلو بھی دونوں سورتوں میں پایا جاتا ہے۔ یعنی سورۃ البقرۃ کا اکثر و بیشتر حصہ اگرچہ غزوۂ بدر سے قبل نازل ہوا' لیکن اس کی کچھ آیات ۹ ھ میں نازل ہوئیں۔ اسی طرح سورۂ آلِ عمران کا اکثر و بیشتر حصہ اگرچہ غزوۂ اُحد کے بعد ۳ ھ میں نازل ہوا' لیکن نجران کے عیسائیوں سے خطاب کے ضمن میں اس کی ۳۱ آیات ۹ ھ میں نازل ہوئیں۔ پھر جیسے سورۃ البقرۃ کے نصفِ اوّل کے آخری حصے (رکوع ۱۵' ۱۶' ۱۷' ۱۸) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کا ذکر ہے بالکل اسی طرح سورۂ آل عمران کے نصف اول کے آخر میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کا ذکر ہے۔ سورۂ آل عمران کے اس مقام پر بھی اہلِ کتاب کو اسی انداز میں دعوت دی گئی ہے جیسے سورۃ البقرۃ کے ۱۶ ویں رکوع میں دی گئی ہے۔ سورۂ آل عمران کے نصفِ اوّل کا یہ تیسرا حصہ ۳۸ آیات پر مشتمل ہے۔ یہ آیات خصوصی طور پر بہت جامع ہیں۔

سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران دونوں میں سے ہر ایک کے نصفِ ثانی کا آغاز ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ جیسے سورۃ البقرۃ کے انیسویں رکوع سے نصفِ ثانی کا آغاز ہوتا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝۱۵۳﴾ اسی طرح سورۂ آلِ عمران کے گیارہویں رکوع سے اس کے نصفِ ثانی کا آغاز ہوتا ہے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝۱۰۲﴾

ان دونوں سورتوں کے مابین نسبتِ زوجیت اس قدر گہری ہے کہ ایک سورت کی بعض آیات ہو بہو دوسری سورت میں آ گئی ہیں' جبکہ بعض آیات کے بیشتر الفاظ دونوں سورتوں میں مشترک ہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۳۶ معمولی لفظی تبدیلی کے ساتھ سورۂ آلِ عمران میں آیت ۸۴ کے طور پر دہرائی گئی ہے۔ اسی طرح سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۱ اور سورۂ آل عمران کی آیت ۱۱۲ کے الفاظ' مضمون اور اسلوب میں گہری مشابہت پائی جاتی ہے۔ [قرآن مجید کے ایسے مقامات متشابہ کہلاتے ہیں۔ ان متشابہ مقامات و آیات کو یاد رکھنے کے لیے حفّاظ کو بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔]

واضح رہے کہ اس نوعیت کی نسبت (نسبتِ زوجیت) قرآن مجید کی اکثر و بیشتر سورتوں میں پائی جاتی ہے' لیکن اس کی پہچان کے لیے گہرے تدبّر کی ضرورت ہے۔ بہرحال اس حوالے سے قرآن مجید پر جس قدر فکر و تدبّر اور غور و خوض کیا جائے اسی قدر اضافی معانی' اضافی علم' اضافی معرفت اور اضافی حکمت کے خزانوں کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔

سورۂ آل عمران کا نصفِ ثانی دس رکوعوں پر مشتمل ہے اور ان کے مضامین کی تقسیم عمودی ہے' اُفقی نہیں ہے۔ پہلے دو رکوعوں میں

خطاب زیادہ تر مسلمانوں سے ہے۔ اس کے بعد مسلسل چھ رکوع (۱۶۰ آیات) غزوۂ اُحد کے حالات پر تبصرے سے متعلق ہیں۔ یعنی اس ضمن میں جو مسائل سامنے آئے ان پر تبصرہ' مسلمانوں سے جو غلطیاں ہوئیں ان پر گرفت اور آئندہ کے لیے ہدایات۔ اس سورت کا یہ حصہ گویا ''غزوۂ اُحد'' کے عنوان سے قرآن مجید کا ایک مستقل باب (chapter) ہے۔ البتہ قرآن میں اس طرح کے ذیلی ابواب نہیں بنائے گئے ہیں' بلکہ اس کلام کی تقسیم سورتوں کے عنوانات کے حوالے سے ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں ''تعارفِ قرآن'' کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے' قرآن خطباتِ الٰہیہ کا مجموعہ ہے۔ ان خطبات میں مختلف مضامین خاص ربط اور ترتیب سے بیان ہوئے ہیں۔ زمانہ ماضی میں اس ربط اور ترتیب پر بہت کم توجہ دی گئی' لیکن موجودہ دور میں قرآن حکیم کے علم و معرفت کا یہ پہلو نسبتاً زیادہ نمایاں ہوا ہے۔ بہرحال یہ انتہائی منظم اور مربوط کلام ہے' اس میں آیات کا آیات کے ساتھ اور سورتوں کا سورتوں کے ساتھ ربط واضح نظر آتا ہے۔

اس سورۂ مبارکہ کے آخری دو رکوع بہت جامع ہیں۔ انیسویں رکوع میں پوری سورۂ مبارکہ کے مضامین کا گویا خلاصہ بیان ہوا ہے' جبکہ آخری رکوع فلسفۂ ایمان کی بحث کے حوالے سے اہم ہے۔ اس رکوع میں وہ عظیم دعا بھی ہے جس کا ذکر ان تعارفی کلمات میں قبل ازیں بھی آ چکا ہے۔

سورۃ البقرۃ کے تعارف کے دوران اگرچہ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کے مشترکہ نام کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے' مگر یہاں یاددہانی کے طور پر ایک مرتبہ پھر نوٹ کر لیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں سورتوں کو ''الزَّهْرَاوَيْن'' کا نام دیا ہے' یعنی دو نہایت تابناک اور روشن سورتیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ قرآن مجید کی دو آخری سورتوں یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کو اسی طرح ''المُعَوِّذَتَيْن'' کا نام دیا گیا ہے۔

آیات ۱ تا ۹

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِيَّةٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ اٰيَاتُهَا: ۲۰۰ رُكُوْعَاتُهَا: ۲۰

الٓمّٓ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ
يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۭ اِنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى
عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاۗءِ ﴿۵﴾ هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاۗءُ ۭ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ
اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ
الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ
كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۷﴾ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ
هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۸﴾ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ
لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۹﴾ ع ۱

آیت ۱ ﴿الٓمّٓ ①﴾ ''ا۔ل۔م۔''

یہ حروفِ مقطعات ہیں جن کے بارے میں اجمالی گفتگو ہم سورۃ البقرۃ کے آغاز میں کر چکے ہیں۔

آیت ۲ ﴿اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ②﴾ ''اللہ وہ معبودِ برحق ہے جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں' وہ زندہ ہے' سب کا قائم رکھنے والا ہے۔''

یہ الفاظ سورۃ البقرۃ میں آیت الکرسی کے آغاز میں آ چکے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک اسم اعظم ہے' جس کے حوالے سے اگر اللہ سے کوئی دعا مانگی جائے تو وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ یہ تین سورتوں البقرۃ' آل عمران اور طٰہٰ میں ہے۔(۱)

آنحضور ﷺ نے تعیّن کے ساتھ نہیں بتایا کہ وہ اسم اعظم کون سا ہے' البتہ کچھ اشارے کیے ہیں۔ جیسے رمضان المبارک کی ایک شب ''لیلۃ القدر'' جو ہزار مہینوں سے افضل ہے' اس کے بارے میں تعیّن کے ساتھ نہیں بتایا کہ وہ کون سی ہے' بلکہ فرمایا: ((فَالْتَمِسُوْهَا فِی الْعَشْرِ الْاَوَاخِرِ فِی الْوِتْرِ))(۲) ''اسے آخری عشرے کی طاق راتوں میں تلاش کرو''۔ تاکہ زیادہ ذوق و شوق کا معاملہ ہو۔ اسی طرح اسمِ اعظم کے بارے میں آپؐ نے اشارات فرمائے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تین سورتوں سورۃ البقرۃ' سورۂ آل عمران اور سورۂ طٰہٰ میں ہے۔ ان تین سورتوں میں جو الفاظ مشترک ہیں وہ ''الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ'' ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں یہ الفاظ آیت الکرسی میں آئے ہیں' سورۂ آل عمران میں یہاں دوسری آیت میں اور سورۃ طٰہٰ کی آیت ۱۱۱ میں موجود ہیں۔

آیت ۳ ﴿نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ ''اُس نے نازل فرمائی ہے آپ پر (اے نبی ﷺ) یہ کتاب حق کے ساتھ''

اُس اللہ نے جس کے سوا کوئی معبود نہیں' جو الْحَیُّ ہے' الْقَیُّوْمُ ہے۔ اس میں اس کلام کی عظمت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ جان لو یہ کلام کس کا ہے' کس نے اتارا ہے۔ اور یہاں نوٹ کیجیے لفظ نَزَّلَ آیا ہے' اَنْزَلَ نہیں آیا۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ﴾ ''یہ تصدیق کرتے ہوئے آئی ہے اُس کی جو اس کے سامنے موجود ہے''

یعنی تورات اور انجیل کی جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں۔ قرآن حکیم سابقہ کُتبِ سماویہ کی دو اعتبارات سے تصدیق کرتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی کتابیں تھیں جن میں تحریف ہو گئی۔ دوسرے یہ کہ قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ ان پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر آئے ہیں جو اُن کتابوں میں موجود تھیں۔

﴿وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ③﴾ ''اور اُس نے تورات اور انجیل نازل فرمائی تھیں۔''

آیت ۴ ﴿مِنْ قَبْلُ هُدًی لِّلنَّاسِ﴾ ''اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لیے''

﴿وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ﴾ ''اور اللہ نے فرقان اُتارا۔''

''فرقان'' کا مصداق قرآن مجید بھی ہے' تورات بھی ہے اور معجزات بھی ہیں۔ سورۃ الانفال میں ''یوم الفرقان'' غزوۂ بدر کے دن کو کہا گیا ہے۔ ہر وہ شے جو حق کو بالکل مبرہن کر دے اور حق و باطل کے مابین امتیاز پیدا کر دے وہ فرقان ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ﴾ ''بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا ان کے

۱۔ سنن ابن ماجه' کتاب الدعاء' باب اسم الله الاعظم۔

۲۔ صحیح البخاری' کتاب صلاة التراویح' باب التماس لیلة القدر فی السبع الاواخر۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل لیلة القدر...

لیے سخت عذاب ہے۔''

یہاں اب تہدید اور دھمکی کا انداز ہے کہ اس قرآن کا معاملہ دنیا کی دوسری کتابوں کی طرح نہ سمجھو کہ مان لیا تب بھی کوئی حرج نہیں' نہ مانا تب بھی کوئی حرج نہیں۔ اگر پڑھنے پر طبیعت راغب ہوئی تو بھی کوئی بات نہیں' طبیعت راغب نہیں ہے تو مت پڑھو' کوئی الزام نہیں۔ یہ کتاب ویسی نہیں ہے' بلکہ یہ وہ کتاب ہے کہ جو اس پر ایمان نہیں لائیں گے اُن کے لیے بہت سخت سزا ہوگی۔

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝۴﴾ ''اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے' انتقام لینے والا ہے۔''

یہ لفظ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ بے شک رؤف ہے' رحیم ہے' شفیق ہے' غفور ہے' ستار ہے' لیکن ساتھ ہی ''عزیزٌ ذُوانتقام'' بھی ہے' ''شدیدُ العِقاب'' بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ دونوں شانیں قلب و ذہن میں رہنی چاہئیں۔

آیت ۵ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ۝۵﴾ ''یقیناً اللہ پر کوئی شے بھی مخفی نہیں ہے' نہ آسمان میں نہ زمین میں۔''

آیت ۶ ﴿هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ ۭ﴾ ''وہی ہے جو تمہاری صورت گری کرتا ہے (تمہاری ماؤں کے) رحموں میں جس طرح چاہتا ہے۔''

پہلی چیز اللہ کے علم سے متعلق تھی اور یہ اللہ کی قدرت سے متعلق ہے۔ وہی ہے جو تمہاری نقشہ کشی کر دیتا ہے' صورت بنا دیتا ہے تمہاری ماؤں کے رحموں میں جیسے چاہتا ہے۔ کسی کے پاس کوئی اختیار (choice) نہیں ہے کہ وہ اپنا نقشہ خود بنائے۔

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶﴾ ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ غالب اور حکیم ہے۔''

آیت ۷ ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ﴾ ''وہی ہے جس نے آپؐ پر یہ کتاب نازل فرمائی''

کسی کسی جگہ نَزَّلَ کے بجائے اَنْزَلَ کا لفظ بھی آ جاتا ہے' اور یہ آہنگ (rhythm) کے اعتبار سے ہوتا ہے' کیونکہ قرآن مجید کا اپنا ایک ملکوتی غنا (Divine Music) ہے' اس میں اگر آہنگ کے حوالے سے ضرورت ہو تو یہ الفاظ ایک دوسرے کی جگہ آ جاتے ہیں۔

﴿مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ﴾ ''اس میں محکم آیات ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں''

''محکم'' اور پختہ آیات وہ ہیں جن کا مفہوم بالکل واضح ہو اور جنہیں اِدھر سے اُدھر کرنے کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ اس کتاب کی جڑ' بنیاد اور اساس وہی ہیں۔

﴿وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ﴾ ''اور کچھ دوسری آیتیں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔''

جن کا حقیقی اور صحیح صحیح مفہوم معین کرنا بہت مشکل بلکہ عام حالات میں ناممکن ہے۔ اس کی تفصیل تعارفِ قرآن کے ضمن میں عرض کی جا چکی ہے۔ آیاتُ الاحکام جتنی بھی ہیں وہ سب محکم ہیں' کہ یہ کرو یہ نہ کرو' یہ حلال ہے یہ حرام! جیسا کہ ہم نے سورۃ البقرۃ میں دیکھا کہ بار بار ''كُتِبَ عَلَيْكُمْ'' کے الفاظ آتے رہے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ کتاب درحقیقت ہے ہی مجموعۂ احکام۔ لیکن جن آیات میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی بحث ہے ان کا فہم آسان نہیں ہے۔ اللہ کی ذات و صفات کا ہم کیا تصور کر سکتے ہیں؟ اللہ کا ہاتھ' اللہ کا چہرہ' اللہ کی کرسی' اللہ کا عرش' ان کا ہم کیا تصور کریں گے؟ اسی طرح فرشتے عالمِ غیب کی شے ہیں۔ عالمِ برزخ کی کیا کیفیت ہے؟ قبر میں کیا ہوتا ہے؟ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ عالمِ آخرت' جنت اور دوزخ کی اصل حقیقتیں ہم نہیں سمجھ سکتے۔ چنانچہ ہماری ذہنی سطح کے

قریب لا کر کچھ باتیں ہمیں بتا دی گئی ہیں کہ مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ کُلُّہٗ (جو چیز پوری کی پوری حاصل نہ ہو سکے اسے پورے کا پورا چھوڑا بھی نہیں جاتا۔) چنانچہ ان کا ایک اجمالی تصور قائم ہو جانا چاہیے' اس کے بغیر آدمی کا راستہ سیدھا نہیں رہے گا۔ لیکن ان کی تفاصیل میں نہیں جانا چاہیے۔ دوسرے درجے میں مَیں نے آپ کو بتایا تھا کہ کچھ طبیعیاتی مظاہر (Physical Phenomena) بھی ایک وقت تک آیاتِ متشابہات میں سے رہے ہیں' لیکن جیسے جیسے سائنس کا علم بڑھتا چلا جا رہا ہے' رفتہ رفتہ ان کی حقیقت سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے اور اب بہت سی چیزیں محکم ہو کر ہمارے سامنے آ رہی ہیں۔ تاہم اب بھی بعض چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت سے ہم بے خبر ہیں۔ جیسے ہم ابھی تک نہیں جانتے کہ سات آسمان سے مراد کیا ہے؟ ہمارا یقین ہے کہ اِن شاء اللہ وہ وقت آئے گا کہ انسان سمجھ لے گا کہ ہاں یہی بات صحیح تھی اور یہی تعبیر صحیح تھی جو قرآن نے بیان کی تھی۔

﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ﴾ ''تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ پیچھے لگتے ہیں ان آیات کے جو ان میں سے متشابہ ہیں''

﴿ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ﴾ ''فتنے کی تلاش میں''

وہ چاہتے ہیں کہ کوئی خاص نئی بات نکالی جائے تاکہ اپنی ذہانت اور فطانت کا ڈنکا بجایا جا سکے یا کوئی فتنہ اٹھایا جائے' کوئی فساد پیدا کیا جائے۔ جن کا اپنا ذہن ٹیڑھا ہو چکا ہے وہ اس ٹیڑھے ذہن کے لیے قرآن سے کوئی دلیل چاہتے ہیں۔ چنانچہ اب وہ متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں کہ ان میں سے کسی کے مفہوم کو اپنے مَن پسند مفہوم کی طرف موڑ سکیں۔ یہ اس سے فتنہ اٹھانا چاہتے ہیں۔

﴿وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ﴾ ''اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کرنے کے لیے۔''

وہ تلاش کرتے ہیں کہ ان آیات کی اصل حقیقت' اصل منشا اور اصل مراد کیا ہے۔ یعنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کا علمی ذوق ہی ایسا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کی فطرت میں کجی ہو۔

﴿وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ۘ﴾ ''حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

﴿وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ﴾ ''اور جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اس کتاب پر' یہ کُل کا کُل ہمارے ربّ کی طرف سے ہے۔''

جن لوگوں کو رسوخ فی العلم حاصل ہو گیا ہے' جن کی جڑیں علم میں گہری ہو چکی ہیں ان کا طرزِ عمل یہ ہوتا ہے کہ جو بات صاف سمجھ میں آ گئی ہے اس پر عمل کریں گے اور جو بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آ رہی ہے اس کے لیے انتظار کریں گے' لیکن یہ اجمالی یقین رکھیں گے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔

﴿وَمَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝۷﴾ ''اور نصیحت حاصل نہیں کر سکتے مگر وہی جو ہوش مند ہیں۔''

اور سب سے بڑی ہوش مندی یہ ہے کہ انسان اپنی عقل کی حدود (limitations) کو جان لے کہ میری عقل کہاں تک جا سکتی ہے۔ اگر انسان یہ نہیں جانتا تو پھر وہ اولوالالباب میں سے نہیں ہے۔ بلاشبہ عقل بڑی شے ہے لیکن اس کی اپنی حدود ہیں۔ ایک حد سے آگے عقل تجاوز نہیں کر سکتی: ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے!

یعنی منزل تک پہنچانے والی شے عقل نہیں، بلکہ قلب ہے۔ لیکن عقل بہرحال ایک روشنی دیتی ہے، حقیقت کی طرف اشارے کرتی ہے۔

آیت ۸ ﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا﴾ ''(اور ان اولوالالباب کا یہ قول ہوتا ہے) اے ربّ ہمارے! ہمارے دلوں کو کج نہ ہونے دیجیو اس کے بعد کہ تُو نے ہمیں ہدایت دے دی ہے''

﴿وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ﴾ ''اور ہمیں تُو خاص اپنے خزانۂ فضل سے رحمت عطا فرما۔''

﴿اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸﴾ ''یقیناً تُو ہی سب کچھ دینے والا ہے۔''

ہمیں جو بھی ملے گا تیری ہی بارگاہ سے ملے گا۔ تُو ہی فیاضِ حقیقی ہے۔

آیت ۹ ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ﴾ ''اے ربّ ہمارے! یقیناً تُو جمع کرنے والا ہے لوگوں کو ایک ایسے دن کے لیے جس (کے آنے) میں کوئی شک نہیں ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۹﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ اس وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔''

اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ لہٰذا جو اُس نے بتایا ہے وہ ہو کر رہے گا اور قیامت کا دن آ کر رہے گا۔

آیات ۱۰ تا ۲۰

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝۱۰ۙ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۱ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۲ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۭ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝۱۳ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاۗءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝۱۴ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۱۵ۚ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۶ۚ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝۱۷ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَاۗىِٕمًۢا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۸ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹ فَاِنْ حَاۗجُّوْكَ فَقُلْ

اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ۭ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ۭ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰

آیت ۱۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ﴾ ''یقیناً جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کی ہرگز نہ بچا سکیں گے انہیں ان کے مال اور نہ ان کی اولاد اللہ سے کچھ بھی۔''

اب یہ ذرا تحدی اور چیلنج کا انداز ہے۔ زمانۂ نزول کے اعتبار سے آپ نے نوٹ کر لیا کہ یہ سورۂ مبارکہ ۳ھ میں غزوۂ اُحد کے بعد نازل ہو رہی ہے' لیکن یہ رکوع جو زیر مطالعہ ہے اس کے بارے میں گمانِ غالب ہے کہ یہ غزوۂ بدر کے بعد نازل ہوا۔ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کو بڑی زبردست فتح حاصل ہوئی تھی تو مسلمانوں کا morale بہت بلند تھا۔ لیکن ایسی روایات بھی ملتی ہیں کہ جب مسلمان بدر سے غازی بن کر' فتح یاب ہو کر واپس آئے تو مدینہ منورہ میں جو یہودی قبیلے تھے ان میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ مسلمانو! اتنا نہ اِتراؤ۔ یہ تو قریش کے کچھ ناتجربہ کار چھوکرے تھے جن سے تمہارا مقابلہ پیش آیا ہے' اگر کبھی ہم سے مقابلہ پیش آیا تو دن میں تارے نظر آ جائیں گے' وغیرہ وغیرہ۔ تو اس پس منظر میں یہ الفاظ کہے جا رہے ہیں کہ صرف مشرکینِ مکہ پر موقوف نہیں' آخر کار تمام کُفّار اسی طرح سے زیر ہوں گے اور اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓي اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۱﴾ (یوسف) ﴿وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝۱۰﴾ ''اور وہ تو سب کے سب آگ کا ایندھن بنیں گے۔''

آیت ۱۱ ﴿كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ﴾ ''(ان کے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ ہوگا) جیسا کہ آلِ فرعون اور ان لوگوں کے ساتھ ہوا جو اُن سے پہلے گزرے۔''

تمہاری تو حیثیت ہی کیا ہے! کیا پدّی اور کیا پدّی کا شوربہ۔ آلِ فرعون کا معاملہ یاد کرو' ان کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ فرعون بہت بڑا شہنشاہ اور بڑے لاؤ لشکر والا تھا' لیکن اس کا کیا حال ہوا؟ اور اس سے پہلے عاد و ثمود جیسی زبردست قومیں اسی جزیرہ نمائے عرب میں رہی ہیں۔

﴿كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ﴾ ''انہوں نے بھی ہماری آیات کو جھٹلایا تھا۔''

﴿فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ﴾ ''تو اللہ نے پکڑا اُن کو اُن کے گناہوں کی پاداش میں۔''

﴿وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۱۱﴾ ''اور اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

آیت ۱۲ ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۭ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے ان لوگوں سے جو کفر کی روش اختیار کر رہے ہیں کہ تم سب کے سب (دُنیا میں) مغلوب ہو کر رہو گے اور (پھر آخرت میں) جہنم کی طرف گھیر کر لے جائے جاؤ گے۔''

﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۱۲﴾ ''اور وہ بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔''

آیت ۱۳ ﴿قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۭ﴾ ''تمہارے لیے ایک نشانی آ چکی ہے ان دو گروہوں میں جنہوں نے آپس میں جنگ کی۔''

یعنی بدر کی جنگ میں ایک طرف مسلمان تھے اور دوسری طرف مشرکینِ مکہ تھے۔ اس میں تمہارے لیے نشانی موجود ہے۔

﴿فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ﴾ ''ایک گروہ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہا تھا اور دوسرا کافر تھا''

﴿يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ﴾ ''وہ انہیں دیکھ رہے تھے اپنی آنکھوں سے کہ ان سے دُگنے ہیں۔''

اس کے کئی معانی کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کو تو کھلم کھلا نظر آ رہا تھا کہ ہمارے مقابل ہم سے دوگنی فوج ہے' جبکہ وہ تگنی تھی۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر میں کفار پر ایسا رُعب طاری کر دیا تھا کہ انہیں نظر آ رہا تھا کہ مسلمان ہم سے دُگنے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ تائید فرماتا ہے اپنی نصرت سے جس کی چاہتا ہے۔''

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾﴾ ''اس میں یقیناً ایک عبرت ہے آنکھیں رکھنے والوں کے لیے۔''

یہ عبرت اور سبق آموزی صرف ان کے لیے ہوتی ہے جو آنکھیں رکھتے ہوں' جن کے اندر دیکھنے کی صلاحیت موجود ہو۔

اگلی آیت فطرتِ انسانی کے اعتبار سے بڑی اہم ہے۔ بعض لوگوں میں خاص طور پر دنیا اور علائقِ دُنیوی کی محبت زیادہ شدید ہوتی ہے۔ یہاں اس کا اصل سبب بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ شے فطرتِ انسانی میں رکھی ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو قیامت تک آباد رکھنا ہے اور اس کی رونقیں بحال رکھنی ہیں۔ چنانچہ مرد اور عورت کی ایک دوسرے کے لیے کشش ہوگی تو اولاد پیدا ہوگی اور دنیا کی آبادی میں اضافہ ہوتا رہے گا اور اس طرح دنیا قائم رہے گی۔ دولت کی کوئی طلب ہوگی تو آدمی محنت و مشقت کرے گا اور دولت کمائے گا۔ اس لیے یہ چیزیں فطرتِ انسانی میں basic animal instincts کے طور پر رکھ دی گئی ہیں۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ ان جبلی تقاضوں کو دبا کر رکھا جائے' اللہ کی محبت اور اللہ کی شریعت کو اس سے بالاتر رکھا جائے۔ یہ مطلوب نہیں ہے کہ ان کو ختم کر دیا جائے۔ تعذیبِ نفس اور نفس کُشی (self annihilation) اسلام میں نہیں ہے۔ یہ تو رہبانیت ہے کہ اپنے نفس کو کچل دو' ختم کر دو۔ جبکہ اسلام تزکیۂ نفس اور self control کا درس دیتا ہے کہ اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔ نفسِ انسانی ایک مُنہ زور گھوڑا ہے۔ گھوڑا جتنا طاقت ور ہوتا ہے اتنا ہی سوار کے لیے اسے تیز دوڑانا آسان ہوتا ہے' لیکن منہ زور اور طاقتور گھوڑے کو قابو میں رکھنے کی ضرورت بھی ہے۔ ورنہ سوار اگر اس کے رحم و کرم پر آ گیا تو وہ جہاں چاہے گا اسے پٹخنی دے دے گا۔

آیت ۱۴ ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ﴾ ''مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے مرغوباتِ دنیا کی محبت جیسے عورتیں اور بیٹے''

مرغوباتِ دنیا میں سے پہلی محبت عورتوں کی گنوائی گئی ہے۔ فرائیڈ کے نزدیک بھی انسانی محرکات میں سب سے قوی اور زبردست محرّک (potent motive) جنسی جذبہ ہے اور یہاں اللہ تعالیٰ نے بھی سب سے پہلے اُسی کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ بعض لوگوں کے لیے پیٹ کا مسئلہ فوقیت اختیار کر جاتا ہے اور معاشی ضرورت جنسی جذبے سے بھی شدید تر ہو جاتی ہے' لیکن واقعہ یہ ہے کہ مرد و عورت کے مابین کشش انسانی فطرت کا لازمہ ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے بھی فرمایا ہے:

((مَا تَرَكْتُ بَعْدِيْ فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ))[۳]

''میں نے اپنے بعد مَردوں کے لیے عورتوں کے فتنے سے زیادہ ضرر رساں فتنہ اور کوئی نہیں چھوڑا۔''

۳۔ صحیح البخاری' کتاب النکاح' باب ما یتقی من شئوم المرأۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب اکثر اھل الجنۃ الفقراء واکثر اھل النار النساء۔

ان کی محبت انسان کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے۔ بلعام بن باعورہ یہود میں سے ایک بہت بڑا عالم اور فاضل شخص تھا' مگر ایک عورت کے چکر میں آ کر وہ شیطان کا پیرو بن گیا۔ اس کا قصہ سورۃ الاعراف میں بیان ہوا ہے۔ بہرحال عورتوں کی محبت انسانی فطرت کے اندر رکھ دی گئی ہے۔ پھر انسان کو بیٹے بہت پسند ہیں کہ اس کی نسل اور اس کا نام چلتا رہے' وہ بڑھاپے کا سہارا بنیں۔

﴿وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ﴾ ''اور جمع کیے ہوئے خزانے سونے اور چاندی کے''

﴿وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ﴾ ''اور نشان زدہ گھوڑے''

عمدہ نسل کے گھوڑے جنہیں چُن کر ان پر نشان لگائے جاتے ہیں۔

﴿وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ﴾ ''اور مال مویشی اور کھیتی۔''

پنجاب اور سرائیکی علاقہ میں چوپاؤں کو مال کہا جاتا ہے۔ یہ جانور ان کے مالکوں کے لیے مال کی حیثیت رکھتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ﴾ ''یہ سب دُنیوی زندگی کا سروسامان ہے۔''

بس نقطۂ اعتدال یہ ہے کہ جان لو یہ ساری چیزیں اس دنیا کی چند روزہ زندگی کا ساز و سامان ہیں۔ اس زندگی کے لیے ضروریات کی حد تک ان سے فائدہ اٹھانا کوئی بُری بات نہیں ہے۔

﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾﴾ ''لیکن اللہ کے پاس ہے اچھا لوٹنا۔''

وہ جو اللہ کے پاس ہے اس کے مقابلے میں یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر ایمان بالآخرت موجود ہے تو پھر انسان ان تمام مرغوبات کو' اپنے تمام جذبات اور میلانات کو ایک حد کے اندر رکھے گا' اس سے آگے نہیں بڑھنے دے گا۔ لیکن اگر ان میں سے کسی ایک شے کی محبت بھی اتنی زوردار ہو گئی کہ آپ کے دل کے اوپر اس کا قبضہ ہو گیا تو بس آپ اس کے غلام ہو گئے' اب وہی آپ کا معبود ہے' چاہے وہ دولت ہو یا کوئی اور شے ہو۔

آیت ۱۵ ﴿قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ﴾ ''ان سے کہیے کہ کیا میں تمہیں بتاؤں ان تمام چیزوں سے بہتر شے کون سی ہے؟''

﴿لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے ان کے ربّ کے پاس ایسے باغات ہیں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''

تقویٰ یہی ہے کہ تم پر اپنے نفس کا بھی حق ہے جو تمہیں ادا کرنا ہے' لیکن ناجائز راستے سے نہیں۔ تمہارے پیٹ کا بھی حق ہے' وہ بھی ادا کرو' لیکن اکلِ حلال سے۔ تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد کے بھی تم پر حقوق ہیں' جو تمہیں جائز طریقوں سے ادا کرنے ہیں۔ تمہارے جو ملاقاتی آنے والے ہیں ان کا بھی تم پر حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے ارشاد فرمایا تھا:

((فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا' وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا' وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا' وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا)) (۴)

''یقیناً تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے' تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے' اور تمہارے ملاقاتی کا

۴۔ صحیح البخاری' کتاب الصوم' باب حق الجسم فی الصوم۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النهی عن صوم الدهر...

بھی تم پر حق ہے۔''

ان سب کے حقوق ادا کرو' لیکن اللہ سے اوپر کسی حق کو فائق نہ کر دینا۔ بس یہ ہے اصل بات ع ''گر حفظِ مراتب نہ کنی زندیقی!'' اگر یہ حفظِ مراتب نہیں ہوگا تو گویا آپ کا دین بھی گیا اور دنیا بھی گئی۔

﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَا﴾ ''ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے''

﴿وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ﴾ ''اور ان کے لیے بڑی ہی پاک عورتیں ہوں گی''

﴿وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''اور (سب سے بڑھ کر) اللہ کی خوشنودی ہوگی۔''

﴿وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾﴾ ''اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔''

آیت ۱۶ ﴿اَلَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا﴾ ''جو یہ کہتے رہتے ہیں پروردگار! ہم ایمان لے آئے''

﴿فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ ''پس ہمارے گناہوں کو بخش دے''

﴿وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔''

آگے ان کی مدح میں الفاظ استعمال ہو رہے ہیں کہ جو یہ دعائیں کرتے ہیں ان کے یہ اوصاف ہیں۔ اس میں گویا تلقین ہے کہ اگر اللہ سے یہ دعا کرنا چاہتے ہو کہ اللہ تمہارے گناہ بخش دے اور تمہیں جہنم کے عذاب سے بچا لے تو اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کرو۔

آیت ۱۷ ﴿اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ﴾ ''صبر کرنے والے اور راست باز''

راست بازی میں راست گوئی بھی شامل ہے اور راست کرداری بھی۔ یعنی آپ کا عمل بھی صحیح اور درست ہو اور قول بھی صحیح اور درست ہو۔

﴿وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ﴾ ''اور فرماں بردار اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے''

﴿وَالْمُسْتَغْفِرِیْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور اوقاتِ سحر میں مغفرت چاہنے والے۔''

وہ جو سحر کا وقت ہے (small hours of the morning) اُس وقت اللہ کے حضور استغفار کرنے والے۔ ایک تو پنج وقتہ نمازیں ہیں' اور ایک خاص وقت ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ ہر رات جب رات کا آخری ایک تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سمائے دنیا تک نزول فرماتا ہے اور کہتا ہے: ((هَلْ مِنْ سَائِلٍ يُعْطٰى؟ هَلْ مِنْ دَاعٍ يُسْتَجَابُ لَهٗ؟ هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ يُغْفَرُ لَهٗ؟))[۵] ''ہے کوئی مانگنے والا کہ اسے عطا کیا جائے؟ ہے کوئی دعا کرنے والا کہ اس کی دعا قبول کی جائے؟ ہے کوئی استغفار کرنے والا کہ اسے معاف کر دیا جائے؟'' گویا: ؎

ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں
راہ دکھلائیں کسے راہ روِ منزل ہی نہیں!

آیت ۱۸ ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ ''اللہ خود گواہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے''

۵۔ صحیح مسلم' کتاب صلاۃ المسافرین وقصرھا' باب الترغیب فی الدعاء والذکر فی آخر اللیل... اس مضمون کی متعدد احادیث مختلف الفاظ میں صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث میں موجود ہیں۔ (مرتب)

سب سے بڑی گواہی تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی ہے' جو کُتبِ سماویہ سے بھی ظاہر ہے اور مظاہرِ فطرت سے بھی۔

﴿وَالْمَلٰٓئِكَةُ﴾ ''اور سارے فرشتے (گواہ ہیں)''

﴿وَاُولُوا الْعِلْمِ﴾ ''اور اہلِ علم بھی (اس پر گواہ ہیں)''

اولوالعلم وہی لوگ ہیں جنہیں قرآن کہیں اُولوالالباب قرار دیتا ہے اور کہیں ان کے لیے ''الَّذِيْنَ يَعْقِلُوْنَ'' جیسے الفاظ آتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو آیاتِ آفاقی کے حوالے سے اللہ کو پہچان لیتے ہیں اور مان لیتے ہیں کہ وہی معبودِ برحق ہے۔ سورۃ البقرۃ کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت ہم نے پڑھی تھی جسے میں ''آیت الآیات'' قرار دیتا ہوں۔ اس میں بہت سے مظاہرِ فطرت بیان کر کے فرمایا گیا: ﴿لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝۱۶۴﴾ ''(ان میں) یقیناً نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔ تو یہ جو ''قَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ'' ہیں' جو اولوالالباب ہیں' اولوالعلم ہیں' وہ بھی گواہ ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

﴿قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ ''وہ عدل وقسط کا قائم کرنے والا ہے۔''

یہ اس آیت مبارکہ کے اہم ترین الفاظ ہیں۔ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے کہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ عدل قائم کرتا ہے اور عدل کرے گا' البتہ اہلِ سُنّت کے نزدیک یہ کہنا سوءِ ادب ہے کہ اللہ پر عدل کرنا واجب ہے۔ اللہ پر کسی شے کا وجوب نہیں ہے۔ اللہ کو عدل پسند ہے اور وہ عدل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۹﴾ (الحجرات) اور اللہ خود بھی عدل فرمائے گا۔

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱۸﴾ ''اُس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہ زبردست ہے' کمال حکمت والا ہے۔''

آیت ۱۹ ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ﴾ ''یقیناً دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔''

اللہ کا پسندیدہ اور اللہ کے ہاں منظور شدہ دین ایک ہی ہے اور وہ ''اسلام'' ہے۔ سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کی نسبتِ زوجیت کے حوالے سے یہ بات سمجھ لیجیے کہ سورۃ البقرۃ میں ایمان پر زیادہ زور ہے اور سورۂ آل عمران میں اسلام پر۔ سورۃ البقرۃ کے آغاز میں بھی ایمانیات کا تذکرہ ہے' درمیان میں آیت البِرّ میں بھی ایمانیات کا بیان ہے اور آخری آیات میں بھی ایمانیات کا ذکر ہے: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ﴾ جبکہ اس سورۂ مبارکہ میں اسلام کو emphasize کیا گیا ہے۔ یہاں فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ﴾ آگے جا کر آیت آئے گی: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ ''اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو قبول کرے گا وہ اس کی جانب سے اللہ کے ہاں منظور نہیں کیا جائے گا۔''

﴿وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ؕ﴾ ''اور اہلِ کتاب نے اختلاف نہیں کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا مگر باہمی ضِدم ضِدا کے سبب سے۔''

یہ گویا سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۳ (آیت الاختلاف) کا خلاصہ ہے۔ دینِ اسلام تو حضرت آدم علیہ السلام سے چلا آ رہا ہے۔ جن لوگوں نے اس میں اختلاف کیا' پگڈنڈیاں نکالیں اور غلط راستوں پر مُڑ گئے' اس کے بعد کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' ان کا اصلی روگ وہی ضِدم ضِدا کی روش اور غالب آنے کی اُمنگ (The urge to dominate) تھی۔

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹﴾ ''اور جو کوئی اللہ کی آیات کا انکار کرتا ہے تو (وہ یاد رکھے کہ) اللہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کو حساب لیتے دیر نہیں لگے گی' وہ بڑی تیزی کے ساتھ حساب لے لے گا۔

آیت ۲۰ ﴿فَاِنْ حَآجُّوْكَ﴾ ''پھر (اے نبی ﷺ) اگر وہ آپ سے حُجت بازی کریں''

دلیل بازی اور مناظرے کی روش اختیار کریں۔

﴿فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ﴾ ''تو آپ کہہ دیں کہ میں نے تو اپنا چہرہ اللہ کے سامنے جھکا دیا ہے اور انہوں نے بھی جو میرا اتباع کر رہے ہیں۔''

آپؐ ان سے دوٹوک انداز میں یہ آخری بات کہہ دیں کہ ہم نے تو اللہ کے آگے سرِ اطاعت خم کر دیا ہے۔ ہم نے ایک راستہ اختیار کر لیا ہے۔ تم جدھر جانا چاہتے ہو جاؤ' جس پگڈنڈی پر مڑنا چاہتے ہو مڑ جاؤ' جس کھائی میں گرنا چاہتے ہو گر جاؤ۔ ﴿لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝۶﴾ (الکافرون) ''اب تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین۔''

﴿وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے اُن سے بھی کہ جنہیں کتاب دی گئی تھی (یعنی یہود اور نصاریٰ) اور اُمّیین سے بھی کہ کیا تم بھی اسی طرح اسلام لاتے ہو؟''

کیا تم بھی سرِ تسلیم خم کرتے ہو یا نہیں؟ تابع ہوتے ہو یا نہیں؟ اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کرتے ہو یا نہیں؟

﴿فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ﴾ ''پس اگر وہ بھی اسی طرح اسلام لے آئیں تو ہدایت پر ہو جائیں گے۔''

﴿وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ﴾ ''اور اگر وہ مُنہ موڑ لیں تو (اے نبی ﷺ!) آپ پر ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے۔''

آپؐ نے ہمارا پیغام ان تک پہنچا دیا' ہماری دعوت اُن تک پہنچا دی' ہماری آیات انہیں پڑھ کر سنا دیں' اب قبول کرنا یا نہ کرنا ان کا اپنا اختیار (choice) ہے۔ آپؐ پر ذمہ داری نہیں ہے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لائے۔ سورۃ البقرۃ میں ہم یہ الفاظ پڑھ آئے ہیں: ﴿وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝۱۱۹﴾ ''اور آپؐ سے سوال نہیں کیا جائے گا جہنّمیوں کے بارے میں۔''

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰﴾ ''اور اللہ اپنے بندوں کے حال کو دیکھ رہا ہے۔''

وہ اُن سے حساب کتاب کر لے گا اور ان سے نمٹ لے گا۔ آپؐ کے ذمہ جو فرض ہے آپ اُس کو ادا کرتے رہیے۔

آیات ۲۱ تا ۳۲

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ
بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝۲۱ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۲۲ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ
اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝۲۳ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا
لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝۲۴ فَكَيْفَ
اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۖ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۲۵ قُلِ

اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۚ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝

آیت ۲۱ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو اللہ کی آیات کا کفر کرتے ہیں اور انبیاءؑ کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں''

﴿وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ﴾ ''اور اُن لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں (یا قتل کرتے ہیں) جو انسانوں میں سے عدل وقسط کا حکم دیتے ہیں''

اس لیے کہ انصاف کی بات تو بالعموم کسی کو پسند نہیں ہوتی۔ ''اَلْحَقُّ مُرٌّ'' (حق بات کڑوی ہوتی ہے)۔ بہت سے مواقع پر کسی حق گو انسان کو حق گوئی کی پاداش میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ یہاں پھر عدل وقسط کا معاملہ آیا ہے۔ اللہ خود ''قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ'' ہے اور اللہ کے محبوب بندے وہی ہیں جو عدل کا حکم دیں' انصاف کا ڈنکا بجانے کی کوشش کریں۔ تو فرمایا کہ جو ایسے لوگوں کو قتل کریں.....

﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝﴾ ''تو (اے نبی ﷺ) انہیں بشارت سنا دیجیے دردناک عذاب کی۔''

لفظ ''بشارت'' یہاں طنز کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

آیت ۲۲ ﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت ہو گئے۔''

جیسے قریش کو یہ زعم تھا کہ ہم خُدّامِ کعبہ ہیں اور ہمارے پاس جو یہ لوگ حج کرنے آتے ہیں ہم ان کو کھانا کھلاتے ہیں' پانی پلاتے ہیں' ہماری ان خدمات کے عوض ہمیں بخش دیا جائے گا۔ فرمایا وہ سارے اعمال حبط ہو جائیں گے۔ اگر تو صحیح صحیح پورے دین کو اختیار کرو گے تو ٹھیک ہے' ورنہ چاہے خیرات اور بھلائی کے بڑے سے بڑے کام کیے ہوں' لوگوں کی فلاح و بہبود کے ادارے قائم کر دیے ہوں' اللہ کی نگاہ میں ان کی کوئی حیثیت نہیں۔

﴿وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''اور ان کا پھر کوئی مددگار نہیں ہوگا۔''

آیت ۲۳ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ ''کیا تم نے غور نہیں کیا ان لوگوں کی حالت پر جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا؟''

اُوْتُوْا مجہول کا صیغہ ہے اور یاد رہے کہ قرآن مجید میں جہاں مذمت کا پہلو ہوتا ہے وہاں عام طور پر مجہول کا صیغہ آتا ہے۔

﴿يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ﴾ ''اب انہیں بلایا جاتا ہے اللہ کی کتاب کی طرف کہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے''

﴿ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾﴾ ''پھر ان میں سے ایک گروہ پیٹھ پھیر لیتا ہے اعراض کرتے ہوئے۔''

یعنی کتاب کو مانتے بھی ہیں لیکن اس کے فیصلے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

آیت ۲۴ ﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ﴾ ''یہ اس وجہ سے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو جہنم کی آگ چھو ہی نہیں سکتی مگر گنتی کے چند دن۔''

یہ مضمون سورۃ البقرۃ میں بھی آ چکا ہے۔ ان کی ڈھٹائی کا اصل سبب ان کے مَن گھڑت عقائد ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم کتاب پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر عمل کیوں نہیں کر رہے؟ اس میں تو لکھا ہے کہ سود حرام ہے اور تم سود خوری پر کمربستہ ہو اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام کیوں نہیں جانتے؟ تو اس کے جواب میں وہ اپنا یہ مَن گھڑت عقیدہ بیان کرتے ہیں کہ ''ہمیں تو جہنم کی آگ چھو ہی نہیں سکتی مگر گنتی کے چند دن''۔ جب یہ عقیدہ ہے تو پھر انسان کا ہے کو دنیا کا نقصان برداشت کرے ع ''بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست''۔ پھر تو حلال سے' حرام سے' جائز سے' ناجائز سے' جیسے بھی عیشِ دنیا حاصل کیا جا سکتا ہو حاصل کرنا چاہیے۔ یہ عقیدہ درحقیقت ایمان بالآخرۃ کی نفی کر دیتا ہے۔

﴿وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ''اور انہیں دھوکے میں مبتلا کر دیا ہے ان کے دین کے بارے میں ان چیزوں نے جو یہ گھڑتے رہے ہیں۔''

اس طرح کے جو عقائد و نظریات انہوں نے گھڑ لیے ہیں ان کے باعث یہ دین کے معاملے میں گمراہی کا شکار ہو گئے ہیں۔ اللہ نے تو ایسی کوئی ضمانت نہیں دی تھی۔ تورات لاؤ' انجیل لاؤ' کہیں ایسی ضمانت نہیں ہے۔ یہ تو تمہارا مَن گھڑت عقیدہ ہے اور اسی کی وجہ سے اب تم دین کے اندر بددین یا بے دین ہو گئے ہو۔

آیت ۲۵ ﴿فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ﴾ ''تو کیا حال ہوگا جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے اُس دن جس کے بارے میں کوئی شک نہیں!''

اِس وقت تو یہ بڑھ چڑھ کر باتیں بنا رہے ہیں' زبان درازیاں کر رہے ہیں۔ لیکن جب ہم انہیں ایک ایسے دن میں جمع کریں گے جس کے آنے میں ذرا شک نہیں' تو اُس دن ان کا کیا حال ہوگا!

﴿وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ﴾ ''اور ہر جان کو پورا پورا دے دیا جائے گا جو کچھ اس نے کمائی کی ہوگی''

﴿وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''اور ان پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔''

اس کے بعد اب پھر ایک بہت عظیم دعا آ رہی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں بہت سی دعائیں ہیں۔ یہ بھی ایک عظیم دعا ہے، جس کی باقاعدہ تلقین کر کے کہا گیا ہے کہ یوں کہا کرو۔

آیت ۲۶ ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ﴾ ''کہو: اے اللہ! تمام بادشاہت کے مالک!''

کُل ملک تیرے اختیار میں ہے۔

﴿تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ﴾ ''تُو حکومت اور اختیار دیتا ہے جس کو چاہتا ہے''

﴿وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ﴾ ''اور تُو سلطنت چھین لیتا ہے جس سے چاہتا ہے''

﴿وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ﴾ ''اور تُو عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے''

﴿وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ﴾ ''اور تُو ذلیل کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے۔''

﴿بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ﴾ ''تیرے ہی ہاتھ میں سب خیر ہے۔''

اس کے دونوں معنی ہیں۔ ایک یہ کہ کُل خیر و خوبی تیرے ہاتھ میں ہے اور دوسرے یہ کہ تیرے ہاتھ میں خیر ہی خیر ہے۔ بسا اوقات انسان جسے اپنے لیے شر سمجھ بیٹھتا ہے وہ بھی اس کے لیے خیر ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۲۱۶) میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ﴾ ''اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ تم کسی شے کو پسند کرو درآنحالیکہ وہی تمہارے لیے بُری ہو۔''

﴿اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۶﴾ ''یقیناً تُو ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۲۷ ﴿تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ﴾ ''تُو رات کو لے آتا ہے دن میں پرو کر''

﴿وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ﴾ ''اور پھر دن کو نکال لاتا ہے رات میں سے پرو کر۔''

﴿وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ﴾ ''اور تُو نکالتا ہے زندہ کو مُردہ سے''

﴿وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾ ''اور تُو نکالتا ہے مُردہ کو زندہ سے۔''

اس کی بہترین مثال مرغی اور انڈا ہے۔ انڈے میں جان نہیں ہے لیکن اسی میں سے زندہ چوزہ برآمد ہوتا ہے اور مرغی سے انڈا برآمد ہوتا ہے۔

﴿وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۲۷﴾ ''اور تُو دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے حد و حساب۔''

آیت ۲۸ ﴿لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ﴾ ''اہلِ ایمان نہ بنائیں کافروں کو اپنے دوست اہلِ ایمان کو چھوڑ کر۔''

''اولیاء'' ایسے قلبی دوست ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے رازدار بھی بن جائیں اور ایک دوسرے کے پشت پناہ بھی ہوں۔ یہ تعلق کُفار کے ساتھ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کے ساتھ اچھا رویہ، ظاہری مدارات اور تہذیب و شائستگی سے بات چیت تو اور بات ہے، لیکن دلی محبت، قلبی رشتہ، جذباتی تعلق، باہمی نصرت و تعاون اور ایک دوسرے کے پشت پناہ ہونے کا رشتہ قائم کر لینے کی اجازت نہیں ہے۔ کُفار کے ساتھ اس طرح کے تعلقات اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں ہیں۔

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ﴾ ''اور جو کوئی بھی یہ حرکت کرے گا تو پھر اللہ کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں رہے گا''

اگر اللہ کے دشمنوں کے ساتھ تمہاری دوستی ہے تو ظاہر ہے پھر تمہارا اللہ کے ساتھ کوئی رشتہ و تعلق نہیں رہا ہے۔

﴿اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ﴾ ''سوائے یہ کہ تم ان سے بچنے کے لیے اپنا بچاؤ کرنا چاہو۔''

بعض اوقات ایسے حالات ہوتے ہیں کہ کھلے مقابلے کا ابھی موقع نہیں ہوتا تو آپ دشمن کو طرح دیتے ہیں اور اس طرح گویا وقت حاصل کرتے ہیں (you are buying time) تو اس دوران اگر ظاہری خاطر مدارات کا معاملہ بھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے' لیکن مستقل طور پر کفار سے قلبی محبت قائم کر لینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ قرآن کے انہی الفاظ کو ہمارے ہاں اہلِ تشیع نے تقیہ کی بنیاد بنا لیا ہے۔ لیکن انہوں نے اسے اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ وہ جھوٹ بولنا اور اپنے عقائد کو چھپا لینا بھی روا سمجھتے ہیں اور اس کے لیے دلیل یہاں سے لاتے ہیں۔ لیکن یہ ایک بالکل دوسری شکل ہے اور یہ صرف ظاہری مدارات کی حد تک ہے۔ جیسے کہ ہم سورۃ البقرۃ میں پڑھ چکے ہیں کہ اگرچہ تمہارے خلاف یہود کے دلوں میں حسد کی آگ بھری ہوئی ہے لیکن ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ (آیت ۱۰۹) ابھی ذرا درگزر کرتے رہو اور چشم پوشی سے کام لو۔ ابھی فوری طور پر ان کے ساتھ مقابلہ شروع کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس حد تک مصلحت بینی تو صحیح ہے' لیکن یہ نہیں کہ جھوٹ بولا جائے' معاذ اللہ!

﴿وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ﴾ ''اور اللہ تمہیں ڈراتا ہے اپنے آپ سے۔''

اللہ سے ڈرو۔ یعنی کسی اور سے خواہ مخواہ ڈر کر صرف خاطر مدارات کر لینا بھی صحیح نہیں ہے۔ کسی وقت مصلحت کا تقاضا ہو تو ایسا کر لو' لیکن تمہارے دل میں خوف صرف اللہ کا رہنا چاہیے۔

﴿وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾﴾ ''اور اللہ ہی کی طرف (تمہیں) لوٹ کر جانا ہے۔''

آیت ۲۹ ﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ﴾ ''کہہ دیجیے (اے نبی ﷺ!) کہ اگر تم چھپاؤ جو کچھ کہ تمہارے سینوں میں ہے یا اسے ظاہر کر دو اللہ اسے جانتا ہے۔''

تم اپنے سینوں میں مخفی باتیں ایک دوسرے سے تو چھپا سکتے ہو' اللہ تعالیٰ سے نہیں۔ سورۃ البقرۃ میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ﴾ ''اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے خواہ تم اسے ظاہر کرو خواہ چھپاؤ اللہ تم سے اس کا محاسبہ کر لے گا۔''

﴿وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور وہ جانتا ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیت ۳۰ ﴿يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ﴾ ''(اُس دن کا تصور کرو) جس دن ہر جان اپنے سامنے موجود پائے گی ہر نیکی جو اُس نے کی ہوگی''

﴿وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ﴾ ''اور ہر برائی جو اُس نے کمائی ہوگی۔''

اس کا نقشہ سورۃ الزلزال میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے: ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ

شَرًّا یَّرَہٗ ﴿۸﴾ ’’تو جس نے ایک ذرے کے ہم وزن نیکی کی ہوگی وہ اس کو (بچشمِ خود) دیکھ لے گا۔ اور جس نے ایک ذرے کے ہم وزن برائی کی ہوگی وہ اُس کو (بچشمِ خود) دیکھ لے گا۔‘‘

﴿تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَیْنَهَا وَبَیْنَهٗۤ اَمَدًۢا بَعِیْدًا ؕ﴾ ’’اور (ہر جان) یہ چاہے گی کہ کاش اُس کے اور اُس (کے نامۂ اعمال) کے درمیان ایک زمانہ دراز حائل ہوتا۔‘‘

اُس وقت ہر انسان یہ چاہے گا کہ کاش میرے اور میرے اعمال نامے کے درمیان بڑا فاصلہ آ جائے اور میری نگاہ بھی اس پر نہ پڑے۔

﴿وَیُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ﴾ ’’اور اللہ ڈرا رہا ہے تمہیں اپنے آپ سے۔‘‘

یعنی تقویٰ اختیار کرنا ہے تو اُس کا کرو ڈرنا ہے تو اُس سے ڈرو‘ خوف کھانا ہے تو اس سے کھاؤ!

﴿وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾﴾ ’’اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں بہت شفیق ہے۔‘‘

یہ تنبیہات (warnings) وہ تمہیں بار بار اسی لیے دے رہا ہے تاکہ تمہاری عاقبت خراب نہ ہو۔

آیت ۳۱ ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو‘‘

یہ آیت بہت معروف ہے اور مسلمانوں کو بہت پسند بھی ہے۔ ہمارے ہاں مواعظ و خطابات میں یہ بہت کثرت سے بیان ہوتی ہے۔ فرمایا کہ اے نبی ﷺ اہلِ ایمان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو‘ میرا اتباع کرو! اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ:

﴿یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ ’’اللہ تم سے محبت کرے گا‘‘

﴿وَیَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ﴾ ’’اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۱﴾﴾ ’’اور اللہ بخشنے والا‘ رحم فرمانے والا ہے۔‘‘

آیت ۳۲ ﴿قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ﴾ ’’کہہ دیجیے اطاعت کرو اللہ کی اور رسولؐ کی۔‘‘

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۲﴾﴾ ’’پھر اگر وہ پیٹھ موڑ لیں تو (یاد رکھیں کہ) اللہ کو ایسے کافر پسند نہیں ہیں۔‘‘

یہ دو آیتیں اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ ان میں رسول اللہ ﷺ کے لیے دو الفاظ آئے ہیں ’’اطاعت‘‘ اور ’’اتباع‘‘۔ اطاعت اگر نہیں ہے تو یہ کفر ہے۔ چنانچہ اطاعت تو لازم ہے اور وہ بھی دلی آمادگی سے‘ مارے باندھے کی اطاعت نہیں۔ لیکن اطاعت کس چیز میں ہوتی ہے؟ جو حکم دیا گیا ہے کہ یہ کرو وہ آپ کو کرنا ہے۔ اتباع اس سے بلند تر شے ہے۔ انسان خود تلاش کرے کہ آنحضور ﷺ کے اعمال کیا تھے اور ان پر عمل پیرا ہو جائے‘ خواہ آپ ﷺ نے ان کا حکم نہ دیا ہو۔ گویا اتباع کا دائرہ اطاعت سے وسیع تر ہے۔ انسان کو جس کسی سے محبت ہوتی ہے وہ اُس سے ہر طرح سے ایک مناسبت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے لباس جیسا لباس پہننا پسند کرتا ہے‘ جو چیزیں اس کو کھانے میں پسند ہیں وہی چیزیں خود بھی کھانا پسند کرتا ہے۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا حکم نہیں دیا گیا لیکن ان کا التزام پسندیدہ ہے۔ ایک صحابیؓ کا واقعہ آتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر

ہوئے تو انہوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے کُرتے کے بٹن نہیں لگے ہوئے تھے اور آپؐ کا گریبان کھلا تھا۔ اس کے بعد ان صحابیؓ نے پھر ساری عمر اپنے کرتے کے بٹن نہیں لگائے۔ حالانکہ حضور ﷺ نے تو انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ یہ صحابیؓ کہیں دور دراز سے آئے ہوں گے اور ایک ہی مرتبہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے ہوں گے' لیکن انہوں نے اُس وقت جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو جس شان میں دیکھا اس کو پھر اپنے اوپر لازم کر لیا۔

اتباع کے ضمن میں یہ بات بھی لائقِ توجہ ہے کہ اگرچہ دین کے کچھ تقاضے ایسے ہیں کہ انہیں جس درجے میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے پورا فرمایا اس درجے میں پورا کرنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے' لیکن پھر بھی اس کی کوشش کرتے رہنا اتباع کا تقاضا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے کوئی مکان نہیں بنایا' کوئی جائیداد نہیں بنائی' جیسے ہی وحی کا آغاز ہوا' اس کے بعد آپؐ نے کوئی دُنیوی کام نہیں کیا' کوئی تجارت نہیں کی۔ آپ ﷺ نے اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ اور اپنی توانائی کی ایک ایک رمق اللہ کے دین کی دعوت اور اس کی اقامت میں لگا دی۔ سب کے لیے تو اس مقام تک پہنچنا یقیناً مشکل ہے' لیکن بہرحال بندۂ مؤمن کا آئیڈیل یہ رہے اور وہ اسی کی طرف چلنے کی کوشش کرتا رہے' اپنا زیادہ سے زیادہ وقت اور زیادہ سے زیادہ وسائل فارغ کرے اور اس کام کے اندر لگائے تو ''اتباع'' کا کم سے کم تقاضا پورا ہوگا۔ البتہ جہاں تک ''اطاعت'' کا تعلق ہے اس میں کوتاہی قابلِ قبول نہیں۔ جہاں حکم دے دیا گیا کہ یہ حلال ہے' یہ حرام ہے' یہ فرض ہے' یہ واجب ہے' وہاں حکم عدولی کی گنجائش نہیں۔ اگر اطاعت ہی سے انکار ہے تو اسے قرآن کفر قرار دے رہا ہے۔

اتباع کا معاملہ یہ ہے کہ نبی ﷺ کا اتباع کرنے والا اللہ کا محبوب بن جاتا ہے۔ یہاں ارشاد فرمایا کہ اے نبی ﷺ! اہلِ ایمان سے کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میرا اتباع کرو' میری پیروی کرو۔ دیکھو' میرے شب و روز کیا ہیں؟ میری توانائیاں کن کاموں پر لگ رہی ہیں؟ دنیا کے اندر میری دلچسپیاں کیا ہیں؟ ان معاملات میں تم میری پیروی کرو۔ اس کے نتیجے میں تم اللہ تعالیٰ کے ''محب'' سے بڑھ کر ''محبوب'' بن جاؤ گے اور اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ وہ یقیناً غفور اور رحیم ہے۔ باقی اطاعت تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بہرصورت کرنی ہے۔ اگر یہ اس اطاعت سے بھی منہ موڑیں تو اللہ تعالیٰ کو ایسے کافر پسند نہیں ہیں۔ کیونکہ اطاعتِ رسول ﷺ کا انکار تو کفر ہو گیا۔

یہاں سورۂ آلِ عمران کے نصفِ اوّل کا ثُلثِ اوّل مکمل ہو گیا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اس سورۂ مبارکہ کی پہلی ۳۲ آیات تمہیدی اور عمومی نوعیت کی ہیں۔ ان میں دین کے بڑے گہرے اصول بیان ہوئے ہیں' نہایت جامع دعائیں تلقین کی گئی ہیں اور محکمات اور متشابہات کا فرق واضح کیا گیا ہے۔

آیات ۳۳ تا ۴۱

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ
بَعْضٍ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ
مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۳۵﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَاۤ
اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّيْۤ

أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا
حَسَنًا ۙ وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ
يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾
هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ
الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى
مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ
لِيْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ
اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا
وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع ۱۴

سورۂ آل عمران کے نصفِ اوّل کا دوسرا حصہ ۱۳۱ آیات پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں خطاب براہِ راست نصاریٰ سے ہے اور انہیں بتایا گیا ہے کہ یہ جو تم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو معبود بنا لیا ہے اور تثلیث (Trinity) کا عقیدہ گھڑ لیا ہے یہ سب باطل ہے۔ عیسائیوں کے ہاں دو طرح کی تثلیث رائج رہی ہے —— i) خدا، مریم اور عیسیٰؑ —— اور ii) خدا، روح القدس اور عیسیٰؑ۔ یہاں پر واضح کر دیا گیا کہ یہ جو تثلیثیں تم نے ایجاد کر لی ہیں ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے، یہ تمہاری کج روی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بہت برگزیدہ پیغمبر تھے۔ ہاں اُن کی ولادت معجزانہ طریقے پر ہوئی ہے۔ لیکن ان سے متصلاً قبل حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت بھی تو معجزانہ ہوئی تھی۔ اور پھر حضرت آدم علیہ السلام کی ولادت بھی تو بہت بڑا معجزہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو معجزانہ طور پر پیدا کیا اور ان سے نسلِ انسانی کا آغاز ہوا۔ چنانچہ اگر کسی کی معجزانہ ولادت الوہیت کی دلیل ہے تو کیا حضرت آدمؑ اور حضرت یحییٰؑ بھی الٰہ ہیں؟ تو یہ ساری بحث اسی موضوع پر ہو رہی ہے۔

آیت ۳۳ ﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۳۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ نے چُن لیا آدمؑ کو، نوحؑ کو، آلِ ابراہیمؑ کو اور آلِ عمران کو تمام جہان والوں پر۔''

اِصطفاء کے معنی منتخب کرنے یا چُن لینے (selection) کے ہیں۔ زیر مطالعہ آیت سے متبادر ہوتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا بھی ''اِصطفاء'' ہوا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے ایک دلیل موجود ہے جو تخلیقِ آدم کے ضمن میں یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ پہلے ایک نوع (species) وجود میں آئی تھی اور اللہ نے اس نوع کے ایک فرد کو چُن کر اس میں اپنی روح پھونکی تو وہ آدمؑ بن گئے۔ چنانچہ وہ بھی چنیدہ (selected) تھے۔ اِصطفاء کے ایک عام معنی بھی ہوتے ہیں، یعنی پسند کر لینا۔ ان معنوں میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اور نوحؑ کو اور ابراہیمؑ کے خاندان کو اور عمران کے خاندان کو تمام جہان والوں پر ترجیح دے کر پسند کر لیا۔ تاریخ بنی اسرائیل میں ''عمران'' دو عظیم شخصیتوں کے نام ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد کا نام بھی عمران تھا اور حضرت مریم سلامٌ علیہا کے والد یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا کا نام بھی عمران تھا۔ یہاں پر غالباً حضرت موسیٰؑ کے والد مراد ہیں۔ لیکن آگے چونکہ حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ آ رہا ہے، لہٰذا عین ممکن ہے کہ یہاں پر حضرت مریمؑ کے والد کی طرف اشارہ ہو۔

آیت ﴿ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ ۗ﴾ ''یہ ایک دوسرے کی اولاد سے ہیں۔''

حضرت نوح علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں' حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت نوحؑ کی اولاد سے ہیں' اور پھر بنی اسماعیل' بنی اسرائیل اور آلِ عمران حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٣٤﴾﴾ ''اور اللہ سننے والا' جاننے والا ہے۔''

آیت ﴿إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ إِنِّيْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّرًا﴾ ''جب کہا عمران کی بیوی نے: اے میرے ربّ! جو بچہ میرے پیٹ میں ہے اس کو میں تیری ہی نذر کرتی ہوں' ہر ذمہ داری سے چھڑا کر''

عمران کی بیوی یعنی حضرت مریمؑ کی والدہ بہت ہی نیک' متقی اور زاہدہ خاتون تھیں۔ جب ان کو حمل ہوا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور یہ عرض کیا کہ پروردگار! جو بچہ میرے پیٹ میں ہے' جسے تو پیدا فرما رہا ہے' اسے میں تیری ہی نذر کرتی ہوں۔ ہم اس پر دُنیوی ذمہ داریوں کا کوئی بوجھ نہیں ڈالیں گے اور اس کو خالصتاً ہیکل کی خدمت کے لیے' دین کی خدمت کے لیے' تورات کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے۔ ہم اپنا بھی کوئی بوجھ اس پر نہیں ڈالیں گے۔ انہیں یہ توقع تھی کہ اللہ تعالیٰ بیٹا عطا فرمائے گا۔ مُحَرَّرًا کے معنی ہیں ''اسے آزاد کرتے ہوئے''۔ یعنی ہماری طرف سے اس پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی اور اسے ہم تیرے لیے خالص کر دیں گے۔

﴿فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ ۚ﴾ ''پس تُو اس کو میری طرف سے قبول فرما!''

اے اللہ تو میری اس نذر کو شرفِ قبول عطا فرما۔

﴿إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٥﴾﴾ ''یقیناً تُو سب کچھ سننے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

آیت ﴿فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّيْ وَضَعْتُهَآ أُنْثٰى ۭ﴾ ''تو جب اسے وضع حمل ہوا تو اس نے کہا: اے میرے ربّ! یہ تو میں ایک لڑکی جَن گئی ہوں۔''

یعنی میرے ہاں تو بیٹی پیدا ہو گئی ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ بیٹا پیدا ہوگا تو میں اس کو وقف کر دوں گی۔ اُس وقت تک ہیکل کے خادموں میں کسی لڑکی کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔

﴿وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ۭ﴾ ''اور اللہ بہتر جانتا تھا کہ اُس نے کیا جنا ہے۔''

اسے کیا پتا تھا کہ اس نے کیسی بیٹی جنی ہے!

﴿وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثٰى ۚ﴾ ''اور نہیں ہوگا کوئی بیٹا اس بیٹی جیسا!''

اس جملے کے دونوں معنی کیے گئے۔ اوّلاً: اگر یہ قول مانا جائے حضرت مریمؑ کی والدہ کا تو ترجمہ یوں ہوگا: ''اور لڑکا لڑکی کی مانند تو نہیں ہوتا''۔ اگر لڑکا ہوتا تو میں اُسے خدمت کے لیے وقف کر دیتی' یہ تو لڑکی ہو گئی ہے۔ ثانیاً: اگر اس قول کو اللہ کی طرف سے مانا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ کوئی بیٹا ایسا ہو ہی نہیں سکتا جیسی بیٹی تو نے جنم دی ہے۔ اور اب مریمؑ کی والدہ کا کلام شروع ہوا:

﴿وَإِنِّيْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ﴾ ''اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے''

﴿وَإِنِّيْ أُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿٣٦﴾﴾ ''اور (اے پروردگار!) میں اس کو اور اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتی ہوں شیطانِ مردود (کے حملوں) سے۔''

اے اللہ! تو اس لڑکی (مریمؑ) کو بھی اور اس کی آنے والی اولاد کو بھی شیطان کے شر سے اپنی حفاظت میں رکھیو!

آیت ۳۷ ﴿فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ﴾ ''تو قبول فرمالیا اُس کو (یعنی حضرت مریمؑ کو) اس کے ربّ نے بڑی ہی عمدگی کے ساتھ''

شرفِ قبول عطا فرمایا بڑے ہی خوبصورت انداز میں۔

﴿وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا﴾ ''اور اُس کو پروان چڑھایا بہت اعلیٰ طریقے پر''

﴿وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا﴾ ''اور اس کو زکریّا کی کفالت میں دے دیا۔''

حضرت زکریا علیہ السلام ان کے سرپرست مقرر ہوئے اور انہوں نے حضرت مریمؑ کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری اٹھائی۔ حضرت زکریّا حضرت مریمؑ کے خالو تھے۔ آپؑ وقت کے نبی تھے اور اسرائیلی اصطلاح میں ہیکلِ سلیمانی کے کاہنِ اعظم (Chief Priest) بھی تھے۔

﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ﴾ ''جب کبھی بھی زکریّا ان کے پاس جاتے تھے محراب میں''

﴿وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا﴾ ''تو ان کے پاس رزق پاتے۔''

''محراب'' سے مراد وہ گوشہ یا حجرہ ہے جو حضرت مریمؑ کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ حضرت زکریّا اُن کی دیکھ بھال کے لیے اکثر ان کے حجرے میں جاتے تھے۔ آپؑ جب بھی حجرے میں جاتے تو دیکھتے کہ حضرت مریمؑ کے پاس کھانے پینے کی چیزیں اور بغیر موسم کے پھل موجود ہوتے۔ بعض لوگوں کی رائے اس حوالے سے یہ بھی ہے کہ یہاں رزق سے مراد مادی کھانا نہیں' بلکہ علم و حکمت ہے کہ جب حضرت زکریّا ان سے بات کرتے تھے تو حیران رہ جاتے تھے کہ اس لڑکی کو اس قدر حکمت اور اتنی معرفت کہاں سے حاصل ہوگئی ہے؟

﴿قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا﴾ ''وہ پوچھتے اے مریمؑ! تمہیں یہ چیزیں کہاں سے ملتی ہیں؟''

یہ انواع و اقسام کے کھانے اور بے موسمی پھل تمہارے پاس کہاں سے آ جاتے ہیں؟ یا یہ علم و حکمت اور معرفت کی باتیں تمہیں کہاں سے معلوم ہوتی ہیں؟

﴿قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ ''وہ کہتی تھیں کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔''

یہ سب اُس کا فضل اور اس کا کرم ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۳۷﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بے حساب عطا کرتا ہے۔''

آیت ۳۸ ﴿هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ﴾ ''(حضرت زکریّا کو یہ مشاہدہ ہوا تو انہوں نے) اُسی وقت اپنے پروردگار سے ایک دعا کی۔''

﴿قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ ''انہوں نے کہا: اے میرے ربّ! تو مجھے بھی اپنی جناب سے کوئی پاکیزہ اولاد عطا فرما دے۔''

حضرت زکریا علیہ السلام بہت بوڑھے ہو چکے تھے' ان کی اہلیہ بھی بہت بوڑھی ہو چکی تھیں۔ وہ ساری عمر بانجھ رہی تھیں اور ان کے ہاں

کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ یہ مضامین سورۂ مریم میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ مکی دور میں جبکہ مسلمان ہجرتِ حبشہ کے لیے گئے تھے تو وہاں جا کر نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ بن ابی طالب نے سورۂ مریم کی آیات پڑھ کر سنائی تھیں۔ حضرت زکریاؑ ساری عمر بے اولاد رہے تھے لیکن حضرت مریمؑ کے پاس اللہ تعالیٰ کی قدرت کا مشاہدہ کرنے کے بعد اولاد کی جو خواہش ان کے اندر دبی ہوئی تھی وہ چنگاری دفعۃً بھڑک اٹھی۔ انہوں نے عرض کیا کہ اے اللہ! تو اس بچی کو یہ سب کچھ دے سکتا ہے تو اپنی قدرت سے مجھے بھی پاکیزہ اولاد عطا فرما دے!

﴿اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾﴾ ''یقیناً تُو دعا کا سننے والا ہے۔''

آیت ۳۹ ﴿فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ﴾ ''تو فرشتوں نے انہیں ندا دی جبکہ وہ اپنے حُجرے میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے''

﴿اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى﴾ ''کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بشارت دیتا ہے یحییٰؑ کی''

﴿مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''جو تصدیق کرے گا اللہ کی طرف سے ایک کلمہ کی''

اس سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جن کے لیے آگے آیت ۴۵ میں ''بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ'' کا لفظ آ رہا ہے۔

﴿وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾﴾ ''اور سردار ہوگا اور تجرد کی زندگی گزارے گا اور نبی ہوگا صالحین میں سے۔''

یہاں نوٹ کر لیجیے کہ آخری لفظ جو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی مدح کے لیے آیا ہے وہ ''نبی'' ہے۔ اس بارے میں مزید وضاحت آگے آیت ۴۹ کے مطالعہ کے دوران آئے گی۔

آیت ۴۰ ﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ﴾ ''(زکریاؑ نے) کہا: پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے ہو جائے گا؟''

ابھی خود دعا کر رہے تھے لیکن اللہ کی طرف سے بیٹے کی بشارت ملنے پر غالباً اس کی توثیق اور re-assurance چاہ رہے ہیں کہ میرے ہاں کیسے بیٹا ہو جائے گا؟

﴿وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ﴾ ''جبکہ میں انتہائی بوڑھا ہو چکا ہوں''

﴿وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ﴾ ''اور میری بیوی بانجھ رہی ہے۔''

﴿قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾﴾ ''(اللہ نے) فرمایا: اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

اسے اسباب کی احتیاج نہیں ہے۔ اسباب اس کے محتاج ہیں اللہ اسباب کا محتاج نہیں ہے۔

آیت ۴۱ ﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ﴾ ''انہوں نے عرض کیا: پروردگار! میرے (اطمینان کے) لیے کوئی نشانی مقرر کر دیں۔''

مجھے معلوم ہو جائے کہ واقعی ایسا ہونا ہے اور یہ کلام جو میں سن رہا ہوں واقعتاً تیری طرف سے ہے۔

﴿قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ﴾ ''(اللہ نے) فرمایا: تمہارے لیے نشانی یہ ہے کہ اب تم تین دن تک لوگوں سے گفتگو نہیں کر سکو گے سوائے اشارے کنائے کے۔''

یعنی ان کی قوتِ گویائی سلب ہو گئی اور اب وہ تین دن تک کسی سے بات نہیں کر سکتے تھے۔

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا﴾ ''اور (اپنے دل میں) اپنے رب کو کثرت سے یاد کرتے رہو''
﴿وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور تسبیح کیا کرو شام کے وقت بھی اور صبح کے وقت بھی۔''

آیات ۴۲ تا ۵۴

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾
يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ
اِلَيْكَ ۭ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ
يَخْتَصِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى
ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّ
مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۴۶﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ
يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۴۷﴾ وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ
وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿۴۸﴾ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ
اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْــَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ
الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ
بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ
التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۵۰﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۵۱﴾ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى
مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ
وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾
وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ ع ۵

حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے اس قصے سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کو شدید ضعیفی کی عمر میں ایک بانجھ اور بوڑھی عورت سے حضرت یحییٰؑ جیسا بیٹا دے دیا۔ تو کیا یہ عام قانون کے مطابق ہے؟ ظاہر ہے یہ بھی تو معجزہ تھا۔ اسی طرح اس سے ذرا بڑھ کر ایک معجزہ حضرت مسیحؑ کی پیدائش ہے کہ انہیں بغیر باپ کے پیدا فرما دیا۔ اب اس کا ذکر آ رہا ہے۔

آیت ۴۲ ﴿وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ کہا فرشتوں نے اے مریمؑ''
﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾﴾ ''یقیناً اللہ نے تمہیں چُن لیا ہے اور تمہیں خوب پاک کر دیا ہے اور تمہیں تمام جہان کی خواتین پر ترجیح دی ہے۔''

آیت ﴿یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّكِ﴾ ''اے مریمؑ! اپنے ربّ کی فرماں برداری کرتی رہو''

﴿وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ۝۴۳﴾ ''اور سجدہ کرتی رہو اور رکوع کرتی رہو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔''

یعنی نمازِ باجماعت کے اندر شریک ہو جایا کرو۔

آیت ﴿ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ؕ﴾ ''یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو (اے محمد ﷺ!) ہم آپ کو وحی کر رہے ہیں۔''

﴿وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ ۪﴾ ''اور آپ تو ان کے پاس موجود نہیں تھے جبکہ وہ اپنے قلم پھینک رہے تھے (یہ طے کرنے کے لیے) کہ ان میں سے کون مریم کا کفیل ہوگا۔''

جب حضرت مریم سلام علیہا کو ان کی والدہ نے ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کیا تو ہیکل کے کاہنوں میں سے ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ یہ بچی میری تحویل میں ہو' اس کی تربیت اور پرورش کی سعادت مجھے حاصل ہو جائے جسے اللہ کے نام پر وقف کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے وہ اپنے قلم پھینک کر کسی طرح قرعہ اندازی کر رہے تھے۔ اس میں اللہ نے حضرت زکریاؑ کا نام نکال دیا۔ یہاں اثنائے کلام میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ تو اُس وقت وہاں نہیں تھے جب وہ قرعہ اندازی سے یہ معاملہ طے کر رہے تھے۔

﴿وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ ۝۴۴﴾ ''اور نہ آپ اُس وقت ان کے پاس موجود تھے جبکہ وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔''

آیت ﴿اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ ۖ﴾ ''یاد کرو جبکہ فرشتوں نے کہا اے مریمؑ! یقیناً اللہ تعالیٰ تمہیں بشارت دے رہا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی''

تمہیں اللہ تعالیٰ ایک ایسی ہستی کی ولادت کی خوشخبری دے رہا ہے جو اُس کی جانب سے ایک خاص کلمہ ہوگا۔

﴿اسْمُهُ الْمَسِیْحُ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ﴾ ''اس کا نام ہوگا المسیح' عیسیٰ' مریم کا بیٹا''

﴿وَجِیْهًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ ۝۴۵﴾ ''مرتبے والا ہوگا دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور اللہ کے بہت ہی مقرّبین بارگاہ میں سے ہوگا۔''

آیت ﴿وَیُكَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَهْدِ وَكَهْلًا﴾ ''اور وہ لوگوں سے گفتگو کرے گا گود میں بھی اور پوری عمر کا ہو کر بھی''

کہولت چالیس برس کے بعد آتی ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کا رفعِ سماوی ۳۳ برس کی عمر میں ہو گیا تھا۔ گویا اس آیت کا تقاضا ابھی پورا نہیں ہوا ہے۔ اور اس سے اندازہ کر لیجیے کہ یہ بات کہنے کی ضرورت کیا تھی؟ پوری عمر کو پہنچ کر تو سبھی بولتے ہیں' یہاں اس کا اشارہ کیوں کیا گیا؟ اس لیے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ حضرت مسیحؑ پر موت ابھی وارد نہیں ہوئی' بلکہ وہ واپس آئیں گے' دنیا میں دوبارہ اتریں گے' پھر ان کی کہولت کی عمر بھی ہوگی۔ وہ شادی بھی کریں گے' ان کی اولاد بھی ہوگی اور ان کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو پوری دنیا میں قائم کرے گا۔

﴿وَّمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۴۶﴾ ''اور وہ (ہمارے) نیکوکار بندوں میں سے ہوگا۔''

آیت ۴۷ ﴿قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ؕ﴾ ''(حضرت مریمؑ نے یہ بات سنی تو تعجب سے) بولی: اے اللہ! میرے اولاد کیسے ہو جائے گی جبکہ مجھے تو کسی مرد نے ہاتھ تک نہیں لگایا!''

﴿قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ﴾ ''فرمایا: اسی طرح اللہ تعالیٰ تخلیق فرماتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔''

وہ اپنے بنائے ہوئے قوانینِ فطرت کا پابند نہیں ہے۔ اگرچہ عام ولادت اسی طرح ہوتی ہے کہ اس میں باپ کا بھی حصہ ہوتا ہے اور ماں کا بھی' لیکن اللہ تعالیٰ ان اسباب اور وسائل و ذرائع کا محتاج نہیں ہے' وہ جیسے چاہے پیدا کرتا ہے۔

﴿اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۴۷﴾ ''وہ تو جب کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔''

آیت ۴۸ ﴿وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝۴۸﴾ ''اور اللہ تعالیٰ اس کو سکھائے گا کتاب اور حکمت بھی اور تورات اور انجیل بھی۔''

یہاں پر چار چیزوں کا ذکر آیا ہے جن کی اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیحؑ کو تعلیم دی: کتاب اور حکمت اور تورات اور انجیل۔ ان چار چیزوں کے مابین جو تین ''و'' آئے ہیں ان میں سے دو واوِ عطف ہیں' جبکہ درمیانی ''و'' واوِ تفسیر ہے۔ اس طرح آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ ''اللہ ان کو سکھائے گا کتاب اور حکمت یعنی تورات اور انجیل''۔ اس لیے کہ تورات میں صرف احکام تھے' حکمت نہیں تھی اور انجیل میں صرف حکمت ہے' احکام نہیں ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کو سمجھ لینے سے یہ گتھی حل ہوتی ہے اور اسے سمجھے بغیر لوگوں کے ذہنوں میں اُلجھنیں رہتی ہیں۔

آیت ۴۹ ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ﴾ ''اور اُس کو رسول بنا کر بھیجے گا بنی اسرائیل کی طرف''

اب یہ جو دو بیک وقت آنے والی (contemporary) اصطلاحات ہیں ان کو نوٹ کر لیجیے۔ حضرت یحییٰؑ کے بارے میں تمام توصیفی کلمات کے بعد آخری بات یہ فرمائی: ﴿نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۳۹﴾ ''نبی ہوں گے صالحین میں سے''۔ جبکہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں فرمایا: ﴿وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۙ﴾ یعنی بنی اسرائیل کی طرف رسول بن کر آئیں گے۔ نبی اور رسول میں یہ فرق نوٹ کر لیجیے کہ حضرت یحییٰؑ صرف نبی تھے اس لیے وہ قتل بھی کر دیے گئے' جبکہ حضرت عیسیٰؑ رسول تھے اور رسول قتل نہیں ہو سکتے' اس لیے انہیں زندہ آسمان پر اٹھا لیا گیا۔ یہ بہت اہم مضمون ہے۔ مطالعۂ قرآن حکیم کے دوران اس کے اور بھی حوالے آئیں گے۔

﴿اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ﴾ ''(چنانچہ حضرت مسیحؑ نے بنی اسرائیل کو دعوت دی) کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں''

ابھی تک گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت مریمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ساری خوشخبریاں دی گئیں۔ اب یوں سمجھئے کہ قصہ مختصراً ان کی ولادت ہوئی' وہ پلے بڑھے' یہ ساری تاریخ بیچ میں سے حذف کر کے نقشہ کھینچا جا رہا ہے کہ اب حضرت مسیحؑ نے اپنی دعوت کا آغاز کر دیا۔ آپؑ نے بنی اسرائیل سے کہا کہ میں تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔

﴿اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ﴾ ''کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی مانند صورت بناتا ہوں''

﴿فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''پھر میں اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ بن جاتا ہے اڑتا ہوا پرندہ اللہ

کے حکم سے۔''

یہاں آپ نوٹ کرتے جایئے کہ ہر معجزے کے ذکر کے بعد ''بِاِذْنِ اللّٰہِ'' فرمایا گیا ہے۔ یعنی یہ میرا دعویٰ نہیں ہے' اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ جو کچھ ہے اللہ کے حکم سے ہے۔

﴿وَاُبْرِئُ الْاَکْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اور میں شفا دے دیتا ہوں مادرزاد اندھے کو بھی اور کوڑھی کو بھی' اور میں مُردے کو زندہ کر دیتا ہوں اللہ کے حکم سے۔''

﴿وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ؕ﴾ ''اور میں تمہیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔''

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۴۹﴾﴾ ''یقیناً اُن تمام چیزوں میں تمہارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔''

حضرت مسیحؑ نے اپنی رسالت کی صداقت اور دلیل کے طور پر یہ تمام معجزات پیش فرمائے۔

آیت ۵۰ ﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ﴾ ''اور میں تصدیق کرتے ہوئے آیا ہوں اُس کی جو میرے سامنے موجود ہے تورات میں سے''

﴿وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِیْ حُرِّمَ عَلَیْكُمْ﴾ ''اور (اس لیے آیا ہوں) تاکہ میں حلال ٹھہرا دوں تم پر ان میں سے بعض چیزیں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں۔''

یہ اصل میں ''سبت'' کے حکم کے بارے میں اشارہ ہے۔ جیسے ہمارے ہاں بھی بعض مذہبی مزاج کے لوگوں میں بڑی سختی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دین کے احکام میں غلو کرتے چلے جاتے ہیں' اسی طرح سبت کے حکم میں یہودیوں نے اس حد تک غلو کر لیا تھا کہ اس روز کسی مریض کے لیے دعا کرنا کہ اللہ اسے شفا دے دے' یہ بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ بھی دنیا کا کام ہے۔ چنانچہ وہ اس معاملے میں ایک انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ حضرت مسیحؑ نے آ کر اس کی وضاحت کی کہ اس طرح کی چیزیں سبت کے تقاضوں میں شامل نہیں ہیں۔

﴿وَجِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۫﴾ ''اور میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں نشانی تمہارے رب کی طرف سے۔''

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ﴿۵۰﴾﴾ ''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔''

آیت ۵۱ ﴿اِنَّ اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ﴾ ''یقیناً اللہ ہی میرا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی ربّ ہے' پس اُسی کی بندگی کرو۔''

﴿هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ﴿۵۱﴾﴾ ''یہی سیدھا راستہ ہے۔''

یہی الفاظ سورۂ مریم (آیت ۳۶) میں بھی وارد ہوئے ہیں۔

آیت ۵۲ ﴿فَلَمَّاۤ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْهُمُ الْكُفْرَ﴾ ''پس جب عیسیٰؑ نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا''

﴿قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ ؕ﴾ ''تو انہوں نے پکار لگائی کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟''

یہاں پھر درمیانی عرصے کا ذکر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کو دعوت دیتے ہوئے حضرت مسیحؑ کو کئی سال بیت چکے تھے۔ اس

دعوت سے جب علماءِ یہود کی مسندوں کو خطرہ لاحق ہو گیا اور ان کی چودھراہٹیں خطرے میں پڑ گئیں تو انہوں نے حضرت مسیحؑ کی مخالفت شروع کر دی۔ اُس وقت تک یہودیوں پر ان کے علماء کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ جب آپؑ نے ان کی طرف سے کفر کی شدت کو محسوس کیا کہ اب یہ ضد اور مخالفت پر تُل گئے ہیں۔ تو آپؑ نے ایک پکار لگائی' ایک ندا دی' ایک دعوتِ عام دی کہ کون ہیں جو اللہ کی راہ میں میرے مددگار ہیں؟ یعنی اب جو کشاکش ہونے والی ہے' جو تصادم ہونے والا ہے اس میں ایک ''حزبُ اللہ'' بنے گی اور ایک ''حزبُ الشیطان'' ہو گی۔ اب کون ہے جو میرا مددگار ہو اللہ کی راہ میں اس جدّوجُہد اور کشاکش میں؟ واضح رہے کہ دین کا کام کرنے کے لیے یہی اصل اساس ہے۔ اسی بنیاد پر کوئی شخص اٹھے کہ میں دین کا کام کرنا چاہتا ہوں' کون ہے کہ جو میرا ساتھ دے؟ یہ جماعت سازی کا ایک بالکل طبعی طریقہ ہوتا ہے۔ ایک داعی اٹھتا ہے اور اُس داعی پر اعتماد کرنے والے' اُس سے اتفاق کرنے والے لوگ اس کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ ذاتی اعتبار سے اُس کے ساتھی نہیں ہوتے' اس کی حکومت اور سرداری قائم کرنے کے لیے نہیں' بلکہ اللہ کی حکومت قائم کرنے کے لیے اور اللہ تعالیٰ کے دین کے غلبہ کے لیے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔

﴿قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ﴾ ''کہا حواریوں نے کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار!''

''حواری'' کے اصل معنی دھوبی کے ہیں جو کپڑے کو دھو کر صاف کر دیتا ہے۔ یہ لفظ پھر آگے بڑھ کر اپنے اخلاق اور کردار کو صاف کرنے والوں کے لیے استعمال ہونے لگا۔ حضرت مسیحؑ کی تبلیغ زیادہ تر گلیلی جھیل کے کناروں پر ہوتی تھی' جو سمندر کی طرح بہت بڑی جھیل ہے۔ آپؑ کبھی وہاں کپڑے دھونے والے دھوبیوں میں تبلیغ کرتے تھے اور کبھی مچھلیاں پکڑنے والے مچھیروں کو دعوت دیتے تھے۔ آپؑ ان سے فرمایا کرتے تھے کہ اے مچھلیوں کا شکار کرنے والو! آؤ' میں تمہیں انسانوں کا شکار کرنا سکھاؤں''۔ آپؑ نے دھوبیوں میں تبلیغ کی تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا کہ ہم آپ کی جدّوجُہد میں اللہ کے مددگار بننے کو تیار ہیں۔ یہ آپؑ کے اوّلین ساتھی تھے جو ''حواری'' کہلاتے تھے۔ اس طرح حواری کا لفظ ساتھی کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔

﴿اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ﴾ ''ہم ایمان لائے اللہ پر۔''

﴿وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝۵۲﴾ ''اور آپؑ بھی گواہ رہیے گا کہ ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں''۔

آیت ۵۳ ﴿رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ﴾ ''اے ربّ ہمارے! ہم ایمان لے آئے اُس پر جو تُو نے نازل فرمایا''

﴿وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ﴾ ''اور ہم اتباع کر رہے ہیں تیرے رسول کا''

﴿فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۵۳﴾ ''پس تُو ہمارا نام گواہوں میں لکھ لے۔''

یہی لفظ ''گواہ'' بعد میں عیسائیوں کے ایک خاص فرقے (Jehova's Witnesses) نے اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ لفظ یہوہ (Jehova) عبرانی میں خدا کے لیے آتا ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنے آپ کو ''خدا کے گواہ'' کہتے ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمّتِ وَسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو''۔ تو یہ لفظ ''شاہد'' (گواہ) قدیم ہے اور اسلامی حکمت اور اسلام کی مصطلحات میں اس کی ایک حیثیت ہے۔

آیت ۵۴ ﴿وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ﴾ ''اب انہوں نے بھی چالیں چلیں اور اللہ نے بھی چال چلی۔''

یہود کے علماء اور فریسی حضرت مسیحؑ کے خلاف مختلف چالیں چل رہے تھے کہ کسی طرح یہ قانون کی گرفت میں آجائیں اور ان کا

کام تمام کر دیا جائے۔ ان لوگوں نے آنجنابؑ کو مرتد اور واجب القتل قرار دے دیا تھا' لیکن ملک پر سیاسی اقتدار چونکہ رومیوں کا تھا لہٰذا رومی گورنر کی توثیق (sanction) کے بغیر کسی کو سزائے موت نہیں دی جا سکتی تھی۔ ملک کا بادشاہ اگرچہ ایک یہودی تھا لیکن اس کی حیثیت کٹھ پتلی بادشاہ کی تھی' جیسے انگریزی حکومت کے تحت مصر کے شاہ فاروق ہوتے تھے۔ یہود کی مذہبی عدالتیں موجود تھیں جہاں ان کے علماء' مفتی اور فریسی بیٹھ کر فیصلے کرتے تھے' اور اگر وہ سزائے موت کا فیصلہ دے دیتے تھے تو اس فیصلے کی تنفیذ (execution) رومی گورنر کے ذریعے ہوتی تھی۔ اس صورت حال میں علماء یہود کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے' اس لیے وہ حضرت مسیحؑ کو رومی قانون کی زد میں لانے کے لیے اپنی سی چالیں چل رہے تھے۔ وہ آنجنابؑ سے اس طرح کے الٹے سیدھے سوالات کرتے کہ آپؑ کے جوابات سے یہ ثابت کیا جا سکے کہ یہ شخص رومی حکومت کا باغی ہے۔

یہود کی ان چالوں کا توڑ کرنے کے لیے اللہ نے اپنی چال چلی۔ اللہ کی چال کیا تھی؟ اس کی تفصیل قرآن یا حدیث میں نہیں ہے' بلکہ ''انجیل برنباس'' میں ہے جو پوپ کی لائبریری سے برآمد ہوئی تھی۔ چنانچہ انجیل برنباس کے مطابق حضرت مسیحؑ کے حواریوں میں سے ایک حواری یہوداہ اسکریوتی (Judas Iscariot) کو یہود نے رشوت دے کر اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ مخبری کر کے آپؑ کو گرفتار کرائے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی غدار حواری کی شکل حضرت مسیحؑ کی سی بدل دی۔ حضرت مسیحؑ اُس وقت ایک باغ میں روپوش تھے۔ آپؑ اس باغ کے اندر بنی ہوئی ایک کوٹھڑی میں رات کے وقت عبادت میں مشغول تھے' جبکہ آپؑ کے بارہ حواری باہر موجود تھے۔ اُس وقت وہ شخص وہاں سے چپکے سے سٹک گیا اور جا کر سپاہیوں کو لے آیا تاکہ آپؑ کو گرفتار کرا سکے۔ یہ رومی سپاہی تھے اور قندیلیں لے کر آئے تھے۔ اُس نے سپاہیوں سے کہا تھا کہ میں اندر جاؤں گا' جس شخص کو میں کہوں ''اے ہمارے استاد'' بس اسی کو پکڑ لینا' وہی مسیحؑ ہیں۔ ظاہر ہے رومیوں کو کیا پتا تھا کہ مسیحؑ کون ہیں؟ یہ شخص جیسے ہی کوٹھڑی کے اندر داخل ہوا اُسی وقت کوٹھڑی کی چھت پھٹی اور چار فرشتے نازل ہوئے' جو حضرت مسیحؑ کو لے کر چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کی شکل تبدیل کر کے حضرت مسیحؑ والی شکل بنا دی۔ اب یہ گھبرا کر باہر نکلا تو دوسرے حواریوں نے اُس سے کہا ''اے ہمارے استاد!'' یہ سنتے ہی سپاہیوں نے اسے قابو کر لیا اور اصل میں یہی شخص سولی چڑھا ہے' نہ کہ حضرت مسیحؑ۔ یہ ساری تفاصیل انجیل برنباس میں موجود ہیں۔ یہ شہادت درحقیقت نصاریٰ ہی کے گھر سے ہمیں ملی ہے اور قرآن کا جو بیان ہے اس میں یہ پوری طرح فٹ بیٹھتی ہے کہ ''انہوں نے اپنی سی چالیں چلیں اور اللہ نے اپنی چال چلی۔''

﴿وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۵۴﴾ ''اور اللہ تعالیٰ بہترین چال چلنے والا ہے۔''

آیات ۵۵ تا ۶۳

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۵۵ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۵۶ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۷ ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ

الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ
فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا
وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ
وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ
ع ۱۴ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾

آیت ۵۵ ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ﴾ ''یاد کرو جب اللہ نے کہا: اے عیسیٰؑ اب میں تمہیں لے جانے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں''

لفظ ''مُتَوَفِّيْكَ'' کو قادیانیوں نے اپنے اس غلط عقیدے کے لیے بہت بڑی بنیاد بنایا ہے کہ حضرت مسیحؑ کی وفات ہو چکی ہے۔ لہٰذا اس لفظ کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ وَفٰی کے معنی ہیں پورا کرنا۔ اردو میں بھی کہا جاتا ہے وعدہ وفا کرو۔ اسی سے باب تفعیل میں وَفّٰی ۔ یُوَفِّیْ ۔ تَوْفِیَۃً کا مطلب ہے کسی کو پورا دینا۔ جیسا کہ اسی سورت کی آیت ۲۵ میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۪ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''تو کیا حال ہوگا جب ہم انہیں اکٹھا کریں گے اُس دن جس کے بارے میں کوئی شک نہیں! اور ہر جان کو پورا پورا بدلہ اس کے اعمال کا دے دیا جائے گا اور ان پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی''۔ باب تفعّل میں تَوَفّٰی یَتَوَفّٰی کا معنی ہوگا کسی کو پورا پورا لے لینا۔ اور یہ لفظ گویا بتمام و کمال منطبق ہوتا ہے حضرت مسیحؑ پر کہ جن کو اللہ تعالیٰ ان کے جسم اور جان سمیت دُنیا سے لے گیا۔ واضح رہے کہ ہم جب کہتے ہیں کہ کوئی شخص وفات پا گیا تو یہ استعارتاً کہتے ہیں۔ اس لیے کہ مرنے والے کا جسم تو یہیں رہ جاتا ہے' صرف جان جاتی ہے۔ پھر یہی لفظ قرآن مجید میں نیند کے لیے بھی آیا ہے: ﴿اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ﴾ (الزمر:۴۲) ''وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو ابھی نہیں مرا اُس کی روح نیند میں قبض کر لیتا ہے''۔ اس لیے کہ نیند میں بھی انسان سے خود شعوری نکل جاتی ہے' اگرچہ وہ زندہ ہوتا ہے۔ روح کا تعلق خود شعوری کے ساتھ ہے۔ پھر جب انسان مرتا ہے تو روح اور جان دونوں چلی جاتی ہیں اور پیچھے صرف جسم رہ جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے ان دونوں حالتوں (نیند اور موت) کے لیے توفّی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اور سب سے زیادہ مکمل تَوَفّی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مسیحؑ کو ان کے جسم' جان اور روح تینوں سمیت' جوں کا توں' زندہ سلامت لے گیا۔ حضرت مسیحؑ کے رفعِ سماوی کا یہ عقیدہ مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے' اور جہاں تک لفظ ''تَوَفّی'' کے لغوی مفہوم کا تعلق ہے اُس میں قطعاً کوئی ایسا پیچیدہ نکتہ نہیں ہے جس سے کوئی شخص آپؑ کی موت کی دلیل پکڑ سکے۔ البتہ اس معاملے میں ان لوگوں کو بہکانا آسان ہے جنہیں عربی زبان کی گرامر سے واقفیت نہیں ہے۔ اس لیے کہ عام لوگ تو ایک ہی وفات کے بارے میں جانتے ہیں' جبکہ از روئے قرآن تین قسم کی ''وفات'' ثابت ہوتی ہے' جیسے کہ اوپر وضاحت کی گئی ہے۔ اب آیت زیر مطالعہ کے متذکرہ بالا ٹکڑے کا ترجمہ پھر کر لیجیے: ''یاد کرو جب اللہ نے کہا کہ اے عیسیٰؑ میں تمہیں لے جانے والا ہوں اور تمہیں اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں۔''

﴿وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''اور تمہیں پاک کرنے والا ہوں ان لوگوں سے جنہوں نے (تمہارے ساتھ)

کفر کیا ہے‘‘

﴿وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ﴾ ’’اور غالب کرنے والا ہوں اُن لوگوں کو جو تمہاری پیروی کریں گے قیامت تک اُن لوگوں پر جو تمہارا انکار کر رہے ہیں۔‘‘

یہود جنہوں نے حضرت مسیحؑ کا انکار کیا تھا اُس وقت سے لے کر موجودہ زمانے تک حضرت مسیحؑ کے پیروکاروں سے مار کھاتے رہے ہیں۔ حضرت مسیحؑ ۳۰ء یا ۳۳ء میں آسمان پر اٹھا لیے گئے تھے اور اس کے بعد سے یہود عیسائیوں کے ہاتھوں مسلسل عذاب کے کوڑے برستے رہے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کے رفع سماوی کے چالیس برس بعد ۷۰ء میں ٹائٹس رومی کے ہاتھوں ہیکلِ سلیمانی مسمار ہوا اور یروشلم میں ایک لاکھ بیس ہزار یا ایک لاکھ تینتیس ہزار یہودی ایک دن میں قتل کیے گئے۔ اُس وقت سے لے کر اب تک دو ہزار برس ہونے کو ہیں‘ ان کا کعبہ گرا پڑا ہے۔ اس کی صرف ایک دیوار (دیوارِ گریہ) باقی ہے جس پر جا کر یہ رو دھو لیتے ہیں۔

ہیکلِ سلیمانی اوّلاً بخت نصر نے چھٹی صدی قبل مسیح میں مسمار کیا تھا۔ اس حملے میں اس نے پورے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی‘ لاکھوں یہودی تہ تیغ کر دیے اور لاکھوں کو قیدی بنا کر وہ اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ اس دور کو انہوں نے اُسارت (Captivity) کا نام دیا ہے۔ حضرت عزیرؑ کے زمانے میں یہ لوگ دوبارہ فلسطین واپس آئے اور ’’معبد ثانی‘‘ تعمیر کیا‘ جو ۷۰ء میں پھر منہدم کر دیا گیا اور انہیں پھر فلسطین سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد یہ مختلف ملکوں میں منتشر ہو گئے۔ کچھ روس‘ کچھ ہندوستان‘ کچھ مصر اور کچھ یورپ چلے گئے۔ اس طرح یہ پوری دنیا میں پھیل گئے۔ یہ ان کا دورِ انتشار (Diaspora) کہلاتا ہے۔ حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں جب عیسائیوں نے ایک معاہدے کے تحت یروشلم مسلمانوں کے حوالے کر دیا تو حضرت عمرؓ نے اسے کھلا شہر (open city) قرار دے دیا کہ یہاں مسلمان‘ عیسائی اور یہودی سب آ سکتے ہیں۔ اس طرح ان کی یروشلم میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ البتہ عیسائیوں نے اس معاہدے میں یہ شرط بھی لکھوائی تھی کہ یہودیوں کو یہاں آباد ہونے یا جائیداد خریدنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے زمانے سے خلافت عثمانیہ کے دور تک اس معاہدے پر عمل درآمد ہوتا رہا اور یہودیوں کو فلسطین میں آباد ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اس کے لیے انہوں نے عثمانی خلفاء کو بڑی بڑی رشوتوں کی پیشکش کی‘ لیکن انہیں اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ بالآخر انہوں نے عیسائیوں کے ساتھ مل کر خلافتِ عثمانیہ کو ختم کروا دیا۔ اسی دوران (۱۹۱۷ء میں) انہوں نے برطانوی وزیر بالفور (Balfor) کے ذریعے ’’بالفور ڈیکلریشن‘‘ منظور کرایا‘ جس میں ان کو یہ حق دیا گیا کہ وہ فلسطین میں آ کر جائیداد بھی خرید سکتے ہیں اور آباد بھی ہو سکتے ہیں۔ اس ڈیکلریشن کی منظوری کے ۳۱ برس بعد اسرائیل کی ریاست وجود میں آ گئی۔

اب صورتِ حال یہ ہے کہ یہودی دنیا بھر میں سیاست اور اقتدار پر چھائے ہوئے ہیں‘ تعداد میں ڈیڑھ کروڑ سے بھی کم ہونے کے باوجود اس وقت دنیا کی معیشت کا بڑا حصہ ان کے کنٹرول میں ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ سب کچھ عیسائیوں کی پشت پناہی کی وجہ سے ہے۔ اگر عیسائی ان کی مدد نہ کریں تو عرب ایک دن میں ان کے ٹکڑے اڑا کر رکھ دیں۔ اس وقت پوری امریکی حکومت ان کی پشت پر ہے‘ بلکہ White Anglo Saxon Protestants یعنی امریکہ اور برطانیہ تو گویا ان کے زرخرید ہیں۔ دوسرے عیسائی ممالک بھی ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ بہرحال اب بھی صورتِ حال یہ ہے کہ اوپر تو عیسائی ہی ہیں اور یہ معنوی طور پر سازشی انداز میں نیچے سے انہیں کنٹرول کر رہے ہیں۔

﴿ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۵۵﴾ ’’پھر میری طرف ہی تم سب کا لوٹنا ہو گا

اور میں فیصلہ کردوں گا تمہارے مابین ان باتوں میں جن میں تم اختلاف کر رہے تھے۔''

آیت ۵۶ ﴿فَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۫﴾ ''تو وہ لوگ جو کفر کی روش اختیار کریں گے میں انہیں عذاب دوں گا بہت سخت عذاب دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔''

﴿وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۝۵۶﴾ ''اور نہیں ہوں گے ان کے لیے کوئی مددگار۔''

آیت ۵۷ ﴿وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اور جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے''

﴿فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ﴾ ''تو وہ ان کو ان کا پورا اجر دے گا۔''

دیکھئے یہاں پھر وَفّٰی یُوَفِّی آیا ہے۔ یعنی پورا پورا دے دینا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝۵۷﴾ ''اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''

آیت ۵۸ ﴿ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَیْكَ مِنَ الْاٰیٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ ۝۵۸﴾ ''یہ ہم آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں آیاتِ الٰہیہ اور پُرحکمت یاددہانی میں سے۔''

یہاں بھی گویا پس منظر میں حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں جو اللہ کی آیات اور ذکر حکیم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پڑھ کر سنا رہے ہیں۔

آیت ۵۹ ﴿اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ﴾ ''بے شک عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ کی سی ہے۔''

﴿خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝۵۹﴾ ''اُس کو مٹی سے بنایا' پھر کہا ہو جا تو وہ ہو گیا۔''

قرآن مجید کی یہ آیت ان لوگوں کے حق میں دلیل ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی خصوصی تخلیق (special creation) کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک حضرت آدمؑ کا چناؤ ارتقاء (evolution) کے نتیجے میں کسی نوع (species) کے وجود میں آنے کے بعد اس کے ایک فرد کی حیثیت سے نہیں ہوا' بلکہ آپؑ براہِ راست مٹی سے تخلیق کیے گئے۔ تخلیقِ آدمؑ کے ضمن میں یہ دونوں نظریے ملتے ہیں اور دونوں کے بارے میں دلائل بھی موجود ہیں۔ ابھی یہ کوئی طے شدہ حقائق نہیں ہیں۔ ہم غور و فکر کر سکتے ہیں کہ قرآن مجید کے کس مقام پر کس نظریے کے لیے کوئی تائید یا توثیق ملتی ہے۔ یہاں فرمایا کہ ''اللہ کے نزدیک تو عیسیٰؑ کی مثال ایسے ہی ہے جیسے آدمؑ کی۔ اسے مٹی سے بنایا اور کہا ہو جا تو وہ ہو گیا''۔ تو اب اگر آدمؑ کا معاملہ خصوصی تخلیق کا ہے کہ بغیر باپ کے اور بغیر ماں کے پیدا ہو گئے تو کیا وہ ''الٰہ'' بن گئے؟ ان کا خالق تو اللہ ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تو خدا کیسے بن گئے؟ ان کی والدہ کو حمل ہوا' نو مہینے ماں کے پیٹ میں رہے' پھر ان کی پیدائش ہوئی۔ تو تخلیق میں ان کا معاملہ اعجاز کے اعتبار سے حضرت آدمؑ سے تو کم ہی رہا ہے۔ اور اس سے کم تر معاملہ حضرت یحییٰؑ کا ہے کہ انتہائی بڑھاپے کو پہنچے ہوئے حضرت زکریاؑ اور ان کی اہلیہ جو ساری عمر بانجھ رہیں' اللہ نے ان کو اولاد دے دی۔ تو یہ سارے معجزات ہیں' اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔ اس میں کسی کی الوہیت کی دلیل نہیں نکلتی۔

آیت ۶۰ ﴿اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝۶۰﴾ ''یہ حق ہے آپؐ کے ربّ کی طرف سے' تو ہرگز نہ ہو جانا شک کرنے والوں میں سے۔''

یعنی حضرت مسیحؑ کے بارے میں اصل حقیقت یہی ہے جو قرآن نے واضح کر دی ہے' باقی سب نصاریٰ کی افسانہ طرازی ہے۔ اور یہ جو فرمایا: ﴿فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ ۝۶۰﴾ اس میں خطاب بظاہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہے مگر روئے سخن مخاطبین سے ہے۔

آیت ﴿ فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ) جو بھی اس معاملے میں آپؐ سے حُجت بازی کرے اس کے بعد کہ آپ کے پاس صحیح علم آ چکا ہے''

آپؐ کے پاس تو ''العلم'' آ چکا ہے' آپؐ جو بات کہہ رہے ہیں علیٰ وجہ البصیرۃ کہہ رہے ہیں۔ اس ساری وضاحت کے بعد بھی اگر نصاریٰ آپؐ سے حُجت بازی کریں اور بحث و مناظرہ سے کنارہ کش ہونے کو تیار نہ ہوں تو ان کو آخری چیلنج دے دیجیے کہ وہ آپؐ کے ساتھ ''مباہلہ'' کر لیں۔ نجران سے نصاریٰ کا ۷۰ افراد پر مشتمل جو وفد ابوحارثہ اور ابن علقمہ جیسے بڑے بڑے پادریوں کی سرکردگی میں مدینہ آیا تھا' اس سے دعوت و تبلیغ اور تذکیر و تفہیم کا معاملہ کئی دن تک چلتا رہا۔ یہاں دراصل اس وفد کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ اگر یہ لوگ اس قدر سمجھانے پر بھی قائل نہیں ہوتے تو انہیں مباہلے کی دعوت دے دیجیے۔

﴿ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ ﴾ ''پس آپ ان سے کہہ دیجیے کہ آؤ' ہم بلاتے ہیں اپنے بیٹوں کو اور تم بلاؤ اپنے بیٹوں کو'

﴿ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ ﴾ ''اور ہم (بلا لیتے ہیں) اپنی عورتوں کو اور تم (بلاؤ) اپنی عورتوں کو'

﴿ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۟ ﴾ ''اور ہم بھی آ جاتے ہیں اور تم بھی آ جاؤ!''

﴿ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ ﴾ ''پھر ہم سب مل کر دعا کریں اور لعنت کریں اللہ کی اُن پر کہ جو جھوٹے ہیں۔''

ہم سب جمع ہو کر اللہ سے گڑگڑا کر دعا کریں اور کہیں کہ اے اللہ! جو ہم میں سے جھوٹا ہو' اُس پر لعنت کر دے۔ یہ مباہلہ ہے۔ اور مباہلے کی دعوت اس وقت دی جاتی ہے جبکہ احقاقِ حق ہو چکے' بات پوری طرح واضح کر دی جائے۔ آپ کو یقین ہو جائے کہ میرا مخاطب بات پوری طرح سمجھ گیا ہے اور اب صرف ضد پر اڑا ہوا ہے۔ ایسی صورت حال میں یہ مباہلہ آخری تدبیر ہوتی ہے تاکہ حق کا حق ہونا ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ اگر تو مخالف کو اپنے موقف کی صداقت کا یقین ہو گا تو وہ مباہلہ کا چیلنج قبول کر لے گا' اور اگر اس کے دل میں چور ہے اور وہ جانتا ہے کہ حق بات تو یہی ہے جو واضح ہو چکی ہے تو پھر وہ مباہلہ سے راہِ فرار اختیار کرے گا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ مباہلہ کی دعوت سن کر وفدِ نجران نے مہلت مانگی کہ ہم مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ مجلسِ مشاورت میں ان کے بڑوں نے ہوش مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے کہا: ''اے گروہِ نصاریٰ! تم یقیناً دلوں میں سمجھ چکے ہو کہ محمد (ﷺ) نبی مرسل ہیں اور حضرت مسیحؑ کے متعلق انہوں نے صاف صاف فیصلہ کن باتیں کہی ہیں۔ تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے بنی اسماعیل میں نبی بھیجنے کا وعدہ کیا تھا۔ کچھ بعید نہیں یہ وہی نبی ہوں۔ پس ایک نبی سے مباہلہ و ملاعنہ کرنے کا نتیجہ کسی قوم کے حق میں یہی نکل سکتا ہے کہ ان کا کوئی چھوٹا بڑا ہلاکت یا عذابِ الٰہی سے نہ بچے اور پیغمبر کی لعنت کا اثر نسلوں تک پہنچ کر رہے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر کے اپنی بستیوں کی طرف روانہ ہو جائیں' کیونکہ سارے عرب سے لڑائی مول لینے کی طاقت ہم میں نہیں''۔ چنانچہ انہوں نے مقابلہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے۔

آیت ﴿ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ ﴾ ''یقیناً یہی بالکل صحیح سرگزشت ہے۔''

﴿ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ ﴾ ''اور نہیں ہے کوئی معبود اللہ کے سوا۔''

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٦٢﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ ہی زبردست اور کمالِ حکمت والا ہے۔''

آیت ۶۳ ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿٦٣﴾﴾ ''پھر اگر وہ پیٹھ موڑ لیں تو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے مفسدوں کو۔''

یہاں آ کر اس سورۂ مبارکہ کے نصفِ اوّل کا پہلا اور دوسرا حصہ مکمل ہو گیا' جو ۶۳ = ۳۱ + ۳۲ آیات پر مشتمل ہے۔

آیات ۶۴ تا ۷۱

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿٦٤﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَاۗجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٦٥﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاۗجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٦٦﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٦٧﴾ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٨﴾ وَدَّتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٦٩﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٧٠﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿٧١﴾ ع ۱۵

سورۂ آلِ عمران کے نصفِ اوّل کا تیسرا حصہ ۳۸ آیات (۶۴ تا ۱۰۱) پر مشتمل ہے اور یہ سورۃ البقرۃ کے نصفِ اوّل کے تیسرے حصے (رکوع ۱۵ تا ۱۸) سے بہت مشابہ ہے۔ سورۃ البقرۃ کے اس حصے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور بیت اللہ کا ذکر ہے' اہلِ کتاب کو ایمان کی دعوت دی گئی ہے اور تحویلِ قبلہ کا حکم ہے۔ کم و بیش یہی مضامین اس سورت کے اس حصے میں ملتے ہیں۔

آیت ۶۴ ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ﴾ ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ دیجیے: اے اہلِ کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان بالکل برابر ہے''

یہاں ''اہلِ کتاب'' کے صیغۂ خطاب میں یہود و نصاریٰ دونوں کو جمع کر لیا گیا ہے' جبکہ سورۃ البقرۃ میں ''یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ'' کے صیغۂ خطاب میں زیادہ تر گفتگو یہود سے تھی۔ گزشتہ آیات میں ابھی تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ تھا اور اس حوالے سے گویا صرف نصرانیوں سے خطاب تھا' اب زیرِ مطالعہ آیات میں اہلِ کتاب دونوں کے دونوں مخاطب ہیں کہ ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے مابین یکساں مشترک اور متفق علیہ ہے۔ وہ کیا ہے؟

﴿اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ ''کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں''

﴿وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا﴾ ''اور اُس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں''

﴿وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا ربّ ٹھہرائے۔''

یہود و نصاریٰ نے اپنے اَحبار و رُہبان کا یہ اختیار تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جس چیز کو چاہیں حلال قرار دے دیں اور جس چیز کو چاہیں حرام ٹھہرا دیں۔ یہ گویا ان کو رب مان لینے کے مترادف تھا۔ جیسا کہ سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آیت ۳۱) ''انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو رب بنا لیا اللہ کے سوا.....'' مشہور سخی حاتم طائی کے بیٹے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ (جو پہلے عیسائی تھے) ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ قرآن اہل کتاب کے بارے میں کہتا ہے: ''انہوں نے اپنے احبار و رہبان کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا''۔ حالانکہ ہم نے تو انہیں رب کا درجہ نہیں دیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((أَمَا إِنَّهُمْ لَمْ يَكُوْنُوْا يَعْبُدُوْنَهُمْ وَلٰكِنَّهُمْ إِذَا أَحَلُّوْا لَهُمْ شَيْئًا اسْتَحَلُّوْهُ وَإِذَا حَرَّمُوْا عَلَيْهِمْ شَيْئًا حَرَّمُوْهُ))(۱)

''وہ ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے' لیکن جب وہ ان کے لیے کسی شے کو حلال قرار دیتے تو وہ اسے حلال مان لیتے اور جب وہ کسی شے کو حرام قرار دے دیتے تو وہ اسے حرام مان لیتے۔''

ظاہر ہے حلت و حرمت کا اختیار صرف اللہ کا ہے' جو کوئی اس حق کو اختیار کرتا ہے وہ گویا رب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ چنانچہ آج شریعت کے خلاف جہاں کہیں بھی قانون سازی کی جا رہی ہے یہ حقیقت کے اعتبار سے ان لوگوں کی جانب سے خدائی کا دعویٰ ہے جو ان قانون ساز اداروں میں بیٹھے ہوئے ہیں' اور جو وہاں پہنچنے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں اور اس کے لیے کروڑوں روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ اگر تو پہلے سے یہ طے ہو جائے کہ کوئی قانون سازی کتاب و سنت کے منافی نہیں ہو سکتی تو پھر آپ جائیے اور وہاں جا کر قرآن و سنت کے دائرے کے اندر اندر قانون سازی کیجیے۔ لیکن اگر یہ تحدید نہیں ہے اور محض اکثریت کی بنیاد پر قانون سازی ہو رہی ہے تو یہ شرک ہے۔

بہرحال اس آیت میں یہود و نصاریٰ کو واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ توحید ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک عقیدہ ہے۔ اس طرح انہیں غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ وہ موازنہ کریں کہ اس قدرِ مشترک کے معیار پر اسلام پورا اترتا ہے یا یہودیت اور نصرانیت؟

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝۶۴﴾ ''پھر اگر وہ منہ موڑ لیں تو (اے مسلمانو!) تم کہو آپ لوگ گواہ رہیں کہ ہم تو مسلمان ہیں۔''

ہم نے تو اللہ کی اطاعت قبول کر لی ہے اور ہم متذکرہ بالا تینوں باتوں پر قائم رہیں گے۔ آپ کو اگر یہ پسند نہیں تو آپ کی مرضی!

آیت ۶۵ ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ﴾ ''اے کتاب والو! تم ابراہیمؑ کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ تورات اور انجیل نہیں نازل کی گئیں مگر اُس کے بعد؟''

یہ بات تم بھی جانتے اور مانتے ہو کہ تورات بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی اور انجیل بھی۔ یعنی یہودیت بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد کی پیداوار ہے اور نصرانیت بھی۔ چنانچہ تم لوگوں کو اس میں شک نہیں ہونا چاہیے کہ ابراہیمؑ مسلمان تھے' اللہ کے فرماں بردار تھے' اور وہ یہودی یا نصرانی نہیں تھے!

﴿اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۶۵﴾ ''تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟''

آیت ۶۶ ﴿هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ ''دیکھو تم لوگ اب تک جو بھی بحث مباحثہ کرتے رہے ہو وہ

(۱) سنن الترمذی' کتاب تفسیر القرآن' باب ومن سورۃ التوبۃ۔

ان چیزوں کے بارے میں ہے جن کا تمہیں کچھ علم ہے‘‘

﴿فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ ’’تو اب تم ایسی چیزوں کے ضمن میں حجت بازی کیوں کرتے ہو جن کے بارے میں تمہارے پاس کچھ بھی علم نہیں؟‘‘

ان چیزوں کے بارے میں تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں‘ کوئی علمی بنیاد نہیں۔

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۶۶﴾ ’’اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔‘‘

آیت ۶۷ ﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا﴾ ’’(تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ) ابراہیمؑ نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی‘‘

﴿وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا﴾ ’’بلکہ وہ تو بالکل یکسو ہو کر اللہ کے فرماں بردار تھے۔‘‘

﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۶۷﴾ ’’اور نہ وہ مشرکوں میں سے تھے۔‘‘

نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے تینوں اہم گروہ‘ یعنی مشرکینِ عرب‘ یہودی اور نصرانی‘ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے منسوب کرتے تھے۔ مشرکینِ عرب حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے ہونے کی نسبت سے کہتے تھے کہ ہمارا رشتہ ابراہیمؑ سے ہے۔ اسی طرح یہودی اور نصرانی بھی ملتِ ابراہیمیؑ ہونے کے دعوے دار تھے۔ لیکن قرآن نے دوٹوک انداز میں فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے‘ نہ نصرانی تھے اور نہ ہی مشرکین میں سے تھے‘ بلکہ وہ مسلمان تھے۔

آیت ۶۸ ﴿اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ﴾ ’’یقیناً ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ قربت رکھنے والے لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے اُن کی پیروی کی‘‘

﴿وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ’’اور اب یہ نبی (حضرت محمد ﷺ) اور جو اُن پر ایمان لائے (اس نسبت کے زیادہ حقدار ہیں)۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۶۸﴾ ’’اور اللہ ان مؤمنوں کا ساتھی ہے۔‘‘

وہ اہلِ ایمان کا حامی و مددگار ہے‘ پشت پناہ ہے‘ حمایتی ہے۔

آیت ۶۹ ﴿وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ﴾ ’’اہلِ کتاب کا ایک گروہ آرزومند ہے کہ (اے مسلمانو!) تمہیں کسی طرح گمراہ کر دیں۔‘‘

﴿وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝۶۹﴾ ’’اور وہ نہیں گمراہ کر سکیں گے مگر اپنے آپ کو‘ لیکن انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔‘‘

آیت ۷۰ ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝۷۰﴾ ’’اے اہلِ کتاب! تم کیوں اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے ہو جبکہ تم خود گواہ ہو؟‘‘

تم قرآن اور صاحبِ قرآن ﷺ کی حقانیت کے قائل ہو‘ ان کو پہچان چکے ہو‘ دل میں جان چکے ہو!

آیت ۷۱ ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۷۱﴾ ’’اے اہلِ کتاب!

تم کیوں حق کے اوپر باطل کا ملمع چڑھاتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو جانتے بوجھتے ؟''

سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع میں یہ مضمون بایں الفاظ آیا تھا: ﴿وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور نہ گڈمڈ کرو حق کے ساتھ باطل کو اور نہ چھپاؤ حق کو درانحالیکہ تم جانتے ہو۔''

''یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ'' کے صیغۂ خطاب کے ساتھ ان آیات میں اسی طرح کا داعیانہ انداز ہے جو سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع میں ہے۔

آیات ۷۲ تا ۸۰

وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَاۗىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰۗىِٕكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰۗىِٕكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾ ع ۹ ۱۶

آیت ۷۲ ﴿وَقَالَتْ طَّآىِٕفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ﴾ ''اور اہلِ کتاب کے ایک گروہ نے کہا کہ ان اہلِ ایمان پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر ایمان لاؤ صبح کے وقت اور اس کا انکار کردو دن کے آخر میں''

﴿لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾﴾ ''شاید (اس تدبیر سے) ان میں سے بھی کچھ پھر جائیں۔''

یہاں یہود کی ایک بہت بڑی سازش کا ذکر ہو رہا ہے جو اُن کے ایک گروہ نے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو ناکام

بنانے کے لیے مسلمانوں کے خلاف تیار کی تھی۔ اس سازش کا پس منظر یہ تھا کہ دنیا کے سامنے یہ بات آ چکی تھی کہ جو کوئی ایک مرتبہ دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا تھا وہ واپس نہیں آتا تھا' چاہے اسے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا جاتا' بھوکا پیاسا رکھا جاتا' حتیٰ کہ جان سے مار دیا جاتا۔ اس طرح عوام الناس کے دلوں پر دھاک بیٹھ گئی تھی کہ اسلام کے اندر کوئی ایسی کشش' ایسی حقانیت اور ایسی مٹھاس ہے کہ آدمی ایک مرتبہ اسے قبول کر لینے کے بعد بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہو جاتا ہے' لیکن اس نظریے سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں ہوتا۔ اسلام کی اس ساکھ کو توڑنے کا طریقہ انہوں نے یہ سوچا کہ صبح کے وقت اعلان کرو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ سارا دن محمد (ﷺ) کی صحبت میں رہو اور شام کو کہہ دو کہ ہم نے دیکھ لیا' یہاں کچھ بھی نہیں ہے' یہ دُور کے ڈھول سہانے والا معاملہ ہے' ہم تو اپنے عقیدے پر واپس جا رہے ہیں' ہمیں یہاں سے کچھ نہیں ملا۔ ممکن ہے اس سے مسلمانوں میں سے کچھ لوگ یہ سمجھ جائیں کہ انہوں نے سازش کی ہے' لیکن یقیناً کچھ لوگ یہ بھی ضرور سمجھیں گے کہ بھئی یہ بڑے متقی لوگ تھے' متلاشیانِ حق تھے' بڑے جذبے اور بڑی شان کے ساتھ انہوں نے کلمہ پڑھا تھا اور ایمان قبول کیا تھا' پھر سارا دن رسول اللہ ﷺ کی محفل میں بھی بیٹھے رہے ہیں' آخر انہوں نے کچھ نہ کچھ تو دیکھا ہی ہوگا جو واپس پلٹ گئے ہیں۔ اس انداز سے عام لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کرنے کے لیے انہوں نے یہ منافقانہ سازش تیار کی۔ اسلام میں قتلِ مرتد کی سزا کا تعلق اسی سے جڑتا ہے۔ اسلامی ریاست میں اس طرح کی سازشوں کا راستہ روکنے کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہے کہ جو شخص ایمان لانے کے بعد پھر کفر میں جائے گا تو قتل کر دیا جائے گا' کیونکہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی (ideological) ریاست ہے' ایمان اور اسلام ہی تو اس کی بنیادیں ہیں۔ چنانچہ اس کی بنیادوں کو کمزور کرنے اور اس کی جڑوں کو کھودنے والی جو چیز بھی ہو سکتی ہے اس کا سدِباب پوری قوت سے کرنا چاہیے۔

آیت ۷۳ ﴿وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾ ''اور دیکھو کسی کی بات نہ ماننا مگر اُسی کی جو تمہارے دین کی پیروی کرے۔''

یعنی اس سازشی گروہ کو یہ خطرہ بھی تھا کہ اگر ہم جا کر چند گھنٹے اللہ کے رسول ﷺ کے پاس گزاریں گے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم میں سے واقعی کسی کو انشراحِ صدر ہو جائے اور وہ دل سے ایمان لے آئے۔ لہٰذا وہ آپس میں طے کر کے گئے کہ دیکھو' ان پر ایمان نہیں لانا ہے' صرف ایمان کا اعلان کرنا ہے۔ قرآن مجید میں یہ شعوری نفاق کی مثال ہے۔ یعنی جو وقت انہوں نے اپنے ایمان کا اعلان کرنے کے بعد مسلمانوں کے ساتھ گزارا اس میں وہ قانوناً تو مسلمان تھے' اس دوران ان میں سے اگر کوئی مر جاتا تو اس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھی جاتی' لیکن خود انہیں معلوم تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہیں۔ یہ شعوری نفاق ہے' جبکہ غیر شعوری نفاق یہ ہے کہ اندر ایمان ختم ہو چکا ہوتا ہے مگر انسان سمجھتا ہے کہ میں تو مؤمن ہوں' حالانکہ اس کا کردار اور عمل منافقانہ ہے اور اس کے اندر سے ایمان کی پونجی ختم ہو چکی ہے' جیسے دیمک کسی شہتیر کو چٹ کر جاتی ہے لیکن اس کے اوپر ایک پردہ (veneer) بہرحال برقرار رہتا ہے۔ شعوری نفاق اور غیر شعوری نفاق کے اس فرق کو سمجھ لینا چاہیے۔

﴿قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ﴾ ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہہ دیجیے کہ اصل ہدایت تو اللہ ہی کی ہدایت ہے''

آگے یہود کے سازشی ٹولے کے گزشتہ قول کا تسلسل ہے کہ دیکھو ایمان مت لانا!

﴿اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ﴾ ''مبادا کسی کو وہ شے دے دی جائے جو تمہیں دی گئی تھی''

یعنی یہ رسالت و نبوت اور مذہبی پیشوائی تو ہماری میراث تھی' ہم اگر ان پر ایمان لے آئیں گے تو وہ چیز ہم سے ان کو منتقل ہو جائے

گی۔ لہٰذا ماننا تو ہرگز نہیں ہے' لیکن یہ کام ہمیں محض ان کی ہوا اکھیڑنے کے لیے کرنا ہے۔

﴿اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ﴾ ''یا وہ تمہارے خلاف حجت قائم کریں تمہارے پروردگار کے حضور۔''

﴿قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''کہہ دیجیے کہ فضل تو کُل کا کُل اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

﴿يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے دو ہزار برس تک تمہیں اُمتِ مُسلمہ کے منصب پر فائز رکھا' اب تم اس منصب کے نااہل ثابت ہو چکے ہو' لہٰذا اب تمہیں معزول کر دیا گیا ہے' اور تمہاری جگہ ایک نئی اُمت (اُمتِ محمد ﷺ) کو اس مقام پر فائز کر دیا گیا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۷۳﴾ ''اور اللہ بہت وسعت والا اور جاننے والا ہے۔''

آیت ۷۴ ﴿يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''وہ مختص کر لیتا ہے اپنی رحمت کے لیے جس کو چاہتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۷۴﴾ ''اور اللہ بڑے فضل کا مالک ہے۔''

اگلی آیت میں حکمتِ دعوت کے اعتبار سے بہت اہم نکتہ بیان ہوا ہے کہ برے سے برے گروہ کے اندر بھی کہیں نہ کہیں کوئی اچھے افراد لازماً موجود ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسے افراد کا تذکرہ بھی کرتا رہے تاکہ ان کے دلوں کے اندر نرمی پیدا ہو۔ اسی طرح فرد کا معاملہ ہے کہ بُرے سے بُرے آدمی کے اندر کوئی اچھائی بھی موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر آپ کسی کو حق کی دعوت دے رہے ہیں تو اس میں جو اچھائی ہے اس کا اعتراف کیجیے' تاکہ اسے معلوم ہو کہ آپ اس کے خیر خواہ ہیں' آپ اس کی اچھائی کو پسند کرتے ہیں اور صرف اس کی غلطی کی اصلاح چاہتے ہیں۔ اس طرح اس کے دل میں کشادگی پیدا ہوگی اور وہ آپ کی بات سننے پر آمادہ ہوگا۔ فرمایا:

آیت ۷۵ ﴿وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ ۚ﴾ ''اور اہلِ کتاب میں سے ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس امانت رکھوا دو ڈھیروں مال تو وہ تمہیں پورا پورا واپس لوٹا دیں گے۔''

یعنی ان میں امانت دار لوگ بھی موجود ہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖۤ اِلَيْكَ﴾ ''اور ان میں ایسے بھی ہیں کہ اگر تم ان کے پاس ایک دینار بھی امانت رکھوا دو تو وہ تمہیں واپس نہیں کریں گے''

﴿اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ؕ﴾ ''مگر جب تک کہ تم اس کے سر پر کھڑے رہو۔''

اگر تم ایسے شخص کے سر پر سوار ہو جاؤ اور اس کو ادائیگی پر مجبور کر دو تب تو وہ تمہاری امانت تمہیں واپس کر دے گا' ورنہ نہیں۔ اہلِ کتاب میں سے اکثر کا کردار تو ایسا ہی ہے' لیکن ان میں سے جو تھوڑے بہت دیانت دار تھے ان کی اچھائی کا ذکر بھی کر دیا گیا۔ بالفعل اس قسم کے کردار کے حامل لوگ اُس وقت عیسائیوں میں تو موجود تھے' جبکہ یہودیوں میں نہ ہونے کے برابر تھے' لیکن اس جملے میں ''اہلِ کتاب'' کے عنوان سے ان کا ذکر مشترک طور پر کر دیا گیا۔ البتہ آگے خاص طور پر یہود کا تذکرہ ہے کہ ان میں بددیانتی' بے ایمانی اور خیانت کیوں آ گئی ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ﴾ ''یہ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان اُمّیین کے معاملے

میں ہم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔''

یہودیوں کا یہ عقیدہ تورات میں نہیں ہے' لیکن ان کی اصل مذہبی کتاب کا درجہ تورات کی بجائے ''تالمود'' کو حاصل ہے۔ یوں سمجھئے کہ تورات تو ان کے لیے ''اُمّ الکتاب'' ہے' جبکہ ان کی ساری شریعت' قوانین وضوابط اور عبادات کی ساری تفاصیل تالمود میں ہیں۔ اور تالمود میں یہ بات موجود ہے کہ ایک یہودی کے لیے دوسرے یہودی سے جھوٹ بولنا حرام ہے' لیکن کسی غیر یہودی سے جھوٹ بولنے میں کوئی قباحت نہیں۔ اسی طرح ایک یہودی کے لیے کسی یہودی کا مال ہڑپ کرنا حرام اور ناجائز ہے' لیکن کسی غیر یہودی کا مال جس طرح چاہو' دھوکہ' فریب اور بددیانتی سے ہڑپ کرو' سب جائز ہے' اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ ان کے نزدیک انسانیت کا شرف صرف یہودیوں کو حاصل ہے جبکہ غیر یہودی ان کے نزدیک انسان ہی نہیں۔ غیر یہودیوں کو وہ انسان نما حیوان (Goyims & Gentiles) سمجھتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ غیر یہودیوں سے ہر قسم کا فائدہ اٹھالینا ان کا حق ہے' جیسا کہ گھوڑے کو تانگے اور بیل کو ہل کے اندر جوت لینا اس کے مالک کا حق ہے۔ یہودیوں کے اس فلسفے پر امریکہ میں ایک مووی بھی بنائی گئی ہے: "The Other Side of Israel" یہ دستاویزی فلم وہاں کے عیسائیوں نے بنائی ہے اور اس میں انہوں نے یہودیوں کی اپنی کتابوں کے حوالے سے ان کے نظریات کو واضح کیا ہے اور یہودیت کا اصل چہرہ دنیا کو دکھایا ہے۔ (اب اسی عنوان سے کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔)

﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝۷۵﴾ ''اور وہ جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں حالانکہ وہ جانتے ہیں (کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی)۔''

آیت ۷۶ ﴿بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝۷۶﴾ ''کیوں نہیں! جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے اپنے عہد کو پورا کرے گا اور تقویٰ کی روش اختیار کرے گا تو بے شک اللہ تعالیٰ کو اہلِ تقویٰ پسند ہیں۔''

آیت ۷۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے عہد اور اپنی قسموں کو فروخت کرتے ہیں حقیر سی قیمت پر''

یعنی جب وہ دیکھتے ہیں کہ لوگ ہماری بات میں کچھ شک کر رہے ہیں تو اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ایسا ہی ہے۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے لیے کوئی حصہ نہیں ہے آخرت میں''

﴿وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ﴾ ''اور نہ اللہ اُن سے کلام کرے گا''

﴿وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ ''اور نہ اُن کی طرف نگاہ کرے گا قیامت کے دن''

﴿وَلَا يُزَكِّيْهِمْ﴾ ''اور نہ اُن کو پاک کرے گا''

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۷۷﴾ ''اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

یہ مضمون بھی تقریباً پورا سورۃ البقرۃ (آیت ۱۷۴) میں آ چکا ہے۔

آیت ۷۸ ﴿وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ ''اور ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اپنی زبان کو توڑتا مروڑتا ہے کتاب کو پڑھتے ہوئے' تاکہ تم سمجھو کہ (جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں)

وہ کتاب میں سے ہے' حالانکہ وہ کتاب میں سے نہیں ہوتا۔''

علماءِ یہود الفاظ کو ذرا سا اِدھر سے اُدھر مروڑ کر عبارت میں اپنی مرضی کے معنی پیدا کر لیتے تھے۔ ہم سورۃ البقرۃ میں پڑھ چکے ہیں کہ یہود سے کہا گیا ''حِطَّةٌ'' کہو تو وہ ''حِنْطَةٌ'' کہنے لگے۔ یعنی بجائے یہ دعا کرنے کے کہ ''اے اللہ ہمارے گناہ جھاڑ دے'' انہوں نے کہنا شروع کر دیا ''ہمیں گیہوں دے''۔ اسی طرح جب انہیں تلقین کی گئی کہ تم کہو: ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' (ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی) تو انہوں نے کہا: ''سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا'' (النساء:۴۶) (ہم نے سنا اور ہم نے نہیں مانا)۔ بالکل ایسا ہی معاملہ وہ تورات کو پڑھتے ہوئے بھی کرتے تھے اور فتویٰ پوچھنے والے سائل کو اس کی مرضی کا فتویٰ دے کر اس سے رقم بٹور لیتے تھے۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے جبکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا۔''

ہم یہ مضمون سورۃ البقرۃ (آیت ۷۹) میں بھی پڑھ چکے ہیں۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾﴾ ''اور وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں جانتے بوجھتے۔''

آیت ۷۹ ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ﴾ ''کسی انسان کے شایانِ شان نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اُس کو کتاب' حکمت اور نبوت عطا فرمائے''

﴿ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ ''پھر وہ لوگوں سے کہنے لگے کہ میرے بندے بن جاؤ اللہ کو چھوڑ کر''

یہ اب نصرانیوں کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا' انہیں کتاب دی' حکمت دی' نبوت دی' معجزات دیے۔ تو اب یہ کیسے ممکن تھا کہ حضرت عیسیٰ ان سے کہتے کہ تم اللہ کے سوا مجھے اپنا معبود بنالو!

﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾﴾ ''بلکہ (وہ تو یہی دعوت دے گا کہ) اللہ والے بن جاؤ اس وجہ سے کہ تم لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیتے ہو اور تم خود بھی اس کو پڑھتے ہو۔''

کتابِ الٰہی کی تعلیم و تعلّم کا یہی تقاضا ہے۔ دین کا سیکھنا' سکھانا' قرآن کا پڑھنا پڑھانا اور حدیث و فقہ کا درس و تدریس اس لیے ہونا چاہیے کہ لوگوں کو اللہ والے بنایا جائے' نہ یہ کہ اپنے بندے بنا کر اور ان سے نذرانے وصول کر کے ان کا استحصال کیا جائے۔

آیت ۸۰ ﴿وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ﴾ ''اور نہ کبھی وہ تمہیں اس بات کا حکم دے گا کہ تم فرشتوں کو اور انبیاء کو رب بنالو۔''

مشرکینِ مکہ نے فرشتوں کو رب بنایا اور ان کے نام پر لات' منات اور عُزّیٰ جیسی مورتیاں بنالیں' جبکہ نصاریٰ نے اللہ کے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنا رب بنالیا۔

﴿اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۸۰﴾﴾ ''تو کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے گا اس کے بعد کہ تم مسلم ہو چکے ہو؟''

اللہ کا وہ بندہ جسے اللہ نے کتاب' حکمت اور نبوت عطا کی ہو' کیا تمہیں کفر کا حکم دے سکتا ہے جبکہ تم فرمانبرداری اختیار کر چکے ہو؟

آیات ۸۱ تا ۹۱

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾ اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۖ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّ لَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾ ع ۱۱

آیت ۸۱ ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ اللہ نے تمام انبیاء سے ایک عہد لیا تھا کہ''

﴿لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ﴾

''جو کچھ بھی مَیں تمہیں کتاب اور حکمت عطا کروں' پھر تمہارے پاس آئے کوئی اور رسول جو تصدیق کرتا ہو اُس کی جو تمہارے پاس (پہلے سے) موجود ہے تو تمہیں لازماً اُس پر ایمان لانا ہوگا اور اُس کی مدد کرنی ہوگی۔''

انبیاء و رُسل کا یہ سلسلہ ایسے ہی چل رہا تھا کہ ہر نبی نے آئندہ آنے والے نبی کی پیشین گوئی کی اور اپنی اُمت کو اُس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی۔ اس لحاظ سے یہ آیت بھی ختمِ نبوت کے بارے میں بہت بڑی دلیل ہے۔ یعنی حضور ﷺ سے پہلے تو ہر نبی سے یہ عہد لیا گیا لیکن آپؐ سے ایسا کوئی عہد نہیں لیا گیا' اور نہ ہی آپؐ نے اپنی اُمت کو کسی بعد میں آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی' بلکہ اس کے برعکس قرآن میں صراحت کے ساتھ آنحضور ﷺ کو خاتم النّبیین فرمایا گیا ہے اور متعدد احادیث میں آپ ﷺ نے بھی واضح فرما دیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ حضرت مسیح علیہ السلام محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بشارت دے کر گئے تھے اور دیگر انبیاء کی کتابوں میں بھی ایسی بشارتیں موجود ہیں۔ انجیل برنباس کا تو کوئی صفحہ خالی نہیں ہے جس

میں آنحضور ﷺ کی آمد کی بشارت نہ ہو لیکن باقی انجیلوں میں سے یہ بشارتیں نکال دی گئی ہیں۔

﴿قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ﴾ ''اللہ نے فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا ہے اور اس پر میری ڈالی ہوئی ذمہ داری قبول کر لی ہے؟''

﴿قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ﴾ ''انہوں نے کہا: ہاں ہم نے اقرار کیا۔''

انبیاء و رسلؑ سے یہ عہد عالمِ ارواح میں لیا گیا۔ جس طرح تمام ارواحِ انسانیہ سے ''عہد الست'' لیا گیا تھا ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ﴾ (الاعراف: ۱۷۲) ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کیوں نہیں!'' اسی طرح جنہیں نبوت سے سرفراز ہونا تھا اُن کی ارواح سے اللہ تعالیٰ نے یہ اضافی عہد لیا کہ میں تمہیں نبی بنا کر بھیجوں گا' تم اپنی اُمت کو یہ ہدایت کر کے جانا کہ تمہارے بعد جو نبی بھی آئے اُس پر ایمان لانا اور اس کی مدد اور نصرت کرنا۔

﴿قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۸۱﴾ ''اللہ تعالیٰ نے کہا: اچھا اب تم بھی گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔''

آیت ۸۲ ﴿فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۸۲﴾ ''تو جس نے بھی منہ موڑ لیا اس کے بعد تو یقیناً وہی لوگ سرکش (اور نافرمان) ہیں۔''

آیت ۸۳ ﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ﴾ ''تو کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں؟''

﴿وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝۸۳﴾ ''جبکہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے وہ اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہے' چاہے خوشی سے اور چاہے مجبوراً' اور اُسی کی طرف ان سب کو لوٹا دیا جائے گا۔''

آیت ۸۴ ﴿قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾ ''کہیے ہم ایمان لائے اللہ پر اور جو نازل کیا گیا ہم پر''

یاد رہے کہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۳۶ میں تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

﴿وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ ''اور جو کچھ نازل کیا گیا ابراہیمؑ' اسماعیلؑ' اسحاقؑ' یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر''

﴿وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ﴾ ''اور جو بھی موسیٰؑ' عیسیٰؑ اور تمام انبیاءؑ کو دیا گیا اُن کے ربّ کی طرف سے۔''

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۸۴﴾ ''ہم ان میں سے کسی ایک کے مابین بھی کوئی تفریق نہیں کرتے' اور ہم تو اللہ ہی کے فرمانبردار ہیں۔''

آیت ۸۵ ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ﴾ ''اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرنا چاہے گا تو وہ اس کی جانب سے قبول نہیں کیا جائے گا۔''

﴿وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۸۵﴾ ''اور پھر آخرت میں وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہو کر رہے گا۔''

آیت ۸۶ ﴿كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ﴾ ''کیسے ہدایت دے گا اللہ ان لوگوں کو جو اپنے ایمان لانے

کے بعد کافر ہو گئے؟''

یعنی ان کے دل ایمان لے آئے تھے' ان پر حقیقت منکشف ہو گئی تھی' لیکن دُنیوی مصلحتیں آڑے آ گئیں اور زبان سے انکار کر دیا۔ جیسے سورۃ النمل میں ہم پڑھیں گے: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ﴾ (آیت ۱۴) ''انہوں نے ظلم اور تکبر کے مارے ان معجزات کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل ان کے قائل ہو چکے تھے۔''

﴿وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ﴾ ''اور انہوں نے گواہی دی کہ یہ رسول حق ہیں''

اہلِ کتاب جب آپس میں باتیں کرتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ واقعتاً نبی آخر الزمان (ﷺ) ہیں اور ہماری کتابوں میں بیان کردہ پیشگوئیوں کا مصداق ہیں۔ چنانچہ روایات میں آتا ہے کہ علقمہ کے دو بیٹے ابوحارثہ اور کرز جب نجران سے مدینہ منورہ چلے آ رہے تھے تو راستے میں کرز کے گھوڑے کو کہیں ٹھوکر لگی تو اس نے کہا: ''تَعِسَ الْاَبْعَدُ'' (ہلاک ہو جائے وہ دور والا یعنی جس کی طرف ہم جا رہے ہیں)۔ اُس کا اشارہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف تھا۔ اس پر اس کے بڑے بھائی ابوحارثہ نے کہا ''بَلْ تَعِسَتْ اُمُّكَ'' (بلکہ تیری ماں ہلاک ہو جائے!) اُس نے کہا میرے بھائی! تمہیں میری بات اس قدر بُری کیوں لگی؟ ابوحارثہ نے کہا: اللہ کی قسم! یقیناً وہ وہی نبی اُمّی ہیں جس کے ہم منتظر تھے۔ کرز نے کہا: جب آپ یہ سب جانتے ہیں تو ان پر ایمان کیوں نہیں لے آتے؟ ابوحارثہ کہنے لگا: ان بادشاہوں نے ہمیں بڑا مقام و مرتبہ عطا کر رکھا ہے' اگر ہم ایمان لے آئے تو وہ ہم سے یہ سب کچھ چھین لیں گے۔ یہ لوگ سلطنتِ روما کے تحت تھے اور انہیں مصر کی حکومت کی طرف سے بڑی مراعات حاصل تھیں' انہیں مال و دولت اور عزت و وجاہت حاصل تھی۔ ابھی یہ لوگ محمد عربی ﷺ سے ملاقات کے لیے جا رہے تھے تو یہ حال تھا' اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آنحضور ﷺ کی خدمت میں کئی روز گزارنے کے بعد مباہلہ سے راہِ فرار اختیار کر کے واپس جاتے ہوئے انہیں کس قدر یقین حاصل ہو گیا ہو گا کہ یہی وہ نبی آخر الزماں ﷺ ہیں جن کے وہ منتظر تھے۔ اس آیت میں ان کی اسی کیفیت کا ذکر ہے کہ ان کے دل گواہی دے چکے تھے کہ یہ رسولِ برحق (ﷺ) ہیں۔

﴿وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ﴾ ''اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں بھی آ چکی ہیں۔''

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۸۶﴾ ''اور اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

آیت ۸۷ ﴿اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝۸۷﴾ ''یہی وہ لوگ ہیں کہ جن کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ کی' فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت ہے۔''

آیت ۸۸ ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ﴾ ''اسی (لعنت) میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

﴿لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝۸۸﴾ ''ان کے عذاب میں کوئی تخفیف نہیں کی جائے گی اور نہ ہی ان کو کوئی مہلت ملے گی۔''

یہ الفاظ بھی سورۃ البقرۃ (آیات ۱۶۱۔۱۶۲) میں آ چکے ہیں۔

آیت ۸۹ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا﴾ ''سوائے اُن کے جو اس کے بعد توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں''

یعنی سچے دل سے ایمان لا کر عملِ صالح کی روش پر گامزن ہو جائیں۔

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۸۹﴾﴾ ''تو یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔''

توبہ کا دروازہ ابھی بند نہیں ہے۔

آیت ۹۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا﴾ ''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد' پھر وہ اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے''

یعنی حق کو پہچان لینے کے بعد' چاہے زبان سے مانا ہو یا نہ مانا ہو' پھر اگر وہ کفر کرتے ہیں یا زبان سے ماننے کے بعد مرتد ہو جاتے ہیں' اور پھر وہ اپنے کفر میں بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

﴿لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ﴾ ''اُن کی توبہ کبھی قبول نہیں ہوگی۔''

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾﴾ ''اور وہ تو یقیناً گمراہوں میں سے ہیں۔''

آیت ۹۱ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے اسی حال میں کہ وہ کافر تھے''

﴿فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۭ﴾ ''تو ان میں سے کسی سے زمین کی مقدار کے برابر سونا بھی فدیے میں قبول نہیں کیا جائے گا اگر وہ پیش کر سکے۔''

ظاہر ہے کہ یہ محال ہے' ناممکن ہے' لیکن یہ بات سمجھانے کے لیے کہ وہاں پر کوئی فدیہ نہیں ہے فرمایا کہ اگر ان میں سے کوئی زمین کے حجم کے برابر سونا دے کر بھی چھوٹنا چاہے گا تو نہیں چھوٹ سکے گا۔ یہ وہی بات ہے جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۳ اور آیت ۱۴۸ میں فرمائی گئی کہ اُس دن کسی سے کوئی فدیہ نہیں لیا جائے گا۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے لیے دردناک عذاب ہے''

﴿وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾﴾ ''اور نہیں ہوں گے ان کے لیے کوئی مدد کرنے والے۔''

آیات ۹۲ تا ۱۰۱

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَاۗءِيْلُ عَلٰي نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ۭ وَلِلّٰهِ عَلَي النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۭ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۣ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰي مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَاۗءُ ۭ وَمَا اللّٰهُ

الجزء الرابع (۴)

بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾

آیت ۹۲ ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ﴾ ''تم ہرگز نہیں پہنچ سکتے نیکی کے مقام کو جب تک کہ خرچ نہ کرو اس میں سے جو تمہیں پسند ہے۔''

آیۃ البر (البقرۃ: ۱۷۷) کے ضمن میں اس آیت کا حوالہ بھی آیا تھا کہ نیکی کے مظاہر میں سب سے بڑی اور سب سے مقدم شے انسانی ہمدردی ہے' اور انسانی ہمدردی میں اپنا وہ مال خرچ کرنا مطلوب ہے جو خود اپنے آپ کو محبوب ہو۔ ایسا مال جو ردّی ہو' دل سے اُتر گیا ہو' بوسیدہ ہو گیا ہو' اگر وہ کسی کو دے کر سمجھا جائے کہ ہم نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماردی ہے تو یہ بجائے خود حماقت ہے۔

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾﴾ ''اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے۔''

آیت ۹۳ ﴿كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ﴾ ''کھانے کی ساری چیزیں (جو شریعتِ محمدیؐ میں حلال ہیں) بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں''

﴿اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَاۗءِيْلُ عَلٰي نَفْسِهٖ مِنْ قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ﴾ ''سوائے اُن چیزوں کے جنہیں اسرائیل (حضرت یعقوبؑ) نے حرام ٹھہرالیا تھا اپنی جان پر' اس سے پہلے کہ تورات نازل ہو۔''

یہودی شریعتِ محمدیؐ پر اعتراض کرتے تھے کہ اس میں بعض ایسی چیزیں حلال قرار دی گئی ہیں جو شریعتِ موسویؑ میں حرام تھیں۔ مثلاً ان کے ہاں اونٹ کا گوشت حرام تھا' لیکن شریعتِ محمدیؐ میں یہ حرام نہیں ہے۔ اگر یہ بھی آسمانی شریعت ہے تو یہ تغیر کیسے ہو گیا؟ یہاں اس کی حقیقت بتائی جا رہی ہے کہ تورات کے نزول سے قبل حضرت یعقوب علیہ السلام نے طبعی کراہت یا کسی مرض کے باعث بعض چیزیں اپنے لیے ممنوع قرار دے لی تھیں جن میں اونٹ کا گوشت بھی شامل تھا۔ جیسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دو ازواج کی دلجوئی کی خاطر (ایک خاص قسم کا) شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی' جس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۭ﴾ (التحریم: ۱) ''اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ کیوں حرام ٹھہرا رہے ہیں (اپنے اوپر) وہ شے جو اللہ نے آپ کے لیے حلال کی ہے؟ آپ چاہتے ہیں اپنی بیویوں کی رضاجوئی!'' حضرت یعقوبؑ کی اولاد نے بعد میں ان چیزوں کو حرام سمجھ لیا' چنانچہ یہ چیز ان کے ہاں رواج کے طور پر حرام چلی آ رہی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان چیزوں کی حرمت تورات میں نازل نہیں ہوئی۔ کھانے پینے کی وہ تمام چیزیں جو اسلام نے حلال کی ہیں وہ بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں' سوائے اُن چیزوں کے کہ جنہیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی ذاتی ناپسند کے باعث اپنے اوپر حرام ٹھہرالیا تھا' اور یہ بات تورات کے نزول سے بہت پہلے کی ہے۔ اس لیے کہ حضرت یعقوبؑ میں اور نزولِ تورات میں چار پانچ سو سال کا فصل ہے۔

﴿قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾﴾ ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے) کہیے لاؤ تورات اور اس کو پڑھو اگر تم (اپنے اعتراض میں) سچے ہو۔''

تورات کے اندر تو کہیں بھی اونٹ کے گوشت کی حرمت مذکور نہیں ہے۔

آیت ﴿فَمَنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾﴾ ''پس جو لوگ اس کے بعد بھی اللہ کی طرف جھوٹ منسوب کرتے رہیں تو یہی لوگ ظالم ہیں۔''

آیت ﴿قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۠﴾ ''کہہ دیجیے اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے''

﴿فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ﴾ ''پس پیروی کرو ملّتِ ابراہیم کی جو یکسو تھے (یا یکسو ہو کر!)''

''حَنِیْفًا'' ابراہیم کا حال ہے۔ اگر اسے ''اِتَّبِعُوْا'' کا حال (بمعنی حَنِیْفِیْنَ) مانا جائے تو دوسرا ترجمہ یوں ہوگا کہ یکسو ہو کر' بعد کی تمام تقسیمات سے بلند تر ہو کر' ابراہیمؑ کے طریقے کی پیروی کرو!

﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۹۵﴾﴾ ''اور وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔''

آیت ﴿اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ﴾ ''یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا (اللہ کی عبادت کے لیے) وہی ہے جو مکّہ میں ہے''

''بَکَّة'' اور ''مَکَّة'' درحقیقت ایک ہی لفظ کے لیے دو تلفظ (pronunciations) ہیں۔

﴿مُبٰرَكًا وَّهُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۶﴾﴾ ''برکت والا ہے اور ہدایت کا مرکز ہے تمام جہان والوں کے لیے۔''

آیت ﴿فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ﴾ ''اس میں بڑی واضح نشانیاں ہیں' جیسے مقامِ ابراہیمؑ۔''

سورۃ البقرۃ کے نصفِ اوّل کے آخری چار رکوعوں (۱۵' ۱۶' ۱۷' ۱۸) میں پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کا ذکر ہے' پھر باقی گفتگو ہے۔ یہاں سورۂ آل عمران کے نصفِ اوّل کے تیسرے حصے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کا تذکرہ آخر میں آیا ہے۔ گویا مضامین وہی ہیں' ترتیب بدل گئی ہے۔

﴿وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ﴾ ''اور جو بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے امن میں آ جاتا ہے۔''

جاہلیت کے بدترین دور میں بھی بیت اللہ امن کا گہوارہ تھا۔ پورے عرب کے اندر خونریزی ہوتی تھی' لیکن حرم کعبہ میں اگر کوئی اپنے باپ کے قاتل کو بھی دیکھ لیتا تھا تو اسے کچھ نہیں کہتا تھا۔ حرم کی یہ روایات ہمیشہ سے رہی ہیں اور آج تک یہ اللہ کے فضل و کرم سے دارالامن ہے کہ وہاں پر امن ہی امن ہے۔

﴿وَلِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ﴾ ''اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر کہ وہ حج کریں اُس کے گھر کا' جو بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے سفر کی۔''

﴿وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۹۷﴾﴾ ''اور جس نے کفر کیا تو (وہ جان لے کہ) اللہ بے نیاز ہے تمام جہان والوں سے۔''

نوٹ کیجیے کہ یہاں لفظ ''کَفَرَ'' آیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کوئی استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتا وہ گویا کفر کرتا ہے۔ اگلی آیات میں اہلِ کتاب کو بڑے تیکھے اور جھنجوڑنے کے انداز میں مخاطب کیا جا رہا ہے' جیسے کسی پر نگاہیں گاڑ کر اس سے بات کی جائے۔

آیت ﴿قُلْ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۙ﴾ ''کہہ دیجیے اے اہلِ کتاب! تم کیوں اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہو؟''

﴿وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾﴾ ''جبکہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ﴾ ''کہہ دیجیے اے کتاب والو! تم کیوں روکتے ہو اللہ کے راستے سے اُس کو جو ایمان لے آتا ہے''

﴿تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا﴾ ''تم اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہو''

تم چاہتے ہو کہ جو اہلِ ایمان ہیں وہ بھی ٹیڑھے راستے پر چلیں۔ چنانچہ تم سازشیں کرتے ہو کہ صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو کافر ہو جاؤ تاکہ اہلِ ایمان کے دلوں میں بھی وسوسے اور دغدغے پیدا ہو جائیں۔

﴿وَاَنْتُمْ شُهَدَآءُ﴾ ''حالانکہ تم خود گواہ ہو!''

تم راہِ راست کو پہچانتے ہو اور جو کچھ کر رہے ہو جانتے بوجھتے کر رہے ہو۔

﴿وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾﴾ ''اور اللہ غافل نہیں ہے اس سے جو تم کر رہے ہو۔''

لیکن ان تمام سازشوں کے جواب میں اہلِ ایمان سے فرمایا گیا ہے:

آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾ ''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اگر تم ان اہلِ کتاب کے کسی گروہ کی بات مان لو گے تو یہ تم کو تمہارے ایمان کے بعد پھر کفر کی حالت میں لوٹا کر لے جائیں گے۔''

آیت ﴿وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ﴾ ''اور (ذرا سوچو تو سہی) یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم پھر کفر کرنے لگو جبکہ تمہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے اندر اُس کا رسول موجود ہے۔''

تمہارے درمیان جناب محمد رسول اللہ ﷺ بنفسِ نفیس تمہاری راہنمائی کے لیے موجود ہیں اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی آیات پڑھ پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مدینہ میں علماءِ یہود کا کتنا اثر تھا۔ اوس اور خزرج کے لوگ ان سے مرعوب تھے کیونکہ یہ اَن پڑھ لوگ تھے' ان کے پاس کوئی کتاب' کوئی شریعت اور کوئی قانون نہیں تھا' جبکہ یہود صاحبِ کتاب اور صاحبِ شریعت تھے' ان کے ہاں علماء تھے۔ لہٰذا اوس اور خزرج کے جو لوگ اسلام لے آئے تھے ان کے بارے میں اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں یہود کی ریشہ دوانیوں کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس قسم کے خطرے سے بچنے کی تدبیر بھی بتا دی گئی:

﴿وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''اور جو کوئی اللہ سے چمٹ جائے اُس کو تو ہدایت ہو گئی صراطِ مستقیم کی طرف۔''

جو کوئی اللہ کی پناہ میں آ جائے' اللہ کا دامن مضبوطی سے تھام لے اُسے تو ضرور صراطِ مستقیم کی ہدایت ملے گی اور وہ ضلالت و گمراہی کے خطرات سے محفوظ ہو جائے گا۔ جیسے شیر خوار بچے کو کوئی خطرہ محسوس ہو تو وہ دوڑ کر آئے گا اور اپنی ماں کے ساتھ چمٹ جائے گا۔ اب وہ یہ سمجھے گا کہ میں مضبوط قلعہ میں آ گیا ہوں' اب مجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ نہیں جانتا کہ ماں بے چاری تمام خطرات سے اس کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ اسے کیا پتا کہ کب کوئی درندہ صفت انسان اسے ماں کی گود سے کھینچ کر اُچھالے اور کسی بلم یا نیزے کی اَنی میں پرو دے۔ بہرحال بچہ تو یہی سمجھتا ہے کہ اب میں ماں کی گود میں آ گیا ہوں تو محفوظ پناہ میں آ گیا ہوں۔ بہرحال اللہ کا دامن واقعتاً محفوظ

پناہ گاہ ہے اور جو کوئی اس کے ساتھ چمٹ جاتا ہے وہ گمراہی کی ٹھوکروں سے محفوظ ہو جاتا ہے اور جادۂ مستقیم پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ! آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ!!

آیات ۱۰۲ تا ۱۰۹

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا
بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ
قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ
كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ یَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَیْرِ
وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا
كَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۙ﴿۱۰۵﴾
یَّوْمَ تَبْیَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۫ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ
اِیْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِیْنَ ابْیَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِیْ رَحْمَةِ
اللّٰهِ ؕ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا
لِّلْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ ع ۱۱

اب سورۂ آل عمران کا نصف ثانی شروع ہو رہا ہے جس کا پہلا حصہ دو رکوعوں پر مشتمل ہے۔ آپ نے یہ مشابہت بھی نوٹ کر لی ہو گی کہ سورۃ البقرۃ کے نصفِ اوّل میں بھی ایک مرتبہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے خطاب تھا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ﴾ اسی طرح سورۂ آل عمران کے نصفِ اوّل میں بھی ایک آیت آ چکی ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تُطِیْعُوْا فَرِیْقًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ یَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِیْمَانِكُمْ كٰفِرِیْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾ لیکن مسلمانوں سے اصل خطاب گیارہویں رکوع سے شروع ہو رہا ہے اور یہاں پر اصل میں اُمت کو ایک سہ نکاتی لائحہ عمل دیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اُمت اب قیامت تک قائم رہنے والی ہے۔ قیامت تک اس نے ہر طرح کے نشیب و فراز سے گزرنا ہے۔ اس میں زوال بھی آئے گا اور اللہ تعالیٰ اولوالعزم اور باہمت لوگوں کو بھی پیدا کرے گا' جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ مجددین اُمت ہر صدی کے اندر اٹھتے رہے۔ لیکن جب بھی تجدید دین کا کوئی کام ہو' دین کو از سرِ نو تر و تازہ کرنے کی کوشش ہو' دین کو قائم کرنے کی جدّوجہد ہو تو اُس کا ایک لائحہ عمل ہو گا۔ وہ لائحہ عمل سورۂ آل عمران کی ان تین آیات (۱۰۲' ۱۰۳' ۱۰۴) میں نہایت جامعیت کے ساتھ بتا دیا گیا ہے۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ ایسی ہی تین جامع آیات سورۃ العصر کی بھی ہیں۔ ان آیات کے مضامین پر میری ایک کتاب بھی موجود ہے ''اُمتِ مُسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل'' اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس لائحہ عمل کا پہلا نکتہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی کام کرنا ہے تو سب سے پہلے افراد کی شخصیت سازی' کردار سازی کرنا ہو گی۔ چنانچہ فرمایا:

نکتہ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جتنا کہ اُس کے تقویٰ کا حق ہے''

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''اور تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر فرمانبرداری کی حالت میں۔''

قرآن مجید میں تقویٰ کی تلقین کے لیے یہ سب سے گاڑھی آیت ہے۔ اس پر صحابہؓ گھبرا گئے کہ یارسول اللہ ﷺ! اللہ کے تقویٰ کا حق کون ادا کر سکتا ہے؟ پھر جب سورۃ التغابن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ (آیت ۱۶) ''اپنی امکانی حد تک اللہ کا تقویٰ اختیار کرو'' تب ان کی جان میں جان آئی۔ تقویٰ کے حکم کے ساتھ ہی یہ فرمایا کہ ''مت مرنا مگر حالتِ فرمانبرداری میں''۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی پتا نہیں کس لمحے موت آ جائے' لہٰذا تمہارا کوئی لمحہ نافرمانی میں نہ گزرنے پائے' مبادا موت کا ہاتھ اُسی وقت آ کر تمہیں دبوچ لے۔ واضح رہے کہ اگر پہلے اس طرح کی شخصیتیں نہ بنی ہوں تو اجتماعی اصلاح کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ اس لیے پہلے مرحلے کے طور پر یہاں افراد کی کردار سازی پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ایک اجتماعیت اختیار کرو۔

آیت ۱۰۳ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ ''اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔''

یاد رہے کہ اس سے پہلے آیت ۱۰۱ ان الفاظ پر ختم ہوئی ہے: ﴿وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''اور جو کوئی اللہ تعالیٰ سے چمٹ جائے (اللہ کی حفاظت میں آ جائے) اُس کو تو ہدایت ہو گئی صراطِ مستقیم کی طرف''۔ سورۃ الحج کی آخری آیت میں بھی یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ ''اور اللہ سے چمٹ جاؤ!'' اب غور طلب نکتہ یہ ہے کہ اللہ کی حفاظت میں کیسے آیا جائے؟ اور یہ کہ اللہ سے چمٹنے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کی وضاحت ان الفاظ میں ہے: ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ﴾ کہ اللہ کی رسّی سے چمٹ جاؤ' اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔ اور یہ اللہ کی رسّی کون سی ہے؟ متعدد احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ''قرآن'' ہے۔ یعنی اللہ کے قرب کے لیے ضروری ہے کہ ایک طرف انسان میں تقویٰ پیدا ہو' اور دوسری طرف قرآن کے نظریات اور قرآن کی حکمت کا فہم۔ ظاہر ہے انسانوں میں اجتماعیت جانوروں کے گلوں کی طرح نہیں ہو سکتی کہ بھیڑ بکریوں کا ایک بڑا ریوڑ ہے اور ایک چرواہا ایک لکڑی لے کر سب کو ہانک رہا ہے۔ انسانوں کو جمع کرنا ہے تو ان کے ذہن ایک جیسے بنانے ہوں گے' ان کی سوچ ایک بنانی ہو گی۔ انسان حیوانِ عاقل ہے' شعور رکھتا ہے۔ چنانچہ مختلف انسانوں کی اجتماعیت تبھی ممکن ہے جب ان کی سوچ ایک ہو' ان کے نظریات اور مقاصد ایک ہوں۔ اس کے لیے وہ چیز چاہیے جو اُن میں یک رنگیٔ خیال' یک رنگیٔ نظر اور مقاصد کی ہم آہنگی پیدا کر دے' اور وہ چیز قرآن ہے' جو ''حبل اللہ'' ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں قرآن حکیم کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں: ((وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ))[۷] ''اور وہ اللہ سے تعلق کا مضبوط وسیلہ ہے''۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا: ((كِتَابُ اللّٰهِ ' حَبْلٌ مَمْدُوْدٌ مِنَ السَّمَاءِ اِلَى الْاَرْضِ))[۸] ''اللہ کی کتاب (کو تھامے رکھنا)' یہی وہ مضبوط رسّی ہے جو آسمان سے زمین تک تنی ہوئی ہے''۔ ایک اور موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَبْشِرُوْا اَبْشِرُوْا ... فَاِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ سَبَبٌ' طَرَفُهٗ بِيَدِ اللّٰهِ وَطَرَفُهٗ بِاَيْدِيْكُمْ))[۹] ''خوش ہو جاؤ' خوشیاں مناؤ..... یہ قرآن ایک واسطہ ہے' جس کا

۷۔ سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ماجاء فی فضل القرآن۔

۸۔ سنن الترمذی' کتاب المناقب' باب مناقب اهل بیت النبی ﷺ۔

۹۔ مصنف ابن ابی شیبه' کتاب فضائل القرآن' باب فی التمسک بالقرآن۔

ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا تمہارے ہاتھ میں ہے''۔ چنانچہ قرآن تقرب الی اللہ کا وسیلہ بھی ہے اور مسلمانوں کو آپس میں جوڑ کر رکھنے کا ذریعہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری (تنظیم اسلامی کی) دعوت وتحریک کی فکر کا منبع وسرچشمہ اور مبنیٰ ومدار قرآن ہے' بلکہ ہماری دعوت کا تو عنوان ہی ''دعوت رجوع الی القرآن'' ہے۔ میں نے اپنی پوری زندگی الحمد للہ اسی کام میں کھپائی ہے اور اسی کے ذریعہ سے انجمن ہائے خدام القرآن اور قرآن اکیڈمیز کا سلسلہ قائم ہوا۔ ان اکیڈمیز میں ''ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس'' برسہا برس سے جاری ہے۔ اس کورس میں جدید تعلیم یافتہ لوگ داخلہ لیتے ہیں' جو ایم اے/ایم ایس سی ہوتے ہیں' بعض پی ایچ ڈی کر چکے ہوتے ہیں' ڈاکٹر اور انجینئر بھی آتے ہیں۔ اس کورس میں ایک سال لگا کر یہ لوگ بنیادی طور پر عربی سیکھتے ہیں تاکہ قرآن کو سمجھ سکیں۔ ظاہر ہے جب قرآن مجید کے ساتھ آپ کی وابستگی ہوگی تو تبھی آپ دین کے درست رُخ پر آگے چل سکیں گے۔ تو ان آیات میں دوسرا نکتہ یہ بتایا گیا کہ اللہ کی رسی کو مل جل کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً﴾ ''اور ذرا یاد کرو اللہ کا جو انعام تم پر ہوا جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے''

﴿فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''تو اللہ نے تمہارے دلوں کے اندر اُلفت پیدا کر دی''

﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ﴾ ''پس تم اللہ کے فضل وکرم سے بھائی بھائی بن گئے۔''

یہاں اوّلین مخاطب انصار ہیں۔ ان کے جو دو قبیلے تھے اوس اور خزرج وہ آپس میں لڑتے آ رہے تھے۔ سو برس سے خاندانی دشمنیاں چلی آ رہی تھیں اور قتل کے بعد قتل کا سلسلہ جاری تھا۔ لیکن جب اسلام آ گیا' اللہ کی کتاب آ گئی' محمد رسول اللہ ﷺ آ گئے اور دلوں میں ایمان آ گیا تو اب وہ شیر وشکر ہو گئے' ان کے جھگڑے ختم ہو گئے۔ اسی طرح اسلام کی وجہ سے پورے عرب کے اندر غارت گری کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اللہ نے اسے دارالامن بنا دیا۔

﴿وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ ''اور تم تو آگ کے گڑھے کے کنارے تک پہنچ گئے تھے'' (بس اس میں گرنے ہی والے تھے)

﴿فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ﴾ ''تو اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔''

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝۱۰۳﴾ ''اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات واضح کر رہا ہے تاکہ تم راہ پاؤ (اور صحیح راہ پر قائم رہو)۔''

گزشتہ دو آیات میں اُمّتِ مُسلمہ کے لیے سہ نکاتی لائحہ عمل کے دو نکتے بیان ہوئے ہیں' یعنی سب سے پہلے افراد کے کردار کی تعمیر کرنا' انہیں تقویٰ اور فرمانبرداری جیسے اوصاف سے متصف کرنا ——— اور پھر ان کو ایک جمعیت' تنظیم یا جماعت کی صورت میں قرآن کے معنوی محور کے گرد منظم کرنا' جو حبلُ اللہ ہے۔ بقول علامہ اقبال: ع اعتصامش کن کہ حبلُ اللہ اوست! (اس کو مضبوطی سے تھامو کہ یہی حبل اللہ ہے!) ایسی جماعت سازی کا فطری طریقہ ہم اسی سورت کی آیت ۵۲ کے ذیل میں پڑھ چکے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ داعی بن کر کھڑا ہو اور ﴿مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ کی آواز لگائے کہ میں تو اللہ کے راستے پر چل رہا ہوں' اب کون ہے جو میرے ساتھ اس راستے پر آتا ہے اور اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے؟ ایسی جمعیت جب وجود میں آئے گی تو وہ کیا کرے گی؟ اس ضمن میں

راہنمائی اگلی آیت میں فراہم کی گئی ہے:

آیت ۱۰۴ ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ﴾ ''اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیے جو خیر کی طرف دعوت دے' نیکی کا حکم دیتی رہے اور بدی سے روکتی رہے۔''

اس آیت میں اس جماعت کے کرنے کے تین کام بتائے گئے ہیں' جن میں اوّلین دعوت الی الخیر ہے' اور اس ضمن میں یہ نکتہ واضح رہے کہ سب سے بڑا خیر خود یہ قرآن ہے۔

یہاں لفظ ''مِنکُم'' بڑا معنی خیز ہے کہ تم میں سے ایک ایسی اُمت وجود میں آنی چاہیے۔ گویا ایک تو بڑی اُمت ہے اُمت ِمُسلمہ' وہ تو کروڑوں نفوس پر مشتمل ہے' ان میں سے اکثر خوابِ غفلت میں مدہوش ہیں' اپنے منصب کو بھولے ہوئے ہیں اور دین سے دور ہیں۔ لہٰذا اس اُمت کے اندر ایک چھوٹی اُمت یعنی ایک جماعت وجود میں آئے جو ''جاگو اور جگاؤ'' کا فریضہ سرانجام دے۔ یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے جاگنے کی توفیق دے دی ہے' وہ اب اوروں کو جگائیں' ایک منظم جماعت بنائیں اور غلبۂ دین کی تحریک کے لیے طاقت فراہم کریں۔

﴿وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۱۰۴﴾ ''اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

یعنی وہ بڑی اُمت جو کروڑوں افراد پر مشتمل ہے وہ اگر یہ کام نہیں کرتی اور اس کے باوجود فلاح اور نجات کی اُمید رکھتی ہے تو یہ ایک اُمید موہوم ہے۔ فلاح پانے والے صرف یہ لوگ ہوں گے جو یہ تین کام کریں گے: (i) دعوت الی الخیر (ii) امر بالمعروف (iii) نہی عن المنکر۔ میں نے ''منہج انقلابِ نبویؐ'' کے مراحل و مدارج کے ضمن میں بھی یہ بات واضح کی ہے کہ اسلامی انقلاب کے لیے آخری اقدام بھی ''نہی عن المنکر بالید'' کی صورت میں ہوگا۔ اس کی سند اس حدیث سے ملتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے نہی عن المنکر کے تین مراتب بیان فرمائے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ' فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ' فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ' وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) (۱۰)

''تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ اسے زورِ بازو سے روک دے۔ پس اگر اس کی طاقت نہیں ہے تو زبان سے روکے۔ پھر اگر اس کی بھی ہمت نہیں ہے تو دل میں برائی سے نفرت ضرور رکھے۔ اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

اگر دل میں نفرت بھی ختم ہوگئی ہے تو سمجھ لو کہ متاعِ ایمان رخصت ہوگئی ہے۔ بقولِ اقبال: ؎

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا!

لیکن اگر دل میں نفرت موجود ہے تو پھر اگلا قدم بھی اٹھاؤ۔ یعنی زبان سے کہنا شروع کرو کہ بھائی یہ چیز غلط ہے' اللہ نے اس کو حرام ٹھہرایا ہے' یہ کام مت کرو۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک منظم جماعت بنانے کی کوشش کرتے رہو۔ افرادی قوت کو مجتمع کرو اور جب خاطر خواہ حد تک طاقت جمع ہو جائے تو پھر کھڑے ہو جاؤ کہ اب ہم یہ غلط کام نہیں ہونے دیں گے۔ یہ ہے ''نہی عن المنکر بالید'' کی ممکنہ صورت یعنی طاقت کے ساتھ برائی کو روکنے کا ایک طریقہ۔ اور یہ ہوگا انقلاب کی جدّوجُہد کا آخری مرحلہ۔

۱۰۔ صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان کون النھی عن المنکر من الایمان۔

تو ان تین آیات کے اندر اسلامی انقلاب کا پورا لائحہ عمل موجود ہے' بلکہ اسی میں منہجِ انقلاب نبوی ﷺ کا جو آخری اقدامی عمل ہے وہ بھی پوشیدہ ہے۔

آیت ۱۰۵ ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ﴾ ''اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور انہوں نے اختلاف پیدا کر لیے اس کے بعد کہ ان کے پاس واضح تعلیمات آ گئی تھیں۔''

﴿وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۙ﴾ ''اور ان ہی لوگوں کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

آیت ۱۰۶ ﴿يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ﴾ ''(قیامت کے دن) جس دن بعض چہرے بڑے روشن اور تابناک ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ ہوں گے۔''

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۫﴾ ''تو جن لوگوں کے چہرے سیاہ ہوں گے (ان سے پوچھا جائے گا)''

﴿اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ﴾ ''کیا تم اپنے ایمان کے بعد کفر میں لوٹ گئے تھے؟''

ہدایت کے آنے کے بعد تم لوگ تفرقے میں پڑ گئے تھے اور تم نے حبل اللہ کو چھوڑ دیا تھا؟

﴿فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۱۰۶﴾ ''تو اب عذاب کا مزہ چکھو اُس کفر کے باعث جو تم کرتے رہے تھے۔''

آیت ۱۰۷ ﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور جن کے چہرے روشن اور تابناک ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے۔''

﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۱۰۷﴾ ''وہ اسی میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

آیت ۱۰۸ ﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ﴾ ''یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں حق کے ساتھ۔''

﴿وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۱۰۸﴾ ''اور اللہ تعالیٰ تو جہان والوں کے لیے ظلم کا ارادہ نہیں رکھتا۔''

لوگ اپنے اوپر خود ظلم کرتے ہیں' خود غلط راستے پر پڑتے ہیں اور پھر اس کی سزا انہیں دنیا اور آخرت میں بھگتنی پڑتی ہے۔

آیت ۱۰۹ ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔''

﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۱۰۹﴾ ''اور بالآخر سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹا دیے جائیں گے۔''

قرآن حکیم میں اہم مباحث کے بعد اکثر اس طرح کی آیات آتی ہیں۔ یہ گویا concluding remarks ہوتے ہیں۔

آیات ۱۱۰ تا ۱۲۰

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۱۱۰ لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۱۱۱ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ

اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ
بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ لَيْسُوْا سَوَاۗءً ۭ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ
قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ
الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ
حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ
الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ
قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـــًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝ ع ۱۲

آیت ۱۱۰ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ ''تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے برپا کیا گیا ہے''

یہاں اُمتِ مُسلمہ کی غرضِ تاسیس بیان کی جا رہی ہے' یعنی یہ پوری اُمتِ مُسلمہ اس مقصد کے لیے بنائی گئی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے آج اُمتِ مُسلمہ اپنا مقصدِ حیات بھول چکی ہے۔ اس صورت حال میں ضروری ہے کہ اُمت میں سے جو لوگ جاگ جائیں وہ دوسروں کو جگا کر ''اُمت کے اندر ایک اُمت'' (Ummah within Ummah) بنانے اور مذکورہ بالا تین کام سرانجام دینے کی کوشش کریں۔

قبل ازیں ہم سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۴۳ میں اُمتِ مُسلمہ کا فرضِ منصبی بایں الفاظ پڑھ چکے ہیں: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۭ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) اسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسولؐ تم پر گواہ ہو''۔ سورۂ آل عمران کی آیت زیر مطالعہ اسی کے ہم وزن اور ہم پلّہ آیت ہے۔ فرمایا: ''تم بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا ہے''۔ دنیا کی دیگر قومیں اپنے لیے زندہ رہتی ہیں۔ ان کے پیش نظر اپنی ترقی' اپنی بہتری' اپنی بہبود اور دنیا میں اپنی عزّت و عظمت ہوتی ہے' لیکن تم وہ بہترین اُمت ہو جسے لوگوں کی راہنمائی کے لیے مبعوث کیا گیا ہے: ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!

گویا ایک مسلمان کی زندگی کا مقصد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہدایت کی طرف بلانے اور جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرنا ہے۔ تو

اے مسلمانو! تمہیں جینا ہے لوگوں کے لیے‘ جبکہ لوگ جیتے ہیں اپنے لیے۔

﴿تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ’’تم حکم کرتے ہو نیکی کا‘‘

﴿وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ’’اور تم روکتے ہو بدی سے‘‘

﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر۔‘‘

ظاہر ہے نبی اکرم ﷺ کے دور میں تو پوری اُمّتِ مُسلمہ کی یہ کیفیت تھی۔ چنانچہ امت میں سے ایک جماعت وجود میں لانے کا حکم (آیت ۱۰۴) اُس وقت کے لیے ہے جب اُمّت اپنے مقصدِ وجود کو بھول گئی ہو۔ یعنی ایسے حالات میں جن کو ہوش آ جائے وہ دوسروں کو جگائیں اور اس طرح ایک جمعیت فراہم کریں۔

﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ﴾ ’’اور اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لے آتے تو یہ ان کے حق میں بہتر تھا۔‘‘

﴿مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ’’ان میں سے کچھ تو ایمان والے ہیں‘‘

اس سے مراد یہود و نصاریٰ کے وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو اُس وقت تک ایمان لا چکے تھے‘ اور وہ بھی جن کے اندر بِالقُوّہ (potentially) ایمان موجود تھا اور اللہ کو معلوم تھا کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد ایمان لے آئیں گے۔

﴿وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۱۰﴾ ’’لیکن ان کی اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔‘‘

ایسا ہی معاملہ آج اُمّتِ مُسلمہ کا بھی ہو چکا ہے۔ آج اُمّت کی اکثریت کا جو حال ہے وہ سب کو معلوم ہے۔

آیت ۱۱۱ ﴿لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّاۤ اَذًى ؕ﴾ ’’(اے مسلمانو!) یہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے سوائے تھوڑی سی کوفت کے۔‘‘

یہ تمہارے خلاف تھوڑی بہت زبان درازی ضرور کرتے رہیں گے اور اس طرح تمہارے لیے کوفت کا سبب بنتے رہیں گے‘ لیکن بالفعل تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے۔

﴿وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۫﴾ ’’اور اگر یہ تم سے جنگ کریں گے تو پیٹھ دکھا دیں گے۔‘‘

اب ان میں تمہارے مقابلے کی جرأت نہیں ہے‘ یہ بزدل ہیں‘ تمہارے مقابلے میں آئیں گے بھی تو ٹھہر نہیں پائیں گے۔

﴿ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ۝۱۱۱﴾ ’’پھر ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔‘‘

یہ ایسے بے بس ہوں گے کہ ان کو کہیں سے مدد بھی نہیں مل سکے گی۔

آیت ۱۱۲ ﴿ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْۤا﴾ ’’ان کے اوپر ذلّت تھوپ دی گئی ہے جہاں کہیں بھی پائے جائیں‘‘

﴿اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ﴾ ’’سوائے یہ کہ (انہیں کسی وقت) اللہ کا کوئی سہارا حاصل ہو جائے یا لوگوں کی طرف سے کوئی سہارا مل جائے‘‘

جیسے آج پوری عیسائی دنیا یہودیوں کا سہارا بنی ہوئی ہے۔ اسرائیل اپنے بل پر نہیں‘ بلکہ عیسائی دنیا کی پشت پناہی کی وجہ سے قائم ہے۔ خلیج کی جنگ میں اتحادی افواج کے کمانڈر انچیف نے صاف کہہ دیا تھا کہ یہ ساری جنگ ہم نے اسرائیل کے تحفظ کے لیے لڑی ہے۔ گویا اس قدر خونریزی سے صرف اسرائیل کا تحفظ پیشِ نظر تھا۔

﴿وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ’’اور یہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہو گئے‘‘

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ﴾ ''اوران کے اوپر کم ہمتی مسلط کر دی گئی۔''

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے رہے''

﴿وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ ''اور انبیاء کو ناحق قتل کرتے رہے۔''

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ ''اور یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی روش اختیار کی اور حدود سے تجاوز کرتے رہے۔''

یاد رہے کہ یہ آیت تھوڑے سے لفظی فرق کے ساتھ سورۃ البقرۃ میں بھی گزر چکی ہے۔ (آیت ۶۱)

آیت ۱۱۳ ﴿لَيْسُوْا سَوَآءً﴾ ''یہ سب کے سب برابر نہیں ہیں۔''

ان میں اچھے بھی ہیں، بُرے بھی ہیں۔

﴿مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴿۱۱۳﴾﴾ ''اہلِ کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو (سیدھے راستے پر) قائم ہیں، رات کے اوقات میں اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خاص طور پر عیسائی راہبوں کی ایک کثیر تعداد اس کردار کی حامل تھی۔ ان ہی میں سے ایک بحیرہ راہب بھی تھا جس نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بچپن میں ہی پہچان لیا تھا۔ دوسری طرف یہود میں اُس وقت صرف اِکّا دُکّا لوگ اس طرح کے باقی تھے، جبکہ مجموعی طور پر ان میں یہ کردار ختم ہو چکا تھا۔

آیت ۱۱۴ ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''وہ ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور یوم آخر پر''

﴿وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ ''اور نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں''

﴿وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ﴾ ''اور نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

﴿وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۱۴﴾﴾ ''اور یقیناً یہ لوگ صالحین میں سے ہیں۔''

آیت ۱۱۵ ﴿وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ﴾ ''جو خیر بھی یہ کریں گے تو اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾﴾ ''اور اللہ ایسے متقی لوگوں سے خوب واقف ہے۔''

آیت ۱۱۶ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ ''(اس کے برعکس) جو لوگ کفر پر اڑ گئے ان کے کام نہیں آسکیں گے نہ ان کے اموال نہ ان کی اولاد اللہ سے بچانے میں کچھ بھی۔''

﴿وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ﴾ ''یہی لوگ جہنمی ہیں۔''

﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۱۶﴾﴾ ''اسی میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

آیت ۱۱۷ ﴿مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''دنیا کی اس زندگی میں یہ لوگ جو بھی خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے''

قریشِ مکہ اہلِ ایمان کے خلاف جو جنگی تیاریاں کر رہے تھے تو اس کے لیے وہ مال بھی خرچ کرتے تھے۔ ظاہر ہے اگر فوج تیار کرنی ہے تو اس کے لیے سواریاں بھی درکار ہوں گی اور سامانِ حرب وضرب کی ضرورت بھی ہوگی۔ اور اس سب کچھ کی فراہمی کے لیے

مال خرچ کرنا ہوگا۔ یہ کفار و مشرکین کے اس انفاقِ مال کی طرف اشارہ ہے جو یہ لوگ دنیا کی زندگی میں یا تو اسلام کی مخالفت کے لیے یا اپنے جی کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے خرچ کرتے ہیں کہ ہم کچھ صدقہ وخیرات بھی کرتے ہیں۔ تو ان کے اس انفاق کی مثال ایسی ہے:

﴿كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ﴾ ''کہ جیسے ایک زوردار آندھی جس میں پالا ہو''

﴿اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ؕ﴾ ''وہ کسی ایسی قوم کی کھیتی کو آ پڑے جس نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہو' پھر وہ اس (کھیتی) کو تباہ و برباد اور تہس نہس کر کے رکھ دے۔''

یعنی ان کی یہ نیکیاں' یہ انفاق' یہ جدّوجُہد اور دوڑ دھوپ سب کا سب بالکل ضائع ہو جانے والا ہے۔

﴿وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۷﴾﴾ ''اور ان پر اللہ نے کوئی ظلم نہیں کیا' بلکہ وہ اپنی جانوں پر خود ظلم ڈھا رہے ہیں۔''

آیت ۱۱۸ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اپنے سوا کسی کو اپنا رازدار نہ بناؤ''

یعنی جس شخص کے بارے میں اطمینان ہو کہ وہ صاحبِ ایمان ہے' مسلمان ہے' اس کے علاوہ کسی اور شخص کو اپنا بھیدی اور محرمِ راز نہ بناؤ۔ یہودی ایک عرصے سے مدینہ میں رہتے تھے اور اوس و خزرج کے لوگوں کی ان سے دوستیاں تھیں' پرانے تعلقات اور روابط تھے۔ اس کی وجہ سے بعض اوقات سادہ لوح مسلمان اپنی سادگی میں راز کی باتیں بھی انہیں بتا دیتے تھے۔ اس سے انہیں روکا گیا۔

﴿لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ﴾ ''وہ تمہارے لیے کسی خرابی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔''

﴿وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ﴾ ''انہیں پسند ہے وہ چیز جو تمہیں تکلیف اور مشقت میں ڈالے۔''

﴿قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚ﴾ ''ان کی دشمنی ان کے مُنہ سے بھی ظاہر ہو چکی ہے۔''

ان کا کلام ایسا زہر آلود ہوتا ہے کہ اس سے اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی ٹپکی پڑتی ہے۔ یہ اپنی زبانوں سے آتش برساتے رہتے ہیں۔

﴿وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ﴾ ''اور جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔''

جو کچھ ان کی زبانوں سے ظاہر ہوتا ہے وہ تو پھر بھی کم ہے' ان کے دلوں کے اندر دشمنی اور حسد کی جو آگ بھڑک رہی ہے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

﴿قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾﴾ ''ہم نے تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح کر دیا ہے اگر تم عقل سے کام لو۔''

یعنی اپنے طرزِ عمل پر غور کرو اور اس سے باز آ جاؤ!

آیت ۱۱۹ ﴿هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ﴾ ''یہ تم ہی ہو کہ ان کو دوست رکھتے ہو''

یہ تمہاری شرافت اور سادہ لوحی ہے کہ تم ان سے محبت کرتے ہو اور پرانے تعلقات اور دوستیوں کو نبھانا چاہتے ہو۔

﴿وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ﴾ ''لیکن (جان لو کہ) وہ تو تم سے محبت نہیں کرتے''

وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے۔

﴿وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ﴾ ''حالانکہ (تمہاری شان یہ ہے کہ) تم پوری کتاب کو مانتے ہو۔''

تم تورات کو بھی مانتے ہو انجیل کو بھی مانتے ہو۔ سورۃ النساء میں تورات اور انجیل کے لیے نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ کے الفاظ آئے ہیں: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ ...﴾ (آیت ۴۴) ''کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا تھا.....'' چنانچہ تمام آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ کی اُس قدیم کتاب ''اُمُّ الکِتاب'' ہی کے حصے ہیں۔ اسی ''اُمُّ الکتاب'' میں سے پہلے تورات آئی' پھر انجیل آئی اور پھر یہ قرآن مجید آیا ہے' جو ہدایتِ کاملہ پر مشتمل ہے۔ تو اے مسلمانو! تم تو پوری کی پوری کتاب کو مانتے ہو۔

﴿وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ﴾ ''اور جب یہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی مؤمن ہیں۔''

﴿وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ﴾ ''اور جب وہ خلوت میں ہوتے ہیں تو تم پر غُصّہ کی وجہ سے اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔''

جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی کوششیں کامیاب نہیں ہو رہیں اور اسلام کا معاملہ مسلسل آگے سے آگے بڑھتا جا رہا ہے تو وہ غُصّے میں پیچ و تاب کھاتے ہیں اور اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔

﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ﴾ ''ان سے کہو مر جاؤ اپنے اس غم و غُصّہ میں۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۱۱۹﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ جو کچھ سینوں کے اندر مضمر ہے اس سے بھی واقف ہے۔''

آیت ۱۲۰ ﴿اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۚ﴾ ''(اے مسلمانو!) اگر تمہیں کوئی بھلائی پہنچ جائے تو وہ ان کو بُری لگتی ہے۔''

اگر تمہیں کوئی کامیابی حاصل ہو جائے' کہیں فتح نصیب ہو جائے تو اس سے ان کو تکلیف پہنچتی ہے۔

﴿وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ۭ﴾ ''اور اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچے تو اس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔''

اگر تمہیں کوئی گزند پہنچ جائے' کہیں عارضی طور پر شکست ہو جائے' جیسے اُحد میں ہو گئی تھی' تو وہ بڑے خوش ہوتے ہیں' شادیانے بجاتے ہیں۔

﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـــًٔا ۭ﴾ ''لیکن اگر تم صبر کرتے رہو اور تقویٰ کی روش اختیار کیے رہو تو ان کی یہ ساری چالیں تمہیں کوئی مستقل نقصان نہیں پہنچا سکیں گی۔''

سورۃ البقرۃ میں صبر اور صلوٰۃ سے مدد لینے کی تلقین کی گئی تھی' یہاں صلوٰۃ کی جگہ لفظ تقویٰ آ گیا ہے کہ اگر تم یہ کرتے رہو گے تو پھر بالآخر ان کی ساری سازشیں ناکام ہوں گی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝۱۲۰﴾ ''جو کچھ یہ کر رہے ہیں یقیناً اللہ تعالیٰ اُس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

یہ اللہ تعالیٰ کے دائرے سے اور اس کی طے کردہ حد سے آگے نہیں نکل سکتے۔ ان کی ساری اُچھل کود اور سازشیں اسی حد کے اندر رہیں گی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ ضمانت دے رہا ہے کہ یہ لوگ تمہیں کوئی مستقل نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔

آیات ۱۲۱ تا ۱۲۹

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۲۱ۙ اِذْ هَمَّتْ
طَّاۗىِٕفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۲۲ وَلَقَدْ

نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّ اَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ
اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ
تَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾
وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۚ وَ مَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ
الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ
مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا
فِي الْاَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع

یہاں سے سورۂ آل عمران کے نصفِ ثانی کے دوسرے حصے کا آغاز ہو رہا ہے' جو چھ رکوعات پر محیط ہے۔ یہ چھ رکوع مسلسل غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات اور ان پر تبصرے پر مشتمل ہیں۔ غزوۂ اُحد شوال ۳ھ میں پیش آیا تھا۔ اس سے پہلے رمضان ۲ھ میں غزوۂ بدر پیش آ چکا تھا' جس کا تذکرہ ہم سورۃ الانفال میں پڑھیں گے۔ اس لیے کہ ترتیبِ مصحف نہ تو ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے ہے اور نہ ہی ترتیبِ نزولی کے مطابق۔ غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بہت زبردست فتح عطا فرمائی تھی جبکہ کُفارِ مکہ کو اس غزوہ میں بڑی زک پہنچی تھی۔ ان کے ستر (۷۰) سربرآوردہ لوگ مارے گئے تھے' جن میں قریش کے تقریباً سارے بڑے بڑے سردار بھی شامل تھے۔ بلکہ مکہ کا شاید ہی کوئی گھر بچا ہو جس کا کوئی فرد غزوۂ بدر میں نہ مارا گیا ہو۔ یہی وجہ تھی کہ تمام اہلِ مکہ کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور ان کے انتقامی جذبات لاوے کی طرح کھول رہے تھے۔ چنانچہ ایک سال کے اندر اندر انہوں نے پوری تیاری کی اور تمام ساز و سامان جو وہ جمع کر سکتے تھے جمع کر لیا۔ ابوجہل غزوۂ بدر میں مارا جا چکا تھا اور اب قریش کے سب سے بڑے سردار ابوسفیان تھے۔ (ابوسفیان چونکہ بعد میں ایمان لے آئے تھے اور صحابیت کے مرتبے سے سرفراز ہوئے تھے لہٰذا ہم ان کا نام احترام سے لیتے ہیں۔) ابوسفیان تین ہزار جنگجوؤں کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھ دوڑے۔ اہلِ مکہ اپنی فتح یقینی بنانے کے لیے اس دفعہ اپنے بچوں اور خاص طور پر خواتین کو بھی ساتھ لے کر آئے تھے تاکہ ان کی غیرت اس احساس سے بیدار رہے کہ اگر کہیں میدان سے ان کے قدم اُکھڑ گئے تو ان کی عورتیں مسلمانوں کے قبضے میں چلی جائیں گی۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بھی لشکر کے ہمراہ تھی۔ (وہ بھی بعد میں فتح مکہ کے موقع پر ایمان لے آئی تھیں۔) غزوۂ بدر میں ہندہ کا باپ' بھائی اور چچا مسلمانوں کے ہاتھوں واصلِ جہنم ہو چکے تھے' لہٰذا اُس کے سینے کے اندر بھی انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔

اس موقع پر نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں ایک مشاورت منعقد فرمائی کہ اب کیا حکمتِ عملی اختیار کرنی چاہیے' جبکہ تین ہزار کا لشکر مدینہ پر چڑھائی کرنے آ رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا اپنا رجحان اس طرف تھا کہ اس صورت حال میں ہم اگر مدینہ میں محصور ہو کر مقابلہ کریں تو بہتر رہے گا۔ عجیب اتفاق ہے کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی بھی یہی رائے تھی۔ لیکن وہ لوگ جو بدر کے بعد ایمان لائے تھے اور وہ جو غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو پائے تھے ان میں سے خاص طور پر نوجوانوں کی طرف سے خصوصی جوش و خروش کا مظاہرہ ہو رہا تھا کہ ہمیں میدان میں نکل کر دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا چاہیے' ہمیں تو شہادت درکار ہے' ہمیں آخر موت سے کیا ڈر ہے؟ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

رسول اللہ ﷺ نے اُن کے جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے فیصلہ فرما دیا کہ دشمن کا کھلے میدان میں مقابلہ کیا جائے گا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ایک ہزار کی نفری لے کر مدینہ سے جبلِ اُحد کی جانب کوچ فرمایا' لیکن راستے ہی میں عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو آدمیوں کے ساتھ یہ کہہ کر واپس چلا گیا کہ جب ہمارے مشورے پر عمل نہیں ہوتا اور ہماری بات نہیں مانی جاتی تو ہم خواہ مخواہ اپنی جانیں جوکھوں میں کیوں ڈالیں؟ تین سو منافقین کے چلے جانے کے بعد اسلامی لشکر میں صرف سات سو افراد باقی رہ گئے تھے' جن میں کمزور ایمان والے بھی تھے۔ چنانچہ دامنِ اُحد میں پہنچ کر مدینہ کے دو خاندانوں بنو حارثہ اور بنو سلمہ کے قدم بھی تھوڑی دیر کے لیے ڈگمگائے اور انہوں نے واپس لوٹنا چاہا' لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو حوصلہ دیا اور اُن کے قدم جما دیے۔

اس کے بعد جنگ ہوئی تو اللہ کی طرف سے مدد آئی۔ اللہ نے لشکرِ اسلام کو فتح دے دی اور مشرکین کے قدم اکھڑ گئے۔ نبی اکرم ﷺ نے اُحد پہاڑ کو اپنی پشت پر رکھا تھا اور اس کے دامن میں صف بندی کی تھی۔ سامنے دشمن کا لشکر تھا۔ پہاڑ میں ایک درّہ تھا اور حضور ﷺ کو اندیشہ تھا کہ اگر اس درّے سے دشمن نے حملہ کر دیا تو ہم دو طرف سے گویا چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان آجائیں گے۔ لہٰذا آپ ﷺ نے اس درّہ پر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی امارت میں پچاس تیر انداز تعینات فرما دیے تھے اور انہیں تاکید فرمائی تھی یہاں سے مت ہلنا۔ چاہے تم دیکھو کہ ہم سب مارے گئے ہیں اور ہمارا گوشت چیلیں اور کوّے نوچ رہے ہیں تب بھی یہ جگہ مت چھوڑنا! لیکن جب مسلمانوں کو فتح ہو گئی تو درّے پر مامور حضرات میں اختلافِ رائے ہو گیا۔ ان میں سے اکثر نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں جو اتنی تاکید فرمائی تھی وہ تو شکست کی صورت میں تھی' اب تو فتح ہو گئی ہے' لہٰذا اب ہمیں بھی چل کر مالِ غنیمت جمع کرنے میں باقی سب لوگوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ وہاں کے لوکل کمانڈر تھے' وہ انہیں منع کرتے رہے کہ یہاں سے ہرگز مت ہٹو' رسول اللہ ﷺ کا حکم یاد رکھو۔ لیکن وہ تو حضور ﷺ کے حکم کی تاویل کر چکے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ۳۵ افراد درّہ چھوڑ کر چلے گئے اور صرف ۱۵ باقی رہ گئے۔

خالد بن ولید (جو اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے) مشرکین کی گھڑسوار فوج (cavalry) کے کمانڈر تھے۔ ان کی عقابی نگاہ نے دیکھ لیا کہ مسلمان لشکر کے عقب میں درہ خالی ہے۔ ان کی پیدل فوج (infantry) شکست کھا چکی تھی اور میدان میں بھگدڑ مچ چکی تھی۔ ایسے میں وہ اپنے دو سو گھڑسواروں کے دستے کے ساتھ اُحد پہاڑ کا چکر کاٹ کر اس درے کے راستے مسلمانوں کی پشت سے ان پر حملہ آور ہو گئے۔ درّے میں مسلمانوں کے صرف پندرہ تیر انداز باقی تھے' ان کے لیے دو سو گھڑسواروں کی یلغار کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ وہ مزاحمت کرتے ہوئے سب کے سب شہید ہو گئے۔ اس اچانک حملے سے یکلخت جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی۔ چنانچہ جنگ کے اس مرحلے میں ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ خود بھی زخمی ہو گئے۔ خود کی کڑیاں آپؐ کے رخسار میں گھس گئیں اور دو دندانِ مبارک بھی شہید ہو گئے۔ خون اتنا بہا کہ آپ ﷺ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ اسی اثناء میں یہ بھی مشہور ہو گیا کہ حضور ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ لیکن بعد میں جب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو پکارا تو لوگ ہمت کر کے جمع ہوئے۔ تب آپ ﷺ نے یہ فیصلہ کیا کہ اس وقت پہاڑ پر چڑھ کر بچاؤ کر لیا جائے۔ چنانچہ آپ تمام مسلمانوں کو لے کر کوہِ اُحد پر چڑھ گئے۔ اس موقع پر ابوسفیان اور خالد بن ولید کے مابین اختلافِ رائے ہو گیا۔ خالد بن ولید کا کہنا تھا کہ ہمیں ان کے پیچھے پہاڑ پر چڑھنا چاہیے اور انہیں ختم کر کے ہی دم لینا چاہیے۔ لیکن ابوسفیان بڑے حقیقت پسند اور زیرک شخص تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں' مسلمان اونچائی پر ہیں' وہ اوپر سے پتھر پھینکیں گے اور تیر برسائیں گے تو ہمارے لیے شدید جانی نقصان کا اندیشہ ہے۔ ہم نے بدر کا بدلہ لے لیا ہے' یہی بہت ہے۔ اس لیے اب ہمیں واپسی کی راہ لینی

چاہیے۔ چنانچہ مشرکین وہاں سے واپس چلے گئے۔ ان آیات کے مطالعہ سے قبل غزوۂ احد کے سلسلۂ واقعات کا یہ اجمالی خاکہ ذہن میں رہنا چاہیے۔

آیت ۱۲۱ ﴿وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) یاد کیجیے جبکہ صبح کو آپؐ اپنے گھر سے نکلے تھے اور مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں مامور کر رہے تھے۔''

یہ غزوۂ اُحد کی صبح حضور ﷺ کے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے سے باہر تشریف لانے اور جنگ کے میدان میں پہنچ کر مسلمانوں کی صف بندی کرنے کا ذکر ہے کہ آپؐ ایک ایک مورچے پر خود صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مامور کر رہے تھے۔

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾﴾ ''جبکہ اللہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔''

آیت ۱۲۲ ﴿اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ﴾ ''جبکہ تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے''

﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ﴾ ''حالانکہ اللہ ان کا پشت پناہ تھا۔''

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾﴾ ''اور اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے اہلِ ایمان کو۔''

جنگ کے آغاز سے پہلے انصار کے دو گھرانوں بنو حارثہ اور بنو سلمہ کے قدم وقتی طور پر ڈگمگا گئے تھے' بربنائے طبع بشری ان کے حوصلے پست ہونے لگے تھے اور انہوں نے واپسی کا ارادہ کر لیا تھا' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ثبات عطا فرمایا اور ان کے قدموں کو جما دیا۔ پھر ان کا ذکر قرآن میں کر دیا گیا۔ وہ لوگ اس پر فخر کیا کرتے تھے کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ﴿مِنْكُمْ﴾ اور ﴿وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ﴾ کے الفاظ میں کیا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ تین سو منافقین جو میدانِ جنگ سے چلے گئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ گویا وہ اس لائق بھی نہیں تھے کہ ان کا براہِ راست ذکر کیا جاتا۔ البتہ ان آیات کے آخر میں ان کا ذکر بالواسطہ طور پر (indirectly) آئے گا۔

آیت ۱۲۳ ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ﴾ ''اور اللہ نے تو تمہاری مدد بدر میں بھی کی تھی جبکہ تم بہت کمزور تھے۔''

غزوۂ بدر میں ایک ہزار مشرکین کے مقابلے میں اہلِ ایمان صرف تین سو تیرہ تھے' جبکہ ان سب کے پاس تلواریں بھی نہیں تھیں' بلکہ پورے لشکر میں کُل آٹھ تلواریں تھیں۔ کُفارِ مکہ ایک سو گھوڑوں کا رسالہ لے کر آئے تھے اور ادھر صرف دو گھوڑے تھے۔ اُدھر سات سو اونٹ تھے اور اِدھر ستر اونٹ تھے۔ اس سب کچھ کے باوجود اللہ کی مدد سے مسلمان اُن پر غالب آ گئے۔

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾﴾ ''تو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تا کہ تم اللہ کا (صحیح معنی میں) شکر ادا کر سکو۔''

آیت ۱۲۴ ﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾﴾

''(اے نبی ﷺ!) جب آپ کہہ رہے تھے اہلِ ایمان سے کہ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ تمہارا ربّ تمہاری مدد کرے تین ہزار فرشتوں سے جو آسمان سے اُترنے والے ہوں گے؟''

یعنی اے مسلمانو! اگر مقابلے میں تین ہزار کا لشکر آ گیا ہے تو کیا غم ہے۔ میں تمہیں خوشخبری دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کو آسمان سے تین ہزار فرشتے بھیجے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی اس خوشخبری کو' جو ایک طرح سے گویا استدعا بھی تھی' فوری طور پر شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور اس کی منظوری کا اعلان فرما دیا۔

آیت ۱۲۵ ﴿بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا﴾ ''کیوں نہیں (اے مسلمانو!) اگر تم صبر کرو گے اور

تقویٰ کی روش پر رہو گے اور اگر وہ فوری طور پر تم پر حملہ آور ہو جائیں''

﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿١٢٥﴾﴾ ''تو تمہارا ربّ تمہاری مدد کرے گا پانچ ہزار فرشتوں کے ذریعے سے جو نشان زدہ گھوڑوں پر آئیں گے۔''

آیت ۱۲۶ ﴿وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ﴾ ''اور اللہ نے اس کو نہیں بنایا مگر تمہارے لیے بشارت''

﴿وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ﴾ ''اور تا کہ تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔''

﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿١٢٦﴾﴾ ''ورنہ مدد تو ہوتی ہی اللہ کی طرف سے ہے جو غالب اور حکمت والا ہے۔''

یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت کے طور پر تمہارے دلوں کے اطمینان کے لیے تمہیں بتا دیا گیا ہے' ورنہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کو بھیجے بغیر بھی تمہاری مدد کر سکتا ہے' وہ ''کُن فیکون'' کی شان رکھتا ہے۔ تمہیں یہ بشارت تمہاری طبع بشری کے حوالے سے دی گئی ہے کہ اگر تین ہزار کی تعداد میں دشمن سامنے ہوا تو تمہاری مدد کو تین ہزار فرشتے اتر آئیں گے' اور اگر وہ فوری طور پر حملہ آور ہو گئے تو اللہ تعالیٰ پانچ ہزار فرشتے بھیج دے گا۔

آیت ۱۲۷ ﴿لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا﴾ ''(اور یہ مدد وہ تمہیں اس لیے دے گا) تا کہ کافروں کا ایک بازو کاٹ دے''

﴿اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَاۗىِٕبِيْنَ ﴿١٢٧﴾﴾ ''یا انہیں ذلیل کر دے کہ وہ خائب و خاسر ہو کر لوٹ جائیں۔''

ان آیات کے مطالعہ کے دوران یہ بات ذہن میں رہے کہ یہاں غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات کا ذکر اور ان پر تبصرہ زمانی ترتیب سے نہیں ہے۔ جیسا کہ سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ کا اپنے گھر سے نکل کر میدانِ جنگ میں مورچہ بندی کا ذکر ہوا۔ پھر اس سے پہلے کے حالات کے بارے میں بتایا گیا کہ جب خبریں پہنچی ہوں گی کہ تین ہزار کا لشکر مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے آ رہا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت کی خوشخبری دی ہوگی۔ اب اس جنگ کے دوران مسلمانوں سے جو کچھ خطائیں اور غلطیاں ہوئیں ان کی نشان دہی کی جا رہی ہے۔ خود آنحضور ﷺ سے بھی خطا کا ایک معاملہ ہوا' اس پر بھی گرفت ہے' بلکہ سب سے پہلے اسی معاملے کو لیا جا رہا ہے۔ جب آپ ﷺ شدید زخمی ہو گئے اور آپؐ پر بے ہوشی طاری ہو گئی' پھر جب ہوش آیا تو آپ ﷺ کی زبان پر یہ الفاظ آ گئے:

((كَيْفَ يُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْهَ نَبِيِّهِمْ بِالدَّمِ وَهُوَ يَدْعُوْهُمْ اِلَى اللّٰهِ))[11]

''یہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون سے رنگ دیا جبکہ وہ انہیں اللہ کی طرف بلا رہا تھا!''

تلوار کا وار آنحضور ﷺ کے رُخسار کی ہڈی پر پڑا تھا اور اس سے آپؐ کے دو دانت بھی شہید ہو گئے تھے۔ زخم سے یکدم خون کا فوارہ چھوٹ پڑا جس سے آپ ﷺ کا پورا چہرۂ مبارک لہولہان ہو گیا اور خون زیادہ مقدار میں بہہ جانے کی وجہ سے آپ ﷺ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ آپ ﷺ ہوش میں آئے تو زبانِ مبارک سے یہ الفاظ ادا ہو گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ...﴾ اے نبی ﷺ اس معاملے میں آپؐ کا کوئی اختیار نہیں ہے' آپؐ کا کام دعوت دینا اور تبلیغ کرنا ہے۔ لوگوں کی

۱۱۔ سنن ابن ماجه' كتاب الفتن' باب الصبر على البلاء۔ ومسند احمد: ۱۲۷۲۵۔ یہ حدیث صحیح مسلم اور سنن الترمذی میں بھی قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔

ہدایت اور ضلالت کے فیصلے ہم کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کا انداز دیکھئے کہ جس شخص کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ ہزیمت اٹھانا پڑی یعنی خالد بن ولید اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ ہی کی زبانِ مبارک سے اُسے ''سَیفٌ مِنْ سُیوفِ اللّٰہ'' (اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار) کا خطاب دلوا دیا۔

آیت ۱۲۸ ﴿لَیْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) اس معاملے میں آپ کو کوئی اختیار نہیں''

﴿اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ﴾ ''اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا انہیں عذاب دے''

یہ اللہ کے اختیار میں ہے' وہ چاہے گا تو ان کو توبہ کی توفیق دے دے گا' وہ ایمان لے آئیں گے' یا اللہ چاہے گا تو انہیں عذاب دے گا۔

﴿فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝۱۲۹﴾ ''اس لیے کہ وہ ظالم ہیں۔''

ان کے ظالم ہونے میں کوئی شبہ نہیں' لہٰذا وہ سزا کے حق دار تو ہو چکے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے اللہ انہیں ہدایت دے دے۔ دیکھئے' یہ وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ چند سال پہلے طائف میں رسول اللہ ﷺ سے جس طرح بدسلوکی کا مظاہرہ کیا گیا وہ آپؐ کی زندگی کا شدید ترین دن تھا۔ اس پر جبرائیل علیہ السلام نے آ کر کہا کہ یہ ملک الجبال حاضر ہے۔ یہ کہتا ہے کہ مجھے اللہ نے بھیجا ہے' آپؐ فرمائیں تو ان دونوں پہاڑوں کو ٹکرا دوں جن کے مابین وادی کے اندر یہ شہر طائف آباد ہے' تاکہ یہ سب پس جائیں' ان کا سُرمہ بن جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں! کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ان کی آئندہ نسلوں کو ہدایت دے دے۔ لیکن یہ وقت کچھ ایسا تھا کہ بر بنائے طبعِ بشری زبانِ مبارک سے وہ جملہ نکل گیا اور اس پر یہ آیت نازل ہو گئی۔ ظاہر ہے: ؎

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلْ

''بندہ بندہ ہی رہتا ہے چاہے کتنا ہی بلند ہو جائے' اور ربّ' ربّ ہی ہے چاہے کتنا ہی نزول فرما لے!''

آیت ۱۲۹ ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ﴾ ''اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔''

﴿یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ﴾ ''وہ جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۱۲۹﴾ ''اور اللہ غفور و رحیم ہے۔''

آیات ۱۳۰ تا ۱۴۳

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۪ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۱۳۰
وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْۤ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ۝۱۳۱ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝۱۳۲
وَسَارِعُوْۤا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ
لِلْمُتَّقِیْنَ ۝۱۳۳ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ
وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝۱۳۴ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ
فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۫ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۫ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَهُمْ
یَعْلَمُوْنَ ۝۱۳۵ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ

فِيهَا ۖ وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿١٣٦﴾ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿١٣٧﴾ هَٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿١٣٨﴾ وَلَا
تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣٩﴾ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ
الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَ
يَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٠﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ
الْكَافِرِينَ ﴿١٤١﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ
الصَّابِرِينَ ﴿١٤٢﴾ وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِن قَبْلِ أَن تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنتُمْ
ع ۱۴ ۵ تَنظُرُونَ ﴿١٤٣﴾

آیت ۱۳۰ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ۖ﴾ ''اے اہلِ ایمان! سُود مت کھاؤ دگنا چوگنا بڑھتا ہوا''

یہاں پر سود مرکب (compound interest) کا ذکر آیا ہے جو بڑھتا چڑھتا رہتا ہے۔ واضح رہے کہ شراب اور جوئے کی طرح سود کی حرمت کے احکام بھی تدریجاً نازل ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے سورۃ الروم (مکی سورت) میں انفاق فی سبیل اللہ اور سود کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر سود کی قباحت اور شناعت کو واضح کر دیا گیا: ﴿وَمَا آتَيْتُم مِّن رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُو عِندَ اللَّهِ ۖ وَمَا آتَيْتُم مِّن زَكَاةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ ﴿٣٩﴾﴾ ''اور جو کچھ تم دیتے ہو سود پر تاکہ بڑھتا رہے لوگوں کے مال میں تو اللہ کے ہاں اس میں کوئی بڑھوتری نہیں ہوتی' اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو (اور اس سے) اللہ کی رضا چاہتے ہو' تو یہی لوگ ہیں جو (اللہ کے ہاں اپنے مال کو) بڑھانے والے ہیں''۔ جیسے کہ شراب اور جوئے کی خرابی کو ابتدائی طور پر سورۃ البقرۃ (آیت ۲۱۹) میں بیان کر دیا گیا تھا۔ اس کے بعد آیت زیر مطالعہ میں دوسرے قدم کے طور پر مہاجنی سود (usury) سے روک دیا گیا۔ ہمارے ہاں آج کل بھی ایسے سود خور موجود ہیں جو بہت زیادہ شرح سود پر لوگوں کو قرض دیتے ہیں اور ان کا خون چوس جاتے ہیں۔ تو یہاں اس سود کی مذمت آئی ہے۔ واضح رہے کہ سود کے بارے میں آخری اور حتمی حکم ۹ھ میں نازل ہوا' لیکن ترتیبِ مصحف میں وہ حکم سورۃ البقرۃ کے رکوع ۳۸ میں ہے۔ وہاں پر سود کو دوٹوک انداز میں حرام قرار دے دیا گیا اور سود خوری سے باز نہ آنے پر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے جنگ کا الٹی میٹم دے دیا گیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات کے درمیان سود خوری کی مذمت کیوں بیان ہوئی؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درّے پر مامور پچاس تیر اندازوں میں سے جو پینتیس لوگ اپنی جگہ چھوڑ کر چلے گئے تھے ان کے تحت الشعور میں مالِ غنیمت کی کوئی طلب تھی' جو نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اس حوالے سے سود خوری کی مذمت بیان کی گئی کہ یہ بھی انسان کے اندر مال و دولت سے ایسی محبت پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے اس کے کردار میں بڑے بڑے خلا پیدا ہو سکتے ہیں۔

﴿وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿١٣٠﴾﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

آیت ۱۳۱ ﴿وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ﴿١٣١﴾﴾ ''اور اُس آگ سے بچو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

آیت ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ ''اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔''

آیت ﴿وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ ''اور مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت کے حصول کے لیے اور اُس جنت کو حاصل کرنے کے لیے جس کا پھیلاؤ آسمانوں اور زمین جتنا ہے''

﴿اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ ''وہ تیار کی گئی ہے (اور سنواری گئی ہے) اہلِ تقویٰ کے لیے۔''

آیت ﴿الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾ ''وہ لوگ جو خرچ کرتے ہیں کشادگی میں بھی اور تنگی میں بھی''

یہاں بھی تقابل ملاحظہ کیجیے کہ سود کے مقابلے میں انفاق کا ذکر ہوا ہے۔

﴿وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ﴾ ''اور وہ اپنے غُصّے کو پی جانے والے اور لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرنے والے ہیں۔''

﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ایسے محسنین کو پسند کرتا ہے۔''

یہ درجہ احسان ہے' جو اسلام اور ایمان کے بعد کا درجہ ہے۔

آیت ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ﴾ ''اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی ان سے کسی بے حیائی کا ارتکاب ہو جائے یا اپنے اوپر کوئی اور ظلم کر بیٹھیں تو فوراً انہیں اللہ یاد آ جاتا ہے''

﴿فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ﴾ ''پس وہ اُس سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگتے ہیں۔''

سورۃ النساء کی آیت ۱۷ میں اس حوالے سے خصوصی بشارت کا ذکر ہے کہ کسی مسلمان شخص سے اگر کوئی خطا ہو جائے اور وہ فوراً توبہ کر لے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب ٹھہرا لیا ہے کہ وہ اس کی توبہ ضرور قبول فرمائے گا۔

﴿وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ ''اور کون ہے جو معاف کر سکے گناہوں کو سوائے اللہ کے؟''

﴿وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰى مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ﴾ ''اور وہ اپنے اس غلط فعل پر جانتے بوجھتے اصرار نہیں کرتے۔''

یعنی ایسا نہیں کہ وہ گناہ پر گناہ کرتے چلے جا رہے ہیں کہ موت آنے پر توبہ کر لیں گے۔ اُس وقت کی توبہ توبہ نہیں ہے' بلکہ توبہ تو یہ ہے کہ ایک مسلمان سے اگر جذبات کی رو میں بہہ کر یا بھول چوک میں کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو وہ ہوش آنے پر فوری اللہ کے حضور گڑگڑائے' عزمِ مصمم کرے کہ دوبارہ ایسا نہیں کرے گا' اور پوری پشیمانی کے ساتھ صمیمِ قلب سے اللہ کی جناب میں توبہ کرے۔ اللہ تعالیٰ ایسی توبہ کو قبول کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔

آیت ﴿اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ ''یہ ہیں وہ لوگ کہ جن کا بدلہ ہے ان کے رب کی طرف سے مغفرت''

﴿وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ''اور وہ باغات کہ جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی اور وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

﴿وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ﴾ ''اور کیا ہی اچھا بدلہ ہے عمل کرنے والوں کے لیے۔''

آیت ﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ﴾ ''تم سے پہلے بھی بہت سے حالات و واقعات گزر چکے ہیں''

﴿فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ ''تو زمین میں گھومو پھرو''

﴿فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۳۷﴾﴾ ''اور دیکھو کہ کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا!''

قریش کے تجارتی قافلے شام کی طرف جاتے تھے تو وہ ان علاقوں سے ہو کر گزرتے تھے جہاں کبھی قومِ ثمود اور قومِ لوط کی بستیاں آباد تھیں۔ اس حوالے سے انہیں بتایا جا رہا ہے کہ ان قوموں کی آبادیوں کے کھنڈرات سے عبرت حاصل کرو کہ ان کے ساتھ کیا کچھ ہوا۔

آیت ۱۳۸ ﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۸﴾﴾ ''یہ وضاحت ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت اور نصیحت ہے متقین کے حق میں۔''

آیت ۱۳۹ ﴿وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا﴾ ''اور نہ کمزور پڑو اور نہ غم کھاؤ''

﴿وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾﴾ ''اور تم ہی سربلند رہو گے اگر تم مؤمن ہوئے۔''

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ آیت بہت اہم ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا پختہ وعدہ ہے کہ تم ہی غالب و سربلند ہو گے' آخری فتح تمہاری ہو گی' بشرطیکہ تم مؤمن ہوئے۔ یہ آیت ہمیں دعوتِ فکر دیتی ہے کہ آج دنیا میں جو ہم ذلیل ہیں' غالب و سربلند نہیں ہیں' تو نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ یہ کہ ہمارے اندر ایمان نہیں ہے' ہم حقیقی ایمان سے محروم ہیں۔ ہم جس ایمان کے مدعی ہیں وہ محض ایک موروثی عقیدہ ہے' یقین قلبی اور conviction والا ایمان نہیں ہے۔ بہرحال اس آیت کی رو سے یہ ممکن نہیں کہ اُمّت کے اندر حقیقی ایمان موجود ہو اور پھر بھی وہ دنیا میں ذلیل و خوار ہو۔

آیت ۱۴۰ ﴿اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ﴾ ''اگر تمہیں اب چرکا لگا ہے تو تمہارے دشمن کو بھی ایسا ہی چرکا اس سے پہلے لگ چکا ہے۔''

غزوۂ اُحد میں ستر صحابہؓ شہید ہو گئے تھے۔ ان میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابہ بھی تھے۔ بلکہ انصار کا تو کوئی گھرانہ ایسا نہیں تھا جس کا کوئی فرد شہید نہ ہوا ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان جب مدینہ واپس آئے تو ہر گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اُس وقت تک میت پر بین کرنے کی ممانعت نہیں ہوئی تھی۔ عورتیں مرثیے کہہ رہی تھیں' بین کر رہی تھیں' ماتم کر رہی تھیں۔ صورت حال اس قدر رقت آمیز تھی کہ خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ نکل گئے: لٰكِنَّ حَمْزَةَ لَا بَوَاكِيَ لَهٗ! [۱۲] ''ہائے حمزہ کے لیے تو کوئی رونے والیاں بھی نہیں ہیں!'' ظاہر ہے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تو مہاجر تھے' مدینہ میں ان کی کوئی رشتہ دار خواتین نہیں تھیں۔ انصار کے گھرانوں کی تمام خواتین اپنے اپنے مقتولوں پر آنسو بہا رہی تھیں اور بین کر رہی تھیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے مذکورہ الفاظ سننے کے بعد انصار نے اپنے گھروں سے خواتین کو بھیجا کہ وہ جا کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ تعزیت کریں۔ بہرحال دکھ تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بہت پہنچا تھا۔ آخر آپؐ کے سینے کے اندر ایک حساس دل تھا' پتھر کا کوئی ٹکڑا تو نہیں تھا۔ اس پس منظر میں یہاں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی دلجوئی کے لیے فرما رہا ہے کہ تم لوگ اس دکھ پر اتنے غمگین اور دل گرفتہ نہ ہو۔ اس وقت اگر تمہیں کوئی چرکا لگا ہے تو اس جیسا چرکا اس سے پہلے تمہارے دشمن کو بھی لگ چکا ہے۔ ایک مال پہلے ان کے بھی ستر افراد مارے گئے تھے۔

﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ﴾ ''یہ تو دن ہیں جن کو ہم لوگوں میں الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں۔''

۱۲۔ سنن ابن ماجه' کتاب الجنائز' باب ما جاء فی البکاء علی المیت۔ و مسند احمد: ۵۵ و ۵۲۳۳۔ عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔

یہ زمانے کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ کسی قوم کو ہم ایک سی کیفیت میں نہیں رکھتے۔

﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ دیکھ لے کہ کون لوگ حقیقتاً مؤمن ہیں''

اگر امتحان اور آزمائش نہ آئے' تکلیف نہ آئے' قربانی نہ دینی پڑے' کوئی زک نہ پہنچے تو کیسے پتا چلے کہ حقیقی مؤمن کون ہے؟ امتحان و آزمائش ہی سے تو پتا چلتا ہے کہ کون اپنے دعوے میں سچا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ آزمائش و ابتلاء کے ذریعے ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ کس نے اپنا سب کچھ لگا دیا؟ کس نے صبر کیا؟ کون ثابت قدم رہا اور کون الٹے پاؤں پھر گیا؟

﴿وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ۗ﴾ ''اور وہ چاہتا ہے کہ تم میں سے کچھ کو مقامِ شہادت عطا کرے۔''

انہیں اپنی گواہی کے لیے قبول کر لے۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۰﴾﴾ ''اور اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔''

اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ نے کفار کی مدد کی ہے اور ان کو پسند کیا ہے (معاذ اللہ!)

آیت ۱۴۱ ﴿وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۱﴾﴾ ''اور یہ اس لیے ہوا ہے کہ اللہ اہلِ ایمان کو بالکل پاک صاف کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔''

اس موقع پر دراصل مسلمانوں میں سے خاص طور پر ان لوگوں کی آزمائش مطلوب تھی جو ابھی تازہ تازہ ایمان لائے تھے' ان میں کچھ پختہ ایمان والے تھے' کچھ کمزور ایمان والے تھے اور کچھ منافق بھی تھے۔ اللہ نے چاہا کہ کمزور ایمان والے بھی پوری طرح پختہ ہو جائیں' اور اگر کوئی منافق ہے تو وہ اہلِ ایمان سے کٹ جائے' تاکہ بحیثیت مجموعی جماعتی قوت کو کوئی ضعف نہ پہنچے۔ چنانچہ اس جنگ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمہاری صفوں میں گڈمڈ ہو جانے والے لوگوں کی تمحیص کر دی ہے' یعنی ان سب کو چھانٹ کر الگ الگ کر دیا ہے۔ ظاہر ہے عبداللہ بن اُبی اور اس کے تین سو ساتھیوں کے نفاق کا پردہ اسی آزمائش سے چاک ہوا ہے' ورنہ ان کی اصلیت مسلمانوں پر کیسے ظاہر ہوتی؟ ''بحث و تمحیص'' کی ترکیب ہم اردو میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ بحث کا معنی ہے کریدنا اور تمحیص بمعنی الگ الگ کرنا۔

آیت ۱۴۲ ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ﴾ ''کیا تم نے سمجھا تھا کہ جنت میں یونہی داخل ہو جاؤ گے''

﴿وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾﴾ ''حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں ہے کہ تم میں سے کون واقعتاً (اللہ کی راہ میں) جہاد کرنے والے ہیں اور کون صبر و استقامت کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔''

گویا ع ''ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!'' ابھی تو تمہارے لیے اس راستے میں کڑی سے کڑی منزلیں آنے والی ہیں۔ یاد رہے کہ یہ مضمون ہم سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۱۴ میں بھی پڑھ آئے ہیں۔ نوٹ کیجیے کہ زیر مطالعہ آیت کا نمبر ۱۴۲ ہے' یعنی ہندسے وہی ہیں صرف ترتیب بدلی ہوئی ہے۔

آیت ۱۴۳ ﴿وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ﴾ ''اور تم تو موت کی تمنا کر رہے تھے اس سے پہلے کہ اُس سے ملاقات ہوتی۔''

﴿فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۱۴۳﴾﴾ ''سو اب تم نے اسے دیکھ لیا ہے اپنی آنکھوں سے۔''

یہاں روئے سخن اُن لوگوں کی طرف ہے جو نئے نئے ایمان لائے تھے اور ان میں سے خاص طور پر نوجوانوں نے کہا تھا کہ ہمیں تو

شہادت چاہیے اور یہ کہ ہم کھلے میدان میں جا کر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ ان کے جذبات پر تھوڑا سا تبصرہ ہو رہا ہے کہ اُس وقت تو جوشِ قتال اور ذوقِ شہادت کا اظہار ہو رہا تھا' اب تم نے موت دیکھ لی ہے نا! تو یہ ہے موت جسے انسان اتنی آسانی کے ساتھ قبول نہیں کرتا۔

آیات ۱۴۴ تا ۱۴۸

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَ سَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَ مَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَ مَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾ وَ مَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِىْۤ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَ حُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ ع

آیت ۱۴۴ ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ﴾ ''محمد (ﷺ) اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔''

غزوۂ اُحد کے دوران جب یہ افواہ اڑ گئی کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے تو بعض لوگ بہت دل گرفتہ ہو گئے کہ اب ہم کس لیے جنگ کریں؟ یہ کیفیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بھی طاری ہو گئی۔ آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر سن کر تلوار پھینک دی اور دل برداشتہ ہو کر بیٹھ گئے کہ اب ہم نے جنگ کر کے کیا لینا ہے! یہاں اس طرزِ عمل پر گرفت ہو رہی ہے کہ تمہارا یہ رویہ غلط تھا۔ محمد ﷺ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ وہ اللہ کے رسول ہیں' وہ معبود تو نہیں ہیں۔ تم ان کے لیے جہاد نہیں کر رہے' بلکہ تم اللہ کے لیے لڑ رہے ہو' اللہ کے دین کے غلبے کے لیے اپنے جان و مال قربان کر رہے ہو۔ محمد ﷺ تو اللہ کے رسول ہیں۔

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ﴾ ''ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔''

﴿اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ﴾ ''تو کیا اگر اُن کا انتقال ہو جائے یا وہ قتل کر دیے جائیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے؟''

کیا اس صورت میں تم اُلٹے پاؤں راہِ حق سے پھر جاؤ گے؟ کیا یہی تمہارے دین اور ایمان کی حقیقت ہے؟

﴿وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''اور جو کوئی بھی اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جائے گا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا۔''

﴿وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾﴾ ''ہاں اللہ بدلہ دے گا شکر کرنے والوں کو۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ جذباتی انسان تھے لہٰذا رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر سن کر حوصلہ چھوڑ گئے۔ اس سے ملتی جلتی کیفیت آپؓ پر حضور ﷺ کے انتقال کے وقت بھی طاری ہو گئی تھی۔ حضور ﷺ کے انتقال کی خبر سن کر آپؓ تلوار سونت کر بیٹھ گئے تھے کہ

جو کہے گا محمد ﷺ کا انتقال ہو گیا ہے میں اُس کا سر اُڑا دوں گا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ''ثانیٔ اسلام و غار و بدر و قبر'' اُس وقت مدینہ کے مضافات میں تھے۔ خبر سن کر آپؓ آئے اور سیدھے اپنی بیٹی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر چادر تھی' آپؓ نے چادر ہٹائی اور جھک کر آنحضور ﷺ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور رو دیے۔ پھر کہا: اے اللہ کے رسولؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر قربان! اللہ تعالیٰ آپؐ پر دو موتیں جمع نہیں کرے گا۔ یعنی اب دوبارہ آپؐ پر موت وارد نہیں ہوگی' اب تو آپؐ کو حیاتِ جاودانی حاصل ہو چکی ہے۔ اس کے بعد آپؓ باہر آئے اور لوگوں سے مخاطب ہوئے۔ آپؓ کو سامنے پا کر حضرت عمرؓ بیٹھ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا: مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ' وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللّٰهَ فَإِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا يَمُوْتُ ''جو کوئی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا وہ جان لے کہ محمد ﷺ کا انتقال ہو چکا ہے' اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا اُسے معلوم ہو کہ اللہ تو زندہ ہے' جسے موت نہیں آئے گی''۔ اس کے بعد آپؓ نے سورۂ آل عمران کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝۱۴۴﴾ ''محمد (ﷺ) اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے یا وہ قتل کر دیے جائیں تو تم اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤ گے؟ اور جو کوئی بھی اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جائے گا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا۔ ہاں اللہ بدلہ دے گا شکر کرنے والوں کو''۔

اُس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ آیت سن کر لوگوں کو ایسے محسوس ہوا جیسے یہ آیت اُسی وقت نازل ہوئی ہو۔[۱۳]

آیت ۱۴۵ ﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''اور کسی جان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ مر سکے مگر اللہ کے حکم سے''

﴿كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ﴾ ''(ہر ایک کی موت کا) وقت مقرر لکھا ہوا ہے۔''

اجلِ معیّن کے ساتھ ہر ایک کا وقت طے ہے۔ لہٰذا انسان کی بہترین محافظ خود اس کی موت ہے۔ چنانچہ کسی انسان کی موت کا جو وقت مقرر ہے اس سے پہلے کوئی اُس کے لیے موت نہیں لا سکتا۔

﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ﴾ ''جو کوئی دنیا کا اجر و ثواب چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دے دیتے ہیں۔''

﴿وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ﴾ ''اور جو واقعتاً آخرت کا اجر چاہتا ہے ہم اسے اس میں سے دیں گے۔''

یہ مضمون سورۃ البقرۃ کی آیات ۲۰۰۔۲۰۲ میں احکامِ حج کے حوالے سے آ چکا ہے۔

﴿وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝۱۴۵﴾ ''اور شکر کرنے والوں کو ہم بھرپور جزا دیں گے۔''

آیت ۱۴۶ ﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ﴾ ''کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں کہ جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی۔''

اے مسلمانو! تمہارے ساتھ جو یہ واقعہ پیش آیا ہے وہ کوئی پہلا واقعہ تو نہیں ہے۔ اللہ کے بہت سے نبی ایسے گزرے ہیں جن کی معیت میں بہت سارے اللہ والوں نے' اللہ کے ماننے اور چاہنے والوں نے' اللہ کے دیوانوں اور متوالوں نے' اللہ کے غلاموں اور عاشقوں نے اللہ کے دشمنوں سے جنگیں کی ہیں۔ ''رِبِّیّٖن'' اور ''ربّانی'' کا لفظ آج بھی یہودیوں کے ہاں اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۳۔ صحیح البخاری' کتاب المغازی' باب مرض النبی ﷺ' و کتاب الجنائز' باب الدخول علی المیت بعد الموت اذا ادرج فی کفنہ' و کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ' باب قول النبی ﷺ: لو کنت متخذا خلیلا۔

﴿فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''تو اللہ کی راہ میں جو بھی تکلیفیں ان پر آئیں اس پر انہوں نے ہمت نہیں ہاری''
﴿وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ﴾ ''اور نہ انہوں نے کمزوری دکھائی اور نہ ہی (باطل کے آگے) سرنگوں ہوئے۔''
﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۶﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی صابروں سے محبت ہے۔''
تو اے مسلمانو! تم بھی ایسا ہی کردار اپناؤ اور دل گرفتہ نہ ہو۔

آیت ۱۴۷ ﴿وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا﴾ ''اور اُن کا تو ہر مرحلے پر یہی قول ہوتا تھا کہ وہ دعا کرتے تھے کہ اے ربّ ہمارے! بخش دے ہمیں ہمارے گناہ اور اگر ہم سے اپنے کسی معاملے میں حد سے تجاوز ہو گیا ہو تو اسے معاف فرما دے''
﴿وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾﴾ ''اور ہمارے قدموں کو جما دے اور ہماری مدد فرما کافروں کے مقابلے میں۔''
حضرت طالوت کے ساتھیوں کی بھی یہی دعا تھی اور سورۃ البقرۃ کے اختتام پر آنے والی دعا کے الفاظ بھی یہی ہیں: ﴿فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾﴾

آیت ۱۴۸ ﴿فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ﴾ ''تو اُن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کا ثواب بھی عطا فرمایا اور آخرت کے ثواب کا بھی بہت ہی عمدہ حصہ عطا کیا۔''
انہیں دنیا کی سربلندی اور فتوحات سے بھی نوازا اور آخرت کا بہترین اجر بھی عطا فرمایا۔
﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۴۸﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ایسے ہی محسنین کو پسند کرتا ہے۔''

آیات ۱۴۹ تا ۱۵۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾
بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ
اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَ
لَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ
وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ
الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾
اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا
تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ

غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۚ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۗ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۗ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۗ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۗ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۵۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۵۵﴾ ع

آیت ۱۴۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اگر تم اُن لوگوں کا کہنا مانو گے جنہوں نے کفر کی روش اختیار کی ہے تو وہ تمہیں تمہاری ایڑیوں کے بَل واپس لے جائیں گے''

﴿فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾﴾ ''پھر تم بالکل نامراد ہو کے رہ جاؤ گے۔''

آیت ۱۵۰ ﴿بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ﴾ ''حقیقت یہ ہے کہ تمہارا مولیٰ تو اللہ ہے۔''

تمہیں یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ تمہارا مولیٰ' مددگار' پشت پناہ' ساتھی اور حمایتی اللہ ہے۔

﴿وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾﴾ ''اور وہی ہے جو سب سے اچھا مددگار ہے۔''

آیت ۱۵۱ ﴿سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ﴾ ''ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے''

﴿بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ﴾ ''اس سبب سے کہ انہوں نے ایسی چیزوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا جن کے حق میں اُس نے کوئی سند نہیں اُتاری۔''

﴿وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾﴾ ''اور اُن کا ٹھکانہ جہنم ہے' اور بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے ان ظالموں کے لیے۔''

اس آیت میں دراصل توجیہہ بیان ہو رہی ہے کہ غزوۂ اُحد میں واضح برتری حاصل کر لینے کے بعد مشرکین واپس کیوں چلے گئے تھے۔ خصوصاً ایسی صورت حال میں جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پہاڑ کے اوپر چڑھ کر پناہ لینا پڑی تھی۔ اُس وقت خالد بن ولید بضد تھے کہ ہمیں مسلمانوں کا تعاقب کرنا چاہیے اور انہیں ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہیے۔ لیکن ہوا یوں کہ اُس وقت ابوسفیان کے دل میں اللہ نے رعب ڈال دیا جس کی وجہ سے وہ لشکر کو لے کر وہاں سے چلے گئے۔ ورنہ مسلمانوں کے لیے اُس وقت صورتِ حال واقعتاً بہت مخدوش ہو چکی تھی۔

آیت ۱۵۲ ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ ''اور اللہ نے تو تم سے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا جبکہ تم ان کو تہ تیغ کر رہے تھے اللہ کے حکم سے۔''

غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو جو زک پہنچی تھی' اس کی وجہ سے ان کے دل شدید زخمی تھے۔ اس ضمن میں اب یہ آیت ایک قولِ فیصل کے انداز میں آئی ہے کہ دیکھو مسلمانو! تم ہم سے کوئی شکایت نہیں کر سکتے' ہم نے تم سے تائید و نصرت کا جو وعدہ کیا تھا وہ اس وقت پورا ہو گیا تھا جب تم انہیں ہمارے حکم سے گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے۔ اُس وقت تمہیں مکمل فتح حاصل ہو گئی تھی۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ''یہاں تک کہ جب تم ڈھیلے پڑ گئے اور امر میں تم نے جھگڑا کیا''

فَشِلْتُمْ کا ترجمہ بعض مترجمین نے کچھ اور بھی کیا ہے' لیکن میرے نزدیک یہاں اس سے مراد نظم (ڈسپلن) کو ڈھیلا کرنا ہے۔ اسلامی نظم جماعت میں سمع وطاعت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے' لیکن ظاہر ہے کہ سمع وطاعت کے نظام میں صرف ایک امیر کی اطاعت ہی مقصود نہیں ہوتی' بلکہ اُوپر سے لے کر نیچے تک' سپہ سالار سے لے کر لوکل کمانڈر تک' درجہ بدرجہ نظامِ سمع وطاعت کی پابندی ضروری ہے۔ جیسے فوج کا ایک سپہ سالار ہے' پھر اس کے تحت میسرہ' میمنہ' قلب' ہراول دستہ' غرض ہر یونٹ کا ایک کمانڈر ہے۔ اب اگر ان کمانڈروں کے ماتحت لوگ ان کے احکام سے سرتابی کریں گے تو ایسی فوج کا کیا انجام ہوگا؟ چنانچہ ایک جماعت کے اندر درجہ بدرجہ جو بھی نظامِ سمع وطاعت ہے اس جماعت کے ارکان کے لیے اُس کی پوری پوری پابندی ضروری ہے۔ اس لیے درّے میں متعین تیر اندازوں پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بھی فرض تھی اور آپ ﷺ کے مقرر کردہ امیر (کمانڈر) کی اطاعت بھی فرض تھی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِیْ فَقَدْ اَطَاعَنِیْ ، وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِیْ فَقَدْ عَصَانِیْ)) (۱۴)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی' اور جس نے میرے نامزد کردہ امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔''

یہاں پر یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ درّہ چھوڑنے والے تیر اندازوں نے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ان کے خیال کے مطابق حضور ﷺ کا یہ حکم شکست کی صورت میں تھا کہ اگر ہم سب بھی اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں اور تم دیکھو کہ چیلیں اور کوّے ہمارا گوشت کھا رہے ہیں تب بھی یہاں سے نہ ہٹنا۔ چنانچہ جب فتح ہو گئی تو انہوں نے نیک نیتی سے یہ سمجھا کہ اب وہاں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے جانتے بوجھتے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے مقامی امیر (لوکل کمانڈر) کے حکم کی بہرحال خلاف ورزی کی تھی' اور میرے نزدیک یہاں ''عَصَيْتُمْ'' سے یہی حکم عدولی مراد ہے۔

﴿وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ ''اور تم نے نافرمانی کی اس کے بعد کہ تم نے وہ چیز دیکھ لی جو تمہیں محبوب ہے۔''

﴿عَصَيْتُمْ﴾ کے بارے میں اوپر وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی نہیں' بلکہ لوکل کمانڈر کی نافرمانی ہے۔ ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ سے اکثر مفسرین نے مالِ غنیمت مراد لیا ہے' کہ درّے پر مامور حضرات مالِ غنیمت کی طلب میں اپنی جگہ چھوڑ آئے تھے' لیکن میرے نزدیک یہ بات درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کا قانون تو غزوۂ بدر کے بعد سورۃ الانفال میں نازل ہو چکا تھا۔ اس قانون کی رو سے اگر کوئی شخص کچھ بھی جمع نہ کرتا تب بھی اسے اس کے حصے کا مالِ غنیمت مل جاتا۔ چنانچہ یہاں ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ سے مراد دراصل ''فتح'' ہے اور اس کے لیے

۱۴۔ صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب قول اللہ تعالیٰ : واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم- وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ...

﴿حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ ''یہاں تک کہ جب تم ڈھیلے پڑ گئے اور امر میں تم نے جھگڑا کیا''

فَشِلْتُمْ کا ترجمہ بعض مترجمین نے کچھ اور بھی کیا ہے' لیکن میرے نزدیک یہاں اس سے مراد لفظ (ڈسپلن) کو ڈھیلا کرنا ہے۔ اسلامی نظم جماعت میں سمع وطاعت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے' لیکن ظاہر ہے کہ سمع وطاعت کے نظام میں صرف ایک امیر کی اطاعت ہی مقصود نہیں ہوتی' بلکہ اُوپر سے لے کر نیچے تک' سپہ سالار سے لے کر لوکل کمانڈر تک' درجہ بدرجہ نظامِ سمع وطاعت کی پابندی ضروری ہے۔ جیسے فوج کا ایک سپہ سالار ہے' پھر اس کے تحت میسرہ' میمنہ' قلب' ہراول دستہ' غرض ہر یونٹ کا ایک کمانڈر ہے۔ اب اگر ان کمانڈروں کے ماتحت لوگ ان کے احکام سے سرتابی کریں گے تو ایسی فوج کا کیا انجام ہوگا؟ چنانچہ ایک جماعت کے اندر درجہ بدرجہ جو بھی نظامِ سمع وطاعت ہے اس جماعت کے ارکان کے لیے اُس کی پوری پوری پابندی ضروری ہے۔ اس لیے درّے میں متعین تیر اندازوں پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت بھی فرض تھی اور آپ ﷺ کے مقرر کردہ امیر (کمانڈر) کی اطاعت بھی فرض تھی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ اَطَاعَنِيْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِيْ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ ، وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِيْ فَقَدْ عَصَانِيْ)) (۱۴)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی' اور جس نے میرے نامزد کردہ امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔''

یہاں پر یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ درّہ چھوڑنے والے تیر اندازوں نے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی۔ ان کے خیال کے مطابق حضور ﷺ کا یہ حکم شکست کی صورت میں تھا کہ اگر ہم سب بھی اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں اور تم دیکھو کہ چیلیں اور کوّے ہمارا گوشت کھا رہے ہیں تب بھی یہاں سے نہ ہٹنا۔ چنانچہ جب فتح ہو گئی تو انہوں نے نیک نیتی سے یہ سمجھا کہ اب وہاں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ انہوں نے جانتے بوجھتے رسول اللہ ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کی تھی۔ لیکن انہوں نے اپنے مقامی امیر (لوکل کمانڈر) کے حکم کی بہرحال خلاف ورزی کی تھی' اور میرے نزدیک یہاں ''عَصَيْتُمْ'' سے یہی حکم عدولی مراد ہے۔

﴿وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ ''اور تم نے نافرمانی کی اس کے بعد کہ تم نے وہ چیز دیکھ لی جو تمہیں محبوب ہے۔''

﴿عَصَيْتُمْ﴾ کے بارے میں اوپر وضاحت ہو چکی ہے کہ اس سے مراد اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی نہیں' بلکہ لوکل کمانڈر کی نافرمانی ہے۔ ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ سے اکثر مفسرین نے مالِ غنیمت مراد لیا ہے' کہ درّے پر مامور حضرات مالِ غنیمت کی طلب میں اپنی جگہ چھوڑ آئے تھے' لیکن میرے نزدیک یہ بات درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ مالِ غنیمت کی تقسیم کا قانون تو غزوۂ بدر کے بعد سورۃ الانفال میں نازل ہو چکا تھا۔ اس قانون کی رو سے اگر کوئی شخص کچھ بھی جمع نہ کرتا تب بھی اسے اس کے حصے کا مالِ غنیمت مل جاتا۔ چنانچہ یہاں ﴿مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ سے مراد دراصل ''فتح'' ہے اور اس کے لیے

۱۴۔ صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب قول اللہ تعالیٰ: واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم- وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ...

"القرآن یُفسِّر بعضُه بعضًا" کی رُو سے سورۃ الصّف کی یہ آیت ہماری رہنمائی کرتی ہے: ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ؕ﴾ (آیت ۱۳) ''اور ایک اور چیز جو تمہیں بہت پسند ہے۔ اللہ کی طرف سے مدد اور قریبی فتح۔'' ظاہر ہے بندۂ مؤمن کو دنیا میں فتح و نصرت محبوب تو ہوتی ہے' لیکن اسے اس کو اپنا مقصود نہیں بنانا چاہیے' بلکہ دنیا میں اس کا مقصود اللہ کی رضا جوئی اور اپنے فرض کی ادائیگی ہے۔ باقی کامیابی یا ناکامی کے بارے میں اسے یقین رکھنا چاہیے کہ اس کا فیصلہ اللہ کی مرضی اور اس کی حکمت کے تحت ہوتا ہے۔ اللہ کب فتح لانا چاہتا ہے وہ بہتر جانتا ہے۔

﴿مِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الدُّنْیَا﴾ ''تم میں سے وہ بھی ہیں جو دنیا چاہتے ہیں''

یعنی وہ خواہش رکھتے ہیں کہ دنیا میں فتح و نصرت اور کامیابی حاصل ہو جائے' ہمارا بول بالا ہو جائے' ہماری حکومت قائم ہو جائے۔

﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرِیْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ﴾ ''اور تم میں وہ بھی ہیں جو صرف آخرت کے طالب ہیں۔''

﴿ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِیَبْتَلِیَكُمْ ۚ﴾ ''پھر اللہ نے تمہارا رُخ پھیر دیا اُن کی طرف سے تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔''

پہلے وہ بھاگ رہے تھے اور تم ان کا تعاقب کر رہے تھے' اب معاملہ الٹا ہو گیا۔ اب تم پسپا ہو گئے اور اپنی جانیں بچانے کے لیے اِدھر اُدھر جائے پناہ ڈھونڈنے لگے۔ تمہاری یہ پسپائی تمہارے لیے آزمائش تھی۔

﴿وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ﴾ ''اور اللہ تمہیں معاف کر چکا ہے۔''

اس دوران تم میں سے جس کسی سے جو بھی خطا ہوئی اللہ نے اسے معاف فرما دیا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۱۵۲﴾ ''اور اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے حق میں بہت فضل والا ہے۔''

آیت ۱۵۳ ﴿اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰۤى اَحَدٍ﴾ ''یاد کرو جب کہ تم (پہاڑ پر) چڑھے چلے جا رہے تھے (جان بچانے کے لیے) اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھ رہے تھے''

﴿وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْۤ اُخْرٰىكُمْ﴾ ''اور رسول (ﷺ) تمہیں پکار رہے تھے تمہارے پیچھے سے''

غزوۂ اُحد میں خالد بن ولید کے اچانک حملے سے یک دم بھگدڑ سی مچ گئی تھی۔ اس صورت حال میں بعض صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کو اپنے حفاظتی حصار میں لے لیا تھا۔ انہوں نے اپنے جسموں کو ڈھال بنا کر آنحضور ﷺ کی حفاظت کی۔ بہت سے لوگ اُس وقت سراسیمہ ہو کر اپنی جان بچانے کی خاطر اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ انہیں پکار پکار کر واپس بلا رہے تھے۔

﴿فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ﴾ ''تو اللہ تعالیٰ تم پر غم کے بعد غم مسلسل ڈالتا رہا''

﴿لِّكَیْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَاۤ اَصَابَكُمْ ؕ﴾ ''تاکہ (آئندہ کے لیے تمہیں یہ سبق ملے کہ) تم غمگین نہ ہوا کرو اُس موقع پر کہ جو تمہارے ہاتھ سے جاتا رہے اور نہ اُس تکلیف پر کہ جو تم پر آ پڑے۔''

یعنی ع ''رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج!'' آدمی کو اگر کبھی کبھار رنج و غم کا سامنا کرنا پڑے تو اس کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے' لیکن جب پے در پے رنج و غم اٹھانے پڑیں تو غم کی شدت میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ دامنِ اُحد میں مسلمانوں کو پے در پے تکالیف برداشت کرنا پڑیں۔ اس دوران سب سے بڑا رنج جو پیش آیا وہ حضور ﷺ کے انتقال کی خبر تھی' جس پر کسی کو اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ رہا کہ خود اس کو کیا زخم لگا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اُس وقت مسلمانوں کو پے در پے رنج و غم سے دوچار کر کے ان کی

تکلیف میں ایک طرح سے تخفیف کی کیفیت پیدا کر دی۔

﴿وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾﴾ ''اور اللہ باخبر ہے اس سے جو تم کر رہے تھے۔''

آیت ۱۵۴ ﴿ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً﴾ ''پھر اس غم کے بعد اللہ تعالیٰ نے تم پر اطمینان نازل فرمایا''

﴿نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ﴾ ''یعنی وہ نیند جو تم میں سے ایک گروہ پر طاری ہو گئی''

نیند انسان کے لیے اطمینانِ قلب کا مظہر ہوتی ہے' نیند کی حالت میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر عین حالتِ جنگ میں نیند کی کیفیت پیدا کر دی جو اللہ کی رحمتِ خاص کا مظہر تھی۔

﴿وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ ''اور ایک گروہ ایسا تھا کہ جنہیں اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی''

﴿يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ؕ﴾ ''وہ اللہ کے بارے میں ناحق جہالت والے گمان کر رہے تھے۔''

عبداللہ بن اُبی اور اس کے تین سو ساتھی تو راستے ہی سے واپس ہو گئے تھے۔ اس کے بعد بھی اگر مسلمانوں کی جماعت میں کچھ منافقین باقی رہ گئے تھے تو ان کا حال یہ تھا کہ اُس وقت انہیں اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ایسی کیفیت میں انہیں اونگھ کیسے آتی؟ ان کا حال تو یہ تھا کہ ان کے دلوں میں وسوسے آ رہے تھے کہ اللہ نے تو مدد کا وعدہ کیا تھا' لیکن وہ وعدہ پورا نہیں ہوا' اللہ کی بات سچی ثابت نہیں ہوئی۔ اس طرح ان کے دل و دماغ میں خلافِ حقیقت جاہلانہ گمان پیدا ہو رہے تھے۔

﴿يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ؕ﴾ ''وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے لیے بھی اختیار میں کوئی حصہ ہے یا نہیں؟''

یہ غالباً وہ لوگ تھے جنہوں نے مشورہ دیا تھا (جیسے حضور ﷺ کی اپنی رائے بھی تھی) کہ مدینے کے اندر محصور رہ کر جنگ کی جائے۔ جب ان کے مشورے پر عمل نہ ہوا تو وہ کہنے لگے کہ ان معاملات میں ہمارا بھی کوئی اختیار ہے یا ساری بات محمد (ﷺ) ہی کی چلے گی؟ یہ وہ مسئلہ ہے جو جماعتی زندگی کے اندر بار بار سر اٹھاتا ہے۔ جماعت کے اندر دراصل ہر شخص چاہتا ہے کہ میری بات بھی مانی جائے' میری رائے کو بھی اہمیت دی جائے۔ آخر ہم اپنے امیر ہی کی رائے کیوں مانتے چلے جائیں؟ ہمارا بھی کچھ اختیار ہے یا نہیں؟

﴿قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ؕ﴾ ''کہہ دیجیے کہ سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔''

﴿يُخْفُوْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ اپنے دل میں وہ بات چھپا رہے ہیں جو آپ پر ظاہر نہیں کر رہے۔''

ان کے دل میں کیا ہے؟ اب اللہ کھول کر بتا رہا ہے۔

﴿يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ؕ﴾ ''یہ (اپنے دل میں) کہتے ہیں کہ اگر اختیار میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔''

کہ اگر ہماری رائے مانی جاتی' ہمارے مشورے پر عمل ہوتا تو ہمارے اتنے لوگ یہاں پر قتل نہ ہوتے۔

﴿قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ﴾ ''ان سے کہیے کہ اگر تم سب کے سب اپنے گھروں میں بھی ہوتے''

﴿لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ﴾ ''تب بھی جن لوگوں کا قتل ہونا مقدر تھا وہ اپنی قتل گاہوں تک پہنچ کر رہتے۔''

اللہ کی مشیت میں جن کے لیے طے تھا کہ انہیں شہادت کی خلعتِ فاخرہ پہنائی جائے گی وہ خود بخود اپنے گھروں سے نکل آتے اور کشاں کشاں ان جگہوں پر پہنچ جاتے جہاں انہوں نے خلعتِ شہادت زیب تن کرنی تھی۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہوتے ہیں' تمہاری تدبیر سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

﴿وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ﴾ ''اور یہ (معاملہ جو پیش آیا) اس لیے تھا کہ اللہ اسے آزمالے جو کچھ تمہارے سینوں میں تھا''

﴿وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ﴾ ''اور تاکہ وہ بالکل پاک اور خالص کر دے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۱۵۴﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سینوں کے اندر مخفی باتوں کو بھی جانتا ہے۔''

آیت ۱۵۵ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ﴾ ''تم میں سے وہ لوگ جو میدانِ جنگ سے چلے گئے اُس دن جب دو گروہ ایک دوسرے کے مقابلے میں آئے''

یہ ایسے مخلص حضرات کا تذکرہ ہے جو اچانک حملے کے بعد جنگ کی شدت سے گھبرا کر اپنی جان بچانے کے لیے وقتی طور پر پیٹھ پھیر گئے۔ ان میں سے کچھ لوگ کوہِ اُحد پر چڑھ گئے تھے اور کچھ اس سے ذرا آگے بڑھ کر میدان ہی سے باہر چلے گئے تھے۔ ان میں بعض کبار صحابہ رضی اللہ عنہم کا نام بھی آتا ہے۔ دراصل یہ بھگدڑ مچ جانے کے بعد ایسی اضطراری کیفیت تھی کہ اُس میں کسی سے بھی کسی ضعف اور کمزوری کا اظہار ہو جانا بالکل قرینِ قیاس بات ہے۔

﴿اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ﴾ ''اصل میں شیطان نے ان کے پاؤں پھسلا دیے تھے ان کے بعض افعال کی وجہ سے۔''

چھوٹی موٹی تقصیر یا کوتاہی کا ہو جانا تو مخلص مسلمانوں سے بھی بعید نہیں۔ ایسا معاملہ ہر کسی کو پیش آ سکتا ہے۔ معصوم تو صرف نبی ہوتے ہیں۔ بہرحال انسانی کمزوریوں کی وجہ سے شیطان کو موقع مل جاتا ہے کہ کسی وقت وہ اڑنگا لگا کر کسی شخص کو پھسلا دے' خواہ وہ کتنا ہی نیک اور کتنا ہی صاحبِ رُتبہ ہو۔

﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ﴾ ''اور اللہ انہیں معاف کر چکا ہے۔''

یہ الفاظ بہت اہم ہیں۔ بعض گمراہ فرقے اس بات کو اچھالتے ہوئے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر تنقید کرتے ہیں کہ وہ میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ گئے تھے۔ لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی معافی کا اعلان کر چکا ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کی موجودگی میں کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اس حوالے سے کسی صحابیؓ پر زبانِ طعن دراز کرے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۱۵۵﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والا اور بردبار ہے۔''

آیات ۱۵۶ تا ۱۸۰

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ

قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾ وَ لَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَ لَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ
تُحْشَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ
حَوْلِكَ ۪ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿۱۵۹﴾ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا
الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۶۰﴾ وَ مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَ
مَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۶۱﴾
اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۶۲﴾
هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۳﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ
فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾ اَوَلَمَّاۤ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى
هٰذَا ؕ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾ وَ مَاۤ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى
الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَ لِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾ ۙ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا تَّبَعْنٰكُمْ ؕ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ
اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۷﴾ ۚ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَ قَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ
اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ وَ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ
بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ ۙ فَرِحِيْنَ بِمَاۤ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ
بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ يَسْتَبْشِرُوْنَ
بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ۚ اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ ع ۸
الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛؕ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾ ۚ
اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ وَّ قَالُوْا حَسْبُنَا
اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّ اتَّبَعُوْا
رِضْوَانَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۪ فَلَا
تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ

اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۷﴾ وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۷۸﴾ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۪ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَ تَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾ وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾ ع

آیت ۱۵۶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ ''اے اہلِ ایمان! تم اُن لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے کفر کیا''

﴿وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ﴾ ''اور جنہوں نے اپنے بھائیوں کے بارے میں جبکہ وہ زمین میں سفر پر نکلے ہوئے تھے یا کسی جہاد میں شریک تھے (اور وہاں ان کا انتقال ہو گیا) کہا کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے۔''

ان لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہر شخص کی موت کا وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے معیّن ہے۔ لہٰذا وہ اگر ان کی گود میں بھی بیٹھے ہوتے تب بھی موت انہیں آلیتی۔ موت تو بہت مضبوط پہرے والے قلعوں میں بھی پہنچ جاتی ہے۔ تو انہیں اس طرح کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ یہ تو کافروں کے انداز کی باتیں ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے اور جنگ میں نہ جاتے تو بچ جاتے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((فَاِنَّ لَوْ تَفْتَحُ عَمَلَ الشَّيْطَانِ)) (۱۵) ''کاش کا لفظ شیطان کے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے''۔ یعنی یہ کہنا کہ کاش ایسے ہو جاتا تو یوں ہو جاتا' اس کلمہ ہی سے شیطان کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جو ہوا اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا ہونا منظور تھا' اس کی حکمتیں اُسے معلوم ہیں' ہم اس کی حکمت کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

﴿لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ﴾ ''(یہ بات اس لیے ان کی زبان پر آتی ہے) تاکہ اللہ اس کو اُن کے دلوں میں حسرت کا باعث بنا دے۔''

اس قسم کی باتوں سے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں حسرت کی آگ جلا دیتا ہے۔ یہ بھی گویا ان کے کفر کی سزا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ﴾ ''اور دیکھو اللہ ہی زندہ رکھتا ہے اور وہی موت وارد کرتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۵۶﴾﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

۱۵۔ صحیح مسلم' کتاب القدر' باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز والاستعانۃ باللہ۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ۔

آیت ۱۵۶ ﴿وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ﴾ ''اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل ہو جاؤ یا ویسے ہی تمہیں موت آ جائے''
﴿لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝۱۵۷﴾ ''تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مغفرت اور رحمت تمہیں ملے گی وہ کہیں بہتر ہے اُن چیزوں سے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔''

اگر تم دنیا میں دس پندرہ سال اور جی لیتے تو کیا کچھ جمع کر لیتے؟ اللہ تعالیٰ نے تمہیں شہادت کی موت دے دی' تمہارے لیے اس سے بڑی سعادت اور کیا ہوگی!

آیت ۱۵۸ ﴿وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۱۵۸﴾ ''اور چاہے تم مرو یا قتل ہو' بہرحال اللہ ہی کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے۔''

چاہے تمہیں اپنے بستروں پر موت آئے اور چاہے تم میدانِ جنگ میں جامِ شہادت نوش کرو' ہر حال میں تمہیں اللہ کی جناب میں حاضر کر دیا جائے گا۔ تمہاری آخری منزل تو وہی ہے۔

آیت ۱۵۹ ﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ) یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ آپ ان کے حق میں بہت نرم ہیں۔''

اس سورۂ مبارکہ کی یہ آیت جماعتی نظم کے حوالے سے بہت اہم ہے۔ جماعتی زندگی میں جو لوگ صاحبِ امر ہوں' جن کے پاس ذمہ داریاں ہوں انہیں یہ خیال رہنا چاہیے کہ ان کے یہ سب ساتھی آخر انسان ہیں' وہ جذبات اور احساسات بھی رکھتے ہیں' ان کی عزتِ نفس بھی ہے' اور یہ کہ وہ ملازم نہیں' بلکہ رضا کار (volunteers) ہیں اور دینی جذبے کے تحت اکٹھے ہوئے ہیں' لہٰذا اُمراء کو اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ ہمیشہ نرم رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ جماعتی زندگی کے اس پہلو کی اہمیت کو یہاں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کے حوالے سے واضح کیا جا رہا ہے کہ اے نبیؐ یہ اللہ کی رحمت کا مظہر ہے کہ آپؐ ان کے حق میں بہت نرم ہیں۔

﴿وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ﴾ ''اور اگر آپؐ تُند خُو اور سخت دل ہوتے تو یہ آپؐ کے اردگرد سے منتشر ہو جاتے۔''

کسی امیر' کمانڈر یا لیڈر کی تند خوئی اور سخت گیری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کا نقشہ علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچا ہے: ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا' کوئی بدگماں حرم سے
کہ امیرِ کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی!

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ﴾ ''پس آپ ان سے درگزر کریں''

اے نبی ﷺ! اس جنگ میں آپؐ کے بعض ساتھیوں سے اگرچہ بہت بڑی غلطی سرزد ہوئی ہے اور اس کی وجہ سے آپ لوگوں کو بہت بڑا چرکا لگا ہے' لیکن اس کے باوجود بھی آپؐ اپنے ان ساتھیوں کے لیے اپنے دل میں میل مت آنے دیجیے۔ ان کی غلطی اور کوتاہی کو اللہ نے معاف کر دیا ہے تو آپؐ بھی انہیں معاف کر دیں' اور عام حالات میں بھی آپ انہیں معاف کرتے رہا کریں۔

﴿وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ﴾ ''اور ان کے لیے مغفرت طلب کریں''

ان سے جو بھی خطا ہو جائے اس پر ان کے لیے استغفار کیا کریں۔

﴿وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ﴾ ''اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہیں۔''

ایسا طرزِ عمل اختیار نہ کریں کہ آئندہ ان کی کوئی بات نہیں سنیں' بلکہ ان کو بھی مشورے میں شامل رکھیے۔ واضح رہے کہ مشاورت کے عمل سے جماعت کے اندر باہمی اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ اس سے لوگ اطمینان محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا امیر ہم سے مشورہ کرتا ہے' ہماری بات کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ مشاورت کے عمل کا تسلسل اجتماعی زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔

﴿فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ﴾ ''پھر جب آپؐ فیصلہ کرلیں تو اللہ پر توکل کریں۔''

مشورے کے بعد جب آپؐ کا دل کسی رائے پر مطمئن ہو جائے اور اس رائے کے مطابق آپؐ فیصلہ کرلیں تو اس کے بعد کسی شخص کی بات کی پروا نہ کریں' بلکہ فقط اللہ کی ذات پر توکل کریں۔ غزوۂ اُحد سے پہلے جب رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا تھا' تو اُس وقت اکثر لوگوں کی رائے وہی تھی جو آنحضور ﷺ کی رائے تھی' یعنی یہ کہ مدینہ میں محصور ہو کر جنگ کی جائے۔ لیکن کچھ لوگوں نے کہا ہم تو کھلے میدان میں جنگ کرنا چاہتے ہیں' ہمیں تو شہادت کی موت چاہیے۔ اس پر حضور ﷺ نے ان کی رعایت کرتے ہوئے باہر نکلنے کا فیصلہ فرمایا۔ اس کے بعد جب آپ ﷺ تیار ہو کر حضرت عائشہ ؓ کے حجرے سے باہر تشریف لائے تو خلافِ معمول آپؐ نے زرہ پہنی ہوئی تھی اور ہتھیار لگائے ہوئے تھے۔ اس سے لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ کچھ سخت معاملہ پیش آنے والا ہے۔ چنانچہ متعلقہ لوگوں نے کہا کہ حضور ﷺ ہم اپنی رائے واپس لیتے ہیں' جو آپؐ کی رائے ہے آپ اس کے مطابق فیصلہ کیجیے۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں' اب یہ فیصلہ برقرار رہے گا۔ نبی کو یہ زیبا نہیں کہ ہتھیار باندھنے کے بعد جنگ کیے بغیر انہیں اتار دے۔ چنانچہ یہ آیت گویا نبی اکرم ﷺ کے اس طرزِ عمل کی توثیق میں نازل ہوئی کہ جب آپؐ ایک فیصلہ کرلیں تو پھر اللہ پر توکل کرتے ہوئے اس پر استقامت اختیار کریں۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿١٥٩﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

آیت ۱۶۰ ﴿إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ﴾ ''(اے مسلمانو! دیکھو) اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں آسکتا۔''

﴿وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ﴾ ''اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے (تمہاری مدد سے دست کش ہو جائے) تو کون ہے جو تمہاری مدد کرے گا اس کے بعد؟''

﴿وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٦٠﴾﴾ ''اور اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے ایمان والوں کو۔''

آیت ۱۶۱ ﴿وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ﴾ ''اور کسی نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ خیانت کرے۔''

غَلَّ يَغُلُّ غُلُوْلًا کے معنی ہیں خیانت کرنا' جبکہ غَلَّ يَغِلُّ غِلًّا کے معنی دل میں کینہ ہونا کے ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ آنحضور ﷺ پر منافقوں نے الزام لگایا تھا کہ آپؐ نے مالِ غنیمت میں کوئی خیانت کی ہے (معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ!) یہ اس الزام کا جواب دیا جا رہا ہے کہ کسی نبیؑ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ خیانت کا ارتکاب کرے۔ البتہ مولانا اصلاحی صاحبؒ نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس لفظ کو صرف مالی خیانت کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی دلیل نہیں۔ ان کی رائے میں یہ دراصل منافقین کے ان الزامات کی تردید ہے جو انہوں نے اُحد کی شکست کے بعد رسول اللہ ﷺ پر لگائے تھے کہ ہم نے تو ان پر اعتماد کیا' ان کے ہاتھ پر بیعت کی' اپنے نیک و بد کا ان کو مالک بنایا' لیکن یہ ہمارے اس اعتماد سے بالکل غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارے جان و مال کو اپنے ذاتی

حوصلوں اور اُمنگوں کے لیے تباہ کر رہے ہیں۔ ان کا منصوبہ پورے عرب کو زیرِ نگیں کرنے کا ہے اور اس مقصد کے لیے انہوں نے ہماری جانوں کو تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ یہ صریحاً قوم کی بدخواہی اور اس کے ساتھ غداری و بے وفائی ہے' وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ قرآن نے منافقین کے ان الزامات کی تردید فرمائی کہ تمہارے یہ الزامات بالکل جھوٹ ہیں' کوئی نبی اپنی اُمت کے ساتھ کبھی بے وفائی اور بدعہدی نہیں کرتا۔ نبی جو قدم بھی اٹھاتا ہے رضائے الٰہی کی طلب میں اور اُس کے احکام کے تحت اٹھاتا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ﴾ ''اور جو کوئی خیانت کرے گا تو وہ اپنی خیانت کی ہوئی چیز سمیت حاضر ہوگا قیامت کے دن۔''

اللہ تعالیٰ کے قانونِ جزا و سزا سے ایک نبی سے بڑھ کر بھلا کون باخبر ہوگا؟

﴿ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۱۶۱﴾ ''پھر ہر جان کو پورا پورا دے دیا جائے گا جو کچھ اُس نے کمایا ہوگا اور اُن پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔''

آیت ۵۵ کے حوالے سے نوٹ کیجیے' لفظ ''تُوَفّٰی'' یہاں بھی پورا پورا دیے جانے کے معنی میں آیا ہے۔

آیت ۱۶۲ ﴿اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''تو کیا بھلا وہ شخص جس نے اللہ کی رضا کی پیروی کی اُس کی مانند ہو جائے گا جو اللہ کے غضب اور غصے کو کما کر لوٹا؟''

﴿وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ﴾ ''اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔''

﴿وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝۱۶۲﴾ ''اور وہ بہت ہی بُری جگہ ہے پہنچنے کی۔''

آیت ۱۶۳ ﴿هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ﴾ ''ان کی درجہ بندیاں ہیں اللہ کے ہاں۔''

جیسے اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکوکاروں کے درجے ہیں اسی طرح وہاں بدکاروں کے بھی درجے ہیں۔ سب بدکار برابر نہیں اور سب نیکوکار برابر نہیں۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝۱۶۳﴾ ''اور جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

اگلی آیت کا مضمون قبل ازیں سورۃ البقرۃ میں دو مرتبہ آ چکا ہے۔ پہلی مرتبہ سورۃ البقرۃ کے پندرہویں رکوع میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا میں یہ مضمون بایں الفاظ آیا ہے: ﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ﴾ (آیت ۱۲۹) پھر اٹھارہویں رکوع کے آخر میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝۱۵۱﴾ اب یہ مضمون تیسری مرتبہ یہاں آ رہا ہے:

آیت ۱۶۴ ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''درحقیقت اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے اہلِ ایمان پر''

﴿اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ ''جب اُن میں اٹھایا ایک رسولؐ ان ہی میں سے''

یعنی ان کی اپنی قوم میں سے۔

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ﴾ ''جو تلاوت کر کے انہیں سناتا ہے اُس کی آیات''

﴿وَيُزَكِّيهِمْ﴾ ''اور انہیں پاک کرتا ہے''

﴿وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ ''اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب وحکمت کی۔''

یہ انقلابِ نبوی ﷺ کے منہاج کے چار بنیادی عناصر ہیں' جنہیں قرآن اسی ترتیب سے بیان کرتا ہے: تلاوتِ آیات' تزکیہ اور تعلیمِ کتاب وحکمت۔ یعنی حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی دعا میں جو ترتیب تھی' (اس دعا میں ''تزکیہ'' کا ذکر آخر میں تھا) اللہ نے اس ترتیب کو تبدیل کیا ہے۔ اس نکتے پر سورۃ البقرۃ آیت ۱۵۱ کے ذیل میں گفتگو ہو چکی ہے۔

﴿وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۱۶۴﴾﴾ ''اور اس سے پہلے (یعنی رسول ﷺ کی آمد سے قبل) تو وہ یقیناً کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔''

آیت ۱۶۵ ﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ؕ﴾ ''اور کیا جب تم پر ایک مصیبت آئی' جبکہ تم اس سے دگنی مصیبت اُن کو پہنچا چکے ہو تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آ گئی؟''

یعنی یہ کیوں ہو گیا؟ اللہ نے پہلے مدد کی تھی' اب کیوں نہیں کی؟

﴿قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے یہ تمہارے اپنے نفسوں (کی شرارت کی وجہ) سے ہوا ہے۔''

غلطی تم نے کی تھی' امیر کے حکم کی خلاف ورزی تم نے کی تھی' جس کا خمیازہ تم کو بھگتنا پڑا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۶۵﴾﴾ ''یقیناً اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔''

گویا اسی مضمون کو یہاں دہرا کر لایا گیا ہے جو پیچھے آیت ۱۵۲ میں بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تو اپنا وعدہ پورا کر چکا تھا اور تم دشمن پر غالب بھی آ چکے تھے' مگر تمہاری اپنی غلطی کی وجہ سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ اللہ چاہتا تو تمہیں کوئی سزا نہ دیتا' بغیر سزا دیے معاف کر دیتا' لیکن اللہ کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ تمہیں سزا دی جائے۔ اس لیے کہ ابھی تو تمہاری اس تحریک کو بڑے بڑے مراحل سے گزرنا ہے۔ اگر تم اسی طرح نظم کو توڑتے رہے اور احکام کی خلاف ورزی کرتے رہے تو پھر تم ایک منظم جماعت کے بجائے ایک انبوہ اور ''ہجومِ مؤمنین'' بن کر رہ جاؤ گے' جبکہ اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے ایک انتہائی منظم جماعت (حزب اللہ) درکار ہے۔

آیت ۱۶۶ ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ ''اور جو بھی مصیبت تم پر آئی ہے اُس دن جب دونوں لشکر آپس میں بھڑ گئے تھے وہ اللہ کے اذن سے آئی ہے''

ظاہر ہے اللہ کے اذن کے بغیر تو یہ تکلیف نہیں آ سکتی تھی۔

﴿وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۶۶﴾﴾ ''اور یہ اس لیے تھی کہ اللہ ظاہر کر دے ایمان والوں کو۔''

تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ صبر واستقامت کا مظاہرہ کرنے والے حقیقی مؤمنین کون ہیں۔

آیت ۱۶۷ ﴿وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ﴾ ''اور تاکہ ان لوگوں کو بھی ظاہر کر دے جنہوں نے منافقت اختیار کی۔''

''لِیَعْلَمَ'' کا معنی ہے ''تاکہ جان لے''۔ لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا جاننے والا ہے لہٰذا ایسے مقامات پر عموماً یوں ترجمہ کیا جاتا ہے: ''تاکہ اللہ ظاہر کر دے''۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے واقعتاً ظاہر کر دیا کہ کون مؤمن ہے اور کون منافق! عبداللہ بن اُبی جب اپنے

تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس چلا گیا تو ان کا نفاق سب پر ظاہر ہو گیا۔ اس کے بعد اہلِ ایمان کے لیے ان پر اعتبار کرنے اور ان کی چکنی چپڑی باتیں کان لگا کر سننے کا جواز ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس آزمائش کے ذریعے واضح کر دیا کہ: Who is who & what is what?۔

﴿وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ؕ﴾ ''اور ان (منافقوں) سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا (کم از کم اپنے شہر کا) دفاع کرو۔''

عبداللہ بن اُبی جب اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر واپس جا رہا تھا تو اس وقت ان سے کچھ لوگوں نے کہا ہو گا کہ بیوقوفو! کہاں جا رہے ہو؟ اس وقت تو قریش کا لشکر سامنے ہے۔ اگر ایک ہزار میں سے تین سو آدمی نکل جائیں گے تو باقی لوگوں کے دلوں میں بھی کچھ نہ کچھ کمزوری پیدا ہو گی۔ اگر تم میدانِ جنگ میں دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو کم از کم مدینہ کے دفاع کے لیے تو کمر بستہ ہو جاؤ۔ اگر مدینہ پر حملہ ہوا تو کیا ہو گا؟ اگر یہاں پر یہ لشکر شکست کھا گیا تو کیا دشمن تمہاری بہو بیٹیوں کو اپنی باندیاں بنا کر نہیں لے جائیں گے؟

﴿قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا تَّبَعْنٰكُمْ ؕ﴾ ''انہوں نے کہا کہ اگر ہم سمجھتے کہ جنگ ہونی ہے تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔''

یعنی یہ تو درحقیقت نورا کشتی ہو رہی ہے' یہ حقیقت میں جنگ ہے ہی نہیں۔ یہ جو مکہ سے محمد (ﷺ) کے ساتھی (مہاجرین) آئے ہیں اور اب یہ جو مکہ ہی سے لشکر ہم پر چڑھائی کر کے آیا ہے یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور ہمارا ان سے کوئی سروکار نہیں۔

﴿هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ﴾ ''یہ لوگ اُس دن ایمان کی نسبت کفر سے قریب تر تھے۔''

﴿يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ؕ﴾ ''یہ اپنے مونہوں سے وہ بات کہہ رہے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ﴿۱۶۸﴾﴾ ''اور اللہ اس چیز کو خوب جانتا ہے جو کچھ وہ چھپا رہے ہیں۔''

آیت ۱۶۹ ﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ؕ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور اپنے (شہید ہو جانے والے) بھائیوں کی نسبت کہا کہ اگر وہ بھی ہمارے ساتھ آ گئے ہوتے تو قتل نہ ہوتے۔''

﴿قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۶۸﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ) ان سے کہیے کہ اگر تم (اپنے اس قول میں) سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت کو ہٹا کر دکھا دو۔''

کیا تم کوشش کر کے اپنے آپ سے موت کو ٹال لو گے؟ اور کیا تمہارے گھروں میں تمہیں موت نہیں آئے گی؟

آیت ۱۶۹ ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ﴾ ''اور ہرگز نہ سمجھنا اُن لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں کہ وہ مُردہ ہیں۔''

یہ مضمون قبل ازیں سورۃ البقرۃ میں بھی آ چکا ہے: ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾﴾ ''اور مت کہو اُن کو جو اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں کہ وہ مُردہ ہیں (وہ مُردہ نہیں ہیں) بلکہ زندہ ہیں' لیکن تمہیں اس کا شعور نہیں ہے۔''

﴿بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾﴾ ''بلکہ وہ تو زندہ ہیں' اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں۔''

آیت ﴿فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ ''شاداں وفرحاں ہیں اُس پر جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کیا ہے''

﴿وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ﴾ ''اور بشارت حاصل کر رہے ہیں اُن لوگوں کے بارے میں جو ان کے پیچھے (دنیا میں) رہ گئے ہیں اور ابھی اُن سے نہیں ملے''

﴿اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۱۷۰﴾ ''کہ نہ اُن پر کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ حزن سے دوچار ہوں گے۔''

آیت ﴿يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ﴾ ''وہ خوشیاں منا رہے ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت کی وجہ سے اور اس کے فضل کی بنا پر''

﴿وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۷۱﴾ ''اور اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔''

اب آگے جو آیات آ رہی ہیں ان کے بارے میں تاریخ و سیرت کی کتابوں میں دو قسم کی روایات ملتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کفار کی فوج کے واپس چلے جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے بعض ضروری امور نمٹائے اور شہداء کی تدفین کی۔ اس کے بعد آپ ﷺ کو اچانک خیال آیا کہ کفار چلے تو گئے ہیں' لیکن ہو سکتا ہے انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو کہ انہوں نے مسلمانوں کو بالکل ختم کیوں نہیں کر دیا اور اس احساس کی وجہ سے وہ کہیں دوبارہ پلٹ کر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو قریش کے تعاقب کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دیا' تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ ہم نے ہمت نہیں ہار دی۔ اُس وقت مسلمان شدید صدمے سے دوچار تھے' ان کے جسم زخموں سے چور چور تھے' لیکن اس کے باوجود انہوں نے حضور ﷺ کے اس حکم پر لبیک کہا۔ چنانچہ حضور ﷺ جان نثاروں کی ایک جماعت کے ساتھ کفار کے تعاقب میں حمراء الاسد تک گئے جو کہ مکہ کے راستہ پر مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ادھر ابوسفیان کو واقعتاً اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور وہ مقام روحاء پر اپنی فوج کی از سرِ نو تنظیم میں مصروف تھا تاکہ پلٹ کر مدینہ پر حملہ آور ہو سکے۔ اُس نے مدینہ کی طرف جانے والے ایک تاجر کو مسلمانوں کے لیے یہ پیغام بھی دیا کہ میں بہت بڑا لشکر لے کر دوبارہ آ رہا ہوں۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ مسلمانوں کے عزم و حوصلہ میں کوئی کمی نہیں آئی ہے اور وہ ان کے تعاقب میں آ رہے ہیں تو اس نے ارادہ بدل کر لشکر کو مکہ کی طرف کوچ کا حکم دے دیا۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ روایات میں یوں آتا ہے کہ ابوسفیان جاتے ہوئے مسلمانوں سے یہ کہہ گیا تھا کہ اگلے سال بدر میں پھر ہمارا مقابلہ ہوگا۔ یعنی ایک سال پہلے بدر میں جنگ ہوئی تھی' اب اُحد میں میدان لگا۔ اس کے بعد اگلے سال ہمارے اور تمہارے درمیان تیسرا مقابلہ پھر بدر میں ہوگا۔ چنانچہ اگلے سال رسول اللہ ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو لے کر بدر تک گئے۔ یہ مہم ''بدرِ صُغریٰ'' کہلاتی ہے۔ ادھر سے ابوسفیان بھی پورے لاؤ لشکر کے ساتھ مکہ سے نکلا۔ اس مرتبہ بھی کچھ لوگوں نے اہلِ ایمان میں خوف و ہراس پھیلانے کی کوشش کی کہ لوگو! کیا کر رہے ہو؟ قریش تو بہت بڑا لشکر لے کر آ رہے ہیں' تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکو گے! بہرحال اس پروپیگنڈا کے جواب میں مسلمانوں نے صبر و توکل کا مظاہرہ کیا اور وہ کلمات کہے جو آگے (آیت ۱۷۳ میں) آ رہے ہیں۔ تو یہ آیات مذکورہ دونوں واقعات پر منطبق ہو سکتی ہیں۔

آیت ﴿اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ﴾ ''جن لوگوں نے لبیک کہی اللہ اور رسولؐ کی پکار پر اس کے بعد کہ ان کو چرکا لگ چکا تھا۔''

یہ آیت سابقہ آیات کے تسلسل میں آئی ہے۔ یعنی اس اجرِ عظیم کے مستحق وہ لوگ ٹھہریں گے جن کے عزم و ایمان میں اُحد کی شکست کا زخم کھانے کے بعد بھی کوئی کمی نہ آئی اور جونہی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے انہیں ایک تازہ مہم کے لیے پکارا گیا وہ فوراً تیار ہو گئے۔

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۲﴾﴾ ''ان میں سے جو بھی محسنین اور متقین ہیں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

آیت ۱۷۳ ﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہو گئی ہیں' پس ان سے ڈرو!''

﴿فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا ۖ﴾ ''تو اس بات نے ان کے ایمان میں اور زیادہ اضافہ کر دیا''

﴿وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ﴿۱۷۳﴾﴾ ''اور انہوں نے کہا اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔'' اُسی کا سہارا ہمارے لیے سب سے اچھا سہارا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بے خوف ہو کر مقابلے کے لیے نکلے۔

آیت ۱۷۴ ﴿فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ﴾ ''پس وہ لوٹ آئے اللہ کی نعمت اور اُس کے فضل کے ساتھ''

ابوسفیان کو جب پتا چلا کہ محمد ﷺ ہمارے تعاقب میں آ رہے ہیں تو اس نے عافیت اسی میں سمجھی کہ مکہ کی راہ لی جائے۔ اسی طرح یہ آیات ''بدرِ صُغریٰ'' سے متعلق روایات پر بھی منطبق ہوتی ہیں کہ ابوسفیان نے جونہی سنا کہ مسلمان ان کے مقابلے کے لیے بدر میں پہنچ چکے ہیں تو وہ لشکر کو لے کر واپس چلا گیا اور مقابلہ میں نہ آیا۔ چنانچہ لشکرِ قریش کے واپس چلے جانے کے بعد مسلمان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حضور سرخرو ہو کر خیریت سے اپنے گھروں کو لوٹے۔

﴿لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ﴾ ''ان کو کسی قسم کا بھی ضرر نہ پہنچا''

انہیں اس مہم میں کوئی تکلیف نہیں پہنچی۔ یہ اللہ کی طرف سے ایک آزمائش تھی جس میں وہ پورے اُترے۔

﴿وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۭ﴾ ''اور انہوں نے تو اللہ کی رضا کی پیروی کی۔''

انہیں اللہ کی رضا و خوشنودی پر چلنے کا شرف حاصل ہو گیا۔

﴿وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۷۴﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ بڑے فضل کا مالک ہے۔''

آیت ۱۷۵ ﴿اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَاۗءَهٗ ۠﴾ ''(اے مسلمانو!) یہ شیطان ہے جو تمہیں ڈراتا ہے اپنے ساتھیوں سے''

وہ تو چاہتا ہے کہ اپنے ساتھیوں یعنی حزب الشیطان کا خوف تم پر طاری کر دے۔ اس کے ایک معنی یہ بھی لیے گئے ہیں کہ شیطان اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے۔ یعنی شیطان کی اس تخویف کا اثر انہی پر ہوتا ہے جو اس کے ولی ہوتے ہیں' جبکہ اولیاء اللہ پر شیطان کی طرف سے اس قسم کی وسوسہ اندازی کا اثر نہیں ہوتا۔

﴿فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ﴾ ''تو تم ان سے نہ ڈرو' مجھ سے ڈرو''

﴿اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۵﴾﴾ ''اگر تم مؤمن صادق ہو۔''

آیت ۱۷۶ ﴿وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) یہ لوگ آپ کے لیے باعثِ غم نہ بنیں جو کفر کے معاملے میں بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔''

مدینہ کے یہود اور مکہ کے مشرکین ہر وقت مسلمانوں کے خلاف ساز باز میں مصروف رہتے تھے۔ کبھی یہودیوں کا کوئی وفد سردارانِ مکہ کے پاس جا کر کہتا کہ تم مسلمانوں پر چڑھائی کرو، ہم اندر سے تمہاری مدد کریں گے۔ کبھی قریش اسی طرح کی کسی پیشکش کے ساتھ یہودیوں سے رابطہ کرتے۔ گویا آج کل کی اصطلاح میں ان کے مابین یہ Diplomatic Activity مسلسل جاری رہتی تھی۔ ان حالات میں یہاں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کی وساطت سے اہلِ ایمان کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ آپ لوگ ان کی سرگرمیوں سے رنجیدہ نہ ہوں، ان کی ساری ریشہ دوانیوں کی حیثیت محض سیلاب کے اوپر آ جانے والے جھاگ کی سی ہے۔

﴿اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۭ﴾ ''وہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔''

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ﴾ ''اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔''

یہ گویا اللہ کے اس فیصلے کا ظہور ہے کہ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہو۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۱۷۶﴾ ''اور اُن کے لیے تو بڑا عذاب ہے۔''

آیت ۱۷۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ﴾ ''یقیناً جن لوگوں نے ایمان ہاتھ سے دے کر کفر خرید لیا وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔''

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۷۷﴾ ''اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۱۷۸ ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ﴾ ''اور مت سمجھیں یہ کافر کہ ہم انہیں جو مہلت دے رہے ہیں وہ ان کے حق میں بہتر ہے۔''

کافروں کو مہلت اس لیے ملتی ہے کہ وہ اپنے کفر میں اور بڑھ جائیں تاکہ اپنے آپ کو بُرے سے بُرے عذاب کا مستحق بنا لیں۔ چنانچہ اگر اللہ ان کو ڈھیل دے رہا ہے تو وہ اس پر خوش نہ ہوں۔

﴿اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ﴾ ''ہم تو ان کو صرف اس لیے ڈھیل دیتے ہیں تاکہ وہ گناہ میں اور اضافہ کر لیں۔''

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۱۷۸﴾ ''اور ان کے لیے اہانت آمیز عذاب ہوگا۔''

آیت ۱۷۹ ﴿مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ﴾ ''اللہ وہ نہیں کہ چھوڑے رکھے مسلمانوں کو اس حالت میں جس پر تم ہو''

﴿حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ﴾ ''یہاں تک کہ وہ خبیث کو طیب سے ممیز کر دے۔''

یہ آیت بھی فلسفۂ آزمائش کے ضمن میں بہت اہم ہے۔ اس میں اس سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور صالح بندوں کو تکالیف میں کیوں ڈالتا ہے، حالانکہ وہ تو قادرِ مطلق ہے، وہ آنِ واحد میں جو چاہے کر سکتا ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ بات اللہ کی حکمت کے مطابق نہیں ہے کہ وہ تمہیں اسی حال میں چھوڑے رکھے جس پر تم ہو۔ ابھی تمہاری صفوں میں کمزور اور پختہ ایمان والے گڈمڈ ہیں، بلکہ ابھی تو منافق اور مؤمن بھی گڈمڈ ہیں۔ تو جب تک تمہاری اجتماعیت سے یہ تمام ناپاک عناصر نکال نہ دیے جائیں اُس

وقت تک تم آئندہ پیش آنے والے مشکل اور کٹھن حالات کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔ ابھی تو تم اپنی قوم کے لوگوں سے نبرد آزما ہو۔ مستقبل میں تمہیں سلطنتِ کسریٰ سے ٹکر لینی ہے' سلطنت روما کے مقابلے کے لیے نکلنا ہے۔ ان آزمائشوں کا مقصد یہ ہے کہ تمہاری اجتماعیت کی تطہیر (purge) ہوتی رہے' یہاں تک کہ منافقین اور صادق الایمان لوگ بالکل نکھر کر علیحدہ ہو جائیں۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کا یہ بھی طریقہ نہیں ہے کہ تمہیں غیب کی خبریں بتائے''

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۠﴾ ''لیکن (اس کام کے لیے) اللہ منتخب کر لیتا ہے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے۔''

وہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے غیب کے حالات بھی بتاتا ہے۔ رسولوں کو غیب از خود معلوم نہیں ہوتا' اللہ کے بتانے سے معلوم ہوتا ہے۔ یعنی ان آزمائشوں میں کیا حکمتیں ہیں اور ان میں تمہارے لیے کیا خیر پنہاں ہے' ہر چیز ہر ایک کو نہیں بتائی جاتی' البتہ ہم اپنے رسولوں کو غیب کی خبریں بتاتے رہتے ہیں۔

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ﴾ ''پس ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اُس کے رسولوںؑ پر۔''

﴿وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۷۹﴾﴾ ''اور اگر تم (یہ دو شرطیں پوری کر دو گے) ایمان میں ثابت قدم رہو گے اور تقویٰ پر کاربند رہو گے تو تمہارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔''

آیت ۱۸۰ ﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ﴾ ''اور نہ خیال کریں وہ لوگ جو بخل کر رہے ہیں اُس مال میں جو اللہ نے انہیں دیا ہے اپنے فضل میں سے کہ یہ بخل ان کے حق میں بہتر ہے۔''

ظاہر بات ہے جب جنگ اُحد کے لیے تیاری ہو رہی ہو گی تو حضور ﷺ نے مسلمانوں کو انفاقِ مال کی دعوت دی ہو گی تاکہ اسبابِ جنگ فراہم کیے جا سکیں۔ اُس وقت جن لوگوں نے دولت مند ہونے کے باوجود بخل کیا' یہ اشارہ ان کی طرف ہے کہ انہوں نے بخل کر کے جو اپنا مال بچا لیا وہ یہ نہ سمجھیں کہ انہوں نے کوئی اچھا کام کیا ہے۔ یہ مال اللہ نے انہیں اپنے فضل سے عطا کیا تھا' اس میں بخل سے کام لے کر انہوں نے اچھا نہیں کیا۔

﴿بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ﴾ ''بلکہ یہ ان کے حق میں بہت بُرا ہے۔''

﴿سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ ''اسی مال کے طوق بنا کر ان کی گردنوں میں پہنائے جائیں گے جس میں انہوں نے بخل کیا تھا' قیامت کے دن۔''

﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور آسمانوں اور زمین کی وراثت بالآخر اللہ ہی کے لیے ہے۔''

دنیا کا مال و اسباب آج تمہارے پاس ہے تو کل کسی اور کے پاس چلا جائے گا اور بالآخر سب کچھ اللہ کے لیے رہ جائے گا۔ ظاہر ہے آسمانوں اور زمین کی میراث کا حقیقی وارث تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۸۰﴾﴾ ''اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُس سے باخبر ہے۔''

یہاں وہ چھ رکوع مکمل ہو گئے ہیں جو غزوۂ اُحد کے حالات و واقعات اور ان پر تبصرے پر مشتمل تھے۔ اس سورۂ مبارکہ کے آخری دو رکوعوں کے کلام کی نوعیت ''حاصلِ کلام'' (concluding remarks) کی ہے۔

آیات ۱۸۱ تا ۱۸۹

لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ نَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا
وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّ نَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ
وَ اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾ اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ
حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَ بِالَّذِيْ
قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ
جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَ اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ
اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ
مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾ وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا
تَكْتُمُوْنَهٗ ۫ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا
تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّ يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ ع

آیت ۱۸۱ ﴿لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَآءُ ۘ﴾ ''اللہ نے سن لیا ہے قول ان لوگوں کا جنہوں نے کہا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔''

یہ بات کہنے والوں میں منافقین بھی شامل تھے اور یہودی بھی۔ جب رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کو انفاقِ مال کی ترغیب دیتے اور فرماتے کہ اللہ کو قرضِ حسنہ دو تو یہودی اور ان کے زیر اثر منافقین اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے کہ ہاں اللہ فقیر ہو گیا ہے جو ہم سے قرض مانگ رہا ہے' جبکہ ہم غنی ہیں' ہمارے پاس دولت ہے۔

﴿سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا﴾ ''ہم لکھ رکھیں گے جو کچھ انہوں نے کہا ہے''

ان الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضگی جھلکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فوراً تو گرفت نہیں کرتا لیکن ایک وقت آئے گا جس دن انہیں اپنے اس قول کی پوری پوری سزا مل جائے گی۔ اور صرف یہی نہیں:

﴿وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ﴾ ''اور ان کے ناحق قتلِ انبیاء کو بھی (ہم لکھ رکھیں گے)''

یہ یہودیوں کا ذکر ہے کہ اس سے پہلے یہ لوگ جو اپنے انبیاء کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں ان کا یہ جرم بھی ان کے نامۂ اعمال میں ثبت ہے۔

﴿وَنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿۱۸۱﴾﴾ ''اور ہم کہیں گے اب چکھو مزا اس جلا دینے والی آگ کے عذاب کا۔''

آیت ۱۸۲ ﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ ''یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے''

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۱۸۲﴾﴾ ''اور اللہ تو اپنے بندوں کے حق میں ہرگز ظالم نہیں ہے۔''

آیت ۱۸۳ ﴿اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ﴾ ''جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہم سے ایک عہد لے لیا تھا''

﴿اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ﴾ ''کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی پیش نہ کرے جسے آگ کھا جائے۔''

یہاں روئے سخن پھر یہود کی طرف ہو گیا ہے۔ نوعِ انسانی جب عہدِ طفولیت میں تھی تو خرقِ عادت واقعات بہت ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ معمول بھی تھا کہ اگر کوئی شخص اللہ کے حضور کوئی جانور ذبح کر کے پیش کرتا تو آسمان سے ایک آگ اُترتی جو اسے بھسم کر دیتی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ یہ قربانی قبول ہو گئی۔ جیسے ہابیل اور قابیل کے قصے میں آیا ہے کہ: ﴿اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ﴾ (المائدۃ:۲۷) ''جب دونوں نے قربانی پیش کی تو ایک کی قربانی قبول ہو گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی''۔ گویا آسمان سے اترنے والی آگ کی وجہ سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا تھا کہ کس کی قربانی قبول ہوئی ہے اور کس کی نہیں ہوئی۔ قربانی کی قبولیت سے متعلق یہ حسی علامت بنی اسرائیل کے ابتدائی دور میں بھی موجود تھی۔ اس لیے مدینہ کے یہود نے کٹ حجتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ہم سے تو اللہ نے یہ عہد لے لیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ وہ یہ معجزہ نہ دکھائے۔ تو اگر محمد (ﷺ) واقعی رسولؐ ہیں تو یہ معجزہ دکھائیں۔ اس کا جواب دیا جا رہا ہے:

﴿قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ''(اے نبی ﷺ! ان سے) کہیے تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آ چکے ہیں واضح معجزوں کے ساتھ''

﴿وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ﴾ ''اور وہ چیز بھی لے کر آئے جس کے لیے تم کہہ رہے ہو''

انہوں نے سوختنی قربانی کا معجزہ بھی دکھایا جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو۔

﴿فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾﴾ ''پھر تم نے انہیں کیوں قتل کیا اگر تم سچے ہو؟''

آیت ۱۸۴ ﴿فَاِنْ كَذَّبُوْكَ﴾ ''پھر (اے نبی ﷺ) اگر وہ آپ کو جھٹلا دیں''

تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ معاملہ صرف آپؐ ہی کے ساتھ نہیں ہوا۔

﴿فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ ''تو آپؐ سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کو جھٹلایا جا چکا ہے''

یہ تو اس راستے کا ایک عام تجربہ ہے جس سے آپؐ کو بھی گزرنا پڑے گا۔

﴿جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾﴾ ''جو آئے تھے واضح نشانیاں اور صحیفے اور روشن کتاب لے کر۔''

آیت ۱۸۵ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ﴾ ''ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔''

موت تو ایک دن آ کر رہنی ہے۔

﴿وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾ ''اور تم کو تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ تو قیامت ہی کے دن دیا جائے گا۔''

﴿فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ﴾ ''تو جو کوئی بچا لیا گیا جہنم سے اور داخل کر دیا گیا جنت میں تو وہ کامیاب ہو گیا۔''

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ: اے اللہ! ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرمانا!

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ١٨٥﴾ ''اور یہ دنیا کی زندگی تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف دھوکے کا سامان ہے۔''

آیت ۱۸۶ ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۡ﴾ ''(مسلمانو! یاد رکھو) تمہیں لازماً آزمایا جائے گا تمہارے مالوں میں بھی اور تمہاری جانوں میں بھی۔''

یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ البقرۃ کے انیسویں رکوع میں گزر چکا ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ﴾ (آیت ۱۵۵) ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف سے اور بھوک سے اور مالوں' جانوں اور ثمرات کے نقصان سے''۔ یہاں مجہول کا صیغہ ہے کہ تمہیں لازماً آزمایا جائے گا' تمہاری آزمائش کی جائے گی تمہارے مالوں میں بھی اور تمہاری جانوں میں بھی۔ کان کھول کر سن لو کہ یہ ایمان کا راستہ پھولوں کی سیج نہیں ہے' یہ کانٹوں بھرا بستر ہے۔ ایسا نہیں ہو گا کہ ٹھنڈے ٹھنڈے' بغیر تکلیفیں اٹھائے تمہیں جنت مل جائے گی۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۲۱۴) میں ہم یہ تنبیہہ بھی پڑھ چکے ہیں: ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تو تم پر وہ حالات و واقعات وارد نہیں ہوئے جو تم سے پہلوں پر ہوئے تھے.....''

﴿وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ﴾ ''اور تمہیں لازماً سننی پڑیں گی ان لوگوں سے بھی جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان سے بھی جنہوں نے شرک کیا بڑی تکلیف دہ باتیں۔''

اے مسلمانو! تم لوگ یہ سب کچھ سنو اور صبر کرو۔ ابتدائی مکی دور میں رسول اللہ ﷺ کو بھی ایسی ہی ہدایات دی گئی تھیں: ﴿وَاصْبِرْ عَلٰي مَا يَقُوْلُوْنَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا ١٠﴾ (المزمل) ''اور ان باتوں پر صبر کیجیے جو یہ لوگ کہتے ہیں اور وضع داری کے ساتھ ان سے الگ ہو جائیے''۔ ذرا تصور کیجیے' آپ ﷺ کو کیا کچھ نہیں سننا پڑا۔ کسی نے کہہ دیا مجنون ہے' کسی نے کہہ دیا شاعر ہے' کسی نے کہا ساحر ہے' کسی نے کہا مسحور ہے۔ سورۃ الحجر کے آخر میں ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ٩٧﴾ ''(اے نبی ﷺ) ہمیں خوب معلوم ہے کہ یہ (مشرکین) جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے آپ کا سینہ بھنچتا ہے''۔ ان کی زبانوں سے جو کچھ آپ کو سننا پڑ رہا ہے اس سے آپ کو تکلیف پہنچتی ہے' لیکن صبر کیجیے! وہی بات یہاں مسلمانوں سے کہی جا رہی ہے۔

﴿وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ١٨٦﴾ ''اور اگر تم صبر کرتے رہو گے (ثابت قدم رہو گے) اور تقویٰ کی روش اختیار کیے رکھو گے تو بے شک یہ بڑے ہمت کے کاموں میں سے ہے۔''

آیت ۱۸۷ ﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ﴾ ''اور یاد کرو جبکہ اللہ نے ان لوگوں سے ایک قول و قرار لیا تھا جن کو کتاب دی گئی تھی''

﴿لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ﴾ ''کہ تم لازماً اسے لوگوں کے سامنے واضح کرو گے اور اسے چھپاؤ گے نہیں''

﴿فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ﴾ ''تو انہوں نے اس عہد کو پسِ پشت پھینک دیا''

﴿وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ﴾ ''اور اس کی بڑی حقیری قیمت وصول کر لی۔''

﴿فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝۱۸۷﴾ ''تو بہت ہی بُری شے ہے جو وہ (اس کے بدلے میں) حاصل کر رہے ہیں۔''

آیت ۱۸۸ ﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا﴾ ''آپ ان کے بارے میں خیال نہ کریں جو اپنے کیے پر خوش ہوتے ہیں'' اگر کبھی بھلائی کا کوئی کام کر لیتے ہیں' کسی کو کچھ دے دیتے ہیں تو اس پر بہت اتراتے ہیں' اکڑتے ہیں کہ ہم نے یہ کچھ کر لیا ہے۔

﴿وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا﴾ ''اور (اس سے بھی بڑھ کر) چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف کی جائے ایسے کاموں پر جو انہوں نے کیے ہی نہیں''

آج کل اس کی سب سے بڑی مثال سیاس نامے ہیں' جو تقریبات میں مدعو شخصیات کو پیش کیے جاتے ہیں۔ ان سپاس ناموں میں ان حضرات کے ایسے ایسے کارہائے نمایاں بیان کیے جاتے ہیں جو ان کی پشتوں میں سے بھی کسی نے نہ کیے ہوں۔ اس طرح ان کی خوشامد اور چاپلوسی کی جاتی ہے اور وہ اسے پسند کرتے ہیں۔

﴿فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ﴾ ''تو آپ ان کے بارے میں یہ خیال نہ کریں کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے۔''

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۸۸﴾ ''اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۱۸۹ ﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۸۹﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

آیات ۱۹۰۔۲۰۰

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝۱۹۰ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝۱۹۱ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝۱۹۲ رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۫ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَ تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ ۝۱۹۳ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَ لَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۱۹۴ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَ قٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ

وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ۫ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْكُمْ وَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِمْ خٰشِعِیْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَ صَابِرُوْا وَ رَابِطُوْا ۟ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع

سورۂ آل عمران کا آخری رکوع قرآن مجید کے عظیم ترین مقامات میں سے ہے۔ اس کی پہلی چھ آیات کے بارے میں روایت آتی ہے کہ جس شب میں یہ نازل ہوئیں' اُس پوری رات حضور ﷺ پر رقت طاری رہی اور آپ ﷺ کھڑے' بیٹھے' لیٹے ہوئے روتے رہے۔ نمازِ تہجد کے دوران بھی آپؐ پر رقت طاری رہی۔ پھر آپؐ نے بہت طویل سجدہ کیا' اس میں بھی گریہ طاری رہا اور سجدہ گاہ آنسوؤں سے تر ہوگئی۔ پھر آپؐ کچھ دیر لیٹے رہے لیکن وہ کیفیت برقرار رہی۔ یہاں تک کہ صبح صادق ہوگئی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ جب فجر کی نماز کی اطلاع دینے کے لیے حاضر ہوئے اور آپؐ کو اس کیفیت میں دیکھا تو وجہ دریافت کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے بلال' میں کیوں نہ روؤں' آج کی شب میرے ربّ نے مجھ پر یہ آیات نازل فرمائی ہیں''۔ پھر آپؐ نے ان آیات کی تلاوت فرمائی (اس روایت کو امام رازی نے تفسیر کبیر میں بیان کیا ہے) یعنی گریہ اور رقت کی وہ کیفیت شکر کے جذبے کے تحت تھی۔

یہاں یہ نکتہ بھی نوٹ کیجیے کہ سورۂ آل عمران کے بیسویں رکوع اور سورۃ البقرۃ کے بیسویں رکوع کا آغاز ایک جیسی آیات اور ایک جیسے الفاظ سے ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ کے بیسویں رکوع کی پہلی آیت کے الفاظ یہ ہیں: ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ اسی ''آیت الآیات'' کا خلاصہ یہاں آ گیا ہے:

آیت ﴿۱۹۰﴾ ﴿اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ﴾ ''یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں''

﴿لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۰﴾﴾ ''ہوش مند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔''

سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ ان الفاظ پر ختم ہوئی تھی: ﴿لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾﴾ ''اُن لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں''۔ یہاں ان لوگوں کو ''اُولوا الالباب'' کا نام دیا گیا۔ یہ ہدایت کا پہلا قدم ہے کہ کائنات کو دیکھو' مظاہرِ فطرت کا مشاہدہ کرو ؎

کھول آنکھ' زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ　　مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

یہ سب آیاتِ الٰہیہ ہیں' ان کو دیکھو اور اللہ کو پہچانو۔ اگلا قدم یہ ہے کہ جب اللہ کو پہچان لو تو اب اُسے یاد رکھو۔ یعنی ؎

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر فکر را کامل نہ دیدم جز بہ ذکر!

آیت ﴿الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾ ''جو اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں' کھڑے بھی' بیٹھے بھی اور اپنے پہلوؤں پر بھی''

﴿وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ﴾ ''اور مزید غور وفکر کرتے رہتے ہیں آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں۔''

اس غور وفکر سے وہ ایک حتمی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور پکار اٹھتے ہیں:

﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ﴾ ''اے ہمارے ربّ! تُو نے یہ سب کچھ بے مقصد تو پیدا نہیں کیا ہے۔''

ظاہر ہے ایسے غور وفکر کے بعد لازماً انسان کا ذہن اپنی طرف منتقل ہوتا ہے کہ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ میں کس لیے پیدا کیا گیا ہوں؟ کیا میری زندگی بس یہی ہے کہ کھاؤ پیو' اولاد پیدا کرو اور دنیا سے رخصت ہو جاؤ؟ اس طرح جب انسان اپنی زندگی اور دنیا کے نظام پر غور کرتا ہے تو وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ انسان کی دنیوی زندگی ادھوری اور نامکمل ہے' اس لیے کہ اس دنیا میں نہ تو انسانی اعمال کے نتائج سامنے آتے ہیں اور نہ ہی انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ ملتا ہے۔ بلکہ اس دنیا میں تو اکثر یہی دیکھا گیا ہے کہ نیکوکار فاقوں سے رہتے ہیں اور بدکار عیش کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ہونی چاہیے' اس دنیا کے علاوہ کوئی اور دنیا ہونی چاہیے جس میں انسان کو اچھے برے اعمال کا بھرپور بدلہ ملے اور مکافاتِ عمل ہو۔ لہٰذا صاحبِ شعور لوگ (اولوالالباب) زمین وآسمان کی تخلیق پر غور وفکر کے بعد بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

﴿سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۱۹۱﴾ ''تُو پاک ہے (اس سے کہ کوئی عبث کام کرے)' پس تُو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے!''

تُو نے یقیناً ایک دوسری دنیا تیار کر رکھی ہے' جس میں جزا وسزا کے لیے جنت بھی ہے اور جہنم بھی!

آیت ﴿رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ﴾ ''اے ہمارے ربّ! جس کو تُو نے داخل کر دیا آگ میں بے شک اس کو تُو نے رسوا کر دیا۔''

﴿وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۱۹۲﴾ ''اور ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوں گے۔''

آیت ﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا﴾ ''اے ہمارے ربّ! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا''

﴿يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۡ﴾ ''جو ایمان کی ندا دے رہا تھا کہ ایمان لاؤ اپنے ربّ پر' تو ہم ایمان لے آئے۔''

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے اس اقرار کے بعد ایسے لوگوں کے کانوں میں جونہی کسی نبی یا رسول کی پکار آتی ہے تو وہ بلا تأمل فوراً لبیک کہتے ہیں' جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فوری طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت قبول کر لی' اس لیے کہ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت تک تو وہ خود اپنی عقل اور فکر کے ذریعے پہنچ چکے تھے۔ یہاں سورۃ الفاتحہ کے مضامین کو بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ ایسے اولوالالباب لوگ اپنی سلامتیٔ طبع' سلامتیٔ فطرت اور سلامتیٔ عقل کی رہنمائی میں جب اللہ کو پہچان لیتے ہیں' آخرت کو پہچان لیتے ہیں اور یہ بھی طے کر لیتے ہیں کہ انہیں اللہ کی بندگی ہی کا راستہ اختیار کرنا ہے' تو اس کے بعد وہ نبوت ورسالت کی راہنمائی کی ضرورت محسوس کرتے

ہیں‘ لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کے حضور دستِ سوال دراز کرتے ہیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝﴾ کہ اے اللہ! اب تو ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرما۔ یہاں بھی یہی مضمون ہے کہ اب ایسے شخص کے سامنے اگر کسی نبی کی دعوت آئے گی تو اُس کا ردِّعمل کیا ہوگا۔ اب آگے ایک بڑی پیاری دُعا آ رہی ہے۔ یہ اُس دُعا سے جو سورۃ البقرہ کے آخر میں آئی تھی بعض پہلوؤں سے کہیں زیادہ عظیم ہے۔

﴿رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا﴾ ’’اے ہمارے ربّ‘ ہمارے گناہ بخش دے!‘‘

﴿وَ كَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا﴾ ’’اور ہماری برائیاں ہم سے دور کر دے!‘‘

ہمارے نامہ اعمال کے دھبے بھی دھو دے اور ہمارے دامنِ کردار پر جو داغ ہیں وہ بھی صاف کر دے۔

﴿وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝۱۹۳﴾ ’’اور ہمیں وفات دیجیو اپنے نیکوکار (اور وفادار) بندوں کے ساتھ۔‘‘

آیت ۱۹۴ ﴿رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ﴾ ’’اے ہمارے رب‘ ہمیں عطا فرما وہ سب کچھ جس کا تُو نے وعدہ کیا ہے ہم سے اپنے رسولوں کے ذریعے سے‘‘

﴿وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ ’’اور ہمیں رسوا نہ کیجیو قیامت کے دن۔‘‘

﴿اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝۱۹۴﴾ ’’یقیناً تُو اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا۔‘‘

ہمیں شک ہے تو اس بات میں کہ آیا ہم تیرے ان وعدوں کے مصداق ثابت ہو سکیں گے یا نہیں۔ لہٰذا تو اپنی شانِ غفاری سے ہماری کوتاہیوں کی پردہ پوشی کرنا اور ہمیں وہ سب کچھ عطا کر دینا جس کے بارے میں تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے وعدہ کیا ہے۔

آیت ۱۹۵ ﴿فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ﴾ ’’تو ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی‘‘

یہ ہے دعا کی قبولیت کی انتہا کہ اس دعا کے فوراً بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کا اعلان ہو رہا ہے۔

﴿اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ﴾ ’’کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے کسی عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں‘ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔‘‘

﴿بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ﴾ ’’تم سب ایک دوسرے ہی میں سے ہو۔‘‘

ایک ہی باپ کے نطفے سے بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی‘ اور ایک ہی ماں کے رحم میں بیٹا بھی پلا ہے اور بیٹی بھی۔

﴿فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ﴾ ’’سو جنہوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکال دیے گئے‘‘

﴿وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ﴾ ’’اور جنہیں میری راہ میں ایذائیں پہنچائی گئیں‘‘

﴿وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾ ’’اور جنہوں نے (میری راہ میں) جنگ کی اور جانیں بھی دے دیں‘‘

﴿لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ ’’میں لازماً اُن سے اُن کی بُرائیوں کو دور کر دوں گا‘‘

ان کے نامۂ اعمال میں اگر کوئی دھبے ہوں گے تو انہیں دھو دوں گا۔

﴿وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ﴾ ’’اور لازماً داخل کروں گا انہیں ان باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔‘‘

﴿ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ﴾ ’’اور یہ بدلہ ہوگا اللہ کے پاس سے۔‘‘

یعنی اللہ تعالیٰ کے خاص خزانۂ فضل سے۔

﴿وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾﴾ ''اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔''

اب ہم اس سورت کی آخری پانچ آیات کا مطالعہ کریں گے۔ ان آیات کی حیثیت اس سورۂ مبارکہ کے تمام مباحث پر ''خاتمۂ کلام'' کی ہے۔ یاد رہے کہ اس سورت میں اہلِ کتاب کا عمومی ذکر بھی ہوا ہے اور یہود و نصاریٰ کا الگ الگ بھی۔ پھر اس میں اہلِ ایمان کا ذکر بھی ہے اور مشرکین کا بھی۔ اب فرمایا:

آیت ۱۹۶ ﴿لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کو دھوکے میں نہ ڈالے ان کافروں کی چلت پھرت شہروں کے اندر۔''

یہ کافر جو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں' اور اسلام اور مسلمانوں کو ختم کرنے کے لیے سازشیں کر رہے ہیں' جمعیتیں فراہم کر رہے ہیں' اس سے آپؐ کسی دھوکے میں نہ آئیں' کسی مغالطے کا شکار نہ ہوں' ان کی طاقت کے بارے میں کہیں آپؐ مرعوب نہ ہو جائیں۔

آیت ۱۹۷ ﴿مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۚ﴾ ''یہ تو بس تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے''

یہ تو محض چند روزہ زندگی کے لیے ہم نے انہیں کچھ ساز و سامان دے دیا ہے۔

﴿ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ﴾ ''پھر ان کا ٹھکانہ جہنم ہی ہے۔''

﴿وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾﴾ ''اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے۔''

آیت ۱۹۸ ﴿لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ﴾ ''اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنے ربّ کا تقویٰ اختیار کیا''

﴿لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ''اُن کے لیے باغات ہیں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' جن میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے''

﴿نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ﴾ ''یہ (ان کے لیے) ابتدائی مہمان نوازی ہوگی اللہ کی طرف سے۔''

﴿وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾﴾ ''اور مزید جو اللہ کے پاس ہے وہ کہیں بہتر ہے نیکوکاروں کے لیے۔''

جنت کی اصل نعمتیں تو بیان میں آ ہی نہیں سکتیں۔ ان کے بارے میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی متفق علیہ حدیث یاد رکھیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى : اَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ)) (۱۶)

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: میں نے اپنے صالح بندوں کے لیے (جنت میں) وہ کچھ تیار کر رکھا ہے جو نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا' اور نہ ہی کسی انسان کے دل میں اس کا خیال ہی گزرا۔''

۱۶۔ صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ما جاء فی صفة الجنة وانها مخلوقة' و کتاب تفسیر القرآن' باب قوله فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرة اعین۔ و صحیح مسلم' کتاب الجنة و صفة نعیمها و اهلها۔

چنانچہ قرآن وحدیث میں جنت کی جن نعمتوں کا تذکرہ ہے ان کی حیثیت اہلِ جنت کے لیے نُزُل (ابتدائی مہمان نوازی) کی ہوگی۔

آیت ۱۹۹ ﴿وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ﴾ ''اور بے شک اہلِ کتاب میں وہ بھی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر''

﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ﴾ ''اور اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر نازل کیا گیا اور اس پر بھی جو اُن کی طرف نازل کیا گیا''

﴿خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ﴾ ''وہ اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں''

ان کے دلوں میں اللہ کا خوف ہے' وہ عاجزی اور تواضع اختیار کرتے ہیں۔

﴿لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ ''وہ اللہ کی آیات کو حقیری قیمت پر فروخت نہیں کرتے۔''

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾ ''ایسے ہی لوگوں کا اجر اُن کے رب کے پاس محفوظ ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۱۹۹﴾ ''یقیناً اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔''

وہ حساب لینے میں دیر نہیں لگاتا۔ آخری آیت پھر بہت جامع ہے:

آیت ۲۰۰ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا﴾ ''اے اہلِ ایمان! صبر کرو اور صبر میں اپنے دشمنوں سے بڑھ جاؤ''

مصابرت بابِ مفاعلہ سے ہے اور اس باب میں مقابلے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ صبر کے معنی ہیں برداشت کرنا اور ثابت قدم رہنا' جبکہ مصابرت کے معنی صبر و استقامت میں دشمن سے بڑھ جانے کے ہیں۔ یعنی اے مسلمانو! صبر تو تمہارے دشمن بھی کر رہے ہیں۔ تمہیں آج چرکا لگا ہے تو انہیں ایک سال پہلے ایسا ہی چرکا لگا تھا۔ اتنے بڑے چرکے کے بعد جب وہ ایک سال کے اندر پھر چڑھائی کر کے آ گئے ہیں تو تم اپنا دل غمگین کر کے کیوں بیٹھے ہوئے ہو؟ تمہیں تو ان سے بڑھ کر صبر کرنا ہے' ان سے بڑھ کر قربانیاں دینی ہیں' تبھی تو تم اللہ کے سچے وفادار ثابت ہو گے۔

﴿وَرَابِطُوْا﴾ ''اور مربوط رہو۔''

مرابطہ پہرے کو بھی کہتے ہیں اور نظم وضبط (discipline) کی پابندی کرتے ہوئے باہم جڑے رہنے کو بھی۔ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو شکست نظم کے ڈھیلے پن اور سمع وطاعت میں کوتاہی کے باعث ہوئی تھی۔ لہٰذا یہاں صبر و مصابرت کے ساتھ ساتھ نظم کی پابندی اور باہم مربوط رہنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۲۰۰﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

یہ آخری اور اہم ترین چیز ہے۔ یہ سب کچھ کرو گے تو فلاح ملے گی۔ ایسے ہی گھر بیٹھے تم فوز وفلاح سے ہمکنار نہیں ہو سکو گے۔

بارک اللہ لی ولکم فی القرآنِ العظیم ۔ ونفعنی وایاکم بالآیات والذکر الحکیم۝۝

سُوْرَۃُ النِّسَآءِ

تمہیدی کلمات

قرآن مجید میں مکی اور مدنی سورتوں کے جو گروپ ہیں ان میں سے پہلا گروپ پانچ سورتوں پر مشتمل ہے۔ اس گروپ میں مکی سورۃ صرف سورۃ الفاتحہ ہے' جو حجم میں بہت چھوٹی مگر معنی و مفہوم اور عظمت و فضیلت میں بہت بڑی ہے۔ اس کے بعد چار سورتیں مدنی ہیں: البقرۃ' النساء' آل عمران اور المائدۃ۔ یہ چار سورتیں دو دو سورتوں کے دو جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ پہلا جوڑا سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران کا ہے' اور انہیں خود رسول اللہ ﷺ نے ایک مشترک نام دیا ہے "الزَّهْرَاوَيْن"۔ ان دو سورتوں میں باہم جو مناسبتیں اور مشابہتیں ہیں وہ ان کے مطالعہ کے دوران تفصیل کے ساتھ ہمارے سامنے آتی رہی ہیں۔

اب ہم مدنی سورتوں کے دوسرے جوڑے یعنی سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ کا مطالعہ کرنے جا رہے ہیں۔ ان دو جوڑوں میں ایک نمایاں فرق (contrast) یہ نظر آئے گا کہ سابقہ دونوں سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے اور اس کے فوراً بعد دونوں میں قرآنِ مجید اور کُتبِ سماویہ کی عظمت کا بیان ہے' جبکہ زیر مطالعہ دونوں سورتوں میں اس طرح کی کوئی تمہیدی گفتگو نہیں ہے' بلکہ ان میں براہِ راست خطاب ہو رہا ہے۔ البتہ نسبتِ زوجیت کے اعتبار سے زیر مطالعہ سورتوں کے بارے میں یہ نکتہ لائقِ توجہ ہے کہ سورۃ النساء کے آغاز میں صیغۂ خطاب "يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ" (اے لوگو) ہے' یعنی خطاب عام ہے' جبکہ سورۃ المائدۃ کا آغاز "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا" کے صیغے سے ہوتا ہے' یعنی سورۃ المائدہ میں خطاب خاص طور پر انسانوں میں سے اُن لوگوں سے ہے جو ایمان کے دعوے دار ہیں۔ باقی جس طرح سورۃ البقرۃ اور سورۂ آلِ عمران نصفین میں منقسم ہیں اس طرح کا معاملہ ان دونوں سورتوں کا نہیں ہے۔

اپنے اسلوب کے اعتبار سے یہ دونوں سورتیں سورۃ البقرۃ کے نصفِ ثانی کے مشابہ ہیں۔ یعنی ان میں بھی مختلف مضامین کی لڑیاں ایک ساتھ چل رہی ہیں' لیکن یہ لڑیاں ایک رسّی کی طرح آپس میں اس طرح بٹی ہوئی اور گتھی ہوئی ہیں کہ دیکھنے والے کو مسلسل نہیں بلکہ کٹواں نظر آتی ہیں۔ ظاہر ہے اگر آپ چار مختلف رنگوں کی لڑیوں کو آپس میں بٹ کر رسّی کی شکل دے دیں تو ان میں سے کوئی سا رنگ بھی مسلسل نظر نہیں آئے گا' بلکہ باری باری چاروں رنگ نظر آتے رہیں گے۔ لیکن اگر آپ اس رسّی کو کھول دیں گے تو ہر ایک لڑی الگ ہو جائے گی اور چاروں رنگ الگ الگ نظر آئیں گے۔ سورۃ البقرۃ کے نصفِ ثانی کے مضامین کے بارے میں قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ یہ مضامین مختلف رنگوں کی چار لڑیوں کی طرح ہیں' جن میں دو کا تعلق شریعت سے ہے اور دو کا جہاد فی سبیل اللہ سے۔ شریعت کی دو لڑیوں میں سے ایک لڑی عبادات کی اور دوسری معاملات کی ہے' جبکہ جہاد فی سبیل اللہ کی لڑیوں میں سے ایک لڑی جہاد بالمال یعنی انفاق فی سبیل اللہ کی اور دوسری جہاد بالنفس کی آخری شکل یعنی قتال فی سبیل اللہ کی ہے۔

سورۃ النساء کے مضامین بھی مختلف رنگوں کی باہم گتھی ہوئی تین لڑیوں کی مانند ہیں۔ مضامین کی یہ تین لڑیاں خطاب کے اعتبار سے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک لڑی تو وہ ہے جس میں خطاب اہلِ ایمان سے ہے' اور سورۃ البقرۃ کی طرح اس کے ذیل میں وہی چار

چیزیں آ رہی ہیں: قتال' اِنفاق' احکامِ شریعت اور عبادات۔ دوسری لڑی اہلِ کتاب سے خطاب کی ہے اور اس میں نصاریٰ اور یہود دونوں شامل ہیں۔ پہلی دو سورتوں (سورۃ البقرۃ اور سورۂ آل عمران) میں یہود و نصاریٰ کا معاملہ علیحدہ علیحدہ تھا' جبکہ اس سورۃ میں اہلِ کتاب کے عنوان سے ان دونوں سے ایک ساتھ خطاب ہوتا ہے۔ مضمون کی تیسری لڑی اس سورۂ مبارکہ کا وہ سب سے بڑا حصہ ہے جو منافقین سے خطاب پر مشتمل ہے' لیکن اکثر و بیشتر لوگ اس اندازِ خطاب کو سمجھ نہیں پاتے۔ اس لیے کہ قرآن مجید میں منافقین کو بھی ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے صیغے سے ہی مخاطب کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ پورے قرآن میں کہیں بھی ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ نَافَقُوْا'' کے الفاظ نہیں آئے۔ قرآن مجید میں صیغۂ خطاب ''یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ'' بھی ہے' ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا'' بھی ہے اور ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' بھی' لیکن ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ نَافَقُوْا'' کہیں نہیں ہے۔ اس لیے کہ منافقین بھی قانوناً تو مسلمان ہی تھے۔ چنانچہ یہ پہچاننے کے لیے بڑی گہری نظر کی ضرورت ہے کہ ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے الفاظ میں کس مقام پر روئے سخن مؤمنین صادقین کی طرف ہے اور کس مقام پر منافقین کی طرف۔ اگر یہ فرق ملحوظ نہ رکھا جائے تو بعض مقامات پر بڑی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً سورۃ التوبہ کا یہ مقام ملاحظہ کیجیے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ ؕ﴾ (آیت ۳۸) ''اے اہلِ ایمان! تمہیں کیا ہو جاتا ہے جب تمہیں کہا جاتا ہے کہ نکلو اللہ کی راہ میں تو تم زمین میں دھنسے جاتے ہو؟'' اس اندازِ تخاطب سے ایک سوءِ ظن پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید یہ عام مسلمانوں کا حال تھا۔ حالانکہ اس طرزِ عمل کا مظاہرہ مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ منافقین کی طرف سے ہوتا تھا' چنانچہ یہاں روئے سخن مسلمانوں کی طرف نہیں منافقین کی طرف ہے۔ مؤمنین صادقین میں سے تو ہر کوئی ہر وقت اپنے مال و جان کو ہتھیلی پر رکھے اس شعر کی عملی تصویر نظر آتا تھا: ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی!

منافقین سے خطاب کے اعتبار سے یہ سورۂ مبارکہ بہت اہم ہے' اس لیے کہ سورۃ البقرۃ میں تو لفظ نفاق کہیں آیا ہی نہیں۔ اس حوالے سے حکمتِ خداوندی شاید یہی تھی کہ اس مرض کو پہلے چھپا کر رکھا جائے اور ابتدا میں اس کی صرف علامات بیان کر دی جائیں تاکہ جو کوئی بھی اپنے اندر ان علامات کو دیکھے وہ متنبہ ہو جائے اور اپنے علاج کی فکر کرے۔ لیکن جو لوگ اس طرح متوجہ نہیں ہوئے انہیں تدریجاً نمایاں کیا گیا۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ایک دو جگہ نفاق کا لفظ آ گیا۔ لیکن اب یہاں سورۃ النساء کا بڑا حصہ منافقین سے خطاب پر مشتمل ہے۔ اس ضمن میں میرا تجزیہ یہ ہے کہ اس سورت کی ۱۷۶ آیات میں سے ۵۵ آیات میں روئے سخن مؤمنین صادقین کی طرف ہے' ۳۷ آیات میں اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے مشترک طور پر خطاب ہے' جبکہ ۸۴ آیات میں خطاب منافقین سے ہے۔ لیکن یاد رہے کہ انہیں جہاں بھی مخاطب کیا گیا ہے: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا'' کے صیغے میں کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ایمان کے دعوے دار تو وہ بھی تھے۔ منافق وہی تو ہوتا ہے جو ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر حقیقت میں ایمان سے تہی دامن ہوتا ہے' چاہے وہ شعوری طور پر منافق ہو چاہے غیر شعوری طور پر۔

سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ کے مابین مضامین کی تقسیم کا یہ پہلو بھی مدِنظر رہے کہ انسانی تمدن اور معاشرت کی بنیادی سطح کے معاملات کے بارے میں زیادہ تر احکام سورۃ النساء میں آئے ہیں جبکہ اعلیٰ ترین (ریاستی اور حکومتی) سطح کے مسائل سے متعلق ہدایات سورۃ المائدۃ میں دی گئی ہیں۔ انسانی تمدن کی بنیاد معاشرے پر ہے اور معاشرے کی بنیادی اکائی (unit) خاندان ہے جو ایک عورت اور ایک مرد کے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے سے وجود میں آتا ہے۔ گویا انسانی تمدن و معاشرت کے زیادہ تر بنیادی مسائل گھریلو

زندگی سے متعلق ہیں۔ یہ مسائل و معاملات سورۃ البقرۃ میں بہت تفصیل سے زیر بحث آئے ہیں' جبکہ سورۃ النساء میں اس موضوع سے متعلق کچھ مزید احکام وارد ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس سورت میں معاشرے کے کمزور اور دبے ہوئے افراد کے حقوق کے تحفظ اور جنسی نظم وضبط (sex-discipline) کی ترویج جیسے بنیادی اہمیت کے حامل معاملات کے بارے میں بھی اہم ہدایات دی گئی ہیں۔ دوسری طرف سورۃ المائدۃ میں ریاستی معاملات کے خدوخال' عدالتی نظام کے قواعد وضوابط اور چوری وراہزنی جیسے جرائم سے متعلق حدود وتعزیرات کا ذکر ملتا ہے۔

پہلے گروپ کی ان چار مدنی سورتوں کے مضامین کا یہ عمومی نقشہ ایک مرتبہ پھر سے ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ ان سورتوں میں دو مضمون متوازی چلتے ہیں۔ پہلا مضمون شریعتِ اسلامی کا ہے جس کے بارے میں ابتدائی خاکہ سورۃ البقرۃ میں دیا گیا ہے اور کچھ مزید احکام سورۃ النساء میں آئے ہیں۔ جبکہ شریعت کے تکمیلی احکام سورۃ المائدۃ میں بیان ہوئے ہیں۔ سورۂ آل عمران اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں شریعت کے احکام نہیں ہیں سوائے سود کے بارے میں اس ایک حکم کے: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ (آیت ۱۳۰)۔

ان سورتوں کا دوسرا اہم مضمون اہلِ کتاب سے خطاب ہے اور وہ بھی تدریجاً آگے بڑھتے ہوئے سورۃ المائدۃ میں اپنی تکمیلی صورت کو پہنچتا ہے۔ چنانچہ اہلِ کتاب سے آخری اور فیصلہ کن باتیں سورۃ المائدۃ میں ملتی ہیں۔ ان تمہیدی کلمات کے بعد اب ہم اس سورۂ مبارکہ کا مطالعہ شروع کرتے ہیں۔

آیات ۱ تا ۱۰

سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ | بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ | اٰيَاتُهَا: ۱۷۶ | رُكُوْعَاتُهَا: ۲۴

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱ وَ اٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَ لَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝۴ وَ لَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَ اكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵ وَ ابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَ لَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّ بِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَ مَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَ مَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝۶

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ ۪ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ ؕ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَ اِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَ لْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۪ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝

آیت ۱ ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ ''اے لوگو اپنے اُس رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا''

دیکھئے معاشرتی مسائل کے ضمن میں گفتگو اس بنیادی بات سے شروع کی گئی ہے کہ اپنے خالق و مالک کا تقویٰ اختیار کرو۔

﴿وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا﴾ ''اور اُسی سے اس کا جوڑا بنایا''

نوٹ کیجیے کہ یہاں یہ الفاظ نہیں ہیں کہ ''اُس نے تمہیں ایک آدم سے پیدا کیا اور اُسی (آدم) سے اس کا جوڑا بنایا''، بلکہ ''نَفْسٍ وَّاحِدَةٍ'' (ایک جان) کا لفظ ہے۔ گویا اس سے یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ عین آدمؑ ہی سے ان کا جوڑا بنایا گیا ہو جیسا کہ بعض روایات سے بھی اشارہ ملتا ہے اور یہ بھی مراد ہو سکتی ہے کہ آدم کی نوع سے ان کا جوڑا بنایا گیا جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے۔ اس لیے کہ نوع ایک ہے جنسیں دو ہیں۔ انسان (Human beings) نوع (species) ایک ہے لیکن اس کے اندر ہی سے جو جنسی تفریق (sexual differentiation) ہوئی ہے اس کے حوالے سے اس کا جوڑا بنایا ہے۔

﴿وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ﴾ ''اور ان دونوں سے پھیلا دیے (زمین میں) کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں۔''

''مِنْهُمَا'' سے مراد یقیناً آدم و حوا ہیں۔ یعنی اگر آپ اس تمدنِ انسانی کا سراغ لگانے کے لیے پیچھے سے پیچھے جائیں گے تو آغاز میں ایک انسانی جوڑا (آدم و حوا) پائیں گے۔ اس رشتہ سے پوری نوعِ انسانی اس سطح پر جا کر رشتۂ اخوت میں منسلک ہو جاتی ہے۔ ایک تو سگے بہن بھائی ہیں۔ دادا دادی پر جا کر cousins کا حلقہ بن جاتا ہے۔ اس سے اوپر پڑدادا پڑدادی پر جا کر ایک اور وسیع حلقہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح چلتے جایئے تو معلوم ہوگا کہ پوری نوعِ انسانی بالآخر ایک جوڑے (آدم و حوا) کی اولاد ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ﴾ ''اور تقویٰ اختیار کرو اُس اللہ کا جس کا تم ایک دوسرے کو واسطہ دیتے ہو اور رحمی رشتوں کو توڑنے سے بھی بچو!''

تقویٰ کی تاکید ملاحظہ کیجیے کہ ایک ہی آیت میں دوسری مرتبہ پھر تقویٰ کا حکم ہے۔ فرمایا کہ اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جس کا تم ایک دوسرے کو واسطہ دیتے ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ فقیر بھی مانگتا ہے تو اللہ کے نام پر مانگتا ہے اللہ کے واسطے مانگتا ہے اور اکثر و بیشتر جو تمدنی معاملات ہوتے ہیں ان میں بھی اللہ کا واسطہ دیا جاتا ہے۔ گھریلو جھگڑوں کو جب نمٹایا جاتا ہے تو آخر کار کہنا پڑتا ہے کہ اللہ کا نام مانو اور اپنی اس ضد سے باز آ جاؤ! تو جہاں آخری اپیل اللہ ہی کے حوالے سے کرنی ہے تو اگر اُس کا تقویٰ اختیار کرو تو یہ جھگڑے ہوں گے ہی نہیں۔ اُس نے اس معاشرے کے مختلف طبقات کے حقوق معین کر دیے ہیں مثلاً مرد اور عورت کے حقوق، ربّ المال اور عامل کے حقوق، فرد اور اجتماعیت کے حقوق وغیرہ۔ اگر اللہ کے احکام کی پیروی کی جائے اور اس کے عائد کردہ حقوق و فرائض کی پابندی کی

جائے تو جھگڑا نہیں ہوگا۔

مزید فرمایا کہ رحمی رشتوں کا لحاظ رکھو انہیں توڑنے سے بچو! جیسا کہ ابھی بتایا گیا کہ رحمی رشتوں کا اوّلین دائرہ بہن بھائی ہیں' جو اپنے والدین کی اولاد ہیں۔ پھر دادا دادی پر جا کر ایک بڑی تعداد پر مشتمل دوسرا دائرہ وجود میں آتا ہے۔ یہ رحمی رشتے ہیں۔ انہی رحمی رشتوں کو پھیلاتے جایئے تو کُل بنی آدم اور کُل بناتِ حوا سب ایک ہی نسل سے ہیں' ایک ہی باپ اور ایک ہی ماں کی اولاد ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ۝۱﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔''

یہ تقویٰ کی روح ہے۔ اگر ہر وقت یہ خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہے' میرا ہر عمل اُس کی نگاہ میں ہے' کوئی عمل اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے تو انسان کا دل اللہ کے تقویٰ سے معمور ہو جائے گا۔ اگر یہ استحضار رہے کہ چاہے میں نے سب دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں اور پردے گرا دیے ہیں لیکن ایک آنکھ سے میں نہیں چھپ سکتا تو یہی تقویٰ ہے۔ اور اگر تقویٰ ہوگا تو پھر اللہ کے ہر حکم کی پابندی کی جائے گی۔

یہ حکمت نبوت ہے کہ اس آیت کو نبی اکرم ﷺ نے خطبۂ نکاح میں شامل فرمایا۔ نکاح کے ذریعے ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان رشتۂ ازدواج قائم ہوتا ہے۔ اس موقع پر آدم کا ایک بیٹا اور حوا کی ایک بیٹی پھر اسی رشتے میں منسلک ہونے کا عہد کرتے ہیں جس میں آدم اور حوا منسلک ہوئے تھے۔ جس طرح اُن دونوں سے نسل پھیلی ہے اسی طرح اب ان دونوں سے نسل آگے بڑھے گی۔ لیکن اس پورے معاشرتی معاملے میں' خاندانی معاملات میں' عائلی معاملات میں اللہ کا تقویٰ انتہائی اہم ہے۔ جیسے ہم نے سورۃ البقرۃ میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے حوالے سے بار بار ﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ﴾ کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اس لیے کہ اگر تقویٰ نہیں ہوگا تو پھر خالی قانون مؤثر نہیں ہوگا۔ قانون کو تو تختۂ مشق بھی بنایا جا سکتا ہے کہ بظاہر قانون کا تقاضا پورا ہو رہا ہو لیکن اس کی روح بالکل ختم ہو کر رہ جائے۔ سورۃ البقرۃ میں اسی طرزِ عمل کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۭ﴾ (آیت ۲۳۱) ''اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بنا لو۔''

آیت ۲ ﴿وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ﴾ ''اور یتیموں کے مال اُن کے حوالے کر دو''

یتامیٰ کا طبقہ معاشرے کے دبے ہوئے طبقات میں سے تھا۔ دورِ جاہلیت میں ان کے کوئی حقوق نہیں تھے' ان کے مال ہڑپ کر لیے جاتے تھے۔ وہ بہت کمزور تھے۔

﴿وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۠﴾ ''اور (اپنے) بُرے مال کو (ان کے) اچھے مال سے نہ بدلو''

ایسا ہرگز نہ ہو کہ یتیموں کے مال میں سے اچھا اچھا لے لیا اور اپنا ردّی مال اس میں شامل کر دیا۔

﴿وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَهُمْ اِلٰٓى اَمْوَالِكُمْ ۭ﴾ ''اور ان کے مال اپنے مالوں میں شامل کر کے ہڑپ نہ کرو۔''

﴿اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۝۲﴾ ''یقیناً یہ بہت بڑا گناہ ہے۔''

یتیموں کے بعض سرپرست جو تقویٰ اور خوفِ خدا سے تہی دامن ہوتے ہیں' اوّل تو ان کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں' اور اگر ایسا نہ بھی کریں تو ان کا اچھا مال خورد برد کر کے اپنا ردّی اور بے کار مال اس میں شامل کر دیتے ہیں اور اس طرح تعداد پوری کر دیتے ہیں۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا لیتے ہیں تاکہ اسے بآسانی ہڑپ کر سکیں۔ ان کو ایسے سب ہتھکنڈوں سے روک دیا گیا۔

آیت ۳ ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی﴾ ''اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچیوں کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے''

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ﴾ ''تو (انہیں اپنے نکاح میں نہ لاؤ بلکہ) جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کر لو دو دو' تین تین' چار چار تک۔''

اس آیت میں ''یَتَامٰی'' سے مراد یتیم بچیاں اور خواتین ہیں۔ یتیم لڑکے تو عمر کی ایک خاص حد کو پہنچنے کے بعد اپنی آزاد مرضی سے زندگی گزار لیتے تھے' لیکن یتیم لڑکیوں کا معاملہ یہ ہوتا تھا کہ ان کے ولی اور سرپرست ان کے ساتھ نکاح بھی کر لیتے تھے۔ اس طرح یتیم لڑکیوں کے مال بھی ان کے قبضے میں آ جاتے تھے اور یتیم لڑکیوں کے پیچھے ان کے حقوق کے معاملے میں ان سے پوچھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اگر ماں باپ ہوتے تو ظاہر ہے کہ وہ بچی کے حقوق کے بارے میں بھی کوئی بات کرتے۔ لہٰذا ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم ان کے بارے میں انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر تم ان یتیم بچیوں سے نکاح مت کرو' بلکہ دوسری عورتیں جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔ اگر ضرورت ہو تو دو دو' تین تین' چار چار کی حد تک نکاح کر سکتے ہو' اس کی تمہیں اجازت ہے۔ لیکن تم یتیم بچیوں کے ولی بن کر ان کی شادیاں کہیں اور کرو تا کہ تم ان کے حقوق کے پاسبان بن کر کھڑے ہو سکو۔ ورنہ اگر تم نے ان کو اپنے گھروں میں ڈال لیا تو پھر کون ہو گا جو ان کے حقوق کے بارے میں تم سے باز پرس کر سکے؟ —— منکرینِ سنت اور منکرینِ حدیث نے اس آیت کی مختلف تعبیرات کی ہیں' جن کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں۔ بہرحال اس کا صحیح مفہوم یہی ہے جو سلف سے چلا آ رہا ہے اور جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔ مزید برآں تعددِ ازدواج کے بارے میں یہی ایک آیت قرآن مجید میں ہے۔ اس آیت کی رو سے تعددِ ازدواج کو محدود کیا گیا ہے اور چار سے زائد بیویاں رکھنے کو ممنوع کر دیا گیا ہے۔

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ ''لیکن اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی پر بس کرو''

یہ جو ہم نے اجازت دی ہے کہ دو دو' تین تین' چار چار عورتوں سے نکاح کر لو' اس کی شرطِ لازم یہ ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل کرو۔ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ اس شرط کو پورا نہیں کر سکو گے اور ان میں برابری نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی شادی کرو' اس سے زائد نہیں۔ بیویوں کے مابین عدل و انصاف میں ہر اُس چیز کا اعتبار ہو گا جو شمار میں آ سکتی ہے۔ مثلاً ہر بیوی کے پاس جو وقت گزارا جائے اس میں مساوات ہونی چاہیے۔ نان نفقہ' زیورات' کپڑے اور دیگر مال و اسباب' غرضیکہ تمام مادّی چیزیں جو دیکھی بھالی جا سکتی ہیں ان میں انصاف اور عدل لازم ہے۔ البتہ دلی میلان اور رجحان جس پر انسان کو قابو نہیں ہوتا' اس میں گرفت نہیں ہے۔

﴿اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُكُمْ ؕ﴾ ''یا وہ عورتیں جو تمہاری ملکِ یمین ہوں۔''

یعنی وہ عورتیں جو جنگوں میں گرفتار ہو کر آئیں اور حکومت کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ وہ ایک علیحدہ معاملہ ہے اور ان کی تعداد پر کوئی تحدید نہیں ہے۔

﴿ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۳﴾ ''یہ اس سے قریب تر ہے کہ تم ایک ہی طرف کو نہ جھک پڑو۔''

کہ بس ایک ہی بیوی کی طرف میلان ہے اور' جیسا کہ آگے آیت ۱۲۹ میں آئے گا' دوسری معلّق ہو کر رہ گئی ہیں کہ نہ وہ شوہر والیاں ہیں اور نہ آزاد ہیں کہ کہیں اور نکاح کر لیں۔

آیت ۴ ﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ﴾ ''اور عورتوں کو ان کے مہر خوشدلی کے ساتھ دیا کرو۔''

عورتوں کے مہر تاوان سمجھ کر نہ دیا کرو' بلکہ فرض جانتے ہوئے ادا کیا کرو۔ صَدُقَاتٌ صِدَاقٌ کی جمع ہے' جبکہ صَدَقَةٌ کی جمع صَدَقَاتٌ آتی ہے۔

﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا﴾ ''پھر اگر وہ خود اپنی رضامندی سے اس میں سے کوئی چیز تمہیں چھوڑ دیں'' تم نے جو مہر مقرر کیا تھا وہ انہیں ادا کر دیا' اب وہ تمہیں اس میں سے کوئی چیز ہدیہ کر رہی ہیں' تحفہ دے رہی ہیں تو کوئی حرج نہیں۔

﴿فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝۴﴾ ''تو تم اس کو کھاؤ مزے سے خوشگواری سے۔''

تم اسے بے کھٹکے استعمال میں لا سکتے ہو' اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن یہ ہو اُن کی مرضی سے' زبردستی اور جبر کر کے نہ لے لیا جائے۔

آیت ۵ ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا﴾ ''اور مت پکڑا دو ناسمجھوں کو اپنے وہ مال جن کو اللہ نے تمہارے گزران کا ذریعہ بنایا ہے''

معاشرے میں ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو نادانوں اور ناسمجھ لوگوں (سُفَهَاء) پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں بچے بھی شامل ہیں جو ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے۔ ایسے بچے اگر یتیم ہو جائیں تو وہ وراثت میں ملنے والے مال کو اللوں تللوں میں اڑا سکتے ہیں۔ لہٰذا یہاں ہدایت کی گئی ہے کہ ایسے مال کے بے جا استعمال کی معاشرتی سطح پر روک تھام ہونی چاہیے۔ یہ تصور نا قابلِ قبول ہے کہ میرا مال ہے' میں جیسے چاہوں خرچ کروں! چنانچہ اس مال کو ''اَمْوَالَكُمْ'' کہا گیا کہ یہ اصل میں معاشرے کی مشترک بہبود کے لیے ہے۔ اگرچہ انفرادی ملکیت ہے' لیکن پھر بھی اسے معاشرے کی مشترک بہبود میں خرچ ہونا چاہیے۔

﴿وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ﴾ ''ہاں انہیں اس میں سے کھلاتے اور پہناتے رہو''

﴿وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۵﴾ ''اور ان سے بات کیا کرو اچھے انداز میں۔''

اسی اُصول کے تحت برطانوی دور کے ہندوستان میں Court of wards مقرر کر دیے جاتے تھے۔ اگر کوئی بڑا جاگیردار یا نواب فوت ہو جاتا اور یہ اندیشہ محسوس ہوتا کہ اس کا بیٹا آوارہ ہے اور وہ سب کچھ اڑا دے گا' ختم کر دے گا تو حکومت اس میراث کو اپنی حفاظت میں لے لیتی اور ورثاء کے لیے اس میں سے سالانہ وظیفہ مقرر کر دیتی۔ باقی سب مال و اسباب جمع رہتا تھا تاکہ یہ ان کی آئندہ نسل کے کام آ سکے۔

آیت ۶ ﴿وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ﴾ ''اور یتیموں کی جانچ پرکھ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔''

﴿فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا﴾ ''پھر اگر تم ان کے اندر سوجھ بوجھ پاؤ''

تم محسوس کرو کہ اب یہ باشعور ہو گئے ہیں' سمجھ دار ہو گئے ہیں۔

﴿فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ﴾ ''تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو۔''

﴿وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ﴾ ''اور تم اسے ہڑپ نہ کر جاؤ اسراف اور جلد بازی کر کے (اس ڈر سے) کہ وہ بڑے ہو جائیں گے۔''

ایسا نہ ہو کہ تم یتیموں کا مال ضرورت سے زیادہ اور جلد بازی میں خرچ کرنے لگو' اس خیال سے کہ بچے جوان ہو جائیں گے تو یہ

مال ان کے حوالے کرنا ہے' لہٰذا اس سے پہلے پہلے ہم اس میں سے جتنا ہڑپ کر سکیں کر جائیں۔

﴿وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ﴾ ''اور جو کوئی غنی ہو اس کو چاہیے کہ وہ پرہیز کرے۔''

یتیم کا ولی اگر خود غنی ہے' اللہ نے اس کو دے رکھا ہے' اس کے پاس کشائش ہے تو اسے یتیم کے مال میں سے کچھ بھی لینے کا حق نہیں ہے۔ پھر اسے یتیم کے مال سے بچتے رہنا چاہیے۔

﴿وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ﴾ ''اور جو کوئی محتاج ہو تو کھائے دستور کے مطابق۔''

اگر کوئی خود تنگ دست ہے' محتاج ہے اور وہ یتیم کی نگہداشت بھی کر رہا ہے' اس کا کچھ وقت بھی اس پر صرف ہو رہا ہے تو معروف طریقے سے اگر وہ یتیم کے مال میں سے کچھ کھا بھی لے تو کچھ حرج نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیم بڑی فطری ہے' اس میں غیر فطری بندشیں نہیں ہیں جن پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے۔

﴿فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ﴾ ''پھر جب تم ان کے مال ان کے حوالے کرو تو اس پر گواہ ٹھہرا لو۔''

ان کا مال و متاع گواہوں کی موجودگی میں ان کے حوالے کیا جائے کہ ان کی یہ یہ چیزیں آج تک میری تحویل میں تھیں' اب میں نے ان کے حوالے کر دیں۔

﴿وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝٦﴾ ''اور اللہ کافی ہے حساب لینے کے لیے۔''

یہ دنیا کا معاملہ ہے کہ اس کے لیے لکھت پڑھت اور شہادت ہے۔ باقی اصل حساب تو تمہیں اللہ کے ہاں جا کر دینا ہے۔

آیت ۷ ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۖ﴾ ''مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اس میں سے جو ترکہ چھوڑا ہو والدین نے اور رشتہ داروں نے''

﴿وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ﴾ ''اور عورتوں کا بھی حصہ ہے اس میں سے جو ترکہ ہے والدین اور رشتہ داروں کا''

یہاں اب پہلی مرتبہ عورتوں کو وراثت کا حق دیا جا رہا ہے' ورنہ قبل از اسلام عرب معاشرے میں عورت کا کوئی حق وراثت نہیں تھا۔

﴿مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ﴾ ''چاہے وہ وراثت تھوڑی ہو یا زیادہ ہو۔''

اللہ تعالیٰ کا قانون اس پر ہر صورت میں پوری طرح نافذ ہونا چاہیے۔

﴿نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝٧﴾ ''یہ حصہ ہے (اللہ کی طرف سے) فرض کیا گیا۔''

آگے آپ دیکھیں گے کہ اس قانونِ وراثت کی کس طرح بار بار تاکید آ رہی ہے۔ ساتھ ہی آپ یہ بھی دیکھتے رہیں کہ ہمارے معاشرے کے اندر اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی کس طرح دھجیاں بکھرتی ہیں۔ خاص طور پر ہمارے شمالی علاقے میں ویسے تو نماز روزہ کا بہت اہتمام ہوتا ہے' لیکن وہاں کے لوگ بیٹیوں کو وراثت میں حصہ دینے کو کسی صورت تیار نہیں ہوتے' بلکہ اپنے رواج کی پیروی کرتے ہیں۔

آیت ۸ ﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ﴾ ''اور جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت قرابت دار اور یتیم اور محتاج''

جب وراثت کی تقسیم ہو رہی ہو تو اب اگر وہاں کچھ قرابت دار' کچھ یتیم اور کچھ محتاج بھی آ جائیں۔

﴿فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۸﴾ ''تو انہیں بھی کچھ دے دلا دو اس میں سے اور ان سے معقول انداز میں بات کرو۔''

وہ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت وراثت تقسیم ہو رہی ہے اور وہ بالکل محتاج ہیں' تو ان کے احساسِ محرومیت کا جو بھی مداوا ہو سکتا ہے کرو' اور ان سے بڑے اچھے انداز میں بات کرو۔ انہیں جھڑکو نہیں کہ ہماری وراثت تقسیم ہو رہی ہے اور یہاں تم کون آ گئے ہو؟

آیت ۹ ﴿وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ ۠﴾ ''اور ڈرتے رہنا چاہیے ان لوگوں کو کہ اگر انہوں نے بھی چھوڑے ہوتے اپنے پیچھے ناتواں بچے تو ان کے بارے میں انہیں کیسے کیسے اندیشے ہوتے۔''

﴿فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ﴾ ''تو انہیں چاہیے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کریں''

انہیں یہ خیال کرنا چاہیے کہ یہ یتیم جو اس وقت آ گئے ہیں یہ بھی کسی کے بچے ہیں' جن کے سر پر باپ کا سایہ نہیں رہا۔ لہٰذا وہ ان کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھیں۔

﴿وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝۹﴾ ''اور سیدھی سیدھی (حق پر مبنی) بات کریں۔''

آیت ۱۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو یتیموں کا مال ہڑپ کرتے ہیں ناحق''

﴿اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ؕ﴾ ''وہ تو اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے ہیں۔''

﴿وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۝۱۰﴾ ''اور وہ عنقریب بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے۔''

اندر کی آگ تو وہ خود اپنے پیٹوں میں ڈال رہے ہیں اور وہ خود بھی سموچے دوزخ کی بھڑکتی آگ میں ڈال دیے جائیں گے۔ گویا ایک آگ ان کے اندر ہو گی اور ایک وسیع و عریض آگ ان کے باہر ہو گی۔ یہ دس آیتیں بڑی جامع ہیں' جن میں اس معاشرے کے پسماندہ طبقات میں سے ایک ایک کا خیال کر کے نہایت باریک بینی اور حکمت کے ساتھ احکام دیے گئے ہیں۔

آیات ۱۱ تا ۱۴

يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْٓ اَوْلَادِكُمْ ۗ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ
فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا
السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ
الثُّلُثُ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهٗٓ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ اٰبَآؤُكُمْ
وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا
حَكِيْمًا ۝۱۱ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ
فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ
اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ

تُوْصُوْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ وَ اِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّوْرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امْرَاَةٌ وَّ لَهٗۤ اَخٌ اَوْ اُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَاِنْ كَانُوْۤا اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصٰى بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ۙ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۲﴾ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۗ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ وَ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۳﴾ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا ع فِيْهَا ۪ وَ لَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿۱۴﴾

سورۃ النساء کا دوسرا رکوع بڑا مختصر ہے۔ اس رکوع میں صرف چار آیات ہیں' لیکن معنوی طور پر ان میں ایک قیامت مضمر ہے۔ یہ قرآن حکیم کا اعجاز ہے کہ چار آیتوں کے اندر اسلام کا پورا قانونِ وراثت بیان کر دیا گیا ہے جس کی تشریح میں بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ گویا جامعیت کی انتہا ہے۔

آیت ۱۱ ﴿يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ فِيْۤ اَوْلَادِكُمْ ۗ﴾ ''اللہ تعالیٰ تمہیں وصیت کرتا ہے تمہاری اولاد کے بارے میں''

﴿لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ﴾ ''کہ لڑکے کے لیے حصہ ہے دو لڑکیوں کے برابر۔''

﴿فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ﴾ ''پھر اگر لڑکیاں ہی ہوں (دو یا) دو سے زیادہ تو ان کے لیے ترکے کا دو تہائی ہے۔''

﴿وَاِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۭ﴾ ''اور اگر ایک ہی لڑکی ہے تو اس کے لیے آدھا ہے۔''

ظاہر ہے اگر ایک ہی بیٹا ہے تو وہ پورے ترکے کا وارث ہو جائے گا۔ لہٰذا جب بیٹی کا حصہ بیٹے سے آدھا ہے تو اگر ایک ہی بیٹی ہے تو اسے آدھی وراثت ملے گی' آدھی دوسرے لوگوں کو جائے گی۔ وہ ایک علیحدہ معاملہ ہے۔

﴿وَلِاَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ اِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ﴾ ''اور میت کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے جو اُس نے چھوڑا اگر میت کے اولاد ہو۔''

اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے والدین یا دونوں میں سے کوئی ایک زندہ ہو تو اس کی وراثت میں سے ان کا بھی معین حصہ ہے۔ اگر وفات پانے والا شخص صاحبِ اولاد ہے تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کے لیے وراثت میں چھٹا حصہ ہے۔ یعنی میت کے ترکے میں سے ایک تہائی والدین کو چلا جائے گا اور دو تہائی اولاد میں تقسیم ہوگا۔

﴿فَاِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ﴾ ''اور اگر اُس کے اولاد نہ ہو اور اُس کے وارث ماں باپ ہی ہوں تو اُس کی ماں کا ایک تہائی ہے۔''

اگر کوئی شخص لاولد فوت ہو جائے تو اس کے ترکے میں سے اس کی ماں کو ایک تہائی اور باپ کو دو تہائی ملے گا۔ یعنی باپ کا حصہ ماں سے دوگنا ہو جائے گا۔

﴿فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ﴾ ''پھر اگر میت کے بہن بھائی ہوں تو اس کی ماں کا چھٹا حصہ ہے''

اگر مرنے والا بے اولاد ہو لیکن اس کے بہن بھائی ہوں تو اس صورت میں ماں کا حصہ مزید کم ہو کر ایک تہائی کے بجائے چھٹا حصہ رہ جائے گا اور باقی باپ کو ملے گا' لیکن بہن بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا۔ وہ باپ کی طرف سے وراثت کے حق دار ہوں گے۔ لیکن ساتھ ہی فرما دیا:

﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ﴾ ''بعد اس وصیت کی تعمیل کے جو وہ کر جائے یا بعد ادائے قرض کے۔''

وراثت کی تقسیم سے پہلے دو کام کر لینے ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اگر اس شخص کے ذمے کوئی قرض ہے تو وہ ادا کیا جائے۔ اور دوسرے یہ کہ اگر اُس نے کوئی وصیت کی ہے تو اس کو پورا کیا جائے۔ پھر وراثت تقسیم ہوگی۔

﴿اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ ۚ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ﴾ ''تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے' تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہارے لیے زیادہ نافع ہے۔''

﴿فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''یہ اللہ کی طرف سے مقرر کیا ہوا فریضہ ہے۔''

تم اپنی عقلوں کو چھوڑو اور اللہ کی طرف سے مقرر کردہ حصوں کے مطابق وراثت تقسیم کرو۔ کوئی آدمی یہ سمجھے کہ میرے بوڑھے والدین ہیں' میری وراثت میں خواہ مخواہ ان کے لیے حصہ کیوں رکھ دیا گیا ہے؟ یہ تو کھا پی چکے' زندگی گزار چکے' وراثت تو اب میری اولاد ہی کو ملنی چاہیے' تو یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ تمہیں بس اللہ کا حکم ماننا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ علم و حکمت والا ہے۔''

اس کا کوئی حکم علم اور حکمت سے خالی نہیں ہے۔

آیت ﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ﴾ ''اور تمہارا حصہ تمہاری بیویوں کے ترکے میں سے آدھا ہے اگر ان کے کوئی اولاد نہ ہو۔''

بیوی فوت ہو گئی ہے اور اس کے کوئی اولاد نہیں ہے تو جو وہ چھوڑ گئی ہے اس میں سے نصف شوہر کا ہو جائے گا۔ باقی جو نصف ہے وہ مرحومہ کے والدین اور بہن بھائیوں میں حسبِ قاعدہ تقسیم ہوگا۔

﴿فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ﴾ ''اور اگر اُن کے اولاد ہے تو تمہارے لیے چوتھائی ہے اس میں سے جو انہوں نے چھوڑا''

﴿مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ ؕ﴾ ''بعد اُس وصیت کی تعمیل کے جو وہ کر جائیں یا بعد ادائے قرض کے۔''

اگر مرنے والی نے اولاد چھوڑی ہو تو موجودہ شوہر کو مرحومہ کے مال سے ادائے دَین و انفاذِ وصیت کے بعد کُل مال کا چوتھائی حصہ ملے گا اور باقی تین چوتھائی دوسرے ورثاء میں تقسیم ہوگا۔

﴿وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ﴾ ''اور ان کے لیے چوتھائی ہے تمہارے ترکے کا اگر تمہارے اولاد نہیں ہے۔''

﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ﴾ ''اور اگر تمہارے اولاد ہے تو ان کے لیے آٹھواں حصہ ہے تمہارے ترکے میں سے''

﴿مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ تُوۡصُوۡنَ بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ؕ﴾ ''اُس وصیت کی تعمیل کے بعد جو تم نے کی ہو یا قرض ادا کرنے کے بعد۔''

اگر مرنے والے نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تو ادائے دَین وانفاذِ وصیت کے بعد اس کی بیوی کو اُس کے ترکے کا چوتھائی ملے گا' اور اگر اُس نے کوئی اولاد چھوڑی ہے تو اس صورت میں بعد ادائے دَین و وصیت کے بیوی کو آٹھواں حصہ ملے گا۔ اگر بیوی ایک سے زائد ہے تو بھی مذکورہ حصہ سب بیویوں میں تقسیم ہو جائے گا۔

﴿وَاِنۡ كَانَ رَجُلٌ يُّوۡرَثُ كَلٰلَةً اَوِ امۡرَاَةٌ﴾ ''اور اگر کوئی شخص جس کی وراثت تقسیم ہو رہی ہے کلالہ ہو' یا عورت ہو ایسی ہی''

''کلالہ'' وہ مرد یا عورت ہے جس کے نہ تو والدین زندہ ہوں اور نہ اس کی کوئی اولاد ہو۔

﴿وَّلَهٗۤ اَخٌ اَوۡ اُخۡتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنۡهُمَا السُّدُسُ ۚ﴾ ''اور اُس کا ایک بھائی یا ایک بہن ہو تو ان میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے۔''

﴿فَاِنۡ كَانُوۡۤا اَكۡثَرَ مِنۡ ذٰلِكَ فَهُمۡ شُرَكَآءُ فِى الثُّلُثِ﴾ ''اور اگر وہ اس سے زیادہ ہوں تو وہ سب ایک تہائی میں شریک ہوں گے''

مفسرین کا اجماع ہے کہ یہاں کلالہ کی میراث کے حکم میں بھائی اور بہنوں سے مراد اَخیافی (ماں شریک) بھائی اور بہن ہیں۔ رہے عینی اور علاتی بھائی بہن تو ان کا حکم اسی سورت کے آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ عربوں میں دراصل تین قسم کے بہن بھائی ہوتے ہیں۔ ایک ''عینی'' جن کا باپ بھی مشترک ہو اور ماں بھی' جنہیں ہمارے ہاں ''حقیقی'' کہتے ہیں۔ دوسرے ''علاتی'' بہن بھائی' جن کا باپ ایک اور مائیں جدا ہوں۔ اہلِ عرب کے ہاں یہ بھی حقیقی بہن بھائی ہوتے ہیں اور ان کا حکم وہی ہے جو ''عینی'' بہن بھائیوں کا ہے۔ وہ انہیں ''سوتیلا'' نہیں سمجھتے۔ ان کے ہاں سوتیلا وہ کہلاتا ہے جو ایک ماں سے ہو لیکن اس کا باپ دوسرا ہو۔ یہ ''اَخیافی'' بہن بھائی کہلاتے ہیں۔ ایک شخص کی اولاد تھی' وہ فوت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی بیوی نے دوسری شادی کر لی۔ تو اب اس دوسرے خاوند سے جو اولاد ہے وہ پہلے خاوند کی اولاد کے اَخیافی بہن بھائی ہیں۔ تو کلالہ کی میراث کے حکم میں یہاں اَخیافی بھائی بہن مراد ہیں۔

﴿مِنۡۢ بَعۡدِ وَصِيَّةٍ يُّوۡصٰى بِهَاۤ اَوۡ دَيۡنٍ ۙ﴾ ''اس وصیت کی تعمیل کے بعد جو کی گئی یا ادائے قرض کے بعد''

یہ دو شرطیں بہرصورت باقی رہیں گی۔ مرنے والے کے ذمے اگر کوئی قرض ہے تو پہلے وہ ادا کیا جائے گا' پھر اس کی وصیت کی تعمیل کی جائے گی' اس کے بعد میراث وارثوں میں تقسیم کی جائے گی۔

﴿غَيۡرَ مُضَآرٍّ ۚ﴾ ''بغیر کسی کو ضرر پہنچائے۔''

یہ سارا کام ایسے ہونا چاہیے کہ کسی کو ضرر پہنچانے کی نیت نہ ہو۔

﴿وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''یہ تاکید ہے اللہ کی طرف سے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا کمالِ حلم والا ہے۔''

اُس کے حلم اور بردباری پر دھوکہ نہ کھاؤ کہ وہ تمہیں پکڑ نہیں رہا ہے۔ ع ''نہ جا اُس کے تحمل پر کہ ہے بے ڈھب گرفت اُس کی!'' اُس کی پکڑ جب آئے گی تو اس سے بچنا ممکن نہیں ہوگا: ﴿اِنَّ بَطۡشَ رَبِّكَ لَشَدِيۡدٌ ﴿۱۲﴾﴾ (البروج) ''یقیناً تمہارے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔''

آیت ۱۳ ﴿تِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ﴾ ''یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود ہیں۔''

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''اور جو اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ داخل کرے گا اسے ان باغات میں جس کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی''

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ''ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

﴿وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۳﴾ ''اور یہی ہے بہت بڑی کامیابی۔''

آیت ۱۴ ﴿وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ﴾ ''اور جو کوئی نافرمانی کرے گا اللہ اور اُس کے رسول کی اور تجاوز کرے گا اُس کی حدود سے''

﴿يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا﴾ ''وہ داخل کرے گا اس کو آگ میں جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔''

﴿وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۱۴﴾ ''اور اُس کے لیے اہانت آمیز عذاب ہوگا۔''

آیات ۱۵ تا ۲۲

وَ الّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝۱۵ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَ اَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۱۶ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْۗءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ فَاُولٰۗىِٕكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۱۷ وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ وَ لَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَاۗءَ كَرْهًا ۭ وَ لَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـــًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝۱۹ وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۲۰ وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۲۱ وَ لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۗؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۭ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّ مَقْتًا ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝۲۲ ع

اب اسلامی معاشرے کی تطہیر کے لیے احکام دیے جا رہے ہیں۔ مسلمان جب تک مکہ میں تھے تو وہاں کفار کا غلبہ تھا۔ مدینہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو وہ حیثیت دی کہ وہ اپنے اجتماعی معاملات کو سنوارنا شروع کریں۔ چنانچہ ان سورتوں میں ایک ایک کر کے معاشرتی معاملات اور سماجی مسائل کو زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ اسلامی معاشرے میں عورت اور مرد کی عفت و عصمت کو بنیادی اہمیت

حاصل ہے۔لہٰذا معاشرے میں جنسی بے راہ روی کی روک تھام کے لیے کچھ ابتدائی احکام یہاں اس سورت میں آئے ہیں۔اس ضمن میں تکمیلی احکام سورۃ النُّور میں آئیں گے۔واضح رہے کہ معاشرتی معاملات کے ضمن میں احکام پہلے سورۃ النساء، پھر سورۃ الاحزاب، پھر سورۃ النور اور پھر سورۃ المائدۃ میں بتدریج آئے ہیں۔بہرحال یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ سورۃ الاحزاب اور سورۃ النور کو مصحف میں کافی آگے رکھا گیا ہے اور یہاں پر سورۃ النساء کے بعد سورۃ المائدۃ آگئی ہے۔

آیت ۱۵ ﴿وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ﴾ ''اور تمہاری عورتوں میں سے جو کسی بے حیائی کا ارتکاب کریں''

﴿فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ﴾ ''تو اُن پر اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔''

﴿فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی الْبُیُوْتِ﴾ ''پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند کر دو''

﴿حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ﴾ ''یہاں تک کہ موت ان کو لے جائے''

اسی حالت میں ان کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

﴿اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾﴾ ''یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ نکال دے۔''

بدکاری کے متعلق یہ ابتدائی حکم تھا۔بعد میں سورۃ النُّور میں حکم آ گیا کہ بدکاری کرنے والے مرد و عورت دونوں کو سو سو کوڑے لگائے جائیں۔معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایسی لڑکیوں یا عورتوں کا تذکرہ ہے جو مسلمانوں میں سے تھیں مگر ان کا بدکاری کا معاملہ کسی غیر مسلم مرد سے ہو گیا جو اسلامی معاشرے کے دباؤ میں نہیں ہے۔ایسی عورتوں کے متعلق یہ ہدایت فرمائی گئی کہ انہیں تاحکم ثانی گھروں کے اندر محبوس رکھا جائے۔

آیت ۱۶ ﴿وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ﴾ ''اور جو دونوں تم میں سے اس (بدکاری) کا ارتکاب کریں تو ان دونوں کو ایذا پہنچاؤ۔''

اگر بدکاری کا ارتکاب کرنے والے مرد و عورت دونوں مسلمانوں میں سے ہی ہوں تو دونوں کو اذیت دی جائے۔یعنی ان کی توہین و تذلیل کی جائے اور مارا پیٹا جائے۔

﴿فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ﴾ ''پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور اصلاح کر لیں تو ان کو چھوڑ دو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

واضح رہے کہ یہ بالکل ابتدائی احکام ہیں۔اسی لیے ان کی وضاحت میں تفسیروں میں بہت سے اقوال مل جائیں گے۔اس لیے کہ جب حدود نافذ ہو گئیں تو یہ عبوری اور عارضی احکام منسوخ قرار پائے۔جیسے کہ سورۃ النساء میں قانونِ وراثت نازل ہونے کے بعد سورۃ البقرۃ میں وارد شدہ وصیت کا حکم ساقط ہو گیا۔

آیت ۱۷ ﴿اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَی اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ﴾ ''اللہ کے ذمے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو کوئی بُری حرکت کر بیٹھتے ہیں جہالت اور نادانی میں''

﴿ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ﴾ ''پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں''

ایک صاحبِ ایمان پر کبھی ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ خارجی اثرات اتنے شدید ہو جائیں یا نفس کے اندر کا ہیجان اسے جذبات

سے مغلوب کر دے اور وہ کوئی گناہ کا کام کر گزرے۔ لیکن اس کے بعد اسے جیسے ہی ہوش آئے گا اس پر شدید ندامت طاری ہو جائے گی اور وہ اللہ کے حضور توبہ کرے گا۔ ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی توبہ قبول کرنا اللہ کے ذمے ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ يَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ۭ﴾ ''تو یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔''

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۱۷﴾ ''اور اللہ تعالیٰ باخبر ہے اور حکیم و دانا ہے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ﴾ ''اور ایسے لوگوں کا کوئی حق نہیں ہے توبہ کا جو بُرے کام کیے چلے جاتے ہیں۔''

مسلسل حرام خوریاں کرتے رہتے ہیں' زندگی بھر عیش اُڑاتے رہتے ہیں۔

﴿حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ ﴾ ''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں''

﴿وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۭ﴾ ''اور نہ اُن لوگوں کی توبہ ہے جو کفر کی حالت میں ہی مر جاتے ہیں۔''

ان کی توبہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝۱۸﴾ ''ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آیت ۱۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَاۗءَ كَرْهًا ۭ﴾ ''اے اہلِ ایمان! تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم عورتوں کو زبردستی وراثت میں لے لو۔''

یہ بھی عرب جاہلیت کی ایک مکروہ رسم تھی جس میں عورتوں کے طبقے پر شدید ظلم ہوتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ ایک شخص فوت ہوا ہے' اس کی چار پانچ بیویاں ہیں' تو اُس کا بڑا بیٹا وارث بن گیا ہے۔ اب اس کی حقیقی ماں تو ایک ہی ہے' باقی سوتیلی مائیں ہیں' تو وہ ان کو وراثت میں لے لیتا تھا کہ یہ میرے قبضے میں رہیں گی' بلکہ وہ لوگ اپنی سوتیلی ماؤں سے شادیاں بھی کر لیتے تھے یا بغیر نکاح اپنے گھروں میں ڈالے رکھتے تھے' یا پھر یہ کہ اختیار اپنے ہاتھ میں رکھ کر ان کی شادیاں کہیں اور کرتے تھے تو مہر خود لے لیتے تھے۔ چنانچہ فرمایا: اے اہلِ ایمان' تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن بیٹھو! جس عورت کا شوہر فوت ہو گیا وہ آزاد ہے۔ عدت گزار کر وہ جہاں چاہے جائے اور جس سے چاہے نکاح کر لے۔

﴿وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ ﴾ ''اور نہ یہ جائز ہے کہ تم انہیں روکے رکھو تاکہ تم ان سے واپس لے لو اس کا کچھ حصہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے''

نکاح کے وقت تو بڑے چاؤ تھے' بڑے لاڈ اٹھائے جا رہے تھے اور کیا کیا دے دیا تھا' اور اب وہ سب واپس ہتھیانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال ہو رہے ہیں' انہیں تنگ کیا جا رہا ہے' ذہنی طور پر تکلیف پہنچائی جا رہی ہے۔

﴿اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ﴾ ''ہاں اگر وہ صریح بدکاری کی مرتکب ہوئی ہوں (تو تمہیں ان کو تنگ کرنے کا حق ہے)۔''

اگر کسی سے صریح حرام کاری کا فعل سرزد ہو گیا ہو اور اس پر اسے کوئی سزا دی جائے (جیسے کہ اوپر آ چکا ہے فَاٰذُوْهُمَا) اس کی تو

اجازت ہے۔ اس کے بغیر کسی پر زیادتی کرنا جائز نہیں ہے۔ خاص طور پر اگر نیت یہ ہو کہ میں اس سے اپنا مہر واپس لے لوں تو یہ انتہائی کمینگی ہے۔

﴿وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ﴾ ''اور عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے پر معاشرت اختیار کرو۔''

ان کے ساتھ بھلے طریقے پر' خوش اسلوبی سے' نیکی اور راستی کے ساتھ گزر بسر کرو۔

﴿فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾﴾ ''اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو بعید نہیں کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو اور اس میں اللہ نے تمہارے لیے بہت کچھ بہتری رکھ دی ہو۔''

اگر تمہیں کسی وجہ سے اپنی عورتیں ناپسند ہو گئی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ کسی شے کو تم ناپسند کرو' درآنحالیکہ اللہ نے اسی میں تمہارے لیے خیرِ کثیر رکھ دیا ہو۔ ایک عورت کسی ایک اعتبار سے آپ کے دل سے اُتر گئی ہے' طبیعت کا میلان نہیں رہا ہے' لیکن پتا نہیں اس میں اور کون کون سی خوبیاں ہیں اور وہ کس کس اعتبار سے آپ کے لیے خیر کا ذریعہ بنتی ہے۔ تو اس معاملے کو اللہ کے حوالے کرو' اور ان کے حقوق ادا کرتے ہوئے' ان کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کرو۔ البتہ اگر معاملہ ایسا ہو گیا ہے کہ ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے تو طلاق کا راستہ کھلا ہے' شریعت اسلامی نے اس میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ یہ مسیحیت کی طرح کا کوئی غیر معقول نظام نہیں ہے کہ طلاق ہو ہی نہیں سکتی۔

آیت ۲۰ ﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ﴾ ''اور اگر تمہارا ارادہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ہو''

اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہو کہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانی ہے۔

﴿وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا﴾ ''اور ان میں سے کسی ایک کو تم نے ڈھیروں مال دیا ہو''

﴿فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ۭ﴾ ''تو اس میں سے کوئی بھی شے واپس نہ لو۔''

عورتوں کو تم نے جو مہر دیا تھا وہ ان کا ہے' اب اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتے۔

﴿اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۲۰﴾﴾ ''کیا تم اسے واپس لو گے بہتان لگا کر اور صریح گناہ کے مرتکب ہو کر؟''

آیت ۲۱ ﴿وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ ''اور تم اسے کیسے واپس لے سکتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو؟''

کچھ عقل کے ناخن لو' کچھ شعور اور شرافت کا ثبوت دو۔ تم ان سے وہ مال کس طرح واپس لینا چاہتے ہو جبکہ تمہارے مابین دنیا کا انتہائی قریبی تعلق قائم ہو چکا ہے۔

﴿وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿۲۱﴾﴾ ''اور وہ تم سے مضبوط قول و قرار لے چکی ہیں۔''

یہ قول و قرار نکاح کے وقت ہوتا ہے جب مرد عورت کے مہر و نفقہ کی پوری ذمہ داری لیتا ہے۔

آیت ۲۲ ﴿وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۗؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ﴾ ''اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے تم نکاح مت کرو''

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا' ایامِ جاہلیت میں سوتیلی ماؤں کو نکاح کر کے یا بغیر نکاح کے گھر میں ڈال لیا جاتا تھا۔ ایسے نکاح کو اُس

معاشرے میں بھی ''نکاحِ مقت'' کہا جاتا تھا۔ یعنی یہ بہت ہی برا نکاح ہے۔ ظاہر ہے فطرتِ انسانی تو ایسے تعلق سے ابا کرتی ہے، مگر ان کے ہاں یہ رواج تھا۔ قرآن مجید نے اس مقام پر اس کا سختی سے سدِ باب کیا ہے۔

﴿اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ﴾ ''سوائے اس کے جو ہو چکا۔''

﴿اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ﴾ ''یقیناً یہ بڑی بے حیائی کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے والی ہے۔''

﴿وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿۲۲﴾﴾ ''اور بہت ہی بُرا راستہ ہے۔''

اگلی آیت میں محرماتِ ابدیہ کا بیان ہے کہ کن رشتوں میں نکاح کا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی ایک مرد اپنی کن کن رشتہ دار خواتین سے شادی نہیں کر سکتا۔

آیات ۲۳ تا ۲۵

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَ بَنٰتُكُمْ وَ اَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَ خٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ
وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآىِٕكُمْ وَ رَبَآىِٕبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ
حُجُوْرِكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ ۫ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ ۫ وَحَلَآىِٕلُ اَبْنَآىِٕكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا
قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَّ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ
غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ؕ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ
فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾ وَ مَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ
مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ
الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ
وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّ لَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَآ
اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ
خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ وَ اَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۵﴾

الجزء الخامس (۵) ع ۴

آیت ۲۳ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ﴾ ''حرام کر دی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں''

﴿وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ﴾ ''اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں''

﴿وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ الْاُخْتِ﴾ ''اور تمہاری بھتیجیاں اور بھانجیاں''

﴿وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ﴾ ''اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے''

﴿وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ ''اور تمہاری دودھ شریک بہنیں''

﴿وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ﴾ ''اور تمہاری بیویوں کی مائیں''

جن کو ہم ساس یا خوش دامن کہتے ہیں۔

﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ﴾ ''اور تمہاری ربیبائیں جو تمہاری گودوں میں پلی بڑھی ہوں''

﴿مِّنْ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ﴾ ''تمہاری اُن بیویوں سے جن کے ساتھ تم نے مقاربت کی ہو''

﴿فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ﴾ ''اور اگر تم نے ان بیویوں سے مقاربت نہ کی ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں''

''ربیبہ'' بیوی کی اُس لڑکی کو کہا جاتا ہے جو اُس کے سابق شوہر سے ہو۔ اگر موجودہ شوہر اس بیوی سے تعلقِ زن وشو قائم ہونے کے بعد اس کو طلاق دے دے تو ربیبہ کو اپنے نکاح میں نہیں لاسکتا' یہ اس کے لیے حرام ہے۔ لیکن اگر اس بیوی کے ساتھ تعلقِ زن وشو قائم نہیں ہوا اور اسے طلاق دے دی تو پھر ربیبہ کے ساتھ نکاح ہوسکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر تم نے ان بیویوں کے ساتھ مقاربت نہ کی ہو تو پھر (انہیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی گناہ نہیں۔

﴿وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ﴾ ''اور تمہارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صُلب سے ہوں''

جن کو ہم بہوئیں کہتے ہیں۔ اپنے صُلبی بیٹے کی بیوی سے نکاح حرام ہے۔ البتہ مُنہ بولے بیٹے کی مُطلقہ بیوی سے نکاح میں کوئی حرج نہیں —— یہ محرماتِ ابدیہ ہیں کہ جن کے ساتھ کسی حال میں' کسی وقت شادی نہیں ہوسکتی۔ اب عارضی محرمات کا بیان ہے۔

﴿وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ﴾ ''اور یہ (بھی تم پر حرام کر دیا گیا ہے) کہ تم بیک وقت دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرو''

اس میں رسول اللہ ﷺ نے اضافہ کیا ہے کہ جس طرح دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں نہیں رکھ سکتے اسی طرح خالہ بھانجی کو اور پھوپھی بھتیجی کو بھی بیک وقت نکاح میں نہیں رکھ سکتے۔

﴿اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ﴾ ''سوائے اس کے کہ جو گزر چکا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۲۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ غفور اور رحیم ہے۔''

جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا۔ اب گڑے مُردے تو اکھاڑے نہیں جاسکتے' لیکن آئندہ کے لیے یہ محرمات ہیں۔

آیت ۲۴ ﴿وَّالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ ''اور وہ عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں) جو کسی اور کے نکاح میں ہوں''

چونکہ وہ کسی اور کے نکاح میں ہیں اس لیے آپ پر حرام ہیں۔ البتہ ایک عورت کو اگر اس کا شوہر طلاق دے دے تو آپ اس سے نکاح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ حرمت ابدی نوعیت کی نہیں ہے۔ ''مُحْصَنٰت'' اُن عورتوں کو کہا جاتا ہے جو کسی کی قید نکاح میں ہوں۔ ''حِصن'' قلعے کو کہتے ہیں اور ''اِحصان'' کے معنی کسی شے کو اپنی حفاظت میں لینے کے بھی ہیں اور کسی کی حفاظت میں ہونے کے بھی۔ چنانچہ ''مُحْصَنٰت'' وہ عورتیں ہیں جو ایک خاندان کے قلعے کے اندر محفوظ ہیں اور شوہر والیاں ہیں۔ نیز یہ لفظ لونڈیوں کے مقابل آزاد خاندانی شریف زادیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

﴿اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ﴾ ''سوائے اس کے کہ جو تمہاری مِلکِ یمین بن جائیں۔''
یعنی جنگ کے نتیجے میں تمہارے ہاں کنیزیں بن کر آجائیں۔ یہ عورتیں اگرچہ مشرکوں کی بیویاں ہیں لیکن وہ لونڈیوں کی حیثیت سے آپ کے لیے جائز ہوں گی۔

﴿كِتٰبَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ﴾ ''یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا فریضہ ہے۔''
یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے۔

﴿وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ﴾ ''ان کے سوا جو عورتیں ہیں وہ تمہارے لیے حلال ہیں''
آپ نے دیکھا کہ کتنی تھوڑی سی تعداد میں محرمات ہیں' جن سے نکاح حرام قرار دے دیا گیا ہے' باقی کثیر تعداد حلال ہے۔ یعنی مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے جبکہ محرمات کا دائرہ بہت محدود ہے۔

﴿اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ﴾ ''کہ تم اپنے مال کے ذریعے ان کے طالب بنو''
یعنی ان کے مہر ادا کر کے ان کے ساتھ نکاح کرو۔

﴿مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۭ﴾ ''بشرطیکہ حصارِ نکاح میں ان کو محفوظ کرو' نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔''
یعنی نیت گھر بسانے کی ہو' صرف مستی نکالنے کی نہیں۔ اس کو محض ایک کھیل اور مشغلہ نہ بنالو۔

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۭ﴾ ''پس جو بھی تم نے ان سے تمتع کیا ہو تو اس کے بدلے ان کے مہر ادا کرو' جو مقرر ہوئے تھے۔''

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۭ﴾ ''البتہ اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ مہر مقرر ہونے کے بعد باہمی رضامندی سے کوئی کمی بیشی کر لو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۲۴﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ ''اور جو کوئی تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے شادی کر سکے''

﴿فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۭ﴾ ''تو وہ تمہاری اُن لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مؤمنہ ہوں۔''

یہاں ''مُحصَنٰت'' دوسرے معنی میں آیا ہے' یعنی شریف زادیاں' آزاد مسلمان عورتیں۔ اور ظاہر ہے آزاد مسلمان عورتوں کا تو مہر ادا کرنا پڑے گا۔ اس حوالے سے اگر کوئی بے چارہ مفلس ہے' ایک خاندانی عورت کا مہر ادا نہیں کر سکتا تو وہ کیا کرے؟ ایسے لوگوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ معاشرے میں موجود مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لیں۔

﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ۭ﴾ ''اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے۔''
یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کون مؤمن ہے اور کون نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو بھی قانونی اعتبار سے مسلمان ہے دنیا میں وہ مؤمن سمجھا جائے گا۔

﴿بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ﴾ ''تم سب ایک دوسرے ہی میں سے ہو۔''

﴿فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ﴾ ''سو اُن سے نکاح کر لو اُن کے مالکوں کی اجازت سے''

کسی لونڈی کا مالک اس سے جنسی تعلق قائم کر سکتا ہے۔ لیکن جب ایک شخص اُس کی اجازت سے اس کی لونڈی سے نکاح کر لے تو اب لونڈی کے مالک کا یہ تعلق منقطع ہو جائے گا۔ اب وہ لونڈی اس اعتبار سے اس کے کام میں نہیں آ سکتی' بلکہ اب وہ ایک مسلمان کی منکوحہ ہو جائے گی۔ اسی لیے اُس نکاح کے لیے ''بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ'' کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ واضح رہے کہ اُس وقت کے معاشرے میں بالفعل یہ شکلیں موجود تھیں۔ یہ نہیں کہا جا رہا کہ یہ شکلیں پیدا کرو۔ غلام اور لونڈیوں کا معاملہ اُس وقت کے بین الاقوامی حالات اور اسیرانِ جنگ کے مسئلے کے ایک حل کے طور پر پہلے سے موجود تھا۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جس معاشرے میں قرآن نے اصلاح کا عمل شروع کیا اس میں فی الواقع کیا صورت حال تھی اور اس میں کس کس اعتبار سے تدریجاً بہتری پیدا کی گئی۔

﴿وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ ''اور انہیں ان کے مہر ادا کرو معروف طریقے پر''

﴿مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ﴾ ''ان کو حصارِ نکاح میں لا کر' نہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے والیاں ہوں''

ان سے نکاح کا تعلق ہو گا' جس میں نیت گھر میں بسانے کی ہونی چاہیے' محض مستی نکالنے کی اور شہوت رانی کی نیت نہ ہو۔ یہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں' آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں۔

﴿وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ ۚ﴾ ''اور نہ ہی چوری چھپے آشنائیاں کریں۔''

کسی کی لونڈی سے کسی کا نکاح ہو تو کھلم کھلا ہو۔ معلوم ہو کہ فلاں کی لونڈی اب فلاں کے نکاح میں ہے۔ جیسے حضرت سُمیہؓ سے حضرت یاسرؓ نے نکاح کیا تھا۔ حضرت سُمیہؓ ابوجہل کے چچا کی لونڈی تھیں' جو ایک شریف انسان تھا۔ حضرت یاسرؓ جب یمن سے آ کر مکّہ میں آباد ہوئے تو انہوں نے ابوجہل کے چچا سے اجازت لے کر ان کی لونڈی سُمیہؓ سے شادی کر لی۔ ان سے حضرت عمارؓ پیدا ہوئے۔ یہ تین افراد کا ایک کنبہ تھا۔ یاسرؓ عمار بن یاسر اور عمار کی والدہ سُمیہ رضی اللہ عنہم۔ ابوجہل کا شریف النفس چچا جب فوت ہو گیا تو ابوجہل کو اس کنبے پر اختیار حاصل ہو گیا اور اُس نے اس خاندان کو بدترین ایذائیں دیں۔

﴿فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ﴾ ''پس جب وہ قیدِ نکاح میں آ جائیں تو پھر اگر وہ بے حیائی کا کام کریں''

﴿فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ﴾ ''تو اُن پر اُس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں کے لیے ہے۔''

لونڈیاں اگر قیدِ نکاح میں آنے کے بعد بدچلنی کی مرتکب ہوں تو بدکاری کی جو سزا آزاد عورتوں کو دی جائے گی انہیں اس کی نصف سزا دی جائے گی۔ واضح رہے کہ یہ ابتدائی احکامات ہیں۔ ابھی تک نہ تو سو کوڑوں کی سزا کا حکم آیا تھا اور نہ رجم کا۔ چنانچہ ''اٰذُوْهُمَا'' (بحوالہ آیت ۱۶) کے حکم کی تعمیل میں بدکاری کی جو سزا بھی آزاد خاندانی عورتوں کو دی جاتی تھی ایک منکوحہ لونڈی کو اس سے نصف سزا دینے کا حکم دیا گیا۔ اس لیے کہ ایک شریف خاندان کی عورت جسے ہر طرح کا تحفظ حاصل ہو اس کا معاملہ اور ہے اور ایک بے چاری غریب لونڈی کا معاملہ اور ہے۔

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ﴾ ''یہ اجازت تم میں سے ان کے لیے ہے جن کو گناہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔''

مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لینے کی اجازت تم میں سے ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی شہوت اور جنسی جذبے کو روک نہ سکتے

ہوں اور انہیں فتنے میں مبتلا ہو جانے اور گناہ میں ملوث ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

﴿وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ﴾ ''اور اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔''

چونکہ عام طور پر اُس معاشرے میں جو باندیاں تھیں وہ بلند کردار نہیں تھیں' لہٰذا فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ تم ان سے نکاح کرنے سے بچو اور تعفف اختیار کرو۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۵﴾ ''اور اللہ غفور اور رحیم ہے۔''

آیات ۲۶ تا ۲۸

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۲۶ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۡ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝۲۷ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝۲۸

ان تین آیات میں احکامِ شریعت کے ضمن میں فلسفہ و حکمت کا بیان ہو رہا ہے۔ بعض اوقات احکامِ شریعت کو انسان اپنے اوپر بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ اسے جب حکم دیا جاتا ہے کہ یہ کرو اور یہ مت کرو تو آدمی کی طبیعت ناگواری محسوس کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں نے شریعت کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں کرسمس کے موقع پر میں لندن میں تھا۔ وہاں میں نے ایک عیسائی دانشور کی تقریر سنی تھی' جس نے کہا تھا کہ شریعت لعنت ہے۔ خواہ مخواہ ایک انسان کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ حلال ہے' یہ حرام ہے۔ جب وہ حرام سے رُک نہیں سکتا تو اس کا دل میلا ہو جاتا ہے' وہ اپنے آپ کو خطا کار سمجھنے لگتا ہے اور مجرم ضمیر (guilty conscience) ہو جاتا ہے۔ اس احساس کے تحت وہ منفی نفسیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عیسائیوں کے نزدیک اس ساری خرابی کا سبب یہ ہے کہ آپ نے حرام اور حلال کا فلسفہ چھیڑا۔ اگر سب کام حلال سمجھ لیے جائیں تو کوئی حرام کام کرتے ہوئے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ دنیا میں ایسے ایسے فلسفے بھی موجود ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک فلسفہ احکام یہ ہے:

آیت ۲۶ ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ﴾ ''اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے اپنے احکام واضح کر دے''

﴿وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ''اور تمہیں ہدایت بخشے ان راستوں کی جو تم سے پہلے کے لوگوں کے تھے'' پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں نیکوکار بھی تھے اور بدکار بھی۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم انبیاء و صلحاء اور نیکوکاروں کا راستہ اختیار کرو: ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اور دوسرے راستوں سے بچ کر رہو۔

﴿وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ﴾ ''اور تم پر نظرِ عنایت فرمائے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۲۶﴾ ''اور اللہ سب کچھ جاننے والا کمالِ حکمت والا ہے۔''

آیت ۲۷ ﴿وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۡ﴾ ''اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائے۔''

﴿وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝۲۷﴾ ''اور وہ لوگ جو شہوات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ حق سے بھٹک کر دور نکل جاؤ۔''

وہ چاہتے ہیں کہ تمہارا رجحان صراطِ مستقیم کے بجائے غلط راستوں کی طرف ہو جائے اور اُدھر ہی تم بھٹکتے چلے جاؤ۔ آج بھی عورت کی آزادی (Women Lib) کی بنیاد پر اور حقوقِ نسواں کے نام پر دنیا میں جو تحریکیں برپا ہیں یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود و قیود کو توڑ کر جنسی بے راہروی پھیلانے کی ایک عظیم سازش ہے جو دنیا میں چل رہی ہے۔

آیت ۲۸ ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ﴾ ''اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ کو ہلکا کرے۔''

تم یہ نہ سمجھو کہ اللہ تم پر بوجھ ڈال رہا ہے۔ اللہ تو تم پر تخفیف چاہتا ہے' تم سے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ اگر تم ان چیزوں پر عمل نہیں کرو گے تو معاشرے میں گندگیاں پھیلیں گی' فساد برپا ہوگا' جھگڑے ہوں گے' بدگمانیاں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ اس سب کی روک تھام چاہتا ہے' وہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے۔

﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

اس کے اندر کمزوری کے پہلو بھی موجود ہیں۔ جہاں ایک بہت اونچا پہلو ہے کہ اس میں روحِ ربانی پھونکی گئی ہے' وہاں اس کے اندر نفس بھی تو ہے' جس میں ضعف کے پہلو موجود ہیں۔

آیات ۲۹ تا ۳۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۣ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَاۗىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْـَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿۳۲﴾ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَي النِّسَاۗءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ۭ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ۭ وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

آیت ۲۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ''اے اہلِ ایمان' اپنے مال آپس میں باطل طریقے پر ہڑپ نہ کرو''

﴿اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡكُمۡ﴾ ''سوائے اس کے کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے۔''

تجارت اور لین دین کی بنیاد جب واقعتاً باہمی رضامندی پر ہو تو اس سے حاصل ہونے والا منافع جائز اور حلال ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ کی جوتوں کی دکان ہے۔ آپ نے گاہک کو ایک جوتا دکھایا اور اس کی قیمت دو سو روپے بتائی۔ گاہک نے جوتا پسند کیا اور دو سو روپے میں خرید لیا۔ یہ باہمی رضامندی کے سودے کی ایک سادہ سی مثال ہے۔ ظاہر بات ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ نفع تو آپ نے کمایا ہے۔ آپ نے اس کے لیے محنت کی ہے' کہیں سے خرید کر لائے ہیں' اسے سٹور میں محفوظ کیا ہے' دکان کا کرایہ دیا ہے' لہٰذا یہ منافع آپ کا حق ہے اور گاہک کو اس میں تامل نہیں ہوگا۔ لیکن اگر آپ یہی جوتا جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر فروخت کرتے اور یوں کہتے کہ میں نے تو خود اتنے کا لیا ہے تو اس طرح آپ اپنی ساری محنت بھی ضائع کرتے اور آپ کا منافع بھی ناجائز اور حرام ہوتا۔ اسی طرح معاملت اور لین دین کے وہ تمام طریقے جن کی بنیاد جھوٹ اور دھوکہ دہی پر ہو' ناجائز اور حرام ہیں۔

﴿وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ ؕ﴾ ''اور نہ اپنے آپ کو قتل کرو۔''

یعنی ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ تمدن کی بنیاد دو چیزوں پر ہے' احترامِ جان اور احترامِ مال۔ میرے لیے آپ کا مال اور آپ کی جان محترم ہے' میں اسے کوئی گزند نہ پہنچاؤں' اور آپ کے لیے میرا مال اور میری جان محترم ہے' اسے آپ گزند نہ پہنچائیں۔ اگر ہمارے مابین یہ شریفانہ معاہدہ (Gentleman's agreement) قائم رہے تب تو ہم ایک معاشرے اور ایک ملک میں رہ سکتے ہیں' جہاں اطمینان' امن وسکون اور چین ہوگا۔ اور جہاں یہ دونوں احترام ختم ہو گئے' جان کا اور مال کا' تو ظاہر بات ہے کہ پھر وہاں امن وسکون' چین اور اطمینان کہاں سے آئے گا؟ اس آیت میں باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے اور قتلِ نفس دونوں کو حرام قرار دے کر ان دونوں حرمتوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمۡ رَحِيۡمًا ﴿۲۹﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے۔''

آیت ۳۰ ﴿وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ عُدۡوَانًا وَّظُلۡمًا﴾ ''اور جو کوئی بھی یہ کام کرے گا تعدی اور ظلم کے ساتھ''

یعنی یہ دونوں کام —— باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانا اور قتلِ نفس۔

﴿فَسَوۡفَ نُصۡلِيۡهِ نَارًا ؕ﴾ ''تو ہم جلد اس کو جھونک دیں گے آگ میں۔''

﴿وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرًا ﴿۳۰﴾﴾ ''اور یہ چیز اللہ پر بہت آسان ہے۔''

یہ مت سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی کے بہت بڑے حصے کو جہنم میں کیسے جھونک دے گا؟ یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔

اگلی دو آیات میں انسانی تمدن کے دو بہت اہم مسائل بیان ہو رہے ہیں' جو بڑے گہرے اور فلسفیانہ اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا مسئلہ گناہوں کے بارے میں ہے' جن میں کبائر اور صغائر کی تقسیم ہے۔ بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ شرک اور پھر کفر ہے۔ پھر یہ کہ جو فرائض ہیں ان کا ترک کرنا اور جو حرام چیزیں ہیں ان کا ارتکاب کبائر میں شامل ہوگا۔ اس کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں جو انسان سے اکثر ہو جاتی ہیں وہ عموماً صغائر کے زمرے میں آتی ہیں' مثلاً آداب میں یا احکام کی جزئیات میں کوئی کوتاہی ہو گئی' یا بغیر کسی ارادے کے کہیں کوئی ایسی بات کہہ بیٹھے کہ جو غیبت کے حکم میں آ گئی' وغیرہ وغیرہ۔ اس ضمن میں صحت مندانہ رویہ یہ ہے کہ کبائر سے پورے اہتمام کے ساتھ بچا جائے کہ اس سے انسان بالکل پاک ہو جائے۔ فرائض کی پوری ادائیگی ہو' محرمات سے مطلق اجتناب ہو'

اور یہ جو چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں ان کے بارے میں نہ تو ایک دوسرے پر زیادہ گرفت اور نکیر کی جائے اور نہ ہی خود زیادہ دل گرفتہ ہوا جائے' بلکہ ان کے بارے میں توقع رکھی جائے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ ان کے بارے میں استغفار بھی کیا جائے۔ یہی صغائر ہیں جو نیکیوں کے ذریعے سے خود بخود بھی ختم ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ اعضائے وضو دھوتے ہوئے ان اعضاء کے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص وضو کرتا ہے تو جب وہ کُلّی کرتا ہے اور ناک میں پانی ڈالتا ہے تو اُس کے مُنہ اور ناک سے اس کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ جب وہ چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں سے اُس کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے گناہ نکل جاتے ہیں' یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ دُھل جاتے ہیں۔ جب وہ سر کا مسح کرتا ہے تو اُس کے سر اور کانوں سے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ پھر جب وہ پاؤں دھوتا ہے تو اس کے پاؤں سے گناہ نکل جاتے ہیں' یہاں تک کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں۔ پھر اس کا مسجد کی طرف چلنا اور نماز پڑھنا اس کی نیکیوں میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔[1]

یہ صغیرہ گناہ ہیں جو نیکیوں کے اثر سے معاف ہوتے رہتے ہیں' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ﴾ (ھود: ۱۱۴) ''یقیناً نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں''۔ ان برائیوں سے مراد کبائر نہیں' صغائر ہیں۔ کبائر تو بہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے (اِلَّا ماشاء اللہ!) ان کے لیے تو بہ کرنی ہوگی۔ اور جو اکبر الکبائر یعنی شرک ہے اس کے بارے میں تو اس سورت میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ﴾ (آیت ۴۸ و ۱۱۶) ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ یہ بات تو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے' اور اس کے ماسوا جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا''۔ لیکن ہمارے ہاں مذہب کا جو مسخ شدہ (perverted) تصور موجود ہے اس سے ایک ایسا مذہبی مزاج وجود میں آتا ہے کہ جو کبائر ہیں وہ تو ہو رہے ہیں' سود خوری ہو رہی ہے' حرام خوری ہو رہی ہے' مگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر نکیر اور گرفت ہو رہی ہے کہ تمہاری داڑھی کیوں شرعی نہیں ہے' اور تمہارا پائنچہ ٹخنوں سے نیچے کیوں ہے؟ وغیرہ۔ قرآن مجید میں اس معاملے کو تین جگہ نقل کیا گیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں درگزر سے بھی کام لو اور یہ کہ بہت زیادہ متفکر بھی نہ ہو۔ اس معاملے میں باہمی نسبت و تناسب پیش نظر رہنی چاہیے۔ فرمایا:

آیت ۳۱ ﴿اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآىِٕرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ﴾ ''اگر تم اجتناب کرتے رہو گے اُن بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تمہیں روکا جا رہا ہے''

﴿نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ﴾ ''تو ہم تمہاری چھوٹی بُرائیوں کو تم سے دور کر دیں گے''

ہم تمہیں ان سے پاک صاف کرتے رہیں گے۔ تم جو بھی نیک کام کرو گے ان کے حوالے سے تمہاری سیئات خود بخود دھلتی رہیں گی۔

﴿وَّنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِیْمًا ۝۳۱﴾ ''اور تمہیں داخل کریں گے بہت باعزت جگہ پر۔''

یہ مضمون سورۃ الشوریٰ (آیت ۳۷) میں بھی آیا ہے اور پھر سورۃ النجم (آیت ۳۲) میں بھی۔ واضح رہے کہ قرآن حکیم میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں اور یہ مضمون قرآن میں تین بار آیا ہے۔

۱۔ سنن النسائی' کتاب الطھارۃ' باب مسح الاذنین مع الرأس . . . وسنن ابن ماجہ' کتاب الطھارۃ وسنتھا' باب ثواب الطھور۔ ومسند احمد۔ عن عبداللہ الصنابحی رضی اللہ عنہ۔

دوسرا مسئلہ انسانی معاشرے میں انسانوں کے مابین فضیلت کا ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ایک جیسا تو نہیں بنایا ہے۔ کسی کو خوبصورت بنا دیا تو کسی کو بدصورت۔ کوئی صحیح سالم ہے تو کوئی ناقص الاعضاء ہے۔ کسی کا قد اونچا ہے تو کوئی ٹھگنے قد کا ہے اور لوگ اس پر ہنستے ہیں۔ کسی کو مرد بنا دیا' کسی کو عورت۔ اب کوئی عورت اندر ہی اندر کُڑھتی رہے کہ مجھے اللہ نے عورت کیوں بنایا تو اس کا حاصل کیا ہوگا؟ اسی طرح کوئی بدصورت انسان ہے یا ٹھگنا ہے یا کسی اور اعتبار سے کمتر ہے اور وہ دوسرے شخص کو دیکھتا ہے کہ وہ تو بڑا اچھا ہے' تو اب اس پر کڑھنے کے بجائے یہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو کچھ دیا ہے اس پر صبر اور شکر کرے۔ اللہ کا فضل کسی اور پہلو سے بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ ارادہ کرے کہ میں نیکی اور خیر کے کاموں میں آگے بڑھ جاؤں' میں علم میں آگے بڑھ جاؤں۔ اس طرح انسان دوسری چیزوں سے ان چیزوں کی تلافی کر لے جو اسے میسر نہیں ہیں' بجائے اس کے کہ ایک منفی نفسیات پروان چڑھتی چلی جائے۔ اس طرح انسان احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر کڑھتے رہنے سے طرح طرح کی ذہنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ذہنی الجھنوں' محرومیوں اور ناکامیوں کے احساسات کے تحت انسان اپنا ذہنی توازن تک کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے اس ضمن میں کس قدر عمدہ تعلیم دی جا رہی ہے:

آیت ۳۲ ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ﴾ ''اور تمنا نہ کیا کرو اُس شے کی جس کے ذریعے سے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دے دی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو ان کی خلقی صفات کے اعتبار سے دوسروں پر فضیلت دی ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جہاں کسی دوسرے کو اپنے مقابلہ میں کسی حیثیت سے بڑھا ہوا دیکھے بے چین ہو جائے' اس کے اندر حسد' رقابت اور عداوت کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرمائی جا رہی ہے۔ فضیلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو مرد بنایا' کسی کو عورت۔ یہ چیز بھی خلقی ہے اور کسی عورت کا مرد بننے یا کسی مرد کی عورت بننے کی تمنا نری حماقت ہے۔ البتہ دنیا میں قسمت آزمائی اور جدوجہد کے مواقع سب کے لیے موجود ہیں۔

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ﴾ ''مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں گے۔''

﴿وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ﴾ ''اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں گی۔''

یعنی جہاں تک خیرات وحسنات یا سیئات ومنکرات کا معاملہ ہے' مرد وزن میں بالکل مساوات ہے۔ مرد نے جو نیکی کمائی وہ اس کے لیے ہے اور عورت نے جو نیکی کمائی وہ اس کے لیے ہے۔ مسابقت کا یہ میدان دونوں کے لیے کھلا ہے۔ عورت نیکی میں مرد سے آگے نکل سکتی ہے۔ کروڑوں مرد ہوں گے جو قیامت کے دن حضرت خدیجہؓ' حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہن کے مقام پر رشک کریں گے اور ان کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ چنانچہ آدمی کا طرزِ عمل تسلیم ورضا کا ہونا چاہیے کہ جو بھی اللہ نے مجھے بنا دیا اور جو کچھ اس نے مجھے عطا فرمایا اس حوالے سے مجھے بہتر سے بہتر عمل کرنا ہے۔ میرا ''شاکلہ'' تو اللہ کی طرف سے آ گیا ہے' جس سے میں تجاوز نہیں کر سکتا: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ﴾ (بنی اسراءیل:۸۴) ''آپؐ کہہ دیجئے کہ ہر شخص کام کرتا ہے اپنے شاکلہ کے مطابق''۔ ہم سورۃ البقرۃ میں بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ (آیت ۲۸۶) ''اللہ تعالیٰ نہیں ذمہ دار ٹھہرائے گا کسی جان کو مگر اُس کی وسعت کے مطابق۔''

سورۃ النساء کی زیر مطالعہ آیت سے بعض لوگ یہ مطلب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ عورتیں بھی مال کما سکتی ہیں۔ یہ بات سمجھ

لیجیے کہ قرآن مجید میں صرف ایک مقام (البقرۃ:۲۶۷) پر ''کسب'' کا لفظ معاشی جدوجہد اور معاشی کمائی کے لیے آیا ہے: ﴿اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾ ''اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مال میں سے خرچ کرو''۔ باقی پورے قرآن میں ''کسب'' جہاں بھی آیا ہے اعمال کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ کسبِ حسنات نیکیاں کمانا ہے اور کسبِ سیئات بدیاں کمانا۔ آپ اس آیت کے الفاظ پر دوبارہ غور کیجیے: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ﴾ ''مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو انہوں نے کمایا' اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو انہوں نے کمایا''۔ تو کیا ایک عورت کی تنخواہ اگر دس ہزار ہے تو اسے اس میں سے پانچ ہزار ملیں گے؟ نہیں' بلکہ اسے پوری تنخواہ ملے گی۔ لہٰذا اس آیت میں ''کسب'' کا اطلاق دُنیوی کمائی پر نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک عورت کی معاشی جدوجہد کا تعلق ہے ایک خاتون کوئی کام کرتی ہے یا کہیں ملازمت کرتی ہے تو اگر اس میں کوئی حرام پہلو نہیں ہے' شریفانہ جاب ہے' اور وہ ستر و حجاب کے آداب کو بھی ملحوظ رکھتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو بھی کمائی ہوگی وہ پوری اس کی ہوگی' اس میں اس کا حصہ تو نہیں ہوگا۔ البتہ یہ اسلوب جزائے اعمال کے لیے آتا ہے کہ انہیں ان کی کمائی میں سے حصہ ملے گا۔ اس لیے کہ اعمال کے مختلف مراتب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس عمل میں خلوصِ نیت کتنا تھا اور آداب کس حد تک ملحوظ رکھے گئے تھے۔ ہم سورۃ البقرۃ میں حج کے ذکر میں بھی پڑھ چکے ہیں: ﴿اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ﴾ (آیت ۲۰۲) یعنی جو انہوں نے کمایا ہوگا اس میں سے انہیں حصہ ملے گا۔ اسی طرح یہاں پر بھی اکتساب سے مراد اچھے یا بُرے اعمال کمانا ہے۔ یعنی اخلاقی سطح پر اور انسانی عزت و تکریم کے لحاظ سے عورت اور مرد برابر ہیں' لیکن معاشرتی ذمہ داریوں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے جو تقسیم کار رکھی ہے اس کے اعتبار سے فرق ہے۔ اب اگر عورت اس فرق کو قبول کرنے پر تیار نہ ہو' مفاہمت پر رضامند نہ ہو' اور وہ اس پر کڑھتی رہے اور مرد کے بالکل برابر ہونے کی کوشش کرے تو ظاہر ہے کہ معاشرے میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔

﴿وَسْـَٔـلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ﴾ ''اور اللہ سے اُس کا فضل طلب کرو۔''

یعنی جو فضیلت اللہ نے دوسروں کو دے رکھی ہے اس کی تمنا نہ کرو' البتہ اُس سے فضل کی دعا کرو کہ اے اللہ! تُو نے اس معاملے میں مجھے کمتر رکھا ہے' تو مجھے دوسرے معاملات کے اندر ہمت دے کہ میں ترقی کروں۔ اللہ تعالیٰ جس پہلو سے مناسب سمجھے گا اپنا فضل تمہیں عطا فرما دے گا۔ وہ بہت سے لوگوں کو کسی اور پہلو سے نمایاں کر دیتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝۳۲﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔''

آیت ۳۳ ﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ﴾ ''اور ہر ایک کے لیے ہم نے وارث مقرر کر دیے ہیں جو بھی والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔''

قانونِ وراثت کی اہمیت کو دیکھئے کہ اب آخر میں ایک مرتبہ پھر اس کا ذکر فرمایا۔

﴿وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِيْبَهُمْ ۭ﴾ ''اور جن کے ساتھ تمہارے عہد و پیمان ہوں تو اُن کو اُن کا حصہ دو۔''

تقسیمِ وراثت کے احکام کے حوالے سے ایک یہ سوال سامنے آیا کہ جن لوگوں کا آپس میں بھائی چارہ ہے یا مواخات کا رشتہ ہے (مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری اور ایک مہاجر کو بھائی بھائی بنا دیا تھا) تو کیا ان کا وراثت میں بھی حصہ ہے؟ اس ضمن میں یہاں وضاحت کر دی گئی کہ وراثت تو اُسی قاعدہ کے مطابق ورثاء میں تقسیم ہونی چاہیے جو ہم نے مقرر کر دیا ہے۔ جن

لوگوں کے ساتھ تمہارے دوستی اور بھائی چارے کے عہد و پیمان ہیں' یا جو مُنہ بولے بھائی یا بیٹے ہیں ان کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے' البتہ اپنی زندگی میں ان کے ساتھ جو بھلائی کرنا چاہو کر سکتے ہو' انہیں جو کچھ دینا چاہو دے سکتے ہو' اپنی وراثت میں سے بھی کچھ وصیت کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ لیکن جو قانونِ وراثت طے ہو گیا ہے اُس میں کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ وراثت میں حق دار کوئی اور نہیں ہو گا سوائے اُس کے جس کو اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ﴿۳۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔''

اب آ رہی ہے وہ کانٹے دار آیت جو عورتوں کے حلق سے بہت مشکل سے اُترتی ہے اور اکثر کانٹا بن کر حلق میں اٹک جاتی ہے۔ اب تک اس ضمن میں جو باتیں آئیں وہ دراصل اس کی تمہید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلی تمہید سورۃ البقرۃ میں آ چکی ہے: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ﴾ (آیت ۲۲۸) ''اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق' البتہ مَردوں کے لیے اُن پر ایک درجہ فوقیت کا ہے''۔ وہاں صرف یہ کہہ کر بات چھوڑ دی گئی۔ اس کے بعد ابھی آیت ۳۲ میں ہم نے پڑھا: ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ﴾ ''اور تمنا نہ کیا کرو اُس شے کی جس کے ذریعے سے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دے دی ہے''۔ یہ ہدایت عورتوں کے لیے مزید ذہنی تیاری کی غرض سے دی گئی۔ اور اب دوٹوک انداز میں ارشاد ہو رہا ہے:

آیت ۳۴ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں''

یہ ترجمہ میں زور دے کر کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ یہاں قَامَ 'عَلٰی' کے صلہ کے ساتھ آیا ہے۔ قَامَ 'بِ' کے ساتھ آئے گا تو معنی ہوں گے ''کسی شے کو قائم کرنا''۔ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر آیت ۱۳۵ میں یہ الفاظ آئیں گے: ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ﴾ ''عدل کو قائم کرنے والے بن کر کھڑے ہو جاؤ!'' جبکہ قَامَ عَلٰی کے معنی کسی پر مسلط ہونے کے ہیں' یعنی حاکم اور منتظم ہونا۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ سے یہ واضح ہدایت ملتی ہے کہ گھر کے ادارے میں حاکم ہونے کی حیثیت مرد کو حاصل ہے' سربراہِ خاندان مرد ہے' عورت نہیں ہے۔ عورت کو بہر حال اس کے ساتھ ایک وزیر کی حیثیت سے کام کرنا ہے۔ یوں تو ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ میری بات مانی جائے۔ گھر کے اندر مرد بھی یہ چاہتا ہے اور عورت بھی۔ لیکن آخر کار کس کی بات چلے گی؟ یا تو دونوں باہمی رضامندی سے کسی مسئلے میں متفق ہو جائیں' بیوی اپنے شوہر کو دلیل سے' اپیل سے' جس طرح ہو سکے قائل کر لے تو معاملہ ٹھیک ہو گیا۔ لیکن اگر معاملہ طے نہیں ہو رہا تو اب کس کی رائے فیصلہ کن ہو گی؟ مرد کی! لیکن ظاہر ہے عورت کی رائے جب مسترد ہو گی تو اُسے اس سے ایک صدمہ تو پہنچے گا۔ اسی صدمے کا اثر کم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عورت میں نسیان کا مادہ زیادہ رکھ دیا ہے' جو ایک safety valve کا کام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانونِ شہادت میں ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کا نصاب رکھا گیا ہے'' تاکہ ان میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری یاد کرا دے''۔ اس پر ہم سورۃ البقرۃ (آیت ۲۸۲) میں بھی گفتگو کر چکے ہیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے گھر کے ادارے کا سربراہ مرد کو بنایا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ مرد اگر اپنی اس حیثیت کا غلط استعمال کرتا ہے' عورت پر ظلم کرتا ہے اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتا تو اللہ کے ہاں بڑی سخت پکڑ ہو گی۔ آپ کو ایک اختیار دیا گیا ہے اور آپ اس کا غلط استعمال کر رہے ہیں' اس کو ظلم کا ذریعہ بنا رہے ہیں تو اس کی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کو مل جائے گی۔

﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ ''بسبب اُس فضیلت کے جو اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہے''

مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوق حاصل ہے' جن کی بنا پر قوامیت کی ذمہ داری اس پر ڈالی گئی ہے۔

﴿وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ﴾ ''اور بسبب اس کے کہ جو وہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال۔''

اسلام کے معاشرتی نظام میں کفالتی ذمہ داری تمام تر مرد کے اوپر ہے۔ اس کے اخراجات شادی کے آغاز ہی سے شروع ہو جاتے ہیں۔ شادی اگرچہ مرد کی بھی ضرورت ہے اور عورت کی بھی' لیکن مرد مہر دیتا ہے' عورت مہر وصول کرتی ہے۔ پھر گھر میں عورت کا نان نفقہ مرد کے ذمے ہے۔

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ﴾ ''پس جو نیک بیویاں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں''

مرد کو قوامیت کے منصب پر فائز کرنے کے بعد اب نیک بیویوں کا رویہ بتایا جا رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ قرآن کے نزدیک ایک خاتونِ خانہ کی جو بہترین روش ہونی چاہیے وہ یہاں تین الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے: ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ﴾۔

﴿حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ﴾ ''غیب میں حفاظت کرنے والیاں''

وہ مَردوں کی غیر موجودگی میں ان کے اموال اور حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔ ظاہر ہے مرد کا مال تو گھر میں ہی ہوتا ہے' وہ کام پر چلا گیا تو اب وہ بیوی کی حفاظت میں ہے۔ اسی طرح بیوی کی عصمت درحقیقت مرد کی عزت ہے۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی عزت کی حفاظت کرتی ہے۔ اسی طرح مرد کے راز ہوتے ہیں' جن کی سب سے زیادہ بڑھ کر رازدان بیوی ہوتی ہے۔ تو یہ حفاظت تین اعتبارات سے ہے' شوہر کے مال کی' شوہر کی عزت و ناموس کی' اور شوہر کے رازوں کی۔

﴿بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ﴾ ''اللہ کی حفاظت سے۔''

اصل حفاظت و نگرانی تو اللہ کی ہے' لیکن انسان کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی پڑتی ہے۔ جیسے رازق تو اللہ ہے' لیکن انسان کو کام کر کے رزق کمانا پڑتا ہے۔

﴿وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ﴾ ''اور وہ خواتین جن کے بارے میں تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو''

اگر کسی عورت کے رویّے سے ظاہر ہو رہا ہو کہ یہ سرکشی' سرتابی' ضد اور ہٹ دھرمی کی روش پر چل پڑی ہے' شوہر کی بات نہیں مان رہی بلکہ ہر صورت میں اپنی بات منوانے پر مُصر ہے اور اس طرح گھر کی فضا خراب کی ہوئی ہے تو یہ نشوز ہے۔ اگر عورت اپنی اس حیثیت کو ذہناً تسلیم نہ کرے کہ وہ شوہر کے تابع ہے تو ظاہر بات ہے کہ مزاحمت (friction) ہو گی اور اس کے نتیجے میں گھر کے اندر ایک فساد پیدا ہو گا۔ ایسی صورت حال میں مرد کو قوام ہونے کی حیثیت سے بعض تادیبی اختیارات دیے گئے ہیں' جن کے تین مراحل ہیں:

﴿فَعِظُوْهُنَّ﴾ ''پس ان کو نصیحت کرو''

پہلا مرحلہ سمجھانے بجھانے کا ہے' جس میں ڈانٹ ڈپٹ بھی شامل ہے۔

﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ﴾ ''اور اُن کو اُن کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو''

اگر نصیحت و ملامت سے کام نہ چلے تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان سے اپنے بستر علیحدہ کر لو اور اس کے ساتھ تعلقِ زن و شو کچھ عرصہ کے لیے منقطع کر لو۔

﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ﴾ ''اور ان کو مارو۔''

اگر اب بھی وہ اپنی روش نہ بدلیں تو مرد کو جسمانی سزا دینے کا بھی اختیار ہے۔ اس ضمن میں آنحضور ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے کہ چہرے پر نہ مارا جائے اور کوئی ایسی مار نہ ہو جس کا مستقل نشان جسم پر پڑے۔ مذکورہ بالا تادیبی ہدایات اللہ کے کلام کے اندر بیان فرمائی گئی ہیں اور انہیں بیان کرنے میں ہمارے لیے کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ معاشرتی زندگی کو درست رکھنے کے لیے ان کی ضرورت پیش آئے تو انہیں اختیار کرنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔

﴿فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ۭ﴾ ''پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف (خواہ مخواہ زیادتی کی) راہ مت تلاش کرو۔''

اگر عورت سرکشی و سرتابی کی روش چھوڑ کر اطاعت کی راہ پر آ جائے تو پچھلی کدورتیں بھلا دینی چاہئیں۔ اس سے انتقام لینے کے بہانے تلاش نہیں کرنے چاہئیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝۳۴﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بلند ہے، بہت بڑا ہے۔''

آیت ۳۵ ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ ''اور اگر تم کو میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو''

اب اگر کوئی تدبیر نتیجہ خیز نہ ہو اور ان دونوں کے مابین ضِدّم ضِدّا کی کیفیت پیدا ہو چکی ہو کہ عورت بھی اکڑ گئی ہے، مرد بھی اکڑا ہوا ہے، اور اب ان کا ساتھ چلنا مشکل نظر آتا ہو تو اصلاحِ احوال کے لیے ایک دوسری تدبیر اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

﴿فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ﴾ ''تو ایک حَکَم مرد کے خاندان سے مقرر کرو اور ایک حَکَم عورت کے خاندان سے۔''

﴿اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ﴾ ''اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔''

''اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا'' سے مراد زوجین بھی ہو سکتے ہیں اور حَکَمین بھی۔ یعنی ایک تو یہ کہ اگر واقعتاً شوہر اور بیوی موافقت چاہتے ہیں تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا فرما دے گا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں کی خواہش ہوتی ہے کہ معاملہ درست ہو جائے، لیکن کوئی نفسیاتی گرہ ایسی بندھ جاتی ہے جسے کھولنا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ اب اگر دونوں کے خاندانوں میں سے ایک ایک ثالث آ جائے گا اور وہ دونوں مل بیٹھ کر خیر خواہی کے جذبے سے اصلاحِ احوال کی کوشش کریں گے تو اس گرہ کو کھول سکیں گے۔ یہ دونوں اسبابِ اختلاف کی تحقیق کریں گے، میاں بیوی دونوں کے گلے شکوے اور وضاحتیں سنیں گے اور دونوں کو سمجھا بجھا کر تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں گے۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہوگا جب میاں بیوی دونوں اصلاح چاہیں گے۔ ''اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا'' کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اگر حَکَمین نیک نیتی سے اصلاح کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے مابین موافقت پیدا فرما دے گا۔ لیکن میرا رجحان پہلی رائے کی طرف زیادہ ہے کہ اس سے مراد میاں بیوی ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ۝۳۵﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔''

آیات ۳۶ تا ۴۳

وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنِ وَ الْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴿۳۶﴾ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَ يَاْمُرُوْنَ
النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۚ﴿۳۷﴾ وَ
الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ مَنْ يَّكُنِ
الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا ﴿۳۸﴾ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا
مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ﴿۳۹﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَ اِنْ تَكُ
حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ
وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ عَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى
بِهِمُ الْاَرْضُ ؕ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ﴿۴۲﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ ع
سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ
مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً
فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾

اس سے قبل سورۃ البقرۃ آیت ۸۳ میں بنی اسرائیل سے لیے جانے والے میثاق کے حوالے سے اُمّہاتِ شریعت یا دین کی بنیادی باتوں کا ذکر بایں الفاظ آیا تھا: ''اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا کہ تم نہیں عبادت کرو گے کسی کی سوائے اللہ کے' اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو گے اور قرابت داروں' یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھی' اور لوگوں سے اچھی بات کہو' اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو''۔ اب یہ دوسرا مقام آ رہا ہے کہ شریعت کے اندر جو چیزیں اہم تر ہیں اور جنہیں معاشرتی سطح پر مقدم رکھنا چاہیے وہ بیان کی جا رہی ہیں۔ فرمایا:

آیت ۳۶ ﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا﴾ ''اور اللہ ہی کی بندگی کرو اور کسی چیز کو بھی اُس کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ''

سب سے پہلا حق اللہ کا ہے کہ اُسی کی بندگی اور پرستش کرو' اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔

﴿وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ ''اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو''

قرآن حکیم میں چار مقامات (البقرۃ:۸۳' النساء:۳۶' الانعام:۱۵۱' بنی اسرائیل:۲۳) پر اللہ کے حق کے فوراً بعد والدین کے حق کا تذکرہ آیا ہے کہ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک ہو' اُن کا ادب و احترام ہو' اُن کی خدمت کی جائے' اُن کے سامنے آواز پست رکھی جائے۔ یہ بات سورۂ بنی اسرائیل میں بڑی تفصیل سے آئے گی۔ ہمارے معاشرے میں خاندان کے استحکام کی یہ ایک بہت اہم بنیاد ہے۔

﴿وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ﴾ ''اور قرابت داروں' یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ''

﴿وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ﴾ ''اور قرابت دار ہمسائے اور اجنبی ہمسائے کے ساتھ''

پہلے عام طور پر محلّے ایسے ہی ہوتے تھے کہ ایک قبیلہ ایک ہی جگہ رہ رہا ہے' رشتہ داری بھی ہے اور ہمسائیگی بھی۔ لیکن کوئی اجنبی ہمسایہ بھی ہوسکتا ہے۔ جیسے آج کل شہروں میں ہمسائے اجنبی ہوتے ہیں۔

﴿وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ﴾ ''اور ہم نشین ساتھی اور مسافر کے ساتھ''

ایک ہمسائیگی عارضی نوعیت کی بھی ہوتی ہے۔ مثلاً آپ بس میں بیٹھے ہوئے ہیں' آپ کے برابر بیٹھا ہوا شخص آپ کا ہمسایہ ہے۔ نیز جو لوگ کسی بھی اعتبار سے آپ کے ساتھی ہیں' آپ کے پاس بیٹھنے والے ہیں' وہ سب آپ کے حسنِ سلوک کے مستحق ہیں۔

﴿وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ﴾ ''اور وہ لونڈی غلام جو تمہارے ملکِ یمین ہیں (ان کے ساتھ بھی نیک سلوک کرو)۔''

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ﴿۳۶﴾﴾ ''اللہ بالکل پسند نہیں کرتا اُن لوگوں کو جو شیخی خورے اور اکڑنے والے ہوں۔''

آیت ۳۷ ﴿الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ﴾ ''جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں''

جن میں یہ شیخی خوری اور اکڑ ہوتی ہے پھر وہ بخیل بھی ہوتے ہیں' اس لیے کہ غرور و تکبر عام طور پر دولت کی بنا پر ہوتا ہے۔ انہیں معلوم ہے کہ ہمارے پاس جو دولت ہے اگر یہ خرچ ہوگئی تو ہمارا وہ مقام نہیں رہے گا' لوگوں کی نظروں میں ہماری عزت نہیں رہے گی۔ لہٰذا وہ اپنا مال خرچ کرنے میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ اس پر انہیں یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ لوگ ہمیں ملامت کریں گے کہ تم بڑے بخیل ہو' چنانچہ وہ خود لوگوں کو اس طرح کے مشورے دینے لگتے ہیں کہ بابا اس طرح کھلا خرچ نہ کیا کرو' تم خواہ مخواہ پیسے اڑاتے ہو' عقل کے ناخن لو' کچھ نہ کچھ بچا کے رکھا کرو' وقت پر کام آئے گا۔ اس طرح وہ لوگوں کو بھی بخل ہی کا مشورہ دیتے ہیں۔

﴿وَیَکْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ﴾ ''اور وہ چھپاتے ہیں اُس کو جو اللہ نے انہیں اپنے فضل میں سے دیا ہے۔''

اپنی دولت کو چھپا چھپا کر رکھتے ہیں۔ انہیں یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ دولت ظاہر ہوگی تو کوئی سائل سوال کر بیٹھے گا۔ لہٰذا خود ہی مسکین صورت بنائے رکھتے ہیں کہ کوئی ان کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے۔

﴿وَاَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّھِیْنًا ﴿۳۷﴾﴾ ''اور ایسے ناشکروں کے لیے ہم نے بڑا اہانت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آیت ۳۸ ﴿وَالَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ رِئَآءَ النَّاسِ﴾ ''اور وہ لوگ (بھی اللہ کو ناپسند ہیں) جو اپنے مال خرچ کرتے ہیں لوگوں کو دکھانے کے لیے''

﴿وَلَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''اور وہ حقیقت میں ایمان نہیں رکھتے نہ اللہ پر نہ یوم آخر پر۔''

﴿وَمَنْ یَّکُنِ الشَّیْطٰنُ لَہٗ قَرِیْنًا فَسَآءَ قَرِیْنًا ﴿۳۸﴾﴾ ''(ایسے لوگ گویا شیطان کے ساتھی ہیں) اور جس کا ساتھی شیطان ہو جائے تو وہ بہت ہی بُرا ساتھی ہے۔''

آیت ۳۹ ﴿وَمَاذَا عَلَیْھِمْ لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ ''ان لوگوں پر کیا آفت آ جاتی اگر یہ اللہ اور یوم آخر پر

(صدقِ دل سے) ایمان لے آتے''

﴿وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ؕ﴾ ''اور خرچ کرتے (کھلے دل کے ساتھ) اس میں سے جو اللہ نے انہیں دیا ہے۔''

﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝۳۹﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ان سے اچھی طرح واقف ہے۔''

آیت ۴۰ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ﴾ ''یقیناً اللہ کسی پر ذرّے کے ہم وزن بھی ظلم نہیں کرے گا۔''

﴿وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا﴾ ''اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا بڑھائے گا''

﴿وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۴۰﴾ ''اور خاص اپنے خزانہ فضل سے مزید بہت بڑا اجر دے گا۔''

اس سورۂ مبارکہ کی اگلی آیت شہادت علی الناس سے متعلق ہے۔ یہ وہی مضمون ہے جو قبل ازیں سورۃ البقرۃ (آیت ۱۴۳) میں بھی آ چکا ہے کہ اے مسلمانو! تمہیں شہداء علی الناس بنایا گیا ہے' جیسے کہ نبیؐ نے تم پر شہادت دی ہے۔ نبی مکرم ﷺ قیامت کے دن کھڑے ہو کر کہیں گے کہ اے اللہ میرے پاس جو دین آیا تھا میں نے ان تک پہنچا دیا تھا' اب یہ اپنے طرزِ عمل کے خود ذمہ دار ہیں۔ یہی بات قیامت کے دن کھڑے ہو کر تمہیں کہنی ہے کہ اے اللہ ہم نے اپنے زمانے کے لوگوں تک تیرا دین پہنچا دیا تھا' اب اس کے بعد اپنے طرزِ عمل کے یہ خود جواب دہ ہیں۔ اس حوالے سے ہم سب کو اپنی ذمہ داری کی فکر کرنی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ الٹا وہ ہمارے اوپر مقدمہ کریں کہ اے اللہ ان بدبختوں نے ہمیں تیرا دین نہیں پہنچایا' یہ خزانے کے سانپ بن کر بیٹھے رہے۔ بہرحال جس کے کاندھوں پر یہ ذمہ داری ڈال دی گئی ہو' واقعہ یہ ہے کہ اس کے لیے تو یہ ایک بہت بھاری بوجھ ہے۔ اب اس حوالے سے قیامت کے دن کا نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔

آیت ۴۱ ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ﴾ ''تو اُس دن کیا صورت حال ہوگی جب ہم ہر اُمت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے''

یعنی اُس نبی اور رسول کو گواہ بنا کر کھڑا کریں گے جس نے اس اُمت کو دعوت پہنچائی ہوگی۔

﴿وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) آپ کو لائیں گے ہم ان پر گواہ بنا کر۔''

یعنی آپؐ کو کھڑے ہو کر کہنا ہوگا کہ اے اللہ! میں نے ان تک تیرا پیغام پہنچا دیا تھا۔ ہماری عدالتی اصطلاح میں اسے استغاثہ کا گواہ (prosecution witness) کہا جاتا ہے۔ گویا عدالتِ خداوندی میں نبی مکرم ﷺ استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے پیش ہو کر کہیں گے کہ اے اللہ' تیرا پیغام جو مجھ تک پہنچا تھا میں نے انہیں پہنچا دیا تھا' اب یہ خود ذمہ دار اور جواب دہ ہیں۔ چنانچہ اپنی ہی قوم کے خلاف گواہی آ گئی نا؟ یہاں الفاظ نوٹ کر لیجیے: عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ عَلٰی ہمیشہ مخالفت کے لیے آتا ہے۔ ادھر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے شفاعت کی امید میں بیٹھے ہیں اور اُدھر ہمارے خلاف مقدمہ قائم ہونے چلا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ دربارِ خداوندی میں ہمارے خلاف گواہی دیں گے کہ اے اللہ! میں نے تیرا دین ان کے سپرد کیا تھا' اس کے بعد اسے دنیا میں پھیلانا ان کا کام تھا' لیکن انہوں نے خود دین کو چھوڑ دیا۔ سورۃ الفرقان میں اس حوالے سے بہت سخت الفاظ آئے ہیں: ﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝۳۰﴾ ''اور رسولؐ کہیں گے کہ پروردگار' میری قوم نے اس قرآن کو ترک کر دیا تھا''۔ سورۃ النساء کی آیت زیر مطالعہ کے بارے میں ایک واقعہ بھی ہے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ! انہوں نے عرض کیا حضورؐ آپ کو سناؤں؟ آپؐ پر تو قرآن نازل ہوا ہے۔ فرمایا: ہاں' لیکن مجھے کسی دوسرے سے سن کر

کچھ اور حظ حاصل ہوتا ہے۔ اس پر حضرت عبداللہ ؓ نے سورۃ النساء پڑھنی شروع کی۔ حضور ﷺ بھی سن رہے تھے' باقی اور صحابہؓ بھی ہوں گے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ گردن جھکائے پڑھتے جا رہے تھے۔ جب اس آیت پر پہنچے ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۭ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝۴۱﴾ تو حضور ﷺ نے فرمایا: حَسْبُکَ ' حَسْبُکَ (بس کرو' بس کرو!) عبداللہ بن مسعودؓ نے سر اٹھا کر دیکھا تو حضور ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ حضور ﷺ کے یہ آنسو ظاہر ہے اس احساس کی وجہ سے تھے کہ مجھے اپنی قوم کے خلاف گواہی دینی ہوگی۔

آیت ۴۲ ﴿يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ﴾ ''اُس دن تمنا کریں گے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تھا اور رسول کی نافرمانی کی تھی کہ کاش ان کے سمیت زمین برابر کر دی جائے۔''

یعنی کسی طرح زمین پھٹ جائے اور ہم اس میں دفن ہو جائیں' ہمیں نسیاً منسیاً کر دیا جائے۔

﴿وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۝۴۲﴾ ''اور وہ اللہ سے کوئی بات بھی چھپا نہیں سکیں گے۔''

آیت ۴۳ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ ''اے اہلِ ایمان' نماز کے قریب نہ جاؤ اس حال میں کہ تم نشے کی حالت میں ہو''

﴿حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ ''یہاں تک کہ تمہیں معلوم ہو جو کچھ تم کہہ رہے ہو''

سورۃ البقرۃ (آیت ۲۱۹) میں شراب اور جوئے کے بارے میں محض اظہارِ ناراضگی فرمایا گیا تھا: ﴿اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ﴾ ''ان کا گناہ کا پہلو نفع کے پہلو سے بڑا ہے''۔ اب اگلے قدم کے طور پر شراب کے اندر جو خباثت' شناعت اور برائی کا پہلو ہے اسے ایک مرتبہ پھر اُجاگر کیا گیا کہ نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جایا کرو۔ جب تک نشہ اُتر نہ جائے اور تمہیں معلوم نہ ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو اُس وقت تک نماز نہ پڑھا کرو۔ چونکہ شراب کی حرمت کا حکم ابھی نہیں آیا تھا لہٰذا بعض اوقات لوگ نشے کی حالت ہی میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے۔ ایسے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں کہ کسی نے نشے میں نماز پڑھائی اور ''لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ'' کے بجائے ''اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ'' پڑھ دیا۔ اس پر خاص طور پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہاں پر ﴿حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ کے الفاظ خصوصی طور پر قابلِ غور ہیں کہ جب تک تم شعور کے ساتھ سمجھ نہ رہے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو! اس میں ایک اشارہ ادھر بھی ہو گیا کہ بے سمجھے نماز مت پڑھا کرو! یعنی ایک تو مدہوشی کی وجہ سے سمجھ میں نہیں آ رہا اور غلط سلط پڑھ رہے ہیں تو اس سے روکا جا رہا ہے' اور ایک سمجھتے ہی نہیں کہ نماز میں کیا پڑھ رہے ہیں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم کہہ کیا رہے ہو۔ اب جنہیں قرآن مجید کے معنی نہیں آتے' نماز کے معنی نہیں آتے' انہیں کیا پتا کہ وہ نماز میں کیا کہہ رہے ہیں!

﴿وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا ۭ﴾ ''اور اسی طرح جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے قریب نہ جاؤ) جب تک غسل نہ کر لو' اِلّا یہ کہ راستے سے گزرتے ہوئے۔''

اگر تم نے اپنی بیویوں سے مباشرت کی ہو یا احتلام وغیرہ کی شکل ہو گئی ہو تب بھی تم نماز کے قریب مت جاؤ جب تک کہ غسل نہ کر لو۔ ''اِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ'' کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں۔ بعض فقہاء اور مفسرین نے اس کا یہ مفہوم سمجھا ہے کہ حالتِ جنابت میں مسجد میں نہ جانا چاہیے' اِلا یہ کہ کسی کام کے لیے مسجد میں سے گزرنا ہو' جبکہ بعض نے اس سے مراد سفر لیا ہے۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ﴾ ''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو''

آدمی کو تیز بخار ہے یا کوئی اور تکلیف ہے جس میں غسل کرنا مُضر ثابت ہو سکتا ہے تو تیمم کی اجازت ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص سفر میں ہے اور اسے پانی دستیاب نہیں ہے تو وہ تیمم کر لے۔

﴿اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ﴾ ''یا تم میں سے کوئی قضاءِ حاجت کے بعد آیا ہو''

﴿اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ ''یا تم نے عورتوں کے ساتھ مباشرت کی ہو''

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً﴾ ''پھر تم پانی نہ پاؤ''

﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ ''تو پاک مٹی کا قصد کرو''

یعنی وہ تمام صورتیں جن میں غسل یا وضو واجب ہے' ان میں اگر بیماری غسل سے مانع ہو' حالتِ سفر میں نہانا ممکن نہ ہو' قضائے حاجت یا عورتوں سے مباشرت کے بعد پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لیا جائے۔

﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ﴾ ''اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر مسح کر لو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۴۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا' بخشنے والا ہے۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے لیلۃ القدر کی جو دعا مروی ہے اس میں یہی لفظ آیا ہے: ((اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّيْ)) ''اے اللہ' تو معاف فرمانے والا ہے' معافی کو پسند کرتا ہے' پس تُو مجھے معاف فرما دے!''

سورۃ النساء کی ان تینتالیس آیات میں وہی سورۃ البقرۃ کا انداز ہے کہ شریعت کے احکام مختلف گوشوں میں' مختلف پہلوؤں سے بیان ہوئے۔ عبادات کے ضمن میں تیمم کا ذکر آ گیا' وراثت کا قانون پوری تفصیل سے بیان ہو گیا اور معاشرے میں جنسی بے راہ روی کی روک تھام کے لیے احکام آ گئے' تاکہ ایک پاکیزہ اور صالح معاشرہ وجود میں آئے جہاں ایک مستحکم خاندانی نظام ہو۔ اب آگے ایک مختصر سا خطاب اہلِ کتاب کے بارے میں آ رہا ہے۔

آیات ۴۴ تا ۵۷

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ ۭ وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ۭ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ﴿۴۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ

افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ
وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۵۰﴾ ع
اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ
لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ﴿۵۱﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ وَ
مَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ﴿۵۲﴾ اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ
نَقِيْرًا ﴿۵۳﴾ اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ
الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ
وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ﴿۵۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ كُلَّمَا نَضِجَتْ
جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۵۶﴾ وَ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ
اَبَدًا ۭ لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۡ وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ﴿۵۷﴾

آیت ۴۴ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جنہیں کتاب میں سے ایک حصہ دیا گیا تھا''

وہ ''الکتاب'' ایک حقیقت ہے جس میں سے ایک حصہ تورات اور ایک حصہ انجیل کے نام سے نازل ہوا اور پھر وہ کتاب ہر اعتبار سے کامل ہو کر قرآن کی شکل میں نازل ہوئی۔

﴿يَشْتَرُوْنَ الضَّلٰلَةَ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ تَضِلُّوا السَّبِيْلَ ﴿۴۴﴾﴾ ''وہ گمراہی خریدتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔''

مشرکینِ مکہ کی کوشش بھی یہی ہوتی تھی کہ لوگ لہو ولعب میں مشغول رہیں اور قرآن نہ سنیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایران سے رستم واسفندیار کے قصے منگوا کر داستان گوئی کا سلسلہ شروع کیا اور گانے بجانے والی لونڈیوں اور آلاتِ موسیقی کا انتظام کیا تاکہ لوگ انہی چیزوں میں مشغول رہیں اور حضور ﷺ کی بات کوئی نہ سنے۔ اسی طرح مدینہ میں یہود کا بھی یہی معاملہ تھا کہ وہ خود بھی گمراہ کن مشاغل اختیار کرتے اور دوسروں کو بھی اس میں مشغول کرنے کی کوشش کرتے۔ ہمارے زمانے میں اس قسم کے مشاغل کی بہت سی صورتیں ہیں۔ ہمارے ہاں جب کرکٹ میچ ہو رہے ہوتے ہیں اور ٹی وی پر دکھائے جاتے ہیں تو پوری قوم کا یہ حال ہوتا ہے گویا دنیا کی اہم ترین شے کرکٹ ہی ہے۔ اسی طرح دنیا میں دوسرے کھیل تماشے دیکھے جاتے ہیں کہ دنیا ان کے پیچھے پاگل ہو جاتی ہے۔ شیطان کو اور کیا چاہیے؟ وہ تو یہی چاہتا ہے نا کہ لوگوں کی حقائق کی طرف نگاہ ہی نہ ہو۔ کسی کو یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ جینا کاہے کے لیے ہے؟ موت ہے تو اس کے بعد کیا ہونا ہے؟ انسان یا تو حیوانی سطح پر زندگی گزار دے اور اسے حلال وحرام کی تمیز ہی نہ رہے کہ وہ کیا کما رہا ہے اور کیا کھا رہا ہے' یا پھر لہو ولعب میں مشغول رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان چیزوں کے فروغ کے لیے دنیا

میں بڑے مستحکم نظام قائم کیے گئے ہیں اور ان سے وابستہ افراد کو بھاری معاوضے اور بڑے بڑے انعامات دیے جاتے ہیں۔ فرمایا: یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں بھی سیدھے راستے سے بھٹکا دیں' راہِ حق سے منحرف کر دیں۔

آیت ۴۵ ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَآئِكُمْ ؕ﴾ ''اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے۔''

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا ﴿۴۵﴾﴾ ''اور اللہ کافی ہے تمہارے ولی اور پشت پناہ ہونے کی حیثیت سے' اور وہ کافی ہے تمہارے مددگار ہونے کے اعتبار سے۔''

آیت ۴۶ ﴿مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ﴾ ''ان یہودیوں میں سے کچھ لوگ ہیں جو کلام کو اس کے اصل مقام و محل سے پھیر دیتے ہیں''

﴿وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا﴾ ''وہ کہتے ہیں ہم نے سنا اور ہم نے نہیں مانا''

یہود اپنی زبانوں کو توڑ مروڑ کر الفاظ کو کچھ کا کچھ بنا دیتے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو احکامِ الٰہی سن کر کہتے سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا۔ بظاہر وہ اہلِ ایمان کی طرح سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (ہم نے سنا اور ہم نے قبول کیا) کہہ رہے ہوتے' لیکن زبان کو مروڑ کر حقیقت میں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کہتے۔

﴿وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ﴾ ''اور (کہتے ہیں) سنیے نہ سنا جائے۔''

وہ حضور ﷺ کی مجلس میں آپؐ کو مخاطب کر کے کہتے ذرا ہماری بات سنیے! ساتھ ہی چپکے سے کہہ دیتے کہ آپ سے سنا نہ جائے' ہمیں آپ کو سنانا مطلوب نہیں ہے۔ اس طرح وہ شانِ رسالت ﷺ میں گستاخی کے مرتکب ہوتے۔

﴿وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ﴾ ''اور (کہتے ہیں) رَاعِنَا اپنی زبانوں کو موڑ کر''

رَاعِنَا کا مفہوم تو ہے ''ہماری رعایت کیجیے'' لیکن وہ اسے کھینچ کر رَاعِيْنَا بنا دیتے۔ یعنی اے ہمارے چرواہے!

﴿وَطَعْنًا فِى الدِّيْنِ ؕ﴾ ''اور دین میں طعن کرنے کے لیے۔''

یہود اپنی زبانوں کو توڑ مروڑ کر ایسے کلمات کہتے اور پھر دین میں یہ عیب لگاتے کہ اگر یہ شخص واقعی نبی ہوتا تو ہمارا فریب اس پر ظاہر ہو جاتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب کو ظاہر کر دیا۔

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ ۙ﴾ ''اور اگر وہ یہ کہتے کہ ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی' اور آپ ہماری بات سن لیجیے' اور ذرا ہمیں مہلت دیجیے' تو یہ ان کے حق میں کہیں بہتر ہوتا اور بہت درست اور سیدھی بات ہوتی''

﴿وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ﴾ ''لیکن اللہ نے تو ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کر دی ہے''

﴿فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۴۶﴾﴾ ''تو اب وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں مگر شاذ ہی کوئی۔''

آیت ۴۷ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا﴾ ''اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی تھی! ایمان لاؤ اُس پر جو ہم نے نازل کیا ہے''

یہود کی شرارتوں پر لعنت و ملامت کے ساتھ ہی انہیں قرآن کریم پر ایمان کی دعوت بھی دی جا رہی ہے۔

﴿مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ﴾ ''جو اُس کی تصدیق کرتے ہوئے آیا ہے جو تمہارے پاس ہے''

﴿مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ﴾ ''اس سے قبل کہ ہم چہروں کو مٹا ڈالیں' پھر ان کو ان کی پیٹھوں کی طرف موڑ دیں''

یعنی چہرے اس طرح مسخ کر دیے جائیں کہ بالکل سپاٹ ہو جائیں' ان پر کوئی نشان باقی نہ رہے اور پھر انہیں پشت کی طرف موڑ دیا جائے کہ چہرہ پیچھے اور گُدی سامنے۔

﴿اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ السَّبْتِ ؕ﴾ ''یا ہم ان پر بھی اسی طرح لعنت کر دیں جس طرح ہم نے اصحابِ سبت پر لعنت کی تھی۔''

اصحابِ سبت کے واقعے کی تفصیل سورۃ الاعراف (رکوع ۲۱) میں آئے گی' لیکن اجمالاً یہ واقعہ سورۃ البقرۃ (آیات ۶۵'۶۶) میں بھی آ چکا ہے۔

﴿وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُوْلًا ۝۴۷﴾ ''اور اللہ کا حکم تو نافذ ہو کر رہنا ہے۔''

آیت ۴۸ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ﴾ ''اور یقیناً اللہ اس بات کو ہرگز نہیں بخشے گا کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے''

﴿وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾ ''اور اس سے کم تر جو کچھ ہے وہ جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا۔''

بہرحال یہ بھی کوئی کھلا لائسنس نہیں ہے کہ کسی کے باقی سب گناہ تو معاف ہو ہی جائیں گے۔ البتہ ان الفاظ میں اُمید دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ باقی تمام گناہوں کو بغیر توبہ کے بھی معاف کر سکتا ہے' لیکن شرک کے معاف ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قدر اہم ہے کہ آگے آیت ۱۱۶ میں اسے پھر دہرایا گیا ہے۔

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝۴۸﴾ ''اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا ہے اُس نے تو بہت بڑے گناہ کا افترا کیا۔''

اللہ تعالیٰ تو واحد و یکتا ہے۔ اُس کی ذات و صفات میں کسی اور کو شریک کرنا بہت بڑا جھوٹ' افترا' بہتان اور عظیم ترین گناہ ہے۔

آیت ۴۹ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں اُن لوگوں کو جو اپنے آپ کو بڑا پاکیزہ ٹھہراتے ہیں؟''

یہاں یہود کے اُسی فلسفے کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو بہت پاک باز اور اعلیٰ وارفع سمجھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ "We are the chosen people of the Lord" کہ ہم اللہ کے منظورِ نظر لوگ ہیں۔ سورۃ المائدۃ میں ان کا یہ قول نقل ہوا ہے: ﴿نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ (آیت ۱۸) یعنی ہم تو اللہ کے بیٹوں کی طرح ہیں بلکہ اس کے بہت ہی چہیتے اور لاڈلے ہیں۔ ان کے نزدیک دوسرے تمام لوگ Goyims اور Gentiles ہیں' جو دیکھنے میں انسان نظر آتے ہیں' حقیقت میں حیوان ہیں۔ ان کو ہم جس طرح چاہیں لوٹ کر کھا جائیں' جس طرح سے چاہیں ان کو دھوکہ دیں' ان کا استحصال کریں' ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ اس حوالے سے سورۂ آل عمران میں ہم ان کا یہ قول پڑھ چکے ہیں: ﴿لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ﴾ (آیت ۷۵) کہ ان اُمیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ ہم سے ان کے بارے میں کوئی محاسبہ اور کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ جیسے آپ نے اپنے گھوڑے کو

ٹانگے میں جوت لیا یا ہرن کا شکار کر کے اسے کھا لیا تو آپ سے اس پر کون مؤاخذہ کرے گا؟

﴿بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ ''بلکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو پاک کرتا ہے جس کو چاہتا ہے''

﴿وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۴۹﴾ ''اور ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

ان کو اگر پاکیزگی نہیں ملتی تو اس کا سبب ان کے اپنے کرتوت ہیں' اللہ تعالیٰ کی طرف سے تو ان پر ذرا بھی ظلم نہیں کیا جاتا۔ فَتِیل دراصل اُس دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کے اندر گٹھلی کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں جو چھوٹی سے چھوٹی چیزیں لوگوں کے مشاہدے میں آتی تھیں ظاہر ہے کہ وہیں سے کسی چیز کے چھوٹا ہونے کے لیے مثال پیش کی جا سکتی تھی۔

آیت ۵۰ ﴿اُنْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ﴾ ''دیکھو یہ لوگ اللہ پر کیسے جھوٹ باندھ رہے ہیں؟''

﴿وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝۵۰﴾ ''اور صریح گناہ ہونے کے لیے تو یہی کافی ہے۔''

یعنی ان کی گرفت کے لیے اور ان کو عذاب دینے کے لیے یہی ایک بات کافی ہے جو انہوں نے گھڑی ہے۔

آیت ۵۱ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ﴾ ''کیا تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنہیں کتاب میں سے ایک حصہ دیا گیا تھا''

﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ﴾ ''وہ ایمان لاتے ہیں بُتوں پر اور شیطان پر''

﴿وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ۝۵۱﴾ ''اور کہتے ہیں ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے کفر کیا (یعنی مشرکین) کہ ان اہلِ ایمان سے زیادہ ہدایت پر تو یہ ہیں۔''

یہود اپنی ضد اور ہٹ دھرمی میں اس حد تک پہنچ گئے تھے۔ انہیں خوب معلوم تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھی ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ میں ان سے مشابہ تھے' پھر وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان رکھتے تھے اور تورات کو اللہ کی کتاب مانتے تھے۔ لیکن اہلِ ایمان کے ساتھ ضد مِ ضدا اور عداوت میں وہ اس حد تک آگے بڑھے کہ مشرکینِ مکہ سے مل کر ان کے بُتوں کی تعظیم کرتے اور کہتے کہ یہ مشرک مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ ہیں اور ان کا دین مسلمانوں کے دین سے بہتر ہے۔

آیت ۵۲ ﴿اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۭ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت فرما دی ہے۔''

﴿وَمَنْ يَّلْعَنِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ نَصِيْرًا ۝۵۲﴾ ''اور جس پر اللہ لعنت کر دے پھر تم اُس کے لیے کوئی مددگار نہیں پاؤ گے۔''

آیت ۵۳ ﴿اَمْ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّنَ الْمُلْكِ﴾ ''کیا ان کا کوئی حصہ ہے اقتدار میں؟''

انہوں نے یہ جو تقسیم کر لی ہے کہ دنیا میں یہ سب کچھ ہمارے لیے ہے' باقی تمام انسان Goyims اور Gentiles ہیں' تو انسانوں میں یہ تقسیم اور تفریق کا اختیار انہیں کس نے دیا ہے؟ کیا ان کا اللہ کی حکومت میں کوئی حصہ ہے؟ زمین و آسمان کی بادشاہی تو اللہ کی ہے' مالک الملک اللہ ہے۔ تو کیا ان کو اُس کے پاس سے کوئی اختیار ملا ہوا ہے؟

﴿فَاِذًا لَّا يُؤْتُوْنَ النَّاسَ نَقِيْرًا ۝۵۳﴾ ''اگر ایسا کہیں ہوتا تو یہ دوسرے لوگوں کو تل کے برابر بھی کوئی شے دینے کو تیار نہ ہوتے۔''

آیت ۵۴ ﴿اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰي مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ﴾ ''کیا یہ حسد کر رہے ہیں لوگوں سے اس پر کہ جو اللہ

نے ان کو اپنے فضل میں سے عطا کر دیا ہے؟''

دراصل یہ سب اس حسد کا نتیجہ ہے جو یہ مسلمانوں سے رکھتے ہیں کہ اللہ نے ان اُمّیین میں اپنا آخری نبی بھیج دیا اور انہیں اپنی آخری کتاب عطا فرما دی جنہیں یہ حقیر سمجھتے تھے۔ اب یہ اس حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔

﴿فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ۝۵۴﴾ ''تو ہم نے آلِ ابراہیمؑ کو کتاب اور حکمت عطا فرمائی اور انہیں بہت بڑی حکومتیں بھی دیں۔''

یعنی انہیں اگر تورات اور انجیل ملی تھی تو ابراہیم علیہ السلام کی نسل ہونے کے ناتے سے ملی تھی' تو یہ جو بنو اسماعیلؑ ہیں یہ بھی تو ابراہیمؑ ہی کی نسل سے ہیں۔ ہاں بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت علیحدہ علیحدہ ملی۔ تورات کتاب تھی اور انجیل حکمت تھی' جبکہ یہاں کتاب اور حکمت اللہ تعالیٰ نے ایک ہی جگہ پر قرآن میں بتمام و کمال جمع کر دی ہیں۔ مزید برآں جیسے ان کو ملکِ عظیم دیا تھا' اب ہم ان مسلمانوں کو اس سے بڑا ملک دیں گے۔ یہ مضمون سورۃ النُّور میں آئے گا: ﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠﴾ (آیت ۵۵) ''ہم لازماً ان اہلِ ایمان کو دنیا میں حکومت اور خلافت عطا کریں گے جیسے ان سے پہلوں کو عطا کی تھی۔''

آیت ۵۵ ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ بِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ صَدَّ عَنْهُ ۭ﴾ ''پس ان میں سے وہ بھی ہیں جو اس پر ایمان لے آئے ہیں اور وہ بھی ہیں جو اس سے رُک گئے ہیں۔''

﴿وَكَفٰى بِجَهَنَّمَ سَعِيْرًا ۝۵۵﴾ ''اور ایسے لوگوں کے لیے تو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہی کافی ہے۔''

آیت ۵۶ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا سَوْفَ نُصْلِيْهِمْ نَارًا ۭ﴾ ''یقیناً جو لوگ ہماری آیات کا کفر کریں گے ایک وقت آئے گا کہ ہم انہیں آگ میں جھونک دیں گے۔''

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ ''اور جب بھی ان کی کھالیں جل جائیں گی ہم ان کو دوسری کھالیں بدل دیں گے''

﴿لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ﴾ ''تاکہ وہ عذاب کا مزا چکھتے رہیں۔''

یہ بھی ایک بہت بڑی حقیقت ہے جسے میڈیکل سائنس نے دریافت کیا ہے کہ درد کا احساس انسان کی کھال (skin) ہی میں ہے۔ اس کے نیچے گوشت اور عضلات وغیرہ میں درد کا احساس نہیں ہے۔ کسی کو چٹکی کاٹی جائے' کانٹا چبھے' چوٹ لگے یا کوئی حصہ جل جائے تو تکلیف اور درد کا سارا احساس جلد ہی میں ہوتا ہے۔ چنانچہ جہنمیوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ جب بھی ان کی کھال آتشِ جہنم سے جل جائے گی تو اس کی جگہ نئی کھال دے دی جائے گی تاکہ ان کی تکلیف اور جلن کا احساس مسلسل برقرار رہے' اس میں کمی نہ ہو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۵۶﴾ ''یقیناً اللہ زبردست ہے' کمالِ حکمت والا ہے۔''

آیت ۵۷ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے''

اہلِ جہنم کے تذکرے کے فوراً بعد اب اہلِ جنّت کا ذکر ہے۔ یہ فوری تقابل (simultaneous contrast) کا وہ معروف انداز ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

﴿سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ ''عنقریب انہیں ہم داخل کریں گے ان باغات میں جن کے

دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی‘‘

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ﴾ ’’وہ رہیں گے ان میں ہمیشہ ہمیش۔‘‘

﴿لَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫﴾ ’’ان کے لیے اس میں ہوں گی بڑی پاک باز بیویاں‘‘

﴿وَّنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيْلًا ۝۵۷﴾ ’’اور ہم انہیں داخل کریں گے گھنی چھاؤں میں۔‘‘

انہیں ایسی گہری اور ٹھنڈی چھاؤں میں رکھا جائے گا جو دھوپ کی حِدّت اور تمازت سے بالکل محفوظ ہوگی۔

یہاں وہ حصہ ختم ہوا جس میں اہلِ کتاب کی طرف روئے سخن تھا۔ اب پھر مسلمانوں سے خطاب ہے۔

آیات ۵۸ تا ۷۰

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَ اِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۵۸ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝۵۹ ع اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ؕ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۶۰ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَ اِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝۶۱ فَكَيْفَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ ۖ بِاللّٰهِ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۝۶۲ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۗ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِيْغًا ۝۶۳ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۶۴ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵ وَ لَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ وَ لَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَ اَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝۶۶ وَّ اِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۶۷ وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝۶۸ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ۝۶۹ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝۷۰ ع

یہ دو آیات (۵۸، ۵۹) قرآن مجید کی نہایت اہم آیات ہیں' ان میں اسلام کا سارا سیاسی' قانونی اور دستوری نظام موجود ہے۔ فرمایا:

آیت ۵۸ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ﴾ ''اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو''

﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ۭ﴾ ''اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔''

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ جو بھی سیاسی نظام بناتے ہیں اس میں مناصب ہوتے ہیں' جن کی ذمہ داریاں بھی ہوتی ہیں اور اختیارات بھی۔ لہٰذا ان مناصب کے انتخاب میں آپ کی رائے کی حیثیت امانت کی ہے۔ آپ اپنی رائے دیکھ بھال کر دیں کہ کون اس کا اہل ہے۔ اگر آپ نے ذات برادری' رشتہ داری وغیرہ کی بنا پر یا مفادات کے لالچ میں یا کسی کی دھونس کی وجہ سے کسی کے حق میں رائے دی تو یہ صریح خیانت ہے۔ حقِ رائے دہی ایک امانت ہے اور اس امانت کا استعمال صحیح صحیح ہونا چاہیے۔ عام معنی میں بھی امانت کی حفاظت ضروری ہے اور جو بھی امانت کسی نے رکھوائی ہے اسے واپس لوٹانا آپ کی شرعی ذمہ داری ہے۔ لیکن یہاں یہ بات اجتماعی زندگی کے اہم اصولوں کی حیثیت سے آ رہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔ گویا پہلی ہدایت سیاسی نظام سے متعلق ہے کہ امیر المؤمنین یا سربراہِ ریاست کا انتخاب اہلیت کی بنیاد پر ہوگا' جبکہ دوسری ہدایت عدلیہ (Judiciary) کے استحکام کے بارے میں ہے کہ وہاں بلا امتیاز ہر ایک کو عدل و انصاف میسر آئے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ﴾ ''یقیناً یہ بہت ہی اچھی نصیحتیں ہیں جو اللہ تمہیں کر رہا ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝۵۸﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

اگلی آیت میں تیسری ہدایت مقننہ (Legislature) کے بارے میں آ رہی ہے کہ اسلامی ریاست کی دستوری بنیاد کیا ہوگی۔ جدید ریاست کے تین ستون انتظامیہ (Executive)' عدلیہ (Judiciary) اور مقننہ (Legislature) گنے جاتے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو کا ذکر گزشتہ آیت میں آیا ہے۔ اب اگلی آیت میں مقننہ کا ذکر ہے کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کے اصول کیا ہوں گے۔ فرمایا:

آیت ۵۹ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی''

یعنی کوئی قانون اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی منشا کے خلاف نہیں بنایا جا سکتا۔ اصولی طور پر یہ بات پاکستان کے دستور میں بھی تسلیم کی گئی ہے:

"No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah."

یعنی کوئی قانون سازی قرآن و سنت کے منافی نہیں کی جائے گی۔ لیکن اس کی تنفیذ و تعمیل کی کوئی ضمانت موجود نہیں ہے' لہٰذا اس وقت ہمارا دستور منافقت کا پلندہ ہے۔ اس آیت کی رو سے اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام قانون سازی کے دو مستقل ذرائع (sources) ہیں۔ اس طرح یہاں منکرینِ سنت کی نفی ہوتی ہے جو مؤخر الذکر کا انکار کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فرمایا:

﴿وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ﴾ ''اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی (اطاعت کرو)۔''

اس آیت کا اسلوب خصوصی طور پر لائقِ توجہ ہے۔ یہاں تین ہستیوں یعنی اللہ‘ رسول ﷺ اور اولوالامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے‘ لیکن پہلے دو کے لیے ’’اَطِیْعُوْا‘‘ کا لفظ آیا ہے‘ جبکہ تیسرے کے لیے نہیں ہے۔ ایک اسلوب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ’’اَطِیْعُوْا‘‘ ایک مرتبہ آ جاتا اور اس کا اطلاق تینوں پر ہو جاتا: ’’یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ‘‘۔ اس طرح تینوں برابر ہو جاتے۔ دوسرا اسلوب یہ ہو سکتا تھا کہ ’’اَطِیْعُوْا‘‘ تیسری مرتبہ بھی آتا: ’’یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاَطِیْعُوْٓا اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ‘‘۔ لیکن قرآن نے جو اسلوب اختیار کیا ہے کہ ’’اَطِیْعُوْا‘‘ دو کے ساتھ ہے‘ تیسرے کے ساتھ نہیں ہے‘ اس سے اولوالامر کی اطاعت کا مرتبہ (status) متعین ہو جاتا ہے۔ ایک تو ’’مِنْكُمْ‘‘ کی شرط سے واضح ہو گیا کہ اولوالامر تم ہی میں سے ہونے چاہئیں‘ یعنی مسلمان ہوں۔ غیر مسلم کی حکومت کو ذہناً تسلیم کرنا اللہ سے بغاوت ہے۔ پھر متذکرہ بالا اسلوب سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ اولوالامر کی اطاعت مطلق‘ دائم اور غیر مشروط نہیں۔ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت مطلق‘ دائم‘ غیر مشروط اور غیر محدود ہے‘ لیکن صاحبِ امر کی اطاعت اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کے تابع ہو گی۔ وہ جو حکم بھی لائے اسے بتانا ہو گا کہ میں کتاب و سنّت سے کیسے اس کا استنباط کر رہا ہوں۔ گویا اسے کم از کم یہ ثابت کرنا ہو گا کہ یہ حکم کتاب و سنّت کے خلاف نہیں ہے۔ ایک مسلمان ریاست میں قانون سازی اسی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست میں قانون ساز ادارہ کوئی بھی ہو‘ کانگریس ہو‘ پارلیمنٹ ہو یا مجلسِ ملی ہو‘ وہ قانون سازی اس شرط کے ساتھ کرے گی کہ اس کا بنایا ہوا کوئی قانون قرآن و سنّت سے متصادم نہ ہو۔

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ﴾ ’’پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملے میں اختلافِ رائے ہو جائے‘‘

ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ اولوالامر کہے کہ میں تو اسے اسلام کے عین مطابق سمجھتا ہوں‘ لیکن دوسرے لوگ کہیں کہ نہیں‘ یہ بات خلافِ اسلام ہے‘ تو اب کہاں جائیں؟ فرمایا:

﴿فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ ’’تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف‘‘

یعنی ہر ایک کو اپنا موقف درست ثابت کرنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے یعنی قرآن و سنّت سے دلیل لانی پڑے گی۔ میری پسند‘ میرا خیال‘ میرا نظریہ والا استدلال قابلِ قبول نہیں ہو گا۔ استدلال کی بنیاد اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی مرضی ہو گی۔ البتہ اس حکم میں ایک خلا چھوڑا گیا ہے جو ہر زمانے کے حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے پُر ہو گا۔ وہ خلا یہ ہے کہ یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فریقین میں سے کس کی رائے صحیح ہے۔ بہرحال آج کے ریاستی نظام میں یہ خلا ایک آزاد عدلیہ پُر کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جب عرب میں اسلامی ریاست قائم ہوئی تو اس طرح علیحدہ علیحدہ ریاستی ادارے ابھی واضح طور پر وجود میں نہیں آئے تھے اور ان کی الگ الگ شناخت نہیں تھی کہ یہ مقنّنہ (Legislature) ہے‘ یہ عدلیہ (Judiciary) ہے اور یہ انتظامیہ (Executive) ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تو کوئی قاضی تھے ہی نہیں۔ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شعبہ قضاء شروع کیا۔ اس طرح رفتہ رفتہ یہ ریاستی ادارے پروان چڑھے۔ جدید دور میں ان تنازعات کے حل کا ادارہ عدلیہ ہے۔ وہاں ہر شخص جائے اور اپنی دلیل پیش کرے۔ علماء جائیں‘ قانون دان جائیں اور سب جا کر دلائل دیں۔ وہاں سے فیصلہ ہو جائے گا کہ کون سی بات واقعتاً قرآن و سنّت سے متصادم ہے۔

﴿اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ ’’اگر تم واقعتاً اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔‘‘

﴿ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴿۵۹﴾﴾ ’’یہی طریقہ بہتر بھی ہے اور نتائج کے اعتبار سے بھی بہت مفید ہے۔‘‘

آگے پھر منافقین کا تذکرہ شروع ہو رہا ہے۔ یاد رہے کہ میں نے آغاز میں عرض کیا تھا کہ اس سورۂ مبارکہ کا سب سے بڑا حصہ منافقین سے خطاب اور ان کے تذکرے پر مشتمل ہے۔

آیت ۶۰ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ ''کیا تم نے غور نہیں کیا اُن لوگوں کی طرف جن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ایمان لے آئے ہیں اُس پر بھی جو (اے نبی ﷺ!) آپ پر نازل کیا گیا اور اُس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا''

لیکن ان کا طرزِ عمل یہ ہے کہ:

﴿يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ﴾ ''وہ چاہتے یہ ہیں کہ اپنے مقدمات کے فیصلے طاغوت سے کروائیں''

یہاں ''طاغوت'' سے مراد وہ حاکم یا وہ ادارہ ہے جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کے احکام کے مطابق فیصلے نہیں کرتا۔ پچھلی آیت میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا تھا۔ گویا جو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی اطاعت پر کاربند ہو گیا وہ طاغوت سے خارج ہو گیا اور جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کو قبول نہیں کرتا وہ طاغوت ہے' اس لیے کہ وہ اپنی حد سے تجاوز کر گیا۔ چنانچہ غیر مسلم حاکم یا منصف جو اللہ اور اُس کے رسولؐ کے احکام کا پابند نہیں وہ طاغوت ہے۔

﴿وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ﴾ ''حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کا کفر کریں۔''

منافقینِ مدینہ کی عام روش یہ تھی جس مقدمہ میں انہیں اندیشہ ہوتا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہو گا اسے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں لانے کے بجائے یہودی عالموں کے پاس لے جاتے۔ وہ جانتے تھے کہ حضور ﷺ کے پاس جائیں گے تو حق اور انصاف کی بات ہو گی۔ ایک یہودی اور ایک مسلمان جو منافق تھا' ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ یہودی کہنے لگا کہ چلو محمد (ﷺ) کے پاس چلتے ہیں۔ اس لیے کہ اسے یقین تھا کہ میں حق پر ہوں۔ لیکن یہ منافق کہنے لگا کہ کعب بن اشرف کے پاس چلتے ہیں جو ایک یہودی عالم تھا۔ بہر حال وہ یہودی اس منافق کو رسول اللہ ﷺ کے پاس لے آیا۔ آپؐ نے دونوں کے دلائل سننے کے بعد فیصلہ یہودی کے حق میں کر دیا۔ وہاں سے باہر نکلے تو منافق نے کہا کہ چلو اب حضرت عمرؓ کے پاس چلتے ہیں' وہ جو فیصلہ کر دیں وہ مجھے منظور ہو گا۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت عمرؓ کے پاس آ گئے۔ منافق کو یہ امید تھی کہ حضرت عمرؓ میرا زیادہ لحاظ کریں گے' کیونکہ میں مسلمان ہوں۔ لیکن جب یہودی نے یہ بتایا کہ اس مقدمے کا فیصلہ رسول اللہ ﷺ میرے حق میں کر چکے ہیں تو حضرت عمرؓ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' تلوار لی اور اس منافق کی گردن اڑا دی کہ جو محمد رسول اللہ ﷺ کے فیصلے پر راضی نہیں ہے اور اس کے بعد مجھ سے فیصلہ کروانا چاہتا ہے' اُس کے حق میں میرا یہ فیصلہ ہے! اس پر اس منافق کے خاندان والوں نے بڑا واویلا مچایا۔ وہ چیختے چلّاتے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضرت عمرؓ پر قتل کا دعویٰ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مقتول حضرت عمرؓ کے پاس یہودی کو لے کر اس وجہ سے گیا تھا کہ وہ اس معاملہ میں باہم مصالحت کرا دیں' اس کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ کے فیصلے سے انکار نہیں تھا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں جن میں اصل حقیقت ظاہر فرما دی گئی۔

﴿وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّهُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۶۰﴾ ''اور شیطان چاہتا ہے کہ انہیں بہت دور کی گمراہی میں ڈال دے۔''

آیت ۶۱ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور آؤ رسول کی طرف''

اپنے مقدمات کے فیصلے اللہ کے رسول ﷺ سے کراؤ۔

﴿رَاَیْتَ الْمُنٰفِقِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ﴿۶۱﴾﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ دیکھتے ہیں کہ یہ منافق آپ کے پاس آنے سے کنی کتراتے ہیں۔''

صَدَّ یَصُدُّ رُکنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور روکنے کے معنی میں بھی۔

آیت ۶۲ ﴿فَكَیْفَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ﴾ ''پھر اُس وقت کیا ہوا جب ان پر کوئی مصیبت آگئی ان کے اپنے ہاتھوں کے کرتوتوں کی وجہ سے''

﴿ثُمَّ جَآءُوْكَ یَحْلِفُوْنَ ۚ بِاللّٰهِ﴾ ''پھر وہ آپ کے پاس آئے اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے''

وہ چیختے چلّاتے آئے کہ عمر نے ہمارا آدمی مار ڈالا ہے' ہمیں اس کا قصاص دلایا جائے۔

﴿اِنْ اَرَدْنَاۤ اِلَّاۤ اِحْسَانًا وَّتَوْفِیْقًا ﴿۶۲﴾﴾ ''کہ ہم تو صرف بھلائی اور موافقت چاہتے تھے۔''

ہم تو عمرؓ کے پاس محض اس لیے گئے تھے کہ کوئی مصالحت اور راضی نامہ ہو جائے۔

آیت ۶۳ ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ ۚ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اللہ اسے جانتا ہے۔''

﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے چشم پوشی کیجیے''

﴿وَعِظْهُمْ﴾ ''اور ان کو ذرا نصیحت کیجیے''

﴿وَّقُلْ لَّهُمْ فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًۢا بَلِیْغًا ﴿۶۳﴾﴾ ''اور ان سے خود ان کے بارے میں ایسی بات کہیے جو ان کے دلوں میں اُتر جائے۔''

یہ آیات نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بَری قرار دیا کہ اللہ کی طرف سے ان کی براءت آگئی ہے' اور اسی دن سے ان کا لقب ''فاروق'' قرار پایا' یعنی حق و باطل میں فرق کر دینے والا۔

اب ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ اس سورۂ مبارکہ میں منافقت جو زیر بحث آئی ہے وہ تین عنوانات کے تحت ہے۔ منافقوں پر تین چیزیں بہت بھاری تھیں' جن میں سے اوّلین رسول اللہ ﷺ کی اطاعت تھی۔ دراصل نفسیاتی طور پر ایک انسان کے لیے دوسرے انسان کی اطاعت کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ ہم جو رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں تو رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے ایک ادارے (institution) کی حیثیت رکھتے ہیں' رسولؐ شخصاً ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ جبکہ ان منافقین کے سامنے رسول اللہ ﷺ شخصاً موجود تھے۔ وہ دیکھتے تھے کہ ان کے بھی دو ہاتھ ہیں' دو پاؤں ہیں' دو آنکھیں ہیں' لہٰذا بظاہر اپنے جیسے ایک انسان کی اطاعت ان پر بہت شاق تھی۔ جیسا کہ جماعتی زندگی میں بعض لوگوں پر امیر کی اطاعت بہت شاق گزرتی ہے۔ اس لیے کہ امیر کی رائے پر چلنے کے لیے اپنی رائے کو پیچھے ڈالنا پڑتا ہے۔ بہرحال جو صادق الایمان مسلمان تھے انہیں تو یہ یقین تھا کہ یہ محمد بن عبداللہ جنہیں ہم دیکھ رہے ہیں' حقیقت میں محمد رسول اللہ ﷺ ہیں اور ہم ان کی اسی حیثیت میں ان پر ایمان لائے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے دلوں میں یہ یقین نہیں تھا یا کمزور تھا ان کے لیے حضور ﷺ کی شخصی اطاعت بڑی بھاری اور بڑی کٹھن تھی۔ اسی لیے بعض مواقع پر منافقین حضور ﷺ پر اعتراض کرتے کہ آپؐ جو کچھ کہہ رہے ہیں اپنے پاس سے کہہ رہے ہیں۔ کیوں نہیں کوئی سورت نازل ہو جاتی؟ کیوں

نہیں کوئی آیت نازل ہو جاتی؟ اور سورۂ محمدؐ اسی انداز میں نازل ہوئی ہے۔ انہوں نے جب حضور ﷺ کے اِقدامِ جہاد کے بارے میں کہا کہ محمد ﷺ نے خود اپنی طرف سے اقدام کر دیا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ محمد میں قتال کی آیات نازل کر دی گئیں۔ دوسری چیز جو اُن پر کٹھن تھی وہ تھا قتال' یعنی اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلنا۔ اس معاملے میں ان کا حال بقول غالبؔ یہ تھا کہ ع ''مرحلہ سخت ہے اور جان عزیز!'' تیسری کٹھن چیز ہجرت تھی۔ اس کا اطلاق منافقینِ مدینہ پر نہیں ہوتا تھا بلکہ مکّہ اور اردگرد کے جو منافق تھے ان پر ہوتا تھا۔ ان کا ذکر بھی آگے آئے گا۔ ظاہر ہے گھر بار اور خاندان والوں کو چھوڑ کر نکل جانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔

اب اس پس منظر میں سب سے پہلے اطاعتِ رسولؐ کی اہمیت بیان کی جا رہی ہے:

آیت ۶۴ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''ہم نے نہیں بھیجا کسی رسول کو مگر اس لیے کہ اُس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔''

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ﴾ ''اور اگر وہ' جبکہ انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا' آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتے''

﴿فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ﴾ ''اور اللہ سے استغفار کرتے اور رسول بھی اُن کے لیے استغفار کرتے''

﴿لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝۶۴﴾ ''تو وہ یقیناً اللہ کو بڑا توبہ قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا پاتے۔''

آیت ۶۵ ﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ ''پس نہیں' آپ کے رب کی قسم! یہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ آپ کو حَکم نہ مانیں اُن تمام معاملات میں جو ان کے مابین پیدا ہو جائیں''

یعنی اس معاملے میں انہیں کوئی اختیار (choice) حاصل نہیں ہے۔ ان کے مابین جو بھی نزاعات اور اختلافات ہوں ان میں اگر یہ آپ کو حَکم نہیں مانتے تو آپ کے رب کی قسم یہ مؤمن نہیں ہیں۔ کلامِ الٰہی کا دوٹوک اور پُرجلال انداز ملاحظہ کیجیے۔

﴿ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ﴾ ''پھر جو کچھ آپ فیصلہ کر دیں اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں''

اگر آپؐ کا فیصلہ قبول بھی کر لیا' لیکن دل کی تنگی اور کدورت کے ساتھ کیا تب بھی یہ مؤمن نہیں ہیں۔

﴿وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝۶۵﴾ ''اور سرِ تسلیم خم کریں' جیسے کہ سرِ تسلیم خم کرنے کا حق ہے۔''

واضح رہے کہ یہ حکم صرف رسول اللہ ﷺ کی زندگی تک محدود نہیں تھا' بلکہ یہ قیامت تک کے لیے ہے۔

آیت ۶۶ ﴿وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ ''اور اگر ہم نے ان پر یہ فرض کر دیا ہوتا کہ قتل کرو اپنے آپ کو'

﴿اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ﴾ ''یا نکلو اپنے گھروں سے''

﴿مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ ؕ﴾ ''تو یہ اس کی تعمیل نہ کرتے سوائے ان میں سے چند ایک کے۔''

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ﴾ ''اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی ان کو نصیحت کی جا رہی ہے''

اس کا ترجمہ اس طرح بھی کیا گیا ہے: ''اور اگر یہ لوگ وہ کرتے جس کی انہیں ہدایت کی جاتی'' یعنی اپنے آپ کو قتل کرنا اور اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہونا۔

﴿لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ﴾ ''تو یہی ان کے لیے بہتر ہوتا اور انہیں دین پر ثابت قدم رکھنے والا ہوتا۔''

آیت ﴿وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّاۤ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ ''اور اس صورت میں ہم انہیں اپنے پاس سے بہت بڑا اجر دیتے۔''

آیت ﴿وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴾ ''اور انہیں ہدایت فرما دیتے سیدھی راہ کی طرف۔''

اکثر مفسرین نے اس آیت کے الفاظ کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کیا ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ حکم دے کہ اپنے آپ کو قتل کرو، خودکشی کرو، تو ہمیں یہ کرنا ہوگا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ حکم دے کہ اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو نکلنا ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارا خالق و مالک ہے اور اُس کی طرف سے دیا گیا ہر حکم ہمارے لیے واجب التعمیل ہے۔ البتہ یہاں ﴿اَنِ اقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ کے الفاظ میں ایک مزید اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۵۴) میں ہم تاریخ بنی اسرائیل کے حوالے سے پڑھ آئے ہیں کہ بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کی تھی ان کو مرتد ہونے کی جو سزا دی گئی تھی اس کے لیے یہی الفاظ آئے تھے: ﴿فَاقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ﴾ ''پس قتل کرو اپنے آپ کو''۔ اس سے مراد یہ تھی کہ تم اپنے اپنے قبیلے کے ان لوگوں کو قتل کر دو جنہوں نے اس کفر و شرک کا ارتکاب کیا ہے۔ اب ادھر منافقین کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی حمایت میں اکثر و بیشتر ان کے خاندان والے، رشتہ دار، ان کے گھرانے والے سب ان کے ساتھ شامل ہو جاتے تھے۔ تو یہاں شاید یہ بتایا جا رہا ہے کہ بجائے اس کے کہ تم ان کی حمایت کرو، تمہارا طرزِ عمل اس کے برعکس ہونا چاہیے کہ تم اپنے اندر سے خود دیکھو کہ کون منافق ہیں جو اصل میں آستین کے سانپ ہیں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ حکم نہیں دیا، مگر وہ یہ حکم بھی دے سکتا تھا کہ ہر گھرانہ اپنے ہاں کے منافقین کو خود قتل کرے۔ یہ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی غیرتِ ایمانی کی وجہ سے اس منافق کو قتل کیا تھا، جبکہ اُس منافق کے خاندان کے لوگ حضرت عمرؓ پر قتل کا دعویٰ کر رہے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا تو یہ بھی تمہیں کرنا چاہیے تھا، لیکن یہ اللہ کے علم میں ہے کہ تم میں سے بہت کم لوگ ہوتے جو اس حکم کی تعمیل کرتے۔ اور اگر وہ یہ کر گزرتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا اور ان کے ثباتِ قلبی اور ثباتِ ایمانی کا باعث ہوتا۔ اس صورت میں اللہ تعالیٰ انہیں خاص اپنے پاس سے اجرِ عظیم عطا فرماتا اور انہیں صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرماتا۔

اب جو آیت آ رہی ہے یہ اطاعتِ رسول کے موضوع پر قرآن حکیم کی عظیم ترین آیت ہے۔ فرمایا:

آیت ﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ ''اور جو کوئی اطاعت کرے گا اللہ کی اور رسولؐ کی تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہیں معیت حاصل ہوگی اُن کی جن پر اللہ کا انعام ہوا''

﴿مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ ﴾ ''یعنی انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین۔''

﴿وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾ ''اور کیا ہی اچھے ہیں یہ لوگ رفاقت کے لیے۔''

یعنی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت کرنے والوں کا شمار ان لوگوں کے زمرے میں ہوگا جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ اس حوالے سے سورۃ الفاتحہ کے یہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیں: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ﴾۔ گویا آیت زیر مطالعہ ''اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ'' کی تفسیر ہے۔ آیت میں مذکور مراتب کے بارے میں یہ وضاحت مدِنظر رکھیے کہ صالح مسلمان گویا baseline پر ہے۔ وہ ایک نیک نیت مسلمان ہے جس کے دل میں خلوص کے ساتھ ایمان ہے۔ وہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل کر رہا ہے، محرّمات سے بچا ہوا ہے۔ وہ اس سے اوپر اٹھے گا تو اس سے آگے شہداء کا درجہ ہے، اس سے بلند تر درجہ صدیقین کا ہے اور بلند ترین درجہ انبیاء کا ہے۔ اس بلند ترین درجے پر تو کوئی نہیں پہنچ سکتا، اس لیے کہ وہ کوئی کسبی چیز نہیں

ہے‘ وہ تو ایک وہبی چیز تھی‘ جس کا دروازہ بھی اب بند ہو چکا ہے۔ البتہ مرتبہ صالحیت سے بلند تر دو درجے اب بھی موجود ہیں کہ انسان اپنی ہمت‘ محنت اور کوشش سے شہادت اور صِدّیقیت کے مراتب پر فائز ہو سکتا ہے۔ یہ مضمون ان شاء اللہ سورۃ الحدید میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان ہوگا۔

آیت ۷۰ ﴿ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ﴾ ’’یہ فضل ہے اللہ کی طرف سے۔‘‘

یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہے اُن پر کہ جنہیں آخرت میں انبیاء کرام‘ صِدّیقینِ عِظام‘ شہداء اور صالحین کی معیت حاصل ہو جائے۔ اس کے لیے دُعا کرنی چاہیے: وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ اے اللہ! ہمیں موت دیجیو اپنے وفادار و نیکوکار بندوں کے ساتھ!

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝۷۰﴾ ’’اور اللہ کافی ہے ہر شے کے جاننے کے لیے۔‘‘

یعنی کون کس استعداد کا حامل ہے اور کس قدر و منزلت کا مستحق ہے‘ اللہ خوب جانتا ہے۔ حقیقت جاننے کے لیے بس اللہ ہی کا علم کافی ہے۔

آیات ۷۱ تا ۷۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝۷۱ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝۷۲ وَلَىِٕنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝۷۳ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۷۴ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۙ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝۷۵ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝۷۶ غ

اب ذکر آ رہا ہے قتال فی سبیل اللہ کا۔ یہ دوسری چیز تھی جو منافقین پر بہت بھاری تھی۔ مادی اعتبار سے یہ بڑا سخت امتحان تھا۔ اطاعتِ رسولؐ زیادہ تر ایک نفسیاتی مرحلہ تھا‘ ایک نفسیاتی الجھن تھی‘ لیکن اپنا مال خرچ کرنا اور اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا ایک خالص محسوس مادی شے تھی۔

آیت ۷۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ﴾ ’’اے اہلِ ایمان‘ اپنے تحفظ کا سامان (اور اپنے ہتھیار) سنبھالو‘‘

﴿فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا ۝۷۱﴾ ’’اور (جہاد کے لیے) نکلو‘ خواہ ٹکڑیوں کی صورت میں خواہ فوج کی شکل میں۔‘‘

یعنی جیسا موقع ہو اس کے مطابق الگ الگ دستوں کی شکل میں یا اکٹھے فوج کی صورت میں نکلو۔ رسول اللہ ﷺ موقع کی مناسبت سے کبھی چھوٹے چھوٹے گروپ بھیجتے تھے۔ جیسے غزوۂ بدر سے قبل آپؐ نے آٹھ مہمیں روانہ فرمائیں‘ جبکہ غزوۂ بدر اور غزوۂ

اُحد میں آپؐ پوری فوج لے کر نکلے۔ تو ان میں سے جو شکل بھی ہو نکلو اللہ کی راہ میں!

آیت ۷۲ ﴿وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ﴾ ''اور تم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو دیر لگا دیتے ہیں۔''

حکم ہو گیا ہے کہ جہاد کے لیے نکلنا ہے' فلاں وقت کوچ ہو گا' لیکن وہ تیاری میں ڈھیل برت رہے ہیں اور پھر بہانہ بنا دیں گے کہ بس ہم تو تیاری کر ہی رہے تھے۔ اور وہ منتظر رہتے ہیں کہ جنگ کا فیصلہ ہو جائے تو اُس وقت ہم کہیں گے کہ ہم تو بس نکلنے ہی والے تھے کہ یہ فیصلہ ہم کو پہنچ گیا۔

﴿فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ﴾ ''پھر اگر تمہیں کوئی مصیبت پیش آ جائے''

اگر جنگ کے لیے نکلنے والے مسلمانوں کو کوئی تکلیف پیش آ جائے' کوئی گزند پہنچ جائے' وقتی طور پر کوئی ہزیمت ہو جائے۔

﴿قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ۝۷۲﴾ ''تو وہ کہے گا کہ مجھ پر تو اللہ نے بڑا انعام کیا کہ میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوا۔''

مجھ پر اللہ کا بڑا فضل و کرم ہوا کہ میں پیچھے رہ گیا اور اس معرکے میں جانے سے بچ گیا۔ میری فلاں جو ضرورت تھی وہ میرے لیے رحمت بن گئی۔ اُس وقت میرا جو اونٹ گم ہوا تھا اگر کہیں میرے پاس موجود ہوتا تو میں بھی ان کے ساتھ مصیبت میں گرفتار ہوتا۔

آیت ۷۳ ﴿وَلَئِنْ اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''اور اگر تمہیں کوئی فضل پہنچ جائے اللہ کی طرف سے''

یعنی تمہیں فتح ہو جائے اور تم کامرانی کے ساتھ مالِ غنیمت لے کر واپس آؤ۔

﴿لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ﴾ ''تو اُس وقت وہ (حسرت کے ساتھ) کہے گا' جیسے تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی تعلق تھا ہی نہیں''

﴿يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝۷۳﴾ ''اے کاش کہ میں بھی ان کے ساتھ گیا ہوتا تو یہ بڑی کامیابی مجھے بھی حاصل ہو جاتی۔''

یہ منافقین کا کردار تھا جس کا یہاں نقشہ کھینچ دیا گیا ہے۔

آیت ۷۴ ﴿فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ﴾ ''پس اللہ کی راہ میں قتال کرنا چاہیے ان لوگوں کو جو دنیا کی زندگی کو آخرت کے عوض فروخت کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

جو لوگ دنیا کی زندگی کے بدلے میں آخرت کے طالب ہیں' ان کے لیے تو قتال فی سبیل اللہ میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے۔ اگر انہوں نے واقعی اللہ تعالیٰ سے یہ سودا کر لیا ہے تو پھر انہیں اللہ کی راہ میں جنگ کے لیے نکلنا چاہیے۔

﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ﴾ ''اور جو کوئی بھی اللہ کی راہ میں قتال کرے گا' تو خواہ مارا جائے یا غالب ہو''

اللہ کی راہ میں قتال کرنے والے کے لیے دو ہی امکانات ہیں' ایک یہ کہ وہ قتل ہو کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہو جائے اور دوسرے یہ کہ وہ دشمن پر غالب رہے اور فتح مند ہو کر واپس آئے۔

﴿فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝۷۴﴾ ''ہم اسے (دونوں حالتوں میں) بہت بڑا اجر عطا فرمائیں گے۔''

اگلی آیت میں خاص طور پر ان مسلمانوں کی نصرت وحمایت کے لیے قتال کی ترغیب دلائی جارہی ہے جو اُس وقت مختلف علاقوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان میں کمزور بھی تھے' بیمار اور بوڑھے بھی تھے' خواتین اور بچے بھی تھے۔ یہ لوگ ایمان تو لے آئے تھے لیکن ہجرت کرنے سے معذور تھے۔ یہ اپنے اپنے علاقوں میں اور اپنے اپنے قبائل میں پھنسے ہوئے تھے جہاں ان پر ظلم ہو رہا تھا اور انہیں تشدد وتعذیب کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ تو خاص طور پر ان کی مدد کے لیے نکلنا' ان کی جان چھڑانا اور ان کو بچا کر لے آنا' یہ غیرتِ ایمانی کا بہت ہی شدید تقاضا تھا' بلکہ یہ غیرتِ انسانی کا بھی تقاضا تھا۔ چنانچہ فرمایا:

آیت ۷۵ ﴿وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ ''اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم قتال نہیں کرتے اللہ کی راہ میں''

﴿وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ﴾ ''اور ان بے بس مَردوں' عورتوں اور بچوں کی خاطر جو مغلوب بنا دیے گئے ہیں''

﴿الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ﴾ ''جو دُعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار' ہمیں نکال اِس بستی سے جس کے رہنے والے لوگ ظالم ہیں۔''

﴿وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿۷۵﴾﴾ ''اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی بنا دے' اور ہمارے لیے خاص اپنے فضل سے کوئی مددگار بھیج دے۔''

ان کی یہ آہ وبکا تمہیں آمادۂ پیکار کیوں نہیں کر رہی؟ ان پر ظلم ہو رہا ہے' ان پر ستم ڈھائے جا رہے ہیں اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم اپنے گھروں سے نکلنے کو تیار نہیں ہو۔ بعض لوگ اس آیت کا انطباق ان مختلف قسم کے سیاسی تنازعات پر بھی کر دیتے ہیں جو آج کل ہمارے ہاں مختلف صورتوں میں جاری ہیں اور اس طرح وہ ان محاذ آرائیوں پر ''جہاد فی سبیل اللہ'' کا لیبل لگا دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات بالکل ہی قیاس مع الفارق ہے۔ واضح رہے کہ یہ خطاب اُن اہلِ ایمان سے ہو رہا ہے جن کے ہاں اسلام قائم ہو چکا تھا۔ اس کے برعکس ہماری حالت یہ ہے کہ ہم اپنے ملک میں تو اسلام قائم کر نہیں سکتے' یہاں پر دین کے غلبہ واقامت کی کوئی جدّوجُہد بھی ہم نہیں کر رہے اور ہمارے ہاں کفر کا جو نظام چل رہا ہے اس کو ختم کرنے کے لیے ہم کوشش بھی نہیں کر رہے۔ چنانچہ ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ پہلے ہم اپنے گھر کو درست کریں' پہلے اپنے ملک کے اندر اسلام قائم کریں۔ جہاد کرنا ہے تو یہاں کریں' جانیں دینی ہیں تو یہاں دیں۔ یہاں پر طاغوت کی حکومت ہے' غیر اللہ کی حکومت ہے' قرآن کے سوا کوئی اور قانون چل رہا ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ ... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ ... فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾﴾ (المائدۃ) ''اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں..... وہی تو ظالم ہیں..... وہی تو فاسق ہیں''۔ چنانچہ اس سیاق وسباق میں کافر' ظالم اور فاسق تو ہم خود ہیں۔ ہمیں پہلے اپنے گھر کی حالت درست کرنا ہوگی' اس کے بعد جہاد کے لیے ایک جمعیت قائم کرنا ہوگی۔ ہماری حکومت تو ان لوگوں سے دوستیاں کرتی پھرتی ہے جن کے خلاف یہاں جہاد کا نعرہ بلند ہو رہا ہے' تو اس آیت کا حکم اپنی جگہ ایک حقیقت ہے' لیکن ہر چیز کو اس کے سیاق وسباق کے اندر رکھنا چاہیے۔

آیت ۷۶ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''جو لوگ ایمان والے ہیں وہ قتال کرتے ہیں اللہ کی راہ میں۔''

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ﴾ ''اور جو لوگ کافر ہیں وہ طاغوت کی راہ میں قتال کر رہے ہیں''

جنگ تو کفار و مشرکین بھی کر رہے ہیں' جانیں تو وہ بھی دے رہے ہیں۔ ابوجہل بھی تو لشکر لے کر آیا تھا۔ لیکن ان کی ساری جدوجہد طاغوت کی راہ میں ہے۔

﴿فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ ۚ﴾ ''تو تم جنگ کرو شیطان کے ساتھیوں سے۔''

تم شیطان کے حمایتیوں سے' حزب الشیطان سے قتال کرو۔

﴿اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۝۷۶﴾ ''یقیناً شیطان کی چال بڑی کمزور ہے۔''

شیطان کی چال بظاہر بڑی زوردار اور بارعب دکھائی دیتی ہے' لیکن جب مردِ مؤمن اس کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے تو پھر معلوم ہوتا ہے کہ اس کی چال بڑی بودی اور پھُسپھُسی ہے۔

آیات ۷۷ تا ۸۷

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝۷۷ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۝۷۸ مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۠ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۭ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۷۹ مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝۸۰ وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَاۗىِٕفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ۭ وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَي اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝۸۱ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۭ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝۸۲ وَاِذَا جَاۗءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ۭ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ۭ وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۳ فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝۸۴ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝۸۵ وَاِذَا حُيِّيْتُمْ

بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَسِيْبًا ۝ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ۝ ع ۱۱ ۸

آیت ۷۷ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ﴾ ''تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو؟''

مکہ مکرمہ میں بارہ برس تک مسلمانوں کو یہی حکم تھا کہ اپنے ہاتھ بندھے رکھو۔ اس دور میں مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے' انہیں بہت بُری طرح ستایا جا رہا تھا' تشدد وتعذیب کی نئی تاریخ رقم کی جا رہی تھی۔ اس پر مسلمانوں کا خون کھولتا تھا اور بہت سے مسلمان یہ چاہتے تھے کہ انہیں اجازت دی جائے تو وہ اپنے بھائیوں پر ہونے والے ظلم وستم کا بدلہ لیں' کہ آخر وہ بے غیرت اور بزدل تو نہیں ہیں۔ لیکن اُس وقت انہیں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ منہجِ انقلابِ نبویؐ کا ''صبرِ محض'' کا مرحلہ تھا۔ اُس وقت ان کے لیے حکم یہ تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو۔ ؎

نالہ ہے بلبلِ شوریدہ ترا خام ابھی
اپنے سینے میں اسے اور ذرا تھام ابھی!

ایک وقت آئے گا کہ تمہارے ہاتھ کھول دیے جائیں گے۔

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ﴾ میں ''قِيْلَ'' فعل مجہول ہے۔ یہ کہا کس نے تھا؟ مکی قرآن میں تو ''كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ'' کا حکم موجود نہیں ہے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ حکم تھا جناب محمد رسول اللہ ﷺ کا۔ حضور ﷺ نے اہلِ ایمان کو ہاتھ اٹھانے سے روکا تھا اور اس کے بارے میں بتایا جا رہا ہے سورۃ النساء کی اس آیت میں جو مدنی ہے۔ گویا رسول اللہ ﷺ کے حکم کو یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنا حکم قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وحی جلی (قرآن) کے علاوہ نبی اکرم ﷺ پر وحی خفی بھی نازل ہوتی تھی۔ تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مکی دور میں وحی خفی کے ذریعے رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا ہو جو یہاں نقل ہوا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ حضور ﷺ کا اپنا اجتہاد ہو جسے اللہ تعالیٰ نے برقرار رکھا ہو' اور قبول (own) کیا ہو۔

اب یہ بات یہاں محذوف ہے کہ اُس وقت تو کچھ لوگ بڑے جوش وجذبہ سے اور بڑے زور شور سے کہتے تھے کہ ہمیں اجازت ہونی چاہیے کہ ہم جنگ کریں' لیکن اب کیا حال ہوا:

﴿فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ﴾ ''تو جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک فریق کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اس طرح ڈر رہے ہیں جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے' بلکہ اس سے بھی زیادہ ڈر رہے ہیں۔''

ظاہر بات ہے کہ یہ مکہ کے مہاجرین نہیں تھے' بلکہ یہ حال منافقینِ مدینہ کا تھا' لیکن فرق وتفاوت واضح کرنے کے لیے مکی دور کی کیفیت سے تقابل کیا گیا کہ اصل ایمان تو وہ تھا' اور یہ جو صورت حال ہے یہ کمزوریٔ ایمان اور نفاق کی علامت ہے۔

﴿وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں پروردگار! تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی؟''

﴿لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ﴾ ''کیوں نہ ابھی ہمیں کچھ اور مہلت دی؟''

اس حکم کو کچھ دیر کے لیے مزید مؤخر کیوں نہ کیا؟

﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے دنیا کا ساز و سامان بہت تھوڑا ہے۔''

﴿وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ﴾ ''اور آخرت بہت بہتر ہے اُس کے لیے جو تقویٰ کی روش اختیار کرے۔''

﴿وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۷﴾﴾ ''اور تم پر ایک دھاگے کے برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔''

تمہاری حق تلفی قطعاً نہیں ہوگی اور تمہارے جو بھی اعمال ہیں' انفاق ہے' قتال ہے' اللہ کی راہ میں ایثار ہے' اس کا تمہیں بھرپور اجر و ثواب دے دیا جائے گا۔

آیت ۷۸ ﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ﴾ ''تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تم کو پالے گی''

ظاہر ہے قتال سے جی چرانے کا اصل سبب موت کا خوف تھا۔ چنانچہ ان کے دلوں کے اندر جو خوف تھا اسے ظاہر کیا جا رہا ہے۔ ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ موت سے کوئی مفر نہیں' تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تمہیں پالے گی۔

﴿وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ﴾ ''خواہ تم بڑے مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔''

اگرچہ تم بہت مضبوط (fortified) قلعوں کے اندر اپنے آپ کو محصور کر لو پھر بھی موت سے نہیں بچ سکتے۔

﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اور اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے۔''

منافقین کا ایک طرزِ عمل یہ بھی تھا کہ اگر مسلمانوں کو کوئی کامیابی حاصل ہو جاتی' فتح نصیب ہو جاتی' کوئی اور بھلائی پہنچ جاتی' حضور ﷺ کی تدبیر کے اچھے نتائج نکل آتے تو اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرتے تھے' بلکہ کہتے تھے کہ یہ اللہ کا فضل و کرم ہوا ہے' یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔

﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ﴾ ''اور اگر انہیں کوئی تکلیف پہنچ جائے تو کہتے ہیں کہ (اے محمد ﷺ) یہ آپ کی وجہ سے ہے۔''

آپؐ نے یہ غلط اقدام کیا تو اس کے نتیجے میں ہم پر یہ مصیبت آ گئی۔ یہ آپ کا فیصلہ تھا کہ کھلے میدان میں جا کر جنگ کریں گے' ہم نے تو آپ کو مشورہ دیا تھا کہ مدینے کے اندر محصور ہو کر جنگ کریں۔

﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''کہہ دیجیے سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔''

یہ سب چیزیں' خیر ہو' شر ہو' تکلیف ہو' آسانی ہو' مشکل ہو' سب اللہ کی طرف سے ہیں۔

﴿فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ﴿۷۸﴾﴾ ''تو ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ یہ کوئی بات بھی نہیں سمجھتے!''

آیت ۷۹ ﴿مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۘ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ؕ﴾ ''(اے مسلمان!) تجھے جو بھلائی بھی پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے پہنچتی ہے' اور جو مصیبت تجھ پر آتی ہے وہ خود تیرے نفس کی طرف سے ہے۔''

ان آیات کے بارے میں مفسرین نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں۔ میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ یہاں تحویلِ خطاب ہے۔ پہلی آیت میں خطاب ان مسلمانوں سے ہے جن کی طرف سے کمزوری یا نفاق کا اظہار ہو رہا تھا' لیکن اس آیت میں بحیثیتِ

مجموعی خطاب ہے کہ دیکھو اے مسلمانو! جو بھی کوئی خیر تمہیں ملتا ہے اس پر تمہیں یہی کہنا چاہیے کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر کوئی شر پہنچ جائے تو اسے اپنے کسب و عمل کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ اگرچہ ہمارا ایمان ہے کہ خیر بھی اللہ کی طرف سے ہے اور شر بھی۔ ''ایمان مفصل'' میں الفاظ آتے ہیں: ''وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى'' یعنی میں تقدیر پر بھی ایمان لایا کہ اس کی اچھائی اور برائی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ لیکن ایک مسلمان کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ خیر ملے تو اسے اللہ کا فضل سمجھے اور اگر کوئی خرابی ہو جائے تو سمجھے کہ یہ میری کسی غلطی کے سبب ہوئی ہے' مجھ سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے' جس پر اللہ تعالیٰ نے کوئی تادیب فرمانی چاہی ہے۔

﴿وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ؕ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کو تو لوگوں کے لیے رسول بنا کر بھیجا ہے۔''

اس مقام کے بارے میں ایک قول یہ بھی ہے کہ درمیانی ٹکڑے میں بھی خطاب تو رسول اللہ ﷺ ہی سے ہے' لیکن استعجاب کے انداز میں کہ اچھا! جو کچھ انہیں خیر مل جائے وہ تو اللہ کی طرف سے ہے اور جو کوئی برائی آ جائے تو وہ آپ کی طرف سے ہے! یعنی یہ کیا بات کہہ رہے ہیں! جبکہ اللہ نے تو آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ اس کی یہ دو تعبیریں ہیں۔ میرے نزدیک پہلی تعبیر راجح ہے۔

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۷۹﴾ ''اور اللہ تعالیٰ کافی ہے گواہ کے طور پر۔''

آیت ۸۰ ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ ''جس نے اطاعت کی رسول کی اُس نے اطاعت کی اللہ کی۔''

یہ الفاظ بہت اہم ہیں۔ اس لیے کہ یہ الفاظ دوٹوک انداز میں واضح کر رہے ہیں کہ رسولؐ کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔ اس کی مزید وضاحت کے لیے یہ حدیث ملاحظہ کیجیے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ اَطَاعَنِيْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ، وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ ، وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِيْ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ ، وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِيْ فَقَدْ عَصَانِيْ)) (۲)

''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی' اور جس نے میری نافرمانی کی اُس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے (مقرر کردہ) امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی' اور جس نے میرے (مقرر کردہ) امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔''

رسول اللہ ﷺ کی ساری جدّوجہد جماعتی نظم کے تحت ہو رہی تھی۔ جہاد و قتال کے لیے فوج تیار ہوتی تو اس میں اوپر سے نیچے تک سمع و طاعت کی ایک زنجیر بنتی چلی جاتی۔ رسول اللہ ﷺ کمانڈر انچیف تھے' آپؐ لشکر کے میمنہ' میسرہ' قلب اور عقب وغیرہ پر' نیز ہراول دستے پر الگ الگ کمانڈر مقرر فرماتے۔ ان امراء کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اُس نے میری اطاعت کی' اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اُس نے میری نافرمانی کی۔

﴿وَمَنْ تَوَلّٰى فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۝۸۰﴾ ''اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے آپ کو ان پر نگران بنا کر نہیں بھیجا ہے۔''

اے نبی ﷺ! ہم نے آپ کو ان پر داروغہ مقرر نہیں کیا۔ اپنے طرزِ عمل کے یہ خود ذمہ دار اور جواب دہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر یہ اُس کے محاسبے کا خود سامنا کر لیں گے۔

۲۔ صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب قول اللہ تعالٰی واطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب اطاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ وتحریمھا فی المعصیۃ۔

آیت ۸۱ ﴿وَيَقُوْلُوْنَ طَاعَةٌ ۡ﴾ ''اور کہتے ہیں کہ سرِ تسلیم خم ہے''

ان منافقوں کا حال یہ ہے کہ آپ کے سامنے تو کہتے ہیں کہ ہم مطیع فرمان ہیں' آپؐ نے جو فرمایا قبول ہے' ہم اس پر عمل کریں گے۔

﴿فَاِذَا بَرَزُوْا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ غَيْرَ الَّذِيْ تَقُوْلُ ؕ﴾ ''پھر جب آپ کے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان میں سے ایک گروہ راتوں کو ایسے مشورے کرتا ہے جو اُن کے اپنے قول کے خلاف ہے۔''

یہ منافقین آپؐ کے سامنے اطاعت کا اقرار کرتے ہیں' لیکن آپؐ کی مجلس میں جو باتیں ظاہر کرتے ہیں راتوں کو آپس میں ان کے برعکس باتیں کرتے ہیں اور ریشہ دوانیاں اور سازشیں شروع کر دیتے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُوْنَ ۚ﴾ ''اور اللہ لکھ رہا ہے جو بھی وہ راتوں کو مشورے کرتے ہیں۔''

﴿فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ﴾ ''تو (اے نبی ﷺ!) آپ ان سے چشم پوشی کیجیے''

آپ ان کی پروا نہ کیجیے' یہ آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکیں گے۔ ابھی ان کے خلاف اقدام کرنا خلافِ مصلحت ہے۔ جیسے ایک دور میں فرمایا گیا: ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ (البقرۃ:۱۰۹) یعنی ان یہودیوں کو ذرا نظر انداز کیجیے' ابھی ان کی شرارتوں پر نکیر نہ کیجیے' جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجیے' اس لیے کہ مصلحت کا تقاضا ہے کہ ابھی یہ محاذ نہ کھولا جائے۔ اسی طرح یہاں منافقین کے بارے میں کہا گیا کہ ابھی ان سے اعراض کیجیے۔ چنانچہ ان کی ریشہ دوانیوں سے کچھ عرصے تک چشم پوشی کی گئی اور پھر غزوۂ تبوک کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان پر گرفت شروع کی۔ پھر وہ وقت آ گیا کہ اب تک ان کی شرارتوں پر جو پردے پڑے رہے تھے وہ پردے اٹھا دیے گئے۔

﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور آپ اللہ پر توکل کیجیے۔''

﴿وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۸۱﴾﴾ ''اور اللہ کافی ہے بھروسے کے لیے۔''

آپؐ کو سہارے کے لیے اللہ کافی ہے۔ ان کی ساری ریشہ دوانیاں' یہ مشورے' یہ سازشیں' سب پادر ہوا ہو جائیں گی' آپ فکر نہ کیجیے۔

آیت ۸۲ ﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴾ ''کیا یہ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟''

یہ قرآن پڑھتے بھی ہیں اور سنتے بھی ہیں' لیکن اس پر غور و فکر نہیں کرتے۔ نمازیں تو وہ پڑھتے تھے۔ اُس وقت جو بھی منافق تھا اسے نماز تو پڑھنی پڑتی تھی' ورنہ اس کو مسلمان نہ مانا جاتا۔ آج تو مسلمان مانے جانے کے لیے نماز ضروری نہیں ہے' اُس وقت ضروری تھی۔ بلکہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی تو پہلی صف میں ہوتا تھا اور جمعہ کے روز تو خاص طور پر خطبے سے پہلے کھڑے ہو کر اعلان کرتا تھا کہ لوگو ان کی بات توجہ سے سنو' یہ اللہ کے رسول ہیں۔ گویا اپنی چودھراہٹ کے اظہار کے لیے یہ انداز اختیار کرتا۔ تو وہ نمازیں پڑھتے تھے' قرآن سنتے تھے' لیکن قرآن پر تدبر نہیں کرتے تھے۔ قرآن ان کے سروں کے اوپر سے گزر رہا تھا یا ان کے ایک کان سے داخل ہو کر دوسرے کان سے نکل جاتا تھا۔

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾﴾ ''اور اگر یہ اللہ کے سوائے کسی اور کے پاس سے آیا ہوتا تو اس میں وہ بہت سے تضادات پاتے۔''

اس پر غور کرو' یہ بہت مربوط کلام ہے۔ اس کا پورا فلسفہ منطقی طور پر بہت مربوط ہے' اس کے اندر کہیں کوئی تضاد نہیں ہے۔

آیت ۸۳ ﴿وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ﴾ ''اور جب ان کے پاس کوئی خبر پہنچتی ہے امن کی یا خطرے کی تو وہ اسے پھیلا دیتے ہیں۔''

منافقین کی ایک روش یہ بھی تھی کہ جوں ہی کوئی اطمینان بخش یا خطرناک خبر سن پاتے اُسے لے کر پھیلا دیتے۔ کہیں سے خبر آ گئی کہ فلاں قبیلہ چڑھائی کرنے کی تیاری کر رہا ہے' اس کی طرف سے حملے کا اندیشہ ہے تو وہ فوراً اسے عام کر دیتے' تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس پیدا ہو جائے۔ ''اِذَاعَۃ'' کا لفظ آج کل نشریاتی (broadcasting) اداروں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور ''مِذْیَاع'' ریڈیو سیٹ کو کہا جاتا ہے۔

﴿وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي الْاَمْرِ مِنْهُمْ﴾ ''اور اگر وہ اس کو رسولؐ اور اپنے اولوالامر کے سامنے پیش کرتے''

﴿لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ﴾ ''تو یہ بات ان میں سے ان لوگوں کے علم میں آ جاتی جو بات کی تہہ تک پہنچنے والے ہیں۔''

اگر یہ لوگ ایسی خبروں کو رسول اللہ ﷺ تک یا ذمہ دار اصحاب تک پہنچاتے تو وہ ان کی درست انداز میں تحقیق کر کے بہتر فیصلہ کرتے۔ لیکن ان کی روش یہ تھی کہ محض سنسنی پھیلانے اور سراسیمگی پیدا کرنے کے لیے ایسی خبریں لوگوں میں عام کر دیتے۔

﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ﴾ ''اور اگر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت تمہارے شاملِ حال نہ ہوتی''

﴿لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۳﴾﴾ ''تو تم سب کے سب شیطان کی پیروی کرتے' سوائے چند ایک کے۔''

آیت ۸۴ ﴿فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ﴾ ''پس (اے نبی ﷺ!) آپ جنگ کریں اللہ کی راہ میں!''

قتال کے ضمن میں یہ قرآن مجید کی غالباً سخت ترین آیت ہے' لیکن اس میں سختی لفظی نہیں' معنوی ہے۔

﴿لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ﴾ ''آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے سوائے اپنی ذات کے''

﴿وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ﴾ ''البتہ اہلِ ایمان کو آپ اس کے لیے اُکسائیں۔''

آپ اہلِ ایمان کو قتال فی سبیل اللہ کے لیے جس قدر ترغیب و تشویق دے سکتے ہیں' دیجیے۔ انہیں اس کے لیے جوش دلائیے' اُبھاریے۔ لیکن اگر کوئی اور نہیں نکلتا تو اکیلے نکلئے۔ جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا قول بھی نقل ہوا ہے' جب ان سے کہا گیا کہ مانعینِ زکوٰۃ کے بارے میں نرمی کیجیے تو آپؓ نے فرمایا تھا کہ اگر کوئی میرا ساتھ نہیں دے گا تو میں اکیلا جاؤں گا۔ عزیمت کا یہ عالَم ہے! تو اے نبی ﷺ! آپ کو تو یہ کام کرنا ہے' آپ کا تو یہ فرضِ منصبی ہے۔ آپ کو ہم نے بھیجا ہی اس لیے ہے کہ روئے ارضی پر اللہ کے دین کو غالب کر دیں۔

﴿عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّكُفَّ بَاْسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ﴾ ''بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ جلد ہی ان کافروں کی قوت کو روک دے۔''

کُفار و مشرکین کی جو جنگی تیاریاں ہو رہی ہیں' بڑی چلت پھرت ہو رہی ہے' یہ تو کچھ عرصے کی بات ہے۔ وہ وقت بس اب آیا ہی چاہتا ہے کہ آپ کے مقابلے کے لیے ان میں دم نہیں رہے گا اور وہ وقت جلد ہی آ گیا کہ مشرکین کی کمر ٹوٹ گئی۔ سورۃ النساء کی یہ آیت ۴ ہجری میں نازل ہوئی اور ۵ ہجری میں غزوۂ احزاب پیش آیا' جس کے بعد جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے دوٹوک انداز میں اہلِ

ایمان سے فرمادیا: ((لَنْ تَغْزُوْكُمْ قُرَيْشٌ بَعْدَ عَامِكُمْ هٰذَا وَلٰكِنَّكُمْ تَغْزُوْنَهُمْ))[۳] ''اس سال کے بعد قریش تم پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہیں کریں گے' بلکہ اب تم ان پر حملہ آور ہو گے''۔ غزوۂ احزاب کے فوراً بعد سورۃ الصف نازل ہوئی' جس میں اہلِ ایمان کو فتح و نصرت کی بشارت دی گئی: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۳﴾ اس سے اگلے سال ۶ ہجری میں آپ ﷺ نے عمرے کا سفر کیا' جس کے نتیجے میں صلح حدیبیہ ہوئی' جسے اللہ تعالیٰ نے فتح مبین قرار دیا ﴿اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝۱﴾ (الفتح) اس کے بعد ساتویں سال میں اللہ تعالیٰ نے فتح خیبر عطا فرمادی اور آٹھویں سال میں مکہ فتح ہو گیا۔ اس طرح ایک کے بعد ایک' سارے بند دروازے کھلتے چلے گئے۔

﴿وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا ۝۸۴﴾ ''اور اللہ تعالیٰ بہت شدید ہے قوت میں بھی اور سزا دینے میں بھی۔''

منافقین سے خطاب کے بعد اب پھر کچھ تمدنی آداب کا ذکر ہو رہا ہے۔ منافقین سے خطاب میں دو باتوں کو نمایاں کیا گیا۔ ایک اطاعتِ رسولؐ جو ان پر بہت شاق گزرتی تھی اور ایک قتال فی سبیل اللہ جو ان کے لیے بہت بڑا امتحان بن جاتا تھا۔ اب پھر اہلِ ایمان سے خطاب آ رہا ہے۔

آیت ۸۵ ﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ﴾ ''جو کوئی سفارش کرے گا بھلائی کی اُسے اس میں سے حصہ ملے گا۔''

انسانی معاشرے کے اندر کسی کے لیے سفارش کرنا بھی بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ آپ کے آس پاس کوئی شخص ہے' اس کی کوئی احتیاج ہے' آپ جانتے ہیں کہ صحیح آدمی ہے' بہروپیا نہیں ہے۔ دوسرے شخص کو آپ جانتے ہیں کہ وہ اس کی مدد کر سکتا ہے تو آپ کو دوسرے شخص کے پاس جا کر اس کے حق میں سفارش کرنی چاہیے کہ میں اس کو جانتا ہوں' یہ واقعتاً ضرورت مند ہے۔ اس طرح اُس کی ضرورت پوری ہو جائے گی اور اس نیکی کے ثواب میں آپ بھی حصہ دار ہوں گے۔ اسی طرح کسی پر کوئی مقدمہ قائم ہو گیا ہے اور آپ کے علم میں اس کی بے گناہی کے بارے میں حقائق اور شواہد ہیں تو آپ کو عدالت میں پیش ہو کر یہ حقائق اور شواہد پیش کرنے چاہئیں' تاکہ اس کی گلوخلاصی ہو سکے۔ اس آیت کی رو سے نیکی' بھلائی' خیر اور عدل و انصاف کی خاطر اگر کسی کی سفارش کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کا اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

﴿وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ؕ﴾ ''اور جو کوئی سفارش کرے گا بُرائی کی تو اُسے اس میں سے حصہ ملے گا۔''

کسی نے کسی کی جھوٹی اور غلط سفارش کی' حقائق کو توڑا مروڑا تو وہ بھی اس کے جرم میں شریک ہو گیا اور وہ اس جرم کی سزا میں بھی حصہ دار ہو گا۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝۸۵﴾ ''اور اللہ تعالیٰ ہر شے پر قوت رکھنے والا ہے۔''

آیت ۸۶ ﴿وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا ؕ﴾ ''اور جب تمہیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔''

ہر معاشرے میں کچھ ایسے دعائیہ کلمات رائج ہوتے ہیں جو معاشرے کے افراد باہمی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کے لیے

۳۔ تفسیر ابن کثیر ۳۹۶/۶۔ بروایت محمد بن اسحاق۔

بولتے ہیں۔ جیسے مغربی معاشرے میں گڈ مارننگ اور گڈ ایوننگ وغیرہ۔ عربوں کے ہاں صباح الخیر اور مساء الخیر کے علاوہ سب سے زیادہ رواج "حَیَّاکَ اللّٰہ" کہنے کا تھا۔ یعنی اللہ تمہاری زندگی بڑھائے۔ جیسے ہمارے ہاں سرائیکی علاقے میں کہا جاتا ہے "حیاتی ہووے"۔ درازیٔ عمر کی اس دعا کو تحیّہ کہا جاتا ہے۔ سلام اور اس کے ہم معنی دوسرے دعائیہ کلمات بھی سب اس کے اندر شامل ہو جاتے ہیں۔ عرب میں جب اسلامی معاشرہ وجود میں آیا تو دیگر دعائیہ کلمات بھی باقی رہے' البتہ "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کو ایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس آیت میں ہدایت کی جا رہی ہے کہ جب تمہیں کوئی سلامتی کی دعا دے، تو اس کے جواب کا اعلیٰ طریقہ یہ ہے کہ اس سے بہتر طریقے پر جواب دو۔ "اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ" کے جواب میں "وَعَلَیْکُمُ السَّلَامُ" کے ساتھ "وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ" کا اضافہ کر کے اسے لوٹاؤ۔ اگر یہ نہیں تو کم از کم اسی کے الفاظ اس کی طرف لوٹا دو۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا ﴿۸۶﴾﴾ "یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔"

یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں جو ہیں انسانی زندگی میں ان کی بھی اہمیت ہے۔ ان معاشرتی آداب سے معاشرتی زندگی کے اندر حسن پیدا ہوتا ہے' آپس میں محبت و مودّت پیدا ہوتی ہے۔

آیت ۸۷ ﴿اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ؕ﴾ "اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔"

﴿لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ لَا رَیْبَ فِیْہِ ؕ﴾ "وہ تمہیں لازماً جمع کرے گا قیامت کے دن' جس کے آنے میں کوئی شک نہیں۔"

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا ﴿۸۷﴾﴾ "اور اللہ سے بڑھ کر اپنی بات میں سچا کون ہوگا؟"

منافقین پر جو تین چیزیں بہت شاق تھیں' اب ان میں سے تیسری چیز کا تذکرہ آ رہا ہے' یعنی ہجرت۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو بیمار تھے' بوڑھے تھے' سفر کے قابل نہیں تھے' یا عورتیں اور بچے تھے' ان کا معاملہ تو پہلے ذکر ہو چکا کہ ان کے لیے تمہیں قتال کرنا چاہیے تاکہ انہیں ظالموں کے چنگل سے چھڑاؤ۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا اعلان تو کر چکے تھے لیکن اپنے کافر قبیلوں اور اپنی بستیوں کے اندر آرام سے رہ رہے تھے اور ہجرت نہیں کر رہے تھے' جبکہ ہجرت اب تمام مسلمانوں پر فرض کر دی گئی تھی۔ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ یہ ہجرت فرض کیوں کی گئی تھی؟ اس لیے کہ جب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت اور تحریک اس مرحلے میں داخل ہو گئی کہ اب باطل کے خلاف اقدام کرنا ہے' تو اب اہلِ ایمان کی جتنی بھی دستیاب طاقت تھی اسے ایک مرکز پر مجتمع کرنا ضروری تھا' تاکہ پوری قوت کے ساتھ ایک جگہ سے فیصلہ کن اقدام کیا جا سکے۔ مکی دور میں جو پہلی ہجرت ہوئی تھی یعنی ہجرت حبشہ' وہ اختیاری تھی۔ اس کی صرف اجازت تھی' حکم نہیں تھا۔ لیکن ہجرتِ مدینہ کا تو حکم تھا۔ لہٰذا اب ان لوگوں کا ذکر ہے جو ہجرت نہ کرنے کی بنا پر منافق قرار پائے۔

آیات ۸۸ تا ۹۱

فَمَا لَکُمْ فِی الْمُنٰفِقِیْنَ فِئَتَیْنِ وَاللّٰہُ اَرْکَسَہُمْ بِمَا کَسَبُوْا ؕ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَہْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَنْ تَجِدَ لَہٗ سَبِیْلًا ﴿۸۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ کَمَا کَفَرُوْا فَتَکُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْہُمْ اَوْلِیَآءَ حَتّٰی یُہَاجِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْہُمْ وَ

اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ لَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۸۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ
اِلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا
قَوْمَهُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَ اَلْقَوْا
اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ﴿۹۰﴾ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ
يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْٓا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَ
يُلْقُوْٓا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فَخُذُوْهُمْ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ وَ اُولٰٓئِكُمْ
جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۹۱﴾ ع ۱۲

آیت ۸۸ ﴿فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ﴾ ''پس تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو گروہ ہو رہے ہو؟''

یہ بات آگے واضح ہو جائے گی کہ یہ کن منافقین کا تذکرہ ہے' جن کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان دو آراء پائی جاتی تھیں۔ اہلِ ایمان میں سے بعض کا خیال تھا کہ ان کے ساتھ نرمی ہونی چاہیے' آخر یہ ایمان تو لائے تھے نا' اب ہجرت نہیں کر سکے۔ جبکہ کچھ لوگ اللہ کے حکم کے معاملے میں ان سے سخت رویہ اختیار کرنے کے حق میں تھے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ اے مسلمانو! تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم ان کے بارے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہو؟

﴿وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ﴾ ''اور اللہ نے تو اُن کو اُن کے کرتوتوں کے سبب الٹ دیا ہے۔''

ان کا ہجرت نہ کرنا درحقیقت اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ الٹے پھیر دیے گئے ہیں۔ یعنی ان کا ایمان سلب ہو چکا ہے۔ ہاں کوئی مجبوری ہوتی' عذر ہوتا تو اور بات تھی۔

﴿اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ﴾ ''کیا تم چاہتے ہو کہ اُن کو ہدایت دے دو جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے؟''

جن کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہرِ تصدیق ثبت ہو چکی ہے۔

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۸۸﴾﴾ ''اور جس کو اللہ راستے سے ہٹا دے اُس کے لیے تم کوئی راستہ نہ پاؤ گے۔''

جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے آخری مہر تصدیق ثبت ہو چکی ہو اس کے لیے پھر کون سا راستہ باقی رہ جاتا ہے؟

آیت ۸۹ ﴿وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً﴾ ''یہ تو چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جس طرح انہوں نے کفر کیا ہے تاکہ تم سب برابر ہو جاؤ''

یہ لوگ جو اُن کے بارے میں نرمی کی باتیں کر رہے ہیں' یہ چاہتے ہیں کہ جیسے انہوں نے کفر کیا ہے تم بھی کرو' تاکہ تم اور وہ سب یکساں ہو جائیں۔ دُم کٹی بلّی چاہتی ہے کہ سب بلیوں کی دُمیں کٹ جائیں۔

﴿فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''تو اب ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں اللہ کی راہ میں۔''

تو ہجرت گویا اب ان کے ایمان کا لٹمس (litmus) ٹیسٹ ہے۔ اگر وہ ہجرت نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ مؤمن نہیں' منافق ہیں۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪﴾ ''اور اگر وہ پیٹھ موڑ لیں (ہجرت نہ کریں) تو اُن کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ۔''

یعنی اگر وہ ہجرت نہیں کرتے جو ان پر فرض کر دی گئی ہے تو پھر وہ کافروں کے حکم میں ہیں' چاہے وہ کلمہ پڑھتے ہوں۔ تم انہیں جہاں بھی پاؤ پکڑو اور قتل کرو۔

﴿وَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝۸۹﴾ ''اور ان میں سے کسی کو بھی اپنا ساتھی اور مددگار مت بناؤ۔''

آیت ۹۰ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ﴾ ''سوائے اُن کے جن کا تعلق کسی ایسی قوم سے ہو جس کے ساتھ تمہارا کوئی معاہدہ ہے''

یعنی اس حکم سے صرف وہ منافقین مستثنیٰ ہیں جو کسی ایسے قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں جس کے ساتھ تمہارا صلح کا معاہدہ ہے۔ اس معاہدے سے انہیں بھی تحفظ حاصل ہو جائے گا۔

﴿اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ﴾ ''یا وہ لوگ جو تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ دل برداشتہ ہوں''

﴿اَنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ﴾ ''اس بات سے کہ تم سے لڑیں یا اپنی قوم سے لڑیں۔''

یعنی ان میں اتنی جرأت نہیں رہی کہ وہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم کے خلاف لڑیں یا اپنی قوم کے ساتھ ہو کر تمہارے خلاف لڑیں۔ انسانی معاشرے میں ہر سطح کے لوگ ہر دور میں رہے ہیں اور ہر دور میں رہیں گے۔ لہٰذا واضح کیا جا رہا ہے کہ انقلابی جدوجہد کے دوران ہر طرح کے حالات آئیں گے اور ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ چنانچہ اس طرح کے کم ہمت لوگ جو کہتے تھے کہ بھئی ہمارے لیے لڑنا بھڑنا مشکل ہے' نہ تو ہم اپنی قوم کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے لڑیں گے اور نہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں گے' ان کے بارے میں بھی فرمایا کہ ان کی بھی جان بخشی کرو۔ چنانچہ ہجرت نہ کرنے والے منافقین کے بارے میں جو یہ حکم دیا گیا کہ ﴿فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۪﴾ ''پس ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ'' اس سے دو استثناء بیان کر دیے گئے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ﴾ ''اور اگر اللہ چاہتا تو ان کو تم پر مسلط کر دیتا اور وہ تم سے لڑتے۔''

یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اللہ انہیں تمہارے خلاف ہمت عطا کر دیتا اور وہ تمہارے خلاف قتال کرتے۔

﴿فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ﴾ ''پس اگر یہ لوگ تم سے کنارہ کش رہیں اور تم سے جنگ نہ کریں''

﴿وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ﴾ ''اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں''

﴿فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝۹۰﴾ ''تو اللہ نے تمہیں بھی ایسے لوگوں کے خلاف اقدام کرنے کی اجازت نہیں دی۔''

تو اس بات کو سمجھ لیجیے کہ جو منافق ہجرت نہیں کر رہے' ان کے لیے عام قاعدہ یہ ہے کہ اب ان کے خلاف اقدام ہوگا' انہیں جہاں بھی پاؤ پکڑو اور قتل کر دو' وہ حربی کافروں کے حکم میں ہیں۔ اِلّا یہ کہ (ا) ان کے قبیلے سے تمہارا صلح کا معاہدہ ہے تو وہ ان کو تحفظ فراہم کر جائے گا۔ (ب) وہ آ کر اگر یہ کہہ دیں کہ ہم بالکل غیر جانبدار ہو جاتے ہیں' ہم میں جنگ کی ہمت نہیں ہے' ہم نہ آپ کے ساتھ ہو کر

اپنی قوم سے لڑ سکتے ہیں اور نہ ہی آپ کے خلاف اپنی قوم کی مدد کریں گے' تب بھی انہیں چھوڑ دو۔ اس کے بعد اب منافقین کے ایک تیسرے گروہ کی نشان دہی کی جا رہی ہے۔

آیت ۹۱ ﴿سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْکُمْ وَ یَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ﴾ ''تم پاؤ گے ایک اور قسم کے لوگوں کو بھی جو چاہتے ہیں کہ تم سے بھی امن میں رہیں اور اپنی قوم سے بھی امن میں رہیں۔''

﴿کُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَی الْفِتْنَةِ اُرْکِسُوْا فِیْهَا ۚ﴾ ''لیکن جب بھی فتنے کی طرف موڑے جاتے ہیں تو اس کے اندر اوندھے ہو جاتے ہیں۔''

جب بھی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس میں اوندھے منہ گرتے ہیں۔ جب دیکھتے ہیں کہ اپنی قوم کا پلڑا بھاری ہے تو مسلمانوں کے خلاف جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں کہ اب تو ہماری فتح ہونے والی ہے اور ہمیں مالِ غنیمت میں سے حصہ مل جائے گا۔

﴿فَاِنْ لَّمْ یَعْتَزِلُوْکُمْ وَیُلْقُوْۤا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ وَیَکُفُّوْۤا اَیْدِیَهُمْ﴾ ''پس اگر یہ تم سے کنارہ کش نہ رہیں' تمہارے سامنے صلح و سلامتی پیش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں''

﴿فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ؕ﴾ ''تو ان کو پکڑو اور قتل کرو جہاں کہیں بھی پاؤ۔''

﴿وَاُولٰٓئِکُمْ جَعَلْنَا لَکُمْ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا ﴿۹۱﴾﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمہیں سند (اور قوت) عطا کر دی ہے۔''

ایسے لوگوں کے معاملے میں ہم نے تمہیں کھلا اختیار دے دیا ہے کہ تم ان کے خلاف اقدام کر سکتے ہو۔

آیات ۹۲ تا ۹۶

وَ مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ یَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤی اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّصَّدَّقُوْا ؕ فَاِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّکُمْ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ وَ اِنْ کَانَ مِنْ قَوْمٍ بَیْنَکُمْ وَ بَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ فَدِیَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤی اَهْلِهٖ وَ تَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا ﴿۹۲﴾ وَ مَنْ یَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِیْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِیْمًا ﴿۹۳﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَتَبَیَّنُوْا وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰۤی اِلَیْکُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۫ فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ کَثِیْرَةٌ ؕ کَذٰلِکَ کُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَیْکُمْ فَتَبَیَّنُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۹۴﴾ لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ وَ الْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ

وَ اَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَ مَغْفِرَةً وَّ رَحْمَةً ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾ ع ۱۳

اب ایک اور معاشرتی مسئلے کا ذکر آ رہا ہے۔ ان سورتوں کے نزول کے وقت دراصل پورے عرب کے اندر ایک بھٹی دہک رہی تھی' جگہ جگہ جنگیں لڑی جا رہی تھیں' میدان لگ رہے تھے' معرکے ہو رہے تھے۔ تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں تو صرف بڑے بڑے معرکوں اور غزوات کا ذکر ہوا ہے مگر حقیقت میں اُس وقت پورا معاشرہ حالتِ جنگ میں تھا۔ ایک چومکھی جنگ تھی جو مسلسل جاری تھی۔ اِن آیات سے اُس وقت کے عرب معاشرے کی اصل صورتِ حال اور اُس قبائلی معاشرے کے مسائل کی بہت کچھ عکاسی ہوتی ہے۔ اس طرح کے ماحول میں فرض کریں' ایک شخص نے کسی دوسرے کو قتل کر دیا۔ قاتل اور مقتول دونوں مسلمان ہیں۔ قاتل کہتا ہے کہ میں نے عمداً ایسا نہیں کیا' میں نے تو شکار کی غرض سے تیر چلایا تھا مگر اتفاق سے نشانہ چُوک گیا اور اس کو جا لگا۔ تو اب یہ مسلمان کا مسلمان کو قتل کرنا دو طرح کا ہو سکتا ہے' قتلِ عمد یا قتلِ خطا۔ چنانچہ اگلی آیات میں اس بارے میں وضاحت فرمائی گئی ہے۔

آیت ۹۲ ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ﴾ ''کسی مؤمن کے لیے یہ روا نہیں کہ وہ ایک مؤمن کو قتل کرے مگر خطا کے طور پر۔''

خطا کے طور پر قتل کیا ہے؟ نشانہ چُوک گیا اور کسی کو جا لگا یا سڑک پر حادثہ ہو گیا' کوئی شخص گاڑی کے نیچے آ کر مر گیا۔ آپ تو اُسے مارنا نہیں چاہتے تھے' بس یہ سب کچھ آپ سے اتفاقی طور پر ہو گیا۔ چنانچہ سعودی عرب میں حادثات کے ذریعے ہونے والی اموات کے فیصلے اسی قانونِ قتلِ خطا کے تحت ہوتے ہیں۔ وہ قانون کیا ہے:

﴿وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ﴾ ''اور جو شخص کسی مؤمن کو قتل کر دے غلطی سے تو (اُس کے ذمہ ہے) ایک مسلمان غلام کی گردن کا آزاد کرانا''

﴿وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ﴾ ''اور خون بہا مقتول کے گھر والوں کو ادا کرنا' اِلّا یہ کہ وہ معاف کر دیں۔''

یعنی قتلِ خطا کے بدلے میں قاتل کو قتل نہیں کیا جائے گا بلکہ دیت یعنی خون بہا ادا کیا جائے گا' یہ مقتول کے ورثاء کا حق ہے۔ اور گناہ کے کفارے کے طور پر ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہوگا' یہ اللہ کا حق ہے۔

﴿فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ ''اور اگر وہ (مقتول) کسی ایسے قبیلے سے تھا جس سے تمہاری دشمنی ہے اور تھا وہ مسلمان''

﴿فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ؕ﴾ ''تو پھر صرف ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا ہوگا۔''

کیونکہ کافر قبیلے کا آدمی تھا اور اگر اُس کی دیت دی جائے گی تو وہ اس کے گھر والوں کو ملے گی جو کہ کافر ہیں' لہٰذا یہاں دیت معاف ہو گئی' لیکن ایک غلام کو آزاد کرنا جو اللہ کا حق تھا' وہ برقرار رہے گا۔

﴿وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ﴾ ''اور اگر وہ (مقتول) ہو کسی ایسی قوم سے جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے''

﴿فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ﴾ ''تو پھر دیت بھی دینا ہوگی اُس کے گھر والوں کو اور ایک مؤمن

غلام بھی آزاد کرنا ہوگا۔''

گویا یہ دو حق الگ الگ ہیں۔ ایک تو دیت ہے جو مقتول کے ورثاء کا حق ہے' اس میں یہاں رعایت نہیں ہو سکتی' البتہ جو حق اللہ کا اپنا ہے یعنی گناہ کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے ایک مؤمن غلام کا آزاد کرنا' تو اس میں اللہ نے نرمی کر دی' جس کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۹۲﴾﴾ ''پھر جو یہ (غلام آزاد) نہ کر سکے تو روزے رکھے دو مہینوں کے متواتر۔ یہ اللہ کی طرف سے توبہ (قبول کرنے کا ذریعہ) ہے' اور یقیناً اللہ تو علیم و حکیم ہے۔''

اب آگے قتلِ عمد کے قانون کے متعلق تفصیلات کا ذکر ہے۔

آیت ۹۳ ﴿وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا﴾ ''اور جو کوئی قتل کرے گا کسی مؤمن کو جان بوجھ کر تو اُس کا بدلہ جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا''

﴿وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ﴿۹۳﴾﴾ ''اور اللہ کا غضب اُس پر ہوگا' اور اللہ نے اُس پر لعنت فرمائی ہے اور اُس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

جیسا کہ آغازِ سورۃ میں ذکر ہوا تھا کہ حرمتِ جان اور حرمتِ مال کے تصور پر معاشرے کی بنیاد قائم ہے۔ لہٰذا ایک مسلمان کا قتل کر دینا اللہ کے ہاں ایک بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ المائدۃ (آیت ۳۲) میں قتلِ ناحق کو پوری نوعِ انسانی کے قتل کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ قاتل نے حرمتِ جان کو پامال کر کے شجرِ تمدن کی گویا جڑ کاٹ دی' اور اس کا یہ فعل ایسے ہی ہے جیسے اس نے پوری انسانی نسل کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ ہمارے ہاں ایمان و اسلام کتنا کچھ ہے اور انسانی جان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں قتلِ عمد کے واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے ہیں اور انسانی جان مچھر مکھی کی جان کی طرح ارزاں ہو چکی ہے۔

اب اگلی آیت کو سمجھنے کے لیے عرب کے ان مخصوص حالات کو نظر میں رکھیں جن میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے' مختلف علاقوں میں کچھ لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہو چکے تھے اور کچھ ابھی کفر پر قائم تھے اور کوئی ذریعہ تمیز بھی ان میں نہیں تھا' جگہ جگہ معرکے بھی ہو رہے تھے۔ اب فرض کریں کسی علاقے میں لڑائی ہو رہی ہے۔ مسلمان مجاہد سمجھا کہ سامنے سے کافر آ رہا ہے مگر جب وہ اسے قتل کرنے کے لیے بڑھا تو اُس نے آگے سے کلمہ پڑھ کر دعویٰ کیا کہ وہ مسلمان ہے۔ اس صورتِ حال میں ممکن ہے سمجھا جائے کہ اُس نے جان بچانے کے لیے بہانہ کیا ہے۔ تو اب اس بارے میں حکم دیا جا رہا ہے:

آیت ۹۴ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا ضَرَبْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَبَيَّنُوْا﴾ ''اے اہلِ ایمان جب تم اللہ کی راہ میں نکلو تو تحقیق کر لیا کرو''

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ﴾ ''اور جو شخص بھی تمہارے سامنے سلام پیش کرے (یا اسلام پیش کرے) اُس کو یہ مت کہو کہ تم مؤمن نہیں ہو۔''

تم اس کی باطنی کیفیت معلوم نہیں کر سکتے۔ ایمان کا تعلق چونکہ دل سے ہے اور دل کا حال سوائے اللہ کے اور کوئی نہیں جان سکتا' لہٰذا دنیا میں تمام معاملات کا اعتبار زبانی اسلام (اقرار باللسان) پر ہی ہوگا۔ اگر کوئی شخص کلمہ پڑھ رہا ہے اور اپنے اسلام کا اظہار

کر رہا ہے تو آپ کو اس کے الفاظ کا اعتبار کرنا ہوگا۔ اس آیت کے پس منظر کے طور پر روایات میں ایک واقعے کا ذکر ملتا ہے جو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ کسی سریہ میں حضرت اسامہؓ کا ایک کافر سے دو بدو مقابلہ ہوا۔ جب وہ کافر بالکل زیر ہو گیا اور اُس کو یقین ہو گیا کہ اس کے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تو اس نے کلمہ پڑھ دیا: اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰهِ۔ اب ایسی صورتِ حال میں جو کوئی بھی ہوتا یہی سمجھتا کہ اس نے جان بچانے کے لیے بہانہ کیا ہے۔ حضرت اسامہؓ نے بھی یہی سمجھتے ہوئے اُس پر نیزے کا وار کیا اور اسے قتل کر دیا' لیکن دل میں ایک خلش رہی۔ بعد میں انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپؐ نے فرمایا: ((اَقَالَ لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَقَتَلْتَهٗ؟)) ''کیا اُس نے لا الٰہ الا اللہ کہہ دیا اور تم نے پھر بھی اُسے قتل کر دیا؟'' حضرت اسامہؓ نے جواب دیا: ''یارسول اللہؐ! اُس نے تو ہتھیار کے خوف سے کلمہ پڑھا تھا''۔ آپؐ نے فرمایا: ((اَفَلَا شَقَقْتَ عَنْ قَلْبِهٖ حَتّٰى تَعْلَمَ اَقَالَهَا اَمْ لَا؟)) ''تو تم نے اُس کا دل چیر کر کیوں نہ جان لیا کہ اُس نے کلمہ دل سے پڑھا تھا یا نہیں؟'' حضرت اسامہؓ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات مجھ سے بار بار فرمائی' یہاں تک کہ میں خواہش کرنے لگا کہ کاش میں آج ہی مسلمان ہوا ہوتا![۴] بعض روایات میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے اسامہ اُس دن کیا جواب دو گے جب وہ کلمۂ شہادت تمہارے خلاف مدعی ہو کر آئے گا؟

﴿تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ ''تم دنیا کا سامان چاہتے ہو''

کہ ایسے شخص کو کافر قرار دیں' قتل کریں اور مالِ غنیمت لے لیں۔

﴿فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ﴾ ''تو اللہ کے ہاں بڑی غنیمتیں ہیں۔''

تمہارے لیے بڑی بڑی مملکتوں کے اموالِ غنیمت آنے والے ہیں۔ لہٰذا تم لوگ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے حدود اللہ سے تجاوز نہ کرو۔

﴿كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ﴾ ''تم خود بھی تو پہلے ایسے ہی تھے' تو اللہ نے تم پر احسان فرمایا ہے''

آخر ایک دَور تم پر بھی تو ایسا ہی گزرا ہے۔ تم سب بھی تو نومسلم ہی ہو اور ایک وقت میں تم میں سے ہر شخص کافر یا مشرک ہی تو تھا! پھر اللہ ہی نے تم لوگوں پر احسان فرمایا کہ تمہیں کلمہ شہادت عطا کیا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ سے بہرہ مند ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ لہٰذا اللہ کا احسان مانو اور اس طریقے سے لوگوں کے معاملے میں اتنی سخت روش اختیار نہ کرو۔

﴿فَتَبَيَّنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝۹۴﴾ ''تو (دیکھو) تحقیق کر لیا کرو۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔''

اگلی آیت مبارکہ میں جہاد کا لفظ بمعنی قتال آیا ہے۔ جہاں تک جہاد کی اصلی روح کا تعلق ہے تو ایک مؤمن گویا ہر وقت حالتِ جہاد میں ہے۔ دعوت و تبلیغ بھی جہاد ہے' اپنے نفس کے خلاف اطاعتِ الٰہی بھی جہاد ہے۔ از روئے حدیثِ نبویؐ: ((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ))[۵] ''مجاہد تو وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے''۔ بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اَیُّ الْجِهَادِ اَفْضَلُ؟

۴۔ صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب تحریم قتل الکافر بعد ان قال لا الٰہ الا اللہ۔ یہ واقعہ صحیح بخاری میں بھی مذکور ہے اور بعض دیگر کتبِ احادیث میں بھی۔

۵۔ سنن الترمذی' کتاب فضائل الجہاد' باب ما جاء فی فضل من مات مرابطاً۔ عن فضالۃ بن عبید رضی اللہ عنہ۔

''سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟'' تو آپؐ نے فرمایا: ((اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ))[۶] ''یہ کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کے خلاف جہاد کرو انہیں اللہ تعالیٰ کا مطیع بنانے کے لیے''۔ چنانچہ جہاد کی بہت سی منازل ہیں جن میں سے آخری منزل قتال ہے۔ تاہم جہاد اور قتال کے الفاظ قرآن میں ایک دوسرے کی جگہ پر بھی استعمال ہوئے ہیں۔ قرآن میں الفاظ کے تین ایسے جوڑے ہیں جن میں سے ہر لفظ اپنے جوڑے کے دوسرے لفظ کی جگہ اکثر استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے ایک جوڑا تو یہی ہے' یعنی جہاد اور قتال کے الفاظ' جبکہ دوسرے دو جوڑے ہیں ''مؤمن و مسلم'' اور ''نبی و رسول''۔

آیت ۹۵ ﴿لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ﴾ ''برابر نہیں ہیں اہلِ ایمان میں سے بیٹھ رہنے والے بغیر عذر کے اور وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں جہاد (قتال) کے لیے نکلتے ہیں اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ۔''

﴿فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ؕ﴾ ''اللہ نے فضیلت دی ہے اُن مجاہدین کو جو اپنی جانوں اور اپنے مالوں سے جہاد کرنے والے ہیں' بیٹھے رہنے والوں پر' ایک بہت بڑے درجے کی۔''

یہاں دَرَجَةً کی تنکیر (بطور اسم نکرہ استعمال) تفخیم کے لیے ہے' یعنی بہت بڑا درجہ۔ یہ قتل فی سبیل اللہ کے لیے نکلنے کا ذکر ہے کہ جو مسلمان کسی معقول عذر کے بغیر قتال کے لیے نہیں نکلتا وہ اس کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتا جو قتال کر رہا ہے۔ اگر کوئی اندھا ہے' دیکھنے سے معذور ہے یا کوئی لنگڑا ہے' چل نہیں سکتا' ایسے معذور قسم کے لوگ اگر قتال کے لیے نہ نکلیں تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن ایسے لوگ جن کو کوئی ایسا عذر نہیں ہے' پھر بھی وہ بیٹھے رہیں' یہاں انہی لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ درجے میں مجاہدین کے برابر ہرگز نہیں ہو سکتے۔ واضح رہے کہ یہ ایسے قتال کی بات ہو رہی ہے جس کی حیثیت اختیاری (optional) ہو' جسے لازمی قرار نہ دیا گیا ہو۔ جب اسلامی ریاست کی طرف سے قتال کے لیے نفیرِ عام ہو جائے تو معذورین کے سوا سب کے لیے نکلنا لازم ہو جاتا ہے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ قتال کے لیے پہلی دفعہ نفیرِ عام غزوۂ تبوک (سن ۹ ہجری) میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے قتال کے بارے میں صرف ترغیب (persuasion) تھی کہ نکلو اللہ کی راہ میں' حکم نہیں تھا۔ لہٰذا کوئی جواب طلبی بھی نہیں تھی۔ کوئی چلا گیا' کوئی نہیں گیا' کوئی گرفت نہیں تھی۔ لیکن غزوۂ تبوک کے لیے نفیرِ عام ہوئی تھی' باقاعدہ ایک حکم تھا' لہٰذا جو لوگ نہیں نکلے اُن سے وضاحت طلب کی گئی' اُن کا مؤاخذہ کیا گیا اور اُن کو سزائیں بھی دی گئیں۔ تو یہاں چونکہ اختیاری قتال کی بات ہو رہی ہے اس لیے یہ نہیں کہا جا رہا کہ ان کو پکڑو اور سزا دو' بلکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ قتال کرنے والے مجاہدین اللہ کی نظر میں بہت افضل ہیں۔ اس سے پہلے ایسے قتال کے لیے اسی سورۃ (آیت ۸۴) میں ﴿وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ کا حکم ہے' یعنی مؤمنین کو قتال پر اُکسایئے' ترغیب دیجئے' آمادہ کیجئے۔ لیکن یہاں واضح انداز میں بتایا جا رہا ہے کہ قتال کرنے والے اور نہ کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

﴿وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ﴾ ''(اگرچہ) سب کے لیے اللہ کی طرف سے اچھا وعدہ ہے۔''

چونکہ ابھی قتال فرض نہیں تھا' نفیرِ عام نہیں تھی' سب کا نکلنا لازم نہیں کیا گیا تھا' اس لیے فرمایا گیا کہ تمام مؤمنین کو ان کے اعمال کے مطابق اچھا اجر دیا جائے گا۔ قتال کے لیے نہ نکلنے والوں نے اگر اتنی ہمت نہیں کی اور وہ کمتر مقام پر قانع ہو گئے ہیں تو ٹھیک ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سلسلے میں ان پر کوئی گرفت نہیں ہو گی۔

۶۔ حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ۲۸۲/۲۔ عن ابی ذر الغفاری رضی اللہ عنہ۔

﴿وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۹۵﴾﴾ ''لیکن فضیلت دی ہے اللہ تعالیٰ نے مجاہدین کو بیٹھے رہنے والوں پر ایک اجرِ عظیم کی (صورت میں)۔''

آیت ۹۶ ﴿دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۹۶﴾﴾ ''(اُن کے لیے) اُس کی طرف سے بلند درجات بھی ہوں گے اور مغفرت و رحمت بھی۔ اور یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا ہے۔''

آیات ۹۷ تا ۱۰۰

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹۸﴾ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴿۹۹﴾ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ؕ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۰﴾ ع ۱۴

اب ان لوگوں کا ذکر آ رہا ہے جو ہجرت کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے' اس سلسلے میں انہیں کوئی عذر بھی مانع نہیں تھا' مگر پھر بھی وہ اپنے قبیلے یا مکہ شہر میں اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھے تھے۔

آیت ۹۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ ''یقیناً وہ لوگ کہ جن کو فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے''

یعنی انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی' اس سلسلے میں رسول ﷺ کے حکم کی اطاعت نہیں کی تھی۔ آخر موت تو آنی ہے' لہٰذا فرشتے جب ان کی روحیں قبض کریں گے تو ان کے ساتھ اس طرح مکالمہ کریں گے:

﴿قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ﴾ ''وہ ان سے کہیں گے یہ تم کس حال میں تھے؟''

تم نے ایمان کا دعویٰ تو کیا تھا' لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کا حکم دیا تو ہجرت کیوں نہیں کی؟ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟

﴿قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''وہ کہیں گے ہم مجبور اور کمزور بنا دیے گئے تھے اس زمین میں۔''

﴿قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ﴾ ''وہ (فرشتے) کہیں گے کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟''

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۹۷﴾﴾ ''تو یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے' اور وہ بہت بُری جگہ ہے ٹھہرنے کی۔''

آیت ﴿ اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ ﴾ ''سوائے اُن مَردوں' عورتوں اور بچوں کے جن کو واقعتاً دبالیا گیا ہو''

جن لوگوں کو کمزور سمجھ کر دبالیا گیا ہو' واقعتاً زنجیروں میں جکڑ کر گھروں میں بند کر دیا گیا ہو' ان کا معاملہ اور ہے۔ یا پھر کوئی عورت ہے جس کے لیے تنہا سفر کرنا ممکن نہیں۔ ویسے تو روایات میں ایسی عورتوں کا بھی ذکر آتا ہے جنہوں نے تنہا ہجرتیں کیں' لیکن ہر ایک کے لیے تو ایسا ممکن نہیں تھا۔

﴿ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّلَا يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلًا ﴾ ''نہ تو وہ کوئی تدبیر کر سکتے ہیں اور نہ وہ راستہ جانتے ہیں۔''

آیت ﴿ فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّعْفُوَ عَنْهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوْرًا ﴾ ''بعید نہیں کہ ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے' اور اللہ واقعتاً بخشنے والا اور معاف فرمانے والا ہے۔''

ایسے بے بس اور لاچار مَردوں' بچوں اور عورتوں کے لیے اسی سورۃ (آیت ۷۵) میں حکم ہوا تھا کہ انہیں چھڑانے کے لیے قتال فی سبیل اللہ کرو۔ لیکن جو لوگ ہجرت کے اس واضح حکم کے بعد بھی بغیر عذر کے بیٹھے رہے ہیں ان کے بارے میں مسلمانوں کو بتایا گیا کہ وہ منافق ہیں' ان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں' جب تک کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ بلکہ قتال کے معاملے میں وہ بالکل کفار کے برابر ہیں۔

آیت ﴿ وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ ''اور جو کوئی ہجرت کرے گا اللہ کی راہ میں''

﴿ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ ﴾ ''وہ پائے گا زمین میں بڑے ٹھکانے اور بڑی وسعت۔''

جیسے سورۃ العنکبوت میں فرمایا: ﴿ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ ﴾ ''اے میرے وہ بندے جو ایمان لائے ہو' میری زمین بہت کشادہ ہے' پس تم لوگ میری ہی بندگی کرو!''۔ اگر اپنے وطن میں اللہ کی بندگی نہیں کر سکتے ہو تو کہیں اور چلے جاؤ۔

﴿ وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ ﴾ ''اور جو کوئی اپنے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہجرت کے لیے اللہ اور اُس کے رسولؐ کی طرف' پھر اُسے موت نے آلیا''

﴿ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ ﴾ ''تو اُس کا اجر اللہ کے ذمے ثابت ہو گیا۔''

یعنی جس کسی نے بھی ہجرت کی' فی سبیل اللہ' دولت کے لیے یا حصولِ دنیا کے لیے نہیں' بلکہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی رضا جوئی کے لیے' وہ اصل ہجرت ہے۔ حدیث میں اس کی وضاحت بایں الفاظ ملتی ہے:

((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَاِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ، وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهٗ لِدُنْيَا يُصِيْبُهَا اَوِامْرَاَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰى مَا هَاجَرَ اِلَيْهِ))(۷)

''اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہی ہے اور بلاشبہ ہر انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اُس نے نیت کی۔ پس جس نے ہجرت کی اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف تو واقعی اُس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہے' اور جس نے ہجرت کی دنیا کمانے کے لیے یا کسی عورت سے شادی رچانے کے لیے تو اس کی ہجرت اُسی چیز کی طرف شمار ہو گی جس کا اُس نے قصد کیا۔''

۷۔ صحیح البخاری' کتاب بدء الوحی' باب بدء الوحی' و کتاب الایمان والنذور' باب النیة فی الایمان۔ و صحیح مسلم' کتاب الامارة' باب قوله انما الاعمال بالنیة...

چنانچہ جس نے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف ہجرت کی' خلوصِ نیت کے ساتھ گھر سے نکل کھڑا ہوا لیکن راستے ہی میں فوت ہو گیا' مدینہ منورہ نہیں پہنچ سکا اور حضور ﷺ کے قدموں تک اُس کی رسائی نہیں ہو سکی' تو پھر بھی وہ کامیاب و کامران ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کی نیت کے مطابق اُسے ہجرت کا اجر ضرور عطا فرمائے گا۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١٠٠﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ بخشنے والا' رحم فرمانے والا ہے۔''

آیات ۱۰۱ تا ۱۰۴

وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾ وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَ لْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَ اَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ؕ وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿١٠٢﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿١٠٣﴾ وَ لَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَ تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١٠٤﴾ ع ۱۵

اس رکوع میں پھر شریعت کے کچھ احکام کا ذکر ہے۔ گویا خطاب کا رُخ اب پھر اہلِ ایمان کی طرف ہے۔

آیت ۱۰۱ ﴿وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ ۖ﴾ ''اور (اے مسلمانو!) جب تم زمین میں سفر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم نماز کو کچھ کم کر لیا کرو'

﴿اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ﴾ ''اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں نقصان پہنچائیں گے۔''

﴿اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿١٠١﴾﴾ ''یقیناً یہ کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔''

یہ تو ہے حالتِ سفر میں قصرِ صلوٰۃ کا حکم۔ لیکن جنگ کی حالت میں قصر یعنی صلوٰۃ الخوف کا طریقہ اگلی آیت میں مذکور ہے۔ حالتِ جنگ میں جب پورے لشکر کا ایک ساتھ نماز پڑھنا ممکن نہ رہے تو گروہوں کی شکل میں نماز ادا کرنے کی اجازت ہے۔ لیکن ایسی صورت میں جب حضور ﷺ خود بھی لشکر میں موجود ہوتے تو کوئی ایک گروہ ہی آپ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھ سکتا تھا' جبکہ دوسرے گروہ کے لوگوں کو لازماً محرومی کا احساس ہوتا۔ لہٰذا اگلی آیت میں اس مسئلے کے حل کے طور پر صلوٰۃ الخوف ادا کرنے کی بہت عمدہ تدبیر بتائی گئی۔

آیت ۱۰۲ ﴿وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) جب آپ ان کے درمیان موجود ہوں اور (حالتِ جنگ میں) انہیں نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوں''

﴿فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ ۫﴾ ''تو ان میں سے ایک گروہ کو کھڑے ہونا چاہیے آپ کے ساتھ' اور وہ اپنا اسلحہ لیے ہوئے ہوں۔''

﴿فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۪﴾ ''پھر جب وہ سجدہ کر چکیں تو تمہارے پیچھے ہو جائیں''

﴿وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ﴾ ''اور آئے دوسرا گروہ جنہوں نے ابھی نماز نہیں پڑھی اور وہ آپؐ کے ساتھ نماز پڑھیں''

یہ حکم صلوٰۃ الخوف کے بارے میں ہے۔ اس کی عملی صورت یہ تھی کہ حضور ﷺ نے ایک رکعت نماز پڑھا دی اور اس کے بعد آپؐ بیٹھے رہے' دوسری رکعت کے لیے کھڑے نہیں ہوئے' جبکہ مقتدیوں نے دوسری رکعت خود ادا کر لی۔ دو رکعتیں پوری کر کے وہ محاذ پر واپس چلے گئے تو دوسرے گروہ کے لوگ جو اب تک نماز میں شریک نہیں ہوئے تھے' نماز کے لیے حضورؐ کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے۔ اب حضورؐ نے دوسری رکعت اس گروہ کے لوگوں کی موجودگی میں پڑھائی۔ اس کے بعد حضورؐ نے سلام پھیر دیا' لیکن مقتدیوں نے اپنی دوسری رکعت انفرادی طور پر ادا کر لی۔ اس طریقے سے لشکر میں سے کوئی شخص بھی حضور ﷺ کی امامت کے شرف اور سعادت سے محروم نہ رہا۔

﴿وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ ۚ﴾ ''اور ان کو بھی چاہیے کہ وہ اپنی حفاظت کا سامان اور اپنا اسلحہ اپنے ساتھ رکھیں۔''

﴿وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ عَنْ اَسْلِحَتِكُمْ وَاَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ﴾ ''یہ کافر لوگ تو اسی تاک میں رہتے ہیں کہ تم جیسے ہی اپنے اسلحہ اور ساز و سامان سے ذرا غافل ہو تو وہ تم پر ایک دم ٹوٹ پڑیں۔''

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ كَانَ بِكُمْ اَذًى مِّنْ مَّطَرٍ اَوْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَنْ تَضَعُوْٓا اَسْلِحَتَكُمْ ۚ﴾ ''اور تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ اگر تمہیں کوئی تکلیف ہو بارش کی وجہ سے یا تم بیمار ہو جاؤ اور (ایسی صورتوں میں) تم اپنا اسلحہ اتار کر رکھ دو۔''

﴿وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ﴾ ''البتہ اپنا بچاؤ ضرور کر لیا کرو۔''

اگر تلوار' نیزہ وغیرہ جسم سے بندھے ہوئے ہوں اور اس حالت میں نماز پڑھنا مشکل ہو تو یہ اسلحہ وغیرہ کھول کر علیحدہ رکھ دینے میں کوئی حرج نہیں' بشرطیکہ جنگ کے حالات اجازت دیتے ہوں' لیکن ڈھال وغیرہ اپنے پاس ضرور موجود رہے تاکہ اچانک کوئی حملہ ہو تو انسان اپنے آپ کو اس فوری حملے سے بچا سکے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۰۲﴾ ''یقیناً اللہ نے کافروں کے لیے بہت ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آیت ۱۰۳ ﴿فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ﴾ ''پھر جب تم (اس طریقے سے) نماز ادا کر لو''

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰي جُنُوْبِكُمْ ۚ﴾ ''تو پھر ذکر کرو اللہ کا کھڑے ہوئے' بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے۔''

چلتے پھرتے' اٹھتے بیٹھتے' سواری پر' غرض ہر حالت میں اللہ کا ذکر جاری رہنا چاہیے۔ گویا ذکر کثیر کا تعلق صرف نماز کے ساتھ نہیں بلکہ ہر وقت اور ہر حالت میں اس کا اہتمام رہنا چاہیے۔ جیسے سورۃ الجمعہ میں حکم دیا گیا ہے: ﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي

الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰﴾ ''پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ''۔ چنانچہ نماز کے بعد بھی حتیٰ کہ کاروبارِ زندگی کی مصروفیات کے دوران بھی اللہ کے ذکر میں مشغول رہو۔ ادعیہ ماثورہ اور اورادِ مسنونہ کا اہتمام کرو' اپنی زبانوں' ذہنوں اور دلوں کو اُس کے ذکر سے ہر وقت تر و تازہ رکھو۔

﴿فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ﴾ ''پھر جب تمہیں امن حاصل ہو جائے تو نماز کو قائم کرو (تمام آداب و شرائط کے ساتھ)۔''

یعنی نماز کی مذکورہ شکل (صلوٰۃ الخوف) صرف اضطراری حالت میں ہوگی' مگر جب خوف جاتا رہے اور حالتِ امن بحال ہو جائے تو نماز کو شریعت کے احکام اور آداب کے عین مطابق ادا کرنا ضروری ہے۔

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴿۱۰۳﴾﴾ ''یقیناً نماز اہلِ ایمان پر فرض کی گئی ہے وقت کی پابندی کے ساتھ۔''

یعنی نماز کی فرضیت باقاعدہ اس کے اوقات کے ساتھ ہے۔ نماز کے اوقات کی تفصیل ایک حدیث میں مذکور ہے۔ اس حدیث کے مطابق حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دو دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نمازیں پڑھائیں۔ ایک دن پانچوں نمازیں اوّل وقت میں جبکہ دوسرے دن تمام نمازیں آخر وقت میں پڑھائیں اور بتایا کہ نمازوں کے اوقات ان حدود کے مابین ہیں۔

آیت ۱۰۴ ﴿وَلَا تَهِنُوْا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ ۭ﴾ ''اور اس دشمن گروہ کا پیچھا کرنے میں کمزوری نہ دکھاؤ۔''

حق و باطل کی جنگ اب فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہی ہے۔ اس آخری مرحلے میں آ کر کہیں تھک نہ جانا اور دشمن کا پیچھا کرنے کے معاملے میں ہمت نہ ہار دینا۔

﴿اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ﴾ ''اگر تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو تمہاری طرح انہیں بھی تو تکلیف پہنچتی ہے۔''

یہ نصیحت کا بڑا پیارا انداز ہے کہ اس کشمکش میں اگر تم لوگ نقصان اٹھا رہے ہو تو کیا ہوا؟ تمہارے دشمن بھی تو ویسے ہی نقصان سے دوچار ہو رہے ہیں' انہیں بھی تو تکالیف پہنچ رہی ہیں' وہ بھی تو زخم پر زخم کھا رہے ہیں' ان کے لوگ بھی تو مر رہے ہیں۔

﴿وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۭ﴾ ''اور تم اللہ سے ایسی اُمیدیں رکھتے ہو جیسی امیدیں وہ نہیں رکھتے۔''

تمہیں تو جنت کی اُمید ہے' اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی اُمید ہے' جبکہ انہیں ایسی کوئی اُمید نہیں ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے تمہیں تو ان سے کہیں بڑھ کر پُرجوش ہونا چاہیے۔ سورۂ آل عمران کی آخری آیت میں بھی اہلِ ایمان کو ایسی ہی نصیحت کی گئی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا﴾ ''اے ایمان والو صبر سے کام لو اور صبر میں اپنے دشمنوں سے بڑھ جاؤ اور مربوط رہو''۔ تو آپ لوگوں کو تو صبر و استقامت میں ان سے بہت آگے ہونا چاہیے' کیونکہ تمہارا سہارا تو اللہ ہے: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ (النحل: ۱۲۷) ''آپ صبر کیجیے' اور آپ کا صبر تو بس اللہ ہی کی توفیق سے ہے''۔ تمہارے دشمنوں کے تو مَن گھڑت قسم کے خدا ہیں۔ اُن کے دیوتاؤں اور دیویوں کی خود ان کے دلوں میں کوئی حقیقی قدر و قیمت نہیں ہے' پھر بھی وہ اپنے باطل معبودوں کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال رہے ہیں تو اے مسلمانو! تمہیں تو ان سے کئی گنا زیادہ قربانیوں کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔

﴿وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۰۴﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔''

اہلِ ایمان سے اس مختصر خطاب کے بعد اب اگلے رکوع میں پھر منافقین کا ذکر آ رہا ہے۔

آیات ۱۰۵ تا ۱۱۵

اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ
خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾ وَّ اسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۰۶﴾ وَ لَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ
يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ﴿۱۰۷﴾ يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ لَا
يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَ هُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿۱۰۸﴾ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۫ فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۱۰۹﴾ وَ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ
يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَ مَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَ
كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَ مَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا فَقَدِ احْتَمَلَ
بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ ع وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَ رَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ ع ۱۶
يُّضِلُّوْكَ ؕ وَ مَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ
وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ
مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾ ع ۱۷

آیت ۱۰۵ ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یقیناً ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے حق کے ساتھ تاکہ آپ لوگوں کے مابین فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے آپ کو دکھایا ہے۔''

یعنی ایک تو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو کتاب دی ہے' قانون دیا ہے' اس کے ساتھ آپ کو بصیرتِ خاص دی ہے۔ مثلاً عدالت میں ایک جج بیٹھا ہے' اُس کے سامنے قانون کی کتاب ہے' مقدمے کا متعلقہ ریکارڈ ہے' شہادتیں ہیں' اب ایک اس کی اپنی عقل (چھٹی حس) اور قوتِ فیصلہ بھی ہوتی ہے' جس کو بروئے کار لا کر وہ فیصلہ کرتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جیسا ہم آپ کو دکھاتے ہیں اس کے مطابق آپ فیصلہ کریں۔

﴿وَ لَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ﴿۱۰۵﴾﴾ ''اور آپ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑنے والے نہ بنیں۔''

یعنی آپ ان کی طرف سے وکالت نہ فرمائیں۔ ایک شخص جو کہنے کو تو مسلمان ہے لیکن ہے خائن' آپ کو اس کی طرف داری نہیں

کرنی چاہیے۔اس کے پس منظر میں دراصل ایک واقعہ ہے۔ایک منافق نے کسی مسلمان کے گھر میں چوری کے لیے نقب لگائی اور وہاں سے آٹے کا ایک تھیلا اور کچھ اسلحہ چرا لیا۔آٹے کے تھیلے میں سوراخ تھا' جب وہاں سے وہ اپنے گھر کی طرف چلا تو سوراخ میں سے آٹا تھوڑا تھوڑا گرتا گیا۔اس طرح اس کے راستے اور گھر کی نشاندہی ہوتی گئی' مگر اسے خبر نہیں تھی کہ آٹے کی لکیر اس کا راز فاش کر رہی ہے۔گھر پہنچ کر اسے خیال آیا کہ ممکن ہے مجھ پر شک ہو جائے' چنانچہ اُس نے اسی وقت جا کر وہ سامان ایک یہودی کے ہاں امانتاً رکھوا دیا' لیکن آٹے کا نشان وہاں بھی پہنچ گیا۔اگلے روز جب تلاش شروع ہوئی تو آٹے کی لکیر کے ذریعے لوگ کھوج لگاتے ہوئے اُس کے مکان پر پہنچ گئے' لیکن پوچھ گچھ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔تلاشی لی گئی' مگر کوئی چیز برآمد نہ ہوئی۔جب لوگوں نے دیکھا کہ آٹے کے نشانات مزید آگے جا رہے ہیں تو وہ کھوج لگاتے ہوئے یہودی کے گھر پہنچے' اُس کے ہاں سے سامان بھی برآمد ہو گیا۔یہودی نے حقیقت بیان کر دی کہ یہ سامان رات کو فلاں شخص نے اُس کے پاس امانتاً رکھوایا تھا۔منافق کی قوم کے لوگوں نے کہا کہ یہودی جھوٹ بولتا ہے' وہی چور ہے۔جب کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو یہ جھگڑا حضور ﷺ کے سامنے لایا گیا۔منافق کے قبیلے والوں نے قسمیں کھا کھا کر خوب وکالت کی کہ ہمارا یہ آدمی تو بہت نیک ہے' اس پر خواہ مخواہ کا جھوٹا الزام لگ رہا ہے۔یہاں تک کہ حضور ﷺ کا دل بھی اُس شخص کے بارے میں کچھ پسیجنے لگا۔اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ خیانت کرنے والے کے حمایتی نہ بنیں' اُس کی طرف سے وکالت نہ کریں' اس کا سہارا نہ بنیں' اس کو مدد نہ پہنچائیں۔یہاں خَصِیْمًا کے معنی ہیں جھگڑا کرنے والا' بحث کرنے والا۔لِلْخَآئِنِیْنَ کا مطلب ہے ''خائن لوگوں کے حق میں''۔لیکن اگر عَلَی الْخَآئِنِیْنَ ہوتا تو اس کا مطلب ہوتا ''خائن لوگوں کے خلاف''۔

آیت ۱۰۶ ﴿وَّاسْتَغْفِرِ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۰۶﴾ ''اور اللہ سے استغفار کریں' یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا بہت رحم کرنے والا ہے۔''

یعنی اس منافق کے حق میں آپ کی طبیعت میں جو نرمی پیدا ہو گئی تھی اُس پر اللہ سے استغفار کیجیے' مغفرت طلب کیجیے۔

آیت ۱۰۷ ﴿وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ﴾ ''اور آپ مت جھگڑیے اُن لوگوں کی طرف سے جو اپنی جانوں کے ساتھ خیانت کرتے ہیں۔''

اس حکم کے حوالے سے ذرا مسئلہ شفاعت پر بھی غور کریں۔ہم یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ حضور ﷺ ہماری طرف سے شفاعت کریں گے' چاہے ہم نے بے ایمانیاں کی ہیں' حرام خوریاں کی ہیں' شریعت کی دھجیاں بکھیری ہیں۔لیکن یہاں آپ کو دوٹوک انداز میں خائن لوگوں کی وکالت سے منع کیا جا رہا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝۱۰۷﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ کو بالکل پسند نہیں ہیں خیانت میں بہت بڑھے ہوئے اور گنہگار لوگ۔''

آیت ۱۰۸ ﴿يَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ﴾ ''یہ لوگوں سے تو چھپتے ہیں مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتے''

یہ لوگ انسانوں سے اپنی حرکات چھپا سکتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپا سکتے۔

﴿وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ﴾ ''اور وہ تو اُن کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو چھپ کر اُس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔''

یہ منافقین کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ جب وہ مسلمانوں اور رسول اللہ ﷺ کے خلاف چوری چھپے سازشیں کر رہے

ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ اگر اللہ پر ان کا ایمان ہوتو انہیں معلوم ہو کہ اللہ ہماری باتیں سن رہا ہے۔ یہ مسلمانوں سے ڈرتے ہیں' ان سے اپنی باتوں کو خفیہ رکھتے ہیں' مگر ان بدبختوں کو یہ خیال نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ تو ہر وقت ان کے ساتھ موجود ہے' اس سے تو کچھ نہیں چھپ سکتا۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ﴿١٠٨﴾﴾ ''اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ اس کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''
یعنی اس کی پکڑ سے یہ کہیں باہر نہیں نکل سکتے۔

آیت ۱۰۹ ﴿هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ جٰدَلْتُمْ عَنْهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۣ﴾ ''یہ تم لوگ ہو جنہوں نے دنیا کی زندگی میں ان (مجرموں) کی طرف سے جھگڑا کر لیا۔''

﴿فَمَنْ يُّجَادِلُ اللّٰهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ ''مگر قیامت کے دن اللہ سے اُن کے بارے میں کون جھگڑا کرے گا؟''

﴿اَمْ مَّنْ يَّكُوْنُ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿١٠٩﴾﴾ ''یا کون ہوگا جو (وہاں) ان کا وکیل بن سکے گا؟''

یہ خطاب ہے اُس منافق چور کے قبیلے کے لوگوں سے کہ اے لوگو! تم نے دنیا کی زندگی میں تو مجرموں کی طرف سے خوب وکالت کر لی' یہاں تک کہ اللہ کے رسول (ﷺ) کو بھی قائل کرنے کی حد تک تم پہنچ گئے۔ مگر یہاں تم انہیں چھڑا بھی لیتے اور بالفرض رسول اللہ (ﷺ) کو بھی قائل کر لیتے تو قیامت کے دن انہیں اللہ کی پکڑ سے کون چھڑاتا؟ اس ضمن میں حضور ﷺ کی ایک حدیث کا مفہوم اس طرح ہے کہ میرے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہوتا ہے' اس میں ایک فریق زیادہ چرب زبان ہوتا ہے' وہ اپنی بات بہتر طور پر پیش کرتا ہے اور میرے ہاں سے اپنے حق میں غلط طور پر فیصلہ لے جاتا ہے۔ (فرض کیجئے کسی زمین کے ٹکڑے کے بارے میں کوئی تنازعہ تھا اور ایک شخص غلط طور پر بات ثابت کر کے اپنے حق میں فیصلہ لے گیا۔) لیکن اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح وہ زمین کا ٹکڑا نہیں بلکہ جہنم کا ٹکڑا لے کر گیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی شہادتوں کے اعتبار سے فیصلے کرتے تھے۔ ظاہر ہے اللہ کی طرف سے ہر وقت اور ہر مرحلے پر تو وحی نازل نہیں ہوتی تھی' البتہ جہاں اللہ تعالیٰ چاہتا آپؐ کو متنبہ فرما دیتا تھا۔ اس لیے آئندہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے تنبیہہ فرما دی کہ اگر کچھ لوگ اس دنیا میں جھوٹ' فریب اور غلط فیصلے کے ذریعے کوئی مفاد حاصل کر بھی لیتے ہیں تو انہیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ ایک دن اُس کی عدالت میں بھی پیش ہونا ہے جہاں جھوٹ اور غلط بیانی سے کام نہیں چلے گا' وہاں اُن کے حق میں اللہ سے کون جھگڑے گا؟

آیت ۱۱۰ ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿١١٠﴾﴾ ''اور جو کوئی بُری حرکت کرے یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھے اور پھر اللہ سے استغفار کرے تو وہ اللہ کو پائے گا بخشنے والا' بہت رحم کرنے والا۔''
اس سلسلے میں سیدھی روش یہی ہے کہ غلطی یا خطا ہو گئی ہے تو اس کا اعتراف کر لو' اس جرم کی جو دُنیوی سزا ہے وہ بھگت لو اور اللہ سے استغفار کرو۔ اس طرح آخرت کی سزا سے چھٹکارا مل جائے گا۔

آیت ۱۱۱ ﴿وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿١١١﴾﴾ ''اور جو کوئی بھی گناہ کماتا ہے تو وہ اس کا وبال اپنی ہی جان پر لیتا ہے۔ اور اللہ علیم اور حکیم ہے۔''

آیت ۱۱۲ ﴿وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْۗـــَٔةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْۗـــًٔـا﴾ ''اور جو کوئی کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے' پھر اس کا

الزام کسی بے گناہ پر لگا دیتا ہے"

﴿فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾﴾ "تو اُس نے اپنے سر ایک بہت بڑا بہتان اور بہت صریح گناہ کا بوجھ لے لیا۔"

کسی نے کوئی گناہ کمایا' کوئی خطا کی' کوئی جرم کیا' اور پھر اس کی تہمت کسی بے قصور شخص پر لگا دی تو اُس نے گویا بہت بڑے بہتان اور کھلم کھلا گناہ کا بار سمیٹ لیا۔ مذکورہ معاملے میں یہودی تو بے قصور تھا' چنانچہ جو لوگ اس کو سزا دلوانے پر تُل گئے' ان کا یہ فعل یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓـًٔا کے زُمرے میں آ گیا۔ بہرحال کسی بے گناہ پر اس طرح کا بہتان لگانا اللہ کے نزدیک بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔

اُس کے بعد اب اُس یہودی اور منافق کے مقدمے کے کچھ مزید پہلوؤں کے بارے میں حضور ﷺ سے خطاب ہو رہا ہے۔

آیت ۱۱۳ ﴿وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ﴾ "اور (اے نبی ﷺ!) اگر اللہ کا فضل اور اُس کی رحمت آپ کے شاملِ حال نہ ہوتی تو اُن (منافقین) کا ایک گروہ تو اس پر تُل گیا تھا کہ آپ کو گمراہ کر دے۔"

وہ لوگ تو اس پر کمر بستہ تھے کہ آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کر کے آپ سے غلط فیصلہ کروا لیں۔ ان کا منصوبہ تھا کہ عدالتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ظلم پر مبنی فیصلہ صادر ہو جائے' گناہگار چھوٹ جائے اور جو اصل مجرم نہیں تھا' بالکل بے گناہ تھا' اس کو پکڑ لیا جائے۔

﴿وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ﴾ "اور حقیقت میں وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو اور (اے نبی ﷺ!) وہ آپ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

ہم ایسے مواقع پر بروقت آپ ﷺ کو مطلع کرتے رہیں گے۔

﴿وَاَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ﴾ "اور اللہ نے آپ پر کتاب نازل کی ہے اور حکمت بھی' اور آپ کو وہ کچھ سکھایا ہے جو آپ نہیں جانتے تھے۔"

﴿وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾﴾ "اور یقیناً اللہ کا فضل ہے آپ پر بہت بڑا۔"

آیت ۱۱۴ ﴿لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ﴾ "ان (منافقین) کی سرگوشیوں میں سے اکثر میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی"

یہ منافقین کی منفی سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے۔ علیحدہ بیٹھ کر سرگوشیاں کرنا' دوسروں کو دیکھ کر مسکرانا اور ساتھ اشارے بھی کرنا تاکہ دیکھنے والے کے دل میں خلجان پیدا ہو کہ میرے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ یہ سارے معاملات جوں کے توں انسانی معاشرے کے اندر آج بھی موجود ہیں۔ مگر اللہ کا فرمان ہے کہ اس انداز کی خفیہ سرگوشیوں کا زیادہ حصہ ایسا ہوتا ہے جس میں کوئی خیر نہیں ہوتی۔

﴿اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ﴾ "اِلّا یہ کہ کوئی تلقین کرے صدقہ و خیرات کی' یا نیکی کی یا لوگوں کے معاملات کو درست کرنے کی۔"

خیر والی سرگوشی یہ ہو سکتی ہے کہ خاموشی سے کسی کو علیحدگی میں لے جا کر اُس کو صدقہ و خیرات کی تلقین کی جائے کہ بھائی دیکھو آپ کو اللہ نے غنی کیا ہے' فلاں شخص محتاج ہے' میں اُس کو جانتا ہوں' آپ کو اس کی مدد کرنی چاہیے' وغیرہ۔ پھر معروف اور بھلائی کے امور میں خفیہ صلاح مشورے اگر کیے جائیں تو اس میں بھی حرج نہیں۔ اسی طرح کسی غلط فہمی یا جھگڑے کی صورت میں فریقین میں صلح صفائی کرانے کی غرض سے بھی خفیہ مذاکرات کسی سازش کے زمرے میں نہیں آتے۔ مثلاً دو بھائی جھگڑ پڑے ہیں' اب آپ ایک کی بات علیحدگی میں سنیں اور دوسرے کے پاس جا کر اس بات کو بہتر انداز میں پیش کریں کہ آپ کو مغالطہ ہوا ہے' انہوں نے یہ بات یوں نہیں'

یوں کہی تھی۔ اس طرح کی علیحدہ علیحدہ گفتگو جو نیک نیتی سے کی جا رہی ہو' یہ یقیناً نیکی اور بھلائی کی بات ہے' جو باعثِ اجر و ثواب ہے۔

﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾﴾ ''اور جو شخص اس طرح (کی سرگوشی) کرے گا اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے تو عنقریب ہم اُسے دیں گے بہت بڑا اجر۔''

آیت ۱۱۵ ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى﴾ ''اور جو رسولؐ کی مخالفت پر تُل گیا' اس کے بعد کہ اُس پر ہدایت واضح ہو چکی''

یعنی جو کوئی خفیہ سازشوں اور چوری چھپے کی لگائی بجھائی کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے رسول ﷺ کے خلاف بھڑکاتا ہے کہ دیکھو جی یہ اپنے لوگوں کو نواز رہے ہیں۔ جیسا کہ غزوۂ حنین میں ہوا تھا کہ آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ کے ان مسلمانوں کو جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے' مالِ غنیمت میں سے ان کی دلجوئی کے لیے (جسے قرآن میں تالیفِ قلوب کہا گیا ہے) ذرا زیادہ مال دے دیا تو اس پر بعض لوگوں نے شور مچا دیا کہ دیکھ لیا' جب کڑا وقت تھا تو اسے ہم جھیلتے رہے' اب جب اچھا وقت آیا ہے تو اپنے رشتہ دار یاد آ گئے ہیں۔ ظاہر ہے مکہ والے حضور ﷺ کے رشتہ دار تھے' قریش کا قبیلہ حضور ﷺ کا اپنا قبیلہ تھا۔ تو طرح طرح کی باتیں جو آج کے دور میں بھی ہوتی ہیں ویسی ہی باتیں ہمیشہ ہوتی رہی ہیں۔ یہ انسان کی فطرت ہے جو ہمیشہ ایک سی رہی ہے' اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

﴿وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''اور وہ اہلِ ایمان کے راستے کے سوا کوئی دوسرا راستہ اختیار کرے''

﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ﴾ ''تو ہم بھی اس کو اُسی طرف پھیر دیتے ہیں جس طرف اُس نے خود رُخ اختیار کر لیا ہو اور ہم اسے پہنچائیں گے جہنم میں۔''

﴿وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾﴾ ''اور وہ بہت بُری جگہ ہے لوٹنے کی۔''

یہ آیت اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک اجماعِ اُمت کی سند اس آیت میں ہے۔ یہ بات تو بہت واضح ہے کہ اسلامی قوانین کے لیے بنیادی ماخذ قرآن ہے' پھر حدیث و سُنّت ہے۔ اسی طرح اجتہاد کا معاملہ بھی سمجھ میں آتا ہے' مگر اجماع کس چیز کا نام ہے؟ اس کا ذکر قرآن میں کہاں ہے؟ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اجماع کی دلیل قرآن سے تلاش کرنے کی کوشش کی اور قرآن کو شروع سے آخر تک تین سو مرتبہ پڑھا مگر مجھے اجماع کی کوئی دلیل نہیں ملی۔ پھر بالآخر تین سو ایک مرتبہ پڑھنے پر میری نظر جا کر اس آیت پر جم گئی: ﴿وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾۔ گویا اہلِ ایمان کا جو راستہ ہے' جس پر اجماع ہو گیا ہو اہلِ ایمان کا' وہ خود اپنی جگہ بہت بڑی سند ہے۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اِنَّ اُمَّتِیْ لَا تَجْتَمِعُ عَلٰی ضَلَالَۃٍ))[۸] ''میری اُمت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو گی۔''

آیات ۱۱۶ تا ۱۲۶

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا

۸۔ سنن ابن ماجہ' کتاب الفتن' باب السواد الاعظم' بروایت انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾ وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ وَ
لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ يَّتَّخِذِ
الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ يَعِدُهُمْ وَ يُمَنِّيْهِمْ ؕ وَ مَا يَعِدُهُمُ
الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَ لَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ
وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَ لَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ
الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ لَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾ وَ
مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَ لَا
يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾ وَ مَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ وَّ اتَّبَعَ مِلَّةَ
اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾ وَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ
وَ كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾ ع ۱۸ ۱۵

آیت ۱۱۶ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ ''اللہ ہرگز نہیں بخشے گا اس بات کو کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے' اور بخش دے گا اس کے سوا جس کے لیے چاہے گا۔''

یاد رہے کہ یہ الفاظ اس سورۂ مبارکہ میں قبل ازیں آیت ۴۸ میں بھی آ چکے ہیں۔

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا ۢ بَعِيْدًا ﴿۱۱۶﴾﴾ ''اور جو شرک کرتا ہے اللہ کے ساتھ وہ تو پھر گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں بھی بہت دور نکل گیا۔''

آیت ۱۱۷ ﴿اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا ۚ وَاِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ﴿۱۱۷﴾﴾ ''نہیں پکارتے یہ لوگ اللہ کے سوا مگر دیویوں کو' اور یہ نہیں پکارتے کسی کو سوائے سرکش شیطان کے۔''

یہاں اس سورت میں پہلی مرتبہ مشرکینِ مکہ کی بات بھی ہو رہی ہے۔ مشرکینِ مکہ نے اپنی دیویوں کے مؤنث نام رکھے ہوئے تھے' جیسے لات' منات' عُزّیٰ وغیرہ۔ ان پر واضح کیا جا رہا ہے اصل میں نہ لات کا کوئی وجود ہے اور نہ ہی منات کی کچھ حقیقت ہے۔ البتہ شیطان ضرور موجود ہے جو اُن کی پکار سن رہا ہے۔

آیت ۱۱۸ ﴿لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ﴾ ''اللہ نے اُس پر لعنت فرما دی ہے۔''

﴿وَقَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ﴿۱۱۸﴾﴾ ''اور اُس نے کہا (اے اللہ) میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ تو لے کر ہی چھوڑوں گا۔''

ان لوگوں کو میں اپنے ساتھ جہنم میں پہنچا کر رہوں گا۔ گویا: ع

''ہم تو ڈوبے ہیں صنم' تم کو بھی لے ڈوبیں گے!''

آیت ﴿ وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّيَنَّهُمْ ﴾ ''اور میں لازماً ان کو بہکاؤں گا اور ان کو بڑی بڑی امیدیں دلاؤں گا''

میں ان کے دلوں میں دلکش امیدوں کے چراغ روشن کروں گا۔ مثلاً یہ کہ یہ بہت تابناک کیریئر ہے' لگے رہو اسی کام میں' اس میں بڑا فائدہ ہے' ناجائز ہے تو خیر ہے' اللہ بخش ہی دے گا۔ اور یہ کہ تم تو اللہ کے پیارے رسول ﷺ کے اُمتی ہو' تمہیں کس بات کا خوف ہے؟ جیسے مَیں نے یہودیوں کو یہ زعم دلایا تھا کہ تم اللہ کے بیٹے اور اس کے بڑے چہیتے ہو' وغیرہ۔ تو ان کو میں اس طرح کی لمبی لمبی امیدوں اور لمبے لمبے منصوبوں میں اُلجھا دوں گا۔ اسی کو 'طولِ امل' کہتے ہیں۔

﴿ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ ﴾ ''اور مَیں انہیں حکم دوں گا تو (اس کی تعمیل میں) وہ چوپایوں کے کان چیر دیں گے''

اس کی تفصیل سورۃ الانعام (رکوع ۱۶) میں آئے گی کہ فلاں بُت یا فلاں دیوی کے نام پر کسی جانور کے کان چیر کر اسے آزاد کر دیا گیا ہے' اب اس کو کوئی چھیڑ نہیں سکتا' اس کا گوشت نہیں کھایا جا سکتا' اس پر سواری نہیں ہو سکتی۔

﴿ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ؕ ﴾ ''اور مَیں انہیں حکم دوں گا تو (اس کی تعمیل میں) وہ اللہ کی تخلیق میں تبدیلی کریں گے۔''

جیسے آج جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مَردوں میں عورتوں کے سے انداز اپنائے جا رہے ہیں اور عورتوں میں مَردوں کے سے طور طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں۔ لیکن اس حوالے سے سائنس کے میدان (خاص طور پر Genetics) میں جو کچھ آج ہو رہا ہے وہ تو بہت ہی نازک صورتِ حال ہے۔ سائنسی ترقی کے سبب انسان آج اس مقام پر پہنچ گیا ہے کہ وہ اپنا اختیار استعمال کر کے جینیاتی تبدیلیوں کے ذریعے سے اللہ کی تخلیق میں تغیّر و تبدّل کر رہا ہے۔

﴿ وَمَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۹﴾ ﴾ ''اور جس کسی نے بھی اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا دوست بنا لیا تو وہ بہت کھلے خسارے (اور تباہی) میں پڑ گیا۔''

آیت ﴿ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيْهِمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲۰﴾ ﴾ ''وہ (شیطان) ان سے وعدے بھی کرتا ہے اور انہیں اُمیدیں بھی دلاتا ہے' اور نہیں وعدہ کرتا ان سے شیطان مگر دھوکے کا۔''

شیطان ان کو وعدوں کے بہلاوے دیتا ہے اور آرزوؤں میں پھنساتا ہے' سبز باغ دکھاتا ہے' مگر شیطان کے سب وعدے اور دعوے سراسر فریب ہیں۔

آیت ﴿ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؗ وَلَا يَجِدُوْنَ عَنْهَا مَحِيْصًا ﴿۱۲۱﴾ ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنّم ہے' اور وہاں سے وہ فرار کی کوئی صورت نہیں پائیں گے۔''

وہاں سے بھاگنے کا انہیں کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ دوسری طرف اہلِ ایمان کی شان کیا ہوگی' اگلی آیت میں اس کی تفصیل ہے۔ دو گروہوں یا دو پہلوؤں کے درمیان فوری تقابل (simultaneous contrast) کا یہ انداز قرآن میں ہمیں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔

آیت ﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ﴾ ''اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں انہیں ہم عنقریب داخل کریں گے ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی''

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ﴾ ''ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

﴿وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ؕ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿۱۲۲﴾﴾ ''اللہ کا یہ وعدہ سچا ہے' اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنی بات میں سچا ہو سکتا ہے؟''

آیت ۱۲۳ ﴿لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ﴾ ''(اے مسلمانو!) نہ تمہاری خواہشات پر (موقوف ہے) اور نہ اہلِ کتاب کی خواہشات پر۔''

یہ تنبیہہ آ گئی کہ یہود و نصاریٰ کی طرح تم لوگ بھی بے بنیاد خواہشات اور خوش کن آرزوؤں (wishful thinkings) کے عادی ہو جاؤ گے' شفاعت کی امید پر تم بھی حرام خوریاں کرو گے' اللہ کی نافرمانیاں جیسی کچھ انہوں نے کی تھیں تم بھی کرو گے۔ لیکن جان لو کہ اللہ کا قانون اٹل ہے' بدلے گا نہیں۔ تمہاری خواہشات سے' تمہاری آرزوؤں سے اور تمہاری تمناؤں سے کچھ نہیں ہو گا۔ بالکل اسی طرح جیسے اہلِ کتاب کی خواہشات سے کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ:

﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ﴾ ''جو کوئی بُرا کام کرے گا اس کی سزا اُس کو مل کر رہے گی''

یہ بہت سخت الفاظ ہیں۔ اگرچہ اللہ کے ہاں اس قانون میں نرمی کا ایک پہلو موجود ہے' یعنی بعض اوقات بدی کے منفی اثرات کو نیکی دھو دیتی ہے' لیکن اس آیت کی رو سے برائی کا حساب تو بہرحال ہو کر رہنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان سے جس بدی کا ارتکاب ہوتا ہے وہ اس کے بارے میں جواب دہ ہے' اس کا احتساب ہو کر رہے گا۔ اگر کسی نے غلطی کی' پھر صدقِ دل سے توبہ کر لی اور اس کے سبب اس کی بدی کے اثرات جاتے بھی رہے' تب بھی معاملہ account for ضرور ہو گا۔ توبہ کو دیکھا جائے گا' کہ آیا توبہ واقعتاً سچی تھی؟ توبہ کرنے والا اپنے کیے پر نادم ہوا تھا؟ واقعی اس نے عادتِ بد کو چھوڑ دیا تھا؟ یا یہ کہ صرف زبان سے ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ'' کی گردان ہو رہی تھی اور ساتھ نافرمانی اور حرام خوری بھی جوں کی توں چل رہی تھی۔ تو احتساب کے کٹہرے میں ہر شخص اور ہر معاملے کو لایا جائے گا اور کھرا کھوٹا دیکھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔ پھر جو مجرم پایا گیا' اسے اس کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔

﴿وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۲۳﴾﴾ ''اور وہ نہیں پائے گا اپنے لیے اللہ کے مقابلے میں کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔''

آیت ۱۲۴ ﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ ''اور جو کوئی نیک عمل کرے گا' خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور ہو وہ صاحبِ ایمان''

﴿فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ﴿۱۲۴﴾﴾ ''تو یہ وہ لوگ ہیں جو جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی تل کے برابر بھی کوئی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔''

آیت ۱۲۵ ﴿وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ﴾ ''اور اُس سے بہتر دین کس کا ہو گا جس نے اپنا چہرہ (سر) اللہ کے سامنے جھکا دیا' اور (اس کے بعد) احسان (کے درجے) تک پہنچ گیا''

اللہ کی بندگی میں خوبصورتی لا کر' خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ' پورے دین کا اتباع کر کے' تفریق بین الدین سے بچ کر اور

total submission کے ذریعے سے اُس نے احسان کے درجے تک رسائی حاصل کر لی۔

﴿وَاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ﴾ ''اور اُس نے پیروی کی دینِ ابراہیمؑ کی یکسو ہو کر (یا پیروی کی اُس ابراہیمؑ کے دین کی' جو یکسو تھا)۔''

﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ﴿۱۲۵﴾﴾ ''اور اللہ نے تو ابراہیم (علیہ السلام) کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔''

آیت ۱۲۶ ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ﴿۱۲۶﴾﴾ ''اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے' اور اللہ تعالیٰ ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔''

آیات ۱۲۷ تا ۱۳۴

وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾ وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ؕ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ؕ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ؕ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۲۸﴾ وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ؕ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾ وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾ ع ۱۹ ۱۶

اب جو آیات آ رہی ہیں ان میں خطاب مسلمانوں ہی سے ہے لیکن ان کی حیثیت ''استدراک'' کی ہے۔ اس حوالے سے ان کا تعلق اس سورۃ کی ابتدائی آیات کے ساتھ ہے جن میں خواتین کے مسائل کے بارے میں کچھ احکام نازل ہوئے تھے' اور یتیم بچیوں سے نکاح کے بارے میں بھی کچھ معاملات زیر بحث آئے تھے۔ ان میں سے کچھ نکات لوگوں کے لیے وضاحت طلب تھے' لہٰذا ایسے نکات کے بارے میں لوگوں نے حضور ﷺ سے کچھ وضاحتیں طلب کیں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ وضاحتیں نازل کی ہیں۔

آیت ۱۲۷ ﴿وَيَسْتَفْتُوْنَكَ فِي النِّسَآءِ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔''

﴿قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِيْهِنَّ ۙ﴾ ''کہہ دیجیے کہ اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے (وضاحت کرتا ہے) ان کے بارے میں''
﴿وَمَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِيْ يَتٰمَى النِّسَآءِ﴾ ''اور جو تمہیں (پہلے سے) سنایا جا رہا ہے کتاب میں یتیم لڑکیوں کے بارے میں''

یہ اسی سورۃ کی آیت ۳ کی طرف اشارہ ہے۔ اب آیت زیر نظر کے ساتھ مل کر اُس آیت کی تشریح بھی بالکل واضح ہو گئی اور ثابت ہو گیا کہ وہاں جو فرمایا گیا تھا ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى﴾ تو اس سے اصل مراد ''يَتٰمَى النِّسَاءِ'' تھا۔ یعنی اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیم لڑکیوں سے شادی کرو گے تو ان کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے (اس لیے کہ ان کی طرف سے کوئی نہیں جو ان کے حقوق کا پاسدار ہو اور تم سے باز پرس کر سکے) تو پھر ان سے شادی مت کرو بلکہ دوسری عورتوں سے شادی کر لو۔ اگر ایک سے زائد نکاح کرنا چاہتے ہو تو اپنی پسند کی دوسری عورتوں سے' دو دو' تین تین یا چار چار سے کر لو ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ﴾۔ مگر ایسی بے سہارا یتیم لڑکیوں سے نکاح نہ کرو' کیونکہ:

﴿الّٰتِيْ لَا تُؤْتُوْنَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ﴾ ''جن کو تم دیتے نہیں ہو جو اللہ نے اُن کے لیے لکھ دیا ہے اور چاہتے ہو کہ اِن سے نکاح بھی کرو''
تم انہیں یتیم سمجھ کر مہر ادا کیے بغیر ان سے نکاح کرنے کے خواہش مند رہتے ہو۔
﴿وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ﴾ ''اور (اسی طرح) وہ بچے جو کمزور ہیں (جن پر ظلم ہوتا ہے)''
﴿وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ﴾ ''اور یہ (ہم نے تمہیں اتنے تفصیلی احکام دیے ہیں) کہ یتیموں کے معاملے میں انصاف پر کاربند رہو۔''

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِهٖ عَلِيْمًا ﴿۱۲۷﴾﴾ ''اور جو بھلائی بھی تم کرو گے اللہ اس سے واقف ہے۔''
وہ تمہاری نیتوں کو جانتا ہے۔ اُس نے شریعت کے احکام نازل کر دیے ہیں' بنیادی ہدایات تمہیں دے دی گئی ہیں۔ اب اضافی چیز تو بس یہی ہے کہ تمہاری نیت صاف ہونی چاہیے۔ کیونکہ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۲۰) یعنی اللہ جانتا ہے کہ کون حقیقت میں شرارتی ہے اور کس کی نیت صحیح ہے۔

آیت ۱۲۸ ﴿وَاِنِ امْرَاَةٌ خَافَتْ مِنْۢ بَعْلِهَا نُشُوْزًا اَوْ اِعْرَاضًا﴾ ''اور اگر کسی عورت کو اندیشہ ہو اپنے شوہر سے زیادتی یا بے رُخی کا''

ایک ''نشوز'' تو وہ تھا جس کا تذکرہ اسی سورۃ کی آیت ۳۴ میں عورت کے حوالے سے ہوا تھا: ﴿وَالّٰتِيْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ﴾ ''اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو''۔ یعنی وہ عورتیں جو اپنے خاوندوں سے سرکشی کرتی ہیں' ان کی اطاعت نہیں کرتیں اور اپنی ضد پر اڑی رہتی ہیں۔ اب یہاں ذکر ہے اُس ''نشوز'' کا جس کا اظہار خاوند کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ یعنی یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ خاوند اپنی بیوی پر ظلم کر رہا ہو' اس کے حقوق ادا کرنے میں پہلوتہی کر رہا ہو' اپنی ''قوامیت'' کے حق کو غلط طریقے سے استعمال کر رہا ہو' اس پر بے جا رُعب ڈالتا ہو' اسے بلاوجہ ستاتا ہو اور تنگ کر کے مہر معاف کروانا چاہتا ہو' یا اگر بیوی کے والدین اچھے کھاتے پیتے ہوں تو ہو سکتا ہے خاوند اسے بلیک میل کر کے اس کے والدین سے دولت ہتھیانا چاہتا ہو۔ یہ ساری خباثتیں ہمارے معاشرے میں موجود ہیں اور

عورتیں بیچاری ظلم وستم کی اس چکی میں پستی رہتی ہیں۔ آیت زیر نظر میں اس مسئلے کی وضاحت کی گئی ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے اندیشہ ہو جائے کہ وہ زیادتی کرے گا' یا اگر شوہر زیادتی کر رہا ہو اور وہ بیوی کے حقوق ادا نہ کر رہا ہو' یا اس کی طرف میلان ہی نہ رکھتا ہو' کوئی نئی شادی رچالی ہو اور اب ساری توجہ نئی دلہن کی طرف ہو۔

﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۭ﴾ ''تو ان دونوں پر کوئی الزام نہیں ہوگا کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔''

یہاں صلح سے مراد یہ ہے کہ سارے معاملات باہم طے کر کے عورت خلع لے لے۔ لیکن خلع لینے میں' جیسا کہ سورۃ البقرۃ' آیت ۲۲۹ میں ہم پڑھ چکے ہیں' عورت کو مہر چھوڑنا پڑے گا' اور اگر لیا تھا تو کچھ واپس کرنا پڑے گا۔

﴿وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۭ وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ۭ﴾ ''اور صلح بہر حال بہتر ہے۔ البتہ انسانی نفس پر لالچ مسلط رہتا ہے۔'' مرد چاہے گا کہ میرا پورا مہر واپس کیا جائے جبکہ عورت چاہے گی کہ مجھے کچھ بھی واپس نہ کرنا پڑے۔ یہ مضامین سورۃ البقرۃ میں بیان ہو چکے ہیں۔

﴿وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۝﴾ ''اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو جان لو کہ اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔''

تم مرد ہو' مردانگی کا ثبوت دو' اس معاملے میں اپنے اندر نرمی پیدا کرو' بیوی کا حق فراخ دلی سے ادا کرو۔

آیت ۱۲۹ ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَاۗءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ﴾ ''اور تمہارے لیے ممکن ہی نہیں کہ تم عورتوں کے درمیان پورا پورا انصاف کر سکو' چاہے تم اس کے لیے کتنے ہی حریص ہو''

سورۃ کے آغاز (آیت ۳) میں فرمایا گیا تھا: ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ﴾ یعنی اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم اپنی بیویوں میں (اگر ایک سے زائد ہیں) عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک پر ہی اکتفا کرو' دوسری شادی مت کرو۔ اگر تمہیں کلی طور پر اطمینان ہے اپنے اوپر اعتماد ہے کہ تم عدل کر سکتے ہو تب دوسری شادی کرو' ورنہ نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کچھ چیزیں تو گنتی اور ناپ تول کی ہوتی ہیں' ان میں تو عدل کرنا ممکن ہے' لیکن جو قلبی میلان ہے یہ تو انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ حضور ﷺ نے اپنی تمام ازواج کے لیے ہر چیز گن گن کر طے کی ہوئی تھی۔ شب بسری کے لیے سب کی باریاں مقرر تھیں۔ دن میں بھی آپؐ ہر گھر میں چکر لگاتے تھے۔ عصر اور مغرب کے درمیان تھوڑی تھوڑی دیر ہر زوجہ محترمہ کے پاس ٹھہرتے تھے۔ اگر کہیں زیادہ دیر ہو جاتی تو گویا کھلبلی مچ جاتی تھی کہ آج وہاں زیادہ دیر کیوں ٹھہر گئے؟ یہ چیزیں انسانی معاشرے میں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا آپس کا معاملہ بہت اچھا تھا' لیکن سوکناپے کے اثرات کچھ نہ کچھ تو ہوتے ہیں' یہ عورت کی فطرت ہے' جو اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ تو اس لیے فرمایا کہ مکمل انصاف کرنا تمہارے بس میں نہیں۔ اس سے مراد دراصل قلبی میلان ہے۔ اس کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ میں نے ظاہری چیزوں میں پورا پورا عدل کیا ہے' باقی جہاں تک میرے دل کے میلان کا تعلق ہے تو مجھے امید ہے کہ اس بارے میں تُو مجھ سے مؤاخذہ نہیں کرے گا۔ اسی لیے یہاں فرمایا گیا کہ تم چاہو بھی تو عدل نہیں کر سکتے۔

﴿فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ۭ﴾ ''تو ایسا نہ ہو کہ تم ایک ہی کی طرف پورے کے پورے جھک جاؤ کہ دوسری بیوی کو معلق کر کے چھوڑ دو۔''

دوسری بیوی اس طرح معلّق ہو کر نہ رہ جائے کہ اب وہ نہ شوہر والی ہے اور نہ آزاد ہے۔ اس سے خاوند کا گویا کوئی تعلق ہی نہیں رہا۔

﴿وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۲۹﴾﴾ ''اور اگر تم اصلاح کر لو اور تقویٰ کی روش اختیار کرو تو اللہ تعالیٰ بھی غفور اور رحیم ہے۔''

اب اگلی آیت میں طلاق کے معاملے میں ایک اہم نکتہ بیان ہو رہا ہے۔ طلاق یقیناً ایک نہایت سنجیدہ مسئلہ ہے' اس لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى الطَّلَاقُ)) [۹] ''حلال چیزوں میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے''۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اس کو بسا اوقات کفر تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ لڑائیاں ہو رہی ہیں' مقدمات چل رہے ہیں' مزاجوں میں موافقت نہیں ہے' ایک دوسرے کو کوس رہے ہیں' دن رات کا جھگڑا ہے' لیکن طلاق نہیں دیتے۔ یہ طرزِ عمل نہایت احمقانہ ہے اور شریعت کی منشاء کے بھی خلاف ہے۔ لہٰذا اس آیت میں آپ دیکھیں گے کہ ایک طرح سے طلاق کی ترغیب دی گئی ہے۔

آیت ۱۳۰ ﴿وَاِنْ يَّتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ﴾ ''اور اگر وہ (میاں بیوی) دونوں علیحدہ ہو جائیں گے تو اللہ ان کو اپنی کشادگی سے غنی کر دے گا۔''

ہو سکتا ہے کہ اس عورت کو بھی کوئی بہتر رشتہ مل جائے جو اس کے ساتھ مزاجی موافقت رکھنے والا ہو اور اس مرد کو بھی اللہ تعالیٰ کوئی بہتر بیوی دے دے۔ میاں بیوی کا ہر وقت لڑتے رہنا' دنگا فساد کرنا اور عدمِ موافقت کے باوجود طلاق کا اختیار (option) استعمال نہ کرنا' یہ سوچ ہمارے ہاں دراصل ہندو معاشرت اور عیسائیت کے اثرات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ ہندومت کی طرح عیسائیت میں بھی طلاق حرام ہے۔ دراصل انجیل میں تو شریعت اور قانون ہے ہی نہیں' صرف اخلاقی تعلیمات ہیں۔ چنانچہ جس طرح نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ)) ایسی ہی کوئی بات حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی فرمائی تھی تاکہ کوئی شخص بلاوجہ اپنی بیوی کو طلاق نہ دے۔ ظاہر ہے معاشرے میں طلاق کے منفی اثرات مرتب ہونے کا اندیشہ تو ہوتا ہے۔ طلاق شدہ عورت کی دوسری شادی نہ ہونے کی صورت میں اس کے آوارہ ہو جانے کا امکان بھی ہے اور اگر ایسا ہوا تو اس کا وبال اسے بلاوجہ طلاق دینے والے کے سر ہی جائے گا۔ بہرحال حضرت مسیح کا ایسا فرمان محض ایک اخلاقی نصیحت تھی' کوئی قانونی شق نہیں تھی۔ عیسائیت کا قانون تو وہی ہے جو تورات کے اندر ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کا فرمان بھی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت تم پر بدستور نافذ رہے گی' میں اس قانون کو ختم کرنے نہیں آیا۔ قانون بہرحال قانون ہے' اخلاقی ہدایات کو قانون کا درجہ تو نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن عیسائیت میں اس طرح کی اخلاقی تعلیمات کو قانون بنا دیا گیا' جس کی وجہ سے بلاجواز پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ چنانچہ ان کے ہاں کوئی شخص اپنی بیوی کو اُس وقت تک طلاق نہیں دے سکتا جب تک اس پر بدکاری کا جرم ثابت نہ ہو جائے۔ لہٰذا وہ لوگ طلاق دینے کے لیے طرح طرح کے طریقے استعمال کر کے بیوی کو پہلے بدکردار بناتے ہیں' پھر اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں' تب جا کر اس سے جان چھڑاتے ہیں۔ تو جب شریعت کے درست اور آسان راستے چھوڑ دیے جاتے ہیں تو پھر اسی طرح غلط اور مشکل راستے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں عدمِ موافقت کی صورت میں طلاق کے بارے میں ایک طرح کی ترغیب نظر آتی ہے۔

۹۔ سنن ابی داؤد' کتاب الطلاق' باب فی کراھیۃ الطلاق۔ وسنن ابن ماجہ' کتاب الطلاق' باب حدثنا سوید بن سعید۔ راوی: عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيْمًا ﴿۱۳۰﴾﴾ ''اور اللہ بڑی وسعت رکھنے والا' حکمت والا ہے۔''

اللہ کے خزانے بڑے وسیع ہیں اور اُس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔

آیت ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔''

﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ﴾ ''اور (دیکھو مسلمانو!) تم سے پہلے جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی انہیں بھی ہم نے وصیت کی تھی اور اب تمہیں بھی یہی وصیت ہے کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔''

احکامِ شریعت کی تعمیل کے سلسلے میں اصل جذبہ محرکہ تقویٰ ہے۔ تقویٰ کے بغیر شریعت بھی مذاق بن جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کے ایک خطبہ کے یہ الفاظ بہت مشہور ہیں اور خطباتِ جمعہ میں بھی اکثر انہیں شامل کیا جاتا ہے: ((اُوْصِيْكُمْ وَنَفْسِيْ بِتَقْوَى اللّٰهِ))(۱۰) ''مسلمانو! میں تمہیں بھی اور اپنے نفس کو بھی اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی وصیت کرتا ہوں''۔ قرآن حکیم میں جابجا اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ یہاں بھی تقویٰ کا حکم انتہائی تاکید کے ساتھ دیا جا رہا ہے۔

﴿وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا حَمِيْدًا ﴿۱۳۱﴾﴾ ''اور اگر تم نہ مانو گے تو (یاد رکھو کہ) جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ ہی کا ہے' اور اللہ تعالیٰ تو خود غنی ہے' وہ اپنی ذات میں خود ستودہ صفات ہے۔''

آیت ﴿وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۳۲﴾﴾ ''اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے' اور اللہ کافی ہے کارساز ہونے کے اعتبار سے۔''

اگر میاں بیوی میں واقعی نباہ نہیں ہو رہا تو بے شک وہ علیحدگی اختیار کر لیں' دونوں کا کارساز اللہ ہے۔ عورت بھی یہ سمجھے کہ اگر میں اس شوہر سے تعلق منقطع کر لوں گی تو اللہ کارساز ہے' وہ میرے لیے کوئی اور راستہ پیدا کر دے گا۔ اور اسی طرح کی سوچ مرد کی بھی ہونی چاہیے۔ اس کے برعکس یہ سوچ انتہائی احمقانہ اور خلافِ شریعت ہے کہ ہر صورت میں عورت سے نباہ کرنا ہے' چاہے اللہ سے بغاوت ہی کیوں نہ ہو جائے۔ لہٰذا ہر چیز کو اُس کے مقام پر رکھنا چاہیے۔

آیت ﴿اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ بِاٰخَرِيْنَ ؕ﴾ ''اے لوگو! وہ چاہے تو تم سب کو لے جائے اور دوسرے لوگوں کو لے آئے۔''

اللہ کے مقابلے میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ اُس کے سامنے تم سب نفسِ واحد کی طرح ہو' اللہ تعالیٰ جب چاہے تم سب کو نسیاً منسیاً کر دے اور تمہاری جگہ نئے لوگوں کو پیدا کر دے۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى ذٰلِكَ قَدِيْرًا ﴿۱۳۳﴾﴾ ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے۔''

آیت ﴿مَنْ كَانَ يُرِيْدُ ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؕ﴾ ''جو کوئی بھی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اللہ کے پاس ہے ثواب دنیا کا بھی اور آخرت کا بھی۔''

۱۰۔ یہ الفاظ اگرچہ مشہور ہیں لیکن دستیاب کُتبِ احادیث میں ان کا حوالہ نہیں مل سکا۔ البتہ ((اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ)) کے الفاظ رسول اللہ ﷺ کے خطبات میں بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً: سنن الترمذی' کتاب العلم' باب ما جاء فی الاخذ بالسنة واجتناب البدع۔ و سنن ابی داؤد' کتاب السنة' باب فی لزوم السنة۔ (مرتب)

جو شخص اپنی ساری بھاگ دوڑ اور دن رات کی محنت دنیا کمانے' دولت اور جائیداد بڑھانے' عہدوں میں ترقی پانے اور مادی طور پر پھلنے پھولنے میں لگا رہا ہے' اور اس وجہ سے اللہ کے احکام اور حقوق کو نظر انداز کر رہا ہے' اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس تو دنیا کے خزانے بھی ہیں اور آخرت کے بھی۔ اور یہ کہ وہ صرف دنیاوی چیزوں کی خواہش کر کے گویا سمندر سے قطرہ حاصل کرنے پر اکتفا کر رہا ہے۔ بقولِ علامہ اقبالؔ ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے!

لہٰذا اللہ سے دنیا بھی مانگو اور آخرت بھی۔ اور اس طرح مانگو جس طرح اُس نے مانگنے کا طریقہ بتایا ہے: ﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾﴾ (البقرۃ) ''پروردگار! ہمیں اس دنیا میں بھی خیر عطا فرما اور آخرت میں بھی خیر عطا فرما اور ہمیں بچا لے آگ کے عذاب سے''۔ تم لوگ اللہ کے ساتھ اپنے معاملات کو درست کرو' اُس کے ساتھ اپنا تعلق خلوص و اخلاص کی بنیادوں پر استوار کرو' اُس کی طرف سے جو ذمہ داریاں ہیں ان کو ادا کرو' پھر اللہ تعالیٰ یقیناً دنیا میں بھی تمہیں نوازے گا اور آخرت میں بھی۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ﴿۱۳۴﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔''

آیات ۱۳۵ تا ۱۴۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾ بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَۨا ﴿۱۳۸﴾ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴿۱۳۹﴾ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ۚ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَۨا ﴿۱۴۰﴾ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۷

آیت ۱۳۵ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ ''اے اہلِ ایمان' کھڑے ہو جاؤ پوری قوت

کے ساتھ عدل کو قائم کرنے کے لیے اللہ کے گواہ بن کر‘‘

یہ آیت قرآن کریم کی عظیم ترین آیات میں سے ہے۔ سورۂ آل عمران (آیت ۱۸) میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ﴾ ’’اللہ گواہ ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں‘ اور سارے فرشتے اور اہلِ علم بھی اس پر گواہ ہیں‘ وہ عدل کا قائم کرنے والا ہے‘‘۔ اللہ تعالیٰ اس زمین پر عدل قائم کرنا چاہتا ہے‘ اس کے لیے وہ اپنے دین کا غلبہ چاہتا ہے‘ اور اس عظیم کام کے لیے اُس کے کارندے اور سپاہی اہلِ ایمان ہی ہیں۔ انہی کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اس دنیا میں عدل قائم کرے گا۔ لیکن اہلِ ایمان کو اس عظیم مقصد کے لیے کوشش کرنی ہوگی‘ جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہوگا‘ ایثار کرنا ہوگا‘ قربانیاں دینی ہوں گی‘ تب جا کر کہیں دین غالب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ بہت ہی اہم معاملہ ہے۔ معاشرے میں عدل وقسط کے قیام کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ اس کے لیے جدوجہد کرنے والوں کو ’’اللہ کے گواہ‘‘ کہا گیا ہے۔ عدلِ اجتماعی (Social Justice) پر اسلام نے جتنا زور دیا ہے بدقسمتی سے آج ہمارا مذہبی طبقہ اتنا ہی اس سے بے بہرہ ہے۔ آج کے مسلم معاشروں میں سرے سے شعور ہی نہیں کہ عدلِ اجتماعی کی بھی کوئی اہمیت اسلام میں ہے۔ اسلامی قوانین اور حدود وتعزیرات کے نفاذ کی اہمیت تو سب جانتے ہیں‘ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ باطل نظام کی ناانصافیاں کیسے ختم ہوں گی؟ اس جاگیر دارانہ ظلم وستم اور غریبوں کے استحصال (exploitation) کی بیخ کنی کس طرح ہوگی؟ سرمایہ دار غریبوں کا خون چوس چوس کر روز بروز موٹے ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ نظام ایک ایسی چکی ہے جو آٹا پیس پیس کر ایک ہی طرف ڈالتی جا رہی ہے‘ جبکہ دوسری طرف محرومی ہی محرومی ہے۔ یہاں دولت کی تقسیم کا نظام ہی غلط ہے‘ ایک طرف وسائل کی ریل پیل ہے تو دوسری طرف بھوک ہی بھوک۔ ایک طرف امیر امیر تر ہو رہے ہیں تو دوسری طرف غریب غریب تر‘ اور غربت تو ایسی لعنت ہے جو انسان کو کفر تک پہنچا دیتی ہے‘ از روئے حدیثِ نبویؐ: ((كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا)) [11] ’’قریب ہے کہ فقر کفر بن جائے‘‘۔ لہٰذا سب سے پہلے وہ نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے جس میں عدل ہو‘ انصاف ہو‘ جس میں ضمانت دی گئی ہو کہ ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت ہوگی۔ کفالتِ عامہ کی یہ ضمانت نظامِ خلافت میں دی جاتی ہے۔ جب نظام درست ہو جائے تو پھر حدود وتعزیرات کا نفاذ ہو۔ پھر جو کوئی چوری کرے اس کا ہاتھ کاٹا جائے۔ لیکن موجودہ حالات میں اگر اسلامی قوانین نافذ ہوں گے تو ان کا فائدہ الٹا لٹیروں اور حرام خوروں کو ہوگا‘ بلیک مارکیٹنگ کرنے والے ان سے مستفید ہوں گے۔ جنہوں نے حرام خوری سے دولت جمع کر رکھی ہے‘ وہ خوب پاؤں پھیلا کر سوئیں گے۔ چور کا ہاتھ کٹے گا تو انہیں چوری کا ڈر رہے گا نہ ڈاکے کا۔ تو اصل کام نظام کا بدلنا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ (معاذ اللہ) شریعت نافذ نہ کی جائے‘ بلکہ مقصد یہ ہے کہ شریعت نافذ کرنے سے پہلے نظام (system) کو بدلا جائے‘ دین کا نظام قائم کیا جائے اور پھر اس نظام کو قائم رکھنے کے لیے‘ اس کو مستحکم اور مضبوط کرنے کے لیے‘ اسے مستقل طور پر چلانے کے لیے قانون نافذ کیا جائے۔ کیونکہ قانون ہی کسی نظام کے استحکام کا ذریعہ بنتا ہے‘ قانون کے صحیح نفاذ سے ہی کوئی نظام مضبوط ہوتا ہے۔

یہی مضمون آگے چل کر سورۃ المائدہ (آیت ۸) میں بھی آئے گا‘ لیکن وہاں اس کی ترتیب بدل گئی ہے۔ وہاں ترتیب اس طرح ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫﴾۔ اس ترتیب کے بدلنے میں ایک اشارہ یہ بھی ہے کہ اللہ اور

۱۱۔ رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح‘ کتاب الآداب‘ باب ماینھی عنہ من التھاجر والتقاطع واتباع العورات۔ راوی: انس بن مالک رضی اللہ عنہ۔

عدل وقسط گویا مترادف الفاظ ہیں۔ایک جگہ حکم ہے ''گواہ بن جاؤ اللہ کے'' اور دوسری جگہ فرمایا: ''گواہ بن جاؤ قسط کے''۔ایک جگہ فرمایا: ''کھڑے ہوجاؤ قسط (عدل وانصاف) کے لیے'' جبکہ دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ ''کھڑے ہوجاؤ اللہ کے لیے''۔معلوم ہوا کہ اللہ اور قسط کے الفاظ جو ایک دوسرے کی جگہ آئے ہیں' آپس میں مترادف ہیں۔

﴿وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ﴾ ''خواہ یہ (انصاف کی بات اور شہادت) تمہارے اپنے خلاف ہو یا تمہارے والدین کے یا تمہارے قرابت داروں کے۔''

ایک مؤمن کا تعلق عدل وانصاف اور قسط کے ساتھ ہونا چاہیے' رشتہ داری کے ساتھ نہیں۔یہاں پر حرفِ جار کے بدلنے سے معانی میں ہونے والی تبدیلی مدِنظر رہے۔شہادۃ علی کا مطلب ہے لوگوں پر گواہی' اُن کے خلاف گواہی' جبکہ شہادۃ للہ کا مطلب ہے اللہ کے لیے گواہی' لہٰذا شُھَدَآءَ لِلّٰہ کے معنی ہیں اللہ کے گواہ۔

﴿اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ﴾ ''چاہے وہ شخص غنی ہے یا فقیر' اللہ ہی دونوں کا پشت پناہ ہے۔''

ہر کسی کا رازق اور کفیل اللہ تعالیٰ ہے' تم کسی کے کفیل اور ذمہ دار نہیں ہو۔تمہیں تو وہ فیصلہ کرنا ہے جو عدل وانصاف پر مبنی ہو۔ تمہیں کسی کی جانب داری نہیں کرنی' نہ ماں باپ کی' نہ بھائی کی' نہ خود اپنی اور نہ کسی غریب ومسکین کی۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا کے الفاظ نے یہاں جانبدارانہ فیصلوں کا یہ چور دروازہ بھی بند کر دیا ہے کہ اُس کا حق تو نہیں بنتا' لیکن یہ غریب ہے' لہٰذا اس کے حق میں فیصلہ کر دیا جائے۔فرمایا کہ فریقِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب' تمہیں اس کی جانب داری نہیں کرنی۔یہ حکم ہمیں واضح طور پر ہمارا فرض یاد دلاتا ہے کہ ہم سب اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہوجائیں۔ہر حق بات جو اللہ کی طرف سے ہو اس کے علمبردار بن جائیں اور اس حق کو قائم کرنے کے لیے تن' من اور دھن کی قربانی دینے کے لیے اپنی کمر کس لیں۔

﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿۱۳۵﴾﴾ ''تو تم خواہشات کی پیروی نہ کرو' مبادا کہ تم عدل سے ہٹ جاؤ۔اگر تم زبانوں کو مروڑو گے یا اعراض کرو گے تو (یاد رکھو کہ) اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے پوری طرح باخبر ہے۔''

یعنی اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا حق گوئی سے پہلوتہی کی تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ کو اس کی پوری پوری خبر ہے۔ ''تَلْوٗا'' کا صحیح مفہوم آج کی زبان میں ہوگا chewing the words۔یعنی اس طریقے سے زبان کو حرکت دینا کہ بات کہنا بھی چاہتے ہیں لیکن کہہ بھی نہیں پا رہے ہیں' حق بات زبان سے نکالنا نہیں چاہتے' غلط بات نکل نہیں رہی ہے۔یا پھر ویسے ہی حق بات کہنے والی صورتِ حال کا سامنا کرنے سے کنی کترا رہے ہیں' موقع سے ہی بچ نکلنا چاہتے ہیں۔لیکن یاد رکھو کہ ایسی کسی کوشش سے انسانوں کو تو دھوکہ دیا جاسکتا ہے مگر اللہ تو تمہاری ہر سوچ' ہر نیت اور ہر حرکت سے باخبر ہے۔

اس کے بعد جو مضمون آرہا ہے وہ شاید اس سورۂ مبارکہ کا اہم ترین مضمون ہے۔

آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ﴾ ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر' اُس کے رسولؐ پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے نازل فرمائی اپنے رسولؐ پر اور اُس کتاب پر جو اُس نے پہلے نازل فرمائی۔''

ایمان والوں سے یہ کہنا کہ ایمان لاؤ' بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔''اے ایمان والو' ایمان لاؤ!'' چہ معنی دارد؟ اس کا مطلب ہے

کہ اقرار باللسان والا ایمان تو تمہیں موروثی طور پر حاصل ہو چکا ہے۔ مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہو گئے تو وراثت میں ایمان بھی مل گیا' یا یہ کہ جب پورا قبیلہ اسلام لے آیا تو اس میں پکے مسلمانوں کے ساتھ کچھ کچے مسلمان بھی شامل ہو گئے۔ زبان سے تو سب نے "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" پڑھ لیا۔ اس طرح اقرار باللسان کے درجے میں تو ایمان سب کو حاصل ہو گیا۔ لیکن واضح رہے کہ یہ ایمان کا محض قانونی درجہ ہے۔ پیچھے اسی سورۃ (آیت ۹۴) میں ہم پڑھ آئے ہیں کہ اگر کوئی شخص راستے میں ملے اور وہ اپنا اسلام ظاہر کرے تو تم اُس کے ایمان کو جھٹلا نہیں سکتے' کیونکہ جس نے زبان سے کلمہ شہادت ادا کر لیا تو قانونی طور پر وہ مؤمن ہے۔ لیکن کیا حقیقی ایمان یہی ہے؟ نہیں' بلکہ حقیقی ایمان تو یقین قلبی کا نام ہے۔ اس لیے فرمایا: ''اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر.....'' اس نکتے کو سمجھنے کے لیے ہم اِس آیت کا ترجمہ اس طرح کریں گے کہ ''اے اہلِ ایمان! ایمان لاؤ اللہ پر جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے' مانو اللہ کے رسول ﷺ کو جیسا کہ ماننے کا حق ہے.....'' اور یہ حق اُسی وقت ادا ہو گا جب اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان دل میں گھر کر گیا ہو۔ جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں سورۃ الحجرات (آیت ۷) میں فرمایا گیا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''اللہ نے ایمان کو تمہارے نزدیک محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے''۔ آگے چل کر اسی سورۃ (آیت ۱۴) میں کچھ لوگوں کے بارے میں یوں فرمایا: ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''یہ بدو لوگ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ اے نبی (ﷺ) ان سے کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' ہاں یوں کہہ سکتے ہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں' لیکن ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔ چنانچہ اصل ایمان وہ ہے جو دل میں داخل ہو جائے۔ یہ درجہ تصدیق بالقلب کا ہے۔ یاد رہے کہ آیت زیر مطالعہ میں دراصل روئے سخن منافقین کی طرف ہے' جو زبانی ایمان تو لائے تھے لیکن اس کے ساتھ دل کی تصدیق شامل نہیں تھی۔ (عربی زبان سے واقفیت رکھنے والے حضرات یہ نکتہ بھی نوٹ کریں کہ قرآن کے لیے اس آیت میں لفظ نَزَّلَ اور تورات کے لیے اَنْزَلَ استعمال ہوا ہے۔)

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۳۶﴾﴾ ''اور جو کوئی کفر (انکار) کرے گا اللہ کا' اُس کے فرشتوں کا' اُس کی کتابوں کا' اُس کے رسولوں کا اور قیامت کے دن کا' تو وہ گمراہ ہو گیا اور گمراہی میں بہت دُور نکل گیا۔''

آیت ۱۳۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا﴾ ''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے' پھر کفر کیا' پھر ایمان لائے' پھر کفر کیا' پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے''

یہاں کفر سے مراد کفر حقیقی' کفر معنوی یا کفر باطنی یعنی نفاق ہے' قانونی کفر نہیں۔ کیونکہ منافقین کے ہاں کفر و ایمان کے درمیان جو بھی کشمکش اور کھینچا تانی ہو رہی تھی' وہ اندر ہی اندر ہو رہی تھی' لیکن ظاہری طور پر ان لوگوں نے اسلام کا انکار نہیں کیا تھا۔

﴿لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ﴿۱۳۷﴾﴾ ''تو اللہ نہ ان کی مغفرت کرنے والا ہے اور نہ وہ انہیں راہِ راست دکھائے گا۔''

واضح رہے کہ منافقت کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ایک ہی دن میں کوئی شخص منافق ہو گیا ہو۔ منافقین میں ایک تو شعوری منافق تھے' جو باقاعدہ ایک فیصلہ کر کے اپنی حکمتِ عملی اختیار کرتے تھے' جیسے ہم سورۂ آل عمران (آیت ۷۲) میں ان کی پالیسی کے بارے میں

پڑھ آئے ہیں کہ صبح ایمان کا اعلان کریں گے' شام کو پھر کافر ہو جائیں گے' مرتد ہو جائیں گے۔ تو معلوم ہوا کہ ایمان انہیں نصیب ہوا ہی نہیں اور انہیں بھی معلوم تھا کہ وہ مؤمن نہیں ہیں۔ وہ دل سے جانتے تھے کہ ہم ایمان لائے ہی نہیں ہیں' ہم تو مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ یہ شعوری منافقت ہے۔

اس کے برعکس کچھ لوگ غیر شعوری منافق تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اسلام قبول تو کیا تھا' ان کے دل میں دھوکہ دینے کی نیت بھی نہیں تھی' لیکن انہیں اصل صورتِ حال کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پھولوں کی سیج ہے' لیکن ان کی توقعات کے بالکل برعکس وہ نکلا کانٹوں والا بستر۔ اب انہیں قدم قدم پر رکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ارادے میں چونکہ پختگی اور ایمان میں گہرائی نہیں تھی' لہٰذا ان کا معاملہ ''ہر چہ باداباد'' والا نہیں تھا۔ ایسے لوگوں کا حال ہم سورۃ البقرۃ کے آغاز (آیت ۲۰) میں پڑھ آئے ہیں کہ کچھ روشنی ہوئی تو ذرا چل پڑے' اندھیرا ہوا تو کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ حالات بہتر ہوئے تو کچھ ہمت کی' دو چار قدم چلے' پھر حالات ناموافق دیکھ کر ٹھٹک گئے' رک گئے' پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ لوگ ان کو ملامت کرتے کہ یہ تم کیا کرتے ہو؟ چنانچہ ملامت سے بچنے کے لیے وہ جھوٹے بہانے بنانے لگے' اور پھر جب یہ مرض مزید بڑھا تو جھوٹی قسمیں کھانی شروع کر دیں' کہ خدا کی قسم یہ مجبوری تھی' اس لیے میں رُک گیا تھا' ایسا تو نہیں کہ میں جہاد میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری بیوی مر رہی تھی' اُسے چھوڑ کر میں کیسے جا سکتا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی جھوٹی قسمیں کھانا ایسے منافقین کا آخری درجے کا حربہ ہوتا ہے۔ تو ایمان اور کفر کا یہ معاملہ ان کے ہاں یوں ہی چلتا رہتا ہے' اگرچہ اوپر ایمان باللسان کا پردہ موجود رہتا ہے۔ جب کوئی شخص ایمان لے آیا اور اُس نے ارتداد کا اعلان بھی نہیں کیا تو قانونی طور پر تو وہ مسلمان ہی رہتا ہے' لیکن جہاں تک ایمان بالقلب کا تعلق ہے تو وہ ''مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ'' کی کیفیت میں ہوتا ہے اور اس کے اندر ہر وقت تذبذب اور اہتزاز (oscillation) کی کیفیت رہتی ہے کہ ابھی ایمان کی طرف آیا' پھر کفر کی طرف گیا' پھر ایمان کی طرف آیا' پھر کفر کی طرف گیا۔ اس کی مثال بعینہٖ اُس شخص کی سی ہے جو دریا یا تالاب کے گہرے پانی میں ڈوبتے ہوئے کبھی نیچے جاتا ہے' پھر ہاتھ پاؤں مارتا ہے تو ایک لمحے کے لیے اوپر آ جاتا ہے مگر اوپر ٹھہر نہیں سکتا اور فوراً نیچے چلا جاتا ہے۔ بالآخر نیچے جا کر اوپر نہیں آتا اور ڈوب جاتا ہے۔ بالکل یہی نقشہ ہے جو اس آیت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اگلی آیت میں کھول کر بیان کر دیا گیا ہے کہ یہ کن لوگوں کا تذکرہ ہے۔

آیت ۱۳۸ ﴿بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ۝۱۳۸﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان منافقوں کو بشارت دے دیجیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

یعنی واضح طور پر فرما دیا گیا کہ یہ لوگ منافق ہیں اور ان کو عذاب کی بشارت بھی دے دی گئی۔ یہ عذاب کی بشارت دینا طنزیہ انداز ہے۔

یہاں پر قبولِ حق کے دعویداروں کو یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جو لوگ دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے ہیں' اللہ کو اپنا ربّ مانتے ہیں' اُن کے لیے یہاں پھولوں کی سیج نہیں ہے' اس لیے جو شخص اس گروہ میں شامل ہونا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ یکسو ہو کر آئے' دل میں تحفظات (reservations) رکھ کر نہ آئے۔ یہاں تو قدم قدم پر آزمائشیں آئیں گی' یہ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے: ﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۵۵) ''اور ہم تمہیں لازماً آزمائیں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور ثمرات کے نقصان سے''۔ یہاں تو علی الاعلان بتایا جا رہا ہے: ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْۤ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۫ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْۤا اَذًى كَثِيْرًا ؕ﴾

(آل عمران:۱۸۶) ''(مسلمانو! یاد رکھو) تمہیں لازماً آزمایا جائے گا تمہارے مالوں میں بھی اور تمہاری جانوں میں بھی۔ اور تمہیں لازماً سننی پڑیں گی ان لوگوں سے بھی جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور ان سے بھی جنہوں نے شرک کیا' بڑی تکلیف دہ باتیں''۔ یہاں تو مال و جان کا نقصان اٹھانا پڑے گا' ہر قسم کی تلخ و ناز یبا باتیں سننی پڑیں گی' کڑوے گھونٹ بھی حلق سے اُتارنے پڑیں گے' غرض قدم قدم پر خطرات کا سامنا کرنا پڑے گا ؎

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطر ہاست بسے شرطِ اوّل قدم ایں است کہ مجنوں باشی!

(لیلیٰ سے وصال کے راستے میں تو بہت سے خطرات پیش آئیں گے۔ اس راہ میں پہلا قدم رکھنے کی شرط یہ ہے کہ تم مجنوں بن جاؤ!)

آیت ﴿ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ ﴾ ''جو اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کُفار کو اپنا دوست بناتے ہیں۔''

ان منافقین کا وطیرہ یہ بھی تھا کہ وہ کُفار کے ساتھ بھی دوستی رکھتے تھے۔ یعنی اپنی طرف سے وہ اس پالیسی پر عمل پیرا تھے: Don't keep all your eggs in one basket کہ اپنے تمام کے تمام انڈے ایک ہی ٹوکری میں مت رکھو۔ ان کا خیال تھا کہ آج اگر ہم سب تعلق' دوستیاں چھوڑ کر مسلمانوں کے ساتھ ہو گئے تو کل کا کیا پتا؟ کیا معلوم کل حالات بدل جائیں' حالات کا پلڑا کُفار کی طرف جھک جائے۔ تو ایسے مشکل وقت میں پھر یہی لوگ کام آئیں گے' اس لیے وہ ان سے دوستیاں رکھتے تھے۔

﴿ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ ﴾ ''کیا وہ ان کے قرب سے عزّت چاہتے ہیں؟''

کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ کیا ان کی محفلوں میں جگہ پا کر وہ معزز بننا چاہتے ہیں؟ جیسے ہمارے حکمرانوں کے لیے آج امریکہ جانا اور صدرِ امریکہ سے ملنا بہت بڑا اعزاز ہے' جسے پانے کے لیے ہمارے ہاں کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ چند منٹ کی ایسی ملاقات کے لیے کس کس انداز سے lobbying ہوتی ہے' خواہ اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہو۔

﴿ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ﴾ ''حالانکہ عزت تو کُل کی کُل اللہ کے اختیار میں ہے۔''

لیکن وہ اللہ کو چھوڑ کر کہاں عزّت ڈھونڈ رہے ہیں؟

آیت ﴿ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ ﴾ ''اور یہ بات وہ تم پر نازل کر چکا ہے کتاب میں''

﴿ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا ﴾ ''کہ جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے''

﴿ فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ﴾ ''تو ان کے ساتھ مت بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں''

یہ سورۃ الانعام کی آیت ۶۸ کا حوالہ ہے جس میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا تھا کہ جب تمہارے سامنے کافر لوگ اللہ کی آیات کا استہزاء کر رہے ہوں' قرآن کا مذاق اڑا رہے ہوں تو تم وہاں سے اُٹھ جاؤ۔ یہ مکی آیت ہے۔ چونکہ اُس وقت مسلمانوں میں اتنا زور نہیں تھا کہ کفار کو ایسی حرکتوں سے زبردستی منع کر سکتے اس لیے ان کو بتایا گیا کہ ایسی محفلوں میں تم لوگ مت بیٹھو۔ اگر کسی محفل میں ایسی کوئی بات ہو جائے تو احتجاجاً وہاں سے اٹھ کر چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ایسی باتوں سے تمہاری غیرتِ ایمانی میں بھی کچھ کمی آ جائے یا تمہاری ایمانی حس کند پڑ جائے۔ ہاں جب وہ لوگ دوسری باتوں میں مشغول ہو جائیں تو پھر دوبارہ ان کے پاس جانے میں کوئی حرج نہیں۔

واضح رہے کہ یہ غیر مسلموں سے تعلق منقطع کرنے کا حکم نہیں ہے۔ اس لیے کہ تبلیغ کی غرض سے اُن کے پاس جانا بھی ضروری ہے۔

﴿اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ؕ﴾ ''ورنہ تم بھی انہی کی مانند ہو جاؤ گے۔''

اگر اس حالت میں تم بھی ان کے ساتھ بیٹھے رہو گے تو پھر تم بھی ان جیسے ہو جاؤ گے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۙ﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ جمع کرنے والا ہے منافقوں کو بھی اور کافروں کو بھی جہنم میں سب کے سب۔''

آیت ۱۴۱ ﴿الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ﴾ ''وہ لوگ جو تمہارے لیے انتظار کی حالت میں ہیں۔''

منافق تمہارے معاملہ میں گردشِ زمانہ کے منتظر ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ یہ لوگ ''تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو'' کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں اور نتیجے کے انتظار میں ہیں کہ آخری فتح کس کی ہوتی ہے۔ اس لیے ان کا طے شدہ منصوبہ ہے کہ دونوں طرف کچھ نہ کچھ تعلقات رکھو تاکہ وقت جیسا بھی آئے، جو بھی صورت حال ہو، ہم اس کے مطابق اپنے بچاؤ کی کچھ صورت بنا سکیں۔

﴿فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۖ﴾ ''تو اگر تم لوگوں کو اللہ کی طرف سے کوئی فتح حاصل ہو جائے تو یہ کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟''

اگر اللہ تعالیٰ کی مدد سے مسلمان فتح حاصل کر لیتے ہیں تو وہ آ جائیں گے باتیں بناتے ہوئے کہ ہم بھی تو آپ کے ساتھ تھے، مسلمان تھے، مالِ غنیمت میں سے ہمارا بھی حصہ نکالیے۔

﴿وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ﴾ ''اور اگر کوئی حصہ پہنچ جائے کافروں کو''

اگر کبھی وقتی طور پر کفار کو فتح حاصل ہو جائے، جنگ میں ان کا پلڑا بھاری ہو جائے۔

﴿قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ﴾ ''تو وہ کہیں گے (اپنے کافر ساتھیوں سے) کیا ہم نے تمہارا گھیراؤ نہیں کر لیا تھا؟ اور کیا ہم نے بچایا نہیں تم کو مسلمانوں سے؟''

یعنی ہم نے تو آپ کو مسلمانوں سے بچانے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا، ہم تو آپ کے لیے آڑ بنے ہوئے تھے۔ آپ سمجھتے تھے کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جنگ کرنے آئے تھے؟ نہیں، ہم تو اس لیے آئے تھے کہ وقت آنے پر مسلمانوں کے حملوں سے آپ کو بچا سکیں۔

﴿فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ ''تو اللہ ہی فیصلہ کرے گا تمہارے مابین قیامت کے دن۔''

﴿وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝﴾ ''اور اللہ اہل ایمان کے مقابلے میں کافروں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔''

جیسا کہ اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سورۃ النساء کا بڑا حصہ منافقین سے خطاب پر مشتمل ہے، اگرچہ اُن سے براہِ راست خطاب میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ نَافَقُوْا کے الفاظ کہیں استعمال نہیں ہوئے، بلکہ انہیں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ سے ہی مخاطب کیا گیا ہے، کیونکہ وہ بھی ایمان کے دعوے دار تھے، ایمان کے مدعی تھے اور قانونی طور پر مسلمان تھے۔ یہ ایک طویل مضمون ہے جو آئندہ آیاتِ مبارکہ میں انجام پذیر (conclude) ہو رہا ہے۔

آیات ۱۴۲ تا ۱۵۲

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ
النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾ مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ ۫ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَ لَآ اِلٰى
هٰٓؤُلَآءِ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ
اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾ اِنَّ
الْمُنٰفِقِيْنَ فِى الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا
وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَ اَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ؕ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ
الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۴۶﴾ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا
عَلِيْمًا ﴿۱۴۷﴾ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا
عَلِيْمًا ﴿۱۴۸﴾ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ
نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ﴿۱۵۰﴾ اُولٰٓئِكَ هُمُ
الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ﴿۱۵۱﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ
يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۱۵۲﴾

الجزء السادس (۶)

ع ۱۹

آیت ۱۴۲ ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ ''یقیناً منافق کوشش کر رہے ہیں اللہ کو دھوکہ دینے کی''

یہ مضمون سورۃ البقرۃ کے دوسرے رکوع میں بھی آ چکا ہے۔ مُخَادَعَۃ بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے۔ اس باب میں کسی کے مقابلے میں کوشش کے معنی شامل ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں دو فریقوں میں مقابلہ ہوتا ہے اور پتا نہیں ہوتا کہ کون جیتے گا اور کون ہارے گا۔ لہٰذا اس جملے کا صحیح ترجمہ یوں ہوگا کہ ''منافقین اللہ کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہے ہیں''۔ اس کے جواب میں اللہ کی طرف سے فرمایا گیا:

﴿وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ﴾ ''حالانکہ وہ انہی کو دھوکہ میں ڈالنے والا ہے۔''

خَادِع ثلاثی مجرد سے اسم فاعل ہے اور یہ نہایت زوردار تاکید کے لیے آتا ہے۔ یہاں منافقین کے لیے دھوکہ والا پہلو یہ ہے کہ اللہ نے ان کو جو ڈھیل دی ہوئی ہے اس سے وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہو رہے ہیں' ہمارے اوپر ابھی تک کوئی آنچ نہیں آئی' ہماری کوئی پکڑ نہیں ہوئی' کوئی گرفت نہیں ہوئی' ہم دونوں طرف سے بچے ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنی اس ڈھیل کی وجہ سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اور درحقیقت یہی وہ دھوکہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ڈال رکھا ہے۔

﴿وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ﴾ ''اور جب وہ کھڑے ہوتے ہیں نماز کے لیے تو کھڑے ہوتے ہیں بڑی کسل مندی کے ساتھ''

یہ منافقین جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ طبیعت میں بشاشت اور آمادگی نہیں ہے۔ لیکن چونکہ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنا بھی ضروری ہے لہٰذا مجبوراً کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قَامَ فعل ہے اور اس کے معنی ہیں کھڑے ہونا' جبکہ قَائِم اس سے اسم فاعل ہے۔ مختلف زبانوں میں عام طور پر verb کے بعد prepositions کی تبدیلی سے معنی اور مفہوم بدل جاتے ہیں۔ مثلاً انگریزی میں to give ایک خاص مصدر ہے۔ اگر to give up ہو تو معنی یکسر بدل جائیں گے۔ پھر اگر یہ to give in ہو تو بالکل ہی الٹی بات ہو جائے گی۔ اسی طرح عربی میں بھی حروفِ جار کے تبدیل ہونے سے معانی بدل جاتے ہیں۔ لہٰذا اگر قَامَ عَلٰی ہو جیسے آیت ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ﴾ میں ہے تو اس کے معنی ہوں گے حاکم ہونا' سربراہ ہونا' کسی کے حکم کا نافذ ہونا۔ لیکن اگر قَامَ اِلٰی ہو (جیسے آیت زیر نظر میں ہے) تو اس کا مطلب ہوگا کسی شے کے لیے کھڑے ہونا' کوئی کام کرنے کے لیے اٹھنا' کوئی کام کرنے کا ارادہ کرنا۔ اس سے پہلے ہم قَامَ 'بِ' کے ساتھ بھی پڑھ چکے ہیں' یعنی: قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ اور قَائِمًا بِالْقِسْطِ۔ یہاں اس کے معنی ہیں کسی شے کو قائم کرنا۔ تو آپ نے ملاحظہ کیا کہ حروفِ جار (prepositions) کی تبدیلی سے کسی فعل کے اندر کس طرح اضافی معانی پیدا ہو جاتے ہیں۔

﴿يُرَآءُوْنَ النَّاسَ﴾ ''(وہ کھڑے ہوتے ہیں) محض لوگوں کو دکھانے کے لیے''

﴿وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۱۴۲﴾﴾ ''اور اللہ کا ذکر نہیں کرتے مگر بہت کم۔''

یعنی ذکرِ الٰہی جو نماز کا اصل مقصد ہے ﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾﴾ (طٰہٰ) وہ انہیں نصیب نہیں ہوتا۔ مگر ممکن ہے اس بے دھیانی میں کسی وقت کوئی آیت بجلی کے کڑکے کی طرح کڑک کر ان کے شعور میں کچھ نہ کچھ اثرات پیدا کر دے۔

آیت ۱۴۳ ﴿مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ ''یہ اس کے مابین مذبذب (ہو کر رہ گئے) ہیں۔''

کفر اور ایمان کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں' کسی طرف بھی یکسو نہیں ہو رہے۔ اسی لیے قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرے کے ساتھ حَنِیف کا لفظ بار بار آتا ہے۔ دین کے بارے میں اللہ کی طرف سے ترغیب یہی ہے کہ یکسو ہو جاؤ۔ دنیا میں اگر انسان کفر پر بھی یکسو ہوگا تو کم از کم اُس کی دنیا تو بن جائے گی' لیکن اگر دنیا اور آخرت دونوں بنانے ہیں تو پھر ایمان کے ساتھ یکسو ہونا ضروری ہے۔ لیکن جو لوگ بیچ میں رہیں گے' نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے' ان کے لیے تو ﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ﴾ کے مصداق دنیا اور آخرت دونوں کا گھاٹا اور نقصان ہوگا۔

﴿لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ﴾ ''نہ تو یہ اِن کی جانب ہیں اور نہ ہی اُن کی جانب ہیں۔''

نہ اہلِ ایمان کے ساتھ مخلص ہیں اور نہ ہی اہلِ کفر کے ساتھ۔ نہ اِن کے ساتھ یکسو ہیں اور نہ اُن کے ساتھ۔

﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ﴿۱۴۳﴾﴾ ''اور جسے اللہ ہی نے گمراہ کر دیا ہو تو اُس کے لیے تم کوئی راستہ نہ پاؤ گے۔''

یعنی جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہرِ تصدیق ثبت ہو چکی ہو' اس کے راہِ راست پر آنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔

آیت ۱۴۴ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ ''اے اہلِ ایمان' مت بناؤ کافروں کو اپنا دلی دوست مسلمانوں کو چھوڑ کر۔''

یہ مضمون اس سے پہلے آیت ۱۳۹ میں بھی آ چکا ہے۔ یہ بھی نفاق کی ایک علامت ہے کہ اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں کے ساتھ دوستیوں کی پینگیں بڑھائی جائیں' ان کو اپنا حمایتی' مددگار اور رازدار بنایا جائے۔

﴿اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۴۴﴾﴾ ''کیا تم چاہتے ہو کہ تم اپنے خلاف اللہ کے ہاتھ میں ایک صریح حُجت دے دو؟''

اس طرح تم لوگ خود ہی اپنے خلاف ایک حُجت فراہم کر رہے ہو۔ جب اللہ تعالیٰ آخرت میں تمہارا محاسبہ کرے گا' تب اس سوال کا تم کیا جواب دو گے کہ تمہاری دوستیاں کافروں کے ساتھ کیوں تھیں؟ اس طرح تمہارا یہ فعل تمہارے خلاف حُجتِ قاطع بن جائے گا۔

اب جو آیت آ رہی ہے وہ ایک اعتبار سے منافقین کے حق میں قرآنِ حکیم کی سخت ترین آیت ہے۔ اگرچہ بعض دوسرے اعتبارات سے' بلکہ ایک خاص لطیف پہلو سے سورۃ التوبہ کی آیت ۸۰ اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ دراصل طویل سورتوں میں سے سورۃ النساء اور سورۃ التوبہ دو ایسی سورتیں ہیں جن میں نفاق کا مضمون بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے۔

آیت ۱۴۵ ﴿اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ﴿۱۴۵﴾﴾ ''یقیناً منافقین آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے' اور تم نہ پاؤ گے اُن کے لیے کوئی مددگار۔''

اگلی آیت میں ان لوگوں کے لیے ایک رعایت کا اعلان ہے۔ منافقت کا پردہ کُلی طور پر تو سورۃ التوبہ میں چاک ہوا ہے۔ یعنی اُن کے لیے آخری احکام سن ۹ ہجری میں آئے تھے' جبکہ ابھی اس سورت میں سن ۴ ہجری کے دور کی باتیں ہو رہی ہیں۔ تو ابھی ان کے لیے رعایت رکھی گئی ہے کہ توبہ کا دروازہ ابھی کھلا ہے۔ فرمایا:

آیت ۱۴۶ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ﴾ ''سوائے اُن لوگوں کے جو توبہ کریں اور اصلاح کر لیں اور اللہ سے چمٹ جائیں''

اللہ کا دامن مضبوطی سے تھام لیں' ایمان کے ساتھ یکسو ہو جائیں۔ ''كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ'' (آل عمران:۷۹) کے مصداق اللہ والے بن جائیں۔ شیطان سے محبت کی پینگیں نہ بڑھائیں' شیطان کے ایجنٹوں سے دوستیاں نہ کریں' اور اپنے آپ کو دینِ اسلام کے ساتھ وابستہ کر لیں کہ ہر چہ بادا باد' اب تو ہم اسلام کی کشتی پر سوار ہو گئے ہیں' اگر یہ کشتی تیرتی ہے تو ہم تیریں گے' اور اگر خدانخواستہ اس کے مقدر میں کوئی حادثہ ہے تو ہم بھی اس حادثے میں شامل ہوں گے۔

﴿وَاَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ﴾ ''اور اپنی اطاعت کو اللہ کے لیے خالص کر لیں''

یہ نہ ہو کہ زندگی کے کچھ حصے میں تو اطاعت اللہ کی ہو رہی ہے' جبکہ کسی دوسرے حصے میں کسی اور کی اطاعت کی جا رہی ہے کہ کیا کریں جی! یہ معاملہ تو رواج کا ہے' اب برادری کو چھوڑ تو نہیں سکتے نا! گویا اطاعت کے علیحدہ علیحدہ حصے کر لیے ہیں اور پھر ان میں انتخاب کیا جاتا ہے کہ یہ حصہ برادری کی اطاعت کا ہے اور یہ حصہ اللہ کی اطاعت کا۔ بہرحال اطاعت جب تک کُل کی کُل اللہ کے لیے نہ ہو' اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہے۔ سورۃ البقرۃ (آیت ۱۹۳) میں ہم نے پڑھا تھا: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ﴾ ''اور لڑو ان سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے''۔ یہاں پر دین پورے کا پورا اللہ کے لیے ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی سطح پر دین اللہ کے لیے ہو جائے' یعنی اسلامی ریاست قائم ہو جائے' پورا اسلامی نظام قائم ہو جائے' شریعتِ اسلامی کا نفاذ عمل میں آ جائے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو کم از کم ہر مسلمان انفرادی سطح پر تو اپنی اطاعت اللہ کے لیے خالص کر لے۔ یہ گویا انفرادی توحیدِ عملی ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾ ''تو پھر یہ لوگ اہلِ ایمان میں شامل ہو جائیں گے اور اللہ اہلِ ایمان کو عنقریب بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔''

یعنی ابھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے' سچی توبہ کرنے کے بعد ان کو معافی مل سکتی ہے۔ ابھی ان کے لیے point of no return نہیں آیا ہے۔

آیت ۱۴۷ ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ ﴾ ''(اے منافقو ذرا سوچو!) اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا؟''

اللہ تعالیٰ معاذ اللہ کوئی ایذا پسند (sadist) ہستی نہیں ہے کہ اُسے لوگوں کو دکھ پہنچا کر خوشی ہوتی ہے۔ اس طرح کے رویے تو perverted قسم کے انسانوں کے ہوتے ہیں' جن کی شخصیتیں مسخ ہو چکی ہوتی ہیں' جو دوسروں کو تکلیف میں دیکھتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں' دوسروں کو تکلیف اور کوفت پہنچا کر انہیں راحت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تو ایسا نہیں ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ تمہیں عذاب دے کر تم سے کیا لے گا؟

﴿اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ﴾ ''اگر تم شکر اور ایمان کی روش اختیار کرو۔''

﴿وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ﴾ ''اور اللہ بہت ہی قدردانی فرمانے والا اور ہر شے کا علم رکھنے والا ہے۔''

جو بندہ اُس کے لیے کام کرے' محنت کرے اللہ تعالیٰ اُس کی قدر فرماتا ہے۔ اور جو کوئی جو کچھ بھی کرتا ہے سب اُس کے علم میں ہوتا ہے۔ انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو اللہ کے ہاں unaccounted رہ جائے اور اسے اس کا اجر نہ مل سکے۔

اب اس سورۃ کے آخری حصے میں فلسفۂ دین کے بہت اہم بنیادی نکات کی کچھ تفصیل آئے گی۔ اس ضمن میں پہلی بات تو تمدنی اور معاشرتی معاملات ہی سے متعلق ہے۔ معاشرے کے اندر کسی بُری بات کا چرچا کرنا بالفعل کوئی اچھی بات نہیں ہے' لیکن اس میں ایک استثناء رکھا گیا ہے' اور وہ ہے مظلوم کا معاملہ۔ اگر مظلوم کی زبان سے ظلم کے ردِّعمل کے طور پر کچھ نازیبا کلمات' جلے کٹے الفاظ بھی نکل جائیں تو اللہ تعالیٰ انہیں معاف کر دے گا۔

آیت ۱۴۸ ﴿لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْۗءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۭ ﴾ ''اللہ کو بالکل پسند نہیں ہے کہ کسی بُری بات کو بلند آواز سے کہا جائے' سوائے اُس کے جس پر ظلم ہوا ہے۔''

جس کا دل دکھا ہے' جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے' نہ صرف یہ کہ اس کے جواب میں اس کی زبان سے نکلنے والے کلمات پر گرفت نہیں' بلکہ مظلوم کی دعا کو بھی قبولیت کی سند عطا ہوتی ہے۔ کسی فارسی شاعر نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے: ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دعا کردن اجابت از درِ حق بہرِ استقبال می آید

کہ مظلوم کی آہوں سے ڈرو کہ اُس کی زبان سے نکلنے والی فریاد ایسی دعا بن جاتی ہے جس کی قبولیت خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا استقبال کرنے کے لیے عرش سے آتی ہے۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ﴾ ''اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

اسے سب معلوم ہے کہ جس کے دل سے یہ آواز نکلی ہے وہ کتنا دکھی ہے۔ اس کے احساسات کتنے مجروح ہوئے ہیں۔

آیت ۱۴۹ ﴿اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ ﴾ ''اگر تم بھلائی کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ''

جہاں تک تو خیر کا معاملہ ہے تم اسے بلند آواز سے کہو' ظاہر کرو یا چھپاؤ' برابر کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے خیر تو ہر حال میں خیر ہی

ہے‘ عیاں ہو یا خفیہ۔

﴿اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ﴿۱۴۹﴾﴾ ’’یا تم بُرائی کو معاف کر دیا کرو تو یقیناً اللہ بھی معاف فرمانے والا‘ قدرت رکھنے والا ہے۔‘‘

اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو معاف کر دینا یقیناً نیکی کا ایک اونچا درجہ ہے۔ اس لیے یہاں ترغیب کے انداز میں مظلوم سے بھی کہا جا رہا ہے کہ اگرچہ تمہیں چھوٹ ہے‘ تمہاری بدگوئی کی بھی تم پر کوئی گرفت نہیں‘ لیکن زیادتی کی تلافی کا اس سے اعلیٰ اور بلند تر درجہ بھی ہے‘ تم اس بلند درجے کو حاصل کیوں نہیں کرتے؟ وہ یہ کہ تم اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی کو معاف کر دو۔ اس کے ساتھ اللہ کی قدرت کا ذکر بھی ہوا ہے کہ انسان تو بسا اوقات بدلہ لینے کی طاقت نہ ہونے کے باعث معاف کرنے پر مجبور بھی ہو جاتا ہے‘ جبکہ اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے‘ وہ تو جب چاہے‘ جیسے چاہے (there & then) خطا کار کو فوراً سزا دے کر حساب چکا سکتا ہے۔ لیکن اتنی قدرت کے باوجود بھی وہ معاف فرما دیتا ہے۔

اب آئندہ آیت میں پھر وحدت الادیان جیسے اہم مضمون کا تذکرہ ہونے جا رہا ہے اور اس سلسلے میں یہاں تمام غلط نظریات کی جڑ کاٹی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی یہ بات زیر بحث آ چکی ہے کہ فلسفۂ وحدتِ ادیان کا ایک حصہ صحیح ہے۔ وہ یہ کہ اصل (origin) سب ادیان کی ایک ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ مختلف ادیان کی موجودہ شکلوں میں بھی یک رنگی اور ہم آہنگی ہے تو اس سے بڑی حماقت‘ جہالت‘ ضلالت اور گمراہی کوئی نہیں۔

یہاں پر اب کانٹے کی بات بتائی جا رہی ہے کہ دین میں جس چیز کی وجہ سے بنیادی خرابی پیدا ہوتی ہے وہ اصل میں کیا ہے۔ وہ غلطی یا خرابی ہے اللہ اور رسولوں میں تفریق! ایک تفریق تو وہ ہے جو رسولوں کے درمیان کی جاتی ہے‘ اور دوسری تفریق اللہ اور رسول ﷺ کو علیحدہ علیحدہ کر دینے کی شکل میں سامنے آتی ہے‘ اور یہ سب سے بڑی جہالت ہے۔ فتنۂ انکارِ حدیث اور انکارِ سُنّت اسی جہالت و گمراہی کا شاخسانہ ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو اہلِ قرآن سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ رسول ﷺ کا کام قرآن پہنچا دینا تھا‘ سو آپؐ نے پہنچا دیا‘ اب اصل معاملہ ہمارے اور اللہ کے درمیان ہے۔ اللہ کی کتاب عربی زبان میں ہے‘ ہم اس کو خود سمجھیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے زمانے میں مسلمانوں کو جو اس کی تشریح سمجھائی تھی اور اُس زمانے کے لوگوں نے اسے قبول کیا تھا‘ وہ اُس زمانے کے لیے تھی۔ گویا رسول اللہ ﷺ کی تشریح کوئی دائمی چیز نہیں‘ دائمی شے صرف قرآن ہے۔ اس طرح انہوں نے اللہ اور رسول ﷺ کو جُدا کر دیا۔ یہاں اسی گمراہی کا ذکر آ رہا ہے۔

آیت ۱۵۰ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ﴾ ’’یقیناً وہ لوگ جو کفر کرتے ہیں اللہ اور اُس کے رسولوں کا اور وہ چاہتے ہیں کہ تفریق کر دیں اللہ اور اُس کے رسولوں کے مابین‘‘

مغل بادشاہ اکبر کے ’’دینِ الٰہی‘‘ کا بنیادی فلسفہ بھی یہی تھا کہ بس دین تو اللہ ہی کا ہے‘ رسول ﷺ کی نسبت ضروری نہیں‘ کیونکہ جب دین کی نسبت رسول ﷺ کے ساتھ ہو جاتی ہے تو پھر دین رسول کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے کہ یہ دینِ موسیٰؑ ہے‘ یہ دینِ عیسیٰؑ ہے‘ یہ دینِ محمد ﷺ ہے۔ اگر رسولوں کا یہ تفرقی عنصر (differentiating factor) درمیان سے نکال دیا جائے تو مذاہب کے اختلافات کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اللہ تو سب کا مشترک (common) ہے‘ چنانچہ جو دین اللہ کے ساتھ منسوب ہو گا صرف وہی دینِ الٰہی ہو گا۔

﴿وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ﴾ ''اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانیں گے اور کچھ کو نہیں مانیں گے''
یعنی اللہ کو مانیں گے' رسولوں کا ماننا ضروری نہیں ہے۔ اللہ کی کتاب کو مانیں گے' رسول ﷺ کی سُنّت کا ماننا کوئی ضروری نہیں ہے' وغیرہ وغیرہ۔

﴿وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝۱۵۰﴾ ''اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے بین بین ایک راستہ نکال لیں۔''
اللہ کو ایک طرف کر دیں اور رسول (ﷺ) کو ایک طرف۔

آیت ۱۵۱ ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝۱۵۱﴾ ''یہی لوگ حقیقت میں پکے کافر ہیں' اور ہم نے ان کافروں کے لیے بڑا اہانت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آیت ۱۵۲ ﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَلَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ ''اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اللہ اور اُس کے رسولوں پر اور انہوں نے ان میں سے کسی کے مابین کوئی تفریق نہیں کی''
نہ اللہ کو رسول سے جُدا کیا اور نہ رسول کو رسول سے جُدا کیا۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ہم سب کو مانتے ہیں: ﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (البقرۃ:۲۸۵) ''ہم اللہ کے رسولوں میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے''۔ ہم اُن رسولوں کو بھی مانتے ہیں جن کے نام قرآن مجید میں آ گئے ہیں' اور یہ بھی مانتے ہیں کہ ان کے علاوہ بھی اللہ کی طرف سے بے شمار نبی اور رسول علیہم السلام آئے ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝۱۵۲﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں اللہ اُن کے اجر عطا فرمائے گا' اور اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے۔''

آیات ۱۵۳ تا ۱۶۲

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ
فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا
جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝۱۵۳ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ
بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ
مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۱۵۴ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ
قَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۵۵ وَّبِكُفْرِهِمْ وَ
قَوْلِهِمْ عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝۱۵۶ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ
وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ۭ مَا
لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًۢا ۝۱۵۷ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ
عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۵۸ وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ

يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ﴿۴۱﴾ فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَ بِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۴۲﴾ وَّ اَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَ اَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۴۳﴾ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۴۴﴾

آیت ﴿۱۵۳﴾ ﴿يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) اہلِ کتاب آپ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ ان پر ایک کتاب آسمان سے اتار لائیں''

یعنی جیسے تورات اُتری تھی' ویسے ہی تحریری شکل میں ایک کتاب آسمان سے اترنی چاہیے۔ آپؐ تو کہتے ہیں مجھ پر وحی آتی ہے لیکن کہاں لکھی ہوئی ہے وہ وحی؟ کون لایا ہے؟ ہمیں تو پتا نہیں۔ موسیٰؑ کو تو اُن کی کتاب لکھی ہوئی ملی تھی اور وہ پتھر کی تختیوں کی صورت میں اسے لے کر آئے تھے۔ آپؐ پر بھی اسی طرح کی کتاب نازل ہو تو ہم مانیں۔

﴿فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ﴾ ''(یہ تعجب کی بات نہیں) انہوں نے موسیٰؑ سے اس سے بھی بڑھ کر مطالبے کیے تھے''

اے نبی ﷺ آپ فکر نہ کریں' ان کی پروا نہ کریں۔ انہوں نے اور ان کے آباء و اجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس سے بھی بڑے بڑے مطالبات کیے تھے۔

﴿فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ ''انہوں نے تو (اُن سے یہ بھی) کہا تھا کہ ہمیں دکھاؤ اللہ کو علانیہ''

کہ ہم خود اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھنا چاہتے ہیں' جب دیکھیں گے تب مانیں گے۔

﴿فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ﴾ ''تو اُن کو آ پکڑا تھا کڑک نے اُن کے اس گناہ کی پاداش میں۔''

﴿ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ﴾ ''پھر انہوں نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اس کے بعد کہ اُن کے پاس بہت واضح نشانیاں آ چکی تھیں''

ان لوگوں کی ناہنجاری کا اندازہ کریں کہ نو نو معجزے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں دیکھنے کے بعد بھی انہوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔

﴿فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ﴿۱۵۳﴾﴾ ''تو ہم نے ان تمام چیزوں سے بھی درگزر کیا' اور ہم نے موسیٰ کو عطا کیا بڑا واضح غلبہ۔''

فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کو ان کی آنکھوں کے سامنے غرق کر دیا۔

آیت ﴿۱۵۴﴾ ﴿وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا﴾ ''اور ہم نے اُن کے سروں پر معلق کر دیا تھا طور پہاڑ کو جب کہ اُن سے عہد لیا جا رہا تھا اور ہم نے اُن سے کہا کہ دروازے میں داخل ہوں جھک کر''

یعنی جب اریحا (Jericho) شہر تمہارے ہاتھوں فتح ہو جائے اور اس میں داخل ہونے کا مرحلہ آئے تو اپنے سروں کو جھکا کر عاجزی کے ساتھ داخل ہونا۔

﴿وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِي السَّبْتِ﴾ ''اور ہم نے ان سے (یہ بھی) کہا تھا کہ سبت (ہفتے کے دن کے قانون) میں حد سے تجاوز نہ کرنا''

﴿وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝۱۵۴﴾ ''اور ہم نے ان سے (ان تمام باتوں کے بارے میں) بڑے گاڑھے قول و قرار لیے تھے۔''

آیت ۱۵۵ ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ﴾ ''تو انہوں نے جو اپنے اس میثاق کو توڑ ڈالا اس کے سبب''

اب ان کے جرائم کی فہرست آ رہی ہے' اور یوں سمجھئے کہ مبتدا ہی کی تکرار ہو رہی ہے اور اس میں جو اصل خبر ہے وہ گویا محذوف ہے۔ گویا یہ جملہ یوں ہوگا: فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ کہ انہوں نے جو اپنے میثاق کو توڑا اور توڑتے رہے' ہمارے ساتھ انہوں نے جو بھی وعدے کیے تھے' جب ان کا پاس انہوں نے نہ کیا تو ہم نے ان پر لعنت کر دی۔ لیکن یہ ''لَعَنّٰهُمْ'' اتنی واضح بات تھی کہ اس کو کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی' بلکہ ان کے جرائم کی فہرست بیان کر دی گئی۔

﴿وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ ''اور اُن کے اللہ کی آیات کے انکار اور انبیاء کو ناحق قتل کرنے (کے سبب سے)''

﴿وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۱۵۵﴾ ''اور ان کے اس طرح کہنے (کی پاداش) میں کہ ہمارے دِل تو غلافوں میں بند ہیں۔ بلکہ (حقیقت یہ ہے کہ) اللہ نے ان (کے دلوں) پر مہر کر دی ہے ان کے کفر کے باعث' پس اب وہ ایمان نہیں لائیں گے مگر بہت ہی شاذ۔''

آیت ۱۵۶ ﴿وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلٰي مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝۱۵۶﴾ ''اور بسبب اُن کے کفر کے اور اُن باتوں کے جو انہوں نے مریم کے خلاف کہیں ایک بہت بڑے بہتان کے طور پر۔''

حضرت مریم سلام اللہ علیہا پر یہودیوں نے بہتان لگایا کہ انہوں نے (معاذ اللہ) زنا کیا ہے اور مسیحؑ دراصل یوسف نجار کا بیٹا ہے۔ ان کی روایات کے مطابق یوسف نجار کے ساتھ حضرت مریم کی نسبت ہو چکی تھی' لیکن ابھی رخصتی نہیں ہوئی تھی کہ ان کے مابین تعلق قائم ہو گیا' جس کے نتیجے میں یہ بیٹا پیدا ہو گیا۔ اس طرح انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو ولد الزنا قرار دیا۔ یہ ہے وہ اتنی بڑی بات جو یہودی کہتے ہیں اور آج بھی اس گمراہ کن نظریے پر مبنی ''Son of Man'' جیسی فلمیں بنا کر امریکہ میں چلاتے ہیں' جن میں عیسائیوں کو بتایا جاتا ہے کہ جس مسیح کو تم لوگ Son of God کہتے ہو وہ حقیقت میں son of man ہے۔

آیت ۱۵۷ ﴿وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ﴾ ''اور بسبب ان کے یہ کہنے کے کہ ہم نے قتل کیا مسیح عیسیٰ ابن مریم کو' اللہ کے رسول کو!''

یعنی اللہ کے رسول کو قتل کر دیا! یہاں یہ ''رَسُوْلَ اللّٰهِ'' کے الفاظ اُن کے نہیں ہیں' بلکہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں استعجابیہ نشان (sign of exclamation) کے ساتھ' کہ اچھا ان کا دعویٰ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے! جبکہ رسول تو قتل ہو ہی

نہیں سکتا۔ اللہ کا تو فیصلہ ہے' ایک طے شدہ امر ہے' اللہ کی طرف سے لکھا ہوا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب آ کر رہیں گے :
﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ﴾ (المجادلۃ:۲۱) تو ان کی یہ جرأت کہ وہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے!

﴿وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ؕ﴾ ''حالانکہ نہ تو انہوں نے اُسے قتل کیا اور نہ ہی اُسے سولی دی' بلکہ اس کی شبیہہ بنا دی گئی ان کے لیے۔''

معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا اور ایک شخص کی حضرت مسیح جیسی صورت بنا دی گئی' ان کے ساتھ مشابہت کر دی گئی۔ چنانچہ انہوں نے جس کو مسیح سمجھ کر سولی پر چڑھایا' وہ مسیح نہیں تھا' ان کی جگہ کوئی اور تھا۔ انجیل برنباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شخص کا نام ''یہودا اخریوطی'' (Judas Iscariot) تھا اور وہ آپؑ کے حواریوں میں سے تھا۔ ویسے اُس کی نیت کچھ اور تھی' اُس میں بدنیتی بہرحال نہیں تھی (تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے) لیکن چونکہ اُس نے آپؑ کو گرفتار کرایا تھا' چنانچہ اس گستاخی کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے اُس کی شکل حضرت مسیح علیہ السلام جیسی بنا دی۔ اس وجہ سے حضرت مسیحؑ کی جگہ وہ پکڑا گیا اور اسے سولی چڑھا دیا گیا۔

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ ؕ﴾ ''اور جو لوگ اس کے بارے میں اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں وہ یقیناً شکوک و شبہات میں ہیں۔''

انہیں خود پتا نہیں کہ کیا ہوا؟ کیسے ہوا؟

﴿مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا ۞﴾ ''اُن کے پاس اس ضمن میں کوئی علم نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ گمان کی پیروی کر رہے ہیں' اور یہ بات یقینی ہے کہ انہوں نے اُسے قتل نہیں کیا۔''

حضرت مسیح علیہ السلام ہرگز قتل نہیں ہوئے اور نہ ہی آپؑ کو صلیب پر چڑھایا گیا۔

آیت ۱۵۸ ﴿بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۞﴾ ''بلکہ اللہ نے اُسے اٹھا لیا اپنی طرف' اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے کمال حکمت والا۔''

اس واقعہ کی تفصیل انجیل برنباس میں موجود ہے۔

آیت ۱۵۹ ﴿وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ﴾ ''اور نہیں ہوگا اہلِ کتاب میں سے کوئی بھی مگر اُس پر ایمان لا کر رہے گا اُس کی موت سے قبل۔''

یعنی حضرت مسیح علیہ السلام فوت نہیں ہوئے' زندہ ہیں' انہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا۔ آپؑ دوبارہ زمین پر آئیں گے' اور جب آئیں گے تو اہلِ کتاب میں سے کوئی شخص نہیں رہے گا کہ جو اُن پر ایمان نہ لے آئے۔

﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۞﴾ ''اور قیامت کے دن وہی ان کے خلاف گواہ (بن کر کھڑا) ہوگا۔''

یہ اسی گواہی کا ذکر ہے جس کی تفصیل ہم آیت ۴۱ میں پڑھ آئے ہیں: ﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۝﴾ کہ ہر نبی کو اپنی اُمت کے خلاف گواہی دینی ہے' لہٰذا حضرت مسیح علیہ السلام اپنی اُمت کے خلاف گواہی دیں گے۔

آیت ۱۶۰ ﴿فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ﴾ ''تو بسبب اُن یہودی بن جانے والوں کی ظالمانہ روش کے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں بھی حرام کر دیں جو اصلاً ان کے لیے حلال تھیں''

اللہ تعالیٰ کی ایک سُنّت یہ بھی ہے کہ کوئی قوم اگر کسی معاملے میں حد سے گزرتی ہے تو سزا کے طور پر اُسے حلال چیزوں سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے۔ یہاں پر یہی اصول بیان ہو رہا ہے۔ مثلاً اگر حضرت یعقوب علیہ السلام نے ذاتی وجوہات کی بنا پر اونٹ کا گوشت کھانا چھوڑ دیا تھا اور بنی اسرائیل نے اسے اپنے اوپر حرام ٹھہرالیا تو اللہ تعالیٰ نے تورات میں اس کی صراحت نہیں کی کہ یہ حرام نہیں ہے' بلکہ اللہ نے کہا کہ ٹھیک ہے' ان کی یہی سزا ہے کہ ان پر تنگی رہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے کرتوتوں کی سزا کے طور پر حلال چیزیں بھی اُن پر حرام کر دیں۔

﴿وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ﴿۱۶۰﴾﴾ ''اور بسبب اس کے کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے (خود رُکتے ہیں اور دوسروں کو بھی) روکتے ہیں۔''

یہ لوگ اللہ کے راستے سے خود بھی رکتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی روکتے ہیں۔ تو اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سزا دی اور ان پر بعض حلال چیزیں بھی حرام کر دیں۔

آیت ۱۶۱ ﴿وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ﴾ ''اور بسبب ان کے سود کھانے کے جبکہ اس سے انہیں منع کیا گیا تھا''

شریعتِ موسوی میں سود حرام تھا' آج بھی حرام ہے' لیکن انہوں نے اس حکم کا اپنا ایک مَن پسند مفہوم نکال لیا' جس کے مطابق یہودیوں کا آپس میں سود کا لین دین تو حرام ہے' کوئی یہودی دوسرے یہودی سے سودی لین دین نہیں کر سکتا' لیکن غیر یہودی سے سود لینا جائز ہے' کیونکہ غیر یہودی ان کے نزدیک Gentiles اور Goyims ہیں' یعنی انسان نما حیوان ہیں' جن سے فائدہ اٹھانا اور ان کا استحصال کرنا اُن کا حق ہے۔ ہم سورۂ آل عمران (آیت ۷۵) میں یہود کا یہ قول پڑھ چکے ہیں: ﴿لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ﴾ کہ ان اُمّیین کے بارے میں ہم پر کوئی گرفت ہے ہی نہیں۔ ہم جیسے چاہیں ان سے لوٹ مار کریں' جس طرح چاہیں انہیں دھوکہ دیں' ہم پر کوئی مواخذہ نہیں۔ لہٰذا سود کھانے میں اُن کے ہاں عمومی طور پر کوئی قباحت نہیں ہے۔

﴿وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ﴾ ''اور بسبب ان کے لوگوں کے مال ناحق ہڑپ کرنے کے۔''

﴿وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿۱۶۱﴾﴾ ''اور ان میں سے جو کافر ہیں ان کے لیے ہم نے بہت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آیت ۱۶۲ ﴿لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ﴾ ''البتہ جو لوگ ان میں سے پختہ علم والے ہیں اور اہلِ ایمان ہیں''

یعنی یہود میں سے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ جیسے اہلِ علم اور راست باز لوگ جنہوں نے تورات کے علم کی بنا پر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی اور وہ آپؐ پر ایمان لائے۔

﴿يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ ''وہ ایمان رکھتے ہیں اُس پر جو (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم!) آپ پر نازل کیا گیا اور اُس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا''

﴿وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾ ''اور وہ نماز قائم کرنے والے ہیں' زکوٰۃ ادا کرنے والے ہیں' اور ایمان رکھنے والے ہیں اللہ پر بھی اور یومِ آخرت پر بھی''

﴿اُولٰٓئِكَ سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۶۲﴾﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں جنہیں ہم ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائیں گے۔''

ان آیات میں ابھی بھی تھوڑی سی گنجائش رکھی جا رہی ہے کہ اہلِ کتاب میں سے کوئی ایسا عنصر اگر اب بھی موجود ہو جو حق کی طرف مائل ہو' اب بھی اگر کوئی سلیم الفطرت فرد کہیں کونے کھدرے میں پڑا ہو تو وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا لے۔ اور اگر اس کان میں ہیرے کا کوئی ٹکڑا کہیں ابھی تک پڑا رہ گیا ہو تو وہ بھی نکل آئے' اس سے پہلے کہ آخری دروازہ بھی بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ابھی آخری دروازہ نہ تو منافقین پر بند کیا گیا ہے اور نہ ہی ان اہلِ کتاب پر' بلکہ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ فرما کر ایک دفعہ پھر صلائے عام دے دی گئی ہے کہ اہلِ کتاب میں سے اب بھی اگر کچھ لوگ مائل بہ حق ہیں تو وہ متوجہ ہو جائیں۔

آیات ۱۶۳ تا ۱۶۹

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّ النَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ وَ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ عِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَ يُوْنُسَ وَ هٰرُوْنَ وَ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ وَ رُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ؕ وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴿۱۶۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ﴿۱۶۸﴾ اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ؕ وَ كَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۱۶۹﴾

اس رکوع کے شروع میں انبیاء و رسل علیہم السلام کے ناموں کا ایک خوبصورت گلدستہ نظر آتا ہے۔ قرآن پاک میں متعدد ایسے مقامات ہیں جہاں ایسے گلدستے خوبصورتی سے سجائے گئے ہیں۔ یہاں آپ کو پے بہ پے انبیاء و رسل علیہم السلام کے نام ملیں گے اور پھر اُن میں سے بعض کی اضافی شانوں کا ذکر بھی ملے گا۔ اس کے بعد فلسفۂ قرآن کے اعتبار سے ایک بہت اہم آیت بھی آئے گی' جس میں نبوت کا بنیادی مقصد اور اساسی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔

آیت ۱۶۳ ﴿اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ بَعْدِهٖ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ہم نے آپ کی جانب بھی وحی کی ہے جیسے ہم نے نوحؑ اور ان کے بعد بہت سے انبیاء پر وحی کی تھی۔''

﴿وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ﴾ ''اور ہم نے ابراہیمؑ' اسماعیلؑ' اسحاقؑ' یعقوبؑ اور اُن کی اولاد کی طرف بھی وحی کی''

﴿وَعِيْسٰى وَاَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَهٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾﴾ ''اور عیسیٰؑ' ایوبؑ' یونسؑ' ہارونؑ اور

سلیمانؑ کی طرف (بھی وحی کی)۔ اور داؤدؑ کو تو ہم نے زبور (جیسی کتاب) عطا فرمائی۔''

آیت ۱۶۴ ﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۭ﴾ ''اور (بھیجے) وہ رسول جن کا ہم اس سے پہلے آپؐ کے سامنے تذکرہ کر چکے ہیں اور ایسے رسول (بھی) جن کے حالات ہم نے آپؐ کے سامنے بیان نہیں کیے۔''

ظاہر ہے پوری دنیا کی تاریخ بیان کرنا تو قرآن مجید کا مقصد نہیں ہے کہ تمام انبیاء و رُسل علیہم السلام کی مکمل فہرست دے دی جاتی۔ یہ تو کتابِ ہدایت ہے' تاریخ کی کتاب نہیں ہے۔

﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝﴾ ''اور موسیٰؑ سے تو کلام کیا اللہ نے جیسے کہ کلام کیا جاتا ہے۔''

یہ خاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امتیازی شان کا ذکر ہے۔ لیکن واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت موسیٰؑ کا یہ مکالمہ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ تھا' یعنی پردے کے پیچھے سے' البتہ تھا دُو بدو کلام۔ اب اس کے بعد وہ آیت آ رہی ہے جس میں نبوت کا اساسی مقصد بیان ہوا ہے کہ یہ تمام رسولؑ کس لیے بھیجے گئے تھے۔

آیت ۱۶۵ ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ ''یہ رسولؑ (بھیجے گئے) بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر''

﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ﴾ ''تا کہ نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حُجّت (دلیل) رسولوں کے آنے کے بعد۔''

یہاں پر ایک طرف لِلنَّاسِ کا 'ل' نوٹ کیجیے اور دوسری طرف عَلَى اللّٰهِ کا عَلٰی۔ یہ دونوں حروف متضاد معانی پیدا کر رہے ہیں۔ لِلنَّاسِ کے معنی ہیں لوگوں کے حق میں حُجّت' جبکہ عَلَى اللّٰهِ کے معنی ہیں اللہ کے خلاف حُجّت۔

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝﴾ ''اور اللہ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

اس آیت کے حوالے سے یہاں احتسابِ آخرت کے فلسفے کو اچھی طرح سمجھ لیجیے۔ قیامت کے دن ہر کسی کا امتحان ہوگا اور اس امتحان سے نتائج نکلیں گے' کوئی پاس ہوگا اور کوئی فیل۔ لیکن ظاہر ہے امتحان سے پہلے کچھ پڑھایا جانا بھی ضروری ہے' کسی کو جانچنے سے پہلے اُسے کچھ دیا بھی جاتا ہے۔ چنانچہ ہمیں دیکھنا ہے کہ قیامت کے امتحان کے لیے ہمیں کیا پڑھایا گیا ہے؟ اور اس آخری جانچ پڑتال سے پہلے ہمیں کیا کچھ دیا گیا ہے؟ قرآن مجید کے بنیادی فلسفہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمع' بصر اور عقل تین بڑی چیزیں دی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر روح بھی ودیعت کی ہے اور نفسِ انسانی میں خیر اور شر کا علم بھی رکھا ہے۔ ان باتوں کی بنا پر انسان وحیٔ الٰہی کی راہنمائی کے بغیر بھی اللہ کے حضور جواب دہ (accountable) ہے کہ جب اس کی فطرت میں نیکی اور بدی کی تمیز رکھ دی گئی تھی تو وہ بدی کی طرف کیوں گیا؟ تو گویا اگر کوئی نبی یا رسول نہ بھی آتا' کوئی کتاب نازل نہ بھی ہوتی' تب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت کا محاسبہ ناحق نہیں تھا۔ اس لیے کہ وہ بنیادی چیزیں جو امتحان اور احتساب کے لیے ضروری تھیں وہ اللہ تعالیٰ انسان کو دے چکا تھا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کی سُنّت یہ رہی ہے کہ وہ اس کے علاوہ بھی انسانوں پر اتمامِ حُجّت کرتا ہے۔ اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ حُجّت کیا ہے؟ بنیادی حُجّت تو عقل ہے جو اللہ نے ہمیں دے رکھی ہے: ﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝﴾ (بنی اسرائیل) ''یقیناً سماعت' بصارت اور عقل سبھی کے بارے میں باز پرس کی جائے گی''۔ اس کے علاوہ

انسانی نفس کے اندر نیکی اور بدی کی تمیز بھی ودیعت کر دی گئی ہے: ﴿وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝﴾ (الشمس) ''اور قسم ہے نفس انسانی کی اور جیسا کہ اس کو سنوارا۔ پس اس کے اندر نیکی اور بدی کا علم الہام کر دیا''۔ پھر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح بھی پھونکی گئی ہے۔ ان تمام صلاحیتوں اور اہلیتوں کی بنا پر جوابدہی (accountability) کا جواز برحق ہے۔ کوئی نبی آتا یا نہ آتا' اللہ کی یہ حُجت تمام انسانوں پر بہرحال قائم ہے۔

اس کے باوجود بھی اللہ تعالیٰ نے اتمامِ حُجت کرنے کے لیے اپنے نبی اور رسول بھیجے۔ یہ گویا اتمامِ حُجت کا اضافی انتظام تھا کہ اللہ نے انسانوں میں سے ہی کچھ لوگوں کو چُنا' جو بڑے ہی اعلیٰ کردار کے لوگ تھے۔ ان کے دامنِ کردار پر کوئی داغ دھبہ نہیں تھا' ان کی سیرت و اخلاق کھلی کتاب کی مانند ان کی قوموں کے سامنے تھی۔ ان کے پاس اللہ نے اپنی وحی بھیجی اور واضح طور پر بتا دیا کہ انسان کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ اس طرح اُس نے انسانوں کے لیے اس امتحان کو آسان کر دیا' تاکہ اب کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے' کوئی یہ دلیل پیش نہ کر سکے کہ مجھے تو علم ہی نہیں تھا۔ پروردگار! میں تو بے دین ماحول میں پیدا ہو گیا تھا' وہاں سب کے سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ پروردگار! میں تو اپنی دو وقت کی روٹی کے دھندے میں ہی ایسا مصروف رہا کہ مجھے کبھی ہوش ہی نہیں آیا کہ دین و ایمان اور اللہ و آخرت کے بارے میں سوچتا۔ بہرحال رسولوں کے آنے کے بعد حق کھل کر سامنے آ جاتا ہے' حق و باطل کے درمیان امتیاز بالکل واضح طور پر قائم ہو جاتا ہے اور لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے محاسبہ کے مقابلے میں پیش کرنے کے لیے کوئی حُجت باقی نہیں رہتی۔ تو یہ ہے اتمامِ حُجت کا فلسفہ اور طریقہ اللہ کی طرف سے۔ رسولؑ اس کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں؟ وہ کسی کو زبردستی تو ہدایت پر نہیں لا سکتے۔ ہاں جن لوگوں کے اندر احساس جاگ جائے گا وہ رسولؑ کی تعلیمات کی طرف متوجہ ہوں گے' ان سے فائدہ اٹھائیں گے اور سیدھے راستے پر چلیں گے۔ ان کے لیے اللہ کے رسول ''مبشّر'' ہوں گے' یعنی اللہ کے فضل اور جنت کی نعمتوں کی بشارت دینے والے: ﴿فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝﴾ (الواقعہ) کہ ان کے لیے آخرت میں راحت و سرور اور نعمتوں والی جنت ہوگی۔ اور جو لوگ اس کے بعد بھی غلط راستوں پر چلتے رہیں گے' تعصب میں' ضد اور ہٹ دھرمی میں' مفادات کے لالچ میں' اپنی چودھراہٹیں قائم رکھنے کے لالچ میں' ان کے لیے رسولؑ ''نذیر'' ہوں گے۔ یعنی اُن کو وہ خبردار کریں گے کہ اب تمہارے لیے بدترین انجام کے طور پر جہنم تیار ہے۔ تو رسولوں کی بعثت کا بنیادی مقصد یہی ہے' یعنی تبشیر اور انذار۔

تبشیر و انذار کے اس فلسفے کو سمجھ لینے کے بعد اب دوبارہ آیت کے الفاظ کو سامنے رکھیے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ ''رسول بھیجے گئے بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر'' —— یہ تبشیر اور انذار کس لیے؟ ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ ۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۭ﴾ ''تاکہ باقی نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حُجت' کوئی عذر' کوئی بہانہ رسولوں کے آنے کے بعد''۔ ﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝﴾ ''اور اللہ زبردست ہے' حکیم ہے''۔ وہ عزیز ہے' غالب ہے' زبردست ہے' وہ بغیر رسولوں کے بھی محاسبہ کر سکتا ہے' اس کا اختیار مطلق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ حکیم بھی ہے' اُس نے محاسبۂ اُخروی کے لیے یہ مبنی بر حکمت نظام بنایا ہے۔ اس ضمن میں ایک بات اور نوٹ کر لیجیے کہ رسالت کا ایک تکمیلی مقصد بھی ہے جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر کامل ہوا' اور وہ ہے روئے ارضی پر اللہ کے دین کو غالب کرنا۔ آپؐ نے دعوت کا آغاز اسی تبشیر اور انذار ہی سے فرمایا' جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝﴾ ''اے نبی (ﷺ)! یقیناً ہم نے بھیجا ہے آپ کو گواہ بنا کر اور بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔ اور اللہ کی طرف

بلانے والا اُس کے حکم سے اور ایک روشن چراغ بنا کر''۔ بحیثیتِ رسولؐ یہ آپؐ کی رسالت کے بنیادی مقصد کا اظہار ہے' لیکن اس سے بلند تر درجے میں آپؐ کی رسالت کی تکمیلی حیثیت کا اظہار سورۃ التوبہ آیت ۳۳' سورۃ الفتح آیت ۲۸ اور سورۃ الصف آیت ۹ میں بایں الفاظ ہوا ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق دے کر تاکہ وہ اسے غالب کر دے پورے دین پر''۔ تمام انبیاء و رسل علیہم السلام میں یہ آپؐ کی امتیازی شان ہے۔ میری کتاب ''نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت'' میں اس موضوع پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

آیت ۱۶۶ ﴿لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۱۶۶﴾

''لیکن اللہ گواہ ہے کہ جو کچھ اُس نے نازل کیا ہے (اے نبی ﷺ) آپ کی طرف وہ اُس نے نازل کیا ہے اپنے علم سے' اور فرشتے بھی اس پر گواہ ہیں' اگرچہ اللہ (اکیلا ہی) گواہ ہونے کے اعتبار سے کافی ہے۔''

آیت ۱۶۷ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۶۷﴾ ''بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا (خود کو بھی اور دوسروں کو بھی) تو یقیناً وہ گمراہی میں بہت دُور نکل گئے ہیں۔''

اب آخری رسولؐ کے آجانے کے بعد بھی جو لوگ کفر پر اڑے رہے' اللہ کے راستے سے رُکے رہے اور دوسروں کو بھی روکتے رہے' وہ راہِ حق سے بھٹک کر بہت دور کی گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

آیت ۱۶۸ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا ۝۱۶۸﴾ ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور ظلم (شرک) کے مرتکب ہوئے اللہ انہیں ہرگز بخشنے والا نہیں ہے' اور نہ انہیں کسی راستے کی ہدایت دے گا۔''

آیت ۱۶۹ ﴿اِلَّا طَرِيْقَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۱۶۹﴾ ''سوائے جہنم کے راستے کے جس میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔ اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۔''

اب ذرا اس آیت کا تقابل کیجیے آیت ۱۴۷ کے ساتھ ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ ...﴾ ''اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا.....؟'' یقیناً اللہ ایذا پسند (sadist) نہیں ہے' اُسے لوگوں کو عذاب دے کر خوشی نہیں ہوگی۔ لیکن یہ اُس کا ضابطہ اور قانون ہے' اسی پر اس نے دنیا بنائی ہے' اور اپنے اسی ضابطے اور قانون کے عین مطابق وہ مستحقین کو جزا و سزا دے گا۔ یہ اُس پر کوئی بھاری گزرنے والی بات نہیں ہے کہ وہ اپنی ہی مخلوق کو سزا دے۔ بعض ملنگ قسم کے صوفی اس طرح کی باتیں بھی کرتے ہیں کہ اللہ بڑا رحیم ہے' کیا وہ اپنی ہی مخلوق کو جہنم میں جھونک دے گا؟ یہ تو ایسے ہی ڈراوے کے لیے' لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے عذاب اور سزا کی باتیں کی گئی ہیں۔ جیسے باپ بچوں کو ڈانٹتا ہے میں تیری ہڈیاں توڑ دوں گا' ماں کہتی ہے میں تیرا قیمہ کر دوں گی۔ تو کیا وہ سچ مچ اپنے بچوں کا قیمہ کر دے گی؟ لہٰذا یہ تو صرف ڈراوا ہے' حقیقت میں ایسا نہیں ہوگا' وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے خیالات و نظریات گمراہ کن ہیں۔ ماں کے لیے تو اپنے بچے کو بڑے سے بڑے قصور پر بھی آگ میں ڈالنا ممکن نہیں ہے' مگر اللہ تعالیٰ نے جہنم کے عذاب کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے: ﴿وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝﴾ اللہ کے لیے یہ بہت آسان ہے' بہت ہلکی بات ہے۔

آیات ۱۷۰ تا ۱۷۵

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۫ۚ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ؕ اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾ لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰٓئِكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ؕ وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴿۱۷۲﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ وَّلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿۱۷۳﴾ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

ع ۲۳

اب اگلی آیات اِس سورۃ کا ''حرفِ آخر'' ہیں۔

آیت ۱۷۰ ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الرَّسُوْلُ بِالْحَقِّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَاٰمِنُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ؕ ﴾ ''اے لوگو! تمہارے پاس آچکا ہے رسولؐ حق کے ساتھ تمہارے رب کی طرف سے' تو اب تم ایمان لے آؤ' یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔''

بلکہ آخری الفاظ کی صحیح تر ترجمانی یوں ہوگی کہ ''ایمان لے آؤ' اسی میں تمہاری خیریت ہے''۔ اس آیت کے ایک ایک لفظ میں بہت زور اور جلال ہے اور اب بات بالکل دوٹوک انداز اور حتمی طور پر کی جا رہی ہے کہ اے لوگو! اب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اللہ کی طرف سے کوئی راہنمائی نہیں کی گئی' ہمیں کچھ پتا نہیں تھا' ہم پر بات واضح نہیں ہوئی تھی۔ ہمارے آخری نبی ﷺ کے آجانے کے بعد تمہارا یہ بہانہ اب ختم ہو گیا۔

﴿ وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۷۰﴾ ﴾ ''اور اگر تم لوگ کفر پر اڑے رہو گے تو (اللہ کا کیا بگاڑ لو گے؟) آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ ہی کا ہے' اور اللہ علیم بھی ہے' حکیم بھی۔''

آگے اہلِ کتاب سے جو خطاب ہے اس کے مخاطب خاص طور پر عیسائی ہیں' جو حضرت مسیح علیہ السلام کی عقیدت و محبت میں حد سے گزر گئے تھے۔

آیت ۱۷۱ ﴿ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ ﴾ ''اے اہلِ کتاب' اپنے دین میں

غلو (مبالغہ) نہ کرو اور اللہ کی طرف کوئی شے منسوب نہ کرو سوائے اس کے جو حق ہو۔"

تم آپس کے معاملات میں تو جھوٹ بولتے ہی ہو مگر اللہ کے بارے میں جھوٹ گھڑنا' جھوٹ بول کر اللہ پر اسے تھوپنا کہ اللہ کا یہ حکم ہے' اللہ نے یوں کہا ہے' یہ تو وہی بات ہوئی: بازی بازی باریش بابا ہم بازی!

﴿اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ "دیکھو مسیح عیسیٰؑ ابن مریم تو بس اللہ کے رسولؑ تھے"

وہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ایک رسولؑ تھے اور بس! اُلوہیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے' وہ خدا کے بیٹے نہیں ہیں۔

﴿وَكَلِمَتُهٗ ۚ اَلْقٰىهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ ۫﴾ "اور وہ اُس کا ایک کلمہ تھے' جو اُس نے اِلقا کیا مریمؑ پر اور ایک روح تھے اُس کی طرف سے"

یعنی حضرت مریمؑ کے رحم میں جو حمل ہوا تھا وہ اللہ کے کلمۂ کُن کے طفیل ہوا۔ بچے کی پیدائش کے طبعی عمل میں ایک حصہ باپ کا ہوتا ہے اور ایک ماں کا۔ اب حضرت مسیحؑ کی ولادت میں ماں کا حصہ تو پورا موجود ہے۔ حضرت مریمؑ کو حمل ہوا' نو مہینے آپؑ رحم میں رہے' لیکن یہاں باپ والا حصہ بالکل نہیں ہے اور باپ کے بغیر ہی آپؑ کی پیدائش ممکن ہوئی۔ ایسے معاملات میں جہاں اللہ کی مشیت سے ایک لگے بندھے طبعی عمل میں سے اگر کوئی کڑی اپنی جگہ سے ہٹائی جاتی ہے تو وہاں پر اللہ کا مخصوص امر کلمۂ کُن کی صورت میں کفایت کرتا ہے۔ یہاں پر اللہ کے "کلمہ" کا یہی مفہوم ہے۔

جہاں تک حضرت مسیح علیہ السلام کو "رُوْحٌ مِّنْهُ" قرار دینے کا تعلق ہے تو اگرچہ سب انسانوں کی روح اللہ ہی کی طرف سے ہے' لیکن ظاہر ہے تمام روحیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ ذرا تصور کریں روحِ محمدی ﷺ کی شان اور عظمت کیا ہوگی! روحِ محمدیؐ کو عام طور پر ہمارے علماء "نورِ محمدیؐ" کہتے ہیں۔ اس لیے کہ روح ایک نورانی شے ہے۔ ملائکہ بھی نور سے پیدا ہوئے ہیں اور انسانی ارواح بھی نور سے پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن سب انسانوں کی ارواح برابر نہیں ہیں۔ حضور ﷺ کی روح کی اپنی ایک شان ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح کی اپنی ایک شان ہے۔

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۫ وَلَا تَقُوْلُوْا ثَلٰثَةٌ ۭ﴾ "پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر' اور تثلیث (تین خداؤں) کا دعویٰ مت کرو۔"

﴿اِنْتَهُوْا خَيْرًا لَّكُمْ ۭ﴾ "باز آجاؤ' اسی میں تمہاری بہتری (خیریت) ہے۔"

یہ مت کہو کہ الوہیت تین میں ہے۔ ایک میں تین اور تین میں ایک کا عقیدہ مت گھڑو۔

﴿اِنَّمَا اللّٰهُ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ سُبْحٰنَهٗٓ اَنْ يَّكُوْنَ لَهٗ وَلَدٌ ۘ﴾ "جان لو کہ اللہ تو بس ایک ہی الٰہِ واحد ہے' وہ اس سے پاک ہے کہ اُس کا کوئی بیٹا ہو۔"

﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ﴿۱۷۱﴾﴾ "آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب کچھ اُسی کا ہے' اور اللہ کافی ہے بطورِ کارساز۔"

آیت ﴿لَنْ يَّسْتَنْكِفَ الْمَسِيْحُ اَنْ يَّكُوْنَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلٰۗىِٕكَةُ الْمُقَرَّبُوْنَ ۭ﴾ "مسیحؑ کو تو اس میں ہرگز کوئی عار نہیں ہے کہ وہ بنے اللہ کا بندہ اور نہ ہی ملائکہ مقربین کو اس میں کوئی عار ہے (کہ انہیں اللہ کا بندہ سمجھا جائے)۔"

مسیح علیہ السلام کو تو اللہ کا بندہ ہونے میں یقیناً فخر محسوس ہوگا۔ جیسے ہم بھی حضور ﷺ کے بارے میں کہتے ہیں: وَنَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ ''اور ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمد (ﷺ) اُس کے بندے اور اُس کے رسول ہیں''۔ تو عبدیت کی شان تو بہت بلند و بالا ہے' رسالت سے بھی اعلیٰ اور اَرفع۔ (یہ ایک علیحدہ مضمون ہے' جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔) چنانچہ حضرت مسیحؑ کے لیے یہ کوئی عار کی بات نہیں ہے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں۔

﴿وَمَنْ يَّسْتَنْكِفْ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ اِلَيْهِ جَمِيْعًا ﴾ ''اور جو کوئی بھی عار سمجھے گا اُس کی بندگی میں اور تکبر کرے گا تو اللہ ان سب کو اپنے پاس جمع کر لے گا۔''

آیت ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ﴾ ''پس جو لوگ ایمان لائے ہوں گے اور انہوں نے نیک عمل کیے ہوں گے تو اُن کو تو اُن کا پورا پورا اجر بھی دے گا اور انہیں مزید بھی دے گا اپنے خاص فضل میں سے۔''

ایسے لوگوں کو اُن کے اجر کے علاوہ بونس بھی ملے گا۔ جیسے آپ کسی کام کرنے والے کو اچھا کام کرنے پر اُجرت کے علاوہ انعام (tip) بھی دیتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ فضل سے انہیں ان کے مقررہ اجر سے بڑھ کر نوازے گا۔

﴿وَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْتَنْكَفُوْا وَاسْتَكْبَرُوْا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴾ ''اور جنہوں نے (عبدیت کے اندر) عار محسوس کی تھی اور تکبر کیا تھا تو اُن کو وہ دردناک عذاب دے گا''

﴿وَلَا يَجِدُوْنَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴾ ''اور وہ نہیں پائیں گے اپنے لیے اللہ کے مقابلے میں کوئی حمایتی اور نہ کوئی مددگار۔''

آیت ﴿ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ ''اے لوگو! آ چکی ہے تمہارے پاس ایک برہان تمہارے ربّ کی طرف سے''

یہ قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ دونوں کی طرف اشارہ ہے۔ تعارفِ قرآن کے دوران ذکر ہو چکا ہے کہ کتاب اور رسول (ﷺ) مل کر بَیِّنَہ بنتے ہیں' جیسا کہ سورۃ البیّنہ (آیات ۱ تا ۳) میں ارشاد ہوا ہے۔ آیت زیر مطالعہ میں اسی بیّنہ کو بُرھان کہا گیا ہے۔

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴾ ''اور ہم نے تمہاری طرف روشن نُور نازل کر دیا ہے۔''

یہاں چونکہ نور کے ساتھ لفظ انزال آیا ہے اس لیے اس سے مراد لازماً قرآن مجید ہی ہے۔

آیت ﴿ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ ﴾ ''پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں گے اور اُس کے ساتھ چمٹ جائیں گے''

یکسو ہو جائیں گے' خالص اللہ والے بن جائیں گے' مذبذب نہیں رہیں گے کہ کبھی اِدھر کبھی اُدھر' بلکہ پوری طرح سے یکسو ہو کر اللہ کے دامن سے وابستہ ہو جائیں گے۔

﴿فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ ۙ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴾ ''تو انہیں وہ داخل کرے گا اپنی

رحمت اور اپنے فضل میں، اور انہیں ہدایت دے گا اپنی طرف صراطِ مستقیم کی۔''

یعنی انہیں سیدھے راستے (صراطِ مستقیم) پر چلنے کی توفیق بخشے گا اور سہج سہج، رفتہ رفتہ انہیں اپنے خاص فضل و کرم اور جوارِ رحمت میں لے آئے گا۔

آیت ۱۷۶

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ع

اس آخری آیت میں پھر ایک استفتاء ہے۔ آیت ۱۲ میں قانونِ وراثت کے ضمن میں ایک لفظ آیا تھا کلالہ، یعنی وہ مرد یا عورت جس کے نہ تو والدین زندہ ہوں اور نہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ اس کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اگر اُس کے بہن بھائی ہوں تو اس کی وراثت کا حکم یہ ہے، لیکن وہ حکم لوگوں پر واضح نہیں ہو سکا تھا۔ لہٰذا یہاں اس حکم کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ آیت ۱۲ کے حکم کو صرف اَخیافی بہن بھائیوں کے ساتھ مخصوص مان لینے کے بعد اس توضیحی حکم میں کلالہ کی وراثت کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے۔

آیت ۱۷۶ ﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۭ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ آپ سے فتویٰ مانگ رہے ہیں۔ کہو کہ اللہ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دے رہا ہے۔''

﴿اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ﴾ ''اگر کوئی شخص فوت ہو گیا اور اُس کی کوئی اولاد نہیں (اور نہ ماں باپ ہیں) اور اُس کی صرف ایک بہن ہے تو اس کے لیے اس کے ترکے میں سے نصف ہے۔''

ایسی صورت میں اس کی بہن ایسے ہی ہے جیسے ایک بیٹی ہو تو اسے ترکے میں سے آدھا حصہ ملے گا۔

﴿وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۭ﴾ ''اور وہ مرد (بھائی) اس (بہن) کا مکمل وارث ہو گا اگر اس (بہن) کی کوئی اولاد نہیں۔''

یعنی اگر کلالہ عورت تھی جس کی کوئی اولاد نہیں، کوئی والدین نہیں تو اس کا وارث اس کا بھائی بن جائے گا، اس کی پوری وراثت اس کے بھائی کو چلی جائے گی۔

﴿فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۭ﴾ ''پھر اگر دو (یا دو سے زیادہ) بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی۔''

﴿وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاۗءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۭ﴾ ''اور اگر کئی بہن بھائی ہوں تو ایک مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہو گا۔''

یعنی بھائی کو بہن سے دوگنا ملے گا۔ البتہ یہ بات اہم ہے کہ آیت ۱۲ میں جو حکم دیا گیا تھا وہ اَخیافی بہن بھائیوں کے بارے میں

تھا۔یعنی ایسے بہن بھائی جن کی ماں ایک ہو اور باپ علیحدہ علیحدہ ہوں۔اُس زمانے کے عرب معاشرے میں تعددِ ازواج کے عام رواج کی وجہ سے ایسے مسائل معمولات کا حصہ تھے۔باقی عینی یا علاتی بہن بھائیوں (جن کے ماں اور باپ ایک ہی ہوں یا مائیں الگ الگ ہوں اور باپ ایک ہی ہو) کا وہی عام قانون ہوگا جو بیٹے اور بیٹی کا ہے۔جس نسبت سے بیٹے اور بیٹی میں وراثت تقسیم ہوتی ہے ایسے ہی ان بہن بھائیوں میں تقسیم ہوگی۔

﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴾ ''اللہ واضح کیے دیتا ہے تمہارے لیے مبادا کہ تم گمراہ ہو جاؤ' اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔''

تعارفِ قرآن کے دوران میں نے بتایا تھا کہ قرآن حکیم کی ایک تقسیم سات احزاب یا منزلوں کی ہے۔اس اعتبار سے سورۃ النساء پر پہلی منزل ختم ہوگئی ہے۔فالحمد للہ علیٰ ذٰلک!

بارک اللہ لی ولکم فی القرآن العظیم' ونفعنی وایاکم بالآیات والذِّکر الحکیم○○

سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ

تمہیدی کلمات

سورۃ المائدۃ سے قرآن مجید کی دوسری منزل کا آغاز ہوتا ہے' لیکن قرآن حکیم کے مکّی اور مدنی سورتوں کے جو گروپس ہیں' ان کے اعتبار سے پہلا گروپ ابھی ختم نہیں ہوا' بلکہ سورۃ المائدۃ اس گروپ کی آخری سورت ہے۔ ان گروپس کی تفصیل قبل ازیں بیان ہو چکی ہے۔ اُن میں سے پہلا گروپ ایک مکّی سورۃ (الفاتحہ) اور چار مدنی سورتوں (البقرۃ' آل عمران' النّساء اور المائدۃ) پر مشتمل ہے۔ مضامین کی مماثلت کے اعتبار سے سورۃ المائدۃ کا ''جوڑا'' سورۃ النّساء کے ساتھ بنتا ہے۔ ان دونوں سورتوں کا اسلوب بھی کافی حد تک آپس میں ملتا جلتا ہے۔ اس گروپ کی مدنی سورتوں (البقرۃ' آل عمران' النّساء اور المائدۃ) کے بنیادی موضوعات دو ہیں' یعنی اہلِ کتاب پر اتمامِ حُجّت اور احکامِ شریعتِ اسلامی۔ ان سورتوں میں ان دونوں موضوعات کا ایک تسلسل ہے جو تدریجاً آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔ لہٰذا شریعتِ اسلامی کا جو ابتدائی خاکہ ہمیں سورۃ البقرۃ میں ملتا ہے اور پھر سورۂ آل عمران اور سورۃ النساء میں اس کے خدوخال مزید واضح ہوئے ہیں' یہاں سورۃ المائدۃ میں آ کر یہ تکمیلی رنگ اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کی بلند ترین (حکومتی) سطح کے احکام بھی ہمیں اس سورۃ میں ملتے ہیں۔ اسی طرح اہلِ کتاب سے جس خطاب کی ابتدا سورۃ البقرۃ میں ہوئی تھی' یہاں آ کر وہ بھی فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔

سورۃ النساء کا آغاز ''یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ'' سے ہوا تھا' جبکہ سورۃ المائدۃ کا آغاز ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا'' کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔

آیات ۱ تا ۵

سُوْرَۃُ الْمَآئِدَۃِ مَدَنِیَّۃٌ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اٰیَاتُهَا: ۱۲۰ رُکُوْعَاتُهَا: ۱۶

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِیْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا یُتْلٰى عَلَیْكُمْ غَیْرَ مُحِلِّی الصَّیْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ مَا یُرِیْدُ ۝۱ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ وَ لَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ لَا الْهَدْیَ وَ لَا الْقَلَآىِٕدَ وَ لَاۤ آٰمِّیْنَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رِضْوَانًا ؕ وَ اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ؕ وَ لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى ۪ وَ لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝۲ حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَ لَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ لِغَیْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ وَ الْمُتَرَدِّیَةُ

وَالنَّطِيْحَةُ وَ مَآ اَكَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۫ وَ مَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ اَلْيَوْمَ يَىِٕسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ وَ مَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۫ فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَ اذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ ۖ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۫ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَ لَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ ۫ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ع ۵

آیت ۱ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ؕ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اپنے عہد و پیمان (قول و قرار) کو پورا کیا کرو۔''

عقدہ گرہ کو کہتے ہیں جس میں مضبوطی سے بندھنے کا مفہوم شامل ہے۔ لہٰذا ''عُقُود'' سے مراد وہ معاہدے ہیں جو باقاعدہ طے پا گئے ہوں۔ معاہدوں اور قول و قرار کی اہمیت یوں سمجھ لیجیے کہ ہماری پوری کی پوری سماجی و معاشرتی زندگی قائم ہی معاہدوں پر ہے۔ معاشرتی زندگی کا بنیادی یونٹ ایک خاندان ہے' جس کی بنیاد ایک معاہدے پر رکھی جاتی ہے۔ شادی کیا ہے؟ مرد اور عورت کے درمیان ایک ساتھ زندگی گزارنے کا معاہدہ ہے۔ اس معاہدے سے انسانی معاشرے کی بلند و بالا عمارت کی بنیادی اینٹ رکھی جاتی ہے۔ اس معاہدے کے مطابق فریقین کے کچھ حقوق ہیں اور کچھ فرائض۔ ایک طرف بیوی کے حقوق و فرائض ہیں اور دوسری طرف شوہر کے حقوق و فرائض۔ بڑے بڑے کاروبار بھی معاہدوں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ آجر اور مستاجر کا تعلق بھی ایک معاہدے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح کاروبارِ حکومت' حکومتی اداروں میں عہدے اور مناصب' چھوٹے بڑے اہلکاروں کی ذمہ داریاں' ان کی مراعات اور اختیارات وغیرہ کا معاملہ ہے۔ گویا تمام معاشرتی' معاشی اور سیاسی معاملات قرآن حکیم کے ایک حکم پر عمل کرنے سے درست سمت پر چل سکتے ہیں' اور وہ حکم ہے ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ''۔

﴿اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ ''تمہارے لیے حلال کر دیے گئے ہیں مویشی قسم کے تمام حیوانات' سوائے اِن کے جو تمہیں پڑھ کر سنائے جا رہے ہیں''

جن کا حکم آگے چل کر تمہیں بتایا جائے گا' یعنی خنزیر' مُردار وغیرہ حرام ہیں۔ باقی جو مویشی قسم کے جانور ہیں' (وحوش نہیں' مثلاً شیر' چیتا وغیرہ وحشی ہیں) وہ حلال ہیں' جیسے ہرن' نیل گائے اور اس طرح کے جانور جو عام طور پر گوشت خور نہیں ہیں بلکہ سبزے پر ان کا گزارا ہے' ان کا گوشت تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے۔ البتہ استثنائی صورتوں کی تفصیل بعد میں تمہیں بتا دی جائے گی۔

﴿غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ﴾ ''نہ جائز کرتے ہوئے شکار کو جبکہ تم حالتِ احرام میں ہو۔''

یعنی اگر تم نے حج یا عمرے کے لیے احرام باندھا ہوا ہے تو تم اس حالت میں ان حلال جانوروں کا بھی شکار نہیں کر سکتے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝۱ ﴾ ''بے شک اللہ حکم دیتا ہے جو چاہتا ہے۔''

یہ اللہ کا اختیار ہے' وہ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے' جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔

آیت ۲ ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ ﴾ ''اے اہلِ ایمان! مت بے حرمتی کرو اللہ کے شعائر کی اور نہ حرمت والے مہینے کی''

یعنی اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو اپنی خواہش کے مطابق حلال مت کر لیا کرو۔

﴿ وَلَا الْهَدْيَ ﴾ ''اور نہ ہدی کے جانوروں کی (بے حرمتی کرو)''

یعنی قربانی کے وہ جانور جو حج یا عمرے پر جاتے ہوئے لوگ ساتھ لے کر جاتے تھے۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ حج یا عمرے پر جاتے وقت قربانی کے جانور ساتھ لے کر جاتے تھے۔ یہاں ان جانوروں کی بے حرمتی کی ممانعت بیان ہو رہی ہے۔

﴿ وَلَا الْقَلَآئِدَ ﴾ ''اور نہ (اُن جانوروں کی بے حرمتی ہونے پائے) جن کی گردنوں میں پٹے ڈال دیے گئے ہوں''

یہ پٹے (قلادے) علامت کے طور پر ڈال دیے جاتے تھے کہ یہ قربانی کے جانور ہیں اور کعبے کی طرف جا رہے ہیں۔

﴿ وَلَآ اٰۤمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ ﴾ ''اور نہ عازمینِ بیت الحرام (کی عزت و احترام میں فرق آنے پائے)''

یعنی وہ لوگ جو بیت الحرام کی طرف جا رہے ہوں' حج یا عمرے کا قصد کر کے سفر کر رہے ہوں' اب ان کی بھی اللہ کے گھر کے ساتھ ایک نسبت ہو گئی ہے' وہ اللہ کے گھر کے مسافر ہیں' جیسا کہ اہلِ عرب حجاجِ کرام کو کہتے ہیں: مَرْحَبًا بِضُيُوْفِ الرَّحْمٰنِ ''مرحبا ان لوگوں کو جو رحمٰن کے مہمان ہیں''۔ یعنی تمام حجاج کرام اصل میں اللہ کے مہمان ہیں' اللہ ان تمام زائرینِ کعبہ کا میزبان ہے۔ تو اللہ کے ان تمام مہمانوں کی ہتکِ عزت اور بے حرمتی سے منع کر دیا گیا۔

﴿ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ﴾ ''وہ طلب گار ہیں اپنے رب کے فضل اور اُس کی خوشنودی کے۔''

یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں' اللہ کو راضی کرنے کی کوشش میں مکانِ محترم (کعبہ) کی طرف جا رہے ہیں۔

﴿ وَاِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا ﴾ ''ہاں جب تم حلال ہو جاؤ (احرام کھول دو) تو پھر تم شکار کرو۔''

حلال ہو جانا ایک اصطلاح ہے' یعنی احرام کھول دینا' حالتِ احرام سے باہر آ جانا۔ اب تمہیں شکار کی آزادی ہے' اس پر پابندی صرف احرام کی حالت میں تھی۔

﴿ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ ﴾ ''اور تمہیں آمادہ نہ کر دے کسی قوم کی دشمنی''

﴿ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ﴾ ''کہ انہوں نے روکے رکھا تمہیں مسجدِ حرام سے''

﴿ اَنْ تَعْتَدُوْا ﴾ ''کہ (تم بھی ان پر) زیادتی کرنے لگو۔''

یعنی جیسے اہلِ مکہ نے تم لوگوں کو چھ سات برس تک حج و عمرہ سے روکے رکھا' اب کہیں اس کے جواب میں تم لوگ بھی ان پر زیادتی نہ کرنا۔

﴿ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ ﴾ ''اور تم نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرو''

﴿وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠﴾ ''اور گناہ اور ظلم وزیادتی کے کاموں میں تعاون مت کرو''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو یقیناً اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بہت سخت ہے۔''

دیکھئے یہ انداز بالکل وہی ہے جو سورۃ النساء کا تھا' وہی معاشرتی معاملات اور ان کے بارے میں بنیادی اصول بیان ہو رہے ہیں۔ اب آ رہے ہیں وہ استثنائی احکام جن کا ذکر آغازِ سورۃ میں اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ کے الفاظ میں ہوا ہے۔ کھانے پینے کے لیے جو چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں ان کا ذکر یہاں آخری مرتبہ آ رہا ہے اور وہ بھی بہت وضاحت کے ساتھ:

آیت ۳ ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ﴾ ''حرام کیا گیا تم پر مردار''

وہ جانور جو خود اپنی موت مر گیا ہو وہ حرام ہے۔

﴿وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ﴾ ''اور خون اور خنزیر کا گوشت''

﴿وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ﴾ ''اور جس پر پکارا گیا اللہ کے سوا کسی اور کا نام''

یعنی وہ جانور جو اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے نامزد ہے' اور غیر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اس کو ذبح کیا جا رہا ہے۔

﴿وَالْمُنْخَنِقَةُ﴾ ''اور وہ جانور جو گلا گھٹنے سے مر گیا ہو''

﴿وَالْمَوْقُوْذَةُ﴾ ''اور چوٹ لگنے سے جس جانور کی موت واقع ہو گئی ہو''

﴿وَالْمُتَرَدِّيَةُ﴾ ''اور جو جانور کسی اونچی جگہ سے گر کر مر گیا ہو''

﴿وَالنَّطِيْحَةُ﴾ ''اور جو جانور کسی دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے ہلاک ہو گیا ہو''

﴿وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ﴾ ''اور جسے کھایا ہو کسی درندے نے''

یعنی ''اَلْمَيْتَة'' کی یہ پانچ قسمیں ہیں۔ کوئی جانور ان میں سے کسی سبب سے مر گیا' ذبح ہونے کی نوبت نہیں آئی' اس کے جسم سے خون نکلنے کا امکان نہ رہا' بلکہ خون اس کے جسم کے اندر ہی جم گیا اور اس کے گوشت کا حصہ بن گیا تو وہ مردار کے حکم میں ہوگا۔

﴿اِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ ۠﴾ ''مگر یہ کہ جسے تم (زندہ پا کر) ذبح کر لو۔''

یعنی مذکورہ بالا اقسام میں سے جو جانور ابھی مرا نہ ہو اور اسے ذبح کر لیا جائے تو اسے کھایا جا سکتا ہے۔ مثلاً شیر نے ہرن کا شکار کیا' لیکن اس سے پہلے کہ وہ ہرن مرتا شیر نے کسی سبب سے اسے چھوڑ دیا۔ اس حالت میں اگر اسے ذبح کر لیا گیا اور اس میں سے خون بھی نکلا تو وہ حلال جانا جائے گا۔ جہاں جہاں شیر کا منہ لگا ہو وہ حصہ کاٹ کر پھینک دیا جائے تو باقی گوشت کھانا جائز ہے۔

﴿وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ﴾ ''اور وہ جانور جو کسی استھان پر ذبح کیا گیا ہو''

یعنی کسی خاص آستانے پر' خواہ وہ کسی ولی اللہ کا مزار ہو یا دیوتا' دیوی کا کوئی استھان ہو' ایسی جگہوں پر جا کر ذبح کیا گیا جانور بھی حرام ہے۔

﴿وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ ؕ﴾ ''اور یہ کہ جوئے کے تیروں کے ذریعے سے تقسیم کرو۔''

یہ بھی جوئے کی ایک قسم تھی۔ عربوں کے ہاں رواج تھا کہ وہ قربانی کے بعد گوشت کے ڈھیر لگا دیتے تھے اور تیروں کے ذریعے گوشت پر جوا کھیلتے تھے۔

﴿ذٰلِكُمْ فِسْقٌ ؕ﴾ ''یہ تمام گناہ کے کام ہیں۔''

﴿اَلْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ دِيْنِكُمْ﴾ ''اب یہ کافر لوگ تمہارے دین سے مایوس ہو چکے ہیں''

یعنی یہ لوگ اب یہ حقیقت جان چکے ہیں کہ اللہ کا دین غالب ہوا چاہتا ہے اور اس کا راستہ روکنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے' سورۃ المائدۃ نزول کے اعتبار سے آخری سورتوں میں سے ہے۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب عرب میں اسلام کے غلبہ کے آثار صاف نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔

﴿فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ ؕ﴾ ''تو ان سے مت ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو۔''

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ﴾ ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا ہے''

﴿وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ﴾ ''اور تم پر اتمام فرما دیا ہے اپنی نعمت کا''

﴿وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾ ''اور تمہارے لیے میں نے پسند کر لیا ہے اسلام کو بحیثیت دین کے۔''

میرے ہاں پسندیدہ اور مقبول دین ہمیشہ ہمیش کے لیے صرف اسلام ہے۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ﴾ ''لیکن جو شخص بھوک میں مضطر ہو جائے (اور کوئی حرام شے کھا لے)''

اگر کسی انسان پر شدید فاقہ کی کیفیت ہو' بھوک سے اس کی جان نکل رہی ہو تو وہ ان حرام کردہ چیزوں میں سے جان بچانے کے بقدر کھا سکتا ہے۔

﴿غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ ۙ﴾ ''(بشرطیکہ) اس کا گناہ کی طرف کوئی رُجحان نہ ہو''

نیت میں کوئی فتور نہ ہو' بلکہ حقیقت میں جان پر بنی ہو اور دل میں نافرمانی کا کوئی خیال نہ ہو۔

﴿فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳﴾ ''تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔''

آیت ۴ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ؕ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا کیا حلال ہے؟''

﴿قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۙ﴾ ''آپ (ﷺ انھیں) بتائیں کہ تمہارے لیے سب پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں ہیں۔''

﴿وَمَا عَلَّمْتُمْ مِّنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِيْنَ تُعَلِّمُوْنَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ اللّٰهُ ۡ﴾ ''اور یہ جو تم سدھاتے ہو شکاری جانوروں کو' پھر چھوڑتے ہو ان کو شکار کے لیے' انہیں تم نے سکھایا ہے اس میں سے جو اللہ نے تمہیں سکھایا ہے۔''

﴿فَكُلُوْا مِمَّآ اَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ﴾ ''تو تم ان کے اُس شکار میں سے کھاؤ جو وہ تمہارے لیے روکے رکھیں۔''

﴿وَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهِ ۠﴾ ''اور اس پر اللہ کا نام لے لو۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۴﴾ ''یقیناً اللہ بہت جلد حساب چکانے والا ہے۔''

اسے حساب لینے میں دیر نہیں لگتی۔

آیت ۵ ﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ؕ﴾ ''آج تمہارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔''

یہ وہی اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ ..... والا انداز ہے۔ یعنی اس سے پہلے اگر مختلف مذاہب کے احکام کی وجہ سے‘ یہود کی شریعت یا حضرت یعقوب علیہ السلام کی ذاتی پسند و ناپسند کی بنا پر اگر کچھ رکاوٹیں پیدا ہو گئی تھیں یا معاشرے میں رائج مشرکانہ رسومات و اوہام کی وجہ سے تمہارے ذہنوں میں کچھ اُلجھنیں تھیں تو آج ان سب کو صاف کیا جا رہا ہے اور آج تمہارے لیے تمام صاف ستھری اور پاکیزہ چیزوں کے حلال ہونے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

﴿وَطَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ ۖ﴾ ’’اور اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔‘‘

لیکن یہ صرف اُس صورت میں ہے کہ وہ کھانا اصلاً بھی حلال ہو‘ کیونکہ اگر ایک عیسائی سؤر کھا رہا ہو گا تو وہ ہمارے لیے حلال نہیں ہو گا۔ اس کھانے میں اُن کا ذبیحہ بھی شامل ہے‘ دو بنیادی شرائط کے ساتھ: ایک یہ کہ جانور حلال ہو اور دوسرے یہ کہ اسے اللہ کا نام لے کر ذبح کیا گیا ہو۔

﴿وَطَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّهُمْ ۖ﴾ ’’اسی طرح تمہارا کھانا بھی ان کے لیے حلال ہے۔‘‘

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ﴾ ’’اور (تمہارے لیے حلال ہیں) اہلِ ایمان میں سے خاندانی عورتیں‘‘

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ﴾ ’’اور خاندانی عورتیں اُن لوگوں کی جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی‘‘

یعنی مسلمان مرد عیسائی یا یہودی عورت سے شادی کر سکتا ہے۔

﴿اِذَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ ’’جب کہ تم انہیں ادا کر دو ان کے مہر‘‘

﴿مُحْصِنِیْنَ﴾ ’’قیدِ نکاح میں لا کر ان کے محافظ بنتے ہوئے‘‘

نیت یہ ہو کہ تم نے ان کو اپنے گھر میں بسانا ہے‘ مستقل طور پر ایک خاندان کی بنیاد رکھنی ہے۔

﴿غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ﴾ ’’نہ کہ آزاد شہوت رانی کے لیے‘‘

﴿وَلَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ ۭ﴾ ’’اور نہ ہی چوری چھپے آشنائی کرنے کے لیے۔‘‘

بلکہ معروف طریقے سے علی الاعلان نکاح کر کے تم انہیں اپنے گھروں میں آباد کرو اور ان کے محافظ بنو۔ اس ضمن میں یہاں بعض اشکالات کا رفع کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک شریعتِ اسلامی کا حکم ہے تو شریعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو چکی ہے‘ اب اس میں تغیر و تبدل ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے یہ قانون اپنی جگہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ یہ تو ہے اس کا جواز‘ لیکن اگر آج اس کے خلاف کسی کو کوئی مصلحت نظر آتی ہے تو وہ اپنی جگہ درست ہو سکتی ہے‘ بہر حال اس کے باوجود قانون کو بدلا نہیں جا سکتا۔ البتہ ایک خالص اسلامی ریاست کے تحت حالات کی سنگینی کے پیشِ نظر کچھ عرصے کے لیے کسی ایسی اجازت یا حکم کو موقوف کیا جا سکتا ہے۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے زمانے میں قحط کے سبب قطعِ ید (ہاتھ کاٹنے) کی سزا کو موقوف کر دیا تھا۔ اس طرح کسی قانون میں اسلامی حکومت کے کسی عارضی انتظامی حکم (Executive Order) کے ذریعے سے کوئی عارضی تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ مزید برآں اس اجازت کے پس منظر میں جو فلسفہ اور حکمت ہے اس کی اصل روح کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ یہ اجازت صرف مسلمان مَردوں کو دی گئی ہے کہ وہ عیسائی یا یہودی عورتوں سے شادی کر سکتے ہیں‘ مسلمان عورت عیسائی یا یہودی مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر مرد عورت پر غالب ہوتا ہے‘ لہٰذا امکانِ غالب ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اسلام کی طرف راغب کر لے گا۔ دوسرے یہ کہ اُس

زمانے میں یہ بات مسلّمہ تھی کہ اولاد مرد کی ہے' اور مرد کے غالب اور فعال ہونے کا مطلب یہ تھا کہ ایسے میاں بیوی کی اولاد عیسائی یا یہودی نہیں بلکہ مسلمان ہوگی۔ اُس وقت ویسے بھی مسلمانوں کا غلبہ تھا اور یہودی اور عیسائی ان کے تابع ہو چکے تھے۔ آج کل حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ آج عیسائی اور یہودی غالب ہیں' جبکہ مسلمان انتہائی مغلوب۔ دوسری طرف بین الاقوامی سیاست میں عورتوں کا غلبہ ہے۔ لہٰذا موجودہ حالات میں مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ایسی شادیاں نہ ہوں' لیکن بہرحال ان کو حرام نہیں کہا جا سکتا' کیونکہ اس کے جواز کا واضح حکم موجود ہے۔ ہاں اگر کوئی اسلامی ریاست کہیں قائم ہو جائے تو وہ عارضی طور پر (جب تک حالات میں کوئی تبدیلی نہ آ جائے) اس اجازت کو منسوخ کر سکتی ہے۔

﴿وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ﴾ ''تو جس شخص نے ایمان کے ساتھ کفر کیا اُس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے''

اس میں اشارہ اہلِ کتاب کی طرف بھی ہو سکتا ہے کہ جب تک محمد رسول اللہ ﷺ تشریف نہیں لائے تھے تب تک وہ اہلِ ایمان تھے لیکن اب اگر وہ نبی آخر الزماں ﷺ پر ایمان نہیں لا رہے تو گویا وہ کفر کر رہے ہیں۔ اس کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ کوئی شخص ایمان کا مدعی ہو کر کافرانہ حرکتیں کرے تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

﴿وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۵﴾ ''اور آخرت میں وہ ہوگا خسارہ اٹھانے والوں میں۔''

آیات ۶ تا ۱۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ۭ وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰي سَفَرٍ اَوْ جَاۗءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَاۗىِٕطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَاۗءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاۗءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ۭ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۶ وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۷ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۹ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۰ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱ ع

آیت ۶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ﴾ ''اے اہلِ ایمان! جب تم کھڑے ہو نماز کے لیے''

یعنی جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو۔

﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ ''تو دھولیا کرو اپنے چہرے اور دونوں ہاتھ بھی کہنیوں تک''

﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ ''اور اپنے سروں پر مسح کرلیا کرو''

﴿وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ ''اور (دھولیا کرو) اپنے دونوں پاؤں بھی ٹخنوں تک۔''

یہاں پر واضح رہے کہ اَرْجُلَكُمْ اور اَرْجُلِكُمْ دونوں قراءتیں مستند ہیں لہٰذا اہلِ تشیع اس کو مستقلاً اَرْجُلِكُمْ پڑھتے ہیں۔ اس طرح ان کے نزدیک اس میں پاؤں پر مسح کا حکم ہے۔ چنانچہ وہ ﴿وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ﴾ کا ترجمہ اس طرح کرتے ہیں: ''اور مسح کرلیا کرو اپنے سروں پر بھی اور اپنے پاؤں پر بھی''۔ لیکن اہلِ سُنّت کے نزدیک یہ اَرْجُلَكُمْ ہے اور اِلَى الْكَعْبَيْنِ کے اضافے سے یہاں پاؤں کو دھونے کا حکم بالکل واضح ہوگیا ہے۔ اگر صرف مسح کرنا مطلوب ہوتا تو اس میں کوئی حد بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ لہٰذا اِلَى الْكَعْبَيْنِ کی شرط سے یہ ٹکڑا ﴿فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ﴾ کے بالکل مساوی ہوگیا ہے۔ جیسے ہاتھوں کا دھونا ہے کہنیوں تک ایسے ہی پاؤں کا دھونا ہے ٹخنوں تک۔ اس حکم میں وضو کے فرائض بیان ہوئے ہیں۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ ''اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو پھر تم اور زیادہ پاکی حاصل کرو۔''

یعنی پورے جسم کا غسل کرو۔ جنابت کی حالت میں نماز پڑھنا' قرآن کی تلاوت کرنا یا قرآن کو ہاتھ لگانا جائز نہیں۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ﴾ ''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر پر ہو''

﴿اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ﴾ ''یا تم میں سے کوئی کسی نشیبی جگہ سے ہو کر آئے''

یہ استعارہ ہے قضائے حاجت کے لیے۔ عام طور پر لوگ قضائے حاجت کے لیے نشیبی جگہوں پر جاتے تھے۔

﴿اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ ''یا تم نے عورتوں سے مقاربت کی ہو''

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً﴾ ''اور تمہیں پانی دستیاب نہ ہو''

﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ ''تو ارادہ کرلو پاک مٹی کا''

یعنی پاک مٹی سے تیمم کرلیا کرو۔

﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ ''تو اس سے اپنے چہرے اور ہاتھوں کو مل لو۔''

﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ﴾ ''اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی کرے''

﴿وَّلٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ﴾ ''بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کردے''

﴿وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ ''اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرمائے تاکہ تم شکرگزار بن سکو۔''

آیت ۷ ﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ﴾ ''اور اللہ نے تمہیں جو اپنی نعمت عطا کی ہے اس کو یاد رکھو اور اس معاہدے کو بھی جو اُس نے تم سے باندھ لیا ہے (یا جس میں اس نے تمہیں باندھ لیا ہے)''

ایک میثاق وہ تھا جو بنی اسرائیل سے لیا گیا تھا' اب ایک میثاق یہ ہے جو اہلِ ایمان سے ہو رہا ہے۔ چونکہ یہ سورۃ شروع ہوئی تھی یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا سے' یعنی اس کے آغاز میں اہلِ ایمان سے خطاب ہے' لہٰذا اس میثاق میں بھی اہلِ ایمان ہی مخاطب ہیں۔

﴿اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ ''جب تم نے کہا تھا ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی۔''

سورۃ البقرۃ کی آخری آیت سے پہلے والی آیت میں اہلِ ایمان کا یہ اقرار موجود ہے: ﴿سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ﴾۔ اب جو مسلمان بھی سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتا ہے وہ گویا ایک میثاق اور ایک بہت مضبوط معاہدے کے اندر اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندھ جاتا ہے۔ یعنی اب اُسے اللہ کی شریعت کی پابندی کرنی ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' یقیناً اللہ تعالیٰ سینوں کے رازوں سے بھی واقف ہے۔''

آیت ۸ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بن جاؤ''

یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان دونوں آیات میں الفاظ کی ترتیب عکسی ہے (دونوں سورتوں کی نسبتِ زوجیت بھی مدِنظر رہے)۔ وہاں الفاظ آئے ہیں: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ اور یہاں الفاظ ہیں: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫﴾۔ اس سے ایک نکتہ تو یہ معلوم ہوا کہ گویا ''اللہ'' اور ''قِسط'' مترادف الفاظ ہیں۔ ایک جگہ فرمایا گیا ہے: ''قِسط کے لیے کھڑے ہو جاؤ'' اور دوسری جگہ فرمایا جا رہا ہے: ''اللہ کے لیے کھڑے ہو جاؤ''۔ اسی طرح ایک جگہ اللہ کے گواہ بن جانے اور دوسری جگہ قسط کے گواہ بننے کا حکم ہے۔ تو گویا ان دونوں آیات میں ''اللہ'' اور ''قِسط'' کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف کے طور پر آئے ہیں۔

دوسرا اہم نکتہ اِس آیت سے ہمارے سامنے یہ آ رہا ہے کہ معاشرے میں عدل قائم کرنے کا حکم ہے۔ انسان فطرتاً انصاف پسند ہے۔ انصاف عام انسان کی نفسیات اور اس کی فطرت کا تقاضا ہے۔ آج پوری نوعِ انسانی انصاف کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ انصاف ہی کے لیے انسان نے بادشاہت سے نجات حاصل کی اور جمہوریت کو اپنایا تاکہ انسان پر انسان کی حاکمیت ختم ہو' انصاف میسر آئے' مگر جمہوریت کی منزل سراب ثابت ہوئی اور ایک دفعہ انسان پھر سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) کی لعنت میں گرفتار ہو گیا۔ اب سرمایہ دار اس کے آقا اور ڈکٹیٹر بن گئے۔ اس لعنت سے نجات کے لیے اُس نے کمیونزم (Communism) کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر یہاں بھی متعلقہ پارٹی کی آمریت (One Party Dictatorship) اس کی منتظر تھی۔ گویا ''رُست از یک بند تا اُفتاد در بندے دِگر''' یعنی ایک مصیبت سے نجات پائی تھی کہ دوسری آفت میں گرفتار ہو گئے۔ اب انسان عدل اور انصاف حاصل کرنے کے لیے آخر کہاں جائے؟ کیا کرے؟ یہاں پر ایک روشنی تو انسان کو اپنی فطرت کے اندر سے ملتی ہے کہ اس کی فطرت انصاف کا تقاضا کرتی ہے اور اپنی فطرت کے اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے وہ عدل قائم کرنے کے لیے کھڑا ہو جائے' مگر اس سے اوپر بھی ایک منزل ہے اور وہ یہ ہے کہ ''العدل'' اللہ کی ذات ہے جس کا دیا ہوا نظام ہی عادلانہ نظام ہے۔ ہم اُس کے بندے ہیں' اُس کے وفادار ہیں' لہٰذا اُس کے نظام کو قائم کرنا ہمارے ذمے ہے' ہم پر فرض ہے۔ چنانچہ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫﴾ میں اسی بلند تر منزل کا ذکر ہے کہ اے اہلِ ایمان! یہ صرف فطرتِ انسانی ہی کا تقاضا نہیں بلکہ تمہاری عبدیت کا تقاضا بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہاری وفاداری کے رشتے کا تقاضا ہے کہ تم پوری قوت کے ساتھ' اپنے تمام تر وسائل کے ساتھ' جو بھی اسباب و ذرائع تمہیں میسر ہوں ان سب کو جمع کر کے کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے! اور اللہ کے دین میں جو تصور ہے عدل' انصاف اور قسط کا اُس

عدل وانصاف اور قسط کو قائم کرنے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ یہ ہے اس حکم کا تقاضا۔

اب دیکھئے، وہاں (سورۃ النساء آیت ۱۳۵ میں) فرمایا گیا ہے: ''اے ایمان والو! انصاف کے علمبردار اور اللہ واسطے کے گواہ بن جاؤ''۔ ﴿وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾ ''اگرچہ اس کی (تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی) زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین یا رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔''

انصاف سے روکنے والے عوامل میں سے ایک اہم عامل مثبت تعلق یعنی محبت ہے۔ اپنی ذات سے محبت، والدین اور رشتہ داروں وغیرہ کی محبت انسان کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ میں اپنے خلاف کیسے فتویٰ دے دوں؟ اپنے ہی والدین کے خلاف کیونکر فیصلہ سنا دوں؟ سچی گواہی دے کر اپنے عزیز رشتہ دار کو کیسے پھانسی چڑھا دوں؟ لہٰذا ''وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ.....'' فرما کر اس نوعیت کی تمام عصبیتوں کی جڑ کاٹ دی گئی کہ بات اگر حق کی ہے، انصاف کی ہے تو پھر خواہ وہ تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جا رہی ہو، تمہارے والدین پر ہی اس کی زد کیوں نہ پڑ رہی ہو، تمہارے عزیز رشتہ دار ہی اس کی کاٹ کے شکار کیوں نہ ہو رہے ہوں، اس کا اظہار بغیر کسی مصلحت کے ڈنکے کی چوٹ پر کرنا ہے۔

اس سلسلے میں دوسرا عامل منفی تعلق ہے، یعنی کسی فرد یا گروہ کی دشمنی، جس کی وجہ سے انسان حق بات کہنے سے پہلوتہی کر جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ بات تو حق کی ہے مگر ہے تو وہ میرا دشمن، لہٰذا اپنے دشمن کے حق میں آخر کیسے فیصلہ دے دوں؟ آیت زیر نظر میں اس عامل کو بیان کرتے ہوئے دشمنی کی بنا پر بھی کتمانِ حق سے منع کر دیا گیا:

﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ﴾ ''اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل سے منحرف ہو جاؤ۔''

﴿اِعْدِلُوْا ۟﴾ ''عدل سے کام لو''

﴿هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫﴾ ''یہی قریب تر ہے تقویٰ کے''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۸﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ یقیناً اس سے باخبر ہے۔''

تمہارا کوئی عمل اور کوئی قول اس کے علم سے خارج نہیں، لہٰذا ہر وقت چوکس رہو، چوکنے رہو۔ (آیت زیر نظر اور سورۃ النساء کی آیت ۱۳۵ کے معانی و مفہوم کا باہمی ربط اور الفاظ کی عکسی اور reciprocal ترتیب کا حسن لائقِ توجہ ہے۔)

آیت ۹ ﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝۹﴾ ''اللہ کا وعدہ ہے اُن لوگوں سے جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے کہ ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور اجرِ عظیم بھی۔''

آیت ۱۰ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝۱۰﴾ ''اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہی لوگ جہنم والے ہیں۔''

آیت ۱۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ هَمَّ قَوْمٌ اَنْ يَّبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ﴾ ''اے اہلِ ایمان! ذرا یاد کرو اللہ کے اُس انعام کو جو اُس نے تم پر کیا جب ارادہ کیا تھا ایک قوم نے کہ تمہارے خلاف اپنے ہاتھ بڑھائیں''

﴿فَكَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ﴾ ''تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے ہاتھوں کو روک دیا تم سے۔''

یہ غزوۂ احزاب کے بعد کے حالات پر تبصرہ ہے۔ اس غزوہ کے بعد ابھی کفار میں سے بہت سے لوگ پیچ وتاب کھا رہے تھے اور بعید نہیں تھا کہ وہ دوبارہ مہم جوئی کرتے' لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیدا کر دیے اور ان کے دلوں میں ایسا رُعب ڈال دیا کہ وہ دوبارہ لشکر کشی کی جرأت نہ کر سکے۔ اس صورتِ حال کا ذکر اللہ تعالیٰ یہاں اپنے انعام کے طور پر کر رہے ہیں۔ اس میں خاص طور پر صلح حدیبیہ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ اُس وقت بھی قریش لڑائی کے لیے بیتاب ہو رہے تھے' ان کے نوجوانوں کا خون کھول رہا تھا' لیکن بالآخر انہیں اس حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ اب ہم مسلمانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رُعب ڈال دیا اور ان کے ہاتھوں کو مسلمانوں کے خلاف اٹھنے سے روک دیا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝۱۱﴾ ''اور تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اہلِ ایمان کو تو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔''

آیات ۱۲ تا ۱۹

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۝۱۲ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۳ وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝۱۴ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَاۗءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۭ قَدْ جَاۗءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۵ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۶ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۷ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّاۗؤُهٗ ۭ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ۭ بَلْ

اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ۫ وَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ﴿۱۸﴾ یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّ لَا نَذِیْرٍ ۫ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِیْرٌ وَّ نَذِیْرٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۹﴾ ع

اب یہاں سے آگے بنی اسرائیل کی تاریخ کے چند واقعات کا ذکر ہے۔

آیت ۱۲ ﴿وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے بھی میثاق لیا تھا۔''

یعنی اے مسلمانو! جس طرح آج تم سے یہ میثاق لیا گیا ہے اور اللہ نے تمہیں شریعت کے میثاق میں باندھ لیا ہے' بالکل اسی طرح کا میثاق اللہ تعالیٰ نے تم سے پہلے بنی اسرائیل سے بھی لیا تھا۔

﴿وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا ؕ﴾ ''اور ان میں ہم نے مقرر کیے تھے بارہ نقیب۔''

بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے' ہر قبیلے میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک نقیب مقرر کیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی انصار میں بارہ نقیب مقرر فرمائے تھے' نو خزرج میں سے اور تین اوس میں سے۔

﴿وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ﴾ ''اور اللہ نے (ان سے) فرمایا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

میری مدد' میری تائید' میری نصرت تمہارے شاملِ حال رہے گی۔

﴿لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ﴾ ''اگر تم نے نماز کو قائم رکھا اور تم زکوٰۃ ادا کرتے رہے''

﴿وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ﴾ ''اور میرے رسولوں پر ایمان لاتے رہے''

﴿وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ﴾ ''اور ان (رسولوں) کی تم مدد کرتے رہے''

یہ ان رسولوں کا ذکر ہے جو پے در پے بنی اسرائیل میں آتے رہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تو بنی اسرائیل میں رسالت کا یہ سلسلہ ایک تار کی مانند تھا جو چھ سو برس تک ٹوٹا ہی نہیں۔ پھر ذرا سا وقفہ چھ سو برس کا آیا اور اس کے بعد نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔

﴿وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا﴾ ''اور (اگر) تم اللہ کو قرضِ حسنہ دیتے رہے''

یعنی اللہ کے دین کے لیے مال خرچ کرتے رہے۔

﴿لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ﴾ ''تو میں لازماً دور کر دوں گا تم سے تمہاری برائیاں''

﴿وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ﴾ ''اور میں لازماً داخل کر دوں گا تمہیں ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔''

﴿فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۲﴾﴾ ''تو جس نے کفر کیا اس کے بعد تم میں سے تو وہ سیدھے راستے سے بھٹک کر رہ گیا۔''

آیت ۱۳ ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ﴾ ''پس ان کے اپنے اس عہد کو توڑنے کے باعث ہم نے ان پر لعنت فرمائی''

قبل ازیں سورۃ النساء آیت ۱۵۵ میں ''لَعَنّٰهُمْ'' کے محذوف ہونے کا ذکر ہوا تھا' لیکن یہاں پر یہ واضح ہو کر آ گیا ہے کہ ہم

نے ان کے اس میثاق کو توڑنے کی پاداش میں اُن پر لعنت فرمائی۔

﴿وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ﴾ ''اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا۔''

جیسے سورۃ البقرہ (آیت ۷۴) میں فرمایا: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ۭ﴾ ''پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس کے بعد' پتھروں کی طرح بلکہ پتھروں سے بھی بڑھ کر سخت''۔ یہاں پر وہی بات دہرائی گئی ہے۔

﴿يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ﴾ ''وہ کلام کو اس کے اصل مقام سے ہٹاتے تھے''

﴿وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ﴾ ''اور جو کچھ ان کو دیا گیا تھا نصیحت کے طور پر اس کے اکثر حصے کو وہ بھول گئے۔''

اور انہوں نے اس سے فائدہ اٹھانا چھوڑ دیا۔

﴿وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰي خَاۗىِٕنَةٍ مِّنْهُمْ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) آپ ہمیشہ ان کی طرف سے خیانت کی اطلاع پاتے رہیں گے''

رسول اللہ ﷺ جیسے ہی مدینہ پہنچے تھے تو آپ ﷺ نے اس نئی جگہ پر اپنی پوزیشن مضبوط کرنے کے لیے پہلے چھ مہینوں میں جو تین کام کیے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ آپؐ نے یہود کے تینوں قبیلوں سے مدینہ کے مشترکہ دفاع کے معاہدے کر لیے کہ اگر مدینے پر حملہ ہوگا تو سب مل کر اس کا دفاع کریں گے' لیکن بعد میں ان میں سے ہر قبیلے نے ایک ایک کر کے غداری کی۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ ان کی طرف سے مسلسل خیانتیں ہوتی رہیں گی' لہٰذا آپ کو ان کی طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے اور ان کی سازشوں کا توڑ کرنے کے لیے پہلے سے تیار رہنا چاہیے۔

﴿اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ﴾ ''سوائے ان میں سے چند ایک کے''

ان میں سے بہت تھوڑے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

﴿فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ﴾ ''لہٰذا (ابھی) آپؐ انھیں معاف کرتے رہیں اور درگزر سے کام لیں۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۳﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿وَمِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ﴾ ''اور جن لوگوں نے کہا ہم نصاریٰ ہیں' ہم نے ان سے بھی میثاق لیا''

﴿فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۠﴾ ''تو وہ بھی بھول گئے بڑا حصہ اُس کا جس کی ان کو نصیحت کی گئی تھی۔''

وہ اس نصیحت سے فائدہ اٹھانا بھول گئے۔

﴿فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ﴾ ''تو ہم نے ڈال دی اُن کے درمیان دشمنی اور بغض قیامت کے دن تک۔''

اس میں عیسائیوں کی یہودیوں کے ساتھ دشمنی کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔ ماضی میں عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان پورے انیس سو برس شدید دشمنی رہی ہے۔ موجودہ دور میں صورتِ حال عارضی طور پر کچھ تبدیل ہو گئی ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بلکہ خدا سمجھتے ہیں جبکہ یہودیوں نے انہیں ولد الزنا قرار دیا اور کافر و مرتد کہتے ہوئے واجب القتل ٹھہرایا۔ یہ بنیادی اختلاف

دونوں مذاہب کے پیروکاروں میں اس قدر اہم اور شدید ہے کہ اس کی موجودگی میں دونوں میں اتحاد و اتفاق ممکن ہی نہیں۔ لیکن آیت زیر نظر میں بنیادی طور پر عیسائیوں کی آپس کی دشمنی اور ان کا باہمی بغض و عناد مراد ہے۔ ان کے مختلف فرقوں کے درمیان نظریاتی اختلافات ان کی دلی کدورتوں اور نفرتوں سے بڑھ کر بارہا باہمی جنگ و جدل کی شکل میں نمودار ہوتے رہے ہیں۔ مذہبی بنیادوں پر عیسائی فرقوں کی آپس کی خانہ جنگیوں کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مذہب کے نام پر عیسائیوں کی خون ریزی اور قتل و غارت گری کی عبرت آموز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی تفصیلات ''Blood on the Cross'' نامی ضخیم کتاب میں ملتی ہیں' جو لندن سے شائع ہوئی ہے۔ خاص طور پر پروٹسٹنٹس (Protestants) اور کیتھولکس (Catholics) کی باہمی چپقلش تو کوئی پوشیدہ راز نہیں' جس کی ہلکی سی جھلک آج بھی ہمیں آئرلینڈ میں نظر آتی ہے۔

﴿وَسَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۴﴾﴾ ''اور عنقریب اللہ تعالیٰ جتلا دے گا انہیں جو کچھ وہ کرتے رہے تھے۔'' اگلی آیات کا انداز سورۃ النساء کی آخری آیات سے ملتا جلتا ہے۔

آیت ۱۵ ﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا﴾ ''اے اہلِ کتاب' آ گیا ہے تمہارے پاس ہمارا رسول''

﴿يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ﴾ ''جو ظاہر کر رہا ہے تم پر وہ بہت سی باتیں جن کو تم چھپا رہے تھے کتاب میں سے''

﴿وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ؕ﴾ ''اور بہت سی باتوں سے تو درگزر بھی کر رہا ہے۔''

﴿قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۵﴾﴾ ''آ چکا ہے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک نُور بھی اور ایک روشن کتاب بھی۔''

یہاں نور سے مراد نبی اکرم ﷺ کی شخصیت بھی ہو سکتی ہے۔ سورۃ النساء' آیت ۱۷۴ میں جو فرمایا گیا: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا﴾ ''اور نازل کر دیا ہے ہم نے تمہاری طرف ایک روشن نور'' وہاں نور سے مراد قرآن ہے' اس لیے کہ حضور ﷺ کے لیے فعل اَنْزَلْنَا درست نہیں۔ لیکن یہاں زیادہ احتمال یہی ہے کہ نور سے مراد رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہے' یعنی آپ ﷺ کی روحِ پُرنور۔ آپ ﷺ کی روح اور روحانیت آپ ﷺ کے پورے وجود پر غالب تھی' اس لحاظ سے آپ ﷺ کو نورِ مجسم بھی کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک رائے یہ ہے کہ اس آیت میں آپ ﷺ کو استعارۃً ''نُور'' کہا گیا ہے۔ البتہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں نور بھی قرآن پاک ہی کو کہا گیا ہو اور ''و'' اس میں واوِ تفسیری ہو۔ اس صورت میں مفہوم یوں ہوگا: ''آ گیا ہے تمہارے پاس نور یعنی کتابِ مبین۔''

آیت ۱۶ ﴿يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ ''اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ رہنمائی فرماتا ہے ان کی جو اُس کی رضا کے طالب ہیں' سلامتی کے راستوں کی طرف''

﴿وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾﴾ ''اور نکالتا ہے انہیں اندھیروں سے روشنی کی طرف اپنے حکم سے اور ان کی رہنمائی فرماتا ہے سیدھے راستے کی طرف۔''

آیت ۱۷ ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ﴾ ''یقیناً کفر کیا انہوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ ہی مسیح ابنِ مریم ہے۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کے ہاں جو دو عقیدے رہے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ ہی مسیحؑ ہے۔ اس عقیدے کی بنیاد اس نظریہ پر قائم ہے کہ خدا خود ہی انسانی شکل میں ظہور کر لیتا ہے۔ اس عقیدے کو God Incarnate کہا جاتا ہے' یعنی اوتار کا عقیدہ جو ہندوؤں میں بھی رائج ہے۔ جیسے رام چندر جی' کرشن جی مہاراج اُن کے ہاں خدا کے اوتار مانے جاتے ہیں۔ چنانچہ عیسائیوں کا فرقہ Jacobites خاص طور پر God Incarnate کے عقیدے کا سختی سے قائل رہا ہے' کہ اصل میں اللہ ہی نے حضرت مسیحؑ کی شکل میں دنیا میں ظہور فرمایا۔ جیسے ہمارے ہاں بھی بعض لوگ نبی مکرم ﷺ کی محبت و عقیدت اور عظمت کے اظہار میں غلو سے کام لے کر حد سے تجاوز کرتے ہوئے یہاں تک کہہ جاتے ہیں: ؎

وہی جو مستوئ عرش تھا خدا ہو کر
اُتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ہو کر

اس آیت میں عیسائیوں کے اسی عقیدے کا ابطال کیا گیا ہے۔

﴿قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا﴾ ''تو ان سے پوچھئے کون ہے جسے اختیار ہو اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی''

﴿اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ﴾ ''اگر وہ ہلاک کرنا چاہے مسیحؑ ابنِ مریم کو اور اُس کی ماں کو''

﴿وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ؕ﴾ ''اور جو زمین میں ہیں ان سب کو''

اگر اللہ تعالیٰ ان سب کو ہلاک کرنا چاہے تو کون ہے جو اُس کا ہاتھ روک لے گا؟

﴿وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ؕ﴾ ''اور اللہ ہی کے لیے ہے بادشاہی آسمانوں اور زمین کی اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے (سب کی)۔''

﴿يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ﴾ ''وہ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

وہ جو چاہتا ہے' جیسے چاہتا ہے' تخلیق فرماتا ہے۔ اُس نے حضرت آدمؑ' حضرت عیسیٰ اور حضرت یحییٰ علیہم السلام کو معجزانہ طور پر پیدا فرمایا۔

آیت ۱۸ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصٰرٰى نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ ؕ﴾ ''یہودی اور نصرانی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اُس کے بڑے چہیتے ہیں۔''

یعنی بیٹوں کی مانند ہیں' بڑے لاڈلے اور پیارے ہیں۔

﴿قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''(تو ان سے) کہیے کہ پھر وہ تمہیں عذاب کیوں دیتا رہا ہے تمہارے گناہوں کی پاداش میں؟''

اگر تم اللہ کی اولاد ہو' اُس کے بڑے چہیتے ہو' تو کیا اسی لیے بخت نصر (Nebukadnezar) کے ہاتھوں اُس نے تمہیں پٹوایا تھا۔ اس نے تمہارے چھ لاکھ افراد قتل کروا دیے تھے' چھ لاکھ قیدی بنا لیے تھے اور تمہارا ہیکلِ اوّل بھی شہید کر دیا تھا۔ پھر آشوریوں نے تمہاری سلطنت اسرائیل کو روند ڈالا۔ پھر یونانیوں کے ہاتھوں تمہارا استحصال ہوا۔ پھر رومیوں نے تمہارے اوپر ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے اور رومن جنرل طیطس (Titus) نے تمہارا دوسرا ہیکل بھی مسمار کر دیا۔ کیا ایسے ہی لاڈلے ہوتے ہیں اللہ

کے؟ کیا اللہ اتنا ہی لاچار اور عاجز ہے کہ اپنے لاڈلوں کو ذلت وخواری اور ظلم وستم سے بچا نہیں سکتا؟

﴿بَلْ اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ ؕ﴾ ''(نہیں!) بلکہ تم بھی انسان ہو جیسے دوسرے انسان اُس نے پیدا کیے ہیں۔''

﴿یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ﴾ ''وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سزا دیتا ہے۔''

﴿وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَهُمَا ۫﴾ ''اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے' سب کی بادشاہی''

﴿وَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ﴿۱۸﴾﴾ ''اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔''

آیت ۱۹ ﴿یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا﴾ ''اے اہلِ کتاب! تمہارے پاس آ چکا ہے ہمارا رسول''

﴿یُبَیِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ﴾ ''جو تمہارے لیے (دین کو) واضح کر رہا ہے' رسولوں کے ایک وقفے کے بعد''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان چھ سو برس ایسے گزرے ہیں کہ اس دوران دنیا میں کوئی نبی' کوئی رسول نہیں رہا۔ اس وقفے کو اصطلاح میں 'فترت' کہا جاتا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور پھر اس کے بعد تا قیامِ قیامت رسالت کا دروازہ بند ہو گیا۔

﴿اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّ لَا نَذِیْرٍ ۫﴾ ''مبادا تم کہو کہ ہمارے پاس تو آیا ہی نہیں تھا کوئی بشارت دینے والا اور نہ کوئی خبردار کرنے والا''

﴿فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِیْرٌ وَّ نَذِیْرٌ ؕ﴾ ''تو (سن لو!) آ گیا ہے تمہارے پاس بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا۔''

﴿وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۹﴾﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

سورۃ النساء میں یہی بات اس انداز سے بیان ہو چکی ہے: ﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ لِئَلَّا یَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ عَزِیْزًا حَكِیْمًا ﴿۱۶۵﴾﴾ ''یہ رسولؑ (بھیجے گئے) بشارت دینے والے اور خبردار کرنے والے بنا کر تا کہ نہ رہ جائے لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت (دلیل) رسولوں کے آنے کے بعد۔ اور اللہ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

آیات ۲۰ تا ۲۶

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْكُمْ اَنْۢبِیَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖۗ وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۰﴾ یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۲۱﴾ قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۖۗ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى یَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَیْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۳﴾ قَالُوْا یٰمُوْسٰۤى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَاۤ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِیْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ

اَمۡلِكُ اِلَّا نَفۡسِیۡ وَ اَخِیۡ فَافۡرُقۡ بَیۡنَنَا وَ بَیۡنَ الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۵﴾ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ
عَلَیۡهِمۡ اَرۡبَعِیۡنَ سَنَةً ۚ یَتِیۡهُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ فَلَا تَاۡسَ عَلَی الۡقَوۡمِ الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾ ع ۸

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا وہ واقعہ آ رہا ہے جب آپؑ مصر سے اپنی قوم کو لے کر نکلے' صحرائے سینا میں رہے' آپؑ کو کوہِ طور پر بلایا گیا اور تورات دی گئی۔ اس کے بعد آپؑ کو حکم ہوا کہ فلسطین میں داخل ہو جاؤ اور وہاں پر آباد مشرک اور کافر قوم (جو فلسطی کہلاتے تھے) کے ساتھ جنگ کرو اور انہیں وہاں سے نکالو' کیونکہ یہ ارضِ مقدس تمہارے لیے اللہ کی طرف سے موعود ہے۔ ان کے جدِ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کا تعلق اس خطہ سے تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے میں حضرت یوسف علیہ السلام کی وساطت سے بنی اسرائیل مصر میں منتقل ہوئے۔ پھر جب حضرت موسیٰؑ انہیں مصر سے لے کر نکلے تو انہیں حکم ہوا کہ اب جاؤ' اپنے اصل گھر (ارضِ فلسطین) کو دوبارہ حاصل کرو۔ لیکن جب جنگ کا موقع آیا تو پوری قوم نے کورا جواب دے دیا کہ ہم جنگ کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزاج میں جو تلخی پیدا ہوئی اور طبیعت کے اندر بے زاری کی جو کیفیت پیدا ہوئی' اس کی شدت یہاں نظر آتی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ رسول اپنی اُمت کے حق میں سراپا شفقت ہوتا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ رسول کا معاملہ بھی اللہ تعالیٰ کی مانند ہے۔ جیسے اللہ رؤف بھی ہے' وَدُود بھی' لیکن ساتھ ہی وہ عزیزٌ ذُوانتقام بھی ہے (اللہ کی یہ دونوں شانیں ایک ساتھ ہیں) اسی طرح رسول کا معاملہ ہے کہ رسول شفیق اور رحیم ہونے کے ساتھ ساتھ غیور بھی ہوتا ہے۔ اس کے دل میں دین کی غیرت اپنے پیروکاروں سے کہیں بڑھ کر ہوتی ہے۔ لہٰذا قوم کے منفی ردِّعمل پر نبی کی بے زاری لازمی ہے۔

یہاں پر ایک بہت اہم نکتہ سمجھنے کا یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو پے در پے معجزات کے ظہور نے تساہل پسند بنا دیا تھا۔ پیاس لگی تو چٹان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک ہی ضرب سے بارہ چشمے پھوٹ پڑے' بھوک محسوس ہوئی تو منّ وسلویٰ نازل ہو گیا' دھوپ نے ستایا تو اَبر کا سائبان ساتھ ساتھ چل پڑا' سمندر راستے میں آیا تو عصا کی ضرب سے راستہ بن گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس لاڈ پیار کی وجہ سے وہ آرام طلب ہو گئے تھے اور مشکل کی ہر گھڑی میں انہیں معجزے کے ظہور کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ بہرحال جنگ کے اس موقع پر انہوں نے دشمن کا سامنا کرنے سے صاف انکار کر دیا' باوجودیکہ اس وقت اُن کے کم از کم ایک لاکھ افراد تو ایسے تھے جو جنگ کی صلاحیت رکھتے تھے۔ یہی حکمت ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں اس قسم کا کوئی معجزہ نظر نہیں آتا' بلکہ یہاں تو یہ نقشہ نظر آتا ہے کہ مسلمانو! تمہیں جو کچھ کرنا ہے اپنی جان دے کر' ایثار و قربانی سے' محنت و مشقت سے' بھوک جھیل کر اور فاقے برداشت کر کے کرنا ہے۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں ایثار و قربانی' جرأت و بہادری اور بلند ہمتی کا جذبہ موجزن نظر آتا ہے' جس کی واضح مثال غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے:

یَارَسُوۡلَ اللّٰهِ اِنَّا لَا نَقُوۡلُ لَکَ کَمَا قَالَتۡ بَنُوۡ اِسۡرَائِیۡلَ لِمُوۡسٰی ﴿فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوۡنَ﴾ وَلٰکِنِ امۡضِ وَنَحۡنُ مَعَکَ، فَکَاَنَّهٗ سُرِّیَ عَنۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم (۱)

''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم آپؐ سے بنی اسرائیل کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ آپ اور آپؐ کا رب جا کر قتال کرو ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔ بلکہ (ہم کہیں گے) آپؐ قدم بڑھائیے ہم آپؐ کے ساتھ ہیں! اس پر گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پریشانی کا ازالہ ہو گیا۔''

آیت ۲۶ ﴿وَاِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِهٖ﴾ ''اور یاد کرو جب کہا موسیٰؑ نے اپنی قوم سے''

۱۔ صحیح البخاری' کتاب تفسیر القرآن' باب قولہ ﴿فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَا اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوۡنَ﴾

﴿یٰقَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ﴾ ''اے میری قوم کے لوگو! اللہ کے اُس انعام کو یاد کرو جو تم پر ہوا ہے۔''

﴿اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْۢبِیَآءَ﴾ ''جب اُس نے تمہارے اندر نبی اٹھائے''

یعنی خود میں نبی ہوں' میرے بھائی ہارون نبی ہیں۔ حضرت یوسف' حضرت یعقوب' حضرت اسحاق اور حضرت ابراہیم علیہم السلام سب نبی تھے۔

﴿وَّجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا﴾ ''اور تمہیں بادشاہ بنایا''

اگرچہ اُس وقت تک اُن کی بادشاہت تو قائم نہیں ہوئی تھی مگر ہو سکتا ہے کہ یہ پیشین گوئی ہو کہ آئندہ تمہیں اللہ تعالیٰ زمین کی سلطنت اور خلافت عطا کرنے والا ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے زمانے میں بنی اسرائیل کی عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے اقتدار کی طرف اشارہ ہے' آپؑ اگرچہ مصر کے بادشاہ تو نہیں تھے لیکن بادشاہوں کے بھی مخدوم و ممدوح تھے۔ آپؑ کی اس حیثیت کی وجہ سے بنی اسرائیل کو مصر میں پیرزادوں کا سا مقام و احترام حاصل ہو گیا تھا۔

﴿وَّاٰتٰىکُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۰﴾﴾ ''اور تمہیں وہ کچھ دیا جو تمام جہان والوں میں سے کسی کو نہیں دیا۔''

آیت ۲۱ ﴿یٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَۃَ الَّتِیْ کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ﴾ ''(تو) اے میری قوم کے لوگو! اب داخل ہو جاؤ اس ارضِ مقدس (فلسطین) میں جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے۔''

اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ زمین تمہیں ملے گی۔

﴿وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِکُمْ﴾ ''اور اپنی پیٹھوں کے بل واپس نہ پھرنا''

﴿فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِیْنَ ﴿۲۱﴾﴾ ''(اگر ایسا کرو گے) تو ناکام و نامراد پلٹو گے۔''

آیت ۲۲ ﴿قَالُوْا یٰمُوْسٰٓی اِنَّ فِیْہَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۚ﴾ ''انہوں نے کہا: اے موسیٰؑ! اس میں تو بڑے زور آور لوگ ہیں'' ہم فلسطین میں کیسے داخل ہو جائیں؟ یہاں تو جو لوگ آباد ہیں وہ بڑے طاقت ور' گراں ڈیل اور زبردست ہیں۔ ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟

﴿وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَہَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْہَا ۚ﴾ ''اور ہم اس (سرزمین) میں داخل نہیں ہوں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔''

﴿فَاِنْ یَّخْرُجُوْا مِنْہَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾ ''ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم داخل ہو جائیں گے۔''

آیت ۲۳ ﴿قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِیْنَ یَخَافُوْنَ﴾ ''کہا دو اشخاص نے جو (اللہ کا) خوف رکھنے والوں میں سے تھے''

﴿اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمَا﴾ ''اور اللہ نے بھی ان دونوں پر انعام کیا تھا''

یہ دو اشخاص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے شاگرد اور قریبی حواری تھے۔ ایک تو یوشع بن نون تھے' جو حضرت موسیٰؑ کے بعد ان کے جانشین بھی ہوئے اور گمانِ غالب ہے کہ وہ نبی بھی تھے' جبکہ دوسرے شخص کالب بن یفنا تھے۔ ان دونوں نے اپنی قوم کے لوگوں کو سمجھانا چاہا کہ ہمت کرو:

﴿اُدْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ﴾ ''تم ان کے مقابلے میں دروازے کے اندر گھس جاؤ۔''

تم لوگ ایک دفعہ دروازے میں گھس کر ان کا سامنا تو کرو۔

﴿فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ﴾ ''اور جب تم اس میں داخل ہو گے تو لازماً تم غالب ہو جاؤ گے۔''

﴿وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۲۳﴾ ''اور اللہ پر توکل کرو اگر تم مؤمن ہو۔''

آیت ۲۴ ﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا﴾ ''انہوں نے کہا: اے موسیٰ ہم تو ہرگز اس شہر میں داخل نہیں ہوں گے''

﴿مَّا دَامُوْا فِيْهَا﴾ ''جب تک کہ وہ اس میں موجود ہیں''

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ﴾ ''بس تم اور تمہارا رب دونوں جاؤ اور جا کر قتال کرو''

گویا وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ ساتھ اپنی یہ لٹھیا بھی لیتے جاؤ' جس نے بڑے بڑے کارنامے دکھائے ہیں' اس کی مدد سے ان جباروں کو شکست دے دو۔

﴿اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۲۴﴾ ''ہم تو یہاں بیٹھے ہیں۔''

ہم تو یہاں ٹکے ہوئے ہیں' یہاں سے نہیں ہلیں گے' زمیں جنبد' نہ جنبد گل محمد!

مقامِ عبرت ہے! تورات (Book of Exodus) سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ لگ بھگ چھ لاکھ افراد نکلے تھے۔ ان میں سے عورتیں' بچے اور بوڑھے نکال دیں تو ایک لاکھ افراد تو جنگ کے قابل ہوں گے۔ مزید محتاط اندازہ لگائیں تو پچاس ہزار جنگجو تو دستیاب ہو سکتے تھے' مگر اس قوم کی پست ہمتی اور نظریاتی کمزوری ملاحظہ ہو کہ چھ لاکھ کے ہجوم میں سے صرف دو اشخاص نے اللہ کے اس حکم پر لبیک کہا۔ فاعتبروا یا اُولی الابصار!

اب نبی کی بیزاری ملاحظہ فرمائیں۔ وہی حضرت موسیٰ علیہ السلام جنہوں نے اپنے ہم قوم اسرائیلی کی مدافعت کرتے ہوئے ایک مُکّا رسید کر کے قبطی کی جان نکال دی تھی ﴿فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۡ﴾ (القصص:۱۵) اب اپنی قوم سے کس قدر بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔

آیت ۲۵ ﴿قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ﴾ ''موسیٰؑ نے عرض کیا: پروردگار' مجھے تو اختیار نہیں ہے سوائے اپنی جان کے اور اپنے بھائی (ہارونؑ کی جان) کے''

باقی یہ پوری قوم انکار کر رہی ہے۔ میرا کسی پر کچھ زور نہیں ہے۔ یہاں مضمون کی مناسبت سے سورۃ النساء کی آیت ۸۴ کے وہ الفاظ بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے جن میں حضور ﷺ کے لیے حکم ہے: ﴿فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (النساء:۸۴)۔ ''(اے نبی ﷺ!) آپ اللہ کی راہ میں قتال کیجیے' آپ اپنے سوا کسی کے ذمہ دار نہیں ہیں' البتہ اہلِ ایمان کو بھی ترغیب دیں''۔ آپؐ پر کسی اور کی ذمہ داری نہیں ہے سوائے اپنی جان کے' البتہ آپؐ اہلِ ایمان کو جس قدر ترغیب و تشویق دلا سکتے ہیں دلائیں' ان کے جذباتِ ایمانی کو جس جس انداز سے اپیل کرنا ممکن ہے کریں' اور بس اس سے زیادہ آپؐ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔

﴿فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۲۵﴾ ''تو اب تفریق کر دے' ہمارے اور ان نافرمان لوگوں کے درمیان۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کے رویے سے اس درجہ آزردہ خاطر ہوئے کہ قوم سے علیحدگی کی تمنا کرنے لگے کہ میں اب ان ناہنجاروں کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ انہوں نے تیری عطا کردہ کیا کچھ نعمتیں برتی ہیں اور میرے ہاتھوں سے کیا کیا معجزے یہ لوگ دیکھ چکے ہیں' اس کے باوجود ان کا یہ حال ہے تو مجھے ان سے علیحدہ کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ درخواست قبول نہیں کی لیکن اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

آیت ۲۶ ﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ﴾ ''فرمایا اب یہ (ارضِ مقدس) حرام رہے گی ان پر چالیس سال تک۔''

یہ ہماری طرف سے ان کی بزدلی کی سزا ہے۔ اگر یہ بزدلی نہ دکھاتے تو ارضِ فلسطین ابھی ان کو عطا کر دی جاتی' مگر اب یہ چالیس سال تک ان پر حرام رہے گی۔

﴿يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ ''یہ بھٹکتے پھریں گے زمین میں۔''

اس صحرائے سینا میں یہ چالیس سال تک مارے مارے پھرتے رہیں گے۔

﴿فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۶﴾ ''تو (اے موسیٰؑ) آپ افسوس نہ کریں اس فاسق قوم پر۔''

اب آپ ان نافرمانوں کا غم نہ کھائیے۔ اب جو کچھ ان پر بیتے گی اس پر آپؑ کو ترس نہیں کھانا چاہیے۔ آپ بہرحال ان کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں' جب تک زندگی ہے آپ کو ان کے ساتھ رہنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے مطابق بنی اسرائیل چالیس برس تک صحرائے سینا میں بھٹکتے پھرے۔ اس دوران میں وہ سب لوگ مر کھپ گئے جو جوانی کی عمر میں مصر سے نکلے تھے اور صحرا میں ان کی نئی نسل پروان چڑھی جو خوئے غلامی سے مبرا تھی۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام دونوں کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد حضرت یوشع بن نون کے عہدِ خلافت میں یہ لوگ اس قابل ہوئے کہ فلسطین فتح کر سکیں۔

اب پانچویں رکوع میں قتلِ ناحق' ملک میں فساد پھیلانے اور چوری ڈاکے جیسے جرائم کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر اور پھر ان کی سزاؤں کا ذکر ہوگا۔

آیات ۲۷ تا ۳۴

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَ لَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۲۷ لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۲۸ اِنِّيْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِيْ وَ اِثْمِكَ فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۹ۚ فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۳۰ فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ؕ قَالَ يٰوَيْلَتٰى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ

فَاُوَارِیَ سَوْءَةَ اَخِیْ ؕ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِیْنَ ﴿۳۱﴾ مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ
اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ مَنْ
اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَ لَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ۫ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ
بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ﴿۳۲﴾ اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ
فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْۤا اَوْ یُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ
یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۳۳﴾ اِلَّا
الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْهِمْ ۚ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۴﴾ ع

آیت ۲۷ ﴿وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ ابْنَیْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) ان کو پڑھ کر سنایئے آدمؑ کے دو بیٹوں کا قصہ حق کے ساتھ۔''

﴿اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا﴾ ''جبکہ ان دونوں نے قربانی پیش کی''

﴿فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ یُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ؕ﴾ ''تو ان میں سے ایک کی قربانی قبول کر لی گئی' جبکہ دوسرے کی قبول نہیں کی گئی۔''

آدمؑ کے یہ دو بیٹے ہابیل اور قابیل تھے۔ ہابیل بھیڑ بکریاں چراتا تھا اور قابیل کاشت کار تھا۔ ان دونوں نے اللہ کے حضور قربانی دی۔ ہابیل نے کچھ جانور پیش کیے' جبکہ قابیل نے اناج نذر کیا۔ ہابیل کی قربانی قبول ہوگئی مگر قابیل کی قبول نہیں ہوئی۔ اُس زمانے میں قربانی کی قبولیت کی علامت یہ ہوتی تھی کہ آسمان سے ایک شعلہ نیچے اترتا تھا اور وہ قربانی کی چیز کو جلا کر بھسم کر دیتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ نے قربانی کو قبول فرمالیا۔

﴿قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ؕ﴾ ''اُس نے کہا: مَیں تمہیں قتل کر کے رہوں گا۔''

قابیل نے' جس کی قربانی قبول نہیں ہوئی تھی' حسد کی آگ میں جل کر اپنے بھائی ہابیل سے کہا کہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

﴿قَالَ اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۲۷﴾﴾ ''اُس نے جواب دیا کہ اللہ تو پرہیزگاروں ہی سے قبول کرتا ہے۔''

ہابیل نے کہا بھائی جان' اس میں میرا کیا قصور ہے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا قاعدہ ہے کہ وہ صرف اپنے متقی بندوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔

آیت ۲۸ ﴿لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَیَّ یَدَكَ لِتَقْتُلَنِیْ﴾ ''اگر آپ اپنا ہاتھ چلائیں گے مجھ پر مجھے قتل کرنے کے لیے''

﴿مَاۤ اَنَا بِبَاسِطٍ یَّدِیَ اِلَیْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ﴾ ''(تب بھی) میں اپنا ہاتھ نہیں چلاؤں گا آپ کو قتل کرنے کے لیے۔''

یعنی اگر ایسا ہوا تو یہ یک طرفہ قتل ہی ہوگا۔

﴿اِنِّیْۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ''مجھے تو اللہ کا خوف ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔''

آیت ۲۹ ﴿اِنِّیْۤ اُرِیْدُ اَنْ تَبُوْٓاَ بِاِثْمِیْ وَاِثْمِكَ﴾ ''میں چاہتا ہوں کہ میرا اور اپنا گناہ تم ہی اپنے سر لے لو''

﴿فَتَكُوْنَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ﴾ ''تو پھر تم ہو جاؤ گے جہنم والوں میں سے۔''

اگر آپ اس انتہا تک پہنچ جائیں گے کہ مجھے قتل کر ہی دیں گے تو آپ اپنے گناہوں کے ساتھ ساتھ میری خطاؤں کا بوجھ بھی اپنے سر اٹھالیں گے۔ ایک بے گناہ انسان کو قتل کرنے والا گویا مقتول کے تمام گناہوں کا بوجھ بھی اپنے سر اُٹھالیتا ہے۔ یعنی اگر آپ مجھے ناحق قتل کریں گے تو میرے گناہوں کا وبال بھی آپ کے سر ہوگا اور میرے لیے تو یہ کوئی گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ البتہ اس جرم کی وجہ سے آپ جہنمی ہو جائیں گے۔

﴿وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۹﴾ ''اور یہی بدلہ ہے ظالموں کا۔''

آیت ۳۰ ﴿فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ﴾ ''بالآخر اُس کے نفس نے آمادہ کر ہی لیا اسے اپنے بھائی کے قتل پر''

ان الفاظ کے بین السطور اس کے ضمیر کی کش مکش کا مکمل نقشہ موجود ہے۔ ایک طرف اللہ کا خوف' نیکی کا جذبہ' خون کا رشتہ اور دوسری طرف شیطانی ترغیب' حسد کی آگ اور نفسانی خواہش کی اُکساہٹ۔ اور پھر بالآخر اس اندرونی کشمکش میں اس کا نفس جیت ہی گیا۔

﴿فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝۳۰﴾ ''تو اُس نے اسے قتل کر دیا اور ہو گیا تباہ ہونے والوں میں سے۔''

آیت ۳۱ ﴿فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ﴾ ''تو اللہ نے ایک کوّا بھیجا جو زمین کُریدنے لگا''

یہ پہلا خون تھا جو نسلِ آدم میں ہوا۔ قابیل نے ہابیل کو قتل تو کر دیا لیکن اب اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بھائی کی لاش کا کیا کرے' اسے کیسے dispose off کرے' تو اللہ تعالیٰ نے ایک کوّے کو بھیج دیا جو اُس کے سامنے اپنی چونچ سے زمین کھودنے لگا۔

﴿لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ﴾ ''تاکہ (اللہ) اُسے دکھا دے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیسے چھپائے۔''

کوّے کے زمین کھودنے کے عمل سے اسے سمجھ آ جائے کہ زمین کھود کر لاش کو دفن کیا جا سکتا ہے۔

﴿قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ﴾ ''(یہ دیکھا تو) اُس نے کہا: ہائے میری شامت! میں اس کوّے جیسا بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا۔''

افسوس مجھ پر! کیا میرے اندر اس کوّے جیسی عقل بھی نہ تھی کہ یہ طریقہ مجھے خود ہی سوجھ جاتا۔

﴿فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝۳۱﴾ ''پھر وہ بہت پشیمان ہوا۔''

اس احساس پر اس کے اندر بڑی شدید ندامت پیدا ہوئی۔

آیت ۳۲ ﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ ''اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر (تورات میں) یہ بات لکھ دی تھی''

﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚ﴾ والا فقرہ پچھلی آیت کے ساتھ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور اس آیت کے ساتھ بھی' یہ دونوں طرف بامعنی بن سکتا ہے۔

﴿اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ﴾ ''کہ جس کسی نے کسی انسان کو قتل کیا بغیر کسی قتل کے قصاص کے''

یعنی اگر کسی نے قتل کیا ہے اور وہ اس کے قصاص میں قتل کیا جائے تو یہ قتل ناحق نہیں ہے۔

﴿اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ﴾ ''یا بغیر زمین میں فساد پھیلانے (کے جرم کی سزا) کے''

اگر کوئی شخص ملک میں فساد پھیلانے کا مجرم ہے اور اسے اس جرم کی سزا کے طور پر قتل کر دیا جائے تو اس کا قتل بھی قتلِ ناحق نہیں۔

لیکن ان صورتوں کے علاوہ اگر کسی نے کسی بے قصور انسان کا قتل کر دیا۔

﴿فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ﴾ ''گویا اُس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔''

اُس کا یہ فعل ایسا ہی ہے جیسے اُس نے پوری نوعِ انسانی کو تہ تیغ کر دیا۔ اس لیے کہ اُس نے قتلِ ناحق سے تمدن و معاشرت کی جڑ کاٹ ڈالی۔ جان اور مال کا احترام ہی تو تمدن کی جڑ اور بنیاد ہے۔

﴿وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا ؕ﴾ ''اور جس نے اُس (کسی ایک انسان) کی جان بچائی تو گویا اُس نے پوری نوعِ انسانی کو زندہ کر دیا۔''

﴿وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ ۫﴾ ''اور اُن کے پاس ہمارے رسول آئے تھے واضح نشانیاں لے کر''

﴿ثُمَّ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِى الْاَرْضِ لَمُسْرِفُوْنَ ۝۳۲﴾ ''لیکن اس کے باوجود ان میں سے بہت سے لوگ زمین میں زیادتیاں کرتے پھر رہے ہیں۔''

اب ''آیتِ محاربہ'' آ رہی ہے جو اسلامی قوانین کے لحاظ سے بہت اہم آیت ہے۔ محاربہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست میں کوئی گروہ فتنہ و فساد مچا رہا ہے، دہشت گردی کر رہا ہے، خونریزی اور قتل و غارت کر رہا ہے، راہزنی اور ڈاکہ زنی کر رہا ہے، گینگ ریپ ہو رہے ہیں۔ اس آیت میں ایسے لوگوں کی سزا بیان ہوئی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ یہ اسلامی ریاست کی بات ہو رہی ہے، جہاں اسلامی قانون نافذ ہو، جہاں اسلام کا پورا نظام قائم ہو۔ ورنہ اگر نظام ایسا ہو کہ جھوٹی گواہیاں دینے والے کھلے عام سودے کر رہے ہوں، ایمان فروش موجود ہوں، ججوں کو خریدا جا سکتا ہو اور ایسے نظام کے تحت شرعی قوانین کا نفاذ کر دیا جائے تو پھر اس سے جو نتائج نکلیں گے ان سے شریعت الٹا بدنام ہوگی۔ لہٰذا ریاست میں حکومتی نظام اور مروّجہ قوانین دونوں کا درست ہونا لازمی ہے۔ اگر ایسا ہوگا تو یہ دونوں ایک دوسرے کو مضبوط و مستحکم کریں گے اور اسی صورت میں مطلوبہ نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔

آیت ۳۳ ﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ ''یہی ہے سزا اُن لوگوں کی جو لڑائی کرتے ہیں اللہ اور اُس کے رسول سے''

یعنی اسلامی ریاست کی عملداری کو چیلنج کرتے ہیں۔

﴿وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا﴾ ''اور زمین میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں''

﴿اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا﴾ ''کہ انہیں (عبرت ناک طور پر) قتل کیا جائے''

واضح رہے کہ یہاں فعل یُقْتَلُوْا استعمال نہیں ہوا بلکہ یُقَتَّلُوْا ہے کہ ان کے ٹکڑے کیے جائیں۔

﴿اَوْ يُصَلَّبُوْٓا﴾ ''یا انھیں سولی چڑھایا جائے''

﴿اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ﴾ ''یا اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں میں کاٹ دیے جائیں''

یعنی ایک طرف کا ہاتھ اور دوسری طرف کا ایک پاؤں کاٹا جائے۔

﴿اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ؕ﴾ ''یا انھیں ملک بدر کر دیا جائے۔''

﴿ذٰلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِى الدُّنْيَا﴾ ''یہ تو ان کے لیے دُنیا کی زندگی میں رسوائی ہے''

﴿وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۳﴾ ''اور آخرت میں ان کے لیے (مزید) بہت بڑا عذاب ہے۔''

آیت ۳۴ ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهِمْ ۚ﴾ ''سوائے اُن کے جو توبہ کرلیں اس سے پہلے کہ تم ان پر قابو پاؤ۔''

یعنی پکڑے جانے سے پہلے ایسے لوگ اگر توبہ کرلیں تو ان کے لیے رعایت کی گنجائش ہے' لیکن جب پکڑ لیے گئے تو توبہ کا دروازہ بند ہوگیا۔

﴿فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۴﴾ ''پس جان لو کہ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمانے والا' مہربان ہے۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خوارج کے ساتھ یہی معاملہ کیا تھا کہ اگر تم اپنے غلط عقیدے کو اپنے تک رکھو تو تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا لیکن اگر تم خونریزی کرو گے' قتل وغارت کرو گے تو پھر تمہارے ساتھ رعایت نہیں کی جاسکتی۔

آیات ۳۵ تا ۴۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۵ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۳۶ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنْهَا ۡ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ۝۳۷ وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۳۸ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۳۹ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴۰ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ۭ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ يَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ۭ وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ۭ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۚ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۴۱ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ۭ فَاِنْ جَاۗءُوْكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ يَّضُرُّوْكَ شَيْـــًٔا ۭ وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۴۲ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۳ ع

آیت ۳۵ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور اُس کی جناب میں اس کا قُرب تلاش کرو''

یہاں لفظ ''وسیلہ'' قابلِ غور ہے اور اس لفظ نے کافی لوگوں کو پریشان بھی کیا ہے۔ لفظ ''وسیلہ'' اردو میں تو ''ذریعہ'' کے معنی میں آتا ہے' یعنی کسی تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ بنالینا' سفارش کے لیے کسی کو وسیلہ بنالینا۔ لیکن عربی زبان میں ''وسیلہ'' کے معنی ہیں ''قُرب''۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جن کا عربی میں مفہوم کچھ اور ہے جبکہ اردو میں کچھ اور ہے۔ جیسے لفظ ''ذلیل'' ہے' عربی میں اس کے معنی ''کمزور'' جبکہ اردو میں ''کمینے'' کے ہیں۔ جیسا کہ ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ﴾ (آل عمران:۱۲۳) یعنی اے مسلمانو! یاد کرو اللہ نے تمہاری مدد کی تھی بدر میں جب کہ تم بہت کمزور تھے۔ اب اگر یہاں ذلیل کا ترجمہ اردو والا کر دیا جائے تو ہمارے ایمان کے لالے پڑ جائیں گے۔ اسی طرح عربی میں ''جہل'' کے معنی جذباتی ہونا ہے' اَن پڑھ ہونا نہیں۔ ایک پڑھا لکھا شخص بھی جاہل یعنی جذباتی' اکھڑ مزاج ہو سکتا ہے' لیکن اردو میں جاہل عالم کا متضاد ہے' یعنی جو اَن پڑھ ہو۔ اسی طرح کا معاملہ لفظ ''وسیلہ'' کا ہے۔ اس کا اصل مفہوم ''قرب'' ہے اور یہاں بھی یہی مراد لیا جائے گا۔ یہاں ارشاد ہوا ہے:

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور (آگے بڑھ کر) اس کا قرب تلاش کرو''

تقویٰ کے معنی ہیں اللہ کے غضب سے' اللہ کی ناراضگی سے اور اللہ کے احکام توڑنے سے بچنا۔ یہ ایک منفی محرک ہے' جبکہ قربِ الٰہی کی طلب ایک مثبت محرک ہے کہ اللہ کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتے چلے جاؤ۔ لیکن اس کے قرب کا ذریعہ کیا ہوگا؟

﴿وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۵﴾ ''اور اُس کی راہ میں جہاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

اس سے بات بالکل واضح ہو گئی کہ تقرب الی اللہ کے لیے جہاد کرو۔ تقویٰ شرطِ لازم ہے۔ یعنی پہلے جو حرام چیزیں ہیں ان سے اپنے آپ کو بچاؤ' جن چیزوں سے روک دیا گیا ہے ان سے رک جاؤ اور اللہ کی نافرمانی سے باز آ جاؤ۔ اور پھر اس کا تقرب حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کی راہ میں جدّوجہد کرو۔

آیت ۳۶ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ﴾ ''یقیناً وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا' اگر ان کے پاس وہ ساری دولت ہو جو کہ زمین میں ہے کُل کی کُل اور اس کے ساتھ اتنی ہی اور بھی ہو''

﴿لِیَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ یَوْمِ الْقِیٰمَةِ﴾ ''(اور وہ چاہیں) کہ وہ اس کے ذریعے سے فدیہ دے کر چھوٹ سکیں قیامت کے دن کے عذاب سے''

﴿مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۚ﴾ ''تو اُن سے ہرگز قبول نہیں کی جائے گی۔''

یہ حکم گویا ''تعلیق بالمحال'' ہے کہ نہ ایسا ممکن ہے اور نہ ایسا ہوگا۔ لیکن بات کی سختی واضح کرنے کے لیے یہ انداز اپنایا گیا ہے اور آخری درجے میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اگر بالفرض ان کے پاس اتنی دولت موجود بھی ہو تب بھی اللہ کے ہاں اُن کا فدیہ قبول نہیں ہوگا۔

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۳۶﴾ ''اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۳۷ ﴿یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّخْرُجُوْا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِیْنَ مِنْهَا ۡ﴾ ''وہ چاہیں گے کہ آگ سے کسی طرح نکل جائیں لیکن نکل نہیں پائیں گے''

﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ ۝۳۷﴾ ''اور اُن کے لیے ہوگا قائم رہنے والا عذاب۔''

یعنی ان کو مسلسل دائم اور قائم رہنے والا عذاب دیا جائے گا۔

آیت ۳۸ ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ ''اور چور خواہ مرد ہو یا عورت' ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو'' یعنی چور کا ایک ہاتھ کاٹ دو۔

﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا﴾ ''یہ بدلہ ہے ان کے کرتوت کا''

﴿نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور عبرت ناک سزا ہے اللہ کی طرف سے۔''

دیکھئے قرآن خود اپنی حفاظت کس طرح کرتا ہے اور کیوں چیلنج کرتا ہے کہ اس کلام پر باطل حملہ آور نہیں ہو سکتا کسی بھی جانب سے (حٰمٓ السجدہ: ۴۲)۔ ذرا ملاحظہ کیجیے اس آیت کے ضمن میں غلام احمد پرویز صاحب کہتے ہیں کہ یہاں چور کا ہاتھ کاٹنے کا مطلب ہے کہ ایسا نظام وضع کیا جائے جس میں کسی کو چوری کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ یہ تو ہم بھی چاہتے ہیں کہ ایسا نظام ہو' ریاست کی طرف سے کفالتِ عامہ کی سہولت موجود ہو تاکہ کوئی شخص مجبوراً چوری نہ کرے' لیکن ''فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا'' کے الفاظ سے جو مطلب پرویز صاحب نے نکالا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اور اگر فرض کر لیں کہ ایسا ہی ہے تو پھر ﴿جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا﴾ (یہ بدلہ ہے ان کی اپنی کمائی کا) کی کیا تاویل ہوگی؟ یعنی جو کمائی انہوں نے کی ہے اس کا بدلہ یہ ہے کہ ایک اچھا نظام قائم کر دیا جائے؟ اس کے بعد پھر ﴿نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ کے الفاظ مزید آئے ہیں۔ ''نَکَال'' کہتے ہیں عبرتناک سزا کو۔ تو کیا ایسے نظام کا قائم کرنا اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا ہوگی؟ آپ نے دیکھا قرآن کے معانی و مفہوم کی حفاظت کے لیے بھی الفاظ کے کیسے کیسے پہرے بٹھائے گئے ہیں!

دراصل حدود و تعزیرات کے فلسفے کو سمجھنا بہت ضروری ہے اور اس کے لیے لفظ ''نَکَال'' بہت اہم ہے۔ قرآن میں تعزیرات اور حدود کے سلسلے میں یہ لفظ اکثر استعمال ہوا ہے۔ یعنی اگر سزا ہوگی تو عبرت ناک ہوگی۔ اسلام میں شہادت کا قانون بہت سخت رکھا گیا ہے۔ ذرا سا شبہ ہو تو اس کا فائدہ ملزم کو دیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے سزا کا نفاذ آسان نہیں۔ لیکن اگر تمام مراحل طے کر کے جرم پوری طرح ثابت ہو جائے تو پھر سزا ایسی دی جائے کہ ایک کو سزا ملے اور لاکھوں کی آنکھیں کھل جائیں تاکہ آئندہ کسی کو جرم کرنے کی ہمت نہ ہو۔ یہ فلسفہ ہے اسلامی سزاؤں کا۔ یہ درحقیقت ایک تسدید (deterrence) ہے جس کے سبب معاشرے سے برائی کا استیصال کرنا ممکن ہے۔ آج امریکہ جیسے (نام نہاد) مہذب معاشرے میں بھی آئے دن انتہائی گھناؤنے جرائم ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ احتساب اور سزا کا نظام درست نہیں۔ لوگ جرم کرتے ہیں' سزا ہوتی ہے' جیل جاتے ہیں' کچھ دن وہاں گزارنے کے بعد واپس آتے ہیں' پھر جرم کرتے ہیں' پھر جیل چلے جاتے ہیں۔ جیل کیا ہے؟ سرکاری مہمان داری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے معاشروں میں جرائم روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۳۸﴾ ''اور اللہ زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

آیت ۳۹ ﴿فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ﴾ ''تو جس نے بھی توبہ کر لی اپنے اس ظلم کے بعد اور اصلاح کر لی تو اللہ ضرور قبول کرتا ہے اُس کی توبہ کو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۳۹﴾ ''یقیناً اللہ غفور ہے' رحیم ہے۔''

لیکن اس توبہ سے جرم کی سزا دنیا میں ختم نہیں ہوگی۔ یہ جرم ہے دنیا (قانون) کا اور گناہ ہے اللہ کا۔ جرم کی سزا دنیا میں ملے گی' گناہ کی سزا اللہ نے دینی ہے' اگر توبہ کر لی تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا اور اگر توبہ نہیں کی تو اس کی سزا بھی ملے گی۔

آیت ﴿ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ ﴾ ''کیا تم نہیں جانتے ہو کہ اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی؟''

﴿ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ ﴾ ''وہ سزا دے گا جس کو چاہے گا اور بخش دے گا جس کو چاہے گا۔''

﴿ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴾ ''اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

اب یہاں پھر ذکر آ رہا ہے ان لوگوں کا جو دوغلی پالیسی پر کاربند تھے' لیکن سورۃ البقرۃ کی طرح یہاں بھی روئے سخن قطعیت کے ساتھ واضح نہیں کیا گیا۔ لہٰذا اس کا انطباق منافقین پر بھی ہوگا اور اہلِ کتاب پر بھی۔ منافق اہلِ کتاب میں سے بھی تھے' جن کا میلان اسلام کی طرف بھی تھا اور چاہتے بھی تھے کہ مسلمانوں میں شامل رہیں لیکن وہ اپنے ساتھیوں کو بھی چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ تو یہ لوگ جو ''مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ'' کی مثال تھے' یہ دونوں طرف کے لوگ تھے۔

آیت ﴿ يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ﴾ ''اے نبی (ﷺ) یہ لوگ آپ کے لیے باعثِ رنج نہ ہوں جو کفر کی راہ میں بہت بھاگ دوڑ کر رہے ہیں''

﴿ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِاَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُهُمْ ۛ ﴾ ''ان لوگوں میں سے جو اپنے مُنہ سے تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں' مگر اُن کے دل ایمان نہیں لائے ہیں۔''

آپؐ ان لوگوں کی سرگرمیوں اور بھاگ دوڑ سے غمگین اور رنجیدہ خاطر نہ ہوں۔

﴿ وَمِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا ۛ ﴾ ''اور اسی طرح کے لوگ یہودیوں میں سے بھی ہیں۔''

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ ﴾ ''یہ بڑے ہی غور سے سنتے ہیں جھوٹ کو''

﴿ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ۙ لَمْ يَاْتُوْكَ ؕ ﴾ ''اور یہ سنتے ہیں کچھ اور لوگوں کی خاطر جو آپ کے پاس نہیں آتے۔''

یعنی ایک تو یہ لوگ اپنے ''شیاطین'' کی جھوٹی باتیں بڑی توجہ سے سنتے ہیں' جیسے سورۃ البقرۃ (آیت ۱۴) میں فرمایا: ﴿ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴾ ''اور جب یہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اور جب یہ خلوت میں ہوتے ہیں اپنے شیطانوں کے پاس تو کہتے ہیں کہ ہم تو آپ کے ساتھ ہیں اور ان لوگوں سے تو محض مذاق کر رہے ہیں''۔ پھر یہ لوگ ان کی طرف سے جاسوس بن کر مسلمانوں کے ہاں آتے ہیں کہ یہاں سے سن کر ان کو رپورٹ دے سکیں کہ آج محمد (ﷺ) نے یہ کہا' آج آپؐ کی مجلس میں فلاں معاملہ ہوا۔ ﴿ سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ ﴾ کا ترجمہ دونوں طرح سے ہو سکتا ہے: ''دوسری قوم کے لوگوں کی باتوں کو بڑی توجہ سے سنتے ہیں'' یا ''سنتے ہیں دوسری قوم کے لوگوں کے لیے'' یعنی انہیں رپورٹ کرنے کے لیے ان کے جاسوس کی حیثیت سے۔ ان کے جو لیڈر اور شیاطین ہیں' وہ آپؐ کے پاس خود نہیں آتے اور یہ جو بین بین کے لوگ ہیں یہ آپؐ کے پاس آتے ہیں اور ان کے ذریعے سے جاسوسی کا یہ سارا معاملہ چل رہا ہے۔

﴿ يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْۢ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ ۚ ﴾ ''وہ کلام کو پھیر دیتے ہیں اس کی جگہ سے اس کا موقع و محل معیّن ہو جانے کے بعد۔''

﴿یَقُوْلُوْنَ اِنْ اُوْتِیْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ﴾ ''وہ کہتے ہیں اگر تمہیں یہی (فیصلہ) مل جائے تو قبول کر لینا''

﴿وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا ؕ﴾ ''اور اگر یہ (فیصلہ) نہ ملے تو کنی کترا جانا۔''

اہلِ کتاب کے سرداروں کو اگر کسی مقدمے کا فیصلہ مطلوب ہوتا تو اپنے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجتے اور پہلے سے انہیں بتا دیتے کہ اگر فیصلہ اس طرح ہو تو تم قبول کر لینا' ورنہ رد کر دینا۔ واضح رہے کہ مدینہ منورہ میں اسلامی ریاست اور پورے طور پر ایک ہمہ گیر اسلامی حکومت دراصل فتح مکہ کے بعد قائم ہوئی اور یہ صورتِ حال اس سے پہلے کی تھی۔ ورنہ کسی ریاست میں دو ہرا عدالتی نظام نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ جب چاہتے اپنے فیصلوں کے لیے حضور ﷺ کے پاس آ جاتے اور جب چاہتے کسی اور کے پاس چلے جاتے تھے۔ گویا بیک وقت دو متوازی نظام چل رہے تھے۔ اسی لیے تو وہ لوگ یہ کہنے کی جسارت کرتے تھے کہ یہ فیصلہ ہوا تو قبول کر لینا' ورنہ نہیں۔

﴿وَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا ؕ﴾ ''اور جس کو اللہ ہی نے فتنے میں ڈالنے کا ارادہ کر لیا ہو تو تم اُس کے لیے اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے۔''

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَمْ یُرِدِ اللّٰهُ اَنْ یُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ ؕ﴾ ''یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا چاہا ہی نہیں۔''

﴿لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ ۚ﴾ ''ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے''

﴿وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۴۱﴾﴾ ''اور آخرت میں بھی ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

آیت ۴۲ ﴿سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ﴾ ''یہ خوب سننے والے ہیں جھوٹ کو''

﴿اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ ؕ﴾ ''خوب کھانے والے ہیں حرام کو۔''

﴿فَاِنْ جَآءُوْكَ﴾ ''پھر اگر یہ آپؐ کے پاس (اپنا کوئی مقدمہ لے کر) آئیں''

﴿فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ ۚ﴾ ''تو آپؐ (کو اختیار ہے) خواہ ان کے درمیان فیصلہ کر دیں یا ان سے اعراض کریں۔''

آپؐ کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ آپ چاہیں تو ان کا مقدمہ سنیں اور فیصلہ کر دیں اور چاہیں تو مقدمہ لینے ہی سے انکار کر دیں' کیونکہ ان کی نیت درست نہیں ہوتی اور وہ آپؐ کا فیصلہ لینے میں سنجیدہ نہیں ہوتے۔ لہٰذا ایسے لوگوں پر اپنا وقت ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ اندیشہ بھی تھا کہ وہ پراپیگنڈا کریں گے کہ دیکھو جی ہم تو گئے تھے محمد (ﷺ) کے پاس مقدمہ لے کر' یہ کیسے نبی ہیں کہ مقدمے کا فیصلہ کرنے کو ہی تیار نہیں! اس ضمن میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضور ﷺ کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ آپؐ اس کی پرواہ نہ کریں۔

﴿وَاِنْ تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَنْ یَّضُرُّوْكَ شَیْـًٔا ؕ﴾ ''اور اگر آپؐ ان سے اعراض کریں گے تو وہ آپؐ کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکیں گے۔''

یعنی ان کے مخالفانہ پراپیگنڈے سے قطعاً فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَیْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ؕ﴾ ''اور اگر آپؐ فیصلہ کریں تو ان کے درمیان انصاف کے عین مطابق

فیصلہ کریں۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝۴۲﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

آیت ۴۳ ﴿وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) یہ لوگ آپؐ کو کیسے حَکم بناتے ہیں''

﴿وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰىةُ﴾ ''جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے''

﴿فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ﴾ ''جس میں اللہ کا حکم موجود ہے''

یہاں اللہ تعالیٰ نے یہود کی بدنیتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے کہ اگر ان کی نیت درست ہو تو تورات سے راہنمائی حاصل کر لیں۔

﴿ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۭ﴾ ''پھر بھی وہ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔''

﴿وَمَآ اُولٰۗىِٕكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝۴۳﴾ ''اور حقیقت میں یہ لوگ مؤمن نہیں ہیں۔''

اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان سے تہی دست ہیں' ان کے دل ایمان سے خالی ہیں۔ یہ ہے ان کا اصل روگ۔

آیات ۴۴ تا ۵۰

اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَاۗءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۴۴ وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ۭ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۵ وَقَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ ۙ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۶ وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴۷ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ عَمَّا جَاۗءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۴۸ۙ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاِنَّ

كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا
ع لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

سورۃ المائدۃ کا یہ ساتواں رکوع حسنِ اتفاق سے سات ہی آیات پر مشتمل ہے۔ اس میں بہت سخت تہدید، تنبیہ اور دھمکی ہے ان لوگوں کے لیے جو کسی آسمانی شریعت پر ایمان کے دعوے دار ہوں اور پھر اس کے بجائے کسی اور قانون کے مطابق اپنی زندگی گزار رہے ہوں۔ قرآن حکیم کی طویل سورتوں میں کہیں کہیں تین تین آیتوں کے چھوٹے چھوٹے گروپ ملتے ہیں جو معانی و مفہوم کے لحاظ سے بہت جامع ہوتے ہیں، جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کی آیات ۱۰۲، ۱۰۳ اور ۱۰۴ ہیں۔ ابھی سورۃ المائدۃ میں بھی تین آیات پر مشتمل نہایت جامع احکامات کا حامل ایک مقام آئے گا۔ اسی طرح کہیں کہیں سات سات آیات کا مجموعہ بھی ملتا ہے۔ جیسے سورۃ البقرۃ کے پانچویں رکوع کی سات آیات (۴۰ تا ۴۶) بنی اسرائیل سے خطاب کے ضمن میں نہایت جامع ہیں۔ یہ دعوت کے ابتدائی انداز پر مشتمل ہیں اور دعوت کے باب میں بمنزلہ فاتحہ ہیں۔ اسی طرح قانونِ شریعت کی تنفیذ، اس کی اہمیت اور اس سے پہلوتہی پر وعید کے ضمن میں زیر مطالعہ رکوع کی سات آیات نہایت تاکیدی اور جامع ہیں، بلکہ یہ مقام اس موضوع پر قرآن حکیم کا ذروۂ سنام (climax) ہے۔

آیت ۴۴ ﴿اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ﴾ ''یقیناً ہم نے ہی نازل فرمائی تھی تورات''

﴿فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ﴾ ''اس میں ہدایت بھی تھی اور نور بھی تھا۔''

﴿يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ﴾ ''اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے انبیاء''

﴿الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا﴾ ''جو کہ سب فرمانبردار تھے (اللہ کے)''

ظاہر ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام خود بھی اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے۔

﴿لِلَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ ''(اور وہ فیصلے کرتے تھے) یہودیوں کے لیے''

یعنی انبیاء کرام علیہم السلام یہودیوں کے تمام فیصلے تورات (شریعتِ موسویؑ) کے مطابق کرتے تھے، جیسا کہ حدیث میں ہے ((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ)) [۲] یعنی بنی اسرائیل کی سیاست اور حکومت کے معاملات، انبیاء کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ اس لیے وہی ان کے مابین نزاعات کے فیصلے کرتے تھے۔

﴿وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ﴾ ''اور درویش اور علماء''

ان کے ہاں اللہ والے صوفیاء اور علماء و فقہاء بھی تورات ہی کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔

﴿بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ ''بسبب اس کے کہ وہ کتاب اللہ کے نگران بنائے گئے تھے''

انہیں ذمہ داری دی گئی تھی کہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کرنی ہے۔

﴿وَكَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ ۚ﴾ ''اور وہ اس پر گواہ تھے۔''

۲۔ صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسراءیل۔ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب وجوب الوفاء ببیعۃ الخلفاء الاول فالاول۔

﴿فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ﴾ ''(تو اُن سے کہہ دیا گیا تھا کہ) تم لوگوں سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو''

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ﴾ ''اور میری آیات کو حقیری قیمت پر فروخت نہ کرو۔''

یعنی اللہ کا طے کردہ قانون موجود ہے' اس کے مطابق فیصلے کرو۔ لوگوں کو پسند ہو یا ناپسند' اس سے تمہارا بالکل کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اب آ رہی ہے وہ کانٹے والی بات:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾ ''اور جو اللہ کی اُتاری ہوئی شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہی تو کافر ہیں۔''

بقولِ علامہ اقبال ؎

بُتوں سے تجھ کو اُمیدیں' خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

آیت ۴۵ ﴿وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ﴾ ''اور ہم نے لکھ دیا تھا اُن پر اس (تورات) میں''

﴿اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ﴾ ''کہ جان کے بدلے جان''

﴿وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ﴾ ''اور آنکھ کے بدلے آنکھ''

﴿وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ﴾ ''اور ناک کے بدلے ناک''

﴿وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ﴾ ''اور کان کے بدلے کان''

﴿وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ﴾ ''اور دانت کے بدلے دانت''

﴿وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ﴾ ''اور (اسی طرح) زخموں کا بدلہ بھی ہوگا برابر کا۔''

﴿فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ﴾ ''پھر جو کوئی اس کو معاف کر دے تو یہ اُس کے لیے (گناہوں کا) کفارہ ہوگا۔''

کسی نے ایک شخص کا کان کاٹ دیا' اب وہ جواباً اُس کا کان کاٹنے کا حق دار ہے' لیکن اگر وہ قصاص نہیں لیتا اور معاف کر دیتا ہے تو اسے اپنے بہت سے گناہوں کا کفارہ بنا لے گا۔ اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجرم کو جب معاف کر دیا گیا تو اس کے ذمے سے وہ گناہ ڈھل گیا۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾﴾ ''اور جو فیصلے نہیں کرتے اللہ کی اُتاری ہوئی شریعت کے مطابق وہی تو ظالم ہیں۔''

اور ظالم یہاں بمعنی مشرک ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے شرک کو ظلم عظیم قرار دیا ہے: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۳﴾﴾ (لقمان)

اب دیکھئے' ایک قانون اللہ کا ہے اور ایک انسانوں کا۔ پھر انسانوں کے بھی مختلف قوانین ہیں' ایک Roman Law ہے' ایک پاکستانی قانون ہے' ایک رواج پر مبنی قانون ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ فیصلہ کس قانون کے مطابق کر رہے ہیں؟ اللہ کے قانون کے تحت یا کسی اور قانون کے مطابق؟ اگر آپ نے اللہ کے قانون کے ساتھ ساتھ کسی اور قانون کو بھی مان لیا یا اللہ کے قانون کے مقابلے میں کسی اور قانون کو ترجیح دی تو یہ شرک ہے۔

آیت ﴿وَقَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ ''اور ہم نے ان کے پیچھے انہی کے نقش قدم پر عیسیٰؑ ابن مریم کو بھیجا''
﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ ۠﴾ ''(وہ آئے) تصدیق کرتے ہوئے اُس کی جو اُن کے سامنے موجود تھا تورات میں سے''

﴿وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ فِيْهِ هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ ''اور ہم نے انہیں انجیل عطا کی اس میں ہدایت بھی تھی اور نور بھی تھا''
﴿وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرٰىةِ﴾ ''اور وہ (انجیل بھی) تصدیق کر رہی تھی اُس کی جو تورات میں سے اُس کے سامنے موجود تھا''

﴿وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۴۶﴾ ''اور وہ ہدایت (راہنمائی) اور نصیحت تھی تقویٰ والوں کے لیے۔''

آیت ﴿وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۭ﴾ ''اور چاہیے کہ انجیل کے ماننے والے فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے۔''

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴۷﴾ ''اور جو لوگ نہیں فیصلے کرتے اللہ کے اُتارے ہوئے احکامات وقوانین کے مطابق' وہی تو فاسق ہیں۔''

وہی تو سرکش ہیں' وہی تو نافرمان ہیں' وہی تو ناہنجار ہیں۔ غور کیجیے ایک رکوع میں تین دفعہ یہ الفاظ دہرائے گئے ہیں:

﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۴۴﴾
﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۴۵﴾
﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴۷﴾

ان آیاتِ قرآنیہ کو سامنے رکھیے اور ملّتِ اسلامیہ کی موجودہ کیفیت کا جائزہ لیجیے کہ دنیا میں کتنے ممالک ہیں جہاں اللہ کا قانون نافذ ہے؟ آج روئے زمین پر کوئی ایک بھی ملک ایسا نہیں ہے جہاں شریعتِ اسلامی پورے طور پر نافذ ہو اور اسلام کا مکمل نظام قائم ہو۔ اگرچہ ہم انفرادی اعتبار سے مسلمان ہیں لیکن ہمارے نظام کافرانہ ہیں۔

آیت ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ﴾ ''اور (اب اے نبی ﷺ) ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمائی حق کے ساتھ''
﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ ''جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان پر نگران ہے''

یہ کتاب تورات اور انجیل کی مصداق بھی ہے اور مُصدِّق بھی۔ اور اس کی حیثیت کسوٹی کی ہے۔ پہلی کتابوں کے اندر جو تحریفات ہو گئی تھیں اب ان کی تصحیح اس کے ذریعے سے ہو گی۔

﴿فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ ''تو (آپؐ بھی) فیصلہ کریں ان کے درمیان اس (قانون) کے مطابق جو اللہ نے نازل فرمایا ہے''

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاۗءَهُمْ عَمَّا جَاۗءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۭ﴾ ''اور مت پیروی کریں ان کی خواہشات کی' اس حق کو چھوڑ کر جو آ چکا ہے آپ (ﷺ) کے پاس۔''

﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ﴾ ''تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہِ عمل طے کر دی ہے۔''

جہاں تک شریعت کا تعلق ہے سب کو معلوم ہے کہ شریعتِ موسویؑ شریعتِ محمدیؐ سے مختلف تھی۔ مزید برآں رسولوں کے منہاج (طریق کار) میں بھی فرق تھا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے منہاج میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپؑ ایک مسلمان اُمت (بنی اسرائیل) کے لیے بھیجے گئے تھے۔ وہ اُمت جو کہ دبی ہوئی تھی' پسی ہوئی تھی' غلام تھی۔ اس میں اخلاقی خرابیاں بھی تھیں' دینی اعتبار سے ضعف بھی تھا' وہ آلِ فرعون کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے مقصدِ بعثت میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ایک بگڑی ہوئی مسلمان امت کو کافروں کے تسلّط اور غلبے سے نجات دلائیں۔ اس کا ایک خاص طریقہ کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں بتایا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ایک مسلمان اُمت کے لیے مبعوث کیے گئے' یعنی یہودیوں ہی کی طرف۔ اس قوم میں نظریاتی فتور آ چکا تھا' ان کے معاشرے میں اخلاقی و روحانی گراوٹ انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ اُن کے علماء کی توجہ بھی دین کے صرف ظاہری احکام اور قانونی پہلوؤں پر رہ گئی تھی اور وہ اصل مقاصدِ دین کو بھول چکے تھے۔ دین کی اصل رُوح نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس سارے بگاڑ کی اصلاح کے لیے حضرت مسیحؑ کو اللہ تعالیٰ نے ایک خاص منہج' ایک خاص طریقہ کار عطا فرمایا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں میں مبعوث کیا گیا جو مشرک تھے' اَن پڑھ تھے' کسی نبی کے نام سے ناواقف تھے سوائے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے۔ ان کا احترام بھی وہ اپنے جدِّ امجد کے طور پر کرتے تھے' ایک نبی کے طور پر نہیں۔ کوئی شریعت ان میں موجود نہیں تھی' کوئی کتاب ان کے پاس نہیں تھی۔ گویا ''ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا'' کی مجسّم تصویر! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت و تبلیغ کے ذریعے ان میں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک عظیم جماعت پیدا کی' انہیں حزب اللہ بنایا' اور پھر اس جماعت کو ساتھ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر' شرک اور ائمہ کفر کے خلاف جہاد و قتال کیا' اور بالآخر اللہ کے دین کو اس معاشرے میں قائم کر دیا۔ یہ منہاج ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ تو یہ مفہوم ہے اس آیت کا ﴿لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ﴾ ''ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک منہاج (طریقہ کار' منہجِ عمل) مقرر کیا ہے''۔ اس لحاظ سے یہ آیت بہت اہم ہے۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ ''اور اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا''

﴿وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ﴾ ''مگر اُس نے چاہا کہ وہ اس چیز میں تمہاری آزمائش کرے جو اُس نے تم کو عطا کی''

یعنی اللہ کی حکمت اس کی متقاضی ہوئی کہ جس کو جو جو کچھ دیا گیا ہے اس کے حوالے سے اس کو آزمائے۔ چنانچہ اب ہمارے لیے اصل اُسوہ نہ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور نہ ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام' بلکہ ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱) کے مصداق ہمارے لیے اُسوہ ہے تو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اگر شادی نہیں کی تو یہ ہمارے لیے اُسوہ نہیں ہے۔ ہمیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کو پیش نظر رکھنا ہے' جنہوں نے فرمایا: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ))[۳] ''نکاح میری سُنّت میں سے ہے''۔ اور مزید فرمایا: ((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ))[۴] ''پس جس نے میری سُنّت کو

۳۔ سنن ابن ماجه' كتاب النكاح' باب ماجاء فی فضل النكاح۔

۴۔ صحيح البخاری' كتاب النكاح' باب الترغيب فی النكاح۔ وصحيح مسلم' كتاب النكاح' باب استحباب النكاح لمن تاقت نفسه اليه ...

لائقِ التفات نہ سمجھا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں''۔ تو واقعہ یہ ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام اللہ ہی کی طرف سے مبعوث تھے اور ہر ایک کے لیے جو بھی طریقہ اللہ تعالیٰ نے مناسب سمجھا وہ ان کو عطا کیا' البتہ ہمارے لیے قابلِ تقلید منہاجِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اب ہم پر فرض ہے کہ اس منہجِ انقلابِ نبویؐ کا گہرا شعور حاصل کریں' پھر اس راستے پر اُسی طرح چلیں جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم چلے۔ جس طرح آپؐ نے دین کو قائم کیا' غالب کیا' ایک نظام برپا کیا' پھر اُس نظام کے تحت اللہ کا قانون نافذ کیا' اُسی طرح ہم بھی اللہ کے دین کو قائم کرنے کی کوشش کریں۔

﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ﴾ ''تو تم نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کرو۔''

﴿اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا﴾ ''اللہ ہی کی طرف تم سب کا لوٹنا ہے''

﴿فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝۴۸﴾ ''تو وہ تمہیں جتلا دے گا اُن چیزوں کے بارے میں جن میں تم اختلاف کرتے رہے تھے۔''

آیت ۴۹ ﴿وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ ''اور فیصلے کیجیے ان کے مابین اس (شریعت) کے مطابق جو کہ اللہ نے اُتاری ہے''

﴿وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ﴾ ''اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کیجیے''

آج ہمارا کیا حال ہے؟ ہم کن لوگوں کی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں؟ آج ہم احکامِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال کر اپنے سیاسی پیشواؤں کی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں۔ وہ جو چاہتے ہیں قانون بنا دیتے ہیں' جو چاہتے ہیں فیصلہ کر دیتے ہیں اور پوری قوم اس کی پابند ہوتی ہے۔ ہم اس حال سے اسی صورت میں نکل سکتے ہیں کہ ایک زبردست جماعت بنائیں' طاقت پیدا کریں' ایک بھرپور تحریک اٹھائیں' قربانیاں دیں' جانیں لڑائیں' تاکہ یہ موجودہ نظام تبدیل ہو' اللہ کا دین قائم ہو' اور پھر اس دین کے مطابق ہمارے فیصلے ہوں۔ یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بار پھر سے تاکید کی جا رہی ہے کہ آپؐ ان کی خواہشات کی پیروی مت کیجیے اور اللہ کے احکام کے مطابق فیصلے کیجیے۔

﴿وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ؕ﴾ ''اور ان سے ہوشیار رہیے' ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ آپ کو ان میں سے کسی چیز سے بچلا دیں جو اللہ نے آپ پر نازل کی ہیں۔''

یعنی ہر طرف سے دباؤ آئے گا' لیکن آپؐ کو ثابت قدمی سے کھڑے رہنا ہے اُس شریعت پر جو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے۔

﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا﴾ ''پھر اگر وہ روگردانی کریں''

﴿فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ ذُنُوْبِهِمْ ؕ﴾ ''تو جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ان کے بعض گناہوں کی سزا دینا چاہتا ہے۔''

یہ دراصل لرزا دینے والا مقام ہے۔ اگر ہم اپنے اس ملک کے اندر اسلام کو قائم نہیں کرتے اور ہماری ساری کوششوں کے باوجود دین نافذ نہیں ہو رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے عذاب کا کوئی کوڑا مقدر ہو چکا ہے۔ واضح الفاظ میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر وہ اللہ کے احکامات سے مُنہ موڑیں' شریعت کے فیصلوں کا انکار کریں تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ درحقیقت ان کے گناہوں کی پاداش میں ان پر عذاب

نازل کرنا چاہتا ہے اور ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝۱۲﴾ (البروج) کے مصداق انہیں کوئی سزا دینا چاہتا ہے۔

﴿وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ۝۴۹﴾ ''اور اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ لوگوں میں سے اکثر فاسق (نافرمان) ہیں۔''

آیت ۵۰ ﴿اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ﴾ ''تو کیا یہ جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہیں؟''

جاہلیت سے مراد حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے کا دور ہے۔ یعنی کیا قانونِ الٰہی نازل ہو جانے کے بعد بھی یہ لوگ جاہلیت کے دستور، اپنی روایات اور اپنی رسومات پر عمل کرنا چاہتے ہیں؟ جیسا کہ ہندوستان میں مسلمان زمیندار انگریز کی عدالت میں کھڑے ہو کر کہہ دیتے تھے کہ ہمیں اپنی وراثت کے مقدمات میں شریعت کا فیصلہ نہیں چاہیے بلکہ رواج کا فیصلہ چاہیے۔

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝۵۰﴾ ''اور اللہ کے حکم (اور فیصلے) سے بہتر کس کا حکم ہو سکتا ہے اُن لوگوں کے لیے جو یقین رکھنے والے ہیں۔''

اللہ تعالیٰ ہمیں اس یقین اور ایمانِ حقیقی کی دولت سے سرفراز فرمائے۔ (آمین!)

آیات ۵۱ تا ۵۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۵۱ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝۵۲ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝۵۳ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَاۗىِٕمٍ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝۵۴ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝۵۵ وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۵۶ ع

آیت ۵۱ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ﴾ ''اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا دلی دوست (حمایتی اور پشت پناہ) نہ بناؤ۔''

﴿بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ﴾ ''وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔''

ان میں سے بعض بعض کے پشت پناہ اور مددگار ہیں۔ یہ درحقیقت ایک پیشین گوئی تھی جو اِس دور میں آ کر پوری ہوئی ہے۔ جب قرآن نازل ہوا تو صورت حال وہ تھی جو ہم قبل ازیں (اس سورۃ کی آیت ۱۴ میں) پڑھ آئے ہیں: ﴿فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ

الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ ﴾ ''پس ہم نے ان کے مابین عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی روزِ قیامت تک کے لیے''۔ چنانچہ عیسائیوں اور یہودیوں کے مابین ہمیشہ شدید دشمنی رہی ہے اور آپس میں کشت وخون ہوتا رہا ہے' لیکن زیر نظر الفاظ ﴿بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ میں جو پیشین گوئی تھی وہ بیسویں صدی میں آ کر پوری ہوئی ہے۔ بالفور ڈیکلریشن (۱۹۱۷ء) کے بعد کی صورتِ حال میں ان کا باہمی گٹھ جوڑ شروع ہوا' جس کے نتیجے میں برطانیہ اور امریکہ کے زیر اثر اسرائیل کی حکومت قائم ہوئی' اور اب بھی اگر وہ قائم ہے تو اصل میں انہی عیسائی ملکوں کی پشت پناہی کی وجہ سے قائم ہے۔ عیسائی اب یہودیوں کی اس لیے پشت پناہی کر رہے ہیں کہ اُن کی ساری معیشت یہودی بینکاروں کے زیر تسلط ہے۔ عیسائیوں کی معیشت پر یہودیوں کے قبضہ کی وجہ سے یہود و نصاریٰ کا یہ گٹھ جوڑ اس درجہ مستحکم ہو چکا ہے کہ آج عیسائیوں کی پوری عسکری طاقت یہودیوں کی پشت پر ہے۔

﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ؕ ﴾ ''اور تم میں سے جو کوئی ان سے دلی دوستی رکھے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا''۔ یعنی جو کوئی ان سے دوستی کے معاہدے کرے گا' ان سے نصرت وحمایت کا طلب گار ہوگا' ہماری نگاہوں میں وہ یہودی یا نصرانی شمار ہوگا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۱﴾﴾ ''یقیناً اللہ ایسے ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا''۔

آج ہمارے اکثر مسلمان ممالک کی پالیسیاں کیا ہیں اور اس سلسلے میں قرآن کا فتویٰ کیا ہے' وہ آپ کے سامنے ہے۔

آیت ۵۲ ﴿فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ ''تو تم دیکھتے ہو ان لوگوں کو جن کے دلوں میں روگ ہے''

﴿يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ﴾ ''وہ انہی کے اندر گھسنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں''

فلاں ملک سے دوستی کا معاہدہ' فلاں سے مدد کی درخواست' فلاں سے حمایت کی توقع' ان کی ساری بھاگ دوڑ' تگ ودو' خارجہ پالیسی ''يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ'' کی عملی تصویر ہے۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں روگ یعنی نفاق ہے۔ اگر اللہ پر ایمان ہو' اعتماد اور یقین ہو' اس سے خلوص اور اخلاص کا رشتہ ہو تو پھر اُسی سے نصرت وحمایت کی امید ہو اور ﴿اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ﴾ (محمد:۷) کے وعدے پر یقین ہو!

﴿يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ ﴾ ''وہ کہتے ہیں ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم گردشِ زمانہ (اور کسی مصیبت کے چکر) میں نہ پھنس جائیں''۔

یعنی ہم یہود و نصاریٰ سے اس لیے تعلقات استوار کر رہے ہیں کہ کل کلاں کسی ناگہانی آفت سے بچ سکیں۔

﴿فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ﴾ ''تو بہت ممکن ہے اللہ تعالیٰ جلد ہی فتح لے آئے یا اپنے پاس سے کوئی اور فیصلہ صادر فرما دے''

﴿فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ﴿۵۲﴾﴾ ''تو پھر جو کچھ وہ اپنے دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اس پر انہیں نادم ہونا پڑے''۔

انہیں معلوم ہو جائے گا کہ جن کی دوستی کا سہارا انہوں نے اپنے زعم میں لے رکھا تھا وہی انہیں دھوکا دے رہے ہیں' ع ''جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے!''

آیت ﴿وَيَقُولُ الَّذِينَ آمَنُوا أَهَٰؤُلَاءِ الَّذِينَ أَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ إِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۚ﴾ ''اور (اُس وقت) اہلِ ایمان کہیں گے کیا یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ وہ تو تمہارے ساتھ ہیں۔''

﴿حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَأَصْبَحُوا خَاسِرِينَ ﴿٥٣﴾﴾ ''ان کے تمام اعمال اکارت ہو جائیں گے اور وہ خسارے والے بن کر رہ جائیں گے۔''

اب جو تین آیتیں آ رہی ہیں ان میں اُن اہلِ ایمان کا ذکر ہے جو پورے خلوص و اخلاص کے ساتھ اللہ کے راستے میں جِدّوجُہد کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی توفیق دے کہ کمرِ ہمت کس کر اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں یہ احساس پیدا فرما دے کہ اُس کی شریعت کو نافذ کرنا ہے اور الکافِرون' الظالِمون اور الفاسِقون (المائدۃ: ۴۴' ۴۵ اور ۴۷) کی صفوں سے باہر نکلنا ہے۔ اس طرح کی جِدّوجُہد میں محنت کرنا پڑتی ہے' مشکلات برداشت کرنا پڑتی ہیں' تکالیف سہنا پڑتی ہیں۔ ایسے حالات میں بعض اوقات انسان کے قدم لڑکھڑانے لگتے ہیں اور عزم و ہمت میں کچھ کمزوری آنے لگتی ہے۔ ایسے موقع پر اس راہ کے مسافروں کی ایک خاص ذہنی اور نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے یہ تین آیات نہایت اہم اور جامع ہیں۔

آیت ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ﴾ ''اے ایمان والو! جو کوئی بھی پھر گیا تم میں سے اپنے دین سے''

﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ﴾ ''تو اللہ (کو کوئی پرواہ نہیں' وہ) عنقریب (تمہیں ہٹا کر) ایک ایسی قوم کو لے آئے گا''

﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ﴾ ''جنہیں اللہ محبوب رکھے گا اور وہ اُسے محبوب رکھیں گے''

﴿أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ﴾ ''وہ اہلِ ایمان کے حق میں بہت نرم ہوں گے''

﴿أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ ۖ﴾ ''کافروں پر بہت بھاری ہوں گے''

﴿يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ ''اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے''

﴿وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ﴾ ''اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی خوف نہیں کریں گے۔''

یہاں پر جو لفظ یَرْتَدَّ آیا ہے اس کے مفہوم میں ایک تو قانونی اور ظاہری ارتداد ہے۔ جیسے ایک شخص اسلام کو چھوڑ کر کافر ہو جائے' یہودی یا نصرانی ہو جائے۔ یہ تو بہت واضح قانونی ارتداد ہے' لیکن ایک باطنی ارتداد بھی ہے' یعنی اُلٹے پاؤں پھرنے لگنا' پسپائی اختیار کر لینا۔ اوپر اسلام کا لبادہ تو جوں کا توں ہے' لیکن فرق یہ واقع ہو گیا ہے کہ پہلے غلبۂ دین کی جِدّوجُہد میں لگے ہوئے تھے' محنتیں کر رہے تھے' وقت لگا رہے تھے' ایثار کر رہے تھے' انفاق کر رہے تھے' بھاگ دوڑ کر رہے تھے' اور اب کوئی آزمائش آئی ہے تو ٹھٹک کر کھڑے رہ گئے ہیں۔ جیسے سورۃ البقرۃ (آیت ۲۰) میں ارشاد ہے: ﴿كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ﴾ ''جب ذرا روشنی ہوتی ہے ان پر تو اس میں کچھ چل لیتے ہیں اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو کھڑے ہو جاتے ہیں''۔ اب کیفیت یہ ہے کہ نہ صرف کھڑے رہ گئے ہیں بلکہ کچھ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ ایسی کیفیت کے بارے میں فرمایا گیا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ اللہ تمہارا محتاج ہے' بلکہ تم اللہ کے محتاج ہو۔ تمہیں اپنی نجات کے لیے اپنے اس فرض کو ادا کرنا ہے۔ اگر تم نے پسپائی اختیار کی تو اللہ

تعالیٰ تمہیں ہٹائے گا اور کسی دوسری قوم کو لے آئے گا' کسی اور کے ہاتھ میں اپنے دین کا جھنڈا تھما دے گا۔

یہاں پر مؤمنین صادقین کے اوصاف کے ضمن میں جو تین جوڑے آئے ہیں ان پر ذرا دوبارہ غور کریں:

۱۔ ﴿یُحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗ﴾ ''اللہ ان سے محبت کرے گا اور وہ اللہ سے محبت کریں گے۔'' (اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنَا مِنْھُم!)

۲۔ ﴿اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ﴾ ''وہ اہلِ ایمان کے حق میں بہت نرم ہوں گے' کافروں پر بہت سخت ہوں گے''۔ یہی مضمون سورۃ الفتح (آیت ۲۹) میں دوسرے انداز سے آیا ہے: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ ''آپس میں بہت رحیم و شفیق' کفار پر بہت سخت''۔ بقولِ اقبالؔ: ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

۳۔ ﴿یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ ''اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا کوئی خوف نہیں کریں گے''۔ ان کے رشتہ دار اُن کو سمجھائیں گے' دوست احباب نصیحتیں کریں گے کہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا؟ تم fanatic ہو گئے ہو؟ تمہیں اولاد کا خیال نہیں' اپنے مستقبل کی فکر نہیں! مگر یہ لوگ کسی کی کوئی پروا نہیں کریں گے' بس اپنی ہی دھن میں مگن ہوں گے۔ اور ان کی کیفیت یہ ہوگی: ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا — تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں — سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی
اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے سو گزری — تنہا پسِ زنداں' کبھی رسوا سرِ بازار
کڑکے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر — گرجے ہیں بہت اہلِ حکم بر سرِ دربار
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام — چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت
اِس عشق' نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل — ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت!

یہ ایک کردار ہے جس کو واضح کرنے کے لیے دو دو اوصاف کے یہ تین جوڑے آئے ہیں۔ ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیں کہ وہ ہمیں اس کردار کو عملاً اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۵۴﴾﴾ ''یہ اللہ کا فضل ہے' جس کو چاہے عطا کرتا ہے' اور اللہ بہت وسعت رکھنے والا' سب کچھ جاننے والا ہے۔''

اللہ کے خزانوں میں کمی نہیں ہے۔ اگر تم اپنے بھائیوں' عزیزوں' دوستوں' ساتھیوں اور رفیقوں کو دیکھتے ہو کہ ان پر اللہ کا بڑا فضل ہوا ہے' انہوں نے کیسے کیسے مرحلے سر کر لیے ہیں' کیسی کیسی بازیاں جیت لیں ہیں' تو تم بھی اللہ سے اس کا فضل طلب کرو۔ اللہ تمہیں بھی ہمت دے گا۔ اس لیے کہ اس دین کے کام میں اس قسم کا رشک بہت پسندیدہ ہے۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رشک آیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر۔ جب غزوۂ تبوک کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا حکم دیا تو آپؓ نے سوچا کہ آج تو میں ابوبکرؓ سے بازی لے جاؤں گا' کیونکہ اتفاق سے اِس وقت میرے پاس خاصا مال ہے۔ چنانچہ انہوںؓ نے اپنے پورے مال کے دو برابر حصے کیے' اور پورا ایک حصہ یعنی آدھا مال لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈال دیا۔ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر میں جو کچھ تھا وہ سب لے آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے کہا میں نے جان لیا کہ ابوبکرؓ سے آگے کوئی نہیں بڑھ سکتا۔ تو دین کے معاملے

میں اللہ کا حکم ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ (المائدۃ:۴۸) یعنی نیکیوں میں' خیر میں' بھلائی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں رہو!

اب پھر اہلِ ایمان کو دوستانہ تعلقات کے معیار کے بارے میں خبردار کیا جا رہا ہے۔ اہلِ ایمان کی دلی دوستی کفار سے' یہود ہنود اور نصاریٰ سے ممکن ہی نہیں' اس لیے کہ یہ ایمان کے منافی ہے۔ اگر دین کی غیرت وحمیت ہوگی' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت دل میں ہوگی تو ان کے دشمنوں سے دلی دوستی ہو ہی نہیں سکتی۔

آیت ۵۵ ﴿اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا﴾ ''تمہارے ولی تو اصل میں بس اللہ' اُس کا رسول (ﷺ) اور اہلِ ایمان ہیں''

تمہارے دوست' پشت پناہ' حمایتی' معتمد اور راز دار تو بس اللہ' اُس کا رسول ﷺ اور اہلِ ایمان ہیں۔ اور یہ اہلِ ایمان بھی پیدائشی اور قانونی مسلمان نہیں' بلکہ:

﴿الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ۝۵۵﴾ ''جو نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں جھک کر۔''

یہاں وَهُمْ رٰكِعُوْنَ کا مطلب ''وہ رکوع کرتے ہیں'' صحیح نہیں ہے۔ یہ درحقیقت زکوٰۃ دینے کی کیفیت ہے کہ وہ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں فروتنی کرتے ہوئے۔ ہم سورۃ البقرۃ (آیت ۲۷۳) میں پڑھ آئے ہیں کہ سب سے بڑھ کر انفاق فی سبیل اللہ کے مستحق کون لوگ ہیں: ﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۪﴾ جو اللہ کے دین کے لیے ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف ہیں اور ان کے پاس اب اپنی معاشی جدّوجُہد کے لیے وقت نہیں ہے۔ لیکن وہ فقیر تو نہیں کہ آپ سے جھک کر مانگیں' یہ تو آپ کو جھک کر' فروتنی کرتے ہوئے ان کی مدد کرنا ہوگی۔ آپ انہیں دیں اور وہ قبول کر لیں تو آپ کو ان کا ممنونِ احسان ہونا چاہیے۔

آیت ۵۶ ﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''اور جو کوئی دوستی قائم کرے گا اللہ' اُس کے رسول (ﷺ) اور ایمان والوں کے ساتھ''

یوں سمجھ لیں کہ یہاں یہ فقرہ محذوف ہے: ''تو وہ شامل ہو جائے گا حزب اللہ (اللہ کی پارٹی) میں۔''

﴿فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝۵۶﴾ ''پس سن لو کہ حزب اللہ ہی غالب رہنے والی ہے۔''

یہ شرائط پہلے پوری کی جائیں' ان تمام معیارات پر پورا اترا جائے' اللہ تعالیٰ کے وعدے پر ایمان رکھا جائے' تو پھر یقیناً حزب اللہ ہی غالب رہے گی۔

آیات ۵۷ تا ۶۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ الْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۵۷ وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝۵۸ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۵۹

قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۶۰﴾ وَ اِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَ قَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَ هُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۲﴾ لَوْ لَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ الْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَ اَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ ۙ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّ كُفْرًا ؕ وَ اَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾ ع

آیت ۵۷ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ﴾ ''اے اہلِ ایمان! ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی مذاق اور کھیل بنا رکھا ہے ان لوگوں میں سے جنہیں کتاب دی گئی تھی تم سے پہلے اور دوسرے کافروں میں سے بھی۔''

پھر وہی بات فرمائی گئی کہ مشرکین اور اہلِ کتاب میں سے کسی کو اپنا ولی اور دوست نہ بناؤ۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۵۷﴾﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اگر تم مؤمن ہو۔''

آیت ۵۸ ﴿وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ؕ﴾ ''اور جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو یہ لوگ اس کو مذاق اور کھیل بنا لیتے ہیں۔''

یعنی اذان کی آواز سن کر اس کی نقلیں اتارتے ہیں اور تمسخر کرتے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴿۵۸﴾﴾ ''یہ اس وجہ سے کہ یہ لوگ عقل سے عاری ہیں۔''

آیت ۵۹ ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے کہ اے کتاب والو!''

﴿هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ﴾ ''تم کس بات کا انتقام لے رہے ہو ہم سے؟''

﴿اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ﴾ ''سوائے اس کے کہ ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر''

﴿وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا﴾ ''اور (اس پر) جو ہم پر نازل کیا گیا''

﴿وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور (اس پر بھی) جو پہلے نازل کیا گیا''

﴿وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۵۹﴾ ''اور حقیقت یہ ہے کہ تمہاری اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔''

آیت ۶۰ ﴿قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ ''آپ (ﷺ) کہیے کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اللہ کے ہاں اس سے بھی بدتر سزا پانے والے کون ہیں؟''

﴿مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ﴾ ''(وہ لوگ ہیں) جن پر اللہ نے لعنت کی''

﴿وَغَضِبَ عَلَيْهِ﴾ ''اور جن پر وہ غضب ناک ہوا''

﴿وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ﴾ ''اور جن میں سے اُس نے بندر اور خنزیر بنا دیے''

﴿وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ؕ﴾ ''اور جنہوں نے شیطان کی بندگی کی۔''

﴿اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝۶۰﴾ ''یہ سب کے سب بہت بُرے مقام میں ہیں اور بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں سیدھے راستے سے۔''

آیت ۶۱ ﴿وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا﴾ ''اور جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے''

﴿وَقَدْ دَّخَلُوْا بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ؕ﴾ ''حالانکہ وہ داخل بھی ہوئے تھے کفر کے ساتھ اور نکلے بھی ہیں کفر کے ساتھ۔''

میرے نزدیک یہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جن کا ذکر سورۂ آل عمران (آیت ۷۲) میں آیا ہے' جنہوں نے فیصلہ کیا تھا کہ صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو کافر ہو جاؤ۔ ان کے بارے میں یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ کفر کے ساتھ داخل ہوئے تھے اور کفر کے ساتھ ہی نکلے ہیں' ایک لمحہ کے لیے بھی انہیں ایمان کی حلاوت نصیب نہیں ہوئی۔ وہ شعوری طور پر فیصلہ کر چکے تھے کہ رہنا تو ہمیں اپنے دین پر ہے' لیکن اسلام کی جو ساکھ بن گئی ہے اس کو نقصان پہنچانے کی خاطر ہم یہ دھوکہ اور سازش کر رہے ہیں۔

﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا يَكْتُمُوْنَ ۝۶۱﴾ ''اور اللہ خوب جانتا ہے جو وہ چھپائے ہوئے تھے۔''

آیت ۶۲ ﴿وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ ''اور تم دیکھو گے ان میں سے اکثر کو کہ بہت بھاگ دوڑ کرتے ہیں گناہ اور ظلم و زیادتی (کے کاموں) میں''

﴿وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ﴾ ''اور حرام کے مال کھانے میں۔''

﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝۶۲﴾ ''بہت ہی بُرا عمل ہے جو وہ کر رہے ہیں!''

آیت ۶۳ ﴿لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ؕ﴾ ''کیوں نہیں منع کرتے انہیں ان کے درویش (صوفی اور پیر و مرشد) اور علماء و فقہاء گناہ کی بات کہنے سے اور حرام خوری سے؟''

آج ہمارے ہاں بھی اکثر و بیشتر پیر اپنے مریدوں کو حرام خوری سے منع نہیں کرتے۔ انہیں اس میں سے نذرانے مل جانے

چاہئیں اللہ اللہ خیر سلا۔ کہاں سے کمایا؟ کیسے کمایا؟ اس سے کوئی بحث نہیں۔ حالانکہ اللہ والوں کا کام تو برائی سے روکنا ہے' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔

﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝۶۳﴾ ''بہت بُرا ہے وہ کام جو وہ کر رہے ہیں۔''

آیت ۶۴ ﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ ؕ﴾ ''اور یہود نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بند ہو گیا۔''

ان کے اس قول کا مطلب یہ تھا کہ اللہ کی رحمت جو ہمارے لیے تھی وہ بند ہو گئی ہے' نبوت کی رحمت ہمارے لیے مختص تھی اور اب یہ دستِ رحمت ہماری طرف سے بند ہو گیا ہے۔ یا اس کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے جو منافقین کہا کرتے تھے کہ اللہ ہم سے قرضِ حسنہ مانگتا ہے تو گویا اللہ فقیر ہو گیا ہے (نعوذ باللہ) اور ہم اغنیاء ہیں۔ جواب میں فرمایا گیا:

﴿غُلَّتْ اَيْدِيْهِمْ﴾ ''ان کے ہاتھ بندھ گئے ہیں'' یا ''بندھ جائیں ان کے ہاتھ''

﴿وَلُعِنُوْا بِمَا قَالُوْا ۘ﴾ ''اور ان پر لعنت ہے اس کے سبب جو انہوں نے کہا''

﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ ''بلکہ اللہ کے دونوں ہاتھ تو کھلے ہوئے ہیں''

﴿يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَآءُ ؕ﴾ ''وہ جیسے چاہے خرچ کرتا ہے۔''

﴿وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ؕ﴾ ''اور یقیناً اضافہ کرے گا ان میں سے اکثر کی سرکشی اور کفر میں جو کچھ (اے نبی ﷺ!) نازل کیا گیا ہے آپ پر آپ کے ربّ کی طرف سے۔''

یعنی ضد میں آ کر انہوں نے حق و صداقت پر مبنی اس کلام کی مخالفت شروع کر دی ہے۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جیسے جیسے جو جو احسانات بھی آپؐ پر اور آپؐ کے ساتھیوں پر ہو رہے ہیں' اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جو غنیمتیں دے رہا ہے' دین کو رفتہ رفتہ جو غلبہ حاصل ہو رہا ہے' اس کے حسد کے نتیجے میں ان کی ضد اور ہٹ دھرمی بڑھتی جا رہی ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد تو خاص طور پر عرب کے اندر بہت تیزی کے ساتھ صورتحال بدلنی شروع ہو گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں بجائے اس کے کہ یہ لوگ سمجھ جاتے کہ واقعی یہ اللہ کی طرف سے حق ہے اور یک سُو ہو کر اس کا ساتھ دیتے' ان کے اندر کی جلن اور حسد کی آگ مزید بھڑک اٹھی۔

﴿وَاَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ؕ﴾ ''اور ہم نے ان کے مابین قیامت تک کے لیے دشمنی اور بغض ڈال دیا ہے۔''

﴿كُلَّمَآ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۙ﴾ ''جب کبھی یہ آگ بھڑکاتے ہیں جنگ کے لیے اللہ اُس کو بجھا دیتا ہے''

جنگ کی آگ بھڑکانے کے لیے یہودی اکثر سازشیں کرتے رہتے تھے۔ خاص طور پر غزوۂ احزاب تو ان ہی کی سازشوں کے نتیجے میں برپا ہوا تھا۔ مدینے کے یہودی قبائل عرب کے پاس جا جا کر' اِدھر اُدھر وفد بھیج کر لوگوں کو جمع کرتے تھے کہ آؤ تم باہر سے حملہ کرو' ہم اندر سے تمہاری مدد کریں گے۔ ان کی انہی سازشوں کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ جب بھی وہ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ تعالیٰ اسے بجھا دیتا ہے۔

﴿وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ؕ﴾ ''اور (پھر بھی) یہ زمین میں فساد مچانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے رہتے ہیں۔''

﴿وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ ۝۶۴﴾ ''اور اللہ ایسے مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔''

آیت ﴿۶۵﴾ ﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا﴾ ''اور اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے''

﴿لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ﴾ ''تو ہم اُن سے اُن کی برائیوں کو دور کر دیتے''

﴿وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۶۵﴾﴾ ''اور ہم لازماً انہیں داخل کرتے نعمتوں والے باغوں میں۔''

جو آیت آگے آ رہی ہے اس پر غور کیجیے اور اسے خود پر بھی منطبق کر کے ذرا سوچیے۔

آیت ﴿۶۶﴾ ﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ﴾ ''اور اگر انہوں نے قائم کیا ہوتا تورات کو اور انجیل کو اور اس کو جو کچھ نازل کیا گیا تھا ان پر اِن کے رب کی طرف سے''

﴿لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ﴾ ''تو یہ کھاتے اپنے اوپر سے بھی اور اپنے قدموں کے نیچے سے بھی۔''

یعنی ہم نے انہیں تورات اس لیے دی تھی کہ اس کے احکامات کو نافذ کیا جائے۔ اسی سورت کے ساتویں رکوع (آیات ۴۴ تا ۵۰) میں اس کا مفصل ذکر ہم پڑھ آئے ہیں کہ کس طرح انہیں حکم دیا گیا تھا کہ اپنے فیصلے تورات کے احکامات کے مطابق کرو۔ اس سے اگلا مرحلہ اس پورے نظام کے نفاذ کا تھا جو تورات نے دیا تھا۔ اس کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے کہ اگر انہوں نے اللہ کا وہ نظام قائم کیا ہوتا تو ان کے اوپر سے بھی ان کے رب کی طرف سے نعمتوں کی بارش ہوتی اور ان کے قدموں کے نیچے سے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے دھارے پھوٹتے۔ اسی طرح ہم پر بھی فرض ہے کہ ہم بھی قرآن کے نظام کو قائم کریں۔

﴿مِنْهُمْ اُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ؕ﴾ ''ان میں کچھ لوگ ہیں جو درمیانی (یعنی سیدھی) راہ پر ہیں۔''

﴿وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ سَآءَ مَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۶۶﴾﴾ ''لیکن ان میں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو بہت بُری حرکتیں کر رہے ہیں۔''

ان کا عمل اور رویہ نہایت غلط ہے۔

آیات ۶۷ تا ۷۷

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۸﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ

يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾
لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَ اِنْ لَّمْ
يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ
وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾ مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ
قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ
انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۷۵﴾ قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ؕ
وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۷۶﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَ لَا تَتَّبِعُوْٓا
اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ﴿۷۷﴾

آیت ۶۷ ﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ﴾ ''اے رسول (ﷺ) پہنچا دیجیے جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی جانب سے۔''

﴿وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ؕ﴾ ''اور اگر (بالفرض) آپؐ نے ایسا نہ کیا تو گویا آپؐ نے اُس کی رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔''

اپنے مضمون کے اعتبار سے یہ بہت سخت آیت ہے۔ اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اگر وحی میں کہیں رسول اللہ ﷺ پر تنقید نازل ہوئی ہے تو وہ بھی قرآن میں جوں کی توں موجود ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ ایسی چیزوں کو چھپا لیا گیا ہو۔ تیسویں پارے میں سورۃ عبس کی ابتدائی آیات ﴿عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝۱ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝۲﴾ بھی ویسے ہی موجود ہیں جیسے نازل ہوئی تھیں۔ سورۂ آل عمران میں بھی ہم پڑھ کر آئے ہیں کہ حضور ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ ...﴾ (آیت ۱۲۸)۔ ظاہر ہے لَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰى، وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلَ! ''بندہ بندہ ہی رہتا ہے چاہے کتنا ہی بلند ہو جائے اور رب رب ہی ہے چاہے کتنا ہی نزول فرمالے''۔ اس طرح کی آیات اپنی جگہ پر من وعن موجود ہیں' اور یہ قرآن کے محفوظ من اللہ ہونے پر حجت ہیں۔ آیت زیر نظر میں تنبیہہ کی جا رہی ہے کہ وحی الٰہی میں سے کوئی چیز کسی وجہ سے پہنچنے سے رہ نہ جائے۔ لوگوں کے خوف سے یا اپنی کسی مصلحت کی وجہ سے بالفرض اگر ایسا ہوا تو گویا آپ ﷺ فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کا ثبوت دیں گے۔

﴿وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ﴾ ''اور اللہ آپؐ کی حفاظت کرے گا لوگوں سے۔''

آپ کو لوگوں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۶۷﴾﴾ ''یقیناً اللہ کافروں کو راہ یاب نہیں کرتا۔''

آیت ۶۸ ﴿قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے: اے کتاب والو تم کسی چیز پر نہیں ہو'' تمہاری کوئی حیثیت نہیں ہے' کوئی مقام نہیں ہے' کوئی جڑ بنیاد نہیں ہے' تم ہم سے ہم کلام ہونے کے مستحق نہیں ہو۔

﴿حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ ''جب تک تم قائم نہ کرو تورات اور انجیل

کو اور جو کچھ نازل کیا گیا ہے تم پر تمہارے رب کی طرف سے۔''

اب اُمّتِ مُسلمہ کے حوالے سے اس آیت کو آپ اس طرح پڑھ لیجیے: یٰٓاَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا الْقُرْاٰنَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ''اے قرآن کے ماننے والو! تمہاری کوئی حیثیت نہیں.....'' تم سمجھتے ہو کہ ہم اُمّتِ مُسلمہ ہیں' اللہ والے ہیں' اللہ کے لاڈلے اور پیارے ہیں' اللہ کے آخری رسول ﷺ کے اُمّتی ہیں۔ لیکن تم دیکھ رہے ہو کہ ذلّت وخواری تمہارا مقدر بنی ہوئی ہے' ہر طرف سے تم پر یلغار ہے' عزت و وقار نام کی کوئی شے تمہارے پاس نہیں رہی۔ تم کتنی ہی تعداد میں کیوں نہ ہو' دنیا میں تمہاری کوئی حیثیت نہیں' بلکہ تم اس سے زیادہ بے توقیری کے لیے بھی تیار رہو۔ یاد رکھو! ''تمہاری کوئی اصل نہیں جب تک تم قائم نہ کرو قرآن کو اور اس کے ساتھ جو کچھ مزید تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے''۔ قرآن وحی جلی ہے۔ اس کے علاوہ حضور ﷺ کو وحی خفی کے ذریعے سے بھی تو احکامات ملتے تھے اور سُنّتِ رسولؐ وحی خفی کا ظہور ہی تو ہے۔ تو جب تک تم کتاب وسُنّت کا نظام قائم نہیں کرتے' تمہاری کوئی حیثیت نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ''یَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ'' کا خطاب خود حضور ﷺ نے ہمیں دیا ہے۔ میرے کتابچے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' میں وہ حدیث موجود ہے جس میں حضور ﷺ سے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((يَا اَهْلَ الْقُرْاٰنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْاٰنَ' وَاتْلُوْهُ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ مِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ' وَاَفْشُوْهُ وَتَغَنَّوْهُ وَتَدَبَّرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ))(۵)

''اے اہلِ قرآن' قرآن کو اپنا تکیہ نہ بنا لینا' بلکہ اسے پڑھا کرو رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی' جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے' اور اسے عام کرو اور خوش الحانی سے پڑھو اور اس میں تدبّر کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔''

﴿وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَّكُفْرًا﴾ ''لیکن (اے نبی ﷺ!) جو کچھ آپ پر نازل کیا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے یہ ان کے اکثر لوگوں کی سرکشی اور کفر میں یقیناً اضافہ کرے گا۔''

ان کی سرکشی اور طغیانی میں اور اضافہ ہوگا' ان کی مخالفت اور بڑھتی چلی جائے گی' حسد کی آگ میں وہ مزید جلتے چلے جائیں گے۔

﴿فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ ''تو آپؐ ان کافروں کے بارے میں افسوس نہ کریں۔''

نبی چونکہ اپنی اُمت کے حق میں نہایت رحیم وشفیق ہوتا ہے لہٰذا قوم پر عذاب کے تصور سے اسے صدمہ ہوتا ہے۔ پھر خصوصاً جب وہ لوگ اپنی برادری بھی ہوں' جیسا کہ بنی اسماعیلؑ تھے' تو یہ رنج وصدمہ دوچند ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب قریشِ مکّہ کے بارے میں سورۂ یونسؑ اور سورۂ ہودؑ میں عذاب کی خبریں آنا شروع ہوئیں تو حضور ﷺ بہت فکرمند اور غمگین رہتے۔ اس فکر اور تشویش کی وجہ سے آپؐ کے بالوں میں یک دم سفیدی آ گئی۔ اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا' حضور ﷺ کیا ہوا؟ آپؐ پر بڑھاپا طاری ہو گیا؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((شَيَّبَتْنِيْ هُوْدٌ وَاَخَوَاتُهَا))(۶) ''مجھے سورۂ ہود اور اس کی بہنوں (ہم مضمون سورتوں) نے بوڑھا کر دیا ہے''۔ ان سورتوں کا انداز ایسا ہے کہ جیسے اب مہلت ختم ہوئی چاہتی ہے اور عذاب کا دھارا چھوٹنے ہی والا ہے۔

۵۔ رواہ البیھقی فی شعب الایمان' عن عبیدۃ للیلکی رضی اللہ عنہ۔ مشکاۃ للصابیح' کتاب فضائل القرآن' باب آداب التلاوۃ ودروس القرآن۔

۶۔ مشکاۃ للصابیح' کتاب الرقاق' باب البکاء والخوف' بحوالہ الترمذی۔ سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ للالبانی: ۶۴۱۲ و ۶۴۲۔

آیت ﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰی ﴾ ''بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے' اور وہ لوگ جو یہودی' صابی' اور نصاریٰ (عیسائی) ہوئے''

اس آیت میں تقریباً وہی مضمون ہے جو اس سے پہلے سورۃ البقرۃ کے آٹھویں رکوع (آیت ۶۲) میں آچکا ہے' جس سے بعض لوگوں کو دھوکا ہوتا ہے کہ شاید نجات کے لیے ایمان بالرسالت کی ضرورت نہیں ہے' حالانکہ سورۃ النساء (آیات ۵۰' ۵۱ اور ۵۲) میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے مابین تفریق کرنے والوں کے لیے بہت واضح انداز میں فرمایا گیا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا﴾ ''وہی لوگ تو پکے کافر ہیں۔'' دوسری بات یہاں ذہن میں یہ رکھیے کہ ان تمام سورتوں میں محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی دعوت قدم قدم پر ہے' بار بار ہے' لہٰذا اس سے استغناء کا کوئی جواز رہتا ہی نہیں' سوائے اس کے کہ کسی کی نیت میں فساد ہو اور دل میں کجی پیدا ہو چکی ہو۔

﴿مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ ''(اپنے اپنے زمانے میں جس قوم اور جس گروہ سے) جو کوئی ایمان لایا اللہ پر اور یوم آخرت پر اور اُس نے اچھے عمل کیے تو اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غم سے دوچار ہوں گے۔''

یہاں وہ تمام لوگ مراد ہیں جو اپنے اپنے دور میں اللہ اور آخرت پر ایمان و یقین رکھتے تھے اور اپنے وقت کے نبی اور گزشتہ انبیاء پر ایمان رکھتے تھے۔ جیسے حضرت مسیح علیہ السلام سے ماقبل زمانہ میں یہودی تھے' جو کتاب اللہ تورات پر یقین رکھتے تھے' حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانتے تھے' دوسرے نبیوں کو مانتے تھے اور نیک عمل کرتے تھے۔ لیکن عمل کے معاملے میں اصل چیز اور اصل بنیاد اللہ کی رضا جوئی اور آخرت کی جزا طلبی ہے' جس سے کوئی عمل' عملِ صالح بنتا ہے۔

آیت ﴿ لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ﴾ ''ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کی طرف بہت سے رسول بھیجے۔''

یہاں بہت سے رسول بھیجنے سے مراد ہے بہت سے انبیاء بھیجے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں' قرآن مجید میں رسول کا لفظ نبی کی جگہ بھی استعمال ہوا ہے' البتہ جہاں تک لفظ رسول کے اصطلاحی مفہوم کا تعلق ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں رسول صرف ایک آئے ہیں یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام' باقی سب نبی تھے۔

﴿كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ﴾ ''(لیکن) جب بھی کبھی ان کے پاس کوئی رسول لے کر آیا وہ چیز جو اُن کی خواہشاتِ نفس کے خلاف تھی''

﴿فَرِيْقًا كَذَّبُوْا وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴾ ''تو ایک گروہ کو انہوں نے جھٹلایا اور ایک گروہ کو وہ قتل کرتے رہے۔''

آیت ﴿ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ﴾ ''اور انہوں نے سمجھا کہ اُن پر کوئی پکڑ نہیں آئے گی''

کوئی عقوبت نہیں ہوگی' کوئی سرزنش نہیں ہوگی۔

﴿فَعَمُوْا وَصَمُّوْا ﴾ ''تو وہ بہرے بھی ہو گئے اور اندھے بھی ہو گئے''

﴿ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ﴾ ''پھر اللہ نے انہیں معاف کر دیا''

اللہ تعالیٰ نے بھی انہیں فوراً نہیں پکڑا۔ انہیں توبہ کی مہلت دی' موقع دیا۔

﴿ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ﴾ ''(نتیجہ یہ ہوا کہ) پھر ان میں سے اکثر لوگ اور زیادہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔''

بجائے اللہ کے دامنِ رحمت میں آنے کے اپنی گمراہی میں اور بڑھتے چلے گئے۔

﴿وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿٧١﴾﴾ ''اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

آیت ۷۲ ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ ''یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابنِ مریم ہی ہے۔''

یہ وہی بات ہے جو اس سے پہلے اسی سورۃ کی آیت ۱۷ میں آ چکی ہے' یعنی اللہ ہی نے مسیح علیہ السلام کی شخصیت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔

﴿وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ﴾ ''جبکہ مسیحؑ نے تو کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل' بندگی اور پرستش کرو اللہ کی جو میرا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی ربّ ہے۔''

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ﴾ ''یقیناً جو بھی اللہ کے ساتھ شرک کرے گا تو اللہ نے اُس پر جنت کو حرام کر دیا ہے''

﴿وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٧٢﴾﴾ ''اور اُس کا ٹھکانہ آگ ہے' اور ایسے ظالموں کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔''

اب عیسائیوں کے شرک کی ایک دوسری شکل کا ذکر ہو رہا ہے۔ ان کا ایک عقیدہ تو خدا کی تجسیم (God incarnate) کا تھا۔ یہ ان میں سے ایک فرقے Jacobites کا عقیدہ تھا کہ خود اللہ تعالیٰ ہی نے عیسیٰؑ کی شکل میں انسانی روپ دھار لیا ہے۔ اوپر اسی عقیدے کا ذکر ہوا ہے' لیکن عیسائیوں کے ہاں ایک عقیدہ ''تثلیث'' کا بھی ہے' اور اس عقیدہ کی بھی ان کے ہاں دو شکلیں ہیں۔ ابتدا میں جو تثلیث تھی اس میں اللہ' حضرت مریمؑ اور حضرت مسیحؑ شامل تھے۔ یعنی "God the Father, God the Mother and God the Son." دراصل یہ تثلیث مصر میں فراعنہ کے زمانے سے چلی آ رہی تھی۔ اسی کے اندر انہوں نے عیسائیت کو ڈھال دیا' تاکہ مصر کے لوگ آسانی سے عیسائیت قبول کر لیں۔ اس کے بعد حضرت مریمؑ کو اس تثلیث میں سے نکال دیا گیا اور Holy Ghost یا Holy Spirit (روح القدس) کو ان کی جگہ شامل کر لیا گیا اور اس طرح "God the father, God the Son and God the Holy Ghost" پر مشتمل تثلیث وجود میں آئی۔

آیت ۷۳ ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ﴾ ''یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے۔''

﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۭ﴾ ''جبکہ حقیقتاً نہیں ہے کوئی الٰہ سوائے ایک ہی الٰہ کے۔''

﴿وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا عَمَّا يَقُوْلُوْنَ﴾ ''اور اگر یہ باز نہ آئے اس سے جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں''

﴿لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿٧٣﴾﴾ ''تو ان میں سے جو کافر ہیں ان پر بہت دردناک عذاب آ کر

رہے گا۔‘‘

آیت ۷۴ ﴿اَفَلَا یَتُوْبُوْنَ اِلَی اللّٰہِ وَیَسْتَغْفِرُوْنَہٗ ؕ﴾ ’’تو کیا یہ لوگ اللہ کی جناب میں توبہ اور اُس سے استغفار نہیں کرتے؟‘‘

﴿وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۷۴﴾﴾ ’’اور اللہ تو غفور اور رحیم ہے۔‘‘

آیت ۷۵ ﴿مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ﴾ ’’مسیح ابنِ مریم اور کچھ نہیں سوائے اس کے کہ وہ ایک رسول تھے۔‘‘

﴿قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ؕ﴾ ’’ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے تھے۔‘‘

یہ بالکل وہی الفاظ ہیں جو سورۂ آل عمران (آیت ۱۴۴) میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں آئے ہیں: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ ؕ﴾ ’’محمد (ﷺ) اس کے سوا کیا ہیں کہ بس ایک رسول ہیں‘ اور آپؐ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں‘‘۔ تو اسی طرح فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت اللہ کے ایک رسول کی ہے‘ جس طرح ان سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔

﴿وَاُمُّہٗ صِدِّیْقَۃٌ ؕ﴾ ’’اور ان کی والدہ صِدّیقہ تھیں۔‘‘

قبل ازیں ہم سورۃ النساء (آیت ۶۹) میں پڑھ چکے ہیں کہ نبیوں کے بعد سب سے اونچا درجہ صِدّیقین کا ہے۔ خواتین کو اگرچہ نبوت تو نہیں ملی ہے لیکن انبیاء کے بعد کا جو دوسرا درجہ ہے اس میں بہت چوٹی کی حیثیتیں انہیں ملی ہیں۔ ہماری اُمت کی صِدّیقۃ الکبریٰ یعنی سب سے بڑی صِدّیقہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ہیں (صِدّیق اکبر کی حیثیت اس اُمت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ملی ہے)۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی صِدّیقہ ہیں۔ اسی طرح حضرت مریمؑ بھی صِدّیقہ تھیں۔

﴿کَانَا یَاْکُلٰنِ الطَّعَامَ ؕ﴾ ’’وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔‘‘

وہ ماں بیٹا دونوں انسان تھے‘ بشر تھے اور سارے بشری تقاضے ان کے ساتھ تھے۔

﴿اُنْظُرْ کَیْفَ نُبَیِّنُ لَہُمُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰی یُؤْفَکُوْنَ ﴿۷۵﴾﴾ ’’دیکھو‘ کس طرح ہم ان کے لیے اپنی آیات واضح کرتے ہیں‘ پھر دیکھو کہ وہ کہاں سے اُلٹا دیے جاتے ہیں۔‘‘

آیت ۷۶ ﴿قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ؕ﴾ ’’آپؐ کہیے کیا تم پوجتے ہو اللہ کے سوا انہیں جو تمہارے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ نفع کا؟‘‘

﴿وَاللّٰہُ ہُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۷۶﴾﴾ ’’جبکہ اللہ ہی سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔‘‘

آیت ۷۷ ﴿قُلْ یٰٓاَہْلَ الْکِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ غَیْرَ الْحَقِّ﴾ ’’کہہ دیجیے اے اہلِ کتاب‘ اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو‘‘

یہ تم نے حضرت عیسیٰؑ کو محبت اور عقیدت کی وجہ سے جو کچھ بنا دیا ہے‘ وہ سراسر مبالغہ ہے۔ حضور ﷺ کی شان میں بھی مبالغہ آرائی اگر لوگ کرتے ہیں تو محبت کی وجہ سے کرتے ہیں‘ عشقِ رسول ﷺ کے نام پر کرتے ہیں‘ عقیدت کے غلو کی وجہ سے کرتے ہیں۔ تو غلو (مبالغہ) درحقیقت انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے منع کیا جا رہا ہے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ﴾ ''اور مت پیروی کرو اُن لوگوں کی بدعات کی جو تم سے پہلے (خود بھی) گمراہ ہوئے''

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے' یہ تثلیث مصر میں زمانہ قدیم سے موجود تھی' اُسی کو انہوں نے اختیار کیا۔

﴿وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ ''اور انہوں نے بہت سے دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کیا اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔''

آیات ۷۸ تا ۸۶

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿۷۸﴾ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۱﴾ لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۴﴾ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿۸۶﴾ ع

الجزء السابع (۷)

آیت ۷۸ ﴿لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ؕ﴾ ''لعنت کی گئی اُن لوگوں پر جنہوں نے کفر کیا بنی اسرائیل میں سے' داؤدؑ کی زبان سے اور عیسیٰؑ ابن مریم کی زبان سے بھی۔''

بنی اسرائیل کا جو کردار رہا ہے اس پر ان کے انبیاء ان کو مسلسل لعن طعن کرتے رہے ہیں۔ عہد نامہ قدیم (Old Testament) میں حضرت داؤد علیہ السلام کے حوالے سے اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ گوسپلز/عہد نامہ جدید (New Testament) میں حضرت مسیح علیہ السلام کے تنقیدی فرمودات بار بار ملتے ہیں' جن میں اکثر ان کے علماء' احبار اور صوفیاء مخاطب ہیں کہ تم سانپوں کے سنپولیے ہو۔ تمہارا حال ان قبروں جیسا ہے جن کے اوپر تو سفیدی پھری ہوئی ہے' مگر اندر گلی سڑی ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ تم نے اپنے اوپر صرف مذہبی لبادے اوڑھے ہوئے ہیں' لیکن تمہارے اندر خیانت بھری ہوئی ہے۔ تم مچھر چھانتے ہو اور سموچے اونٹ نگل جاتے ہو' یعنی

چھوٹی چھوٹی چیزوں پر تو زوردار بحثیں ہوتی ہیں جبکہ بڑے بڑے گناہ کھلے بندوں کرتے ہو۔ یہ تو یہودی قوم اور ان کے علماء کے کردار کی جھلک ہے ان کے اپنے نبی کی زبان سے' مگر دوسری طرف یہی نقشہ بعینہٖ آج ہمیں اپنے ہاں علماءِ سُوء میں بھی نظر آتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝۷۹﴾ ''یہ اس لیے ہوا کہ انہوں نے نافرمانی کی اور وہ حدود سے تجاوز کر جاتے تھے۔''

آیت ۷۹ ﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ؕ﴾ ''یہ لوگ ایک دوسرے کو نہیں روکتے تھے اُن منکرات سے جو وہ کرتے تھے۔''

جس معاشرے سے نہی عن المنکر ختم ہو جائے گا' وہ پورا معاشرہ سنڈاس بن جائے گا۔ یہ تو گویا انتظامِ صفائی ہے۔ اس لیے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اپنے اردگرد نگاہ رکھے' ایک دوسرے کو روکتا رہے کہ یہ کام غلط ہے' یہ مت کرو! جس معاشرے سے یہ تنقید اور احتساب ختم ہو جائے گا' اس کے اندر لازماً خرابی پیدا ہو جائے گی۔

﴿لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۷۹﴾ ''بہت ہی بُرا طرزِ عمل تھا جو انہوں نے اختیار کیا۔''

آیت ۸۰ ﴿تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ﴾ ''تم ان میں سے اکثر کو دیکھو گے کہ وہ کافروں سے دوستی رکھتے ہیں۔''

خود کافروں کے حمایتی بنتے ہیں اور اپنے لیے ان کی حمایت تلاش کرتے ہیں۔

﴿لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ﴾ ''بہت ہی بُری کمائی ہے جو انہوں نے اپنے لیے آگے بھیجی ہے''

یہ ان کے جو کرتوت ہیں وہ سب آگے اللہ کے ہاں جمع ہو رہے ہیں اور ان کا وبال ان پر آئے گا۔

﴿اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ ''یہ کہ اللہ تعالیٰ کا غضب ہوگا ان پر''

﴿وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝۸۰﴾ ''اور وہ عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

آیت ۸۱ ﴿وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ﴾ ''اور اگر یہ ایمان لاتے اللہ پر اور نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اور اُس پر جو نبیؐ پر نازل کیا گیا (یعنی قرآن حکیم)''

﴿مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ﴾ ''تو پھر انہوں نے اِن (کافروں) کو اپنا ولی نہ بنایا ہوتا''

﴿وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۸۱﴾ ''لیکن ان کی اکثریت نافرمانوں پر مشتمل ہے۔''

آیت ۸۲ ﴿لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ﴾ ''تم لازماً پاؤ گے اہلِ ایمان کے حق میں شدید ترین دشمن یہود کو اور ان کو جو مشرک ہیں۔''

یہ بہت اہم آیت ہے۔ مکہ کے بُت پرست مشرکین مسلمانوں کے کھلے دشمن تھے' وہ سامنے سے حملہ کرتے تھے۔ لیکن مسلمانوں سے بدترین دشمنی یہود کی تھی' وہ آستین کے سانپ تھے اور سازشی انداز میں مسلمانوں کو نقصان پہنچانے میں مشرکینِ مکہ سے کہیں آگے تھے۔ آج بھی یہود اور بت پرست ہندو مسلمانوں کی دشمنی میں سب سے آگے ہیں۔ بُت پرستی کا شرک اب تو صرف ہندوستان میں رہ گیا ہے' اور کہیں نہیں رہا۔ ہندوستان کے بھی اب یہ صرف نچلے طبقے میں ہے جبکہ عام طور پر اوپر کے طبقے میں نہیں ہے۔ لیکن بہرحال اب بھی مسلمانوں کے خلاف یہود اور ہنود (مشرکین) کا گٹھ جوڑ ہے۔

﴿وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰى ؕ﴾ ''اور تم لازماً پاؤ گے مودّت کے اعتبار سے قریب ترین اہلِ ایمان کے حق میں اُن لوگوں کو جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔''

یہ تاریخی حقیقت ہے اور سیرتِ محمد ﷺ سے ثابت ہے کہ جس طرح کی شدید دشمنی اُس وقت یہود نے آپ ﷺ سے کی ویسی نصاریٰ نے نہیں کی۔ حضرت نجاشیؓ (شاہِ حبشہ) نے اُس وقت کے مسلمان مہاجروں کو پناہ دی' مقوقس (شاہِ مصر) نے بھی حضور ﷺ کی خدمت میں ہدیے بھیجے۔ ہرقل نے بھی حضور ﷺ کے نامہ مبارک کا احترام کیا۔ وہ چاہتا بھی تھا کہ اگر میری پوری قوم مان لے تو ہم اسلام قبول کرلیں۔ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا' جس کا ذکر سورۂ آل عمران (آیت ۶۱) میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ وہ لوگ اگرچہ مسلمان تو نہیں ہوئے مگر ان کا رویہ انتہائی محتاط رہا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ حضور ﷺ کے زمانے میں مسلمانوں کے خلاف عیسائیوں کی مخالفت میں وہ شدت نہ تھی جو یہودیوں کی مخالفت میں تھی۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۸۲﴾﴾ ''یہ اس لیے کہ ان (عیسائیوں) میں عالم بھی موجود ہیں اور درویش بھی اور (اس لیے بھی کہ) وہ تکبر نہیں کرتے۔''

یعنی عیسائیوں میں اُس وقت تک علمائے حق بھی موجود تھے اور درویش راہب بھی جو واقعی اللہ والے تھے۔ بحیرہ راہب عیسائی تھا جس نے حضور ﷺ کو بچپن میں پہچانا تھا۔ اسی طرح ورقہ بن نوفل نے حضور ﷺ کی سب سے پہلے تصدیق کی تھی اور آپؐ کو بتایا تھا کہ آپ پر وہی ناموس نازل ہوا ہے جو اس سے پہلے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہما السلام) پر نازل ہوا تھا۔ ورقہ بن نوفل تھے تو عرب کے رہنے والے' لیکن وہ حق کی تلاش میں شام گئے اور عیسائیت اختیار کی۔ وہ عبرانی زبان میں تورات لکھا کرتے تھے۔ یہ اُس دور کے چند عیسائی علماء اور راہبوں کی مثالیں ہیں۔ لیکن وہ قِسِّیسِین اور رُھبان اب آپ کو عیسائیوں میں نہیں ملیں گے۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب قرآن نازل ہو رہا تھا۔ اس کے بعد صورتِ حال بدل گئی۔ بعد میں صلیبی جنگوں کے دوران عیسائیوں نے مسلمانوں کے خلاف جو وحشت و بربریت دکھائی' اور ان کے مذہبی پیشواؤں نے جس طرح مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی یہ ایسے حقائق ہیں جو تاریخ کے چہرے پر بہت ہی بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آیت ۸۳ ﴿وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ﴾ ''اور جب انہوں نے سنی وہ چیز جو کہ رسول (ﷺ) پر نازل کی گئی تھی''

﴿تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ﴾ ''تو تم دیکھتے ہو کہ حق کی جو پہچان انہیں حاصل ہوئی اس کے زیر اثر ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔''

یہ ایک واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ مکی دَور میں جب صحابہ رضی اللہ عنہم ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے تو ان کے ذریعے سے وہاں کچھ لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا۔ پھر جب مدینہ منورہ میں اسلام کا غلبہ ہو گیا اور عرب میں امن قائم ہو گیا تو حبشہ سے ایک وفد مدینہ آیا جو ستر (۷۰) افراد پر مشتمل تھا۔ ان میں کچھ نومسلم بھی شامل تھے۔ آیت زیر نظر میں اس وفد کے ارکان کا ذکر ہے کہ جب انہوں نے قرآن سنا تو حق کو پہچان لینے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری ہو گئیں۔

﴿يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۳﴾﴾ ''(اور) وہ کہہ رہے ہیں: اے ہمارے ربّ! ہم ایمان لے آئے' پس تُو ہمیں لکھ لے گواہی دینے والوں میں سے۔''

آیت ۸۴ ﴿وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ﴾ ''اور ہمیں کیا ہوا ہے کہ ہم ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اُس حق

پر جو ہم تک پہنچ گیا ہے‘‘

﴿وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ﴾ ’’اور ہمیں تو بڑی خواہش ہے کہ داخل کرے ہمیں ہمارا ربّ نیکوکار لوگوں کے ساتھ۔‘‘

آیت ۸۵ ﴿فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ ’’تو اللہ نے ان کے اس قول کے بدلے انہیں وہ باغات عطا کیے جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہیں‘ جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔‘‘

﴿وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ ’’اور یہی بدلہ ہے احسان کی روش اختیار کرنے والوں کا۔‘‘

جو خوش قسمت نفوس اسلام قبول کریں‘ اور اسلام کے بعد ایمان اور پھر ایمان سے آگے بڑھ کر احسان کے درجے تک پہنچ جائیں ان کا بدلہ یہی ہے۔

آیت ۸۶ ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ ’’رہے وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا اور جھٹلا دیا ہماری آیات کو‘ تو وہی لوگ ہیں جو جہنمی ہیں۔‘‘

آیات ۸۷ تا ۹۳

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝۸۷ وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۸۹ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۹۰ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝۹۱ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۹۲ لَيْسَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۹۳ ع

کھانے پینے کی چیزوں میں حِلّت و حرمت اور تحلیل و تحریم الٰہی شریعتوں کا ایک اہم موضوع رہا ہے۔ قرآن حکیم میں بھی بار بار ان مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ یہ موضوع سورۃ البقرۃ سے مسلسل چل رہا ہے۔ عربوں کے ہاں نسل در نسل رائج مشرکانہ اوہام کی وجہ سے

بہت سی چیزوں کے بارے میں حِلّت وحرمت کے غلط تصورات ذہنوں میں پختہ ہو چکے تھے۔ اس قسم کے خیالات ذہنوں' دلوں اور مزاجوں سے نکلنے میں وقت لگتا ہے۔ اس لیے بار بار ان مسائل کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے۔

آیت ۸۷ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ﴾ ''اے ایمان والو نہ حرام ٹھہرالو اُن چیزوں کو جن کو اللہ نے تمہارے لیے حلال کیا ہے''

﴿وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ﴾ ''اور حد سے تجاوز نہ کرو۔''

بعض اوقات لوگ تقویٰ کے جوش میں اور بہت زیادہ نیکی کمانے کے جذبے میں بھی کئی حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر بیٹھتے ہیں' اس لیے فرمایا گیا کہ حد سے تجاوز نہ کرو۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۝۸۷﴾ ''یقیناً اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

آیت ۸۸ ﴿وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪﴾ ''اور کھاؤ اُن حلال اور پاکیزہ چیزوں میں سے جو اللہ نے تمہیں دی ہیں''

یعنی وہ چیزیں جو قانونی طور پر حلال ہوں اور ظاہری طور پر بھی صاف ستھری ہوں۔

﴿وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸﴾ ''اور اُس اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو جس پر تمہارا ایمان ہے۔''

آیت ۸۹ ﴿لَا یُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِیْٓ اَیْمَانِكُمْ﴾ ''اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرے گا تم سے تمہاری ان قسموں میں جو لغو ہوتی ہیں''

قسموں کے سلسلے میں سورۃ البقرۃ (آیت ۲۲۵) میں ہدایات گزر چکی ہیں' اب یہاں اس ضمن میں آخری حکم آ رہا ہے۔ یعنی ایسی قسمیں جو بغیر کسی ارادے کے کھائی جاتی ہیں' ان پر کوئی گرفت نہیں ہے۔ جیسے تکیہ کلام کے طور پر واللہ' باللہ وغیرہ کا استعمال عربوں کی خاص عادت تھی اور آج بھی ہے۔ ظاہر ہے ایسی طرزِ گفتگو کو سن کر کوئی بھی یہ نہیں سمجھتا کہ یہ شخص باقاعدہ قسم کھا رہا ہے۔ تو ایسی قسم کے بارے میں کوئی مؤاخذہ نہیں ہے۔

﴿وَلٰكِنْ یُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَیْمَانَ ۚ﴾ ''لیکن وہ (ضرور) مؤاخذہ کرے گا تم سے ان قسموں پر جن کو تم نے پختہ کیا ہے۔''

عَقَّدْتُّم عقد سے بابِ تفعیل ہے۔ یعنی پورے اہتمام کے ساتھ ایک بات طے کی گئی اور اس پر کسی نے قسم کھائی۔ اب اگر ایسی قسم ٹوٹ جائے یا اس کو توڑنا مقصود ہو تو اس کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔

﴿فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِیْنَ مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِیْكُمْ﴾ ''سو اس کا کفارہ ہے کھانا کھلانا دس مساکین کو اوسط درجے کا کھانا جیسا تم اپنے گھر والوں کو کھلاتے ہو''

﴿اَوْ كِسْوَتُهُمْ﴾ ''یا اُن کو کپڑے پہنانا''

﴿اَوْ تَحْرِیْرُ رَقَبَةٍ ؕ﴾ ''یا کسی غلام کو آزاد کرنا۔''

﴿فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ ثَلٰثَةِ اَیَّامٍ ؕ﴾ ''پھر جو کوئی اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو وہ تین دن کے روزے رکھے۔''

یعنی اگر کسی کے پاس ان تینوں میں سے کوئی صورت بھی موجود نہ ہو' کوئی شخص خود فقیر اور مفلس ہو' اس کے پاس کچھ نہ ہو تو وہ تین

دن کے روزے رکھ لے۔

﴿ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ﴾ ''یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم کھا (کر توڑ) بیٹھو۔''

﴿وَاحْفَظُوْۤا اَيْمَانَكُمْ ؕ﴾ ''اور اپنی قسموں کی حفاظت کیا کرو۔''

یعنی جب کسی جائز معاملے میں بالارادہ قسم کھائی جائے تو اسے پورا کیا جائے' اور اگر کسی وجہ سے قسم توڑنے کی نوبت آ جائے تو اسے توڑنے کا باقاعدہ کفارہ دیا جائے۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۸۹﴾﴾ ''اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کو واضح فرما رہا ہے تاکہ تم شکر کرو۔''

اب شراب اور جوئے کے بارے میں بھی آخری حکم آ رہا ہے۔

آیت ۹۰ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾﴾ ''اے اہلِ ایمان! یقیناً شراب اور جوا' بُت اور پانسے' یہ سب گندے کام ہیں شیطان کے عمل میں سے' تو ان سے بچ کر رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

شراب اور جوئے کے بارے میں تو پہلے بھی حکم آ چکا ہے' لیکن ''اَنصاب'' اور ''اَزلام'' کا یہاں اضافہ کیا گیا ہے۔ اَنصاب سے مراد بُتوں کے استھان ہیں اور اَزلام جوئے ہی کی ایک قسم تھی جس میں اہلِ عرب تیروں کے ذریعے پانسے ڈالتے تھے' یعنی قرعہ اندازی کرتے تھے۔ ان تمام کاموں کو یہاں رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ قرار دے دیا گیا۔

آیت ۹۱ ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ ''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کر دے شراب اور جوئے کے ذریعے سے''

یہ بہت اہم بات ہے۔ شراب کے نشے میں انسان اپنا ہوش اور شعور کھو بیٹھتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کو کچھ خبر نہیں رہتی کہ وہ منہ سے کیا بکواس کر رہا ہے اور اس کے اَعضاء و جوارح سے کیا افعال سرزد ہو رہے ہیں' لہٰذا کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی حالت میں کسی بات یا کسی حرکت سے کیا کیا گُل کھلیں گے' کیسے کیسے جھگڑے اور فسادات جنم لیں گے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ حکومتی اور ریاستی سطح کے بڑے بڑے راز شراب کے نشے میں چُرا لیے جاتے ہیں۔ تو اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ تمہیں ان چیزوں سے بچانا چاہتا ہے' جبکہ شیطان چاہتا ہے کہ تمہارے مابین عداوت اور بغض پیدا کرے۔ اسی طرح جوئے سے بھی بغض و عداوت کی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی جوئے میں ہار جاتا ہے' پھر پے در پے ہارتا چلا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ غصے میں آگ بگولا ہو کر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اسے نظر آ رہا ہے کہ میرا جو حریف مجھ سے جیت رہا ہے وہ کسی محنت کی وجہ سے نہیں جیت رہا۔ کسی نے محنت اور کوشش سے کچھ کمایا ہو تو اس سے دوسرے کو جلن محسوس نہیں ہوتی' لیکن جوئے میں بے محنت کی کمائی ہوتی ہے جسے مخالف فریق برداشت نہیں کر سکتا۔ اس طرح انسانی تعلقات میں کئی منفی پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔

﴿وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ﴾ ''اور (شیطان یہ بھی چاہتا ہے کہ) تمہیں روکے اللہ کی یاد سے اور نماز سے۔''

اللہ کے ذکر اور نماز سے روکنے والا معاملہ بھی شراب کا تو بالکل واضح ہے' لیکن جوئے میں بھی یونہی ہوتا ہے کہ آدمی ایک بار اس میں لگ جائے تو پھر وہاں سے نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ تاش اور شطرنج وغیرہ بھی ایسے کھیل ہیں کہ ان میں مشغول ہو کر انسان ذکر اور نماز جیسی چیزوں سے بالکل غافل ہو جاتا ہے۔

﴿فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾﴾ ''تو اب باز آتے ہو یا نہیں؟''

یہ انداز بہت سخت ہے اور اس کا ایک خاص پس منظر ہے۔ شراب اور جوئے کے بارے میں ایک واضح ہدایت قبل ازیں آ چکی تھی: ﴿فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ﴾ (البقرۃ: ۲۱۹) ''ان دونوں کے اندر بہت بڑے گناہ کے پہلو ہیں' اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں' البتہ ان کا گناہ کا پہلو نفع کے پہلو سے بڑا ہے''۔ تو اسی وقت تمہیں سمجھ لینا چاہیے تھا اور باز آ جانا چاہیے تھا۔ اُس پہلے حکم میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت' مشیت اور شریعت کا رخ تو واضح ہو گیا تھا۔ پھر اگلا قدم اٹھایا گیا اور حکم دیا گیا: ''جب تم لوگ شراب کے نشے میں ہو تو نماز کے قریب مت جاؤ.....'' (النساء: ۴۳) اس سے تو پورے طور سے واضح ہو جانا چاہیے تھا کہ دین کا اہم ترین ستون نماز ہے: ((اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ)) [۷] اور یہ شراب نماز سے روک رہی ہے' تو تمہیں یہ چھوڑ دینی چاہیے تھی۔ بہر حال اب آخری بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ گئی ہے' تو اسے سن کر کیا اب بھی تم باز نہیں آؤ گے؟

آیت ۹۲ ﴿وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ﴾ ''اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی اور (ان کی نافرمانی سے) بچتے رہو۔''

﴿فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰي رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾﴾ ''پھر اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول (ﷺ) پر تو ذمہ داری ہے بس صاف صاف پہنچا دینے کی۔''

یہ اللہ کا حکم ہے۔ اللہ کا حکم پہنچانا رسولؐ کے ذمے تھا' تو رسولؐ نے پہنچا کر اپنی ذمہ داری ادا کر دی' اب معاملہ اللہ کا اور تمہارا ہو گا۔ اللہ تم سے حساب لے لے گا۔

اب جو اگلی آیت آ رہی ہے یہ بھی قرآن مجید کے فلسفہ اور حکمت کے ضمن میں بہت بنیادی آیت ہے۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ جب شراب کے بارے میں اتنا سخت انداز آیا کہ شراب اور جوا گندے شیطانی کام ہیں' ان سے باز آتے ہو یا نہیں؟ تو بہت سے مسلمانوں کو تشویش لاحق ہو گئی کہ ہم جو اتنے عرصے تک شراب پیتے رہے تو یہ گندگی تو ہماری ہڈیوں میں بیٹھ گئی ہو گی۔ آج سائنس کی زبان میں جیسے کوئی شخص کہے کہ میرے جسم کا تو کوئی ایک خلیہ (cell) بھی ایسا نہیں ہو گا جس میں شراب کے اثرات نہ پہنچے ہوں۔ تو اب ہم کیسے پاک ہوں گے؟ اب کس طریقے سے یہ گندگی ہمارے جسموں سے دُھلے گی؟ ان کی یہ تشویش بجا تھی۔ جیسے تحویلِ قبلہ کے وقت تشویش پیدا ہو گئی تھی کہ اگر اصل قبلہ بیت اللہ تھا اور ہم بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نمازیں پڑھتے رہے تو وہ نمازیں تو ضائع ہو گئیں' اور نماز ہی تو ایمان ہے۔ تو اس پر مؤمنین کی تسلی کے لیے فرمایا گیا تھا: ﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ۭ﴾ ''اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے''۔ ایسے ہی یہاں ان کی دل جوئی کے لیے فرمایا:

آیت ۹۳ ﴿لَيْسَ عَلَي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا﴾ ''ان لوگوں پر جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے کوئی گناہ نہیں ہے اس میں جو وہ (پہلے) کھا پی چکے''

۷۔ رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔ راوی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔

کسی شے کی حرمت کے قطعی حکم آنے سے پہلے جو کچھ کھایا پیا گیا' اس کا کوئی گناہ ان پر نہیں رہے گا۔ یہ کوئی ہڈیوں میں بیٹھ جانے والی شے نہیں ہے' یہ تو شرعی اور اخلاقی قانون (Moral Law) کا معاملہ ہے' طبعی قانون (Physical Law) کا نہیں ہے۔ طبعی (Physical) طور پر تو کچھ چیزوں کے اثرات واقعی دائمی ہو جاتے ہیں' لیکن Moral Law کا معاملہ یکسر مختلف ہے۔ گناہ تو اُحد پہاڑ کے برابر بھی ہوں تو سچی توبہ سے بالکل صاف ہو جاتے ہیں۔ ازروئے حدیثِ نبویؐ: ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ))[۸] ''گناہ سے حقیقی توبہ کرنے والا بالکل ایسے ہے جیسے اس نے کبھی وہ گناہ کیا ہی نہیں تھا''۔ صدقِ دل سے توبہ کی جائے تو نامۂ اعمال بالکل دھل جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی کسی تشویش کو بالکل اپنے قریب مت آنے دو۔

﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾﴾

''جب تک وہ تقویٰ کی روش اختیار کیے رکھیں اور ایمان لائیں اور نیک عمل کریں' پھر مزید تقویٰ اختیار کریں اور ایمان لائیں' پھر اور تقویٰ میں بڑھیں اور درجۂ احسان پر فائز ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ محسنوں سے محبت کرتا ہے۔''

یہ دراصل تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ 'اسلام' ہے۔ یعنی اللہ کو مان لیا' رسولؐ کو مان لیا اور اس کے احکام پر چل پڑے۔ اس سے اوپر کا درجہ 'ایمان' ہے' یعنی دِل کا کامل یقین' جو ایمان کے دل میں اُتر جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات:۷) کے مصداق ایمان قلب میں اُتر جائے گا تو اعمال کی کیفیت بدل جائے گی' اعمال میں ایک نئی شان پیدا ہو جائے گی' زندگی کے اندر ایک نیا رنگ آ جائے گا جو کہ خالص اللہ کا رنگ ہوگا: ﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۠﴾ (البقرۃ:۱۳۸) ''ہم نے تو اختیار کر لیا ہے اللہ کے رنگ کو' اور اللہ کے رنگ سے بہتر اور کس کا رنگ ہوگا؟'' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر جب ایمان ''عین الیقین'' کا درجہ حاصل کر لے تو یہی درجہ احسان ہے۔ حدیثِ نبویؐ میں اس کی کیفیت یہ بیان ہوئی ہے: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ))[۹] ''یہ کہ تُو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تُو اُسے دیکھ رہا ہے' اور اگر تُو اسے نہیں دیکھ رہا (یہ کیفیت اگر پیدا نہیں ہو رہی) تو پھر (یہ کیفیت تو پیدا ہونی چاہیے کہ) وہ تو تجھے دیکھتا ہے''۔ یعنی تم اللہ کی بندگی کرو' اللہ کے لیے جہاد کرو' اُس کی راہ میں بھاگ دوڑ کرو' اور اس میں تقویٰ کی کیفیت ایسی ہو جائے کہ جیسے تم اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔

احسان کی یہ تعریف ''حدیثِ جبریلؑ'' میں موجود ہے۔ اس حدیث کو اُمُّ السُّنَّۃ کہا گیا ہے' جیسے سورۃ الفاتحہ کو اُمّ القرآن کا نام دیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح سورۃ الفاتحہ اساس القرآن ہے' اسی طرح حدیثِ جبریلؑ سُنّت کی اساس ہے۔ اس حدیث میں ہمیں یہ تفصیل ملتی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام انسانی شکل میں حضور ﷺ کے پاس آئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا' وہاں انہوں نے کچھ سوالات کیے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پہلا سوال اسلام کے بارے میں کیا: يَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِسْلَامِ! کہ اے محمد (ﷺ) مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے۔ اس کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسولؐ ہیں' نماز قائم کرو' زکوٰۃ ادا کرو' رمضان کے روزے رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو' اگر تمہیں

۸۔ السنن الکبریٰ للبیھقی ۱۰/۱۵۴۔ فتح الباری لابن حجر ۱۳/۴۸۰۔ راوی: عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔

۹۔ صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب سؤال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام والاحسان... وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام والاحسان' ح ۹ و ۱۰۔ ودیگر کُتبِ احادیث۔

اس کے لیے سفر کی استطاعت ہو''۔ یعنی اسلام کے ضمن میں اعمال کا ذکر آ گیا۔ پھر جبرائیلؑ نے کہا کہ مجھے ایمان کے بارے میں بتلائیے! اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر' اُس کے فرشتوں پر' اُس کی کتابوں پر' اُس کے رسولوں پر' یومِ آخرت پر اور تقدیر کی اچھائی اور برائی پر''۔ اب یہاں یہ نکتہ غور طلب ہے کہ ایمان تو اسلام میں بھی موجود ہے' یعنی زبانی اور قانونی ایمان' لیکن دوسرے درجے میں ایمان کو اسلام سے علیحدہ کیا گیا ہے اور اعمالِ صالحہ کا تعلق ایمان کے بجائے اسلام سے بتایا گیا ہے۔ اس لیے کہ جب ایمان دل میں اُتر کر یقین کی صورت اختیار کر جائے تو پھر اعمال کا ذکر الگ سے کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایمان کے اس مرحلے پر اعمال لازماً درست ہو جائیں گے۔ پھر ایمان جب دل میں مزید گہرا اور پختہ ہوتا ہے تو اعمال بھی مزید درست ہوں گے۔ جیسے جتنا جتنا درخت اوپر جاتا ہے اسی نسبت سے جڑ نیچے گہرائی میں اترتی جاتی ہے۔ ایمان کی جڑ نے دل کی زمین میں قرار پکڑا تو اسلام سے ایمان بن گیا۔ جب یہ جڑ مزید گہری ہوئی تو تیسری منزل یعنی احسان تک رسائی ہو گئی اور یہاں اعمال میں مزید نکھار پیدا ہوا۔ چنانچہ جب حضرت جبرائیلؑ نے احسان کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا: ''احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اُسے دیکھ رہے ہو.....'' آپؐ کا یہ جواب تین روایتوں میں تین مختلف الفاظ میں نقل ہوا ہے: (۱) اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ ... (۲) اَنْ تَخْشَى اللّٰهَ تَعَالٰى كَاَنَّكَ تَرَاهُ ...[10] (۳) اَنْ تَعْمَلَ لِلّٰهِ كَاَنَّكَ تَرَاهُ[11]۔ اگلے الفاظ: ((فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ)) تینوں روایتوں میں یکساں ہیں۔ یعنی ایک بندۂ مؤمن اللہ کی بندگی' اللہ کی پرستش' اللہ کے لیے بھاگ دوڑ' اللہ کے لیے عمل' اللہ کے لیے جہاد ایسی کیفیت سے سرشار ہو کر کر رہا ہو گویا وہ اپنی آنکھوں سے اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ تو جب اللہ سامنے ہو گا' تو پھر کیسے کچھ ہمارے جذباتِ عبدیت ہوں گے' کیسی کیسی ہماری قلبی کیفیات ہوں گی۔ یہ کیفیت اس دنیا میں بھی حاصل ہو سکتی ہے' لیکن واقعتاً بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر یہ کیفیت حاصل نہ ہو سکے تو احسان کا ایک اس سے نچلا درجہ بھی ہے۔ یعنی کم از کم یہ بات تو ہر وقت مستحضر رہے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ تو یہ ہیں وہ تین درجے جن کا ذکر اس آیت میں ہے۔

''تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں'' مولانا مودودی مرحوم کی ایک قابلِ قدر کتاب ہے۔ اس میں مولانا نے اسلام' ایمان' احسان اور تقویٰ چار مراتب بیان کیے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک تقویٰ علیحدہ سے کوئی مرتبہ و مقام نہیں ہے۔ تقویٰ وہ روح (spirit) اور وہ قوتِ محرکہ (driving force) ہے جو انسان کو نیکی کی طرف دھکیلتی اور اُبھارتی ہے۔ چنانچہ آیت زیر نظر میں تقویٰ کی تکرار کا مفہوم یوں ہے کہ تقویٰ نے آپ کو baseline سے اوپر اٹھایا اور اب آپ کے ایمان اور عمل صالح میں ایک امتیازی رنگ پیدا ہو گیا ﴿اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾۔ پھر تقویٰ میں مزید اضافہ ہوا اور تقویٰ نے آپ کو مزید اوپر اٹھایا تو اب آپ کے دل میں یقین والا ایمان پیدا ہو گیا۔ چنانچہ ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا﴾ میں یقین والے ایمان کی طرف اشارہ ہے۔ اسی لیے یہاں عمل صالح کا علیحدہ ذکر نہیں ہوا۔ اس لیے کہ جب ایمان دل میں اُتر گیا تو اعمال خود بخود درست ہو گئے۔ پھر تقویٰ اگر مزید رو بہ ترقی ہے ﴿ثُمَّ اتَّقَوْا﴾ تو اس کے نتیجے میں ﴿وَّاَحْسَنُوْا﴾ کا درجہ آ جائے گا' یعنی انسان درجۂ احسان پر فائز ہو جائے گا۔ (اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْهُمْ۔ آمین!)

۱۰۔ صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان الایمان والاسلام والاحسان' ح ۱۱۔ ومسند احمد' ح ۲۷۷۵۔
۱۱۔ مسند احمد' ح ۱۷۹۔
۱۲۔ صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فضل من استبرأ لدینہ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ' باب اخذ الحلال وترک الشبہات۔

ایمان اور تقویٰ کے ساتھ اعمال کے اس ربط و تعلق کو سمجھنے کے لیے نبی اکرم ﷺ کا یہ فرمان پیش نظر رہنا چاہیے:

((اَلَا وَاِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً ' اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ ' وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ کُلُّهٗ ' اَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ))(۱۲)

''آگاہ رہو یقیناً جسم کے اندر ایک گوشت کا لوتھڑا ہے جب وہ درست ہو تو سارا جسم درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ رہو کہ وہ دل ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۹۳﴾﴾ ''اور اللہ ایسے محسن بندوں کو محبوب رکھتا ہے۔''

اللہ کے جو بندے درجۂ احسان تک پہنچ جاتے ہیں وہ اُس کے محبوب بندے بن جاتے ہیں۔

یہاں تقابل کے لیے اس سورۂ مبارکہ کی آیت ۷۱ بھی ذہن میں تازہ کر لیں۔ اس آیت میں ﴿فَعَمُوْا وَصَمُّوْا... ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا...﴾ کے الفاظ میں گمراہی و ضلالت کے مختلف مراحل کا ذکر ہے کہ بنی اسرائیل حق کو دیکھتے اور سمجھتے ہوئے اندھے اور بہرے ہو گئے' اللہ نے انہیں ڈھیل دی تو اس پر وہ اور بھی اندھے اور بہرے ہو گئے' اللہ نے مزید ڈھیل دی تو وہ اور زیادہ اندھے اور بہرے ہو گئے۔ یہ اُس راستے کا ذکر ہے جس پر انسان قدم بہ قدم گمراہی کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔ مگر ایک راستہ یہ ہے جس کا حوالہ اس آیت میں آیا ہے۔ یعنی ہدایت کا راستہ' اسلام' ایمان' احسان' اور تقویٰ کا راستہ' جس پر چلتے ہوئے انسان کو درجہ بہ درجہ ترقی ملتی چلی جاتی ہے۔

آیات ۹۴ تا ۱۰۰

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَیَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَیْءٍ مِّنَ الصَّیْدِ تَنَالُهٗۤ اَیْدِیْكُمْ وَ رِمَاحُكُمْ لِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّخَافُهٗ بِالْغَیْبِ ۚ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۹۴﴾ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّیْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ؕ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ یَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْیًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِیْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِیَامًا لِّیَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَیَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾ اُحِلَّ لَكُمْ صَیْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ وَ لِلسَّیَّارَةِ ۚ وَحُرِّمَ عَلَیْكُمْ صَیْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْۤ اِلَیْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَ الْهَدْیَ وَالْقَلَآىِٕدَ ؕ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ وَ اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۹۷﴾ اِعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ وَ اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۹۸﴾ مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾ قُلْ لَّا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَ الطَّیِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِیْثِ ۚ

ع فَاتَّقُوا اللّٰهَ یٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

اس سورۂ مبارکہ کے شروع میں حالتِ احرام میں شکار کرنے کی ممانعت آ چکی ہے۔ اب اللہ کی اس سُنّت کا ذکر ہے کہ اللہ اپنے ماننے والوں کو آزماتا ہے اور ان کا سخت ترین امتحان لیتا ہے۔ فرض کیجیے کہ حاجیوں کا ایک قافلہ جا رہا ہے' سب نے احرام باندھا ہوا ہے' اتفاق سے ان کے پاس کھانے کو بھی کچھ نہیں۔ اب ایک ہرن اٹھکیلیاں کرتے ہوئے قریب آ رہا ہے' بھوک بھی ستا رہی ہے' ضرورت بھی ہے' چاہیں تو ذرا سا نیزہ ماریں اور شکار کر لیں یا ویسے ہی بھاگ کر پکڑ لیں' لیکن پکڑ نہیں سکتے' شکار نہیں کر سکتے' کیونکہ احرام میں ہیں اور اس حالت میں اجازت نہیں ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اس طرح آزماتا ہے۔

آیت ۹۴ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَيَبْلُوَنَّكُمُ اللّٰهُ بِشَيْءٍ مِّنَ الصَّيْدِ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اللہ تعالیٰ تمہیں لازماً آزمائے گا کسی ایسے شکار کے ذریعے''

﴿تَنَالُهٗٓ اَيْدِيْكُمْ وَرِمَاحُكُمْ﴾ ''جس کو پہنچتے ہوں گے (آسانی سے) تمہارے ہاتھ اور نیزے''

﴿لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّخَافُهٗ بِالْغَيْبِ ۚ﴾ ''تاکہ اللہ دیکھ لے اُن لوگوں کو جو غیب میں ہوتے ہوئے بھی اُس سے ڈرتے رہتے ہیں۔''

شکار پنجے میں بھی ہے' ان کے ہاتھوں اور نیزوں کی زد میں ہے' ضرورت بھی ہے' لیکن مجبور ہیں' کیونکہ احرام باندھا ہوا ہے۔ تو جس کے دل میں ایمان ہوگا وہ اپنی بھوک کو برداشت کرے گا' اللہ کے حکم کو نہیں توڑے گا۔

﴿فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۴﴾﴾ ''اب اس کے بعد جس نے زیادتی کی تو اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔''

آیت ۹۵ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ﴾ ''اے ایمان والو! جب تم احرام کی حالت میں ہو تو کسی شکار کو قتل مت کرو۔''

﴿وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ﴾ ''تو جو کوئی تم میں سے اسے قتل (شکار) کر بیٹھے جان بوجھ کر' تو پھر اس کا کفارہ ہوگا اسی طرح کا ایک چوپایہ جیسا کہ اُس نے قتل کیا''

کفارے کے طور پر اللہ کی راہ میں ویسا ہی ایک چوپایہ صدقہ کیا جائے گا۔ یعنی اگر آپ نے ہرن مارا تو بکری یا بھیڑ دی جائے گی اور اگر نیل گائے مار دی تو پھر گائے بطور کفارہ دینا ہوگی۔ اس طرح جس قسم اور جس جسامت کا حیوان شکار کیا گیا ہے' اس کے برابر کا چوپایہ صدقہ کرنا ہوگا۔

﴿يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ﴾ ''جس کا فیصلہ تم میں سے دو عادل آدمی کریں گے''

یعنی دو متقی اور معتبر اشخاص اس کی گواہی دیں کہ یہ جانور اس شکار کیے جانے والے جانور کے برابر ہے۔

﴿هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾ ''یہ نذر کی حیثیت سے خانہ کعبہ تک پہنچایا جائے''

یہ جانور ہدی کے طور پر خانہ کعبہ کی نذر کیا جائے گا۔

﴿اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ﴾ ''یا پھر اس کا کفارہ ہے کچھ مساکین کو کھانا کھلانا''

اس میں فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر اناج یا رقم دینا ہو تو وہ صدقۂ فطر کے حساب سے ہوگی۔

﴿اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا﴾ ''یا اتنے ہی روزے رکھنا''

یہ دیکھنا ہوگا کہ جو جانور شکار ہوا ہے اسے کتنے آدمی کھا سکتے تھے۔ اتنے آدمیوں کو کھانا کھلایا جائے یا اتنے دن کے روزے رکھے جائیں۔

﴿لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ﴾ ''تاکہ وہ اپنے کیے کی سزا چکھے۔''

﴿عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ﴾ ''اللہ معاف کر چکا ہے جو پہلے ہو چکا ہے۔''

﴿وَمَنْ عَادَ فَيَنْتَقِمُ اللّٰهُ مِنْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۹۵﴾﴾ ''لیکن جو کوئی پھر ایسا کرے گا تو اللہ اُس سے انتقام لے گا' اور یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست ہے' انتقام لینے والا۔''

آیت ﴿اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ﴾ ''(البتہ) تمہارے لیے حلال کر دیا گیا ہے سمندر کا شکار اور اُس کا کھانا''

سمندر اور دریا کا شکار حالتِ احرام میں بھی حلال ہے۔ حاجی لوگ اگر کشتیوں اور بحری جہازوں کے ذریعے سے سفر کر رہے ہوں تو وہ احرام کی حالت میں بھی مچھلی وغیرہ کا شکار کر سکتے ہیں۔

﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ ۚ﴾ ''تمہارے لیے اور مسافروں کے لیے زادِ راہ کے طور پر۔''

سمندر کی خوراک (sea food) تو یوں سمجھ لیجیے کہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے غذا کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ یہ غذا انسان کو بہت سی بیماریوں سے بچانے والی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں آج کل یہ بہت مقبول ہو رہی ہے۔

﴿وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ؕ﴾ ''لیکن خشکی پر شکار کرنا تمہارے لیے حرام کر دیا گیا ہے جب تک کہ تم احرام میں ہو۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو جس کی طرف تمہیں جمع کر دیا جائے گا۔''

تم سب اُس کی طرف گھیر اؤ کر کے لے جائے جاؤ گے۔

آیت ﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ﴾ ''اللہ نے کعبے کو' جو کہ بیت الحرام ہے' لوگوں کے قیام کا باعث بنا دیا ہے''

﴿وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ﴾ ''اور حرمت والا مہینہ' قربانی کے جانور اور وہ جانور بھی جن کے گلوں میں پٹے ڈال دیے گئے ہوں''

یہ سب اللہ تعالیٰ کے شعائر ہیں اور اسی کے معین کردہ ہیں۔ سورۃ کے شروع میں بھی ان کا ذکر آ چکا ہے۔ یہاں دراصل توثیق ہو رہی ہے کہ یہ سب چیزیں زمانہ جاہلیت کی روایات نہیں ہیں بلکہ خانہ کعبہ کی حُرمت اور عظمت کی علامت ہیں۔

﴿ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ﴾ ''یہ اس لیے کہ تم اچھی طرح جان لو کہ اللہ تعالیٰ کو آسمانوں اور زمین کی ہر شے کا علم ہے''

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۹۷﴾﴾ ''اور یہ کہ اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔''

آگے چل کر اِن چیزوں کے مقابلے میں اُن چار چیزوں کا ذکر آئے گا جو اہلِ عرب کے ہاں بغیر کسی سند کے حرام کر لی گئی تھیں۔

آیت ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۸﴾﴾ ''جان لو کہ اللہ سزا دینے میں بہت سخت ہے اور یہ کہ اللہ غفور اور رحیم بھی ہے۔''

یعنی اُس کی تو دونوں شانیں ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اب دیکھو کہ تم اپنے آپ کو اُس کی کس شان کے ساتھ متعلق کر رہے ہو اور خود کو کیسے سلوک کا مستحق بنا رہے ہو؟ اُس کی عقوبت کا یا اُس کی رحمت اور مغفرت کا؟

آیت ﴿مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ﴾ ''رسول (ﷺ) پر سوائے پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔''

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ﴿۹۹﴾﴾ ''اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو۔''

جب رسول اللہ ﷺ نے پیغام پہنچا دیا تو باقی ساری ذمہ داری اب تمہاری ہے۔

آیت ﴿قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے' چاہے ناپاک شے کی کثرت تمہیں اچھی لگے۔''

انسان تو چاہتا ہے کہ اُس کے پاس ہر شے کی بہتات ہو' لیکن واضح رہے کہ ناجائز اور حرام طریقے سے کمایا ہوا مال جس قدر بھی ہو خبیث اور ناپاک ہی ہے۔ بے شک اس کی چکاچوند تمہاری آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہو مگر اس میں تمہارے لیے کوئی بھلائی نہیں ہے۔ بقول علامہ اقبال: ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صنّاعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۰﴾﴾ ''تو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اے ہوش مندو! تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

آیات ۱۰۱ تا ۱۰۸

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَاۗءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ۭ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَاۗىِٕبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ۭ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ

ذَاقُرْبٰى ۙ وَ لَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ﴿۱۰۶﴾ فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ
اِثْمًا فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ
لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا وَ مَا اعْتَدَيْنَاۤ ۖ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ
يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَاۤ اَوْ يَخَافُوْۤا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ
وَاسْمَعُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۰۸﴾

آیت ۱۰۱ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ﴾ ''اے اہلِ ایمان! اُن چیزوں کے متعلق سوال نہ کیا کرو جو اگر تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں بُری لگیں۔''

یہ ایک خاص قسم کی مذہبی ذہنیت کا تذکرہ ہے۔ بعض لوگ بلاضرورت ہر بات کو کھودنے' کریدنے اور بال کی کھال اُتارنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر کسی چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود خاموشی اختیار فرمائی ہے تو اس بارے میں خواہ مخواہ سوال کرنا اپنی ذمہ داری کو بڑھانے والی بات ہے۔ چنانچہ حج کے بارے میں جب سورۂ آل عمران (آیت ۹۷) میں حکم نازل ہوا تو ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضور کیا ہر سال حج فرض ہے؟ آپ ﷺ نے سوال سن لیا لیکن رُخِ مبارک دوسری طرف کر لیا۔ اب وہ صاحب اُدھر تشریف لے آئے اور پھر عرض کیا' حضور کیا حج ہر سال فرض ہے؟ حضور ﷺ نے پھر اعراض فرمایا۔ جب انہوں نے یہی سوال تیسری مرتبہ کیا تو آپ ﷺ نے ناراضی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ دیکھو اگر میں ہاں کہہ دوں تو تم لوگوں پر قیامت تک کے لیے ہر سال حج فرض ہو جائے گا۔ جس وضاحت سے اللہ تعالیٰ نے اعراض فرمایا ہو اُس میں تمہاری بہتری ہے۔ چنانچہ بے جا سوال کر کے تم اپنے لیے تنگی پیدا نہ کرو۔ جیسے گائے کے معاملے میں بنی اسرائیل نے پے در پے سوالات کیے تھے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ اس کی عمر کیا ہو؟ اور وہ کیسی گائے ہو؟ وغیرہ وغیرہ۔ وہ جتنے سوالات کرتے گئے اتنی ہی شرائط ان پر لاگو ہوتی گئیں۔ اس نوعیت کے وضاحتی سوالات اسی ضمن میں آتے ہیں۔

﴿وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ ؕ﴾ ''اور اگر تم سوال کرو گے ایسی چیزوں کے بارے میں جبکہ ابھی قرآن کا نزول جاری ہے تو تمہارے لیے وہ ظاہر کر دی جائیں گی۔''

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت کئی چیزوں کو پردے میں رکھا ہے' کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ان کو ظاہر کرنے میں تمہارے لیے تنگی ہو جائے گی' بوجھ زیادہ ہو جائے گا' اور وہ تم پر گراں گزریں گی۔ لیکن اگر سوال کرو گے تو پھر ان کو ظاہر کر دیا جائے گا۔

﴿عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۱۰۱﴾﴾ ''اللہ تعالیٰ نے اس میں درگزر سے کام لیا ہے' اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔''

بعض چیزوں کے بارے میں جو اللہ نے تم پر نرمی کی ہے اور تمہیں تنگی سے بچایا ہے' وہ اس لیے ہے کہ وہ غفور اور حلیم ہے۔ یہ کسی نسیان' بھول یا غلطی کی وجہ سے نہیں ہوا (معاذ اللہ!)

آیت ۱۰۲ ﴿قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۲﴾﴾ ''تم سے پہلے ایک قوم (اہلِ کتاب) نے اس قسم کے سوالات کیے تھے اور پھر وہ ان کا انکار کرنے والے بن گئے تھے۔''

اب آگے ان چار چیزوں کا ذکر آ رہا ہے جو اہلِ عرب کے ہاں خواہ مخواہ بہت زیادہ مقدس ہو گئی تھیں۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ کے اُن

چار شعائر کے مقابلے کی چار چیزیں ہیں جن کا ذکر پیچھے آیت ۹۷ میں بایں الفاظ ہوا ہے: ﴿جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ؕ﴾ وہاں ان چار چیزوں کی توثیق کی گئی تھی کہ وہ واقعتاً اللہ کی شریعت کے اجزاء ہیں' ان کا احترام اور ان کی حرمت کو ملحوظ رکھنا اہلِ ایمان پر لازم ہے۔ لیکن یہاں توجہ دلائی جا رہی ہے کہ کچھ چیزیں تمہارے ہاں ایسی رائج ہیں جو دورِ جاہلیت کے مشرکانہ اوہام کی یادگاریں ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

آیت ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ﴾ ''اللہ نے نہ تو بحیرہ کو کچھ چیز بنایا ہے' نہ سائبہ' نہ وصیلہ اور نہ حام کو''

ان چیزوں کے تقدس کی اللہ کی طرف سے کوئی سند نہیں۔ بحیرہ' سائبہ' وصیلہ اور حام کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں' لیکن جلیل القدر تابعی حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے ان الفاظ کی جو تفصیل بیان کی ہے' وہ صحیح بخاری (کتاب تفسیر القرآن) میں وارد ہوئی ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے بھی اسے اپنے حواشی میں نقل کیا ہے۔ اس کے مطابق: بحیرہ: ایسا جانور تھا جس کا دودھ بتوں کے نام کر دیا جاتا تھا اور کوئی اسے اپنے کام میں نہ لاتا تھا۔ سائبہ: وہ جانور جو بتوں کے نام پر' ہمارے زمانے کے سانڈ کی طرح' چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وصیلہ: جو اونٹنی مسلسل مادہ بچوں کو جنم دیتی اور درمیان میں کوئی نر بچہ پیدا نہ ہوتا' اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ حام: نر اونٹ جو ایک خاص تعداد میں جفتی کر چکا ہوتا' اُسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اس طرح کے جانوروں کو بتوں کے نام منسوب کر کے آزاد چھوڑ دیا جاتا تھا کہ انہیں کوئی ہاتھ نہ لگائے' کوئی ان سے استفادہ نہ کرے' کوئی ان کا گوشت کھائے نہ صدقہ دے' نہ ان سے کوئی خدمت لے' بس ان کا احترام کیا جائے۔ لہٰذا واضح کر دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے کوئی احکام نہیں دیے گئے' بلکہ فرمایا:

﴿وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۳﴾ ''لیکن یہ کافر اللہ پر افترا کرتے ہیں' اور ان کی اکثریت عقل سے عاری ہے۔''

یہ لوگ بغیر سوچے سمجھے اللہ کی طرف جھوٹی باتیں منسوب کرتے رہتے ہیں۔

آیت ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ﴾ ''اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ اُس چیز کی طرف جو اللہ نے نازل فرمائی ہے اور آؤ اللہ کے رسول کی طرف''

اس حکم (آؤ اللہ کے رسولؐ کی طرف) کی ترجمانی علامہ اقبال نے کیا خوبصورت الفاظ میں کی ہے: ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر بہ اوؐ نرسیدی تمام بولہبی است!

﴿قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ﴾ ''وہ کہتے ہیں ہمارے لیے وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے آباء و اجداد کو پایا۔''

یعنی ہمارے آباء و اجداد جو اتنے عرصے سے ان چیزوں پر عمل کرتے چلے آ رہے تھے تو کیا وہ جاہل تھے؟ یہی باتیں آج بھی سننے کو ملتی ہیں۔ کسی رسم کے بارے میں آپ کسی کو بتائیں کہ اس کی دین میں کوئی سند نہیں ہے اور صحابہؓ کے ہاں اس کا کوئی وجود نہیں تھا تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ ہم نے تو اپنے باپ دادا کو یونہی کرتے دیکھا ہے۔

﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۴﴾﴾ ''خواہ ان کے آباء واَجداد ایسے رہے ہوں کہ نہ انہیں کوئی علم حاصل ہوا ہو نہ ہی وہ ہدایت پر ہوں (تو کیا پھر بھی)؟''

جیسے تم اللہ کی مخلوق ہو ویسے ہی تمہارے باپ دادا بھی مخلوق تھے۔ جیسے تم غلط کام کر سکتے ہو اور غلط آراء قائم کر سکتے ہو ویسے ہی وہ بھی غلط کار ہو سکتے تھے۔

آیت ۱۰۵ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ﴾ ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر ذمہ داری ہے صرف اپنی جانوں کی۔''

﴿لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۭ﴾ ''جو کوئی گمراہ ہو جائے وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا' جبکہ تم ہدایت پر ہو۔''

﴿اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾﴾ ''اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے' اور وہ تمہیں بتا دے گا جو کچھ تم کرتے رہے تھے۔''

یہ آیت اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس کا ایک غلط مطلب اور مفہوم دورِ صحابہؓ میں ہی بعض لوگوں نے نکال لیا تھا۔ وہ یہ کہ دعوت وتبلیغ کی کوئی ذمہ داری ہم پر نہیں ہے' ہر ایک پر اپنی ذات کی ذمہ داری ہے' کوئی کیا کرتا ہے اس سے کسی دوسرے کو کچھ غرض نہیں ہونی چاہیے۔ قرآن جو کہہ رہا ہے کہ ''تم پر ذمہ داری صرف اپنی جانوں کی ہے۔ اگر تم ہدایت پر ہو تو جو گمراہ ہوا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑے گا''۔ لہٰذا ہر کسی کو بس اپنا عمل درست رکھنا چاہیے' کوئی دوسرا شخص اگر غلط کام کرتا ہے تو اسے خواہ مخواہ روکنے ٹوکنے' اس کی ناراضگی مول لینے' اَمر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح کی باتیں جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے علم میں آئیں تو آپؓ نے باقاعدہ ایک خطبہ دیا کہ لوگو میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس آیت کا مطلب غلط سمجھ رہے ہو۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ تمہاری ساری تبلیغ' کوشش' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باوجود اگر کوئی شخص گمراہ رہتا ہے تو اس کا تم پر کوئی وبال نہیں ——— سورۃ البقرۃ میں ہم پڑھ چکے ہیں: ﴿وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾﴾ ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ سے کوئی باز پرس نہیں ہوگی جہنمیوں کے بارے میں''۔ یعنی ہم یہ نہیں پوچھیں گے کہ ہم نے آپؐ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا تھا اور پھر بھی یہ لوگ جہنم میں کیوں چلے گئے؟ بہرحال دعوت وتبلیغ' نصیحت وموعظت' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تو فرائض میں سے ہیں۔ اس آیت کی رو سے یہ فرائض ساقط نہیں ہوتے۔ بلکہ اس آیت کا درست مفہوم یہ ہے کہ تمہاری کوشش کے باوجود اگر کوئی شخص نہیں مانتا تو اب تمہاری ذمہ داری پوری ہوگئی۔ فرض کیجیے کہ کسی کا بچہ آوارہ ہو گیا ہے' والد اپنی امکانی حد تک کوشش کیے جا رہا ہے مگر بچہ راہِ راست پر نہیں آ رہا' تو ظاہر بات ہے کہ اگر اُس نے بچے کی تربیت اور اصلاح میں کوئی کوتاہی نہیں چھوڑی تو اللہ کی طرف سے اس کی گمراہی کا وبال والد پر نہیں آئے گا۔

آیت ۱۰۶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِيْنَ الْوَصِيَّةِ اثْنٰنِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ ﴾ ''اے اہلِ ایمان' تمہارے درمیان شہادت (کا نصاب) ہے جبکہ تم میں سے کسی کو موت آ جائے اور وہ وصیت کر رہا ہو' تو تم میں سے دو معتبر اشخاص (بطور گواہ) موجود ہوں''

یعنی موت سے قبل وصیت کے وقت اپنے لوگوں میں سے دو گواہ (مرد) مقرر کر لو۔ واضح رہے کہ وصیت کُل ترکے کے ایک تہائی حصے سے زیادہ کی نہیں ہو سکتی۔

﴿اَوْ اٰخَرٰنِ مِنْ غَيْرِكُمْ اِنْ اَنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَاَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةُ الْمَوْتِ ۭ﴾ ''یا دوسرے دو آدمی

تمہارے غیروں میں سے اگر تم زمین میں سفر پر (نکلے ہوئے) ہو اور (حالتِ سفر میں) تمہیں موت کی مصیبت پیش آجائے۔''

یعنی حالتِ سفر میں اگر کسی کی موت کا وقت آ پہنچے اور وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو ایسی صورت میں گواہان غیر قوم' کسی دوسری بستی' کسی دوسری برادری اور دوسرے قبیلے سے بھی مقرر کیے جا سکتے ہیں' مگر عام حالات میں اپنی بستی' اپنے خاندان میں رہتے ہوئے کوئی شخص انتقال کر رہا ہو تو اسے وصیت کے وقت اپنے لوگوں' رشتہ داروں اور قرابت داروں میں سے ہی دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنانا چاہیے۔

﴿تَحْبِسُوْنَهُمَا مِنْۢ بَعْدِ الصَّلٰوةِ﴾ ''تم ان دونوں گواہوں کو نماز کے بعد (مسجد میں) روک لو''

یعنی جب وصیت کے بارے میں متعلقہ لوگ پوچھیں اور اس میں کچھ شک کا احتمال ہو تو نماز کے بعد ان دونوں گواہوں کو مسجد میں روک لیا جائے۔

﴿فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ اِنِ ارْتَبْتُمْ﴾ ''پھر وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں' اگر تمہیں شک ہو''

اگر تمہیں ان کے بارے میں کوئی شک ہو کہ کہیں یہ وصیت کو بدل نہ دیں' کہیں ان سے غلطی نہ ہو جائے تو تم ان سے قسم اٹھوا لو۔ وہ نماز کے بعد مسجد میں حلف کی بنیاد پر شہادت دیں' اور اس طرح کہیں:

﴿لَا نَشْتَرِيْ بِهٖ ثَمَنًا وَّلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى﴾ ''ہم اس کی کوئی قیمت وصول نہیں کریں گے' اگرچہ کوئی قرابت دار ہی کیوں نہ ہو''

یعنی ہم اس شہادت سے نہ تو خود کوئی ناجائز فائدہ اٹھائیں گے' نہ کسی کے حق میں کوئی ناانصافی کریں گے اور نہ ہی کسی رشتہ دار عزیز کو کوئی ناجائز فائدہ پہنچائیں گے۔

﴿وَلَا نَكْتُمُ شَهَادَةَ اللّٰهِ﴾ ''اور نہ ہم چھپائیں گے اللہ کی گواہی کو''

غور کریں گواہی اتنی عظیم شے ہے کہ اسے شَهَادَةَ اللّٰهِ کہا گیا ہے' یعنی اللہ کی گواہی' اللہ کی طرف سے امانت۔

﴿اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الْاٰثِمِيْنَ ۝١٠٦﴾ ''اگر ہم ایسا کریں تو یقیناً ہم گنہگاروں میں شمار ہوں گے۔''

آیت ۱۰۷ ﴿فَاِنْ عُثِرَ عَلٰۤى اَنَّهُمَا اسْتَحَقَّاۤ اِثْمًا﴾ ''پھر اگر معلوم ہو جائے کہ ان دونوں نے (جھوٹ بول کر) گناہ کمایا ہے''

حلفیہ بیان بھی غلط دیا ہے اور وصیت میں ترمیم کی ہے' اس کے باوجود کہ نماز کے بعد مسجد کے اندر حلف اٹھا کر بات کر رہے ہیں۔ آخر انسان ہیں اور ہر معاشرے میں ہر طرح کے انسان ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

﴿فَاٰخَرٰنِ يَقُوْمٰنِ مَقَامَهُمَا﴾ ''تو اب دو اور لوگ ان کی جگہ پر کھڑے ہوں''

﴿مِنَ الَّذِيْنَ اسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْاَوْلَيٰنِ﴾ ''ان لوگوں میں سے جن کی حق تلفی کی ہے ان پہلے دو لوگوں نے''

اب وہ کھڑے ہو کر کہیں گے کہ یہ لوگ ہمارا حق تلف کر رہے ہیں' انہوں نے وصیت کے اندر خیانت کی ہے۔

﴿فَيُقْسِمٰنِ بِاللّٰهِ لَشَهَادَتُنَاۤ اَحَقُّ مِنْ شَهَادَتِهِمَا﴾ ''پس وہ دونوں اللہ کی قسم کھائیں کہ ہماری گواہی زیادہ برحق ہے ان دونوں کی گواہی سے''

﴿وَمَا اعْتَدَيْنَاۤ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝١٠٧﴾ ''اور ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہے' اگر ایسا ہو تو یقیناً ہم ظالموں میں سے ہوں گے۔''

آیت ۱۰۸ ﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِالشَّهَادَةِ عَلٰى وَجْهِهَآ﴾ ''یہ طریقہ کار قریب تر ہے کہ اس سے لوگ ٹھیک ٹھیک شہادت پیش کریں''

﴿اَوْ يَخَافُوْٓا اَنْ تُرَدَّ اَيْمَانٌۢ بَعْدَ اَيْمَانِهِمْ ۭ﴾ ''یا (کم از کم) انہیں خوف رہے کہ ہماری قسمیں ان کی قسموں کے بعد رد کر دی جائیں گی۔''

کیونکہ انہیں معلوم ہوگا کہ اگر ہم نے جھوٹی قسم کھا بھی لی' اور پھر اگر دوسرا فریق بھی قسم کھا گیا' تو ہمارا منصوبہ کامیاب نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ اس کی ہمت نہیں کریں گے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۭ﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سن رکھو۔''

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝۱۰۸﴾ ''اللہ ایسے نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اسی طرح کا معاملہ سورۃ النُّور (آیات ۶ تا ۹) میں بھی مذکور ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو بدکاری کرتے ہوئے دیکھے اور اس کے پاس کوئی اور گواہ نہ ہو تو وہ چار مرتبہ قسم کھا کر کہے کہ میں جو کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ تو اُس ایک شخص کی گواہی چار گواہوں کے برابر ہو جائے گی۔ لیکن پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھی بتایا ہے' کہ اگر بیوی بھی چار مرتبہ قسم کھا کر کہہ دے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے' مجھ پر تہمت لگا رہا ہے اور پانچویں مرتبہ یہ کہے کہ مجھ پر اللہ کا غضب ٹوٹے اگر اس کا الزام درست ہو' تو شوہر کی گواہی ساقط ہو جائے گی۔ اس طرح دونوں طرف سے اللہ تعالیٰ نے معاملے کو متوازن کیا ہے۔

اب آخری دو رکوع اس لحاظ سے اہم ہیں کہ ان میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام کے اس مکالمے کا نقشہ کھینچا گیا ہے' جو قیامت کے دن ہوگا۔ اور اس کے پس منظر میں گویا ایک پوری داستان ہے' جو ایک نئی شان سے سامنے آئی ہے۔

آیات ۱۰۹ تا ۱۱۵

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ۝۱۰۹ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰي وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْــــَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۱۰ وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝۱۱۱ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَاۗىِٕدَةً مِّنَ السَّمَاۗءِ ۭ قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۱۲ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝۱۱۳ قَالَ عِيْسَى ابْنُ

مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ ع

آیت ۱۰۹ ﴿يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ؕ﴾ ''(اُس دن کا تصور کرو) جس دن اللہ تعالیٰ تمام رسولوں کو جمع کرے گا اور پوچھے گا آپ لوگوں کو کیا جواب ملا تھا؟''

آپ لوگوں کی دعوت کے جواب میں آپ کی قوموں نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا تھا؟

﴿قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿۱۰۹﴾﴾ ''وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں' تو ہی بہتر جاننے والا ہے غیب کی باتوں کا۔''

وہ اللہ تعالیٰ کے جناب میں زبان کھولنے سے گریز کریں گے اور کہیں گے کہ تُو تمام پوشیدہ باتوں کو جاننے والا ہے' ہر حقیقت تجھ پر منکشف ہے۔

آیت ۱۱۰ ﴿اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ﴾ ''جب کہے گا اللہ تعالیٰ اے عیسیٰؑ ابن مریم''

اب روزِ قیامت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خاص پیشی کا منظر ہے۔ دنیا میں ان کی پرستش کی گئی' ان کو اللہ کا بیٹا بنایا گیا' ثالثُ ثلاثہ قرار دیا گیا۔ لہٰذا اب آنجنابؑ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے جو شرمندگی اٹھانا پڑے گی' اس کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے جب اللہ ان کو مخاطب کر کے فرمائے گا کہ اے عیسیٰ ابنِ مریم:

﴿اذْكُرْ نِعْمَتِيْ عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ﴾ ''ذرا میرے ان انعامات کو یاد کرو جو تم پر اور تمہاری والدہ پر ہوئے۔''

﴿اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ ''جبکہ میں نے تمہاری مدد کی روح القدس سے''

جبرائیلؑ کے ذریعے سے تمہاری تائید کی۔

﴿تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ﴾ ''تم گفتگو کرتے تھے لوگوں کے ساتھ پنگھوڑے میں بھی اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی۔''

تم شیر خوارگی کی عمر میں بھی لوگوں سے گفتگو کرتے تھے اور ادھیڑ عمر کو پہنچ کر بھی۔ آگے وہی سورۂ آل عمران (آیت ۴۸) والے الفاظ دہرائے جا رہے ہیں۔

﴿وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۚ﴾ ''اور (یاد کرو میرے اس احسان کو) جب کہ میں نے تمہیں سکھائی کتاب اور حکمت' یعنی تورات اور انجیل۔''

درمیان کا واؤ تفسیر یہ ہے' لہٰذا ''یعنی'' کے مفہوم میں آئے گا۔

﴿وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ﴾ ''اور (یاد کرو) جب تم بناتے تھے گارے سے پرندے کی ایک شکل' میرے حکم سے''

﴿فَتَنْفُخُ فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ﴾ ''پھر تم اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ ایک اُڑنے والا پرندہ بن جاتا تھا

میرے حکم سے‘‘

﴿وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ﴾ ’’اور تم اچھا کر دیتے تھے مادرزاد اندھے کو اور کوڑھی کو میرے حکم سے۔‘‘

﴿وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ﴾ ’’اور جب تم مُردوں کو نکال کھڑا کرتے تھے میرے حکم سے۔‘‘

﴿وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَنْكَ﴾ ’’اور (یاد کرو میرے اس احسان کو بھی) جب میں نے بنی اسرائیل کے ہاتھ روک دیے تم سے‘‘

ان کے ہاتھ تم تک نہیں پہنچنے دیے اور تمہیں ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ یہ اُسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر سورۂ آل عمران‘ آیت ۵۴ کے تحت ہوا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام گرفتار نہیں ہوئے‘ اور عین اُس وقت جب پولیس والے آپؑ کو گرفتار کرنے کے لیے باغ میں داخل ہوئے تو چار فرشتے اترے‘ جو آپؑ کو لے کر آسمان پر چلے گئے۔

﴿اِذْ جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۱۱۰﴾ ’’جب کہ تم آئے ان کے پاس کھلے معجزات کے ساتھ تو کہا اُن لوگوں نے جو اُن میں سے کافر تھے کہ یہ تو صریح جادو کے سوا کچھ نہیں ہے۔‘‘

آیت ۱۱۱ ﴿وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ﴾ ’’اور (یاد کرو میرے احسان کو) جب میں نے اشارہ کیا حواریوں کو‘‘

﴿اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ﴾ ’’کہ ایمان لاؤ مجھ پر اور میرے رسول پر۔‘‘

ان کے دل میں ڈال دیا‘ الہام کر دیا‘ ان کی طرف وحی کر دی۔ یہ وحی خفی ہے۔ ظاہر ہے حواریوں کی طرف وحی جلی تو نہیں آ سکتی تھی جو خاصۂ نبوت ہے۔ لیکن جیسا کہ شہد کی مکھی کے لیے وحی کا لفظ آیا ہے (النحل:۶۸) یا جیسے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو وحی کی (فصلت:۱۲) یہ وحی خفی کی مثالیں ہیں۔

﴿قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ۝۱۱۱﴾ ’’تو انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لائے اور (اے عیسیٰؑ آپ بھی) گواہ رہیے کہ ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔‘‘

آیت ۱۱۲ ﴿اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ﴾ ’’اور (ذرا یاد کرو اس واقعے کو) جب حواریوں نے کہا کہ اے عیسیٰ ابن مریم‘‘

﴿هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ۭ﴾ ’’کیا آپ کے رب کو یہ قدرت حاصل ہے کہ ہم پر آسمان سے ایک دسترخوان اتارے؟

﴿قَالَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝۱۱۲﴾ ’’(جواب میں عیسیٰؑ نے) کہا: اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔‘‘

مؤمنین کو ایسی دعائیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ایسے مطالبات آپ لوگوں کو زیب نہیں دیتے۔

آیت ۱۱۳ ﴿قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَىِٕنَّ قُلُوْبُنَا﴾ ’’انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اس (خوان) میں سے کھائیں اور ہمارے دل بالکل مطمئن ہو جائیں‘‘

یہ اس طرح کی بات ہے جیسی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہی تھی: ﴿رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۶۰) ’’پروردگار! ذرا مجھے مشاہدہ کرا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ (اللہ تعالیٰ نے)

فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟ کہا: کیوں نہیں! (ایمان تو رکھتا ہوں) لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے''۔ اسی طرح کا مشاہدہ وہ بھی طلب کر رہے تھے۔

﴿وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾﴾ ''اور ہمیں معلوم ہو جائے کہ آپؑ نے جو کچھ ہم سے کہا وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ بن جائیں۔''

تاکہ ہمیں یقین کامل حاصل ہو جائے اور ہمارے اپنے دلوں میں کہیں شک وشبہ کا کوئی کانٹا چبھا ہوا نہ رہ جائے۔

آیت ﴿قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ﴾ ''اس پر عیسیٰؑ ابنِ مریم نے دعا کی: اے اللہ! اے ہمارے رب! اتار دے ہم پر ایک دسترخوان آسمان سے''

﴿تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ﴾ ''جو عید بن جائے ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے اور ایک نشانی ہو تیری طرف سے۔''

آسمان سے' خاص تیرے ہاں سے کھانے سے بھرے ہوئے دسترخوان کا نازل ہونا یقیناً ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے ایک یادگار واقعہ اور تیری طرف سے ایک خاص نشانی ہوگا۔ اس واقعہ پر یقیناً ہم جشن منائیں گے۔

﴿وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾﴾ ''اور ہمیں رزق عطا فرما اور یقیناً تُو بہترین رزق دینے والا ہے۔''

آیت ﴿قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا عَلَيْكُمْ ۚ﴾ ''اللہ نے ارشاد فرمایا (ٹھیک ہے) مَیں نازل کر دوں گا اس کو تم پر۔''

﴿فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾﴾ ''لیکن پھر اس کے بعد تم میں سے جو کوئی کفر کی روش اختیار کرے گا تو پھر اس کو مَیں عذاب بھی وہ دوں گا جو تمام جہانوں میں سے کسی اور کو نہیں دوں گا۔''

یعنی جب اس طرح کی کوئی خرقِ عادت چیز دکھا دی جائے گی' کھلا معجزہ سامنے آ جائے گا تو پھر رعایت نہیں ہوگی۔ گزشتہ قوموں کے ساتھ ایسے ہی ہوا تھا۔ قومِ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اس چٹان میں سے ہمارے سامنے ایک حاملہ اونٹنی برآمد ہو جانی چاہیے۔ اللہ کے حکم سے وہ اونٹنی تو برآمد ہو گئی' لیکن ساتھ ہی رعایت بھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ان سے واضح طور پر کہہ دیا گیا کہ اب تمہارے لیے مہلت کے صرف چند دن ہیں' اگر ان دنوں میں ایمان نہیں لاؤ گے تو نیست ونابود کر دیے جاؤ گے۔ یہ بات سورۃ الشعراء میں بہت تفصیل سے آئے گی کہ اے نبی ﷺ! مشرکینِ مکہ جو نشانیاں مانگ رہے ہیں تو ہم ان کی خیر خواہی میں انہیں ایسی کوئی نشانی نہیں دکھا رہے ہیں۔ اگر ان کے کہنے پر ایسی نشانیاں ہم دکھا دیں تو پھر ان کو مزید رعایت نہیں دی جائے گی اور ان کی مہلت ختم ہو جائے گی۔ اس قسم کے معجزے دیکھ کر نہ کوئی پہلے ایمان لایا' نہ اب یہ لوگ لائیں گے۔ ان کے اندر جو نیت کا فساد ہے وہ کہاں انہیں ماننے دے گا؟ جیسے قومِ صالحؑ نے نہیں مانا' حالانکہ اپنی نگاہوں کے سامنے انہوں نے کھلا معجزہ دیکھ لیا تھا۔ اسی طرح یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کو نہیں مانا' اُلٹا انہیں جادو قرار دے دیا۔ تو اس قدر واضح معجزات دیکھ کر بھی لوگ ایمان نہیں لائے۔ سوائے اُن جادوگروں کے جن کا فرعون کے دربار میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ ہوا تھا۔ لیکن جادوگروں کی تصدیق کے بعد بھی نہ تو خود فرعون ایمان لایا تھا نہ اس کے درباری اور نہ ہی عوام الناس۔ چنانچہ معجزے کا ظہور دراصل متعلقہ قوم کے خلاف جاتا ہے۔ معجزے کے ظہور سے پہلے تو اُمید ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ شاید اس قوم کو کچھ ڈھیل دے دے' شاید کچھ اور لوگوں کو ایمان کی توفیق مل جائے' لیکن معجزے کے ظہور کے بعد مہلت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

آیات ۱۱۶ تا ۱۲۰

وَ اِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ ۗ بِحَقٍّ ؕ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَ لَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَ رَبَّكُمْ ۚ وَ كُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَ اِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۱۸﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ ؕ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۹﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا فِیْهِنَّ ؕ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

اب یہ اس پیشی کا آخری منظر ہے اور اس کا انداز بہت سخت ہے۔

آیت ۱۱۶ ﴿وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ یٰعِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور جب اللہ کہے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰ! کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ مجھے اور میری ماں دونوں کو معبود بنا لینا' اللہ کے سوا؟''

﴿قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ ؕ﴾ ''وہ (جواب میں) عرض کریں گے (اے اللہ) تُو پاک ہے' میرے لیے کیسے روا تھا کہ میں وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔''

﴿اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ ؕ﴾ ''اگر میں نے وہ بات کہی ہوتی تو وہ تیرے علم میں ہوتی۔''

﴿تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَاۤ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ ﴿۱۱۶﴾﴾ ''تُو تو جانتا ہے جو کچھ میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے۔ یقیناً تمام پوشیدہ حقیقتوں کا جاننے والا تو بس تُو ہی ہے۔''

آیت ۱۱۷ ﴿مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَاۤ اَمَرْتَنِیْ بِهٖۤ﴾ ''میں نے ان سے کچھ نہیں کہا مگر وہی کچھ جس کا تُو نے مجھے حکم دیا تھا''

﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ ۚ﴾ ''(اور وہ یہی بات تھی) کہ بندگی کرو اللہ کی جو میرا بھی ربّ ہے اور تمہارا بھی ربّ ہے۔''

﴿وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْهِمْ ۚ﴾ ''اور میں ان پر نگران رہا جب تک اُن میں موجود رہا۔''

ان کی راہنمائی کرتا رہا' نگرانی کرتا رہا۔ یہاں لفظ ''شہید'' نگران کے معنوں میں آیا ہے۔

﴿فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ ؕ﴾ ''پھر جب تُو نے مجھے اٹھا لیا تو (اس کے بعد) تُو ہی نگران تھا ان پر''

واضح رہے کہ یہاں بھی تَوَفَّیْتَنِیْ موت کے معنوں میں نہیں ہے۔ اس سلسلے میں سورۂ آل عمران آیت ۵۵ (اِنِّیْ مُتَوَفِّیْكَ) کی تشریح مدنظر رہے۔

﴿وَاَنْتَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿۱۱۷﴾﴾ ''اور یقیناً تُو ہر چیز پر گواہ ہے۔''

تُو ہر چیز پر نگران ہے' ہر چیز سے باخبر ہے۔

آیت ۱۱۸ ﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ﴾ ''اب اگر تُو انہیں عذاب دے تو یہ تیرے ہی بندے ہیں۔''

تجھے ان پر پورا اختیار حاصل ہے' وہ تیری مخلوق ہیں۔

﴿وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۱۸﴾﴾ ''اور اگر تُو انہیں بخش دے تو تُو زبردست ہے' حکمت والا ہے۔''

معافی کی درخواست کا یہ انداز بہت خوبصورت ہے۔ اس میں اس شفقت و رأفت کا اظہار تو ہے' جو نوعِ انسانی کے لیے انبیاء کی شخصیت کا خاصہ ہے' لیکن اس سے آگے بڑھ کر کچھ نہیں کہا گیا۔ اور یہی مقامِ عبدیت ہے کہ اے اللہ! تو صاحبِ اختیار ہے' تو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی۔ اگر تُو انہیں معاف فرمانا چاہے تو تجھ سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا' کوئی جواب طلبی نہیں کر سکتا کہ تو نے کیسے معاف کر دیا! اب آخر میں اس پیشی کا ڈراپ سین اور آخری نقشہ دکھایا جا رہا ہے۔

آیت ۱۱۹ ﴿قَالَ اللّٰهُ هٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُهُمْ ؕ﴾ ''اللہ فرمائے گا: یہ آج کا دن وہ ہے جس دن سچوں کو اُن کی سچائی فائدہ پہنچائے گی۔''

ان کا سچ اور صدق ان کے حق میں مفید ہوگا۔

﴿لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ؕ﴾ ''ان کے لیے باغات ہیں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' وہ ان میں ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔''

﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ﴿۱۱۹﴾﴾ ''اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔''

یہ ہے باہمی رضامندی کا آخری مقام' اللہ ان سے راضی اور وہ اللہ سے راضی۔

آیت ۱۲۰ ﴿لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا فِیْهِنَّ ؕ﴾ ''اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے' سب کی بادشاہی۔''

﴿وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۱۲۰﴾﴾ ''اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

یہاں پر اللہ تعالیٰ کے فضل سے سورۃ المائدۃ کے اختتام کے ساتھ ہی مکی اور مدنی سورتوں کے گروپس (groups) میں سے پہلے گروپ کا مطالعہ مکمل ہو گیا ہے' اس گروپ میں ایک مکی سورۃ یعنی سورۃ الفاتحہ اور چار مدنی سورتیں شامل ہیں۔ سورۃ الفاتحہ اگرچہ حجم میں بہت چھوٹی ہے لیکن یہ اپنی معنوی عظمت کے لحاظ سے پورے قرآن کے ہم وزن ہے۔ سورۃ الحجر کی آیت: ﴿وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ﴿۸۷﴾﴾ ''اور ہم نے آپؐ کو دی ہیں سات بار بار پڑھی جانے والی آیات اور عظمت والا قرآن''۔ مفسرین کی رائے کے مطابق سورۃ الفاتحہ ہی کے بارے میں ہے۔ اس گروپ کی چار مدنی سورتیں (البقرۃ' آل عمران' النساء اور

المائدۃ) دو دو کے جوڑوں کی شکل میں ہیں۔ ان تمام سورتوں کے مضامین کا خلاصہ یہاں ایک دفعہ پھر ذہن میں تازہ کر لیں۔ مکمل شریعتِ آسمانی' اہلِ کتاب سے خطاب' ان پر الزامات کا تذکرہ' ان کے غلط عقائد کی نفی' انہیں ایمان کی دعوت' ان کی تاریخ کے اہم واقعات کی تفصیلات' ان کا اُمّتِ مُسلمہ کے منصب سے معزول کیا جانا' جس پر وہ دو ہزار برس سے فائز تھے اور اُمّتِ محمد ﷺ کا اس منصب پر فائز کیا جانا' یہ موضوعات آخری درجے میں اس گروپ کی سورتوں میں مکمل ہو گئے ہیں۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم' ونفعنی وایاکم بالآیات والذِّکر الحکیم ○○


اللہ
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ
مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک بپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ **غلبۂ دینِ حق** کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ